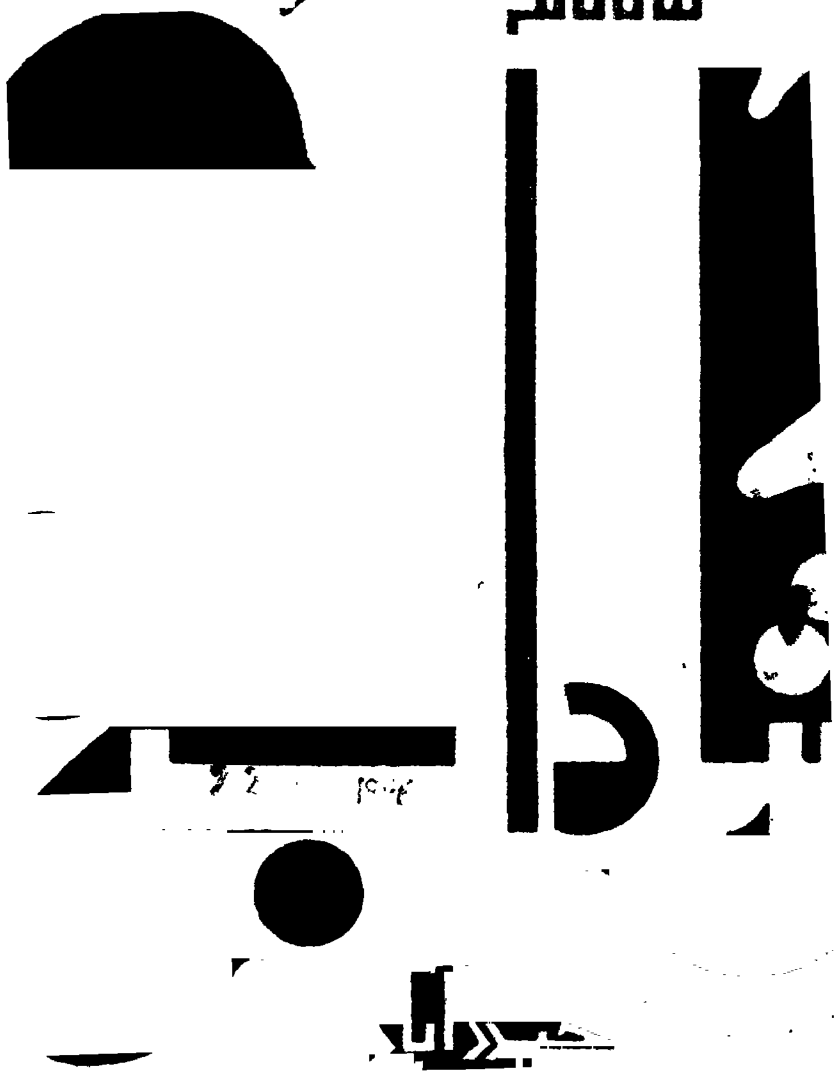
ماهنامه



علمی ادبی دینی وسماجی الکلاسکا

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

خوشبوئے محبت الحاج سید الدین ... ڈاکٹر سجاد حسین دیور ... ہما نمبر

خصوصی شمارہ "15" روپے

جلد (۳) جنوری، فروری ۱۹۸۹ شمارہ (۱، ۲)

ایڈیٹر

محمد قمر الدین صابری

مینجنگ ایڈیٹر — علی الدین قادری

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ ۵۰ روپے	۱۵۰ روپے	۳۵ ڈالر	۲۰ پونڈ	۱۲۵ پاکستانی روپے
دو سالہ ۹۰ روپے	۲۷۰ روپے	۶۵ ڈالر	۳۶ پونڈ	۲۲۵ " "
تاحیات ۱۰۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۵۰۰ ڈالر	۲۰۰ پونڈ	۳۰۰۰ " "

ترسیل زر کا پتہ - 147-5-11 - ریڈ ہلز - حیدرآباد - 500004 - آندھرا پردیش

ایڈیٹر - پرنٹر - پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد - ۴ سے شائع کیا۔

فہرست

حرفِ اول

خواجہ حمیدالدین شاہد اور اعجاز حسین کھٹہ دکن کی سرزمین سے اٹھے۔ دکن نے انہیں پروان چڑھایا۔ حالات نے انہیں پاکستان پہنچا دیا۔ ایک مدت سے پاکستان میں ہیں لیکن دکن کے سپوت دکن کو نہ بھول سکے۔ خواجہ صاحب ادارہ ادبیات اردو کی ابتدا سے ڈاکٹر زور کے ساتھ رہے "ایوانِ اردو" اور "سب رس" کی بنیاد کے پتھر ہے پاکستان جاکر بھی انہوں نے "ایوانِ اردو" بنایا اور سب رس جاری کیا۔ گویا پاکستان میں رہ کر حیدرآباد کی دنیا میں سانس لیتے رہے۔ جناب کھٹہ بھی تین دہوں سے زائد حیدرآباد کے باہر پاکستان میں رہے لیکن دکن کی موہنی "دکھنی" کو نہیں بھولے۔ اور جب بھی شاعری کی "دکھنی" ہی میں شعر کہے۔ حیدرآباد آنے سے پہلے "میرا وطن" اور "سلطان العلوم" جیسی نظمیں کہہ کر اپنے حقیقی دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ جناب کھٹہ ہمیشہ عوام سے قریب رہے اور عوامی زبان میں شعر کہنا صرف اس لئے اختیار کیا کہ عوام سمجھیں اور سبق حاصل کریں۔ پاکستان جانے سے پہلے ریڈیو سے مزاحیہ اصلاحی پروگرام "استاد کی باتیں" پیش کرتے جو نہایت مقبولِ عام تھا۔ کراچی میں بھی ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے کبھی کبھی ٹی وی کے پروگراموں میں بھی حصہ لیا۔ خواجہ صاحب جب تک حیدرآباد میں رہے اردو کی خدمت کرتے رہے۔ پاکستان میں بھی آپ نے اسی خدمت کو جاری رکھا گزشتہ سال دل کے سخت عارضہ میں مبتلا ہوئے۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ حیدرآباد والوں کی محبت و خلوص نے انہیں تندرست و توانا بنایا کہ وہ نہ صرف سفر کے قابل ہوئے بلکہ اس محبت نے انہیں تازگی بخشی۔ خواجہ صاحب خود اخلاص و مروت مجسم ہیں خود ان کا شعر ہے۔ ؎

کبھی کسی کا نہ دل دکھایا کبھی کسی کی نہ کی برائی — ہوا جو ممکن تو کی بھلائی اسی طرح سے بسر ہوئی ہے

منکسر المزاج ایسے کہ گو برسوں سے شعر کہتے ہیں مگر کبھی اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے "حیدرآباد کے شاعر حصہ اول" مرتب کیا۔ اس میں اپنا ہی تذکرہ شامل نہ کیا۔ جب سلیمان اریب نے "حیدرآباد کے شاعر حصہ دوم" مرتب کیا اس میں شاہد صاحب کی غزلیات منتخب کر کے شریک کیں۔ آج خواجہ شاہد اور جناب کھٹہ اپنے ہی شہر میں آپ مہمان ہیں۔ شاہد خود کہہ چکے ہیں۔ ؎ جانے کیا گذرے گی اس وقت ہمارے دل پر — اپنے ہی شہر میں جب آپ ہی مہمان ہونگے

شاداب ان مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنا یہ خاص نمبر پیش کر رہا ہے۔ یہ ایسا تحفۂ خلوص ہے کہ اس دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں

جب ۱۶ دسمبر ۱۹۸۵ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر ڈاکٹر مالک رام نے پاکستان سے آنے والے شاعر، ادیب اور مشہور کالم نویس جناب مشفق خواجہ کو ان کی پاکستان واپسی کے موقع پر ایک کتاب "مشفق خواجہ ـــــ ایک مطالعہ" پیش کی تو اس مطبوعہ گلدستہ کو ہندوستان اور پاکستان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب قرار دیا گیا۔

حیدرآباد بھی اس معاملہ میں دہلی سے پیچھے نہیں۔ ہمارے ہاں حیدرآباد ہی کے دو سپوتوں جناب خواجہ حمید الدین شاہد اور جناب اعجاز حسین کھٹا کی آمد پر خیر مقدمی تقاریب تو منعقد کی گئیں لیکن ماہنامہ شاداب کے مدیر جناب محمد قمر الدین نے اپنے رسالہ کا خاص نمبر ان حضرات کے اعزاز میں شائع کر کے اس طرح ماہنامہ شاداب کو اس کام میں اولیت حاصل ہوئی کیونکہ ماہنامہ شاداب کا یہ خصوصی نمبر اپنی نوعیت کا پہلا خاص نمبر ہے جو پاکستانی ادیبوں کے خیر مقدم کے طور پر ہندوستان سے یا ہندوستانی ادیبوں کے خیر مقدم میں پاکستان سے شائع کیا گیا۔

ماہنامہ شاداب کے اس خاص نمبر نے بے کہے بہت سی باتیں کہہ دی ہیں۔ جذبات محبت و عقیدت سرحدوں کے پابند نہیں ہوتے۔ زبان اردو بھی سرحدوں کی پابند نہیں ہے جناب خواجہ حمید الدین شاہد اور جناب اعجاز حسین کھٹا کو پاکستان سے بھارت آنے کے لیے اجازت کا لزوم ہے وہ یہاں مقررہ مدت سے زیادہ قیام نہیں کر سکتے لیکن ان دونوں کا اہل اردو کے دل میں جو مقام ہے وہ کسی اجازت کا پابند ہے اور نہ اس پر کسی مدت کی قید ہے۔ اہل حیدرآباد دکن ہوں یا اہل حیدرآباد سندھ، سب کو ان دونوں سے پیار ... اور عقیدت ہے۔

میں ان دو حیدرآبادیوں کا ان کے اپنے شہر میں خیر مقدم کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا

غیر معلوم ہوا تو کیا جاتا ہے پنجابی کو زبان کیسے قرار دوں، البتہ ان بچھڑے ہوئے اردو کے سپاہیوں کو جو ایک عرصہ دراز کے بعد اپنے وطن کو اور اپنے شہر کو آئے ہیں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

اپنے ان دو دوستوں اور پرانے ساتھیوں کی موجودگی میں روایاتی انداز میں ان کے حالات زندگی بیان نہیں کروں گا اور ان کی خدمات کے تعلق سے توصیفی الفاظ نہیں کہوں گا۔ یہ باتیں ضرور اس لائق ہیں کہ ان کو بیان کیا جائے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان ہر دو کے کارنامے اور اردو کے تعلق سے ان کی نمایاں اور قابلِ قدر خدمات اس معیار کی ہیں کہ ان پر تحقیقاتی کام کیے جائیں اور اردو دوست نوجوانوں کو ان ہر دو حضرات کی زندگیوں سے سبق حاصل کرنے اور Inspiration حاصل کرنے کے سامان فراہم کیے جائیں۔ میں ان باتوں کو دوسروں پر چھوڑتا ہوں جو اس فرض کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ میں تو ان حضرات کے تعلق سے غیریت کے پردے اٹھاتے ہوئے کچھ اور نقوش دوئی مٹانا چاہتا ہوں۔

میں ان دو شخصیتوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو ہمارے درمیان پاکستان کے معتبر نمائندے ہیں اور پاکستان میں ہمارے معتبر نمائندے ہیں چند اہم باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں جو اردو کے تعلق سے ہیں اور ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں

اردو رسم الخط بہت سی خوبیوں کا حامل ہے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ رسم الخط دنیا کا سب سے خوب صورت رسم الخط ہے اور اس میں زود نویسی کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں۔ اردو رسم الخط ہم کو ہندوستان کے پڑوسی ممالک سے جن کی زبان عربی یا فارسی ہے قریب لاتا ہے۔ عربی اور فارسی رسم الخط سے قریبی تعلق کی وجہ سے اردو رسم الخط سے دنیا کے ایک وسیع خطے میں بسنے والے مانوس ہیں یہ خطہ تمام عرب ممالک کے علاوہ ایران، افغانستان اور روس کے علاقوں پر مشتمل ہے۔

اگر ہندی زبان دیوناگری کے ساتھ ساتھ اردو رسم الخط میں منظر عام پر آئے تو نہ صرف ان تمام ممالک میں جو اردو رسم الخط سے روشناس ہیں بلکہ تمام دنیا میں اس کا

جس شاندار انداز سے خیر مقدم ہوگا وہ بیان سے باہر ہے۔

جس طرح سیاسی اور سفارتی اعتبار سے ہندوستان کا مشرقِ وسطیٰ سے قریبی رابطہ ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ اسی طرح ثقافتی سطح پر بھی نہایت ضروری ہے رسم الخط کی جزوی یکسانیت ہندوستان کے لیے اور ہندی زبان کے لیے نہایت اہم مضمرات کی حامل ہوگی۔

اگر ہندی زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط کے ساتھ اُردو رسم الخط کو بھی اختیار کر لیا جائے جیسا کہ گاندھی جی کا بھی خیال تھا اور پاکستان میں اُردو زبان کے لیے اُردو رسم الخط کے ساتھ دیوناگری رسم الخط کو بھی اختیار کیا جائے تو نہ صرف ہندی اور اُردو زبانیں ایک دوسرے سے بہت قریب آجائیں گی بلکہ ان ہر دو زبانوں کو ایسی بلندی حاصل ہوگی جس کا اہلِ ہندی اور اہلِ اُردو تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مزید برآں ہندی صحیح معنوں میں ہندوستان کی مشترکہ اور قومی زبان بن سکے گی اور سرکاری زبان کہلانا اس کے شایانِ شان ہوگا۔

پہلا اور فوری فائدہ تو یہ حاصل ہوگا کہ ہندی اور اُردو ہر دو زبانوں کے لیے بیک جست اقوامِ متحدہ کی زبان بننے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ اسی طرح دونوں زبانیں ایک دوسرے سے قریب آجانے سے نہ صرف برصغیر کی بڑی زبان بن جائیں گی بلکہ عالمی سطح پر بھی کوئی زبان اس مشترکہ زبان کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

اہلِ ہندی نے کچھ عرصہ سے وسیع النظری کو اپناتے ہوئے ہندی زبان کو آسان اور عام فہم بنانے کی حکمتِ عملی کو اپنا لیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہندی کے لیے دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ساتھ اُردو رسم الخط کو بھی اپنا لیا جائے

اور اسی طرح اردو کے لیے اُردو رسم الخط کے ساتھ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں آج قابلِ عمل نہ معلوم ہوں لیکن بنیادی صداقتوں سے اس لیے اعراض نہیں کیا جا سکتا اور اہم مضمرات کے حامل مطالبات کو پیش کرنے کے لیے اس لیے پس و پیش نہیں کیا جا سکتا کہ آج کچھ مشکلات درپیش ہیں اور ذہن صاف

باقی صفحہ (۲۰) پر

ایڈیٹر

سر پیامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے

دکنی زبان کے ممتاز شاعر فقام سرورخان ڈنڈا کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے سرور ڈنڈا میموریل سوسائٹی نے ۲۲ ، اور ۲۳ ، نومبر ۱۹۸۵ء کو یادِ سرور ڈنڈا تقاریب کا اہتمام کیا ۔ حیدرآباد کی اُردو دنیا سوسائٹی کی ممنون ہے کہ انہوں نے حیدرآباد کے دو سپوتوں کو یہاں آنے کی دعوت دے کر بچھڑے آپسی ملاپ کی صورت پیدا کی ۔ سید غیر خواجہ حمید الدین شاہد اور جناب اعجاز حسین کھٹا افتتاحی تقریب میں شرکت نہ کرسکے جس سے حیدرآباد والوں کو بڑی مایوسی ہوئی ۔

دوسرے دن (۲۳ ، نومبر ۸۵ء) نمائش میدان میں سمینار کی کارروائی شروع ہونی تھی کہ یہ دونوں اصحاب طیران گاہ سے سیدھے نمائش میدان پہنچے ۔ مدتوں کے بچھڑے ہوئے احباب کی ملاقات کا منظر انتہائی متاثر کن تھا ۔ ان مہمانوں اور ان کے قدیم احباب اور ساتھیوں کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک رہے تھے ۔ بغل گیر ہونے اور گل پوشی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد سمینار کی بقیہ کارروائی جاری رہی ۔ صدر سمینار محترمہ سیدہ جعفر صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے کہا کہ وہ شہر حیدرآباد میں حیدرآباد کی دو قد آور شخصیتوں کا خیر مقدم کرتی ہیں ۔ جناب شاہد نے بتایا کہ صحت کے ساتھ نہ دینے اور حالات کے ناسازگار ہونے کے باوجود ان کا حیدرآباد پہنچنا معجزاتی انداز میں ہوا ہے ۔ یہ سرور ڈنڈا کی یاد اور اہلِ حیدرآباد کی محبت ہے جو انہیں یہاں کھینچ لائی ہے ۔ وہ اتنے سارے برس پاکستان میں حیدرآباد کی یاد سے کبھی دور نہیں رہے اور حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے بارے میں اشتیاق کے ساتھ معلومات حاصل کرتے رہے ۔ سرور ڈنڈا سے اپنے مراسم کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ڈنڈا ایک بے باک انسان تھے اور اسی وجہ سے ان کی شاعری میں سماج کی دکھتی رگوں پر تنقید جا بجا ملتی ہے ۔

جناب اعجاز حسین کھٹا نے اپنے نہایت دلچسپ اور استادانہ انداز میں بحیثیت شاعر سرور ڈنڈا

کے آغاز سفر کا دلچسپ واقعہ سنایا اور بتایا کہ سرور ڈنڈا سے ان کی ملاقات ایک محفل میں ہوئی جب کہ ڈنڈا نے شاعری کی ابتدا کی تھی۔ جناب کنتا نے اس مبتدی شاعر کو بر سر محفل ڈنڈا تخلص اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جناب کنتا نے ڈنڈا کی سادگی، بے ساختگی اور بے باکی کو سراہتے ہوئے بتایا کہ ڈنڈا مشاعروں میں عوام کی نظروں میں مرکزی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے اور عوام سے انھیں کافی داد ملتی تھی۔ تقریباً تین دہوں کے بعد پہلی بار حیدرآباد آنے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ مرور زمانہ کی وجہ سے وہ اپنے بعض قدیم شناساؤں حتیٰ کہ قریبی رشتہ داروں کے چہروں کو تک نہ پہچان سکے۔ چونکہ انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ حیدرآباد اور حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں گذارا ہے وہ اپنی سرزمین پیدائش پر واپس آکر اپنے آپ کو مسرت اور انبساط سے معمور پا رہے ہیں۔

اسی دن رات میں یادِ سرور ڈنڈا کا مشاعرہ نمائش میدان ہی میں نہایت کامیاب رہا۔ پاکستان سے آئے ہوئے حیدرآبادی بزرگ اور دکھنی کے باکمال شاعر حضرت اعجاز حسین کنتا نے اس مشاعرہ میں اپنی یادوں سے لبریز خوبصورت نظم "میرا وطن" سنا کر ارباب دکن کو حیدرآباد کی قدیم شعری محفلوں، دانشوروں اور بزرگان دین کی یاد دلادی۔ حضرت کنتا جب ایک متاثر کن نظم سنا رہے تھے تو مجمع اور ڈائس پر بیٹھے اصحاب پر گہری سنجیدگی اور گم گشتہ حیدرآباد کی یاد کا تاثر دیکھا گیا۔ دکھنی زبان کے کلاسیکی آہنگ اور حضرت کنتا کی قادر الکلامی کا داد و تحسین کے شور میں اعتراف کیا گیا۔ صدر مشاعرہ مسٹر ادابیتی معتمد حکومت آندھرا پردیش نے اس موقع پر فصیح اردو میں کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے ایک تہذیب کی تشکیل کی ہے۔ اور ہمیں فخر ہے کہ ہم حیدرآبادی ہیں جہاں اردو کی عزت کی جاتی ہے۔ آپ کی اور ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے کام کریں۔

پاکستانی مہمانوں پر کچھ ایسی محبت کی بوچھار ہوئی اور خلوص نچھاور کیا گیا کہ وہ اپنے قیام کی مدت بڑھانے پر مجبور ہوگئے۔ جناب وقار احمد (انکم ٹیکس کنسلٹنٹ) کی خواہش تھی کہ جناب شاہد ان کے پاس قیام پذیر ہوتے لیکن زندہ دلان حیدرآباد اور فائن آرٹس اکیڈیمی

کے دوران جناب حمایت اللہ نے بقول وقار صاحب پروفیسر شاہد کی حمایت حاصل کرلی۔ اور اپنے پاس ٹھیرا لیا۔ ان کی خواہش تھی کہ جناب کنشا بھی ان کے پاس قیام پذیر رہتے۔ لیکن موصوف کے برادر نسبتی جناب ایم اے سید نے اپنے پاس ملک پیٹ میں ٹھیرا لیا۔ اب تو غیر مقدمی جلسوں اور نشستوں کا ایک سلسلہ پڑا۔ اور روزانہ ایک دو نہیں تین تین نشستیں ہونے لگیں۔ صرف چند نشستوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۲۴ر نومبر کو اردو گھر مغل پورہ میں حضرت اوج یعقوبی کی نعتوں اور منقبتوں پر مشتمل مجموعہ "اوج عرش" کی رسم اجرا حضرت سید حبیب اللہ شاہ قادری رشید پاشا امیر جامعہ نظامیہ نے فرمائی۔ سید مکرم شاہ سابق صدر ریاستی قانون ساز کونسل نے ادبی اجلاس کی صدارت کی۔ جناب شاہد کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھیں اُردو زبان کا آرکیٹکٹ قرار دیا جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف نے بہان شاعر و ادیب جناب شاہد کی حیدرآباد سے الوٹ اور دیرینہ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ جسمانی طور پر پاکستانی ہیں مگر ذہنی طور پر خالص حیدرآبادی ہیں۔ پروفیسر شاہد ایسے مخلص اور ادب دوست چند اصحاب ہند و پاک کو مل جائیں تو دونوں ملکوں میں اٹوٹ دوستی کا سبب بن سکتے ہیں۔ جناب شاہد عملاً پاکستان میں حیدرآباد کے سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں ــــ پروفیسر شاہد نے حضرت اوج یعقوبی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اوج سے ان کے روابط قدیم تھے۔ وہ قلندر صفت آدمی تھے۔ انھوں نے ادارہ ادبیات اُردو میں بھی کام کیا ہے۔ گو اوج غزل کے شاعر تھے مگر جب انھوں نے نعت شریف کہنی شروع کی تو اس میں بھی انھوں نے اپنا منفرد مقام بنا لیا ــ جناب شاہد نے مزید بتایا کہ انھیں حیدرآباد آئے صرف دو دن ہوئے ہیں مگر محبت کے سیکڑوں گل دستوں سے ان کی مشام جاں معطر ہو رہی ہے۔

کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کی جانب سے ۲۶ر نومبر کی شب احاطہ دار السلام میں عظیم الشان پیمانہ پر کل ہند نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی نگرانی الحاج عابد علی خاں مدیر "سیاست" نے کی۔ پروفیسر شاہد اور جناب کنشا نے بارگاہِ رسالت میں منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

اُردو گھر محفل پورہ میں ۲۹ نومبر کو آل انڈیا یوتھ مسلم اکیڈمی کے زیر اہتمام الحاج مرزا شکور بیگ کی زیر نگرانی تنقیدی مشاعرہ میں بھی ان مہمانوں نے شرکت کی اور اپنے کلام سے محفل کو گرمایا۔

حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) نے پاکستانی مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروفیسر شاہد نے اپنی تقریر میں کہا کہ حیدرآباد کی علمی اور ادبی رفتار و حالات کا پاکستان میں روزنامہ "سیاست" اور "منصف" کے ذریعہ علم ہوتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے ادبی ماحول اور علمی اداروں پر تفصیل سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے بتایا کہ پاکستان رائٹرس گلڈ، آرٹس کونسل، مقتدرہ قومی زبان، ترقیٔ اُردو بورڈ اور اکیڈمی ادبیات پاکستان سرکاری طور پر اُردو زبان، تعلیم اور کلچر کے فروغ میں پیش پیش ہیں۔ ان کے علاوہ غیر سرکاری اداروں، انجمن ترقی اُردو، بہادر یار جنگ اکاڈمی، ادارہ یادگارِ غالب اور ادارہ ایوانِ اُردو کے علاوہ مختلف شعری انجمنوں کی طرف سے علمی اجلاس، سیمنار منعقد کئے جاتے ہیں۔ اکیڈمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر شاہد نے بتایا کہ یہ ادارہ نامور طنز و مزاح نگار، ادیب و مصنف شفیق الرحمٰن کی صدارت میں کام کر رہا ہے۔ اس کا اپنا مجلہ شائع ہوتا ہے اور اس کی طرف سے بزرگ اور معاشی طور پر نا استوار مصنفوں اور شاعروں کو ماہانہ وظائف دئے جاتے ہیں۔ اسی ادارہ کی طرف سے پاکستانی غزل شعرا اور مصنفوں پر دو معلوماتی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ پروفیسر شاہد نے "مقتدرہ قومی زبان" کی سرگرمیوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس ادارہ نے اردو اصطلاحات سازی پر اہم کام انجام دئے ہیں۔ ترقیٔ اُردو بورڈ آکسفورڈ ڈکشنری کی طرز پر "اُردو لغت" مرتب کر رہا ہے۔ جس کا کام پچھلے (۱۷) برس سے جاری ہے۔ یہ لغت (۱۴) جلدوں پر مشتمل ہوگی اور تا حال اس کی (۶) جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی صدارت میں یہ ادارہ اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ پروفیسر شاہد نے اپنے ادارہ ایوانِ اُردو کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ کسی سرکاری اعانت کے بغیر اس ادارہ نے (۹) کتابیں شائع کی ہیں، اور ڈسمبر ۱۹۶۲ء سے ماہنامہ "سب رس" کی اشاعت ہو رہی ہے۔ سب رس نے زور نمبر، اقبال نمبر (دو حصے) اور یادِ رفتگاں (دو حصے) ایسے اہم خصوصی اشاعتوں کے ذریعہ ہند و پاک اور دکن کے علمی اور ادبی حلقوں کو قریب لانے میں

متعدد جبر کی انجام دہی ہے ۔ حیدرآبادی اہل قلم حضرات میں حضرت امجد، سفیر صوفی اور صاحب حیدرآبادی کی کتابیں بھی ایوان اردو پاکستان نے شائع کی ہیں ۔ ایوان اردو کے میوزیم اور کتب خانہ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر شاہد نے کہا کہ انکی میوزیم گوشۂ حیدرآباد کے سبب خاص اہمیت کا حامل بن گیا ہے ۔ نایاب اور نادر کتابوں نے کتب خانہ کو جامعاتی اسکالروں کی توجہات کا مرکز بنا دیا ہے ۔ حضرت اعجاز حسین کھٹا نے اس موقع پر اپنا کلام سنایا ۔ مجھے اور پرانے دور کے "تناظر میں لکھی گئی نظم "میرا وطن" کے علاوہ بہادر یار جنگ پر اثر انگیز نظم سنے شرکائے اجلاس کو متاثر کیا ۔ دکھنی لہجے کی روانی اور کلاسیکی دکھنی تشبیہات اور استعاروں کے سبب حضرت کھٹا نے مدت کے بعد دکھنیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو مالا مال کیا ۔

مسز اختر حسن، ڈاکٹر یوسف کمال، سری نواس لاہوٹی، وقار خلیل، یوسف اعظمی اور شفیق اورنگ نیر نے مختلف سوالات کئے اور جناب شاہد نے ہر سوال کا خوش اسلوبی سے جواب دیا ۔ ابتداً سکریٹری حیدرآباد لٹریری سرکل جناب غیاث متین نے مہمان حضرات کا خیر مقدم کیا ۔ صدر حلقہ پروفیسر ڈاکٹر مغنی تبسم نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے حلقہ کی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا ۔ اور کہا کہ یہ تنظیم کسی نظریہ کی پاسدار نہیں بلکہ جمہوری نوعیت کی ہے جہاں نئے ذہن کی تخلیقات پر تعمیری انداز میں تنقید ہوتی ہے ۔ پروفیسر تبسم نے مہمانوں کی حلقہ کے اجلاس میں شرکت اور مخاطبت پر اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شاہد کی شخصیت پاکستان میں حیدرآباد کے سفیر کی سی ہے ۔ جنھوں نے وہاں متوازی خطوط پر ایوانِ اردو اور سب رس کی بنا ڈالی ۔ اور آج تک بھی اسے نہایت کامیابی اور جانفشانی سے چلا رہے ہیں ۔ جناب کھٹا کی شاعری کے متعلق پروفیسر تبسم نے کہا کہ جب دکن سے دکنی زبان مٹ چکی تھی اور صرف ایک بول کی شکل میں باقی تھی اس زمانہ میں نذیر دہقانی اور کھٹا صاحب نے سماجی اور سیاسی مسائل کے اظہار کے لئے اس کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ۔ آج بھی علمی اور ادبی رنگ میں دکنی زبان ان کے ہاں مستعمل ہے ۔

ایلڈرس کونسل آف انڈیا کے اراکین ہر ماہ کے پہلے اتوار کو "دعوت شیراز" پر جمع ہوتے ہیں اپنے لائے ہوئے ناشتوں میں ایک دوسرے کو شریک کرتے ہوئے آپسی تبادلۂ خیال کی یہ تہذیبی

پروفیسر شاہد اور جناب کھشا کو اس دعوت شیراز پر مدعو کرکے ایلائنس
کونسل نے اپنی نشست کو تاریخ ساز ہو گیا ۔ اس منفرد اور بے پناہ خلوص و محبت کی بزم میں
ہر دو پاکستانی ادیب و شاعر کھو گئے ۔ مسٹر جیلانی پیراک بانی سکریٹری ایلائنس کونسل نے اسی شب
لے پیا کلب میں منعقدہ ایک غیر رسمی تہذیبی نشست میں اپنے خیر مقدمی خطاب میں پروفیسر شاہد کی
اردو خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا اُردو کے اس امام نے ایوان اُردو سب رس کے نام سے جو شمع
تاریکیوں میں روشن کی تھی وہ آج تاج کے روپ میں سربلند ہے ۔ اور جب بھی اُردو کا کوئی امام
کہیں سے آجاتا ہے تو اس کا طواف کئے بغیر نہیں لوٹتا ۔ مسٹر پیراک نے جناب کھشا کو دکھنی زبان
کا کہنہ مشق بلند پایہ شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ ماضی میں اس منفرد طنز و مزاح کے شاعر نے
سیکڑوں دلوں پر اپنی آواز کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جس پر دکھنی زبان و ادب کی گہری
بنیاد رکھی ہے ۔ مسٹر پیراک نے مزید کہا کہ ہندوستانی ذہن کے تابع یہاں ورلڈ ریلیٹنس کونسل
کو آئینی موقف دیا گیا تاکہ دنیا کے عظیم مفکرین ادیب اکابر وغیرہ مشترکہ پلیٹ فارم پر متحد ہو کر
تیزی سے پھیلتی ہوئی موجودہ بربریت کو انسانیت کی بقا کے لئے روکیں ۔

پروفیسر شاہد نے اپنی جوابی تقریر میں ایلائنس کونسل آف انڈیا کو جدید تقاضوں کے تحت نمونہ
کا ایک متحدہ مرکز قرار دیتے ہوئے جیلانی پیراک کی قومی و بین قومی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا
جناب کھشا نے ماضی اور حال کے تقاضوں کے درمیان اپنے مخصوص اور انوکھے انداز میں اپنا کلام سنا
انہوں نے "میرا لڑکا" "میرا وطن" اور "سلطان العلوم" سنا کر محفل کو لوٹ لیا ۔ جناب حمایت
نے اپنی دکنی صلاحیت کا معیار پیش کرتے ہوئے زبردست داد تحسین حاصل کی ۔ جناب محمد سلیمان
(بھوئی) کے مزاحیہ خاکے محفل میں مزید زندگی کا سبب بنے ۔

۵ دسمبر کو ڈراگن اسکول آف بانڈو کرائے دبے نگر کالونی میں جناب شاہ علی اور الیس اے تا
نے پروفیسر شاہد کا استقبال کیا ۔ جناب شاہد نے طلباء کو نیک شہری بننے کی تلقین کی اور ممتاز
فن کار جناب حمایت اللہ نے اپنے مخصوص انداز میں مزاحیہ خاکے پیش کئے ۔

۶ دسمبر کو پروفیسر شاہد اور جناب کھشا اور جنرل ریڈنگ روم و لائبریری سیتا رام پیٹھ

میں خیر مقدم کیا گیا ۔ جناب بھوج ریڈی سروز نشین لائبریری انچارج نے صدارت کی ۔ اور قومی یک جہتی پر منعقدہ مقابلہ مضمون نویسی کے کامیاب مضمون نگاروں میں انعامات تقسیم کئے ۔ جناب عبدالحمید صاحب مولف ناظم لائبریری ڈیپارٹمنٹ نے لائبریری سروس کے بارے میں خطاب کیا ۔ اور سپرنٹنڈنٹ جناب پرتاپ کشور نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ جناب کاکا تی نے حاضرین میں بچوں کی زیادہ تعداد کے مد نظر بچوں کی نظمیں سنائیں ۔ جناب شاہد نے مطالعہ کی اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے لائبریری کی افادیت کو واضح کیا اور مطالعہ کی عادت استوار کرنے پر زور دیا ۔

۸ر ڈسمبر کو فائن آرٹس اکاڈیمی اور زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام دربار ہال ڈیفنس کالونی کوٹھی میں منعقدہ تقریب میں پروفیسر شاہد نے کہا کہ وہ کراچی میں ایک مزاح کانفرنس منعقد کرکے اس میں حیدرآباد کے مزاح نگاروں کو مدعو کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ حیدرآبادی عوام کے خلوص و محبت کا پروفیسر شاہد نے تہ دل سے شکریہ ادا کیا ۔ ادبی اجلاس میں جناب مسیح انجم، ڈاکٹر عابد معز، ڈاکٹر حبیب ضیاء اور جناب رشید قریشی نے اپنے مضامین پڑھے اور محفل کو زعفران زار بنادیا ۔ ادبی اجلاس کے بعد مشاعرہ میں جناب اعجاز نے نظمیں سنا کر کافی داد پائی موصوف کے علاوہ مسرز رؤف رحیم، معین بمبو، بوگس حیدرآبادی، اسماعیل ظریف، رشید مسیح جلیل، مصطفیٰ علی بیگ، اقبال ہاشمی، طالب خوندمیری، حفیظ خاں مذاق اور حمایت اللہ نے کلام سنایا ۔

۹ر ڈسمبر ۸۵ء کو انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اردو ہال میں منعقدہ خیر مقدمی جلسہ سے پروفیسر شاہد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں سرکاری زبان کی حیثیت سے اُردو کے نفاذ کی وہی رفتار ہے جو ہندوستان میں ہندی کے نفاذ کی رفتار ہے ۔ جس طرح ریاست حیدرآباد میں اُردو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج رہی پاکستان میں اُردو نے ابھی وہ مقام حاصل نہیں کیا ۔ وہاں اُردو کے نفاذ کا کام ابتدائی مراحل میں ہے ۔ گو صدر ضیاء الحق کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے اُردو کے نفاذ کا کام کسی حد تک زور پکڑا ہے ، اور اب محکمہ لائف انشورنس ڈاکخانوں

اور بینکوں میں فارسی وغیرہ اُردو زبان میں فراہم کیے جارہے ہیں ۔ سندھی، پشتو اور پنجابی وغیرہ کی بھی ہمت افزائی کی جارہی ہے لیکن سرکاری زبان کی حیثیت اردو کے نفاذ پر کسی کو اعتراض نہیں ہے ۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے دار الترجمہ میں اصطلاح سازی کا جو کام ہوا اس پر بھی نے کہا کہ بالکل جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ کا کام ہے ۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جامعہ عثمانیہ کے اصطلاحات کے کام کو ہی آگے بڑھا کر اس میں اضافہ کیا جاتا ۔ لیکن معلوم نہیں کیوں پاکستان نے از سر نو ترجمہ کا کام کیا ۔ پروفیسر شاہد نے بتایا کہ انہوں نے پاکستان میں ایسا کتب خانہ قائم کیا ہے جہاں صرف حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے شعر و ادب کے تقریباً ۵ تا ۶ ہزار کتب جمع کئے ہیں ۔
ابتداء میں جناب سری نواس لاہوٹی سکریٹری انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے انجمن کی جملہ سرگرمیوں اور اس کے زیر اہتمام چلنے والے اداروں پر تفصیلی روشنی ڈالی ۔

دفتر نہج البلاغہ سوسائٹی میں پروفیسر شاہد اور ڈاکٹر سید رشید الحسن سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کا جناب حمایت اللہ اور ڈاکٹر رشید موسوی کے ساتھ سوسائٹی کے صدر آغا تحسین ضابط نائب صدر جناب حاجی مصطفیٰ حسین، جنرل سکریٹری سید بدر الحسن زیدی اور سکریٹری جناب سید کرار حسین کاظمی نے خیر مقدم کیا اور انھیں نہج البلاغہ فیلو شپ کے قیام اور ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں میں فیلو شپ کے قیام کی کوششوں سے واقف کرایا ۔ انہوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے اسکالرس کے لئے سوسائٹی کی طرف سے قائم کردہ ریسرچ سنٹر لائبریری میں آٹھ زبانوں میں موجود کتابوں کا معائنہ بھی کیا ۔ شاہد صاحب نے نہج البلاغہ کے تین سو سالہ قدیم نسخہ کو بے مثل اور نوادرات سے قرار دیا ۔ سوسائٹی کی جانب سے سوسائٹی کی بارہ مطبوعات بھی انھیں پیش کی گئیں ۔

۱۰ دسمبر کو ایوانِ اُردو میں پروفیسر شاہد اور جناب کہتا کے خیر مقدم میں جناب شاہد نے کہا کہ حیدر آباد دکن کی محبت ضرب المثل ہے ۔ اور انھیں بڑی خوشی ہے کہ یہ محبت برسہا برس بعد آج بھی قائم ہے ۔ ایوانِ اُردو میں انہیں یاد فرما کر جو عزت افزائی کی گئی ہے وہ ان کے لئے بڑی فخر کی بات ہے ۔ بانی ایوانِ اُردو ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش

ـتے ہوئے کہا کہ آج مجھے جو شہرت ملی وہ میرے استاد محترم کی شفقت و محبت کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر زور
مجھے منظوم سے گہر آب دار بنا دیا۔ حیدر آباد کی محبت میں پاکستان میں میں نے ۱۹۶۶ء میں
ـوانِ اُردو قائم کیا۔ یہ خیال مجھے اس طرح آیا کہ بہت عرصہ پہلے پروفیسر ہارون خاں شروانی
ـدم کراچی آئے تھے۔ انہوں نے ایک نجی محفل میں مجھ سے کہا تھا کہ جب عربوں نے اسپین میں
ـومت قائم کی تو وہاں کھجور کے درخت لگائے تاکہ وطن کی یاد تازہ رہے اور مجھے مشورہ دیا کہ
ـدر آباد دکن کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اپنے مکان کا نام "ایوانِ اُردو" رکھوں۔ چنانچہ مجھے
ـن کی یہ تجویز بے حد پسند آئی پھر میں نے وہاں "سب رس" کے نام سے پرچہ نکالا۔ جناب
ـن راج سکسینہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ محترمہ طیبہ بیگم، جناب عبدالوہاب، پروفیسر محمود حسین
ـر جناب رشید قریشی نے پروفیسر شاہد کی شخصیت پر مضامین پڑھے۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید
منظوم نذرانہ پیش کیا۔ جناب حامد علی عباسی نے دونوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ دکنی زبان میں
ـیق کی ضرورت ہے اور دکنی ادب، دکنی زبان، دکنی بولی، دکنی لہجہ پر ریسرچ کا کام ہوگا۔
ـمیں جناب منظور احمد نے شکریہ ادا کیا۔

اسی دن شام میں نظام ٹرسٹ اردو لائبریری میں خیر مقدم کرتے ہوئے جناب عبدالمحمود صاحب
ـکریٹری لائبریری نے دونوں پاکستانی مہمانوں کی ادبی خدمات کو سراہا۔ سکریٹری حلقہ احباب ذوق
ـب منظور احمد نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔ اس موقع پر منعقدہ محفل شعر میں پروفیسر شاہد نے اپنا
ـم سنا کر دادِ تحسین حاصل کی اور جناب کھنڈ سے سامعین نے اصرار کر کے کئی نظمیں سنیں۔ ان کے
ـعلاوہ جناب حمایت اللہ، طالب خوندمیری، رشید سمیع جلیل، ان پرشد جونگیری، اقبال ہاشمی،
ـرؤف رحیم نے بھی کلام سنایا۔ پروفیسر شاہد نے نظام ٹرسٹ اُردو لائبریری میں کتب کے ذخیرہ
ـکی ترتیب اور حسنِ سلیقہ کی زبردست ستائش کی۔ موصوف نے بتایا کہ انھوں نے خود بھی
ـچی میں ایوانِ اردو میں ایک لائبریری قائم کی ہے۔ وہ بخوبی واقف ہیں کہ کسی کتب خانے کی
ـنظیم و ترتیب میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ نظام ٹرسٹ لائبریری کی خصوصیت یہ
ـہ کہ اس میں تمام مقامی اخبارات اور رسالوں کی جو جلدیں تیار کی جارہی ہیں وہ بے حد قیمتی

ہوئے ہیں ۔ یہ لائبریری اپنی مثال آپ ہے ۔

۱۱ر دسمبر کو اقبال اکیڈمی میں پاکستانی مہمانوں کی استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی ۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی صدر اکیڈمی کی خیرمقدمی تقریر کے بعد محمد ظہیر الدین احمد نائب صدر اور خواجہ نامر الدین شریک معتمد نے مہمانوں کی خدمات کو سراہا ۔

۱۱ر دسمبر کو شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے آرٹس کالج میں پاکستانی مہمانوں کا خیرمقدم کیا گیا ۔ پروفیسر شاہد نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ سال تک اکیڈیمک کونسل عثمانیہ یونیورسٹی کے ممبر رہے ۔ پرانی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کمرہ نمبر ۱۴۰ جہاں پر خیرمقدمی جلسہ ہوا تھا، اسی کمرہ میں وہ بحیثیت لیکچرار درس دیا کرتے تھے ۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد وہ ترقی اردو بورڈ سے وابستہ ہو گئے اور (۱۷) سال تک لغت کی ترتیب کا کام انجام دیتے رہے جس کی اب تک (۷) جلد شائع ہو چکی ہیں ۔ ۱۹۵۸ء میں ترقی اردو بورڈ سے علحدہ ہو گئے اور ایوانِ اردو کی داغ بیل ڈالی ۔ ایوانِ اردو کے کتب خانے کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر شاہد نے کہا کہ اس کتب خانے میں سب سے زیادہ کتابیں جمع کی گئی ہیں ۔ پاکستان کے کسی بھی کتب خانہ میں اتنی تعداد میں کتابیں نہیں ہیں ان کتابوں سے ریسرچ اسکالرس اور طلباء استفادہ کر رہے ہیں ۔ ایوانِ اردو کے زیر اہتمام اب تک (۱۲) کتابیں شائع کی جا چکی ہیں ۔ انہوں نے خیرمقدمی تقریب کے لئے شعبۂ اردو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ صدر شعبۂ اردو پروفیسر سیدہ جعفر کو پاکستان میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی تصانیف کی قدر و منزلت کی جاتی ہے ۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے پروفیسر شاہد کی علمی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ چادر گھاٹ کالج میں اردو کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور ڈاکٹر زور سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں میں پروفیسر شاہد کا نام قابلِ ذکر ہے ۔ وہ خود ڈاکٹر زور کی شاگرد رہ چکی ہیں، اس لحاظ سے پروفیسر شاہد ان کے برادر طریقت ہوتے ہیں ۔ جناب کنشا کو دکن کی تہذیب کا حصہ قرار دیتے ہوئے موصوفہ نے کہا کہ جناب کنشا نے حساس اور باشعور فرد کی حیثیت سے زندگی میں پیدا ہونے والے عدم توازن اور بے اعتدالی کو شدت کے ساتھ محسوس کر کے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام تک پہنچایا ۔۔۔ پروفیسر مغنی تبسم نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے بتایا کہ پروفیسر شاہد جو شاہد

یونیورسٹی میں اردو کے بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن تھے ۔ ادارہ ادبیات اردو کے معتمد بھی رہے ہیں ۔ ان کا تحقیقی کارنامہ "اردو میں سائنسی ادب" ہے ۔ اس موقع پر کرم خان نے جناب کمتا پر دکنی لب و لہجہ میں نظم سنائی ۔ جناب طالب خوندمیری نے نظمیں سنائیں ۔ جناب کمتا پرشاد کا کلام بار بار سنایا جسے خوب سراہا گیا ۔ پروفیسر یوسف سرمست کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام کو پہنچی ۔

۱۲ دسمبر کو کالج آف لنگویجس میں ان مہمانوں کی ایک غیر رسمی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب ہاشم حسن سجاد پرنسپل نے کی ۔ پروفیسر شاہد نے پاکستان میں اردو کی ترقی کے زیر عنوان اپنے تاثرات بیان کئے ۔ ایوان اردو اور رسالہ سب رس پاکستان کا بھی خصوصی تذکرہ کیا ۔

۱۵ دسمبر کو اردو گھر کے زیر اہتمام پاکستانی مہمانوں کے استقبال میں جناب منوہر راج سکسینہ مینیجنگ ٹرسٹی نے تقریر کرتے ہوئے اردو گھر کے خاکے اور تعمیر میں جناب احمد علی خاں اور جناب عابد علی خاں کے رول کا تذکرہ کیا ۔ اور اردو گھر کی ہمہ وقتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ۔ انہوں نے کہا کہ شاہد صاحب کراچی میں حیدرآبادی ماحول کے لئے بے مثال کام کر رہے ہیں ۔ زبان کا رشتہ ان میں اور ہم میں مشترک ہے جس میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے کہا اپنے ہی گھر آنے والوں کو مہمان کہنے میں ذہنی کشمکش محسوس ہوتی ہے مگر ملکوں کی سیاسی تقسیم ممکن ہے محبت بھرے دلوں اور قلم کاروں کے احساس مشترک کی تقسیم کسی سے ممکن نہیں ۔ ڈاکٹر زور کا تذکرہ کرتے ہوئے ایڈیٹر سیاست نے کہا اردو کی خدمت پاکستانی اور ہندوستانی شہریت سے ماورا ہے اس لئے کوئی ڈاکٹر زور کے خواب کی تعبیر کے لئے ہندوستان میں کام کر رہا ہے تو کوئی کہیں اور ۔ دکنی زبان کو اعلیٰ مقام و مرتبہ دینے کے سلسلے میں دکنی زبان کے شعراء اعجاز حسین کھٹا، علی صاحب میاں اور نذیر دہقانی کی خدمات کو بھی انہوں نے سراہا ۔ جناب غیاث متین نے "گلاب جیسا معطر حیدرآباد" حمید الدین شاہد کے زیر عنوان ایک مضمون سنایا ۔ جناب سید اکبر شاہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شاہد صاحب (۲۱) سال بعد اور کمتا صاحب (۳۵) سال بعد حیدرآباد آئے ہیں ۔ اس مدت میں خونی رشتہ داروں کی پہچان مشکل ہوتی ہے مگر یہاں ادبی رشتے

لیے الوٹ ہیں کہ ان پاکستانی مہمانوں کی حیدرآباد میں ہر جگہ پذیرائی ہو رہی ہے۔ انہوں نے کھٹا
صاحب کی ستائش کرتے ہوئے طنز و مزاح کے قلم کاروں کو دکنی کلچر کے وقار اور اعتبار کو چھوتے
مشورہ دیا۔ حمید الدین شاہد کی اردو خدمات کی ستائش کرتے ہوئے انہوں نے اس توقع کا اظہار
کیا کہ پاکستانی اور ہندوستانی قلم کاروں کی ایک دوسرے کے ملک میں آمد و رفت سے ہندپاک
دوستی الوٹ ہوگی ۔ جناب شاہد نے حیدرآبادیوں بالخصوص اردو دوستوں کے جذبۂ محبت پر اظہار
تشکر کیا ۔ اور بتایا کہ وہ (۲۱) برس سے پاکستان میں مقیم ہیں اور زندگی کا سفر حیدرآباد کی یادوں
کو دل میں بسائے طے کر رہے ہیں ۔ ڈاکٹر زور کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ
وہ جو کچھ بھی ہیں وہ زور صاحب کا فیض ہے کہ ایک لگن کے ساتھ اردو کی حتی المقدور خدمت
جاری ہے ۔ اور حیدرآباد کی تہذیب اور ثقافت کو متعارف کروانے کا کام جاری ہے ۔ اردو
گھر کے بارے میں کہا کہ اردو گھر حیدرآباد دیکھ کر مسرت سے زیادہ حیرت اور حیرت سے زیادہ
سے مسرت ہوئی ۔ کیونکہ اردو گھر نہ صرف تہذیبی، علمی اور ادبی اجتماعات کے لئے مثالی جگہ ہے بلکہ
علم و تہذیب اور شعر و ادب کی ایک دانش گاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے ۔

ادارہ قلم اور آواز کی جانب سے محترمہ طیبہ بیگم نے اپنی قیام گاہ "گہوارا" بنجارہ ہلز پر پاکستانی
مہمانوں کے خیر مقدم کا اہتمام کیا ۔ ابتدا میں موصوفہ نے مہمانوں کے تعارف میں ان کے کارناموں کا
تذکرہ کیا ۔ احمد جلیس پروگرام ایکزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے پروفیسر شاہد کو بحیثیت استاد
خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا شاہد صاحب کی علمیت اور مہذب شخصیت نے شائقین کی ایک پوری
نسل کی ذہنی تربیت کی ہے ۔ اس موقع پر ایک مزاحیہ محفل شعر بھی ترتیب دی گئی تھی ۔ جس میں
رؤف رحیم، بوکس حیدرآبادی، مصطفیٰ علی بیگ، حمایت اللہ اور طالب خوندمیری کے علاوہ جناب کھٹا
نے بھی محفل کو زعفران زار بنا دیا ۔ سامعین کے اصرار پر جناب شاہد نے بھی اپنی غزل سنا کر سامعین
سے داد و تحسین حاصل کی ۔ نیز جناب کھٹا نے اپنا مزاحیہ پروگرام " استاد کی باتیں " پیش کیا جو
وہ (۲۵) سال قبل ریڈیو سے پیش کرتے تھے ۔ اس پروگرام میں حمایت اللہ اور احمد جلیس نے
ان کے معاونین کا رول ادا کیا ۔ اس مخصوص اجتماع میں پروفیسر شاہد نے یہ تجویز رکھی کہ ہندوستان

اہم اصناف ہے شاعروں اور ادیبوں کو ایک ایسی مشترکہ ادبی تنظیم پیدا ہو جائے گی جس کے ذریعے مختلف
علاقوں میں زبان اور ادب کے اشاعتی اور تحقیقاتی کاموں سے مسلسل رابطہ قائم کیا جا سکے۔
اور جس کے وفود تہذیبی و مطالعاتی دوروں کے ذریعہ ادب کو پروان چڑھا سکیں۔

۱۹ دسمبر کو انڈو فرینڈ شپ اکیڈمی (اکفا) کے زیر اہتمام آندھرا پردیش یونیفیڈ جرنلسٹس
اسوسی ایشن اور اے پی ینگ جرنلسٹس اسوسی ایشن کی جانب سے پاکستانی مہمانوں کے اعزاز میں
دفتر کمرشیل ٹیکس سرکس موقوعہ مرزیہ لاج نامپلی پر ایک تہنیتی تقریب منعقد ہوئی۔ جناب
ایم۔ باگا ریڈی قائد حزب الاختلاف ریاستی اسمبلی نے پاکستانی مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ
میں آپ کو غیر حیدرآبادی تو نہیں کہہ سکتا البتہ حیدرآبادی حال مقیم پاکستان ضرور کہوں گا۔
انہوں نے ملک کی تقسیم کو مصنوعی قرار دیتے ہوئے کہا کہ ملک کی تقسیم سے خونی رشتے یا دلوں کے
رشتے ٹوٹ نہیں سکتے۔ زبان، تہذیب اور دلوں کو تقسیم کرنے کی بات کرنا احمق پن ہی ہوگا۔
انہوں نے فارسی کی رباعی پڑھی:

من تو شدم، تو من شدی   من تن شدم، تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں   من دیگرم، تو دیگری

مسٹر باگا ریڈی نے مزید کہا کہ اردو زبان ہندوستانی قوم اور ملک کا ورثہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ
پاکستان میں اردو کی حیثیت کیا ہے لیکن اس زبان کو ختم کرنے کی باتیں کرنے والا پاگل ہی ہو سکتا
ہے۔ چونکہ یہ ہماری تہذیب اور ملک کا ورثہ ہے اس کے ختم کرنے سے ملک کا نقصان ہی ہوگا۔
مسٹر باگا ریڈی نے کہا کہ ہندوستان میں مختلف زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں جن کی ترویج
اور بقا کی دستور ہند میں ضمانت دی گئی ہے یہ اور بات ہے کہ بعض تنگ نظر اور تاریخ اور تہذیب
سے نابلد لوگ احمقانہ بات کرتے ہیں۔ پاکستانی شعراء کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہوں نے
کہا کہ شاعر کی نظر سورج کی کرن سے زیادہ دور رس ہوا کرتی ہے۔ سید ضمیر شاہ نے نہایت ہی
موثر انداز میں اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ اس تقریب کی افادیت اسی لئے کہ دانشوروں
اور سیاسی قائدین کی شرکت کی وجہ سے نمایاں ہوگئی ہے۔ جس کی یاد ہمیشہ ان کے دلوں میں باقی رہے گی

لیتی رہےگی ۔ پروفیسر شاہد نے کہا کہ اس تقریب میں نہ صرف ریاست آندھرا پردیش بلکہ ملک کی اس ممتاز شخصیت کی تقریر اور خیالات کو جاننے کا موقع ملا جن کے متعلق نہ جانتے تھے کہ اردو کی شمع جلائے ہندوستان میں پھر رہے ہیں ۔ انہوں نے مزید کہا کہ دونوں ممالک کے ادبا و تہذیبی وفود کے تبادلوں کے علاوہ ادیبوں و شاعروں کی آمد و رفت سے دونوں ملکوں کے بچھڑے ہوئے عوام ایک جان دو قالب ہو سکتے ہیں ۔ ابتداء میں مسٹر انور ادیب ایڈیٹر گولڈن نیوز سروس نے خیر مقدمی تقریر کی ۔ ینگ جرنلسٹس کے صدر تلگو کے جرنلسٹ مسٹر سکھی جی نے مہمانوں کی گل پوشی کی ۔ نادی لیبرس انڈسٹری کے صدر مسٹر ماہر گوڑ نے اپنی تقریر میں مہمانوں سے کہا کہ وہ تلگو دیش کے لوگوں کے خیر سگالی کا پیام پاکستانی بھائیوں کو پہنچائیں ۔ مسٹر محمد جعفر بے اینڈ بے ڈرامہ سوسائٹی کے آرگنائزنگ سکریٹری نے بھی مہمانوں کی گلپوشی کی ۔ مسٹر کے گنگارام صدر استقبالیہ نے شکریہ ادا کیا ۔

ابھی ان خیر مقدمی تقریبوں کا سلسلہ جاری ہے ۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ ان پاکستانی مہمانوں کو ایک سے زاید جگہ تہنیتی تقریب میں شرکت نہ کرنی پڑے ۔ خلوص و محبت کا یہ اظہار ان مہمانوں کے لئے صرف اس لئے ہے کہ یہ انسانیت دوست ہیں اور اردو کے خدمت گار ۔ یہی ان کی کشش کا راز ہے اور ان کی قوت کا خزانہ ۔

صفحہ (۶) سے آگے

نہیں ہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو ۱۹۱۸ء میں ایک دیسی ریاست میں مادری زبان کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنانے کے تاریخ ساز کام کا آغاز کیا جاتا ۔ اس وقت کی مشکلات کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ تقسیم ہند کے ۳۸ سال بعد بھی آج تک نہ تو ہندوستان میں کوئی ہندی یونیورسٹی قائم ہو سکی اور نہ ہی پاکستان میں اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آسکا ۔

دنیا میں بڑے کاموں کی ابتدا خیالات سے ہوتی ہے اگر اس تحریک کو جو نو جوانان کی گئی ہے عوام کے ذہنوں میں اتارا جائے اور سیاسی اختلافات دور کر کے اس کو آگے بڑھایا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک معقول بات کو قبول نہ کیا جائے

اگر آج کی اس مبارک تقریب میں خیر سگالی کے ... [illegible]

محمد منظور احمد

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد سے ملاقات

چند روز پیشتر، محترم ڈاکٹر رشید موسوی اور جناب حمایت اللہ کے دولت خانے پر، ایک ملاقات کے دوران، پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد نے، میری درخواست پر انٹرویو کے لئے ایک تاریخ مقرر کی۔ طے شدہ پروگرام کے تحت میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مسکراتے ہوئے انھوں نے مصافحہ کیا۔ شاہد صاحب سے اکیس سال کے بعد تفصیلی ملاقات ہو رہی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں حیدرآباد کے ایک مدرسہ گورنمنٹ ہائی اسکول چوک کے طلباء کی ادبی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں، میں نے اس مدرسہ کے رسالہ "نورس" کے لئے بعض دیگر قلمکاروں کے علاوہ شاہد صاحب سے بھی ایک ادبی مضمون حاصل کیا تھا۔ جناب شاہد صاحب نے ایک مرتبہ اسی مدرسہ کے ہال میں مشاعرہ کی صدارت فرمائی تھی جس میں حیدرآباد کے بعض ممتاز اور مقبول شاعروں نے حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا تھا۔ اس مشاعرے میں شاہد صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ طلباء اُن کی منکسر المزاجی، خندہ پیشانی سے ہر ایک سے ملاقات کرنے اور نرم لہجے میں گفتگو کرنے کے انداز سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔

میں جناب حمایت اللہ کے نہایت سلیقے سے سجائے ہوئے صاف ستھرے خوب صورت مہمان خانے میں پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کے روبرو بیٹھا ہوا تھا لیکن چند لمحوں تک میرے دل میں کئی سال پیشتر کی بعض خوشگوار یادیں، ابھر رہی تھیں۔ رسالہ "نورس" کے غزل نمبر (اپریل [illegible]) کے لئے شاہد صاحب نے قلمی تعاون فرماتے ہوئے دکن کے غزل گو شعراء کے اس خصوصی شمارے کے لئے (۱۲) شاعروں کے سوانحی خاکے مرحمت فرمائے تھے۔ میری نگاہوں کے آگے اس غزل نمبر میں شامل شعراء کی فہرست آگئی، ڈاکٹر احمد حسین مائل، حضرت امجد، حضرت سید علی منظور،

القیوم خاں باقی، میکش، رائے منوہر لال شارب، سورڈنڈا، خیرات ندیم، شمس الدین تاباں، ابن احمد تاب، قمر ساحری اور وحید نگلاڈوی — ان سب شعرا کے مختصر سوانحی خاکے جناب شاہد نے تحریر فرمائے تھے۔ خاکوں کے ساتھ غزلوں کے چند منتخب اشعار بھی تھے۔

شاہد صاحب سے گفتگو کا سلسلہ جاری تھا لیکن اس گفتگو کے ساتھ ساتھ (۲۸) سال پیشتر کے خواجہ حمید الدین شاہد لیکچرار اُردو چادرگھاٹ کالج (حیدرآباد) سے میری ملاقاتوں کی یادوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

واقعی منزلیں گرد کی مانند اُڑتی جارہی تھیں۔ قدیم کتاب زندگی کے ورق بڑی تیزی سے اُلٹ رہا تھا۔ میں نے شاہد صاحب کو یاد دلایا کہ اُردو ہال، حمایت نگر میں آپ نے ایک مرتبہ اُردو مجلس کے اجلاس کو بھی مخاطب فرمایا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد کے بانی اور محقق ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے فرمائی تھی۔ جناب نثار احمد فاروقی (دہلی) نے بھی اس اجلاس میں اپنا مضمون پڑھا تھا۔

جیسے ہی میں نے زورؔ صاحب کا نام لیا، جناب شاہد کی آنکھیں مسرت اور غم کے ملے جلے جذبات کا آئینہ ہوگئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد ضبط سے کام لے رہے تھے لیکن اس کے باوجود اُن کی پلکوں پر نمی آہی گئی۔

والہانہ وابستگی، بے پناہ خلوص، سمندر جیسی گہری محبت کے کرشمے کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ جناب شاہد خاموش تھے ——— جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ۔ جناب شاہد کے بے حد مصروف پروگرام کے پیش نظر مجھے چند لمحات بھی بہت قیمتی معلوم ہو رہے تھے اس لئے میں نے سکوت کے توڑنے کیلئے گفتگو کے سلسلے کو عمداً ان کی شاعری کی طرف موڑ دیا۔ میں نے دریافت کیا کہ شاہد صاحب! آپ نے شاعری کب اور کیوں شروع کی۔ جناب شاہد نے بڑی روانی کے ساتھ اور مضبوط لہجہ میں کہا کہ میں نے میٹرک کی طالب علمی کے زمانے میں شعر کہنا شروع کیا۔ طبیعت خود بخود شعر گوئی کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ ادبی اور شعری ذوق، بچپن ہی سے مجھے قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ آپ نے کہا کہ مجھے یاد ہے کہ میں نے سب سے پہلے نعتیہ اشعار کہے تھے۔ طالب علمی کے اس دور میں کہی ہوئی نعت کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے:۔

تیرا مرتبہ کوئی کیا جانتا ہے   خدا ہی ترا مرتبہ جانتا ہے

نثر نگاری کی ابتدا کے بارے میں جناب شاہد نے کہا کہ انٹر میڈیٹ کی طالب علمی کے دوران میں نے اپنا پہلا مضمون حضرت امجد حیدرآبادی کے بارے میں لکھا تھا۔ اپنی پہلی تصنیف کے بارے میں شاہد صاحب نے کہا کہ "سرگزشت ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد)" میری پہلی تصنیف ہے۔ تذکرے میں، جناب شاہد، ڈاکٹر زور کا نام بے حد احترام اور محبت کے ساتھ، بار بار لے رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے شائع شدہ مرقع سخن (جلد اول) کے لئے مجھ سے بھی مضامین لکھوائے تھے۔ میں زور صاحب کی خوش دلی اور دل نوازی کو بھول نہیں سکتا۔ وہ [illegible] ہماری زبانِ اردو کے قافلے کے اس باوقار قائد، رہنما اور خدمتگزارِ ادب (ڈاکٹر زور) کا خیال آتا ہے تو میں تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ بالکل ایسا ہی، جیسے ان کے سامنے جاتے ہی" اردو اور اس کی مسلسل خدمت کے خیال سے، میں اپنے ہر کام، اپنی ہر بات اور اپنی ہر خواہش کو بھول جاتا تھا۔

اصناف نظم و نثر سے اپنی دلچسپی کے بارے میں جناب شاہد نے کہا، اصنافِ نظم میں مجھے غزل پسند ہے۔ کلاسیکی شعراء میں میر، غالب، ولی اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی بے حد پسند ہیں۔ بعد کے شعراء میں فانی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، صفی اورنگ آبادی، علی منظور، وجد اور مخدوم۔ اور رباعی گو شاعروں میں امجد حیدرآبادی میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ اپنے پسندیدہ نثر نگاروں میں جناب شاہد نے خواجہ حسن نظامی اور علامہ راشد الخیری کے نام لئے۔ طنز و مزاح میں جناب شاہد کو ڈاکٹر شفیق الرحمٰن اور شاہد احمد دہلوی پسند ہیں۔ پسندیدہ نقاد کے بارے میں میرے سوال پر شاہد صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر زور، عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی نگارشات کو میں شوق سے پڑھتا ہوں۔

افسانوں اور ناولوں کے مطالعہ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جمیلہ ہاشمی، ابوالفضل صدیقی اور تقی حسن خسرو میرے پسندیدہ مصنف ہیں۔ آپ نے کہا کہ "دکنی ادب سے دلچسپی ڈاکٹر زور کا فیض ہے"۔ جناب شاہد نے بتایا کہ انہوں نے کچھ نادر تحقیق کی "مثنوی تصویر جاناں" اور رسالہ "محمود خوش دہاں" کو ایڈٹ کیا ہے۔ "شمس الامراء کے سائنسی کارنامے" بھی شاہد صاحب کے تحقیقی ذوق کا ثبوت ہے۔ ادارۂ ادبیات میں موجود کئی مخطوطات دکنیات سے دلچسپی کے پیدا ہونے کا ایک سبب ہیں۔ چنانچہ کراچی میں اپنے

یوانِ اُردو" میں بھی شاہد صاحب نے دکنی مخطوطات کا قیمتی ذخیرہ سلیقے سے رکھا ہے جس سے ریسرچ اسکالرس ستفادہ کر رہے ہیں۔ وہ کراچی کے ترقی اُردو بورڈ سے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۷ء تک وابستہ رہے۔ انھوں ہ دکنی زبان کے مشیر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ لغت نگاری کے کام کو آگے بڑھایا۔ اچی کے سہ ماہی رسالہ "اُردو نامہ" کی مجلسِ ادارت کے رکن رہے جس کے نگران جناب ممتاز حسن اور ین میں جوش ملیح آبادی اور شان الحق حقی شامل تھے۔

جناب شاہد، پاکستان رائٹرس گلڈ کے ممبر منتخب کئے گئے اور انھیں اس انتخاب میں سب سے یادہ ووٹ ملے تھے۔ جناب خواجہ حمید الدین شاہد "سوہنی دھرتی رائٹرس گلڈ اور پاک کریسنٹ یوتھ گنائزیشن" (صوبۂ سندھ) کے سرپرست ہیں۔ اسکے علاوہ آپ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے رکن بھی ہیں۔

ہندی سے اپنی دلچسپی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ وہ حیدرآباد میں ردو کے ساتھ ہندی کے لکچرار بھی رہے۔ آپ نے دستورِ ہند کے اُردو ترجمہ کو ناگری رسم الخط میں منتقل کیا ہے۔

...رآباد اور ڈاکٹر زور کے ایوانِ اُردو سے اپنے رشتہ کو مضبوط اپنی وابستگی کو برقرار اور ن کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کیلئے آپ نے کراچی میں اپنے دولت خانہ کو "ایوانِ اُردو" سے موسوم کیا اور ہنامہ "سب رس" (کراچی) جاری کیا۔ اس رسالہ کی اشاعت کا آغاز ڈسمبر ۱۹۷۷ء سے ہوا۔ گفتگو دوران مجھے معلوم ہوا کہ اس رسالہ میں ہر صنفِ ادب پر قلمکاروں کے تنقیدی مضامین ئع ہوتے رہے ہیں۔ "سب رس" کے شعری حصہ میں نظمیں، غزلیں، جدید تر غزلیں اور آزاد غزلیں ا جگہ پاتی رہی ہیں۔ شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ تخلیقات میں شائستگی، سنجیدگی، ادبیت اور معنویت ۔ اس کے علاوہ "سب رس" میں حضرت امجد حیدرآبادی اور ڈاکٹر زور کی یاد میں، ہر سال پابندی سے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

"سب رس" کے اجرا کے سلسلے میں جناب شاہد نے بتایا کہ احمد ندیم قاسمی نے انھیں رسالہ ئع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ "اقبال نمبر" سے کراچی کے "سب رس" کی ابتداء ہوئی۔ اس خصوصی مارے کے بعد ڈاکٹر زور نمبر" "ڈاکٹر سید سجاد نمبر" اور "ممتاز حسن نمبر" اور بعض اور خصوصی شمارے ئع کئے گئے جنھیں ادبی دنیا نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ سب رس (کراچی) کا "یادرفتگاں" نمبر بے حد پسند کیا گیا تھا۔

میرے اس سوال پر کہ مضامین لکھنے کے لئے آپ کو کس قسم کا ماحول پسند ہے ؟ ہ صاحب نے کہا کہ خاموشی ہو، تنہائی ہو، خصوصاً رات میں سکون و اطمینان اور پوری توجہ ساتھ لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا ویسے میں سگریٹ بہت کم پیتا ہوں لیکن لکھنے کے دورا میں سگریٹ پینے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ سگریٹ ں۔ کاغذ پر قلم کی روانی کے ساتھ، سگریٹ کے کش کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ اور دو گھنٹوں چار، پانچ سگریٹ مسلسل پیتا ہوں۔

کراچی میں چند سال پیشتر اپنی علالت کے بارے میں آپ نے کہا کہ خدا کا بڑا فضل ہوا۔ ے قلب پر حملہ ہوا تھا، یہہ آپ۔ اور میرے سب دیگر مہربان دوستوں، رشتہ داروں اللہ فرماؤں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں دوبارہ صحت مند اور توانا ہوں اور آپ سب سے ملنے لے خدا نے حیدرآباد تک سفر کرنے کی طاقت، قوت اور ہمت بھی عطا فرمائی۔ آپ نے مسرت کا ر کرتے ہوئے فرمایا کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو (حیدرآباد) کی طرف سے مجھے ۱۹۸۷ء میں یوم ن قطب شاہ کی سلور جوبلی تقاریب میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ انشاء اللہ میں ان تقاریب ضرور شرکت کروں گا۔ میں اس پُر خلوص دعوت کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ ن کی آخری سانس تک حیدرآباد سے محبت باقی رہے گی۔

الحاج خواجہ شجاع الدین مرحوم کے فرزند جناب پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہدؔ نے اپنے بچپن زمانے کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا کہ شہر حیدرآباد کے محلہ ہنومان ٹیکری میں تھیا سوفیکل سے قریب، ہمارے بزرگوں کی تعمیر کی ہوئی مسجد "مسجد زور آور خاں" (زور آور جنگ) اب موجود ہے۔ اس مسجد سے متصل مکان میں میرا بچپن گذرا۔ یہ ہمارا ذاتی مکان تھا۔ چند روز ر اُدھر سے گزرنے کا مجھے اتفاق ہوا، تو میں نے اشتیاق کی نظروں سے اس مسجد کو دیکھا۔ اس پر میری نگاہیں، چند لمحوں کے لئے جم کر رہ گئیں۔ واقعی یادیں ہی انسان کی زندگی کا قیمتی ثہ ہیں۔ وہ ہمارے سینے میں ہمیشہ محفوظ رہتی ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ ہی، حیدرآباد میں جوانی دور میں، علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا تذکرہ چھڑا۔ اور ہائی اسکول اور کالج کی طالب علمی دور بھی گفتگو کا موضوع رہا۔ آپ نے کہا :-

میں دارالعلوم ہائی اسکول کا طالب علم رہا۔ یہاں صدق جائسی، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر

سید حسین شوکر، میرے محترم اساتذہ رہے ہیں۔ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر زور، پروفیسر سید سجاد، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر سید محمد، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی جیسی قابلِ احترام شخصیتیں میری راہ نما رہی ہیں۔

آپ کچھ عرصہ تک دارالعلوم کالج میں لکچرار اُردو و ہندی رہا۔ اور کلچرل سرگرمیوں میں گہری دلچسپی سے حصہ لیتا رہا۔ مشاعرے، ادبی اور شعری محفلیں، موسیقی کی محفلیں، ڈرامے، اُردو فسٹیول، آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ادبی اور علمی عنوانات پر تقریریں، ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد کے مختلف شعبوں کے کام کو آگے بڑھانے میں ڈاکٹر زور کی رہبری میں شب و روز مصروفیت رہا کرتی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ جناب شاہد نے حیدرآباد میں ایک مصروف زندگی گزاری اور اُردو زبان و ادب کی پُر خلوص خدمت کے سلسلے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ بلاشبہ حیدرآباد کا ادبی اور سماجی خدمات کا شاندار ریکارڈ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے چند ہفتوں سے حیدرآباد کی ممتاز انجمنوں اور اداروں کی طرف سے ان کا بے حد گرمجوشی سے استقبال کیا جا رہا ہے اور خیر مقدمی تقاریب کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

اپنی ملنساری، انکساری، خوش اخلاقی اور وسیع القلبی کی بدولت جناب شاہد پاکستان میں بھی ادبی دوستوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتے ہیں۔ میری خواہش پر انہوں نے کئی ادیبوں، شاعروں، قلمکاروں، صحافیوں اور اُردو کے خدمت گزاروں کے نام لئے جن سے اُن کے بے حد قریبی روابط ہیں۔ مجھے اس کہکشانِ ادب کے جن ستاروں کے نام یاد رہ گئے ان میں افور سدید، احمد ندیم قاسمی، تلسیر صدیقی، مشفق خواجہ، منظر ایوبی، ڈاکٹر نظر کامرانی، امید فاضلی قمر ساحری، رضی اختر شوق، صبا متھراوی، مجیب خیرآبادی، حمایت علی شاعر، طاہر نگار منظر امکانی، راغب مرادآبادی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، مصباح الدین شکیل، اور شاہ بلیغ الدین شامل ہیں۔

میرے ایک سوال پر، خواتین میں ادب اور صحافت کے خدمت گزاروں میں شاہد صاحب نے چند ممتاز خواتین کے نام بتائے جن میں انشائیہ نگار محترمہ صفورہ خیری، ممتاز شاعرہ محترمہ سائمہ خیری (رزاق الخیری کی صاحبزادی) اور محترمہ روحی علی اصغر کے علاوہ "حریم" کی ایڈیٹر محترمہ سلطانہ مہر، اور "دوشیزہ" کی ایڈیٹر محترمہ رخسانہ سہام مرزا کا تذکرہ بھی رہا۔

قاضی ایم اے عسیر بقاعی

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

جناب اخی محترم پروفیسر شاہد صاحب کا نام آتا ہے تو ماضی کی یاد اور ان کے اخلاق مجسم کی تصویر سامنے آجاتی ہے ۔ جناب پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کے نام اور کام و ادبی خدمات سے دانشور ادیب اور اہالیان حیدرآباد و پاکستان بخوبی واقف ہیں چونکہ اکثر لوگ جناب شاہد صاحب کے خاندان سے واقف نہیں ہیں ۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اختصاراً ان کے کچھ خاندانی حالات قلمبند کروں

اللہ تعالیٰ نے نسب پر غرور کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے ۔ قولہٗ تعالیٰ ۔

فاذا نُفِخَ فِی الصُّورِ فَلَا انسَابَ بَیْنَھُم (فرمایا اللہ تعالیٰ نے پس پھونکا جائے گا صور پھر نہیں انساب) علیحدہ اس لئے ہر انسان کو نسب پر یا کسی اور چیز پر غرور و فخر نہیں کرنا چاہیے ۔

البتہ قبیلہ و خاندان کی شناخت کیلئے اپنے قبیلے و خاندان کا ذکر کیا جاسکتا ہے ۔

انسان کی زندگی منزل معاشرہ سے تشکیل پاتی ہے ۔ جس میں چھ بنیادی امور ضروری ہیں ۔ انکی حفاظت واجب ہے اور وہ یہ ہیں ۔

دین ۔ نفس ۔ نسب ۔ عقل ۔ مال ۔ عزت ۔ ہر مذہب میں یہ چھ امور بہت اہم ہیں ۔ قرآنی تعلیمات کا ایک بنیادی مطالبہ تہذیب نفس بھی ہے ۔ اصل تہذیب احترام آدم است ۔ اسی نسبت سے ہے ۔

الحاصل یہ کہ محترم اخی مکرم پروفیسر خواجہ حمید الدین نعمت اللہی القریشی کے جد اعلیٰ حضرت علامہ غلام العلی نعمت اللہی القریشی رسا ایک زبردست عالم باعمل تھے ۔ آپ شاعر بھی تھے تخلص رسا تھا آپ کی شاعری مذہبی اور اصلاحی تھی ۔

سابق ریاست حیدرآباد نظام دکن میں خدمت تحصیلداری پر فائز تھے ۔ علامہ موصوف نے متعدد کتب توحید و رسالت سے متعلق تصنیف فرمائی ہیں منجملہ ان کتب کے امتیاز الشرک والتوحید ۔ نسخہ تسلیم العلوم نا قص الافہام ۔ میرے پاس موجود ہیں ۔

آپ کے جد امجد مولوی محمد فخر الدین نعمت اللہی القریشی بھی ایک سنجیدہ باعمل بزرگ تھے آپکے

پدر بزرگوار مولوی شجاع الدین صاحب نعمت اللہی القریشی بھی ایک نیک سیرت ہمدرد بزرگ تھے علاوہ آپ کے ارکان خاندان عالم ہونے کے علاوہ سابق ریاست حیدرآباد نظام دکن میں اعلیٰ خدمات پر فائز رہ چکے ہیں۔ منجملہ ان تمام ارکان خاندان کے چند نام یہاں قلمبند کئے جاتے ہیں۔ مولوی محمد حبیب الرحمن نعمت اللہی القریشی مرحوم و مغفور سابق تحصیلدار تعلقہ منتھنی ضلع کریم نگر و مولوی محمد عطاالرحمن نعمت اللہی القریشی مرحوم و مغفور۔ مددگار ناظم محکمہ بندوبست۔ دیگر خاندانی اعزا قاضی علامہ محمد عبدالقادر انصاری مرحوم و مغفور خاندانی قضاءت تعلقہ نرمل ناظم عدالت ضلع سرکار عالی جو ایک بلند پایہ عالم باعمل اور متدین بزرگ تھے۔ ان کے فرزند مولوی علامہ قاضی محمد عبدالصمد انصاری مرحوم و مغفور بھی بہت زبردست عالم اور باعمل بزرگ تھے۔ ان کے بھی متعدد مکتوبات ہیں اور مولوی محمد عبدالغفور صدیقی مرحوم و مغفور مددگار معتمد حکومت مقامی آندھرا پردیش تھے۔

بہرحال جناب شاہد صاحب ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ نے الحمدللہ سابق میں اپنی اعلیٰ قابلیت و تدبر سے قوم و ملک کی فلاحی خدمت کرتے ہوئے اپنے علمی خاندان کا چراغ روشن کیا ہے۔ آپنے حیدرآباد میں بہ سرپرستی جناب ڈاکٹر زور صاحب ذریعہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد، قوم و ملک کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انقلاب حالات کے تحت آپ نے اپنے وطن مالوف کو خیرباد فرماکر پاکستان کا توطن حاصل کیا۔ اور وہاں بھی الحمدللہ اپنی اعلیٰ صفات اور جذبہ قومی و ملی رکھتے ہوئے ایوان اردو قائم فرماکر ادبی خدمات کے ذریعہ قبولیت عام اور شہرت دوام حاصل فرما چکے ہیں۔

جناب اخی محترم پروفیسر شاہد صاحب اور آپ کی بیگم صاحبہ ڈاکٹر وحید النساء بیگم صاحبہ کے اخلاق حمیدہ سے متعلق کچھ عرض کرنا میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں وہ یہ کہ اخی محترم جناب شاہد صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے اور علمی و ادبی خدمات کی شہرت کے باوجود طبیعت میں انکسار و بردباری و خودداری ہے وہ خلوص و محبت کے پیکر ہیں۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ محبت عزیبوں کے ساتھ ہمدردی اور طلبہ کے ساتھ انتہائی شفقت یہ ان کی مستودہ صفات ہیں اور دوسری طرف محترمہ ڈاکٹر وحید النساء بیگم صاحبہ جو اخی محترم جناب شاہد صاحب کی شریک حیات ہیں اور میری بھاوج۔ ماضی کی ایک جھلک پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں۔ پولیس ایکشن حیدرآباد سے قبل محترمہ ڈاکٹر وحید النساء بیگم صاحبہ حیدرآباد کی مشہور لیڈی ڈاکٹر تھیں وہ
[illegible]

سید خلیل احمد حسینی

پاکستانی مہمان - اقبال اکیڈمی میں

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے پاکستانی مہمان پروفیسر حمید الدین شاہد اور اعجاز حسین کھٹا کے اعزاز میں خیر مقدمی تقریب کی تفصیل

کن کا خیر مقدم کروں، اپنوں کا ــــ وہی جو کل تک یہاں تھے، ان میں سے ایک جناب حمید الدین شاہد ہیں جو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے روح رواں تھے اور ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والے رسالہ "سب رس" کے مدیر تھے۔ سب کا لینا تو اعزاز ممکن تھا اس لئے یہی بہتر تھا کہ سب رس لے لیں۔ شاہد صاحب کہتے ہی ادبی اور علمی اداروں کے روح رواں رہے جب سے وہ بہت دور چلے گئے یعنی کراچی میں مقیم ہوگئے رہ رہ کر یہ شعر زبان پر آتا ہے کہ

اب یادِ رفتگاں کی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

کراچی میں بھی شاہد صاحب نچلے نہیں بیٹھے، انہوں نے وہاں بھی ایوانِ اردو بنا ڈالا اور اردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ "سب رس" نکالا اور وہاں پاکستان کے لوگوں کو جام جام ادبی معلومات پیش کئے۔ یقیناً ہم اس طرح دار شخصیت سے محروم ہوگئے اور وہ توانا ہو گئے۔ شاہد صاحب کی زندگی کے متعلق شاید اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

آفتاب عالمتاب جو بظاہر سرزمین حیدرآباد سے غروب ہوگیا اور سرزمین کراچی سے ابھرا اور اپنی آب وتاب اور ضیا باریوں سے ایک عالم منور کیا ہے۔

اعجاز حسین کھٹا کو دکن والے کیسے بھلا سکتے ہیں۔ آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے کہ وہ ہر محفل میں چھکتے رہتے تھے۔ دکن کی ہر ادبی محفل کھٹا کے ذکر سے یا ان کے وجود سے خالی نہ ہوتی تھی۔ یہ سرزمین اس کا کھٹا کہلاتی ہے۔ باہر سے آنے والے شروع میں ناک بھول چڑھاتے ہیں لیکن بہت جلد محسوس کرتے ہیں کہ یہاں کی آب وہوا کے پیش نظر کھٹا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے جو نئے نئے یہاں آئے تھے انہوں نے کھٹے کو بُرا بھلا کہا اور اسی دن سے اعجاز حسین صاحب کا تخلص کھٹا ہوگیا۔ دکن کی یہ سرزمین اپنے فرزندوں کو بھلانے والی نہیں۔ چاہے برسوں بعد ان کے قدم میمنت لزوم اس زمین پر آئے ہوں۔ اعجاز صاحب کو دکن میں آج بھی وہی محبت، والہانہ پن اور وارفتگی ملے گی جو اس کی خصوصیت ہے۔ یہاں شگوفہ اور چمن میں وہی بوٹے یار ملے گی جس کو بھلانے کی بہت کوشش کی جاتی ہے۔

کھٹا صاحب! یوں تو باہر کے لوگ کھٹے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن یہاں آکر یہیں کے ہو رہتے ہیں۔ پتہ نہیں گنڈی پیٹ کے پانی میں کیا بات ہے کہ آئے ہوئے واپس ہونا نہیں چاہتے۔ ہماری تمنا ہے کہ کراچی میں آپ پھلے پھولیں اور دکن کے پیام محبت کو عام کریں۔

آپ دونوں اصحاب آج اقبال اکیڈیمی کے ہال میں تشریف لائیے۔ یہاں نائب صدر جناب ظہیرالدین صاحب کی کوششوں سے اور ان کے رفقائے کار کی مدد سے اقبال پر کتابوں کا تصاویر کا اور ان کے خطوط کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ مشاہیر جب بھی حیدرآباد آتے ہیں، اگر انہوں نے اقبال اکیڈیمی کا نام سنا ہے تو اس کی زیارت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اقبال اکیڈیمی نے اس خطہ میں اقبال کے نام کو زندہ و پائندہ رکھا ہے۔ یوم ہائے اقبال اور تصاویر کی نمائش کے ذریعہ اقبال سے دلچسپی قائم رکھی جاتی ہے۔

بعض اقبال کے حامیوں کو اس اکیڈیمی کی جانب سے بیش بہا انعامات سے سرفراز کیا گیا اور ان کی اقبالیات سے متعلق خدمات کو سراہا گیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر غلام دستگیر رشید صاحب کا

ہناں لیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر عالم خوندمیری بھی اس اقبال اکیڈیمی کے نائب صدر ہیں۔ اقبال
سے متعلق ان کے خیالات کی ایک عالم میں دھوم ہے۔

اقبال اکیڈیمی کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالہ "اقبال ریویو" کے نام سے نکالا جاتا ہے
جس میں کوشش کی جاتی ہے کہ اقبال کی زندگی کے چھپے ہوئے پہلوؤں پر سے پردہ اٹھایا جائے۔
نانیہ [illegible] حیدرآباد سے ان کی مراسلت کو واشگاف کرنے کا سہرا بھی اقبال اکیڈیمی کے سر
ہے۔ اس اقبال اکیڈیمی میں جس کے معتمد کریم رضا صاحب ہیں اور مظہر لطیف صاحب خازن ہیں۔
پروفیسر جناب ناصر الدین صاحب اور ان کے دوست پروفیسر یوسف اعظمی صاحب جیسے سرگرم
رکن ہیں۔ آپ اصحاب کا خیر مقدم کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ آپ ہی کے وطن میں آپ کا خیر مقدم کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ اور
متصور اس دن کا کرتا ہوں جب کہ ملکوں کے درمیان حد بندیاں سخت نہیں ہوں گی۔ پاسپورٹ
اور ویزا کا چکر نہیں ہوگا۔ ایک مقام کے لوگ دوسرے مقام پر بآسانی آجاسکیں گے۔ بظاہر یہ
ایک خواب ہے لیکن یقین ہے کہ ؎

وہ صبح کبھی تو ہوگی آخر

دکن کے رہنے والو! سرزمین دکن تم کو خوش آمدید کہتی ہے۔ اقبال اکیڈیمی اس کے صدر
کی طرف سے اپنے کارکنوں کی طرف سے اور مسلمانان حیدرآباد کی طرف سے آپ لوگوں کا خیر مقدم
کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتی ہے۔

پروفیسر محمد محمود حسین

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

یوں تو حیدرآباد کو دنیا کے مختلف حصوں سے مختلف لوگ آتے رہتے ہیں۔ ان کی اہمیت ان کے علم یا کام کی نوعیت سے سماج کے مختلف طبقات میں کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ بعض موقتی شہرت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض کے اثرات بہت دیرپا ہوتے ہیں۔

خواجہ حمید الدین شاہد صاحب بھی ایسے ہی چند لوگوں میں ہیں۔ جن کی آمد کی اطلاع ایک مژدہ تھی اور جب وہ آگئے تو ایک سکون اور مسرت ہوئی اور جب وہ حیدرآباد سے جائیں گے تو موقتی طور پر تکلیف ضرور ہوگی لیکن اس توقع پر کہ وہ بہت جلد دوبارہ آئیں گے۔ ہم ان کے جانے کی تکلیف کو بھول کر ان کے آنے کی امید سے دل خوش کرتے رہیں گے۔

خواجہ حمید الدین شاہد کوئی بڑے سیاسی لیڈر نہیں ہیں کوئی قومی رہنما نہیں ہیں، کوئی خوبصورت فلم ایکٹر نہیں ہیں لیکن اپنے چاہنے والوں میں (اور ان کے چاہنے والوں کی تعداد صرف شہر حیدرآباد ہی میں ہزاروں سے زیادہ ہے) وہ بہت معزز ہیں، بہت مقبول ہیں اور ان کی مقبولیت کی میرے نزدیک دو وجوہات ہیں ایک تو ان کا کردار اور دوسرے ان کی اردو کی خدمت۔

ان کے کردار اور ان کی ذاتی صفات سے بہت سے لوگ واقف ہیں لیکن پولیس ایکشن کے بعد پیدا ہونے والی شاید کم واقف ہو۔ جن لوگوں نے حیدرآباد کی زندگی، اس کی تہذیب، اس کے اپنے تمدن کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس سے واقف ہیں۔ پولیس ایکشن کی وجہ سے جو سیاسی کایا پلٹ ہوئی اس نے حقیقت میں بڑا تغاور

نسل کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ دیا ہے کہ جس کا یہ کہنا بجا ہے کہ شہر شہر
میں ایک خیالی خط فاصل آج تک کھینچ دیا گیا ہے اور یہ خط استوا کے خیالی خط کی طرح
عملی طور پر ہے اور عملی طور پر جغرافیائی امور میں اور دیگر معاملات میں حقیقت کی صورت
اختیار کرتا جا رہا ہے۔ پولیس ایکشن کے بعد جب مختلف سروں سے ترکی ٹوپی اتر
گئی، بشرٹ نے شیروانی کی جگہ لے لی ... کے بجائے پتلون نظر آنے
لگی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو باقی نہیں رہا۔ اسکولوں میں اردو کو زبان
دوم و سوم کا درجہ بھی حاصل نہیں رہا۔ پھر نہ تو اس کے استاد ملنے لگے اور نہ طالب علم
اس بدلے ہوئے ماحول میں پلنے اور بڑھنے والی نسل کے لوگ اگر شاہد صاحب سے
ناواقف ہوں تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔

میں خواجہ حمید الدین شاہد سے اس وقت سے واقف ہوں جب ۱۹۳۲ء
میں میں نے جامعہ عثمانیہ کی انٹرمیڈیٹ کی جماعت سال اول میں داخلہ لیا تھا۔ اردو
ان کا بھی مضمون اختیاری تھا اور میرا بھی۔ انھوں نے بھی اردو کے شہرۂ آفاق اساتذہ
مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر سید سجاد، پروفیسر سروری اور پروفیسر سید محمد سے
شرف تلمذ حاصل کیا اور میں نے بھی۔

ڈاکٹر زور کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سکھاتے ہی بہتر تھے بلکہ سکھاتے بھی تھے
خود ہی بہتر کام کرتے تھے بلکہ دوسروں کو کام کرنے کے لیے اکساتے بھی تھے۔ شمع
کی طرح وہ خود بھی روشن رہتے تھے اور دوسروں کو بھی روشن کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر
زور مرحوم سے مختلف لوگوں نے مختلف باتیں سیکھی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ سے اردو کے
خدمت گزاروں کی جتنی بھی نسلیں نکلی ہیں وہ سب ڈاکٹر زور، ان کے ادبی کارناموں
اور ان کے ادارۂ ادبیات اردو سے متاثر ہیں۔ اگر ڈاکٹر زور کے کسی شاگرد نے ان
کے علمی ادبی کاموں اور ادارے کی تاسیس و ترقی میں شروع سے ساتھ دیا تو وہ
خواجہ حمید الدین شاہد تھے۔

اگر یوں کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ادارۂ ادبیات اردو کے چپے چپے پر
شاہد صاحب کے قدموں کے نشان ہیں اور اس کی تعمیر میں استعمال کی جانے والی ہر
اینٹ پر ان کی انگلیوں کے نشان۔ ڈاکٹر زور صاحب سے انھیں دکن کی محبت اور

کی خدمت جیسے ورثہ میں ملی ہو لیکن ایک چیز میں وہ ڈاکٹر صاحب سے مختلف ہیں۔ ان کے مزاج میں بلا کی نرمی ہے اور یہ ہمیشہ نرم دم گفتگو رہتے ہیں۔
میں نے ہمیشہ انھیں مسکراتے دیکھا۔ جب ان کے ملنے پڑھنے چاہیئے اس وقت بھی ان کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ یہ حق کی تائید میں باطل کی مخالفت ضرور کرتے ہیں لیکن شدت سے نہیں۔ میں نے انھیں کبھی گالی کے جواب میں گالی دیتے ہوئے نہیں سُنا۔ تلخ بات کو ہنس کر برداشت کر جانے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت ہے جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوا ہے کہ مخالفت والے کو ان کے آگے جھکنا پڑا۔ ناکامی سے انھوں نے دل برداشتہ ہونا نہیں سیکھا بلکہ زیادہ محنت اور زیادہ لگن سے اس کام کو پھر سے شروع کیا تاآنکہ اس میں انھیں کامیابی ہو گئی۔

ان کی زبان ہمیشہ میٹھی رہی اور لہجہ میں میں نے تو تندی، تیزی یا ترشی نہیں دیکھی۔ ان کے لب اتنے شیریں تو نہیں کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ کسی نے ان کی گالیوں کا مزہ چکھا ہی نہیں۔ انھوں نے گالیاں کھا کر دعائیں دی ہوں کہ نہ دی ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ جواب میں گالی نہیں دی۔ ایک مرتبہ بھی ان سے گفتگو کرنے والا ان کی شائستگی اور مروّت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ طبیعت کی اسی مروّت اور محبت نے انھیں بہت مہمان نواز بھی بنا دیا ہے۔ حیدرآباد سے کراچی جانے والوں کو یہ بُلا بُلا کر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں، جلسے کرتے ہیں، ادبی محفلیں سجاتے ہیں اور مشاعرے منعقد کرتے ہیں ——————

حیدرآباد کی شاندار روایات کو انھوں نے کراچی میں زندہ رکھا ہے۔ ناظم آباد میں اپنی پُرشکوہ عمارت کا نام 'ایوانِ اردو' رکھا اور اس کو اردو کے خدمت کے مرکز کی حیثیت سے ایسی ہی اہم جگہ حاصل ہے جیسے ادارۂ ادبیات اُردو کو حیدرآباد میں۔

اُردو کی محبت، اس کی خدمت کی لگن نہ صرف زبان و قلم سے بلکہ دامے درمے بھی، شروع ہی سے شاہد صاحب کی خصوصیات رہی ہیں۔ حیثیت طالب علم بحیثیت لکچرار اردو [illegible] رگھاٹ کالج اور جامعہ عثمانیہ بحیثیت مدرس [illegible]

ت مضمون نگار، بحیثیت شاعر، بحیثیت کارکن ادارۂ ادبیات اردو انھوں نے
جو خدمت حیدرآباد میں کی وہی ان کی شہرت کے لیے کافی تھی۔ پاکستان پہنچنے
کے بعد انھوں نے اس کو جاری رکھا وہاں بھی وہ حال حال تک اردو ترقی بورڈ
سے منسلک رہے۔ وہاں بھی وہ "سب رس" نکالتے رہے اور وہاں بھی وہ اردو کے
ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ انھیں پاکستان میں اردو کے خدمت گزاروں
کی فہرست میں بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔

ہمیں شاہد صاحب کی ذات بھی عزیز ہے اور ہم ان کے کاموں کی قدر دل
سے محسوس کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں جو ان کا وطن اولین بھی ہے ان کا اتنا
استقبال بھی ہوا ہے اور کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب ان کے اعزاز میں کوئی
جلسہ منعقد نہ ہوتا ہو۔ ہماری دعا ہے کہ خدا انھیں عمر خضری دے اور
عافیت سے رکھے کہ وہ برسوں تک اردو کی خدمت کر سکیں۔ حیدرآباد
میں اور دوستوں اور قدر کرنے والوں کو شاد کام کرتے رہیں۔

(۱)

---

(۳۸)۔

مشہور تھیں۔ ان کی طبیعت میں سادگی و خلوص محبت و جذبۂ ہمدردی قدرت سے
ہے محبت کا جذبہ ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ایک دفعہ میری ہمشیرہ محترمہ
سلمہا اللہ کو سخت علیل ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے غیر معمولی دلچسپی لے کر میرے غریب خانہ
پر شام تشریف لا کر دیکھ بھال کی اور علاج کیا اور مخلصانہ ہمدردی اور ہمدردی کا مکمل ثبوت
دیا۔ اس کے علاوہ دیگر لوگوں کے ساتھ بھی انکی ایسی ہی ہمدردیاں شامل حال رہیں۔ دل تو
چاہتا ہے کہ بہت کچھ لکھوں مگر بخوف طوالت اختصار پر اکتفا کرنے کیلئے مجبور ہوں
اللہ سے دلی و پر خلوص دعا ہے کہ اللہ تعالی جناب اخی محترم جناب شاہد صاحب کو اپنے
متعلقین کے ساتھ ہمیشہ با صحت و عافیت و خوش و خرم رکھے اور عمر طبعی عطا فرمائے۔
آمین ثم آمین۔ ... جہاں آباد۔ فقط

وقار احمد

خواجہ حمید الدین شاہد

حیدرآباد کے قدیم اردو حلقے کے لئے خواجہ حمید الدین شاہد نئے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد محترم زورؔ کی قیادت میں اردو زبان کی کافی خدمت کی ہے۔ تقریباً ۲۵ سال قبل اپنے حالات سے مجبور کر انھوں نے پاکستان ہجرت کر لی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل زبان اردو کو اتنے خطرات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا جتنے کہ آج کل اسے پیش آرہے ہیں۔ ہندوستان کے اکثریتی طبقے میں فرقہ داری عناصر نے یہ خیال جاگزیں کر دیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان تھا اگرچہ اصل یہ ہندوؤں کی زبان ہے جس کا وجود سنسکرت اور عربی زبانوں کے میل جول کا رہین منت ہے۔ دونوں زبانوں کے ثقیل الفاظ کو ہلکا اور آسانی سے قابل فہم بنا کر اس کا نام اردو رکھ دیا گیا۔ یہی اردو ہے جسے اکثریتی طبقہ ہندی کہتا ہے۔ فرق صرف عربی فارسی اور سنسکرت رسم الخط کا ہے۔ مسلمانوں کے بعض اہم لیڈروں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اردو کو بجائے عربی فارسی الفاظ میں تحریر کرنے کے دیوناگری رسم الخط میں تحریر کیا جائے۔ ہندوستان کی مرکزی اور ریاستی حکومتیں اردو کے تحفظ کا فقط تیقن دیتی ہیں لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا۔ مجھے کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے اجداد نے اردو یا ہندی کو اپنا کر سخت غلطی کی۔ مسلمانوں کی اصل زبان عربی ہے ہمارے اجداد عربی لے کر اس ملک میں آئے تھے اگر وہ اسے ہی باقی رکھتے تو آج زبان کا مسئلہ کھڑا نہ ہوتا۔ انگریزوں نے دو سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی مگر یہاں کی زبانیں قبول کرنے کی بجائے خود انھوں نے اپنی زبان یہاں کے عوام پر اتنی مضبوطی سے مسلط کر دی کہ آج تک حکومت ہند انگریزی زبان استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ مسلمان تو آٹھ سو سال ہندوستان کے

عجب نہیں ہے۔ اگر مسلمان کچھ دنوں کی ایسی ہمت کرتے تو آج سارا ہندوستان اردو بولتا نظر آتا۔
اگر یہ ہو بھی جاتا تو کوئی بات نہیں لیکن مسلمان خود بھی اردو سے کٹ کر رہ گئے۔ ملک کی تقسیم
کو ختم ہوا اور جب تک فرقہ واریت کا زہر نہیں پھیلا تھا۔ اردو کے استعمال میں ہندو مسلمانوں
سے کہیں آگے تھے۔ اور آج بھی جب فرقہ پرستی کا ذہن ہندی اور سنسکرت کی طرف مائل ہے وہ
پھر بھی بغیر اردو کے دو قدم نہیں چل سکتے۔ مثلاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کچھ اس طرح
خبریں نشر ہوتی ہیں "پردھان منتری نے جنتا پر زور دیا کہ وہ آپس میں امن اور شانتی
درگھٹنا کر جہاں درگھٹنائیں ہونے نہ دیں۔" اب خط کشیدہ الفاظ جو اردو کے ہیں نکال
دیئے جائیں تو پھر باقی کیا خاک سمجھ میں آئے گا۔ جب تک فرقہ وارانہ منافرت پیدا نہیں ہوئی
تو اردو کے سیکھنے والوں میں ہندو صف اول میں تھے۔ آج بھی حیدرآباد کے کھتری اور
یو پی کے ہندو بے حد پیاری اردو استعمال کرتے ہیں لیکن لیبل ہندی کا لگا ہوتا ہے۔

خواجہ شاہد اگر یہ امید لے کر پاکستان گئے ہوں گے کہ انہیں وہاں اردو کی ترقی کا سازگار ماحول ملے گا تو یقیناً انہیں مایوسی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ وہاں بھی اردو کے مقابل سندھی اور پنجابی زبانیں کھڑی تھیں۔ پاکستان مذہب کے نام پر حاصل کیا گیا تھا مگر جب حکومت ملی تو مذہب کو ثانوی حیثیت دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان ۱۹۷۱ء میں ٹوٹ گیا اور بنگلہ دیش کے نام سے ابھر کر آیا۔ ایسے مخالفانہ ماحول میں خواجہ شاہد کے لئے پاکستان میں اردو کو سنبھالنے کا کام اور دشوار ہو گیا۔ تاہم انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور بہر قیمت اپنے مشن کو جاری رکھا۔ سندھ میں جو مسلمان محمد بن قاسم کے ساتھ آئے تھے امتداد زمانہ سے انہوں نے بھی عربی چھوڑ کر سندھی کو اپنایا جو آج بھی عربی رسم الخط میں تحریر کی جاتی ہے۔ چند سال قبل حکومت سندھ نے اپنے صوبہ کی حد تک سندھی کو لازمی قرار دیا تھا۔ اس پر وہاں خون ریز فسادات ہوئے لیکن بعد میں حکومت کی سختی جب نرمی میں بدل گئی تو اردو کے تحفظ کے تیقنات کے بعد فسادات ختم ہوئے۔

خواجہ شاہد صاحب کو ایک سہولت یہ بھی حاصل تھی کہ ان کی اہلیہ صاحبہ [illegible] [illegible] اور ان

سے پاکستان منتقل ہونے سے چند سال پیشتر ہی انھوں نے پاکستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔
[illegible] چلا گیا۔ پھر جلد ہی ان کی پریکٹس اونچے پیمانے پر چلنے لگی۔ اور انھوں نے اپنا ایک
نرسنگ ہوم قائم کر لیا۔ جب شاہد نے ہجرت کی تو مالی طور پر وہ مستحکم تھے پھر ان کے بڑے لڑکے
کو پاکستان ایئر فورس میں اچھی ملازمت مل گئی اور آج کل وہ کیپٹن پائلٹ کے عہدے پر فائز
ہیں۔ شاہد صاحب اُردو زبان سے کس حد تک منسلک ہیں اس بات کا اندازہ اس بات سے
لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے وسیع مکان کا نام ہی ایوانِ اُردو رکھا ہے۔ وسیع
ڈرائنگ روم میں مختلف شعراء و ادبا کی تصاویر ٹنگی ہیں جن میں حضرت امجد درویش شاعر کی
تصویر بھی ہے۔ شاہد صاحب سے میری پہلی ملاقات تو حیدرآباد میں ہوئی لیکن وہ کچھ
سرسری نوعیت کی تھی۔ پاکستان کی تشکیل کے موقع پر میں علی گڑھ میں بی اے فائنل میں پڑھتا
تھا۔ مسلم لیگ کے کرتا دھرتا لیڈروں یعنی مسٹر جناح، جناب لیاقت علی، مسٹر حسین شہید
سہروردی، جناب عبدالرب نشتر وغیرہ سے مجھے شرف ملاقات حاصل تھا — چنانچہ جب
جی۔ ایم۔ سید (جو اب بھی بقید حیات ہیں) نے مسلم لیگ کے خلاف محاذ آرائی کی تو لیگ کی طرف
سے سندھ میں الیکشن میں حصہ لینے جو والنٹیر بھیجے گئے ان میں میں بھی شامل تھا۔ کرا
چی کے اس وقت کے غیر آباد علاقے میں جو آج کل مسلم لیگ کوارٹرز کہے جاتے ہیں وہاں ہمارا کیمپ تھا
اور خدا کے فضل سے ہم نے جی ایم سید کو شکست فاش دی۔ پاکستان بننے کے بعد میرے تقریباً سب
قریبی رشتہ دار پاکستان منتقل ہو گئے، ان سے ملنے ہر سال دو سال میں ایک مرتبہ پاکستان جا
رہتا ہوں۔ غالباً [illegible] میں اتفاقیہ طور پر خواجہ حمید الدین شاہد صاحب سے ملنا ہوا اور اس
کے بعد سے کراچی کے ہر دورے پر زیادہ وقت شاہد صاحب کے ساتھ ہی گزرتا ہے۔ ایک د
ان پر امراض قلب کا شدید حملہ ہوا۔ زندگی کی توقع نہ تھی لیکن خدائے عزوجل نے اس دنیا
فانی سے کوچ کرنے کا جو وقت مقرر کیا ہے اس سے پہلے کوئی نہیں جا سکتا۔ شاہد صاحب کی ز
باقی تھی اس لئے نہ صرف وہ بچ گئے بلکہ جلد ہی اس قابل ہو گئے کہ اپنے روزمرہ کے فرائض انجا
دے سکیں۔ اور اب تو ماشاء اللہ حیدرآباد آنے کا طویل سفر کرنے کی بھی اہلیت ان میں ہے۔

انھوں نے کچھ عرصہ بعد حیدرآباد آنے کا وعدہ کیا جو آخر کار بمشکل تمام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ممکنات مشکلات میں پریشانیاں تھیں ہم دونوں میں گہری دوستی تھی آخر وہ مسکراتے ابوظبی کو گئے اسپتال کے کوارٹرز میں ان سے ملنا ہوا جہاں سفر لکھا جاتا تھا۔ یہ لکھنا ابھی جلیبی کا جلسہ تھا بعد شاہد صاحب کا حیدرآباد کیلئے آنا ہوا۔ ۱۹۵۲ء کی آمد کا یہ بھی ہوا کہ اردو کے جدید حیدرآبادی حلقوں سے بھی متعارف ہو گئے۔ شاہد صاحب کا کراچی کا مکان جو ایوانِ اردو کے نام سے موسوم ہے ادیبوں اور شاعروں کی آماجگاہ ہے۔ جہاں مشاعرے اور مذاکرے منعقد ہوتے ہیں۔ انھوں نے وہاں بھی حیدرآبادی ماحول کو برقرار رکھا ہے اور غیر حیدرآبادی ادیب بھی غیر محسوس طریقے پر اس ماحول سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں۔ ماہنامہ "سب رس" کے ذریعہ وہ کراچی میں بھی اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ سب رس کراچی سے شائع ہوتا ہے لیکن پاکستان کے علاوہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں بھی جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ کراچی کے سماجی اور سیاسی حلقوں میں بھی شاہد صاحب غیر معروف نہیں ہیں۔ انھوں نے ایک بار کراچی کے انتخابات میں بھی حصہ لیا۔

حیدرآباد میں ان کا قیام مشہور مزاحیہ آل راؤنڈر حمایت (فائن آرٹس اکاڈمی) کے دولت کدے پر رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اتنے دن بھر کی مصروفیتوں کے بعد شاہد صاحب گھر واپس آتے ہوں گے تو زندہ دل حمایت کی مزاحیہ گفتگو ان کی ساری تکان غائب کر دیتی ہوگی۔

فارم نمبر ۴
تحت تفصیلات ملکیت
بابتہ
اخبار شگوفہ
حیدرآباد

زبان اشاعت وقفہ اشاعت اردو ماہنامہ شگوفہ
مقام اشاعت : ۱۱-۵-۷۳۱ ... حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴
ایڈیٹر پرنٹر پبلشر اور مالک کا نام : محمد قمرالدین صابری
قومیت اور پتہ : ہندوستانی ۵-۱-۱۲ ... حیدرآباد
میں محمد قمرالدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کی حد تک صحیح ہیں۔ دستخط : محمد قمرالدین صابری۔

احمد جلیس

اگلی شرافت کے نمونے

خواجہ حمید الدین شاہد

میانہ قد، دلکش کی پُرکشش سانولی رنگت، بیضوی چہرہ پر چمک دار غلافی آنکھیں جن پر موٹے فریم کی عینک ہر چند علمیت کا دبدبہ پیدا کرتی ہے لیکن آنکھوں کی معصومانہ چمک نہیں چھپا سکتی ——— ہونٹوں پر پان کی سُرخی ——— یہ ہیں برصغیر کے نامور محقق، صاحب طرز شاعر اور میرے استادِ محترم پروفیسر حمید الدین شاہد ———

حسین ماضی کے دریچوں میں جھانکتا ہوں تو ذہن کے اوراق ۱۹۵۹ء کے اورنگ آباد کالج کے احاطے میں کھلتے ہیں جب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ پرنسپل تھے اور شاہد صاحب ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔

پہلی نظر ڈالی تو دل نے جیسے آہستہ سے پوچھا ——— کیا اردو کے لکچرر بھی اس قدر خوش لباس، خوش وضع اور خوش اخلاق ہو سکتے ہیں۔ چہرے پر مستقل ایک دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شاہد صاحب نے کتاب کھولی: اضافات، تلمیح، تلمیحات، استعارے اور تشبیہات کے بارے میں بہت سی باتیں سمجھائیں اور پھر بولے: دیکھئے آپ لوگ اردو کو محض نصاب کی خاطر مت پڑھیئے۔ یہ آپ کی مادری زبان ہے۔ اس کے ساتھ آپ کی تہذیب کی جڑیں استوار ہیں اس لیے اس

٭ پروگرام اگزیکیٹو۔ آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد۔

زبان کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہیے۔

شاہد صاحب کی یہ نصیحت مجھے یاد ہے۔ اکیس سال بعد ۱۹۷۹ء میں دارالعلوم اورینٹل کالج میں میں نے بی اے کی پہلی کلاس لی تو اس وقت بھی مجھے شاہد صاحب کی یہ بات یاد آئی اور میں نے ہمیشہ اپنے طالب علموں کو بھی یہی نصیحت کی۔ لیکن پتہ نہیں آج اردو کے استاد اور شاگرد کے درمیان کس نوعیت کا رشتہ باقی رہ گیا ہے۔

کہتے ہیں اچھا معلم وہ ہے جس کا علم متعدی ہو یعنی طالب علموں کو چھو کر لگے۔ شاہد صاحب کے علم میں اس قسم کے نہایت طاقتور جراثیم موجود ہیں۔ پھر مشکل یہ ہے کہ صرف علم میں ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بھی کچھ ایسی متعدی خصوصیات ہیں کہ طالب علم نہ ان کے علم سے محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ان کے کردار کی خوبیوں سے اپنی شخصیت کا بچاؤ کر سکتا ہے۔

شاہد صاحب ڈاکٹر زور کے خاص شاگردوں بلکہ عقیدت مندوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب ہوں یا ایوان اردو کی کوئی علمی تہذیبی محفل، تمام انتظامات کی نگرانی شاہد صاحب کے سپرد ہوتی تھی۔

آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے جب حیدرآباد کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات زندگی پر مبنی دستاویزی کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو شاہد صاحب نے پس پردہ رہ کر ناشر اور مصنفین کی ہر طرح مدد کی کیونکہ یہ ان کی دلی آرزو تھی کہ حیدرآباد کے شعرا اور ادیبوں کے کارناموں سے پورا ملک واقف ہو جائے۔

شاہد صاحب سے میرا رشتہ استاد اور شاگرد تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ میرے لیے ان کی حیثیت ایک بزرگ خاندان جیسی رہی کیونکہ وہ میرے والد محترم علامہ حیرت بدایونی سے نہایت اخلاص اور عقیدت سے ملتے تھے اسی لیے گاہے ماہے وہ ابا سے ملنے ہمارے گھر بھی آجاتے۔

ایوان اردو میں جب خواجہ حسن نظامی، آنند نرائن ملا اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جیسی عظیم المرتبت شخصیتیں آتیں تو جلسے کے انتظامات کی دوڑ دھوپ میں شاہد صاحب کا پھرتیلا پن ہم نوجوانوں کے لیے قابل رشک ہو جاتا۔ مجھے اکثر اس بات پہ تعجب ہوتا کہ اکیلے شاہد صاحب اتنے بہت سے کاموں میں بٹے ہوئے

تمام کام اس خوش اسلوبی سے کیسے کر لیتے ہیں؟ صبح سے سہ پہر تک کالج، اسی سے شام تک ایوانِ اردو اور پھر دوسری صبح کلاس روم تک۔ معلوم ہوتا کہ ادارہ دیر گئے تک اپنے پڑوس میں حضرت امجد حیدرآبادی کے گھر جا کر "سب رس" کے لیے مضامین کی فراہمی اور خریداروں کی جستجو گویا شاہد صاحب کی ہمہ وقت مصروفیت تھی۔

ہم جیسے جن نوجوانوں میں انھیں تھوڑی بہت بھی صلاحیت نظر آتی انھیں حوصلہ دیتے کہ آپ لوگ پہلے "بچوں کے سب رس" میں چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے معلوماتی مضامین لکھنے کی کوشش کیجیے پھر ہم آپ کو "ماہنامہ سب رس" میں بھی شائع کیا کریں گے۔ چنانچہ میرے بھائی افضل محمد، ضمیر صفی، مسعود شریف، سید نصرت اور جانے کتنے ہی طالب علموں کو شاہد صاحب نے مستقل لکھنے والوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا۔

ان کی شخصیت کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مطالعے میں کسی ذہنی تحفظ کے قائل نہیں۔ تحریر کسی بڑے ادیب کی ہو یا مبتدی کی۔ شاہد صاحب نہ صرف غور سے پڑھیں گے بلکہ چاہے کتنے عرصہ بعد ہی ملاقات ہو، صورت دیکھتے ہی نہایت گرم جوشی سے اس تحریر کا تذکرہ کریں گے اور حوصلہ افزا کلمات کے ساتھ لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ یہ بات بھی آج کے اساتذہ سے مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ آج اول تو مطالعہ کی عادت ہی کم ہوتی جا رہی ہے اور جن لوگوں کو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے وہ لوگ صرف بڑے بڑے ناموں کو سرسری طور سے پڑھ کر ایک پیالی چائے پر بیٹھ کر گفتگو یا بات چیت کر سکتے ہیں۔

نئی نسل کے ساتھ بدبختی سے آج کل مزید یہ مسئلہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اساتذہ کی نسل سے تو حوصلہ افزائی کا یہ رویہ بالکل ہی معدوم ہو گیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شاہد صاحب نے عثمانین کی ایک پوری نسل کی ذہنی آبیاری کی ہے انھوں نے حیدرآباد میں علم و ادب کے جو چراغ روشن کیے ہیں وہ نہ صرف تاریخ ادب دکن میں نئے راستے دریافت کریں گے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ

رہنما ہیں بلکہ وہ شاہد کا نام بھی روشن کریں گے۔

بحیثیت معلم اردو بھی شاہد صاحب آج کی نوجوان نسل کے لیے قابلِ تقلید ہیں۔ ساتھ ہی تدریس کا انداز انتہائی عام فہم اور دلچسپ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شاہد صاحب کتابیں کھولنے سے پہلے مصنفین کے بارے میں ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں اور پھر ان کی مجموعی خدمات کے بارے میں طالب علموں کو اتنی بہت سی باتیں بتاتے تھے کہ طالب علم کا اشتیاق بڑھ جاتا تھا کہ دیکھیں یہ کتاب کیسی ہے ——— پھر کتاب کی بلند خوانی پہلے خود کرتے اور معنی، مطالب اور مفہوم کی وضاحت کرتے جاتے۔ اس طرح جب ایک باب مکمل ہو جاتا تو طالب علموں سے کہتے کہ اب وہ بلند خوانی کے ذریعے پڑھتے جائیں تاکہ ان کا تلفظ درست ہوتا جائے اور جملوں کی روانی صحیح طور پر ادا ہو سکے۔

لکچر کے اختتام پر وہ چند ایسی کتابوں کے نام بھی لکھوا دیتے جو زائد مطالعے کے طور پر طالب علموں کے کام آ سکتی ہیں۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی شاہد صاحب اپنے طلبا کو سلام کرنے میں ہمیشہ پیش رفت کرتے۔

سنا ہے اب شاہد صاحب ایوانِ اردو کراچی میں نئی شمعیں روشن کر رہے ہیں ———

اردو کے تاریک و تیرہ ماحول میں شاہد صاحب جیسی ہستیاں اب شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہیں ——— ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں ———!

●

محمد برہان حسین

رہنما اور رہرو

آجکل شہر میں، شہر حیدرآباد کی دو عظیم شخصیتیں کراچی سے آئی ہوئی ہیں۔ میری مراد جناب اعجاز حسین کھٹا اور پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد سے ہے۔ خواجہ صاحب زور مرحوم کے شاگرد رشید بلکہ دونوں میں مرشد اور مرید کا سا رشتہ تھا جو آج سے آدھی صدی قبل ہوا بھی کرتا تھا۔ خواجہ صاحب نے کراچی میں اپنے مرشد زور صاحب کے ایوانِ اُردو اور رسالہ "سب رس" کو آباد کیا ہوا ہے۔

زور صاحب نے حیدرآبادی تہذیب اور ان کی ایک بڑی تحریر جو کہ بھاگ متی سے متعلق ہے جس کو انھوں نے افسانہ عشق کے طور لکھا لیکن وہ لوگوں کے ذہنوں میں حقیقت کے طور پر جم کر رہ گیا۔

انسانی تاریخ میں ایسی تحریریں ہوتی ہیں، جن کے کردار خیالی تھے لیکن زورِ تحریر نے انھیں حقیقی سورماؤں کا روپ دے دیا جیسے رستم و سہراب، انار کلی، حاتم طائی، سندباد جہازی وغیرہ۔

غرض، ڈاکٹر سیدہ جعفر پروفیسر اردو عثمانیہ یونی ورسٹی نے اپنے معرکہ کے مقالے میں ثابت کر دیا کہ بھاگ متی نام کی کوئی داشتہ بھی قلی قطب شاہ کے حرم میں نہیں تھی اس کے بیوی ہونے کا ذکر ہی بے جا ہے۔

رہا بھاگ نگر یا بھاگیہ نگر تو دراصل بھاگ نگر، باغ نگر کی خرابی ہے (اس زمانہ میں حیدرآباد کے چاروں طرف باغات تھے اس لیے بعضوں نے اسے باغ نگر لکھا ہے) چوں کہ تلگو میں "غ" نہیں ہے لوگ اس کو "باگ نگر" کہتے ——— جو

• آر آر لیب، تارناکہ، حیدرآباد۔ (اے۔ پی)

حال بگڑ ہی گیا۔

خیر تو ذکر تھا خواجہ حمید الدین شاہد اور گھٹا صاحب کا۔

یہ دونوں حضرات مرحوم حیدرآباد کو یاد کر کے روتے ہیں۔ ہم کو بھی رونا چاہیئے لیکن ہم اس لیے نہیں روتے کہ حیدرآباد کو ہم ہی نے مارا ہے اور اب بھی قتل کر رہے ہیں۔

گھٹا صاحب ۴۷ء سے قبل ریڈیو پر ایسے مشہور تھے جیسا اب کوئی نہیں ہے۔ انھوں نے دکھنی زبان میں شاعری کی اور استادی کی آوازیں (دکھاتے ہوئے) استاد بھوی اور بمبئی والے کا مشہور پروگرام پیش کیا تھا لیکن یہ پروگرام اس وقت اردو جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی اور حیدرآباد کے اردو ادبی حلقوں میں سراہا جاتا تھا۔ جب کہ حالیہ دور کے دکھنی زبان کے عامیانہ پروگرام "چھوٹی چھوٹی باتیں" کو زبردستی تھا تیجا کر کے ہنسانا پڑتا تھا جو اردو زبان (خصوصیت سے دکھنی زبان) کی بربادی اور مضحکہ اڑانے کے درپے تھا۔

گھٹا صاحب ماموں جان بھی تھے اور بچوں کا اعلیٰ معیار کا پروگرام پیش کرتے تھے اس وقت نہایت خوبصورت جوان تھے اور اب خوبصورت بڈھے ہیں۔

میں نے انھیں خوبصورت بڈھے کا آغا حیدر حسن کا لطیفہ سنایا:

آغا حیدر حسن صاحب پیرس میں "ایفل ٹاور" کے سامنے بنچ پر بیٹھے تھے ایک حسینہ آئی انھیں خوب غور سے دیکھا اور پھر انھیں اصرار کر کے اپنی کار میں بٹھالیا۔ خوب پیرس کی سیر کروائی اور پھر اپنے گھر والوں سے ملوایا اور پھر آغا صاحب کی جائے رہائش پر پہنچا گئی۔ آغا صاحب نے آخر میں پوچھا:

"بیٹی یہ تو سب جو ہوا اس کا بہت بہت شکریہ۔ اب یہ بتاؤ اس مہربانی کی وجہ کیا تھی؟"

حسینہ نے کہا: "حیدر صاحب! میں نے آج تک آپ جیسا خوبصورت بڈھا کبھی نہیں دیکھا۔" گویا وہ آغا صاحب کے حسن کو سراہ رہی تھی۔

اس لطیفہ کے سننے کے بعد گھٹا صاحب "خوبصورت بڈھے" کے لقب پر راضی ہوئے۔

خواجہ صاحب اور کھٹا صاحب حیدرآباد کی بھری پُری محفلیں چھوڑ کر گئے تھے
اب ہم آئے ہیں تو محفلیں برخواست ہو چکی ہیں۔

کھٹا صاحب نے ہمارے دکھنی میں شاعری کرنے والوں کو اپنی نظموں کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ اس زبان میں مزاح کے ذریعے بڑی گہری فکر انگیز بلکہ بعض اوقات بڑی دُکھ بھری باتیں بھی کہی جا سکتی ہیں۔ مزاح پیدا کرنے کے لیے بیویوں، سالوں، داماد وں، سسروں، ساسوں پر پھبتیاں کسنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ یہ انتہائی پھچھوراپن ہے۔

اسلام نے ہر انسان کے تین باپ گنائے ہیں۔ ایک جو جنم دیتا ہے، دوسرا جو تعلیم دیتا ہے، تیسرا جو اپنی لڑکی زوجیت میں دیتا ہے۔ ساس سسر کا مذاق اڑانا اپنے ماں باپ کا مذاق اڑانے کے مماثل ہے۔

خواجہ صاحب اور کھٹا صاحب کی آمد ایسی ہی ہے جیسے جب دنیا میں خرابیاں آجاتی تھیں تو اللہ تعالیٰ کوئی پیغمبر بھیج دیتا تھا اسی طرح یہ لوگ حیدرآباد کی تہذیب و روایات کو اپنے سینوں میں بند کر کے لے گئے تھے اور اب ہمیں بتانے آئے ہیں کہ ہماری اصل تہذیب اور زبان کیا تھی ———

زندہ باد کھٹا صاحب!
زندہ باد خواجہ صاحب!

اخبار رہنمائے دکن۔ مورخہ [illegible] سے ماخوذ

محترمہ لطیفہ بیگم

ایک خیر مقدمی تقریر

"قلم اور آواز" کی جانب سے آج ہم ان دو شخصیتوں کا خیر مقدم کر رہے ہیں جو ہیں تو ہی کی لیکن کہلاتے ہیں پاکستانی اور جناب خواجہ حمید الدین شاہد کے الفاظ میں ؎

جانے کیا گزرے گی اس وقت ہمارے دل پر
اپنے ہی شہر میں جب آپ ہی مہماں ہونگے

جذبۂ الفت کا اثر ہو گا تو ہم بھی شاہد
بزمِ احباب میں اک روز غزل خواں ہونگے

شاہد صاحب اور اعجاز حسین کھٹا صاحب کے یہاں آنے سے جو محفلیں سج رہی ہیں ان ن پرانے حیدرآباد کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ شاہد صاحب ڈاکٹر زور کے چند ممتاز شاگردو یے جاتے تھے، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے سرگرم رکن اور ماہنامہ "سب رس" کے شاہد صاحب نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم میں حاصل کی۔ ایم اے کا امتحان جامعہ عثمانیہ ڑی درجہ میں کامیاب کیا اور دارالعلوم کالج حیدرآباد میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ٹ کالج (حیدرآباد) میں بھی اردو کے لیکچرار رہے۔ جامعہ عثمانیہ میں چودہ برس تک اردو رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن اور اکیڈمک کونسل کے ممبر بھی رہے سماجی اور دیگر ممتاز انجمنوں اور اداروں کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے قدیم ترین سائنٹفک ادب" ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ "سرگزشت ادارہ ادبیات اردو "ارمغانِ احمد" "حیدرآباد کے شاعر" اور "یادگومتی" ان کی تصانیف ہیں۔ جناب شاہد کی مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں زور صاحب کی ایما پر وہ پاکستان

چلے گئے۔ لیکن جس ایوانِ اُردو کو انھوں نے پروان چڑھایا تھا اس کی یاد انھیں پاک میں بھی نہیں بھولی اور انھوں نے نہ صرف اپنے گھر کا نام "ایوان اُردو" منتخب کیا بلکہ ایوان اُردو سے "سب رس" (ماہنامہ) بھی جاری کیا اور اس طرح حیدرآباد اور زورصاحب سے اپنی محبت اور وفاداری کا رشتہ جوڑے رکھا۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد شاہد "ترقی اُردو بورڈ (کراچی)" سے وابستہ ہوگئے اور (۱۷) سال تک لغت اردو پر کام کرتے رہے نادر کتب خانہ بھی قائم کیا جس سے پاکستان کے ریسرچ اسکالر اور طلباء استفادہ کرتے ہیں ۱۹۷۵ء میں ترقی اُردو بورڈ (کراچی) سے علحدہ ہوئے۔ پھر اچانک عارضۂ قلب میں مبتلا ہوگئے۔ لیکن خدانے شفا دی اور جس چیز نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور انھیں قوت دی وہ وہی "ایوان اُردو" اور سب رس کا جادو تھا جو ان کی رگوں میں سرایت کرگیا تھا اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے نام کا کرشمہ تھا جو ان کا زورِ بازو بن گیا۔

جو احساسات وخیالات تمنائیں اور خواہشات زورؔ صاحب کے دل و دماغ میں موجزن تھیں، جو خواب ان کی آنکھوں میں سجے تھے، شاہدؔ صاحب نے عزم واستقلال کے ساتھ ایک ایک کرکے پورے کیے اور ان خوابوں کی ٹھنڈی چھاؤں کو حقیقت کی چلچلاتی دھوپ سے آشنا کیا اور یوں حیدرآباد کے ایوانِ اُردو کا اپنے شانوں پر مضبوطی سے تھامے رکھا۔

شاعر یا ادیب کسی خاص مسلک سے وابستہ نہیں ہوتا۔ وہ تو ادب وتہذیب کا ہوتا ہے اور خلوص وانسانیت کا سفیر جس کے گیت سانسوں کی دُھن پر نغمہ ریز ہوجاتے ہیں اور زندگی کی دھڑکن بن جاتے ہیں۔

جناب اعجاز حسین کھٹا صاحب ہماری دکنی زبان، دکنی تہذیب ومعاشرت کی رعنائیاں لے کر جب پاکستان تشریف لے گئے، تو وہاں کے ریڈیو اور ٹی وی نے اپنے گلے لگالیا۔ جناب اعجاز حسین صاحب کھٹا دکنی زبان وتہذیب کے سفیر کہلاتے جاتے ہیں۔ وہ ایک حساس شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ زندگی کی بے اعتدالیوں بدنما داغوں اور سماج کی کمزوریوں پر بڑے ہی تیکھے انداز میں نشتر لگائے ہیں۔ دکنی زبان اور نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع سے ان کی محبت اٹوٹ ہے جس کا اظہار ان کی نظموں سے ہوتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ریڈیو اور نمائش گاہ میں آپ کی تقریر

ے ۴۰ سال قبل جو صاحب استاد کا کردار ادا کرتے تھے وہی اعجاز حسین کھٹا تھے۔

غواصی نے کہا ہے دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں۔ وہ حقیقت ہے کہ دکن ۔ دکن کے قدیم باشندے
ں زبان کی گوناگوں خصوصیات تاریخ کے اوراق سے مٹائی نہیں جاسکتیں۔ جناب اعجاز حسین
ب کا دکنی زبان میں "دکنی زبان" جس کلام بے ساختہ پن، شیرینی، زور صداقت اور
ت جیسی اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ حال ہی میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ادارۂ ادبیات
یدرآباد کی جانب سے کھٹا صاحب کے کلام کو شائع کیا جائے گا۔

"قلم اور آواز" کی طرف سے میں دکن کے ان دونوں بیٹوں کا اس محفل میں خلوص دل
ر مقدم کرتی ہوں جو شاید کچھ ہی دنوں میں اپنے وطن کی مٹی کی اس سوندی خوشبو گلابی جامن
ںڈی پیٹ کے خوش ذائقہ پانی کو چھوڑ کر پھر اس سرزمین پر لوٹ جائیں گے جس نے انہیں ہم
مینا ہے۔

سکا۔ جہاں بھی رہے نیک نامی اور ہر دلعزیزی ان پر سایہ فگن رہی۔ ناجائز مالی
ٖخت سے ان کا دامن کبھی داغ دار نہ ہو سکا۔ مدت العمر وہ نہ تو مفاد پرست سربراہانِ
ت کے نقش قدم پر چلے اور نہ خود غرض سیاست دانوں سے ساز باز کرکے وزارت و
رت حاصل کرنے کے چکر میں پڑے۔ اصول پسندی، راستبازی، ملک و قوم کا مفاد اور
ت پسندی ہمیشہ ان کا شعار رہا۔ ان کی مثالی زندگی کے نقوش دورِ حاضر کے صاحبانِ
ار اور آنے والی نسل کیلئے چراغِ راہِ ہدایت کا کام دیں۔

ڈاکٹر ممتاز حسن کی پہلو دار شخصیت پر ایک مبسوط تذکرہ قلمبند کرنے کی ضرورت ہے۔
ے ملک کے دانشوروں بالخصوص ان کے فیض یافتوں کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ جلد سے
اس قومی اہمیت کے کام کی تکمیل کرکے ان کی روح کو اپنی احسان مندی کا نذرانۂ عقیدت
ں کریں۔

ورق تمام ہوا داستاں باقی ہے۔

اور خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء*

ایوانِ اردو کے مکین

نارتھ ناظم آباد کراچی میں میرے والد (مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب، سابق مددگار ناظم تعلیمات) ہت ہی اچھے دوست رہتے ہیں۔ گھر کا نام "ایوانِ اردو" ہے۔ علمی و ادبی رسالہ سب رس ں کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ سراپا خلوص، اتنا شاندار رکھ رکھاؤ کہ ایک بار ملنے والا سو بار ی خواہش کرے۔ انھیں تہذیب و شائستگی کا دبستان کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہیں پروفیسر خواجہ ـد الدین شاہد۔ تقریباً ۲۵ سال قبل جب میں دکنی قواعد پر کام کر رہی تھی وہ حیدرآباد ہی میں ۔۔ ڈاکٹر زورؔ کے ایوانِ اردو میں انھیں سلام کرنے کا موقع ملتا۔ پچھلے جون میں کراچی نے کا اتفاق ہوا۔ دوسرے ہی دن میں نے انھیں فون پر سلام کیا۔ جواب میں انھوں نے ے ریڈر بننے کی پرخلوص مبارک باد اور چھوٹتے ہی ایک دن افطار کی دعوت دے دی۔ ت بڑا سرسبز و شاداب لان، اس پر رنگ برنگی خوب صورت کرسیاں، ایک میٹر پر دو ے کولر تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایک واٹر کولر اور دوسرا شربت کولر تھا۔ افطار میں اتنی شش چیزیں تھیں کہ کئی روزہ داروں کے منہ میں پانی آگیا۔ لان پر ہی نماز کا انتظام تھا طار کی نوعیت اور مقدار دیکھ کر میں نے سمجھا کہ نماز پڑھ کر سلام پھیرتے ہی شاہد صاحب ن چھالیہ دے کر خدا حافظ کہہ دیں گے۔ لیکن اس کی بجائے انھوں نے ہمیں گھر کی طرف ارہ کر کے کہا "چلیے" مطلب یہ کہ ڈرائنگ ہال جانا تھا۔ دروازے کے پاس ہی سے قالین

---

* ریڈر شعبۂ اردو۔ یونیورسٹی کالج فار ویمن حیدرآباد

شروع ہوگیا۔ میں نے چپل دروازے کے پاس چھوڑ دی۔ شاہد صاحب نے کہا آپ چپل پہن کر
اندر جاسکتی ہیں۔ ہر طرف قالین ہی قالین تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "چپل کہاں
تک پہن کر جا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا — وہ — سیڑھیوں کے پاس جہاں جوتا اسٹانڈ ہے وہاں تک
جوتے چپل جاسکتے ہیں۔ اس اصول کی خلاف ورزی کریں گی تو جس کھانے کی خوشبو آپ
محسوس کررہی ہیں اس سے محروم رکھی جائیں گی۔ اس دھمکی کے سنتے ہی میں نے چپل
وہاں چھوڑ دی۔ ویسے بھی جمالیاتی ذوق رکھنے والا وہاں پہنچ کر بغیر چپل کے ہی جانے کو ترجیح
دیتا۔ اس لئے کہ وہاں سے جو قالین شروع ہوا تھا اس پر چلتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی
تھی۔ بہت ہی ملائم، نفیس اور دبیز قسم کا قالین تھا۔ سیڑھیوں کے بعد ڈائننگ ہال میں
دوسرا قالین تھا۔ ان ہی قالینوں میں کھوئی ہوئی چلی جارہی تھی کہ کھانے کی میز سے ٹکرا
گئی۔ کھانے کی میز پر نظر پڑی۔ مرغی، بریانی، قورمہ، کباب، شیرمال، دہی کی چٹنی
ٹنگ، رس ملائی ڈھیر ساری چیزیں تھیں۔

شاہد صاحب کی بیگم صاحبہ ڈاکٹر فراست بھی ان ہی کی طرح پرخلوص ہیں۔ بہت دیر تک
انھوں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں گفتگو کی۔ واپسی کا وقت آیا تو
شاہد صاحب وہیں سے خدا حافظ کہنے کی بجائے گیٹ کے باہر تک آگئے۔ ہمارے لاکھ منع کرتے
بھی انھوں نے مناسب یہی سمجھا کہ شرمندہ کرکے ہندوستانیوں کو سبق سکھانا چاہیئے کہ
اخلاق لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ ان کا دستور ہے کہ آئے ہوئے مہمان کی جی کھول کر خاطر
کرتے ہیں۔ مہمان کے موٹر میں بیٹھنے اور موٹر کے آگے بڑھنے کے بعد گھر واپس جاتے ہیں۔
اب میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ آئندہ پاکستان جاؤں تو موٹر کو دور چھپا کر ان کے گھر پیدل ہی
جاؤں گی۔ تاکہ واپسی پر وہ جو زحمت اٹھاتے ہیں اس سے ان کا کھلایا پلایا پانی نہ ہو۔

شاہد صاحب نے محترم اعجاز حسین کھٹا صاحب کے ہمراہ حیدرآباد آنے کی خوش خبری خط کے
ذریعہ دے دی تھی۔ اب یہ دونوں مایہ ناز ہستیاں حیدرآباد میں ہیں۔ سرورڈنڈا تقاریب
اختتام کے بعد روزانہ کہیں نہ کہیں غیر مقدمی جلسے منعقد کئے جارہے ہیں۔ کئی جلسوں میں

میں نے شرکت کی ۔ جہاں وہ جارہے ہیں شان دار استقبال کیا جارہا ہے ۔ ایک بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ شاہد صاحب حیدر آباد اور حیدر آبادیوں کو بھلا نہیں پائے ۔ عثمانیہ یونیورسٹی، یونیورسٹی کالج فار ویمن اور دوسری عمارتوں میں جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے پرانی یادوں میں گم ہوگئے ۔ کئی جلسوں میں دوران خطاب ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے ۔

کراچی میں وہ مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں ۔ ان کے گھر " ایوانِ اردو " میں آئے دن ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں ۔ بہت بڑی لائبریری بھی ہے جس سے کئی ریسرچ اسکالر استفادہ کرتے ہیں ۔ اس لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ حیدر آبادی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کا ایک گوشہ مختص ہے ۔ یہ کتابیں کراچی کی کسی اور لائبریری میں اتنی تعداد میں نہیں ملیں گی ۔ سب رس پابندی سے شائع ہوتا ہے اور مجھے ہر ماہ بحفاظت مل جاتا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ حیدر آباد کے جو بھی لوگ خریدار بنیں گے انھیں یہ پرچہ پابندی سے ملا کرے گا ۔ سب رس کے کئی خصوصی نمبر بھی شائع ہوچکے ہیں ۔ جو دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں ۔ "یادِ رفتگاں" کے نام سے خصوصی شمارے منظرِ عام پر آئے ہیں ۔ ان پرچوں میں ان دانش وروں کا ذکر ہوتا ہے جو اس دنیا میں نہیں رہے ۔

شاہد صاحب کو علم و ادب سے فطری لگاؤ ہے ۔ وہ تن من دھن سے اردو ادب کی خدمت کررہے ہیں ۔ حیدر آباد کے کئی جلسوں میں دورانِ تقریر انھوں نے کہا کہ اگر یہاں کے کوئی ریسرچ اسکالر پاکستان آئیں تو وہ ان کی ہر ممکنہ مدد کرنے تیار ہیں ۔ اب پیاسوں کا کام ہے کہ وہ کنویں کے پاس جائیں اور اپنی پیاس بجھائیں ۔

خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ شاہد صاحب کو تندرست و توانا رکھے ، ان کی عمر دراز کرے اور وہ اسی طرح علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں ۔

ضیاء متین

کراچی میں دوسرا حیدرآباد
خواجہ حمید الدین شاہد

تاثراتی خاکہ

ممتاز شاعر رؤف خیر کا ایک شعر ہے ؎

یہ ضد ہوا کو ہے میرا خیمہ اکھاڑے گی
یہ ضد زمین کو، میری مٹی نہ ہو خراب

زمانے کی ہوا نے جن حیدرآبادیوں کے خیمے یہاں سے اکھاڑ دیئے، ان میں حمید الدین شاہد بھی ایک ہیں۔ لیکن زمین نے بھی اپنی ضد پوری کی یعنی پردیس میں اپنی مٹی کو خراب ہونے سے بچا لیا۔ حیدرآباد، ڈاکٹر زور، "ایوانِ اردو" "سب رس" ادارۂ ادبیاتِ اردو، چادر گھاٹ سالار، حیدرآباد کے شاعر (جلد اول) اردو فیسٹول، پہلا یوم قلی قطب شاہ ان تمام سے حمید الدین شاہد کے انسلاک وار تباط کا حال، پرانے حیدرآبادی تو خوب ہی جانتے ہیں لیکن نئی نسل نے ہم عمر دور کے احباب سے، اس بارے میں بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ میرے اس مضمون میں یہ ساری باتیں، پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ پیش منظر میں وہ اکیس برس آجاتے ہیں جو انہوں نے اپنے وطن سے دور رہ کر گزارے۔ آج کی نسل اور شاید آنے والی نسل کو بھی انہیں اکیس برسوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اُن کے اس پورے سفر کا جائزہ، یا تو وہ خود لے سکتے ہیں یا پھر اُن کا کوئی ہم سفر۔ میں اور مجھ جیسے حیدرآبادی، جو اپنے کسی کام سے یا عزیز و اقارب سے ملنے کے بہانے وہاں جاتے ہیں، ان کے اس سفر کی، جو انہوں نے ہم سے بچھڑ کر طے کیا صرف چند جھلکیاں

ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
مکان نمبر ۵۸۷-۳-۹۹/۱۲ ... حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

یکھ سکتے اور دکھا سکتے ہیں ۔ میں بھی صرف چند جھلکیوں کا شاہد ہوں ۔ یہ چند جھلکیاں میں
اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ میرے ہم عصر شاہد صاحب اور انہی کے قبیل کے بزرگوں کی ان
روایات اور اقدار کو جو انکی سانسوں کا حصہ ہیں اپنی سانسوں میں بھر سکیں ۔

وہ دسمبر ۱۹۸۱ء کا ایک سرد لیکن خوشگوار دن تھا کہ جب میں شاہد صاحب
ملنے انکی کوٹھی پہنچا ۔ یقین جانئے ، باہر ہی ٹھٹھک کر رہ گیا ۔ خوبصورت ڈیزائن کی ہوئی
منزلہ کوٹھی ، پائیں باغ ، ایک ساتھ کھڑی ہوئی دو موٹریں ۔ سوچنے لگا کہ اتنی شاندار کوٹھی اور
دو موٹریں کیا اپنے انہی شاہد صاحب کی ہو سکتی ہیں جو کبھی حیدرآباد کے ایک محلے "پنجی براق" میں
رہتے تھے ۔ کہیں ان کے ہاتھ علاؤالدین کا جادوئی چراغ تو نہیں آ گیا ؟ اس کے ساتھ ہی پہلے
سنی ہوئی چند باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں ۔ فرمانبردار ، خوش مزاج ، اعلیٰ تعلیم یافتہ فرزند
ہیں سب سے چھوٹے ڈاکٹر خرم فیاض الدین ، شکاگو امریکہ میں مقیم ، بڑے صاحبزادے کیپٹن روت
الدین پائلیٹ اور منجھلے ، بصالت علی الدین کا اپنا بزنس ـــ بیگم صاحبہ شہر کی ممتاز اور مشہور
ڈاکٹر جن کا اپنا ذاتی کلینک اور میٹرنٹی ہوم اور خود وہ بھی جو آج تک مختلف عہدوں پر فائز
رہ معروف رہے ۔ پھر یہ کوٹھی ، یہ موٹریں اور یہ شاہد صاحب ۔ اس علاؤالدین کے پاس
صرف ایک چراغ تھا ان کے پاس تو کئی چراغ ہیں ۔

یہی سوچتے سوچتے میں نے کال بیل دبا دی ۔ ملازم نے ڈرائینگ روم کا دروازہ
کھولا ـــ جی صاحب !

جواب میں ، میں نے بھی کہہ دیا ـــ جی صاحب !

وہ بے ساختہ ہنس پڑا ۔ اس وقت تک میں سنبھل چکا تھا ۔

شاہد صاحب ہیں ؟ ـــ جی ہیں ـــ کہنا کوئی ان سے ملنے کے لیے حیدرآباد دکن
سے آیا ہے ۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا ۔ اب میں ان کے ڈرائینگ روم میں تھا ۔

سگریٹ کے دھوئیں میں ڈرائینگ روم کا جائزہ لینے لگا ۔

فرش پر دبیز قالین ، پاؤں گھڑی ایسی کہ جس پر پاؤں رکھنے کو جی نہ چاہتا
تھا ۔ ایک جانب مشرقی وضع کی نشست کا اہتمام تھا یعنی تخت ، جس پر سفید براق چاندنی
بچھی ہوئی [illegible]

دیا۔ پہلے عثمانیہ یونیورسٹی، چادر گھاٹ [illegible] زمانے [illegible] حیدرآبادی تھے

[illegible] اور گنبدوں کی تصویریں [illegible] شوق و ذوق کی نشست کے مطابق تمام [illegible]

کتابوں [illegible]۔ اس کا [illegible] حیدرآباد ہی [illegible]

اگلے [illegible] شاہد صاحب شیروانی کے [illegible]

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے۔ میں نے معانقہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا، عثمانیہ یونیورسٹی اور حیدرآباد کے نام پر ان کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ وہ سر سے [illegible] انہوں نے مجھے کھینچ کر اپنے گلے لگا لیا۔ میں نے کہا شاید آپ کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے، کہنے لگے "اب نہیں جاؤں گا۔" تم آگئے ہو تو تم سے باتیں ہوں گی۔ سب سے پہلا سوال جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ کراچی کب آئے؟ تمہارا سامان کہاں ہے؟ ابھی اور اسی وقت میری موٹر میں جاؤ اور اپنا سامان یہاں لے آؤ، جتنے بھی دن قیام کا ارادہ ہو، یہیں رہنا۔ میں نے بڑی لجاجت سے کہا، شاہد صاحب میرے بچپن کا ایک دوست حسین شریف ظہیر ہیں، قریب فیڈرل بی ایریا میں رہتا ہے۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اس کے یہاں ٹھہروں۔ ویسے بھی صرف آٹھ دن کے لئے یہاں آیا ہوں اسی لئے ...... اس کے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا! میرے اس جواب پر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد، یوں گویا ہوئے۔ ٹھیک ہے جب یہ بات ہے تو میری بھی ایک شرط ماننی پڑے گی۔ اور وہ یہ کہ تم روزانہ، مجھ سے ملنے آؤ گے میں نے کہا کہ آپ یہ شرط نہ بھی رکھتے تو میں ضرور آتا، اسلئے کہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں جن شخصیتوں سے ملنا ہے ان سے میں آپ ہی کے توسط سے ملنا چاہتا ہوں۔ اتنی دیر میں چائے بسکٹ اور پھل آگئے اور ان کے برادر نسبتی عبدالمنعیم صدیقی بھی، وہ تو تھوڑی ہی دیر میں مجھ سے ایسے گھل مل گئے جیسے برسوں کی ملاقات ہو۔ نہایت خلیق اور ملنسار اور پرخلوص الشان ہیں۔ ہماری شاعری کا دعویٰ تو رہی ایک طرف، ان سے جس طرح تعارف کرایا اس کا خط ہو۔

"میرے حیدرآباد کا ہے"

اس کے بعد گفتگو [illegible] اور [illegible] حیدرآباد [illegible]

صمد بھائی، عابد علی خان، محبوب حسین جگر، [illegible] محمود انصاری، [illegible] حسینی، علی [illegible] میاں، [illegible] اقبال متین، [illegible]

بس ۱۰ حضرت، خیرات ندیم، مصطفیٰ کمال، وقار خلیل، فاتی آرٹسٹ کے سعادت بھائی کنور راج [illegible] کنول جیدرآباد کے جدید شاعر اور ادیب جنہیں کہ کسی احباب کہا جاتا ہے۔ [illegible] سب سے نمایاں گفتگو مجتبیٰ حسین کے بارے میں ہوئی جو ان کا "آدمی نامہ" اپنے ساتھ [illegible] پہنے میں ان کی کچھ سوچ اور کچھ ہماری گفتگو کا موضوع تھا۔ اس بارے میں انہوں نے بہت کچھ کہا لیکن جو بعد مجھے یاد رہ گیا وہ یہ تھا کہ "مجتبیٰ حسین نے اپنے بہت سے ہم عصر ادیبوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔" میں ان کی باتیں سن رہا تھا، مگر اس وقت میرے ذہن میں اختر شیرانی کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" گونج رہی تھی۔

میں ڈر رہا تھا کہ ان شخصیتوں کے بعد شاہد صاحب کہیں یہ نہ پوچھ بیٹھیں کہ بتاؤ چارمینار کیسا ہے؟ قلعہ گولکنڈہ کے آثار کا کیا حال ہے؟ نیا پل، مکہ مسجد، جامعہ عثمانیہ، دواخانہ عثمانیہ، یونانی شفاخانہ، اسمبلی (اندر سے اور باہر سے) حسین ساگر، اور سالار جنگ میوزیم کیسے ہیں؟ شہر میں مچھروں کی فوج کے لئے آدمیوں کا خون کافی ہو جاتا ہے کہ نہیں؟ سڑکوں کے گڑھوں میں کچھ کمی ہوئی ہے کہ نہیں؟ پرانے شہر میں بارش کے بعد ہر سال کتنے مکان گرتے ہیں؟ اردو مدارس کا کیا حال ہے؟ الکشن کے بعد کیا کوئی لیڈر اپنے حلقۂ انتخاب میں آتا ہے؟ یہ اور ایسے ہی ڈھیروں سوالات۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے یہ سب کچھ نہیں پوچھا۔ ورنہ میں کیا جواب دیتا! جب کہ اس کا جواب محکمۂ آثارِ قدیمہ، تعمیرات و صحت عامہ، بلدیہ، پولیس اور خود حکومت کے پاس نہیں ہے!

باتوں ہی باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا، میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر کھانے کی میز پر لے گئے، اپنی بیگم صاحبہ سے بھی اتنا ہی تعارف کروایا،

"میرے حیدرآباد کا ہے"

اپنے ہاتھ سے کھانا ڈال کر مجھے کھلایا ــــ چائے کے دوران میں نے کہا شاہد بھائی مجھے آج ہی ڈاکٹر جمیل جالبی سے ملنا ہے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے، میں ابھی ٹیلیفون کئے دیتا ہوں تم چلے جانا۔ ٹیلیفون اندر کے کمرے میں ہے۔ پوری گفتگو تو سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن ایک جملہ جسے انہوں نے دو تین بار دہرایا تھا،

"جی ہاں، جی ہاں ــــ میرے حیدرآباد کا ہے"

ٹیلی فون کے کمرے سے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی انہوں نے یہ مژدہ سنایا کہ

سیاسی بلاوا ہو چکا' اسی وقت ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ"
پاپا نے فون پر گاڑی کا کہا "سنو یہ صاحب میرے دوست حیدرآباد پاکستان کے ہیں تم ان کو
ت انہیں جالبی صاحب کے پاس لے جاؤ۔ اور ہاں، کل سے یہ جب بھی یہاں کہیں
سے جہاں کہیں جانا چاہیں، تم انہیں اپنی گاڑی میں لے جانا جتنی دیر یہ وہاں ٹھہریں تم گاڑی میں ہی
یا، انہیں چھوڑ کر واپس نہ آجانا۔" میں نے کہا شاہد بھائی، مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا مکان
ں سے بہت قریب ہے۔ یعنی صرف ایک گلی (LANE) بیچ میں ہے میں پیدل ہی چلا جاؤں گا
نے لگے، "نہیں، ---- موٹر جو ہے۔"

میں سہ پہر تین بجے گیا۔ شام چھ بجے لوٹا تو دیکھا کہ شاہد صاحب اپنے
دونوں ہاتھ پیچھے باندھے نہایت بے چینی سے ٹہل رہے ہیں۔ کہنے لگے' تم تو تین بجے جالبی صا
حب کے ہاں گئے تھے اور اب چھ بج چکے ہیں۔ کیا وہاں سے کہیں اور گئے تھے؟" میں نے کہا جی نہیں
تین گھنٹے میں نے جالبی صاحب ہی کے ساتھ گزارے ---- ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جب
بند ہوا تو اس سے صرف ایک لفظ نکلا "ہائیں" پھر یوں گویا ہوئے "پورے تین گھنٹے تم جالبی صاحب
کے ساتھ رہے؟ ---- میں نے کہا اس میں کون سی ایسی خاص بات ہو گئی کہ آپ اس قدر
حیران ہو رہے ہیں۔ تب نہایت نرمی سے کہا "ارے تو تو جادوگر ہے' جادوگر' تجھے نہیں معلوم
جالبی صاحب کتنے مصروف رہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ کسی کو گھنٹے آدھ گھنٹے سے زیادہ
وقت ہی نہیں دیتے۔ میں نے کہا میں اور جادوگر ---- بولے' ٹھیک ہے تو
جادوگر نہیں ---- مگر،

"میرے حیدرآباد کا تو ہے"

میں نے بات کا رُخ پھر جالبی صاحب کی طرف پھیرتے ہوئے کہا ----
مگر ان کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور کشش ہے، پتہ نہیں کیا بات
ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق میرے موضوع سے ہو کہ وہ بڑی ہی محبت
سے ملے۔ چائے' بسکٹ' اور پھل ---- اور ان سب سے زیادہ ان کی
باتیں ---- حیدرآباد' اس کی ادبی فضا' عثمانیہ یونیورسٹی' دارالترجمہ ---

ان ساری باتوں میں تین گھنٹے تو کیا تین دن بھی گذر جاتے تو پتہ نہ چلتا
ن۔ م۔ راشد پہ ان سے انٹرویو بھی کیا۔ ان کے یہاں میرے موضوع سے
کی نشاندہی بھی کی۔ انہوں نے وہ سارا مواد کل دینے کا وعدہ کیا ہے، [illegible]
نے کہا میں ٹھیک وقت پہ پہنچ جانا، جالبی صاحب وقت کے بہت پابند ہیں وہ
سے سیدھے میرے پاس چلے آنا۔ دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔" میں نے [illegible]
تو ڈرائیور کو بلا کر مجھے فیڈرل بی ایریا چھوڑ آنے کی ہدایت دینے لگے۔

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے دن میں جالبی صاحب
پہنچ گیا۔ وہ میرے منتظر بیٹھے۔ ان سے کوئی سو صفحات کا مواد مل گیا
کہ وہ سارے پرچے تھامے بارہ، ساڑھے بارہ بجے شاہد صاحب کے پاس پہنچا۔
کے اتنے سارے شمارے دیکھکر بہت خوش ہوتے، کہنے لگے بہت اچھا
ہو، میں نے کہا وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان تمام پرچوں میں میرے کام کا جوم
اسے (PHOTO STAT) کروا کے کل شام تک یہ پرچے لوٹانے ہیں ــــ جواب
منجھلے صاحبزادے بصالت علی الدین کو بلوا لیا، ان کو الگ لے جا کر کچھ کھسر پھسر کی
مجھ سے کہا، ان کے ساتھ اسی وقت چلے جاؤ، تمہارا کام ہو جائے گا۔

راستے بھر میں یہ سوچتا رہا، پردیس میں ہوں، پیسے بھی کم رہ گئے
واپسی کا کرایہ، سفر خرچ، پھر اس شہر ستم گر سے کچھ یادگار بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہ
دیکھیں فوٹو کاپی کی کیا رقم بنتی ہے؟ ایک جھٹکے کے ساتھ جب موٹر رکی تو میرے ان
سلسلہ ٹوٹ گیا۔

دکاندار کو کام سمجھا کر تھوڑی دیر کے لیے میں قریب کی پان شاپ تک
لیکن اتنی دیر میں بصالت میاں اپنا کام کر چکے تھے۔ دکاندار نے جب وہ سارا مو
حوالے کیا تو جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دبی زبان میں اس سے پوچھا
پیسے ہوتے؟ وہ کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ مجھے ہارن کی آواز سنائی
میاں موٹر میں بیٹھ چکے تھے۔ مواد میرے ہاتھ میں تھا اور ہارن مجھے بلا رہا تھا
میں بیٹھنے کے بعد میں نے نہایت رازدارانہ انداز میں پوچھا، پیسے

شاہد صاحب نے تم سے کیا کہا تھا۔ بسالت نے جواب دیا، "پپّا نے صرف اتنا
کہا تھا کہ :"

"آپ اُن کے حیدرآباد کے ہیں"۔

"ان کے حیدرآباد" پر مجھے حیرت نہیں ہوتی۔ جس لڑکے نے حیدرآباد کی صورت ہی نہ دیکھی ہو وہ "اپنے یا" میرے "حیدرآباد کبھی نہیں کہہ سکتا — یہ دو نسلوں کا تفاوت ہی نہیں دو ذہنوں کا تفاوت بھی ہے۔ لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ وہاں کی نئی نسل بھی شاہد صاحب ہی کی بدولت حیدرآباد سے زیادہ واقف ہوتی ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد، وہ پہلی منزل پر اپنی لائبریری دکھانے لے گئے ایک وسیع و عریض ہال میں اس کونے سے اس کونے تک کتابوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ کتابیں بول رہی تھیں کہ یہ شخص، روزانہ ہماری مزاج پرسی کو یہاں آتا ہے۔ اس نے ہمیں بڑے جتن سے بڑے آرام سے اور بڑے سلیقے سے یہاں سجایا ہے — اور میں سُن رہا تھا۔ کتابوں کی اس دنیا کی سیر کرتے ہوئے، ایک جگہ میرے قدم خود بخود رک گئے بلکہ جم کر رہ گئے اور وہ جگہ تھی "گوشۂ حیدرآباد" جس میں حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں اپنی زبان سے گویا یہ اعلان کر رہی تھیں کہ ملکوں کی سرحدوں پر لگائی ہوئی "تار کی باڑھ" ادیبوں اور شاعروں کو، ان کی کتابوں کو، ان کے افکار اور خیالات کو روک نہیں سکتی — دیکھ لو! ہم یہاں بھی ہیں۔ اس روحانی مسرت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا، جب میں نے یہ دیکھا کہ پہلی ملاقات پر جن حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں میں نے انہیں دی تھیں وہ بھی "گوشۂ حیدرآباد" میں عافیت سے تھیں۔ اُن میں مجتبیٰ حسین کا "آدمی نامہ" مغنی تبسم کا شعری مجموعہ "پہلی کرن کا بوجھ" مظفر مجاز کا "موسم سنگ" رؤف خلش کا "نئی رُتوں کا سفر" علی الدین نوید کا "صدف تمام ریت ریت" رؤف خیر کا "ایلاف" اسلم عمادی کا "اجنبی پرندے" علی ظہیر کا "رات کے ہزار ہاتھ" اور خود میرا شعری مجموعہ "زینہ زینہ راکھ" شامل ہیں۔ کتابوں اور رسالوں کے علاوہ روزنامہ "سیاست" اور روزنامہ "منصف" کے فائل بھی نظر آئے۔

اس لائبریری میں جہاں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں اور رسالے موجود ہیں اگر آپ کسی

کتاب یا رسالے کی فرمائش کریں تو شاہد صاحب پانچ منٹ کے اندر وہ کتاب یا رسالہ آپ کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ انہیں کتابوں اور رسالوں کے ساتھ سوتے اور جاگتے بھی ہیں۔ لائبریری سے لوٹتے ہوئے سامنے کی دیوار پر ٹنگی ایک تصویر کی جانب اشارہ کرتے، کہنے لگے "جانتی معلوم ہے یہ تصویر کس کی ہے؟ میں نے نفی میں گردن ہلا دی ـــــ بولے "یہ جو دائیں جانب ہاتھ میں چھڑی تھامے بیٹھے ہیں، سید احمد عارف مرحوم ہیں جو "دکن" اخبار کے ایڈیٹر تھے ـــ ان کے بازو کھڑے ہیں معین الدین قریشی صاحب مرحوم، مجلہ عثمانیہ کے پہلے ایڈیٹر اور حیدرآباد کے صاحب طرز ادیب۔" میں نے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے جب یہ کہا کہ سید احمد عارف صاحب میرے نانا ہوتے تھے تو وہ تقریباً اچھل پڑے ـــ پھر یوں گویا ہوئے "یہ رشتہ معلوم ہونے کے بعد تو تم اور بھی قریب ہو گئے" ـــ میں نے جب یہ دیکھا کہ اس موقع پر شاہد صاحب سے کوئی بھی بات منوائی جا سکتی ہے تو اچانک اس تصویر کی فرمائش کر بیٹھا۔ بولے، "یہی ایک تصویر ہے میرے پاس ـــ خیر کوئی بات نہیں" یہ کہہ کر، قریب ہی پڑا ہوا اسٹول اٹھایا اور اس پر چڑھ کر، دیوار سے وہ تصویر اتارنے لگے۔ تصویر کے فریم میں، میں نے ان کا عکس دیکھا۔ چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ یہ خوشی ویسی ہی تھی جیسی کسی کا کوئی کام کر دینے کے بعد ہم کو میسر آتی ہے۔ تصویر کو پہلے تو کپڑے سے صاف کیا پھر اسے ہاتھ میں لیے، نیچے اترے۔ اپنے صاحبزادے کو بلا کر کہا "اس کی ایک نقل کل تک مل جانی چاہیئے" ـــ دوسرے دن شام، انہوں نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ کھول کر دیکھا تو اسی تصویر کی نقل تھی۔

شام کی چائے کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا تو بولے، "کل دن بھر چاہے جہاں بھی رہو، چھ بجے شام تک یہاں آ جانا، تمہیں ایک محفل میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا"۔ دوسرے دن شام ان کی بیگم صاحبہ کو کلینک چھوڑ کر ہم سوسائٹی پہونچے۔ میر معزوی کے مکان پر پروفیسر مغنی تبسم کی ہمشیر، صدیقہ شبنم صاحبہ کے اعزاز میں، جو لندن سے کراچی آئی ہوئی تھیں، ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں نقش کاظمی اور ڈاکٹر پیرزادہ قاسم بھائی کے علاوہ کراچی کے بہت سے نوجوان ادیب اور شاعر بھی موجود تھے۔ جب میری باری آئی اور میں نے غزل کا مطلع سنایا تو شاہد صاحب صوفے سے اچھل پڑے آپ نے کسی مشاعرے کے صدر کو اس طرح اچھل اچھل کر داد دیتے ہوئے کبھی نہ دیکھا ہو گا! لیکن، وہ داد کس طرح دے رہے تھے، وہ بھی سن لیجئے: میرے ہر شعر پر وہ صوفے سے قدرے دراز ہوتے، ہاتھ بلند کرتے، اور کہتے:

"میرے حیدرآباد کا ہے۔"

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شاعر اور اس کے شعر کے درمیان کوئی اور آجاتا ہے تو اس کی انا کو سخت ٹھیس پہونچتی ہے۔ ساری محفل تو میرے شعر پر داد دے رہی تھی، اور یہ داد دے رہے تھے اپنے حیدرآباد کو۔ آخر کب تک برداشت کرتا جب چار پانچ شعر تک یہی سلسلہ جاری رہا تو مجھ سے رہا نہ گیا آخری شعر سے پہلے جب انہوں نے پھر یہ کہا کہ "میرے حیدرآباد کا ہے" تو میں نے بھی شرارت سے پوچھا "شاہد بھائی حیدرآباد کا نہیں "میرا شعر ہے"۔ اس پر محفل کا جو حال ہوا ہوگا وہ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن داد دے شاہد صاحب۔ قہقہے تھمتے ہی انہوں نے کہا" "ٹھیک ہے میاں شعر تو تمہارا ہے لیکن تم خود کہاں کے ہو؟" محفل برخاست ہونے کے بعد چند نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا۔ مجھ سے چند دن اور کراچی میں رک جانے کی خواہش کر رہے تھے اور میرے اعزاز میں ایک بڑے ہنگامے کا منصوبہ پیش کر رہے تھے۔ مجھے نوجوانوں میں گھرا دیکھ کر دور کھڑے ہوئے شاہد صاحب نہایت مسرور نظر آرہے تھے اور اپنے قریب ہی کھڑے ہوئے کسی دوست سے میری جانب اشارہ کر کے کہہ رہے تھے'

"میرے حیدرآباد کا ہے۔"

میں وہاں ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ' ن۔ م۔ راشد کے بچپن کے دوست آغا عبدالحمید صاحب' مشہور شاعر افتخار جالب' کراچی یونیورسٹی' اسلامک سنٹر' ڈیفنس کالونی اور پتہ نہیں کہاں کہاں شاہد صاحب کی موٹر میں گیا۔ جب بھی کہیں جانے کا ذکر کرتا موٹر سامنے جانے کے لیے کہتے۔ آخر تنگ آکر ایک بار میں نے کہہ ڈالا' شاہد بھائی' یہ نہ تو میرا احساسِ کمتری ہے اور نہ ہی طبقاتی شعور کا اظہار بلکہ' حقیقتِ حال بیان کرنے کی اجازت دیں تو عرض کردوں کہ جب کبھی میں موٹر میں بیٹھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی چلتی پھرتی جیل میں سفر کر رہا ہوں۔ اور اگر شیشے چڑھا دیئے جائیں تو پھر قفس میں اور موٹر میں کیا فرق ہے؟ میری اس بے سروپا گفتگو کے بعد ان کا ایک ہی جواب ہوتا' "اچھا اچھا چلو اب یہ شاعری بند کرو اور سیدھے جا کر موٹر میں بیٹھ جاؤ۔ راستے میں سوچتا۔ نیا ملک' نیا شہر' نہ لوگ مانوس' نہ راستے معلوم! ایسے میں اپنے شہر کا ایک دیوانہ جب میرا اتنا خیال کر رہا ہے تو سپاس گزاری کے بجائے میں اس کا جی جلا رہا ہوں۔ لعنت ہے مجھ پر۔ دوسرے ہی لمحے ایک آواز آتی' نہیں نہیں جو کچھ کر رہے ہو ٹھیک ہی کر رہے ہو۔ ایسی باتیں نہ کرو گے تو شاہد صاحب تمہیں کس طرح یاد رکھ سکیں گے۔ اسی ادھیڑ بن میں منزل آجاتی اور میں ڈرائیور سے ابھی آیا کہہ کر کسی سے ملنے یا انٹرویو کرنے جاتا تو گھنٹہ دو گھنٹے

بعد آتا!

وہاں پر میرا معمول یہ تھا کہ روزانہ صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ کے بعد ان کی کوٹھی پہونچ جاتا، موٹر لے کر مجھے جہاں جانا ہوتا چلا جاتا اور دوپہر کے کھانے سے ٹھیک بجے پہلے واپس آجاتا۔ دو تین بار تو ایسا بھی ہوا کہ میں کہیں دور نکل گیا اور واپسی پر تین، چار بج گئے۔ اب شاہد صاحب میز پر ہاتھ رکھے کھانے کی میز کے اطراف گھوم رہے ہیں۔ نظریں دروازے پر اور کان موٹر کے ہارن پر ہوتے۔ جیسے ہی میں پہونچا، لپک کر میری طرف آتے ۔۔ قدرے غصے سے اور قدرے پریشانی سے کہتے، "بھوک سے دم نکلا جارہا ہے، کہاں رہ گئے تھے؟" میں کہتا شاہد بھائی آپ نے ناحق میرا انتظار کیا، کھانا کھالیا ہوتا۔ میں پھر کھالیتا۔ کہتے، "میاں، تم تو چار آٹھ دن یہاں رہ کر چلے جاؤ گے میں اپنے حیدرآباد کو کیا منہ دکھاتا۔"

شاہد صاحب فرشتہ نہیں ہیں۔ اور اس دعوی کی دلیل یہ ہے کہ انہیں غصہ بھی آتا ہے لیکن انہیں اپنے غصہ پر قابو بھی رہتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک اصلی انسان ہیں۔ میں نے انہیں دو چار بار غصہ کی حالت میں بھی دیکھا ہے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک ہی رنگ مستقل طور پر ٹھہرا رہتا ہے اور وہ رنگ ہے، ضبط کا رنگ ۔۔ عینک اُتر کر ناک پر آجاتی ہے جسے وہ ویسے ہی رہنے دیتے ۔۔ اور اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر ٹہلتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھی میں نے انہیں کسی کی دل شکنی کرتے نہیں دیکھا۔ ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ مقابل اپنی غلطی تسلیم کرلے۔ اور اگر اتفاق سے مقابل ان کے مزاج سے واقف ہو اور اپنی غلطی فوراً تسلیم کرلے تو شاہد صاحب صرف یہ جملہ کہہ کر کہ "جاؤ اپنا کام کرو، آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔" اپنی عینک درست کرلیتے ہیں اور پیچھے بندھے ہوئے ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

شاہد صاحب اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے، اس لیئے کہ ان کی بیگم صاحبہ شہر کی مشہور ڈاکٹر ہیں۔ اور وہ اپنی صحت سے زیادہ شاہد صاحب کی صحت کا خیال رکھتی ہیں کیونکہ ان کی صحت ہی میں اُن کی اپنی صحت کا راز بھی پوشیدہ ہے۔

کراچی میں، آٹھ دن قیام کے دوران، جس وقت بھی میں ان سے ملنے گیا ہوں بہت کم میں نے انہیں اکیلا پایا۔ دو چار دوست ہمیشہ ان کے ڈرائنگ روم میں موجود رہتے۔ کوئی کسی کتاب یا رسالے کی تلاش میں مارا آتا، کسی کو میری ہی طرح ٹیلیفون کروانا ہوتا، کوئی ریسرچ اسکالر کسی

پر ان کی مدد کا طالب ہوتا اور کوئی ان سے اپنے کسی ذاتی مسئلہ کے بارے میں مشورہ طلب کرنے آتا
شاہد صاحب ہیں کہ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی سے ملکر حتی المقدور اس کی ضرورت پوری کرنے
کی کوشش کرتے۔ زمانے بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو کسی کی مدد کرنے کے بہانے تلاش کرتے رہتے
ہیں شاہد صاحب بھی انھیں میں سے ایک ہیں۔ کسی کو کوئی کتاب یا رسالہ دیتے وقت وہ یہ کہنا
کبھی نہیں بھولتے کہ "یہ کتاب میں حیدرآباد سے اپنے ساتھ لایا ہوں کتاب کا کام پورا ہو جائے تو ضرور لوٹا دینا
اتفاق سے اگر کسی دن کوئی نہ آئے تو شاہد صاحب ڈرائنگ روم ہی سے ملحق ایک کمرے میں قائم
"سب رس" کے دفتر میں کاتب صاحب کے قریب بیٹھ کر کتابت کروا رہے ہونگے یا پروف دیکھ رہے ہونگے
حیدرآباد ان کی پہلی محبت اور "سب رس" ان کا محبت نامہ ہے۔

جس شہر سے بھاگ کر، میں کوسوں دور اپنے THESIS کے لیے مواد حاصل کرنے
پہونچا تھا، صرف اور صرف شاہد صاحب کی وجہ سے، ایسا محسوس ہوا کہ وہ شہر کسی آسیب کی طرح میرا
پیچھا کر رہا تھا۔ اپنی روانگی سے ایک دن قبل، شام کے وقت وداعی ملاقات کے لیے پہونچا تو "سب
"سب رس" کے بہت سے شمارے، کچھ میرے لیے اور کچھ اپنے حیدرآبادی دوستوں کے لیے، میرے
حوالے کر کے، میرا ہاتھ بڑی دیر تک مضبوطی سے تھام رکھا۔ ملاقات کے پہلے دن والے سارے نام
دہرائے اور انھیں سلام کہنے کی ہدایت کرتے ہوئے مجھے موٹر تک چھوڑنے آئے۔ مڑتے وقت میں نے
موٹر سے سر باہر نکال کر دیکھا، شاہد صاحب اسی جگہ کھڑے تھے جہاں پر مجھے چھوڑا تھا، ہاتھ ہوا میں
لہرا رہا تھا۔ میں نے ان کے ہاتھ کی زبان پڑھ لی وہ کہہ رہا تھا:

"میرے حیدرآباد کو سلام کہنا۔"

دوسرے ہی لمحے وہی ہاتھ ان کی عینک پر گیا جسے وہ اپنی آنکھوں سے اتار کر، دوسرے ہاتھ
میں تھمی دستی سے صاف کر رہے تھے۔ کراچی میں آٹھ دن قیام کے دوران، ایک دن بھی میں ان
سے ملے بغیر نہ رہ سکا، سوچ رہا ہوں کہ یہ اکیس برس شاہد صاحب نے حیدرآباد اور حیدرآبادیوں
سے ملے بغیر کیسے گذارے ہوں گے؟ ///

ڈاکٹر حفیظ قتیل

خواجہ حمید الدین شاہد صاحب ایم۔اے (عثمانیہ)

خواجہ حمید الدین شاہد صاحب خواجہ شجاع الدین صاحب کے بڑے فرزند ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد دکن کی قدیم درس گاہ دارالعلوم سے امتحان میٹرک بدرجہ اول پاس کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر زورؔ صاحب نے انہیں اپنے گھر میں بلا لیا۔ جہاں یہ دس بارہ سال تک مقیم رہے۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کی ڈگری لی۔ دو سال تک سنٹرل اسکول آف کامرس میں لیکچرار اُردو کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں جونیر لیکچرار اُردو ہندی کی جائداد پر تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت چادرگھاٹ کالج میں لیکچرار اُردو کی خدمت پر مامور ہیں۔ اور گذشتہ دو سال سے جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو میں جز وقتی لیکچرار کی حیثیت سے بھی کام کر رہے ہیں۔ ان کی شادی لیڈی ڈاکٹر وحیدالنساء یم۔بی۔بی ایس (عثمانیہ) سے ہوئی جن سے اب دو لڑکے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کو بام عروج پر پہنچانے میں خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کی انتھک مساعی کو بڑا دخل ہے۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں میں اس ادارہ کی خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۹۳۸ء سے ماہنامہ سب رس ادارہ ادبیات اُردو کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دس سال تک ادارہ کے مہتمم رہے۔ ادارے کے کتابوں کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داریاں انھیں کے سر رہتی ہیں۔ ادارہ کے شعبۂ اطفال کے شریک معتمد رہے۔ کل ہند اردو کانگریس کی مجلس انتظامی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس وقت ادارہ کے شعبۂ امتحانات اور تعلیم بالغان کی معتمدی کا کام انجام دے رہے ہیں۔ شاہد صاحب کہانی

ات کے پیشِ نظر ادارہ کی مجلسِ انتظامی نے ان کو رفیقِ ادارہ کا اعزاز عطا کیا ہے
زور صاحب کی عنایات کا انھوں نے اپنے خط میں ان الفاظ سے اعتراف کیا ہے:

" ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی دلنوازی اور شفقت و عنایات نے میری علمی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ علمی و ادبی کام کا سلیقہ ان ہی سے سیکھا ہے "

ہد صاحب ۱۹۵۳ء میں اکیڈمک کونسل عثمانیہ یونیورسٹی کے رکن منتخب ہوئے۔
شاہد صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ جبل پور میں اردو کی سائنسی
ت پر مقالہ پڑھا۔ آل انڈیا اردو کانفرنس بنگلور میں " جنوبی ہند کی اردو خدمات "
مقالہ پڑھا ۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ان کی متعدد تقریریں نشر ہوئی ہیں ۔
برس، مجلۂ عثمانیہ، شعور اور آج کل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ حضرت
حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر ایک بسیط مقالہ لکھا جو "مرقعِ سخن"
اول میں شائع ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ شاہد صاحب کی تصنیفات و تالیفات
سب ذیل ہیں ۔

۱ ۔ شمس الامراء کے سائنسی کارنامے ۔ یہ کتاب ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہے ۔

۲ ۔ سرگذشتِ ادارہ ۔ یہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے آغاز و ارتقاء کی داستان ہے جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے ۔ ۱۹۴۰ء میں ادارہ ہی کی طرف سے شائع ہوئی ۔

۳ ۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے سنہ وار تذکرے ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۹ء ۔

۴ ۔ اردو میں سائنسی ادب ۔ یہ شاہد صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے جو قریب میں شائع ہوگا ۔

حمید الدین شاہد صاحب آج کل پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے " اردو مثنوی " پر کام کر رہے ہیں ۔

("تذکرہ اردو کاروان" مطبوعہ ۱۹۵۵ء سے ماخوذ)

سلیمان اریب

خواجہ حمید الدین شاہد

خواجہ حمید الدین نام شاہد تخلص ۔ ۴؍ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد لکچرار ہوگئے اور چودہ سال تک جامعہ عثمانیہ اور اس کے ملحقہ کالجوں میں اردو اور ہندی پڑھاتے رہے۔ آج کل شاہد کراچی میں ہیں اور ترقی اردو بورڈ میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

شاہد حیدرآباد میں جب تک رہے اپنے تدریسی فرائض کی انجام دہی کے علاوہ علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۴۸ء تک وہ ادارہ ادبیاتِ اردو کے مہتمم رہے۔ بارہ سال تک انہوں نے رسالہ "سب رس" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ دو سال تک جامعہ عثمانیہ کی اکیڈیمک کونسل اور فیکلٹی آف آرٹس کے رکن رہے کئی سال تک وہ ادارہ ادبیات کی مجلس انتظامی ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی مجلس انتظامی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات اور دکن ساہتیہ پرکاشن کمیٹی کی مشترکہ مجلسِ انتظامی کے رکن اور فائن آرٹس اکیڈیمی کے نائب صدر رہے۔

شاہد کی اب تک حسب ذیل تالیفات و تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) مثنوی تصویر جاناں (۲) اردو کا قدیم ترین سائنسی ادب (۳) ارمغان احمد (۴) یادگار صفی (۵) سرگذشت ادارہ ادبیات اردو (۶) ادبی مطالعے (۷) حیدرآباد کے شاعر۔

شاہد بیٹے مرنجان مرنج اور مخلص انسان ہیں۔ یوں تو وہ برسوں سے شعر کہتے ہیں لیکن اتنے منکسر المزاج ہیں کہ کبھی اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش نہیں کرتے۔

غزلیاتِ شاہد

منتخبہ سلیمان اریب

نہ بہار کی کہانی نہ گلوں کا کچھ فسانہ
کہوں تا بہ کے بتاؤں میں قفس کو آشیانہ

یہ کمالِ عقل و دانش ہے زوالِ علم و عرفاں
کہ مقامِ آدمیت نہ سمجھ سکا زمانہ

وہ چمن چمن نہیں ہے جو شاخ بے زگل ہے
میں بھٹک رہا ہوں ہر سو بہ تلاشِ آشیانہ

مرے دل کی حسرتوں کا نہ کروں بیاں کسی سے
کوئی سن کے کیا کرے گا مرا دکھ بھرا فسانہ

میں وفا شناس دل ہوں مری آرزو محبت
مری بندگی کا مقصد نہ جبیں نہ آستانہ

دلِ غم زدہ ہے شاہد مری بندگی کا مرکز
یہی خانۂ خدا ہے، یہی میرا آستانہ

ہوش و خرد کے سارے فسانے
کوئی نہ سمجھے کوئی نہ جانے

جان پہ اپنی کھیل رہے ہیں ہم
کتنے بھولے ہیں پروانے

کی تھی محبت یاد ہے کس کو
بیتے دن اور بھولے فسانے

ٹوٹ چکی ہیں سب زنجیریں
بھاگ رہے ہیں اب دیوانے

سب کو اپنی اپنی پڑی ہے
کون پرایا دکھ پہچانے

من کی بپتا کس کو سنائیں
جانے بھی ہیں اب انجانے

تجھ کو منانا کام ہے میرا
تیری مرضی مانے نہ مانے

ریت کے بندھن ٹوٹے شاہد
بکھر رہے ہیں خواب سہانے

یہ کائناتِ حسین بھی اس قدر فریبِ نظر ہوتی ہے
گلوں کی ہلکی سی مسکراہٹ بھی دردِ جگر ہوتی ہے

نظر کی یہ جستجو ہمیشہ کہ حسن کو بے نقاب دیکھے
جو حسن کو بے نقاب دیکھے بھلا کسی کی نظر ہوتی ہے

نہ میری دنیا نہ تیری دنیا یہ اعتبارات ہیں نظر کے
سمجھ میں یہ بات آئی آخر نگاہ جب معتبر ہوتی ہے

وہ نور کب اور کہاں ملے گا کہ جس سے سارا جہاں ہو روشن
کہیں تو ہے رنگِ شام باقی کہیں نمودِ سحر ہوتی ہے

کبھی کسی کا نہ دل دکھایا کبھی کسی کی نہ کی برائی
ہوا جو ممکن تو کی بھلائی اسی طرح سے بسر ہوتی ہے

یہ قصرِ الفت ہے جس کی تعمیر کا ذرا شائبہ نہیں ہے
یہ دل کی بستی ہے اے ستمگر ہمیشہ زیر و زبر ہوتی ہے

اب کیا دعا کریں کہ شعورِ نظر ملے
پھولوں کی انجمن میں بھی زخمِ جگر ملے

اللہ رے حسنِ یار کی فتنہ طرازیاں
جب بھی ملے وہ ہم سے قیامت اثر ملے

جب ان کی یاد ہی سے عبارت ہے زندگی
یہ کیا ضرور ہے کہ نظر سے نظر ملے

تھا انتظار وسعت ہی معراجِ آرزو
دن زندگی کے ہم کو مگر مختصر ملے

منزل شناس کوئی بھی شاہد نہیں ملا
یوں تو ہر اک قدم پہ کئی راہبر ملے

دور ہو کر بھی ترے پاس رہا کرتے ہیں
تیری یادوں کے سہارے ہی جیا کرتے ہیں

تجھ سے اب کوئی شکایت نہ گلہ کرتے ہیں
تو سلامت رہے ہر وقت دعا کرتے ہیں

تیر اندازِ تغافل ترا اندازِ کرم ہم
تیری نظروں ہی سے پہچان لیا کرتے ہیں

منزلِ دار و رسن ہو کہ تری محفلِ ناز
جینے والے تو ہر حال جیا کرتے ہیں

کیا ستم ہے کہ ترے چاہنے والے ساقی
ایک اک جام سے محروم رہا کرتے ہیں

تو جو آیا تو ترے ساتھ قیامت آئی
تیری رفتار سے فتنے ہی اٹھا کرتے ہیں

جب بھی آتا ہے ترا نام کسی محفل میں
اہلِ دل اپنا جگر تھام لیا کرتے ہیں

عیش کے ساتھ ہوا کرتے ہیں غم بھی شاہد
گل کے پہلو میں بھی کچھ خار ہوا کرتے ہیں

تجھ سے ملنے کے مرے دل میں جو ارماں ہونگے
[illegible] مری زیست کے عنواں ہوں گے

کیا خبر تھی کہ ترے چاہنے والے اے دوست
تیری محفل سے نکلتے ہی پریشاں ہوں گے

جانے کیا گذرے گی اس وقت ہمارے دل پر
اپنے ہی شہر میں جب آپ ہی مہماں ہوں گے

تیری فرقت میں گزرتے ہیں جو مشکل لمحات
ایک نگاہ غلط انداز سے آساں ہوں گے

کون کس حال میں ہے کوئی نہیں پوچھے گا
اپنی ہی فکر میں سب لے کے دل ناداں ہوں گے

جذب الفت کا اثر ہو گا تو ہم [illegible]
بزم احباب میں اک روز غزل خواں ہوں گے

اگر کوئی مرا ہمدم نہیں ہے
مجھے اس کا ذرا بھی غم نہیں ہے

ترے بے التفاتی کے مقابل
مرا جذب محبت کم نہیں ہے

کسی کے دل میں کیا ہے کون جانے
دل انساں تو جام جم نہیں ہے

ترا غم جب سے مجھ کو مل گیا ہے
جہاں کا اور کوئی غم نہیں ہے

مآل گلستاں کیا جانے کیا ہو
کہ چشم گل ابھی پرنم نہیں ہے

جہان بیش و کم میں رہنے والو
رہ الفت میں بیش و کم نہیں ہے

(حیدرآباد کے شاعر (جلد دوم) سے ماخوذ)

نہ کچھ سود جاں کو اجالا دیا
دیا تیرا [illegible] سنبھالا دیا

کریا جاتے جاتے تو ادر وہ کام
کہ پائیں گے رزق غریباں مدام

ترا سارا جیون تھا [illegible] کا پیڑ
کہ سوئے تھے چھاؤں میں [illegible]

امن کی یہ میراث تجھ گھر میں تھی
[illegible]

گیا رب کنے لے فقیرانہ شان
[illegible]

طیبہ بیگم

جناب اعجاز حسین کھٹا ایک مختصر سوانحی خاکہ

جناب کھٹا حیدرآباد دکن میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ضلع نظام آباد کے مدرسہ تحتانیہ میں ہوئی۔ میٹرک تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد امتحان ادیب فاضل کامیاب کیا۔ معتمدی مال میں ملازمت اختیار کی۔ اُردو ٹائپسٹ کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اس کے علاوہ دکن ریڈیو سے جز وقتی کارکن کی حیثیت وابستہ ہوئے۔ چنانچہ بچوں کے پروگرام کا انھیں پیش کنندہ مقرر کیا گیا۔ بچوں کے پروگرام کے پیش کرنے والے کو "ماموں جان" کہا جاتا تھا۔ کھٹا صاحب نے ایک مزاحیہ پروگرام "استاد کی باتیں" کا اسکرپٹ لکھ کر اسے پیش کرنا شروع کیا۔ اس پروگرام میں غلام علی صاحب "بھولو" کا کردار پیش کرتے تھے اور مرزا ظفرالحسن صاحب جو ریڈیو کے مستقل ملازم تھے پڑھے لکھے شخص کا رول ادا کرتے تھے۔ اس پروگرام میں "استاد" کا جو کردار تھا وہ زمانے کی ترقی کو کبھی قبول نہیں کرتا تھا بلکہ اپنے مزاج کے مطابق انتہائی مزاحیہ انداز میں اس کا اظہار کرتا تھا کہ یہ تو کوئی بات نہیں، دیکھو میرے دادا کے زمانے میں کافی ترقی ہو چکی ہے۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے آج سے کئی برس پہلے میرے دادا کے زمانے میں ہو چکا ہے۔ ہر جدید ترقی کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ دادا کے زمانے میں ریڈیو سے ایک آدمی نکلتا تھا جو فنکار یا ادیب ہوتا وہ سلام کرتا پھر غائب ہو جاتا پھر آپ اس سے اشعار وغیرہ سنتے۔

جناب کھٹا صاحب نے (۱۷) سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ کبھی کبھی حالات کے تقاضے سے کسی گاؤں کے مشاعرے میں چلے جاتے۔ ایک دفعہ آپ نے سامعین کی آواز سنی کہ "حضرت آپ لوگ مشکل مشکل لفظاں میں شعر بولتیں اور مشکل زباں میں تقریراں کرتیں، ہماری سمجھ میں نئیں آتے۔ آپ ایسی زباں میں شعر یا تقریر کرو جو ہماری سمجھ میں آئے۔"

کھٹا صاحب نے اس سے متاثر ہو کر عوامی دکنی زبان میں شعر کہنے شروع کیے۔ ان کی شاعری
کا محور زندگی کے مسائل اور سیاسی حالات ہوتے تھے۔ دکن کے اضلاع اور دیہاتوں میں
جا کر مشاعرے پڑھتے تھے۔ آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے مشاعروں میں حصہ لیا۔ نواب بہادر
یار جنگ کے جلسوں میں نظمیں سنائیں اور مختلف مقامات پر اسٹیج سے شعر سنائے۔ ان کے اشعار
کے موضوعات بالخصوص دکن کی بہبود، ترقی، آزادیٔ ہند اور انگریزی حکومت کے خلاف
اظہار خیال ہوتے تھے۔ شاعری کا نشان امتیاز "املی کا درخت" ہوتا تھا۔ اس کی مناسبت سے
آپ نے کھٹا تخلص اختیار کیا۔ "املی بن" پر ایک نظم کہی جس کا ایک شعر یہ ہے:

قبر پر کھٹے کی ہو گل کی جگہ تازہ چگر
حشر تک یارب رہے سایہ فگن املی کا بن

دوسری ایک اور نظم "خودداری" میں ایک شعر کہا:

کھٹے کی لاش گور میں گھنچ گا ڑ دیو
اس کے کفن کو غیر کی چدّر نکو رے نکو

نظمیں اور غزلیں تقریباً (۵۰) نظمیں جن میں سے بہت سی ضائع ہو گئیں۔ اس وقت کھٹا
صاحب کے پاس (۶۰) کے قریب نظمیں اور غزلیں ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوسکا۔
کھٹا صاحب میاں اور نذیر دہقانی مرحوم کے کلام سے زیادہ متاثر رہے۔

پاکستان جانے کے بعد (۲۰) سال تک کھٹا صاحب نے کوئی شعر نہیں کہا۔ اس کے
بعد شعر کہنے لگے۔ چنانچہ ان کی پہلی نظم "قلی قطب شاہ" ہے۔ اس کے بعد بہادر یار جنگ، میرا بچہ،
سلطان العلوم میر عثمان علی خان، میرا وطن، خواجہ معین الدین مرحوم، برکت قادری، سوال وغیرہ
جیسی نظمیں لکھیں۔ حالیہ نظم "میرا وطن" ہے جو یہاں (حیدرآباد) آنے سے کچھ دن قبل کہی تھی۔

حیدرآباد کے موجودہ شاعروں میں انہیں خیرات ندیم، طالب خوندمیری، حمایت اللہ،
مصطفیٰ علی بیگ پسند ہیں۔ حمایت اللہ صاحب کے اشعار میں ہنسی اور آنسوؤں کا مجموعہ ہے۔
ان کی اکثر نظموں میں زندگی کے مسائل ہیں جو حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی نظم "آنکھوں کا
حلیہ" خصوصیت کے ساتھ انہیں پسند آئی ہے — کراچی میں آپ کی مصروفیت صرف ریڈیو پاکستان
کے فن کار کی حیثیت سے ہے۔ ٹی وی کے پروگراموں میں بھی کبھی کبھی حصہ لیا کرتے ہیں۔ ●●

مکرم ذیشان ایم ایس سی (عثمانیہ)
ریسرچ اسکالر

اعجاز حسین کھٹا

برسوں کے بعد آیا اعجاز حسین کھٹا
مسٹوں کی خیر لایا اعجاز حسین کھٹا

ملکاں کو غربا کو اپنوں کو نئیں بھلیا وہ
پن دودھ جیسا کورہ کو پانی میں نئیں ملیا وہ
اپنوں کی بات چھوڑو بولی بھی نئیں بھلیا وہ
دکھن کا مال لایا اعجاز حسین کھٹا
برسوں کے بعد آیا اعجاز حسین کھٹا

کیپٹوں علم کے پاشاہ عثمان تھے کتے نا
یہ کالجاں میں نئے آباد تھے کتے نا
شاہد میاں بھی یاں کے استاد تھے کتے نا
ان کو بھی ساتھ لایا اعجاز حسین کھٹا
برسوں کے بعد آیا اعجاز حسین کھٹا

شاعر خطیب جو تھا تم اس کو بھول گئے تھے
گلی ذری دکھی تو گلی کو بھول گئے تھے
پولس کے پاس دیکھا ڈنڈے سے ڈر گئے تھے
ان سب کی یاد لایا اعجاز حسین کھٹا
برسوں کے بعد آیا اعجاز حسین کھٹا

میٹھے پو ہاتھ دھرنا بچوں کے کاماں ہیں جی
کڑوے دوایاں کھانا بڈھوں کے کاماں ہیں جی
کھٹے پو جی اڈنا سب لنگے باتاں ہیں جی
املی کے بوٹاں لایا اعجاز حسین کھٹا
برسوں کے بعد آیا اعجاز حسین کھٹا

اللہ میاں سے بولو ہم ٹھیک سے رہیں یاں
زندہ تو ٹھیک نئیں ہیں پر ٹھیک سے مریں یاں
آمین تم بھی بولو ہم سب کے سنگ ذیشاںؔ
ہاتھ اپنے سے اٹھایا اعجاز حسین کھٹا
برسوں کے بعد آیا اعجاز حسین کھٹا

۱۱/ دسمبر ۱۹۸۵ء کو شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے دکھن کے ممتاز مزاحیہ شاعر جناب اعجاز حسین کھٹا اور جناب پروفیسر حمید الدین شاہد کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ نظم اسی موقع پر سنائی گئی تھی۔

امجادیں کتھا

سائیں کی صدا

جاگ رے بابا جاگ رے بابا
گھر کو لگی ہے آگ رے بابا
لختِ جگر سب تک رہے منہ کو
دودھ کو پی گئے ہیں ناگ رے بابا
کو کھرو پاسے. لو کہہ بجو کو
یا تیرے بھاگ رے بابا
پیچ ندیا آپ ہی پیاسے
جتنا ہے دیتا کاگ رے بابا
کشیا پیچ دیکھے تیش ادھر کے
چھین لے ان سے باگ رے بابا
بھیک نہیں آزادی حق ہے
سجنا ئیں بیراگ رے بابا

---

۱ بچے رہے ہیں ۲ اچھا ہی ۳ مصیبت
۴ کھیا ۵ سانس ۶ ناہل

نکوچ نکو

الٰہی سے جھاڑ کی مجھے بس بس ہے جھاڑوں یہ
غیراں کے اسے میٹل پہ چھپے نکوچ نکو
صفر ابھا تو دمڑی کی ادرک مجھے ہے بس
نکو میاں! فرنگی کا جنجر نکوچ نکو
میٹھے کو جی مٹکے تو ذرا گڑ کھر کرکو کھا
کڑوی رہتی پڑوسی کی شکر نکوچ نکو
دیکھتے بھلے ہیں شیخ گھر کے اور نام بھی
اپنے کو اونچی ذات کا قمر نکوچ نکو
ڈنڈے کو لے کو ہاتھیں مرداں کے ساتھ چل
بٹوہ پکڑ کر ملتی سو سمندر نکوچ نکو
ٹوپی اپنا ٹھیک ہے چلتا ہے آہستے
واپس کرو یہ بھاڑے کا خچر نکوچ نکو
کہتے کی لاش کھٹے ہیں نیکو کھاز دیو
اس کے کفن کو غیر کی چادر نکوچ نکو

---

۱ حل ۲ نہیں چاہیے ۳ جیا ہے ۴ کی ۵ ناقد
۶ ٹوپی ۷ آہستہ ۸ سلامت ۹ قبر ۱۰ شوکی ہی ۱۱ چادر

اعجاز حسین کھٹا

گناہ

ان سے قفس کو بھلانا گناہ ہے
لی کا ٹک دھیان لانا گناہ ہے
یستی بھی اپنے لالاں بھی اپنے
ب کچھ ہے پن حق جتانا گناہ ہے
راں سو سب ستر ول تھو گئے تو ہو کئے
تاں پو سے باندھ رکھانا گناہ ہے
اکے دیئے ہاتھ سو کیں ہرج ہیں
ان کو حرکت میں لانا گناہ ہے
تو کمی ہے یاں پیت کی ریت لو کر
کمیا دل تو پلکاں بھگانا گناہ ہے
سب جانتا ہے خدایا میں کیا کوں
باں پر ترا نام لانا گناہ ہے
لے ہم تو دنیا تری توبچ دکھ لے
ے یاں تو جگنا جگانا گناہ ہے

تناہ ۲ اپنی ہی ۳ لال کی جمع ۴ مگر سب
۵ تیاہ ۶ بندش سو کیں ۷ کھوں ۸ توہی

نکو

اپن لوگاں کا سنگ ایکچ تو پھر یہ چھیڑ خانیاں کیوں
پچھنے کے کرو چالاں بھلا کیچڑ کرو نکو
وہ آئے اُجلے رنگا ساں بدل کو روپ دیو تام
یہ پھر کھڑے ہیں ڈھکلیں گے انوں کی پچ کرو نکو
آپس کی بات تھی تو تکرار کیا ہے مل کو مٹے کر لیو
ہڑپ کر جائیگا باندر اسے منصف کرو نکو
غضب ہے دونوں بازو لڑکو کٹ جانا قیامت ہے
وقت ہے مل کو لڑنے کا ارے لڑکو مرو نکو
کوئی دیکھے بچارے کا کلیجہ ہائے چھلنی ہے
سنو ٹک بولنا تم کیسے کی ارے تمثا کرو نکو

---

۱ ایک ہی ۲ تعفیہ ۳ راکھشس
۴ دھکلیں گے ۵ پر ۶ پکار ۷ مذاق

میرا وطن

اعجاز حسین کھٹا

چھم وہ برسات، سرمئی گگن — وہ دھاناں کے کھیتاں وہ کیوڑیاں کے بن
کالجے میں سب لاج ونتیاں مگن — وہ میرا وطن

سبز جنگلاں، جھیل رمنا مرے — وہ رمنا میں رہتے سوہرناں مرے
لیے جن کو گودی میں املی کا بن — وہ میرا وطن

وہ گنے کے مٹھے جواں رس بھرے — مکئی، باجرے بھی پرے کے پرے
یہ سب میرے کبنی کے سرو و سمن — وہ میرا وطن

جنت کے آذر و فرہاد بھی — جنم واں لیئی سو صنم زاد بھی ہے
متاع سوب میراچ، میرا یہ دھن — وہ میرا وطن

منہ زور موسیٰ کہ طوفاں شغل — وہ جلیم قطب شاہ کا من کنول
وہ بھاگیہ نگر عشق والاں کا دھن — وہ میرا وطن

مسافر جو مہماں ہوا بس گیا — کوئی شاذ ہی واں سے واپس گیا
وہ سب ماں کی دھرتی نشانِ امن — وہ میرا وطن

صبح ہوئی کہ نیئی موٹ چلنے لگے — سہاگن جواریاں کو دلنے لگے
ادھر تے زمیناں چلے دیوتن — وہ میرا وطن

حیا دار بیٹیاں کہ مریم صفت — مری ماں و بہناں کے ٹھنڈے بخت
گرھستیاں میں سب اپنے اپنے مگن — وہ میرا وطن

رہے کج کلاہاں رہے آتش نوا — خطیب ہور مخدوم، سرور مرا
بہادر وہ میرا شہید زمن — وہ میرا وطن

مرا جذبِ ایکشن سکندرِ وفا سبھی اپنے کھیٹے سے ہو کو [illegible]
گئے کاں کہ تھے پاسبانِ سخن [illegible] ــــ [illegible]

مری مہ لقا بائی چندا، ولی وہ رندِ خورش اوقات اپنا صفی
خدا مست امجد وہ عرفانِ سخن ــــ وہ میرا وطن

وہ گیسو دراز ہور مرے یوسفاں حفنت رالعہ ہور مری زوراں ماں
وہ صاحب دلاں کی مرے انجمن ــــ وہ میرا وطن

فیصلاں کی نگراں تھی اک کرن مغل تیغ کا جس سے نشہ پرن
مری چاند بی بی وہ شمشیر زن ــــ وہ میرا وطن

وفا کی وہ تاریخ لاری دلیر کہ سوتا ہے کس بن میں کس بن کا شیر
اتھی کیا کشش تیری خاکِ دکن ــــ وہ میرا وطن

مرے جیسے سورج پڑے سوب مانند اٹھیا خاک سے جامعہ کی وہ چاند
دکن کی سلونی کا سیوک سجن ــــ وہ میرا وطن

وہ اردو کا اب زورِ بازو ہے کاں ادب کا شناور ادیباں کی جاں
جیسے رو بتینگا حشر لگ کا دکن ــــ وہ میرا وطن

بحرِ بیکراں کے سفینے مرے ارے کوئی ڈھونڈو دفینے مرے
ہے دکھن کے سینے میں کیا کیا دفن ــــ وہ میرا وطن

سلطان العلوم

(اعجاز حسین کھٹا) (میر عثمان علی خاں مرحوم)

فقیراں صفت تو مرا تاجور اتھا تیرا دھن بہر علم و ہنر
تری جامعہ علم کی کائنات کہ تجھ سے عبارت ہے اب جیکی ذات
ترے راج اردو ہوئی سرخرو ترا دورِ تہذیب کی آبرو تھا
بلاشک علم کا تو سلطان تھا ستارے تھے عالم تو آسمان تھا

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

خواجہ حمید الدین شاہد

اردو میں سائنسی ادب (قدیم ترین کارنامے)

کا

مقدمہ

"اردو میں سائنسی ادب" پر اب تک کسی نے کچھ نہیں لکھا حالانکہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال ردو میں سائنس کی کتابوں کے ترجمے اور تالیف کا کام شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ ریاضی، کیمیا، ت، حیاتیات، طب اور علم ہئیت پر اتنی زیادہ کتابیں لکھی گئیں کہ اگر ان سب پر مختصر طور سے لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کام کرنے کی بہت ت ہے اور اردو زبان و ادب کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر کیا جا سکتا ہے جس پر بہت کم لوگوں پڑی ہے اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کیلئے میں کئی سال سے مواد فراہم کر رہا ہوں س کا بڑا حصہ مرتب بھی ہو چکا ہے۔ توقع ہے کہ مستقبل قریب میں یہ کتاب شائع ہو کر منظر عام جائے گی۔

میرے محترم استاد اور پرنسپل ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات کے ارشاد کی تعمیل میں اس کتاب کا ایک باب "اردو میں سائنسی ادب کے قدیم ترین کارنامے" صورت میں پیش کر رہا ہوں تحقیق اور تلاش کے باوجود ڈیڑھ سو سال پہلے کی سائنس کی اردو کتاب دستیاب نہیں ہوئی اور نہ کسی سرکاری یا غیر سرکاری کتب خانہ کی فہرست میں اس قدیم کتاب کا پتہ چلا۔ اردو زبان میں سائنس کی سب سے قدیم کتاب "بحر حکمت" ہے جو ۱۲۱۳ھ م ۱۷۹۸ء میں لکھنو کے مطبع مسیحائی سے چھپی تھی۔

نواب محمد فخر الدین خاں امیر کبیر شمس الامراء ثانی کا نام اور کام حیدرآباد دکن کی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے جد اعلیٰ نواب ابوالخیر خاں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے نامور امیر تھے۔ حضرت آصف جاہ اول کے ہمراہ دکن آئے اور آصفی دربار میں بڑا رسوخ حاصل اور ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ پہنچتا ہے۔ نواب محمد فخر الدین خاں ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے ۱۲۰۵ھ میں ان کے والد

نواب ابو الفتح خاں کا انتقال ہو گیا ۔ اس وقت ان کی عمر (۱۰) سال کی تھی ۔ اپنی والدہ کے سا
عاطفت میں تعلیم و تربیت حاصل کی ۔ آصف جاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النسا بیگم سے ان
شادی کردی اور امیر کبیر کے خطاب سے سرفراز فرمایا ۔ آصف جاہ ثالث اور آصف جاہ رابع کے د
میں بھی شمس الامراء امیر کبیر نے بڑی شان و شوکت اور عزت و نام آوری کے ساتھ زندگی بسر
اور ۱۲۷۹ھ میں اس دنیا سے کوچ کر گئے ۔ شمس الامراء نہ صرف خود بڑے عالم و فاضل تھے بلکہ
اہل علم و فن کی بڑی قدردانی اور سرپرستی کرتے تھے ۔ مشرقی علوم کے علاوہ مغربی زبانوں مثلاً انگر
اور فرانسیسی پر بھی ان کو خاص عبور تھا ۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی سائنس کی کتابوں کا یورپ
زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرانے کا انتظام کیا تھا ۔ چنانچہ اس کام کو منظم طور پر چلانے کے
۱۸۳۴ء میں انہوں نے ایک دارالترجمہ کی بنیاد رکھی جس میں حسب ذیل اصحاب ترجمہ اور تالیف
کا کام سر انجام دیتے تھے ۔

غلام محی الدین خاں متین حیدرآبادی ، میر امان علی دہلوی ، میر شجاعت علی ، رتن لال ، مسٹر
موسیو تنڈرس اور مسٹر جوزوف سائنسی تجربوں کیلئے یورپ سے سائنسی آلات منگوائے گئے تھے
فلکیات کے مشاہدوں کیلئے جہاں نما میں ایک رصدگاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھی تعمیر کی تھی ۔

دارالترجمہ کے ساتھ ایک مطبع بھی قائم کیا گیا جو " سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء " کے نام
موسوم تھا ۔ اس مطبع میں تصویر کشی کا بھی انتظام تھا ۔ لیتھو میں سائنسی آلات کے نقشے چھ
تھے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سارے ہندوستان میں صرف لکھنؤ ، کلکتہ اور مدراس میں دو چار چھ
" ستہ شمسیہ " کے چار ایڈیشن مختلف مطبعوں سے شائع ہوئے ۔ ۱۲۵۶ھ اور ۱۲۶۲ھ
سنگی چھاپہ خانہ سے دو ایڈیشن چھپے ۔ ۱۲۷۳ھ میں مدراس کے مطبع اسلامیہ اور ۱۳۱۶ھ میں
امیر احمد کے مطبع میں دو ایڈیشن چھپے ۔

خواجہ حمید الدین شاہد

اردو میں سائنس کی قدیم ترین کتاب

بحر حکمت: تقطیع ۱۰/۲۰ × ۱/۲ ۔ صفحات ۵۸ ۔ سنہ طباعت ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۸ء ۔ اس مقالے کی تیاری کے سلسلے میں ہمیں جتنی مطبوعہ اور قلمی کتابیں دستیاب ہوئیں ان میں یہ کتاب سب سے زیادہ قدیم ہے اور یہ لیتھو میں چھپی ہے ۔ پادری پرکنس صاحب کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے کتاب کے سرورق اور آخری صفحہ پر کہیں بھی مترجم کا نام درج نہیں ۔ فہرست اور دیباچہ بھی نہیں ہے ۔ صفحہ (۲) سے "مقدمہ" کی سرخی کے تحت اصل کتاب شروع ہو گئی ہے ۔ سرورق کی عبارت درج ذیل کی جاتی ہے

"این رسالہ عجیب و غریب در بیان تحقیق ساختن سبب روانگی و دریافتن قواعد حرکت دخانی کل مسمی بہ"

بحر حکمت

کہ بسعی و ترجمہ صاحب والا مناقب پادری پرکنس صاحب ترجمہ اش بزبان اردو عام فہم شدہ بتاریخ پنجم شعبان ۱۲۱۴ھ بہ بیت السلطنت لکھنو در مطبع مسیحائے باہتمام اضعف العباد مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد مرحوم طبع گردید"

آخری صفحہ پر یہ عبارت ہے ۔

"حق سبحانہ تعالیٰ جل جلالہ کی برکت سے یہ کتاب مسمی بحر حکمت بیچ دریافت کرنے احوال حکمت روانگی اور ترکیب طیار کرنے دخانی کل کے جو تالیف کی ہوئی پادری پرکنس صاحب کی حسب فرمائش بعض صاحبان عالیشان کے مطبع مشہورہ مسیحائے میں اہتمام اضعف العباد و احقر الافراد مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد مرحوم کے بیچ دار السلطنت لکھنو کے کشمیری محلہ میں چھاپی گئی !"

اس کتاب میں دخان (steam) کا بیان ہے ۔

اس کی ایک سرخی "بیان میں تحقیق دخان اور اطوار پیمائش" کے تحت دخان و دھویں کا فرق بتلایا گیا ہے اور "پیمائش سطری" یعنی طول ناپنے کے پیمانے "پیمائش سطحی" یعنی طول و عرض ناپنے کے پیمانے اور "طول و عمق" ناپنے کے پیمانوں کو درج کیا گیا ہے ۔ دوسری سرخی "دخانی کل کے بیان" کے تحت اس کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا گیا ہے اور بہت لکھی

ہے اس کل میں حکمت بھری تو بتو
بلاشک اسے چھوڑ دنیا گنو

حرارت کا ذکر کرتے ہوئے تھرمامیٹر کے متعلق اس طرح لکھا گیا ہے۔

"...... تصور نے اس امر واقعی کے عالمان فن کو ایک نہایت مفید آلہ کی ایجاد کی طرف جو انگریزی میں تھرمومیٹر اور اس رسالہ میں تابدرجہ کہلاتا ہے متوجہ کیا جس کے بنانے کا یہ طریقہ ہے بالشت بھر لانبی شیشی کی نے جس کا سوراخ بہت ہی باریک ہو لیتے ہیں اور اس کی ایک طرف کو آگ میں گلا کر گرہ جو فدار کی شکل بناتے ہیں پھر اس میں سیماب اتنا داخل کرتے ہیں کہ گرہ مذکور بھر جاوے اور سیماب نے کی تہائی تک پہنچتی پھر جتنی ہوا کہ اس نے میں باقی رہی بہ ہوشیاری تمام نکال کرنے دہانہ کو مضبوطی سے بند کرتے ہیں بعد اس کی گرہ مذکور کو گلتی ہوئی برف میں داخل کرتے ہیں تب سیماب اپنی حرارت کچھ کھو کر سمٹ جاتا ہے اور نزول کرنے لگتا ہے پھر جس جگہ سیماب نزول کرتے کرتے ٹھہر گیا ایک نشان کرتے ہیں اور اس کا نام نقطہ انجماد آب رکھتے ہیں اس لئے کہ برودت کے اس درجہ پر پانی جم کر برف ہو جاتا ہے پھر اس گرہ پر سیماب کو کھولتے پانی میں داخل کرتے ہیں تب سیماب حرارت حاصل کرکے .... درجہ بدرجہ نے مذکور میں چڑھتا جاتا ہے جب دیکھتے ہیں کہ چڑھتے چڑھتے ٹھہر گیا تب عین نقطہ وقف پر ایک نشان کرتے ہیں اور اسے نقطہ جوش آب کہتے ہیں مناسب ہے کہ اس رسالے کو پڑھنے والے ان دو حساب کو یعنی نقطہ انجماد بتیس اور نقطہ جوش دو سو بارہ یاد رکھے کیونکہ آنے والے ورقوں میں استعمال ان کا اکثر ہے"۔

(صفحہ ۱۳۰) کے حاشیہ پر "ایر پمپ" کی اس طرح تعریف کی گئی ہے۔

"...... اور ایر پمپ ایک آلہ نہایت مکلف بنا ہے کہ ہوا اس کے وسیلے سے ظرفوں سے نکالی جاوے تاکہ اس کی غیر حاضری کی تاثیر معلوم ہو ۱۲"

صفحہ (۱۶۰) کے بعد ایک بڑا نقشہ دیا گیا ہے جس کا نام "نقشہ کلاں دخانی کل شع بیلر وغیرہ" ہے اسی طرح صفحہ (۷۰) پر "نقشہ دخانی کل خیالی" کی سرخی کے تحت ایک دوسرا نقشہ ہے۔ ان نقشوں کی مدد سے دخانی کل کے استعمال کو سمجھایا گیا ہے۔ صفحہ (۲۱۱) کے حاشیہ پر "آلہ مسمی پمپ" کا نقشہ دیکر اس کے استعمال کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ پمپ کنویں سے پانی کھینچنے کے کام آتا ہے۔ صفحہ (۲۴۶) پر "نیوکومن صاحب کے دخانی کل کا" نقشہ دے کر اس کی ساخت کے متعلق تفصیلی معلومات قلمبند کردی گئی ہیں۔ اس آلہ کی مدد سے کنویں یا کان سے پانی باہر نکالا جاتا ہے۔ صفحہ (۲۷) پر بیلر

راس میں متعلقہ آلوں کو ایک نقشہ سے واضح کر کے دخان کے دباؤ کی مختلف شکلوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

"بیان اجزائے دخانی کل" کی سرخی کے تحت بیلر کی تعریف کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ تانبے یا لوہے کا بنایا جاتا ہے۔ بیلر ایک قسم کا برتن ہے جس میں پانی گرم ہو کر بھاپ بن جاتا ہے۔ بیلر کے ایک دوسرے "حافظ" کی تعریف، ساخت اور اس کے استعمال کی تشریح کی گئی ہے پھر آلہ مانع "کا ذکر ہے اس کا کام یہ ہے کہ حسب ضرورت آگ زیادہ یا کم روشن کرے۔ اس کا نقشہ بھی وضاحت کیلئے دیا گیا ہے۔ بھاپ کے بننے سے پانی کی مقدار میں کمی ہوتی ہے اور آگ کے التہاب سے بھاپ کی قوت رفتہ رفتہ زیادہ ہوتی جائے گی اور اندیشہ لگا رہتا ہے کہ پانی کی کمی کے سبب کہیں بیلر پھٹ جائے اس اندیشے کو دور کرنے کیلئے ایک آلہ استعمال کیا جاتا ہے جتنا بھاپ کے بننے میں صرف ہوتا ہے۔ اس آلے کو نقشے کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ یہ معلوم کرنے کیلئے کہ پانی بیلر میں حسب ضرورت پہونچ رہا ہے یا نہیں دو نل لگائے گئے ہیں تاکہ پانی کی کمی و زیادتی معلوم ہو سکے۔ کثرت استعمال سے بیلر میں ریت اور میل وغیرہ بہت جمع ہو جاتا ہے اس لئے بیلر کے نیچے کی طرف ایک بڑا سوراخ بنایا گیا ہے جب صفائی کرنی ہوتی ہے تو اس سوراخ کو ایک "ڈھکنے" سے بند کر دیا جاتا ہے تاکہ بھاپ کا راستہ بند ہو جائے اور آدمی آسانی سے بیلر کو صاف کر سکے۔ غرض بیلر کے تمام متعلقات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور وضاحت کیلئے کئی نقشے کتاب میں درج ہیں جو لیتھو میں نہایت خوبصورت چھپے ہیں۔

اس کتاب کی زبان میں قدامت پائی جاتی ہے جملوں کی ساخت اور ترکیبیں قدیم اردو کا نمونہ ہیں مثلاً۔

"اب آغاز دخانی کل کا کرتا ہوں مطابق نقشے کے مصنف سعی کرتا ہے کہ
اس بات کو روشن کرے ہم آغاز مطلب کا اب یوں کیا چاہتے ہیں۔ وغیرہ۔

بعض ایسے قدیم الفاظ جگہ جگہ نظر آتے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں"۔ جیسے۔ پانیپن ہوا پن۔ اوچائی (اونچائی)، بہتیر (بہتیرا)، وے (وہ) لیے (دیے) ویسا کچ (ویسا ہی) اوپر دار وغیرہ۔

بعض الفاظ کا املا بھی مختلف ہے مثلاً جانا چاہئے (جاننا چاہئے)، کول (کھول) گلوا

ادخانی کل) جیسی بھی ہے۔ اسکی داس سے،
حرف "ث" کو "ت" لکھا گیا ہے۔
تھنڈا ۔فت ۔ تو نئی وغیرہ۔

بعض انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ کیا گیا اور بعض کو ویسا ہی اردو میں منتقل کر لیا گیا۔
دخانی کل Steam Engine ۔ اسکویر انچ ۔ اسکرو۔ پیچ ۔ کیوبک فٹ، ایرپمپ
تھرمومیٹر یا تھرما میٹر۔ تاب درجہ نما ۔ اسکیل ۔ پسٹن بیلنہد

علم طبیعات کی جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔
عمل تکثیف، عمود علی الافق ۔ نقطہ جوش ۔ نقطہ انجماد۔

"باب خانق" کی سرخی کے تحت جو عبارت ہے اس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔
"خانق کا قاعدہ عملیہ اوس پیچ کے جو آگے مذکور ہے مانند ہے کہ اوس کے ایک جانب پھیرنے سے آمد دخان کے بیلنے سے مطلق رک جائیں گے لیکن جانب مند پھیرنے سے دخان بآسانی تمام دخل ہوگا۔ پس روشن ہے کہ جس قدر بند یا کھلا ہو تس قدر دخان کل میں داخل ہوگا امر اختیاری ہے"

سائنس کی مطبوعہ اردو کتابوں میں یہ سب سے قدیم کتاب ہے باوجود اس کے کہیں بھی اردو کو ہندی زبان نہیں لکھا۔ ہر جگہ اردو ہی لکھا ہے۔ اس کے بعد جو کتابیں چھپی ہیں ان میں سے بعض کتابوں میں اردو کو ہندی لکھا گیا ہے۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں (۵۳۰.۵۴۳ب) نمبر پر کتاب مل سکتی ہے۔

(اردو میں سائنسی ادب، قدیم ترین کارنامے مجلہ عثمانیہ ۱۹۵۰ء سے ماخوذ)

سلسلہ صفحہ (۸۱)

نمودہ شد تا در روزگار موجب یادگار باشد"

مذکورہ بالا عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب صاحب خود بھی مصنف تھے اور فرانسیسی زبان پر کافی عبور رکھتے تھے۔ فارسی میں ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ضرور ہے کہ یہ اردو کتابیں بھی ان ہی کی تصانیف ہوں۔ (اردو میں سائنسی ادب سے ماخوذ)

خواجہ حمید الدین شاہد

شمس الامراء کے سائنسی کارنامے

شمس الامراء کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خاندان پائیگاہ آصفجاہی امراء میں ہر لحاظ سے ممتاز رہا ہے۔ جاگیرات و مناصب کے علاوہ شاہی خاندان کی لڑکیاں اس خاندان کے امراء سے بیاہی گئیں۔ اکثر افراد سپہ سالاری کے علاوہ وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے اور خطابات و دیگر مراحم شاہانہ سے سرفراز ہوئے۔ چنانچہ اس خاندان کے تین امراء کو شمس الامراء کا خطاب ملا۔ امیر کبیر نواب محمد فخر الدین خان شمس الامرائے ثانی ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۹ھ میں انتقال کیا۔ یہ سب سے پہلے امیر پائیگاہ ہیں جن کی علم دوستی علم پروری اور رعایا نوازی آج تک مشہور ہے۔ وہ اپنے ذوقِ علم و فضل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے اطراف علماء کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا جو تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ اس عہد کے ایک مشہور مصنف خواجہ غلام حسین خان الملقب بہ خان زماں نے اپنی تاریخ "گلزارِ آصفیہ" میں ان کے علم و فضل اور علمی دلچسپیوں کے متعلق لکھا ہے۔

"آں سرخیلِ امرائے نامدار امیر لیست صاحب شان و شوکت و شکوہ .....
صاحب تصانیف علوم حکمت علی الخصوص در علم ریاضی کہ عبارت از ہندسہ
و ہیئت باشد و نیز در علم جرثقیل رسالہائے عمدہ تصنیف فرمودہ
"ستہ شمسیہ" کہ مشہور آفاق اند۔ در نفس الامر علم ریاضی را آں قدر سہل
و آساں تر نمود کہ خلقے در اندک توجہ و شوق بحصول مقاصد و مطالب
بلند و آب دل پسند ارجمندی رسد اگر بو علی سینا زندہ می بود داد ایں تحریر
دل فزا می داد و نیز در علم حساب رسالہ خلاصہ بہ تحریر تصنیف آوردکہ آں علم
لطیف خلاصہ تر شدہ بہ فہم و ادراک ہر ذی فہم می آید۔ اگر شیخ بہاؤ الدین عاملی
می دید بعہد ایں رسالہ بہ ستائشے بے پایاں لب انصاف می کشاد"

شمس الامراء نے بعنوانات حکمت، ہندسہ، ریاضی وغیرہ ... سے پہلی

دفعہ اردو میں کتابیں لکھوائیں اور خود تصنیف کیں۔ چونکہ نواب موصوف کو علوم ریاضی و ہیئت سے خاص شغف تھا۔ اس لئے زیادہ تر ان ہی علوم سے متعلق کتابیں فرانسیسی اور انگریزی زبان سے ترجمے کرا کے اپنے سنگی چھاپے خانہ میں چھپوائیں۔

یہی نہیں بلکہ ذاتی تحقیق اور تلاش کیلئے انہوں نے ایک رصدگاہ جہاں نما تعمیر کرائی تھی۔

اس مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں ہمیں حسب ذیل کتابوں کا پتہ چلا جو ان کی زیر سرپرستی لکھائی گئیں

(۱) ترجمہ شرح چغمنی قلمی کتابت قریب سنہ ۱۲۵۰ھ (۲) اصول علم حساب مطبوعہ سنہ ۱۲۵۲ھ (۳) رسالہ مختصر جرثقیل (۴) رسالہ کسورات اعشاریہ مطبوعہ سنہ ۱۲۵۲ھ (۵) علم جرثقیل (ستہ شمسیہ جلد اول) مطبوعہ سنہ ۱۲۵۶ھ (۶) علم ہیئت (ستہ شمسیہ جلد دوم) مطبوعہ سنہ ۱۲۵۶ھ (۷) علم آب (ستہ شمسیہ جلد سوم) مطبوعہ سنہ ۱۲۵۶ھ۔ (۸) علم ہوا ستہ شمسیہ جلد چہارم سنہ (۹) علم مناظر (ستہ شمسیہ جلد پنجم) مطبوعہ سنہ ۱۲۵۶ھ (۱۰) علم برق ستہ شمسیہ جلد ششم مطبوعہ سنہ (۱۱) رسالہ علم واعمال کرنے کے بیان میں مطبوعہ سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۲) منتخب السیر دور نما (۱۳) کمسٹری کا مختصر رسالہ مطبوعہ سنہ ۱۲۵۹ھ (۱۴) رسالہ مفتاح الافلاک سنہ ۱۲۶۰ھ۔ (۱۵) رسالہ کیمسٹری مطبوعہ سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۶) خلاصۃ الادویہ مطبوعہ سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۷) نافع الامراض مطبوعہ (۱۸) ترکیب ادویہ مطبوعہ سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۹) رسالہ حیوانات مطلق مطبوعہ سنہ ۱۲۶۴ھ (۲۰) مرقع تصویر حیوانات سنہ ۱۲۶۴ھ۔

نواب فخرالدین خاں نے خود بھی کئی کتابیں لکھیں۔ مگر ان کی اردو کی کتابوں کے متعلق یقین سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان ہی کی ہیں۔ اس لئے دیباچہ میں بجائے اپنے نام کے صرف یہ لکھدیا ہے "مصنف اس کتاب کا یہ کہتا ہے" البتہ فارسی کتابوں میں اپنے نام کی صراحت کردی ہے۔ مثلاً کتاب شمس الہندسہ "مطبوعہ سنہ ۱۲۴۱ھ کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"می گوید مولف ایں رسالہ محمد فخرالدین خاں الملقب بہ شمس الامراء...... کہ کتاب اقلیدس" اگرچہ حاوی جمیع اصول ہندسیہ است از دقت براہین قطویل طالبش مبتدی را بہرہ وافی ...... نمی داد...... نسخہ خوب از تالیفات موسی کلارک کہ در زبان فرانسیس ...... بود دیدم کہ درآں کتاب اعمال اصول اشکال ...... قریب الفہم کہ از آں کارہائے اعمال بہ آسانی می برآئید قوم اند لہٰذا ...... آں کتاب را از زبان فرانسیس بہ زبان فارسی مترجم ساختہ معنون و موسوم بہ

مولانا حمید الدین شاہد

صاحبزادہ محمد علی خاں میکش

پھول تو اپنی بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت تو ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

آج ہم جس ہستی کا سوگ منانے اور یاد تازہ کرنے کے لئے سب دس کا تیغ خاص مخبر جش کھیے
ہ وہ چمنستانِ شعر و ادب کا ایک ایسا گلِ سرسبد تھا جو ابھی پوری طرح کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ
مرجھا گیا ۔ اس غنچۂ ناشگفتہ نے پرستارانِ شعر و سخن کے مشامِ جاں کو اپنی عطر بیزیوں سے
ء اس قدر معطر کر دیا تھا کہ جس کے آگے بہارِ صد گلستاں بھی خجل تھی ۔ اس کے ہر شعر پر
ن اندر چمن بہار اندر بہار کا گمان ہوتا تھا ۔ ہم اپنی اس بدنصیبی پر جس قدر بھی ماتم کریں
یں کم ہے کہ ؎

صد حیف گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

میکش کو مرحوم کہنے کی ہمارا دل اجازت نہیں دیتا ۔ کیسے یقین کریں کہ ہمارا دوست جو کل
ے ہمارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا آج ہم میں نہیں ہے ۔ عمر بھی تو کچھ زیادہ نہیں پائی تھی ۔
ں تو اس نے اپنی زندگی کی تیس بہاریں بھی پوری طرح نہیں دیکھی تھیں ۔ لیکن قدرت کے اس
ہ قانون کے آگے سر تسلیم خم کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے ؎

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

چونکہ میکش نے اپنی اس کم عمری میں اتنے زیادہ کام انجام دیے جو شاید ہی کوئی اور کر سکے ۔
ن دنیا کو ابھی ان سے بہت کام لینے تھے ۔ افسوس کہ میکش بہت جلد ہم سے جدا ہو گئے ۔

بلکہ زبردستی ہم سے چھین لے گئے، اس کو زمانے کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا کہئے۔

صاحبزادہ میکش ان چند خوش نصیب باکمال نوجوانوں میں سے تھے جو اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں ہی میں آسمانِ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس مختصر سی زندگی میں جو کام کئے اور نام پیدا کیا وہ بہت ساروں کے حاصلِ عمر سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے میکش کو فکری اور شعری صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا تھا جس چیز کے حاصل کرنے کے لئے اوروں کو بڑی محنت اور جاں فشانی کرنی پڑتی ہے میکش نہایت آسانی اور چابک دستی سے اس کو پا لیتے تھے اور ان کی اس غیر معمولی صلاحیت کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ فطرت نے ان کی طبیعت میں شرافتِ نفس اور ذکاوت کے انمول جواہر ودیعت کئے تھے۔ جب کبھی وہ کسی عنوان پر قلم اٹھاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ خیالات اور مضامین کے طوفان ہیں کہ بہے چلے آرہے ہیں۔ مجھے کئی مرتبہ ایسے موقعوں پر ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اور میں نے دیکھا کہ میکش کو کسی عنوان پر لکھنے کو کہا جائے تو انکار یا گریز تو کیا کرتے پنسل اور کاغذ ہاتھ میں لے ایک گوشہ میں بیٹھ جاتے اور ایک ہی نشست میں دو چار نہیں بلکہ کئی صفحات کا مضمون قلم بند کر دیتے اور پھر ہم کو سناتے، ان کے قلم میں بلا کا جادو اور اسلوبِ بیان میں حیرت انگیز دل کشی ہوتی تھی۔ معمولی سی بات کو بھی اس انداز سے پیش کرتے کہ سننے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ جب کبھی وہ اپنا مضمون سناتے تو ہم لوگ صدائے آفرین و تحسین بلند کرتے ہوئے ان کی جدتِ طبع اور سحر بیانی پر محوِ حیرت ہو جاتے۔ میں ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اور ان کی قلمی کاوشوں کو ہمیشہ سراہتا رہتا۔ ان کو پھلتا پھولتا دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوتی۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا کہ کہیں اس جوہرِ قابل کو نظر نہ لگ جائے ہمیشہ خدا سے دعا کرتا کہ اے باری تعالیٰ تو نے اپنے فضل و کرم سے اس بندہ کو اتنی خوبیوں سے سرفراز فرمایا اب تو ہی اس کا محافظ و نگہبان ہے۔ اسے ہمیشہ نظرِ بد سے بچائیو، اور وہ نا نصیب کیسے کر آسمانِ علم و ادب کا یہ ستارہ مہرِ درخشاں بن کر چمکے اور اس کی ضیا پاشیاں

سے علمی دنیا کا گوشہ گوشہ منور ہو جائے۔

غالباً اگست ۳۸ء کا زمانہ تھا۔ اندھیری کالج بمبئی نے شاندار پیمانے پر یوم اقبال منایا تھا۔ ڈاکٹر زبید صاحب نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی تھی۔ پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی نے مجھے اور میکش کو بھی مدعو کیا تھا۔ حیدرآباد سے اصحاب ثلاثہ کا یہ گروہ روانہ ہو کر بمبئی پہنچا۔ اسٹیشن پر پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی ہمارے استقبال کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ہم تینوں موٹر میں سوار ہو کر ان کے مکان پہنچے۔ میرے اور میکش کے لئے ایک کمرہ مختص تھا۔ ہم نے اپنا اسباب رکھا اور سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا چاہتے تھے کیونکہ شام میں جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ میکش اور میں اپنے پلنگ پر دراز سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے کہ پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی اپنے ہاتھ میں علامہ اقبال کی چند کتابیں لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور میکش سے مخاطب ہو کر کہا "آپ کو شام کے جلسہ میں علامہ اقبال پر ایک مقالہ سنانا ہوگا۔ یہ کتابیں آپ کے لئے لایا ہوں"۔ میکش بڑے بامروت اور مجسمۂ اخلاق انسان تھے کہ سفر کی تھکان اور اتنے کم وقت کے باوجود بھی انکار نہ کر سکے اور وعدہ بھی کر لیا۔ اور یہ ان کی ایک خاص عادت تھی کہ وہ کبھی کسی کی بات نہ ٹالتے تھے۔ ندوی صاحب چلے گئے اور میکش میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کو چاروناچار مقالہ تیار کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے ٹرنک کھول کر سب رس کا اقبال نمبر ان کے سامنے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک کتابوں اور رسالے کے صفحات الٹ پلٹ کرتے رہے اور حسب عادت پنسل اور کاغذ لے کر مقالہ لکھنے بیٹھ گئے۔ میں نے علامہ اقبال کی کتابوں سے بعض اشعار کا انتخاب کر کے ان کے سامنے رکھ دیئے تا کہ وہ اپنے مضمون میں جہاں مناسب سمجھیں شریک کر لیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان پر محویت کا عالم طاری تھا۔ اور ان کا قلم بغیر رکے کاغذ پر رواں تھا۔ اسی دوران میں ندوی صاحب دو تین مرتبہ یہ دیکھنے کے لئے کمرہ میں آئے کہ میکش صاحب ان کی فرمائش پوری کر رہے ہیں یا نہیں۔ شاید ان کو یقین نہ آیا ہو کہ اتنے کم وقت میں

علامہ اقبالؔ پر مقالہ تیار ہو جائے گا۔ جب انھوں نے میکش کو سوچنے میں مصروف دیکھا تو ان کے چہرہ پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر میکش نے ایک مبسوط مقالہ تیار کر لیا۔ جب انھوں نے مجھے سنایا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ بغیر کسی تیاری کے اتنے کم وقت میں ایسا اچھا مقالہ لکھ ڈالا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میکش میں خداداد تحریری صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شام میں ہم جلسہ میں شریک ہوئے۔ چار پانچ ہزار سے کم کا اجتماع نہ تھا۔ کالجوں کے طلبہ، پروفیسر، اخباروں کے ایڈیٹر، ادیب و شاعر جمع تھے۔

میکش نے جب اپنا مقالہ سنانا شروع کیا تو ساری محفل ہمہ تن گوش ہو کر ان کا مقالہ سن رہی تھی۔ مقالہ سنانے کے دوران میں ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں اور جب جلسہ ختم ہوا تو بڑے بڑے لوگوں نے میکش کو مبارک باد دی۔ اندھیری کالج کے پرنسپل پروفیسر بدل الرحمٰن صاحب اور دیگر حضرات نے ہم کو اپنے ہاں مدعو کیا اور میکش نے ان ادبی محفلوں میں اپنا کلام سنا کر سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ مئی ۱۹۶۲ء میں پیش آیا۔ تعلقہ کوڑنگل میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی شاخ کی طرف سے اُردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ میکش، شاہد صدیقی، کنول پرشاد، سلیمان اریب اور دیگر شعراء نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ صدر جلسہ کسی وجہ سے نہ آسکے تو منتظر کانفرنس نے مجھ سے جلسہ کی صدارت کی خواہش کی۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کانفرنس کی صدارت کے لیے میکش صاحب مجھ سے زیادہ موزوں ہیں، اور میں نے میکش کو صدارت کے لیے راضی بھی کر لیا۔ رسمی طور پر جلسہ کے صدر کو تقریر یا خطبہ سنانا پڑتا ہے۔ اس لیے میکش نے پنسل اور کاغذ لے کر خطبہ لکھنا شروع کیا۔ اور ایک گھنٹہ کے اندر کئی صفحات کا ایک نہایت ہی جامع اور پُر مغز خطبہ تیار کر لیا۔ اور جب انھوں نے مجھے سنایا تو میں حیران رہ گیا کہ ان کے دماغ میں کس طرح غیب سے مضامین آجاتے ہیں ان کا یہ خطبہ اُردو زبان و ادب سے متعلق ایک معلومات آفریں ادبی شاہکار تھا۔

کم لوگ میکش کی اس عظمت اور ذہانت اور صلاحیت سے واقف ہوں گے ۔ صرف وہی میرے اس بیان کی شہادت دے سکتے ہیں جنھوں نے ان کا قریب سے مطالعہ کیا ہے ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہے ہیں ۔ ورنہ دوسرے تو شاید اس کو مبالغہ اور بے جا تعریف پر محمول کریں ۔ میں نے آج تک کسی ایسے ادیب کو نہیں دیکھا جس کے قلم میں روانی اور گل کاریاں ہوں ۔ شعرا کو تو ہم نے فی البدیہہ اشعار کہتے سنا ہے لیکن فی البدیہہ نگار اب تک نظر نہیں آیا ۔ یہ سعادت میکش کا خاص حصہ تھی جو دوسروں کو مشق اور محنت کے بعد بھی نصیب نہیں ہو سکتی ۔

علامہ اقبال کا جس روز انتقال ہوا ، اسی شام کو میں میکش کے مکان پر گیا تھا ، دیکھا ہوں کہ میکش اپنے کمرے میں ٹہل رہے ہیں ۔ چہرے سے افسردگی اور غم کے آثار ہیں ۔ تھوڑی دیر تک علامہ اقبال کی موت پر گفتگو ہوتی رہی اور اپنے عمیق رنج و غم کا اظہار کیا ۔ چلتے ہوئے میں نے ان سے کہا کہ اگر تم اقبال کی موت پر کل تک ایک نظم لکھ دو تو میں سمجھوں گا کہ واقعی شاعر ہو ۔ چنانچہ میکش نے دوسرے دن صبح ہی اپنے خط کے ساتھ وہ نظم میرے ہاں بھیج دی ۔ ان کے خط کا ایک جملہ یہ ہے :

"تم نے کہا تھا اگر اقبال پر نظم نہ دی تو تم شاعر ہی نہیں ۔ تو خدا نے شاعر بنا دیا ۔ نظم مرسل ہے ۔"

میکش نہایت ہی خاموش اور سنجیدہ انسان تھے اور اپنی گوناگوں قابلیتوں اور صلاحیتوں کے باوجود کبھی کسی نے ان کی اپنی تعریف یا بڑائی کرتے ہوئے نہیں سنا ۔ انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں پروفیسر الیاس برنی صاحب معاشیات پڑھاتے تھے اور ہم سب ان کے لیکچر کو نہایت ہی توجہ اور دلچسپی سے سنتے تھے ۔ کئی لیکچروں میں وہ معاشیات کے کسی ایک مسئلہ پر اپنی بحث ختم کرتے اور پھر اسی مسئلہ پر مضامین لکھواتے ۔ طلبہ باری باری سے اپنے مضامین سناتے اور برنی صاحب ہر مضمون پر تبصرہ کرتے لیکن جب میکش اپنا مضمون سناتے تو ساری جماعت پر سکتہ طاری ہو جاتی اور خود پروفیسر برنی صاحب بڑی دلچسپی سے ان کا مضمون سنتے ۔

جب میکش اپنا مضمون ختم کرتے تو یمنی صاحب ان کے مضمون کی بے حد تعریف کرتے اور اظہار مسرت فرماتے۔

اردو علم و ادب کی خدمت وسیع پیمانہ پر کرنے کے لئے میکش نے ایک ادبی رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ہم دونوں نے اس بارے میں ڈاکٹر زور صاحب سے مشورہ کے بعد طے کیا کہ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ایک ماہنامہ سب رس کے نام سے نکالا جائے۔ چنانچہ [illegible] میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ تین سال تک میکش خود اس رسالے کو مرتب کرتے رہے اور اس کام سے ان کو دلچسپی بھی ہوگئی تھی۔ لیکن اس تلخ حقیقت کو معلوم کرکے کہ رسالہ سے مالی منفعت تو کیا اخراجات کی پابجائی کی بھی کوئی توقع نہیں اور آئندہ چند سالوں تک شاید منافع نہ مل سکے۔ میکش کو فکر معاش دامن گیر ہوئی اور انھوں نے محکمہ [illegible] میں ملازمت اختیار کرلی اور سب رس کی ادارت سے مستعفی ہوگئے۔ سب رس سے ان کو بڑا انس تھا چنانچہ انھوں نے ... ملازمت کرتے ہوئے بھی ریڈیو نمبر مرتب کیا۔

یہ تھے میکش کی زندگی کے چند پہلو جن پر میں نے ایک دوست اور ساتھی کی حیثیت سے اپنے تاثرات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ ان کی حقیقی [illegible] اظہار و بیان کے لئے کافی وقت اور سیکڑوں صفحات کی ضرورت ہے۔ قارئین ان کے متعلق میرے اس تصور خاکہ اور اس شمارے کے مضامین اور نظموں سے بآسانی معلوم کرسکتے ہیں کہ میکش ایک باعظمت ہستی تھے یا نہیں۔ نہیں کا شاید گمان بھی نہ ہو۔

(ماخوذ: سب رس میکش نمبر ۱۹۴۹ء)

جہاں اردو استعمال کی جاسکتی ہے ضرور کیجئے
اپنے دعوت نامے اردو میں طبع کروالیجیے
جہاں اردو سمجھی جاتی ہے۔ اردو کے سوا دوسری زبان مت استعمال کیجئے
جہاں اردو میں درخواست دی جاسکتی ہے اردو کا ہی استعمال کیجئے
اردو اخبارات، رسائل کتابیں خرید کر پڑھئے۔

خواجہ حمید الدین شاہد

صفی اورنگ آبادی پر ایک سرسری نظر

صفی اورنگ آبادی کی شخصیت اور ان کے کلام کی عظمت کا اعتراف کرنا دراصل دکن کے قدیم غزل گو شاعروں کے ایوانِ تاریخ میں ایک بہترین باب کا اضافہ کرنا ہے۔ موجودہ دور کے تمام غزل گو شاعروں میں صفی کا ایک خاص مقام ہے۔ وہ اپنے رنگِ تغزل اور اسلوبِ بیان کے مجتہد تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے کلام کی شہرت ان کی انتہائی خودداری اور قناعت پسندی، لا اُبالی زندگی اور شان بے پروائی کی وجہ سے صرف دوستوں اور شاگردوں کے محدود حلقے میں ہی رہی۔ انھوں نے کبھی کسی رسالے میں اپنی غزل شائع نہیں کروائی۔ حیدرآباد کے صرف دو تین رسالوں میں کبھی کبھی ان کا کلام شائع ہوا ہے جو یا تو ان کے دوست احباب نے ان کے منشا کے خلاف بھیج دیا یا خاص تعلقات کی بنا پر کسی رسالے کے مدیر نے ان سے اشاعت کی اجازت حاصل کر لی۔ مشاعروں میں بھی وہ بہت کم شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے شاعری کو اپنی شہرت اور نام و نمود کا وسیلہ نہیں بنایا۔ ذوقِ طبع کی تسکین ہی ان کی شاعری کا مقصد تھا۔ وہ نہایت پُرگو شاعر تھے چنانچہ انھوں نے اپنی ہی زندگی میں ایک عرصہ قبل اپنا دیوان "پراگندہ" کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں اس کو چھپا نہ سکے۔ دیوان نہ چھپنے کے بارے میں ایک جگہ اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے ؎

یہ "پراگندہ" ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی
میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

دیوان کی اشاعت میں تاخیر کا سب سے بڑا سبب ان کی مالی مشکلات سے زیادہ ان کی طبیعت کا خاص انداز اور ایک بلند نظری تھی۔ جو معیار ان کے پیش نظر تھا شاید اس کے مطابق

حالات پیدا نہ ہوسکے ۔ محترم ڈاکٹر زورؔ صاحب نے کئی مرتبہ ان سے خواہش کی کہ ادارہ ادبیات اُردو کی طرف سے کم از کم ان کے کلام کا ایک انتخاب ہی شائع ہوجائے ۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرتے ہی رہے ۔ لیکن کلام کا انتخاب مرتب نہ ہوسکا ۔ خود میں نے کئی دفعہ ان سے درخواست کی تو وہ ہر وقت یہی فرماتے کہ کلام کا انتخاب کرلیا ہے اور فلاں شاگرد کو صاف خط میں لکھنے کو دیا ہے اس طرح دس سال کا طویل عرصہ گذر گیا لیکن وہ کام تکمیل نہ پاسکا ۔

انتقال سے چند مہینے قبل منتی نے مجھے کسی کام سے یاد فرمایا تھا ۔ اثنائے گفتگو میں انتخاب کلام کا ذکر چھیڑا تو فرمایا کہ مجھے بے حد شرمندگی ہے کہ اب تک میں ادارے کو اپنا کلام اشاعت کے لئے نہ دے سکا اس کی وجہ میری صحت کی خرابی ہے ۔ اور میں خود اپنے کلام کو صاف نہیں کرسکتا اور مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کو میری مرضی کے مطابق انجام دے سکے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا کلام غلط سلط چھپ جائے ۔ اب اس کی ایک ہی صورت دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ آپ وقت نکال کر میرے ہاں آجائیں ۔ میں کہتا جاؤں اور آپ لکھتے جائیں ۔ میں نے کہا کہ بخوشی میں اس کام کے کرنے کے لئے تیار ہوں ۔ گرمی کی چھٹیوں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا اور جلد سے جلد اس کام کی تکمیل ہوجائے گی ۔ یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ اس کام کے شروع کرنے سے پہلے ہی ان کی صحت بگڑ گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگئے ۔

منتی مرحوم حیدرآباد کی قدیم تہذیب کا مکمل نمونہ تھے ۔ شرافتِ نفس اور خودداری ان کی فطرت کے نمایاں جوہر تھے ۔ بڑے یارباش اور دوستوں کے دلدادہ تھے ۔ آدابِ مجلس کا ان کو بڑا خیال رہتا تھا ۔ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے دوسروں کو دکھ پہنچے ۔ ابتذال سے انھیں نفرت تھی ۔ اپنے ہم عصروں حتیٰ کہ نوجوان شاعروں کے اچھے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے ۔ رشک و حسد کو وہ گناہِ عظیم سمجھتے تھے ۔ ہر نئے ملنے والے سے وہ خندہ پیشانی سے ملتے ان کی گفتگو کا انداز بھی عجیب تھا ۔ مختصر الفاظ میں اپنا مطلب ادا کرکے بات کو فوراً ختم کردیتے تھے ۔ عمر بھر کوئی مستقل ملازمت نہیں کی ۔ ان کے ذریعۂ معاش کے بارے میں مجھے علم نہ ہوسکا لیکن کبھی انھوں نے کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا ۔ ان کی خودداری اور قناعت

دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا کہ ان کی خدمت میں کچھ پیش کیا جائے۔ بظاہر آمدنی کا کوئی ذریعہ ان کا نہ تھا۔ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے شعبۂ ملازمت کا سہارا لیا۔ پولیس پنشن کے بعد ان کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی اور انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بھی ان کی زبان سے حرفِ شکایت نہیں سنا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ حکومتِ ہند شاعروں اور ادیبوں کو مالی امداد دینا چاہتی ہے اگر آپ کی طرف سے بھی ایک درخواست بھیج دی جائے تو مناسب ہوگا۔ انھوں نے میری اس تجویز کی مخالفت نہیں کی اور درخواست پر اپنے دستخط کر دیے۔ ان کی یہ درخواست منظوری کے مرحلے طے کر رہی تھی کہ ان کا پیمانۂ زندگی لبریز ہو گیا۔

صفیؔ مرحوم نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی لیکن غزل کو ان کی طبیعت سے خاص مناسبت تھی۔ چنانچہ وہ ہمیشہ غزل ہی کہتے رہے اور رنگِ تغزل میں ایسا نکھار پیدا کیا جو اپنی آپ نظیر ہے۔ وہ غزل کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ اور غزل کی ساری خصوصیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ بالخصوص جذبات نگاری، معاملہ بندی، لفظ پرستی اور محاورہ بندی پر انھیں عبور تھا کہ اس خصوص میں انفرادیت پیدا کر لی تھی۔ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال پر خاص مہارت رکھتے تھے۔ زبان کا چٹخارہ اور اندازِ بیان کا بانکپن انھیں کا حصہ تھا۔ شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی علمی قابلیت، وسیع مطالعہ اور بالخصوص فنِ عروض اور قواعدِ زبان سے کامل آگاہی ان کی شاعرانہ عظمت کا باعث ہوئی۔ صفیؔ مرحوم نے اردو زبان کے قدیم دبستانِ شاعری کے بلند پایہ شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا لیکن کسی رنگ میں ڈوب نہیں گئے بلکہ ساری رنگینیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنا ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ یہی ان کے بڑے شاعر ہونے کا ثبوت ہے۔ صفیؔ مرحوم صحیح معنوں میں عوام کے شاعر تھے۔ زبان و اندازِ بیان اتنا سادہ و سلیس ہے کہ ہر آدمی بقدرِ ظرف ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی سادگی و شستگی کلام کی بے پناہ روانی اور خیالات کی ہمواری ان کے کلام کے نمایاں پہلو ہیں۔ مشکل سے مشکل اور بلند سے بلند خیال ان کے اشعار کے سانچوں میں ڈھل کر سننے والوں کے دل و دماغ میں ایک کیفیت

پیدا کرتا ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں یہ دیکھا کہ عام آدمی ان کی غزلوں کو مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ موسیقی کی کوئی محفل ایسی نہ ہوتی جہاں صفی کی غزلیں نہ گائی جاتی ہوں ۔ ۱۹
زمانے میں جو غزلیں میں نے سنی تھیں ان کے بعض اشعار اب تک مجھے یاد ہیں ؎

ادا پیدا نظر سے شان رخ سے آن تیور سے
تمہیں قرباں آخر دل ہے کس کس کے لئے ٹوٹے

—

کسی کا رزق رکتا ہے بھلا خلاق اکبر سے
صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے

ارے شادان سیاہ بختی والا نہیں ملتا
ملا یا صفی کو جس کو دل کی لگی بجھی نصیبے سے

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا
بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

صفی کو مسکرا کر دیکھو غصے سے کیا حاصل
اسے تم زہر کیوں دیتے ہو جو مرتا ہے شکر سے

—

اسے دیکھا ہے جس کے دیکھنے کو لوگ مرتے ہیں
نظر بازو ہماری بھی ذرا حد نظر دیکھو

—

خیال آپ کا جب ذرا آ گیا
تڑپنے میں ہم کو مزہ آ گیا

نہ ہم دوسرے ہیں نہ وہ دوسرے
زمانہ مگر دوسرا آ گیا

کوئی مجھ سے بھی ہے سوا نامہ بر
ابھی کے ابھی میں گیا آ گیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو
یہ دل ہے جدھر آ گیا آ گیا

—

وہ تشریف لائے تو میں نے کہا
حسینوں کا احسان کیا چیز ہے

فرشتوں نے سمجھا کیا ہے صفی
حقیقت میں انسان کیا چیز ہے

—

وہ ہم جو دل سے بیٹھیں تو اٹھتی ہیں انگلیاں
کیا دل کے بیٹھتے نہیں دنیا میں چار لوگ

—

صفی مرحوم ایک فطری شاعر تھے۔ قدرت کی طرف سے جو دل و دماغ انھیں عطا ہوا : وہ داخلی شاعری کے لئے نہایت موزوں تھا۔ دلی جذبات، قلبی واردات اور شاعرانہ احساسات کے اظہار پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ زبان و بیان کی ندرت سے کام معمولی سے معمولی خیال کو نئے رنگ و روپ میں پیش کرتے تھے۔ زبان کی سلاست ساتھ مضمون آفرینی کا جوہر ان کے کمال شاعری کی دلیل ہے۔ مثال کے طور پر اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

نشیمن کیا بچے گا فصل گل میں چمن کی آگ تک جلائے گی گھر کو
رضائے دوست پر مرمٹنے والے سمجھ کر کیا کریں گے خیر و شر کو

—

سب کو کیا کیا بندھی ہیں امیدیں وہ ذرا بھی جو مسکرایا ہے
اس نے شرما کے منہ جو پھیر لیا ہم نے سمجھا ادھر بلایا ہے
اے صفی وقت کو برا نہ کہو وقت پیغمبروں پہ آیا ہے

—

الٰہی بندۂ مسکیں کا بھرم رکھ، قیامت میں نہ کھلوا دشمنوں کے سامنے گٹھڑی گناہوں کی
اسے دیکھا ہے جس انداز میں اللہ شاہد ہے بلائیں خود مجھے لینی پڑیں اپنی نگاہوں کی

—

اچھے گن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے
جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے اس سے دنیا مرید ہوتی ہے
اس کے وعدہ پہ جا رہا ہوں صفی ہائے کیا شئے امید ہوتی ہے

—

ہر ایک چیز پھر گئی آنکھوں کے سامنے اس انجمن کا ذکر جب انجمن ہوا
—
اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے غافل ہزار نام کا یہ ایک نام ہے

تسکینِ اضطراب بھی ہے ان کے ہاتھ میں ۔۔۔ دل پر رکھے تو کچھ نہیں تھوڑا سا کام ہے

کیا کہوں حسرت سے کہ قرآن کا منہ ہے ورنہ ۔۔۔ حمد کا لفظ تو ہونا تھا محمد کے لیے

ہر ذرہ کائنات کا سرمستِ عشق ہے ۔۔۔ قرباں جاؤں آپ کہاں ہیں کہاں نہیں

انتقال سے کچھ دن پہلے صفی نے یہ شعر کہا تھا ؎

چراغِ زندگی مدھم ہے لیکن ۔۔۔ چراغِ آرزو مدھم نہیں ہے

غزل کی ساری ظاہری اور معنوی خوبیاں یعنی زبان کی شیرینی، الفاظ کی سجاوٹ، محاورہ بندی، نازک خیالی، جذبات نگاری اور معاملہ بندی سب کچھ صفی کے کلام میں مو(جود ہے)۔ اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان کی شاعری کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ج(ائے)۔ آئندہ موقع ملے تو صفی کی شخصیت اور ان کی شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا جائے۔

آخر میں ایک تلخ حقیقت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ ہم لوگ مردہ پرست (ہیں) اور یہ ایک رسم قدیم ہے۔ زندوں کی قدر کرنا ہماری سرشت میں ہی نہیں ہے ا(ور ہم) نے اب تک زندہ قوموں سے یہ بات نہیں سیکھی ہے۔ نہ جانے کتنی باکمال ہستیاں ہم(اری) بے اعتنائی اور ناقدر شناسی کی وجہ سے منظر عام پر نہ آسکیں اور کتنے گوہر آب دار (خاک) میں دب کر ہی پڑے رہے۔ زندوں کی عیب جوئی اور مردوں کی مدح سرائی ہمارا (شعار) بن گیا ہے۔ خود صفی مرحوم نے بھی اپنے کلام میں کہیں کہیں اس کی طرف اشارے کئے ـــ

کسمپرسی ہے خاک ہونے تک ۔۔۔ خاک ہوتے ہی کیمیا ہوں میں

صفی بھی کس قدر ناداں ہے شاعر ہوا تو کیا ۔ ایسے لوگوں سے جیتے جی امیدِ قدر دانی۔

اس سے بڑھ کر صلۂ شعر ملا کیا ہو صفی ۔۔۔ لوگ سر دھنتے ہیں تعریف تو کی جاتی ہے

صفی کیوں قدر کا طالب ہوا ہے اس زمانے میں ۔۔۔ ارے کم بخت تیرے پاس کب ہے مال و زر

(یادگارِ صفی مطبوعہ ۱۹۵۶ء سے ماخوذ)

خواجہ حمید الدین شاہد

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی سرمد ثانی ۲۶ر مارچ ۱۹۶۱ء کو انتقال فرما گئے۔ اردو کے اس صاحب عرفان اور صوفی منش شاعر کی رحلت پر حیدرآباد دکن کی ساری فضا رنج و غم سے بوجھل ہوگئی۔ صبح ہوتے ہوتے حضرت امجد کی قیام گاہ پر عقیدت مندوں کا تانتا بندھ گیا۔ جنازہ کے جلوس میں ہزاروں پرستاروں اور بے شمار ادیبوں، شاعروں، عالموں اور معزز شہریوں نے شرکت کی۔ حیدرآباد کے ایک صاحب دل بزرگ حضرت عبداللہ شاہ صاحب قبلہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ درگاہ حضرت شاہ خاموشؒ کے شہر خموشاں میں اپنی اہلیہ سلمیٰ مرحومہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

اردو کے ممتاز اور منفرد رباعی گو شاعر حضرت امجد کی وفات پر پاکستان و ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ بالخصوص حیدرآباد کے مختلف ادبی اور تہذیبی اداروں کی جانب سے تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ اور ان کی زندگی اور شاعری پر وہاں کے مشہور اہل قلم اصحاب نے مقالے پڑھے اور شاعروں نے ان کی روح کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ اس کے علاوہ شہر حیدرآباد کی سماجی اور سیاسی تنظیموں نے بھی حضرت امجد کی وفات کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔ کیونکہ حضرت امجد نے اپنی لافانی شاعری کے ذریعہ حیدرآباد کا نام اونچا کیا اور اردو دنیا میں اپنا مقام حاصل کیا۔

آپ کی وفات پر ارکانِ حکومت، اہل قلم اصحاب، اور معززینِ شہر کے تعزیتی بیانات سے حضرت امجد کی شخصیت اور عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان بیانات میں سے

چند کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں :

" محترمہ بیگم صاحبہ ۔ آپ کے مایہ ناز شوہر کی وفات کی خبر سُن کر مجھے دلی رنج ہوا ۔ ان سے مل کر خوشی ہوتی تھی اور میرے دل میں ان کے لئے بہت عزت اور پیار تھا ۔ حیدرآباد بالخصوص اور ہمارا ملک عام طور پر ان کی گرامی قدر خدمات کو نہیں بھول سکتا ۔ خدا تعالیٰ ان کی روح کو شانتی اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے کہ آپ اس بھاری صدمے کو برداشت کر سکیں "۔

(ہامیم سین سیم گورنر آندھرا پردیش)

(اس تعزیت نامے کے ساتھ گورنر صاحب نے (۵۰۰) روپے بھی ارسال فرمائے)

•

" حضرت امجد کے انتقال کی خبر میں نے بڑے افسوس کے ساتھ اخبارات میں پڑھی ۔ مجھے ان کی ذات سے خاص عقیدت تھی ۔ قیام حیدرآباد میں مجھے دو بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا ۔ وہ ایک صوفی منش اور نیک انسان تھے ۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند تھا ۔ انہوں نے اپنی تمام تصانیف اور ایک تصویر مجھے عنایت کی تھی ۔ یہ تصویر میرے بیڈ روم میں آویزاں ہے اور ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی ہے ۔ ان کا جسم ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ہے لیکن ان کی تصانیف اور ان کا کلام کبھی نہیں مر سکتا ۔ حیدرآباد کے لئے حضرت امجد کی موت ایک عظیم سانحہ ہے اور مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے "

(ڈاکٹر بی گوپال ریڈی وزیر حکومت ہند)

•

" مرحوم رباعی گوئی میں اپنی مثال آپ تھے ۔ اور عبرت و فنا د عبدیت و توحید کے مضمون کو اپنی نظموں میں اس خوبی و خوش اسلوبی اور دلآویزی سے ادا کرتے تھے کہ اہلِ غفلت بھی وقتی طور پر تو ضرور متاثر ہو کر رہتے تھے ۔ ان کی حکیمانہ ... و ...

شاعری نصف صدی سے زیادہ کو گرمائے رکھے ہوئے تھی اعمال کی ذات قائم کے اپنے صوفی شاعروں کی زندہ یادگار کا کام دے رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہتر سے بہتر مرتبہ عطا فرمائے"۔

(عبدالماجد دریابادی)

●

"حضرت امجد حیدرآبادی تنہا شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اس سے زیادہ حکیم و عارف اور صحیح معنوں میں اس دور میں سرمد اور ابوالخیر تھے۔ شاعری کو تو انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ رباعی گوئی میں اس دور میں یگانہ تھے۔ اکبر اور اقبال کے بعد حکیمانہ شاعری انہیں کے دم سے زندہ تھی۔ ان کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس لئے ان کی وفات تنہا دنیائے ادب و شاعری کا نہیں بلکہ حقیقتاً دنیائے دل کا حادثہ ہے"۔

(معین الدین احمد ندوی مدیر معارف)

●

حکیم الشعراء حضرت امجد علیہ الرحمہ کی وفات کی خبر نے یوں تو تمام اردو دنیا میں غم و الم کی لہر دوڑا دی لیکن حیدرآباد سب سے زیادہ اس صدمے سے متاثر ہوا ہے۔ حضرت امجد کے کلام سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کی ہم پلہ بن گئی بلکہ حیدرآباد کی عزت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا ہے جس پر یہاں کے رہنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ گذشتہ دو صدیوں میں وہی ایک ایسے منفرد شاعر دکن میں پیدا ہوئے تھے جن کا احترام پوری اردو دنیا میں کیا گیا"۔

(ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

●

حضرت امجد جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے اور یہی وہ خصوصیت تھی جس کی وجہ سے ان کا ہر ملنے والا، ان کی شاعرانہ عظمت اور بزرگانہ شفقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی شخصیت اور انداز گفتگو میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ جو بھی آدمی ایک دفعہ ان سے مل لیتا وہ ہمیشہ کے لئے ان کا ہو جاتا تھا۔ میں صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا

سے حضرت امجد سے پہلی بار کب ملا تھا۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ وہ شروع ہی سے مجھ پر بہت مہربان تھے۔ اور ایسا شفقت و عنایت کی نظر فرماتے تھے کہ میں روز بروز ان سے قریب ہوتا گیا۔ زندگی کے مختلف مسائل پر مجھے ان سے گفتگو کرنے کے مواقع ملے۔ وہ زندگی کے مشکل سے مشکل مسئلہ کو بڑی آسانی سے سمجھا دیتے تھے۔ اور ان کا اندازِ تفہیم اتنا معقول ہوتا تھا کہ ان کا مخالف بھی ان کی بات کا قائل ہوجاتا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں ایسی بات کہہ جاتے تھے جو کانوں کی راہ سے دل میں اتر جاتی تھی۔

مجھے حضرت امجد کے ساتھ سفر کرنے کے بھی مواقع ملے۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ اورنگ آباد کالج (حیدرآباد دکن) کی طرف سے حالی کا صد سالہ جشن منایا گیا تھا جس میں حضرت امجد بطور خاص مدعو کئے گئے تھے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ اس جشن میں شرکت کی تھی۔ ریل گاڑی کے تیسرے درجے میں ہم دونوں سفر کر رہے تھے۔ اس درجے میں سفر کرنے والے تقریباً سب کے سب غریب لوگ تھے۔ ہر اسٹیشن پر مسافروں کو چڑھنے اترنے میں بڑی زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ غریبوں کی زندگی کے مختلف مناظر کو دیکھ کر حضرت امجد بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے فرمایا، سنو ابھی میں نے دو رباعیاں کہی ہیں۔ ایک غریب کی زبانی اور دوسری امیر کی زبانی۔ امیر غریب کو اس طرح بڑی حقارت سے مخاطب کرتا ہے ؎

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں　　مردود جیسے جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا　　معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

غریب کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور وہ امیر سے مخاطب ہو کر جواب دیتا ہے کہ آپ ہمارے جینے پر تعجب ہوتا ہے۔ اور وہ امیر سے مخاطب ہو کر جواب دیتا ہے کہ

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں　　سر چڑھ کے زمیں میں اترتے کیوں ہیں
رکھ کر بھی تمام زندگی کے ساماں　　معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

حضرت امجد اردو کے ان چند باکمال اور صاحب دل شاعروں میں سے تھے جنھیں زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے۔ دکن کی سرزمین شروع ہی سے اردو شاعری کا گہوارہ رہی ہے

جس میں : قطب شاہ، وجہی، غواصی، ولی، سراج، فیض، کیفی، علی اختر، توفیق، علی منظور اور صفی جیسے باکمال شاعروں نے نشوونما پائی جن کی شاعری کی آب و تاب نے آسمان شاعری میں چار چاند لگائے۔ موجودہ دور کے شاعروں میں حضرت امجد کی ایک نمایاں حیثیت ہے اور وہ ہے ان کی حقیقت نگاری۔ بالخصوص آج کی مادہ پرست دنیا میں جہاں روحانیت اور خدا پرستی کا مفہوم محض خیالی بن کر رہ گیا ہے۔ ان کے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات نے اردو شاعری کے اخلاقی اور روحانی اقدار کو باقی رکھنے میں بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ ان کا متصوفانہ اور روحانی کلام مشعل ہدایت بن کر بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کرتا رہے گا اور ان کی شاعری کا محور اخلاقیات، انسانیت کا احترام اور روحانی تعلیم ہے۔ یہی ایک ایسی انفرادی خصوصیت ہے جو اردو دنیا میں حضرت امجد کی شہرت اور مقبولیت کا باعث بنی۔ اگرچہ کہ ان کا کلام مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے لیکن رباعی گو شاعر کی حیثیت سے انہیں لازوال شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ان کی رباعیات اتنی بلند پایہ ہیں کہ اردو ادب میں شاید ہی ان کا جواب مل سکے۔ امجد ہی سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت اردو دنیا میں نام پیدا کیا۔ ان کی رباعیوں میں سلطان ابوسعید ابوالخیر اور سرمد کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس لئے ان کو "زندہ سرمد" بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ غلام قادر گرامی مرحوم نے اپنی ایک رباعی میں ان کو "جواب سرمد" کہا ہے۔

امجد بہ رباعی است فرد امجد   کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز   روح سرمد بہ گفت امجد امجد

حضرت امجد کے کلام کی انفرادیت سے متاثر ہو کر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے در "معارف" بابت فروری ۱۹۳۲ء کے شذرات میں اس طرح اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا تھا

" معارف کا یہ شیوہ نہیں کہ شاعروں کو خطابات بانٹے۔ لیکن حضرت امجد کی توبہ نو حکمت آمیز شاعری نے اس اعتراف فضل پر مجبور کیا اور لفظ حکیم الشعراء سے عقیدت کا اظہار کیا تھا۔

اُردو کے پہلے پروفیسر مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے اپنے مضمون "دکن میں ایک رباعی گو شاعر" حضرت امجد کے علم و فضل اور کمالِ شاعری کا اس طرح اعتراف کیا ہے:

"یہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو لفظوں اور محاوروں کے گلدستے تیار کرتے رہتے ہیں ان کے کلام میں جا بجا بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہلِ بصیرت کے لئے ہوش رُبا ہے۔ وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی پروا نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں۔ خود خیال ہی اپنے لئے لباس تیار کر لیتا ہے اور اس کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ قدرتی شاعر کی یہ پہچان ہے۔ ان کی رباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی اور اُردو ادب کا اہم عنصر خیال کی جائیں گی۔"

غرض حضرت امجد کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک باکمال شاعر کے لئے ضروری ہیں۔ قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ شاعرانہ جذبات ان کی فطرت میں ودیعت کئے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام حقیقت اور فطرت سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک شعر نہیں کہتے تھے جب تک ان کے دل پر کوئی کیفیت طاری نہیں ہو جاتی تھی۔ اور اسی کیف و مستی کے عالم میں ان کے دلی جذبات اشعار کی صورت میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ شعر کی تاثیر کے بارے میں وہ اپنی ایک رباعی اور ایک قطعہ میں اس طرح اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبارِ فن خوب کہا لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

....

کلام ایسا اکثر سنا ہوگا تم نے سنا آج اور کل اثر دل میں اُترا
کہو شعر ایسا کہ ہو تیز خنجر ادھر منہ سے نکلا اُدھر دل میں اُترا

"خرقۂ امجد" کے دیباچہ میں انہوں نے شاعری کے بارے میں اپنے تصورات پیش کئے ہیں وہ حرف بہ حرف خود ان کی شاعری پر صادق آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"شاعری، موسیقی، مصوری تینوں اپنی جگہ ضروری ہیں لیکن ان میں باہمی تعلق ایسا ہے
جیسے شعور میں شعر کہتا ہے، ایسے راگ کا گاتا ہے پھر تلفظ ہے، کتنی بڑی تصویر
بناتے ہیں۔ وزن کے اعتبار سے شعر، لحن کے اعتبار سے راگ، اگر ناک نقشے کے اعتبار
سے تصویر تو ضرور ہے لیکن کوئی صاحبِ فن کیا ان کو فنونِ لطیفہ میں شمار کر سکتا ہے؟
شعر، راگ جب تک سامع کے لیے وجد آفریں نہ ہو، یا موزونیت میں حرارت پیدا نہ کرے
تصویر اگر مسلمان و جاذب کشش نہ ہو، اس میں لطیف روح نہ جھلکتی ہو تو فنونِ لطیفہ
میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔ ہر شعر ایک مکمل راگ یا تصویر ہوتی ہے۔ جس طرح
تصویر میں مصور کو ہر عضو اپنی اپنی جگہ اور خوبی اور موزونیت کے ساتھ بنانے کی
ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعر کو بھی ہر لفظ اپنے اپنے مقام پر بغیر کسی تعقید
کے رکھنا پڑتا ہے۔ اس ترتیب کے قطع نظر تناسب اور توازن بھی ضروری اور
لازمی چیز ہے۔ اگر ناک کی جگہ ناک تو بنائی جائے مگر اصل صورت کے اعتبار سے بڑی
یا چھوٹی کر دی جائے تو تعداد و وضع کے اعتبار سے تصویر تو مکمل ہو گئی مگر مضحکہ خیز۔
اسی طرح منظوم کلام بھی اپنی بدنظمی اور غیر مناسب استعمالِ الفاظ اور دور از فہم
استعارات اور تلمیحات کی وجہ سے "شعر گفتن چہ ضرور بود" کا مصداق ہو جاتا ہے
نظم ہو یا نثر، تقریر ہو یا تحریر اس کا کچھ نہ کچھ اصل ہونا چاہیے۔ مرزا یا میر کا،
خود اپنے لیے یا غیر کے لیے۔ جس نظم و نثر میں اس امر کا لحاظ نہ ہو اور محض قافیہ پیمائی
اور خامہ فرسائی کی جائے، بازیچۂ اطفال ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعر کو لفظیات کی طرف
کم توجہ ہوتی ہے اور صنائع و بدائع ظاہری اور لفظی آرائش کے عوض سے اس کا
خیال ادبی مدارج میں ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنے کامل جذبات کے اظہار کے لیے بعض اوقات
قدیم قیود رسمی اور فرضی کو توڑ دینا پڑتا ہے۔"

"الہامات [illegible]" حصہ اول کے دیباچے میں خود اپنی شاعری کے متعلق رقم طراز ہیں کہ
"لطیف زبان اور لطافت شاعری سے مجھ کو دلچسپی نہیں ہے [illegible]

کی طرح میں نے اپنے مذاق میں کوئی تبدیلی نہیں کی' محض ضمیر کی اس آواز کو (جو مبدء فیاض کا فیضان خاص ہے) اپنی زبان اور سادہ لفظوں میں فرض کے طور پر ادا کر دیا ہے"۔

مذکورہ بالا تحریروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظریہ شعر اور تصور شاعری کے بارے میں حضرت امجد کا کیا معیار تھا۔ انہوں نے اس معیار سے اپنے کلام کو کبھی گرنے نہیں دیا اور ان کی شاعری کی ساحری نے دلدادگانِ شعر و ادب کو کلامِ امجد کا گرویدہ بنا دیا حقیقت نگاری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ محاسن لفظی' ندرتِ بیان اور طرزِ ادا کے بانکپن نے ان کی شاعری میں انفرادیت کی شان پیدا کر دی۔

امجد کا کلام پُر اثر ہونے کے علاوہ نہایت سلیس عام فہم اور وجد آفریں ہوتا ہے۔ اور لطف تو یہ ہے کہ لفظی اور معنوی خوبیاں بھی بدرجۂ اتم موجود رہتی ہیں۔ سادگی اور روانی کا یہ عالم کہ نظم نثر معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہات اور استعاروں کو بڑی چابکدستی اور سلیقہ سے اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ بے محل اور قوانین فطرت سے تجاوز نہیں ہونے پاتے اور نہ مذاقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں فلسفہ کی جھلک ہے تو کہیں تصوف کی چاشنی' کہیں درد و غم کا بیان ہے تو کہیں اخلاق و انسانیت کا درس۔ عام شاعروں کی طرح وہ صرف قافیہ پیمائی نہیں کرتے بلکہ ان کے ہر شعر میں اہلِ دنیا کے لیے ایک پیغام اور درسِ عمل ہوتا ہے۔ ان کے حسبِ ذیل قطعات اور رباعیوں میں اہلِ دانش و بینش کے لیے بہت کچھ ہے:

جہاں کو ناز ہے ہستی پہ اپنی — میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری — تنزل میں ترقی کر رہا ہوں

ہے اور یقینی ہے یہی سب کی صدا ہے — لیکن نہیں معلوم کہ وہ کون ہے کیا ہے
کیا کوئی کہے اس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے — ہاتھ آئے تو بُت' ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

کچھ عجب ہے یہ مادی دنیا   دور تک اس کا شعبدہ ہے
شمع پروانے کو جلاتی ہے   شمع کو بھی کوئی جلاتا ہے

—

یہ خورشید و قمر کیا دیکھتے ہو   فضائے بحر و بر کیا دیکھتے ہو
کسی کے حکم سے سب ہو رہا ہے   اُدھر دیکھو اِدھر کیا دیکھتے ہو

—

کیا جانئے وہ نور تھا یا سایہ تھا   شعلہ بن کر کسی نے دل میں بھڑکایا تھا
آیا کس وقت یہ تو معلوم نہیں   جاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں آیا تھا

—

چھپنے کا عجب ڈھنگ نکالا اس نے   کیا کام کیا یہ بالا بالا اس نے
اپنی بے پردگی چھپانے کے لئے   میری آنکھوں پہ پردہ ڈالا اس نے

—

عارض ہو کہ خط و خال میرا کب ہے   نقصان ہو یا کمال میرا کب ہے
مانا کہ مرا خیال ہی ہے سب کچھ   لیکن میرا خیال میرا کب ہے

—

حضرت امجد ایک خدا رس اور صاحب باطن صوفی تھے۔ سلوک و معرفت پر ان کی گہری نظر تھی۔ تصوف کے مشکل سے مشکل مسئلے کو چار مصرعوں میں اس طرح آسان بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہر آدمی کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث سے ہٹ کر انہوں نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ان کی ہر رباعی کسی نہ کسی آیت قرآنی کی تفسیر یا حدیث کی تشریح ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں:

ادعونی استجب لکم

ہر عصر کی عنایت تازہ ہے ۔۔۔ اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ ۔۔۔ یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

لا موجود الا اللہ

ہیں بہت سے شہود تو بھی میں بھی ۔۔۔ ہیں مدعیٔ نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں ۔۔۔ ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

تن کی ہستی کو چھوڑ نہ کر دوں تو سہی ۔۔۔ میدانِ ہوا کو ہو نہ کر دوں تو سہی
ملتا نہیں تو مجھ سے اگر خیر نہ مل ۔۔۔ میں بھی اس میں کو تو نہ کر دوں تو سہی

رباعیاتِ امجد انسانی زندگی کے حقائق کا مرقع ہیں۔ جس میں کی ہر تصویر زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ محفلِ عیش میں انسان خوش و خرم اور خود فراموش رہتا ہے لیکن جیسے ہی وہ محفل برخاست ہو جاتی ہے تو ردِ عمل کے طور پہ اس پہ افسردگی طاری ہو جاتی ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ دنیوی عیش و عشرت محض عارضی اور موقتی ہوتا ہے۔ اسی مضمون کو ایک رباعی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

ہر محفل سے بہ حال خستہ نکلا ۔۔۔ ہر بزم طرب سے دل شکستہ نکلا
منزل ہی نہیں یہاں مسافر کیلئے ۔۔۔ سمجھا تھا جسے مقام رستہ نکلا

تخلیقِ عالم کے موضوع پر اکثر شعراء نے طبع آزمائی کی ہے لیکن حضرت امجد نے اس کے اظہار کے لئے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ بالکل اچھوتا اور اپنی آپ نظیر ہے۔

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے ۔۔۔ کیا ذکرِ صفات ذات رکھ لی میں نے
عالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی ۔۔۔ سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں لیکن عام انسان کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا ۔ امجد باری تعالیٰ سے اس طرح استفسار کرتے ہیں :

دونوں یکجا مگر ملاقات نہیں ۔۔۔ تارے نکلے ہیں مگر رات نہیں
کیا اس کا سبب بھی تو نے سمجھا امجد ۔۔۔ میں ہوں تیرے ساتھ تو مرے ساتھ نہیں

اولوالعزمی اور بلند پروازی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے

اے قطرۂ آب پھیل دریا ہو جا ۔۔۔ اے طائرِ روح مرغِ سدرہ ہو جا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر ۔۔۔ اے تودۂ خاک اٹھ بگولا ہو جا

انسان کی قیدِ زندگی اور بے بسی کو جس خوبی سے ظاہر کیا گیا ہے وہ حضرت امجد ہی کا حصہ ہے

پابند کیا قید قفس میں رکھو ۔۔۔ بے بس کیا مجھ کو اپنے بس میں رکھو
صیاد کی صید پروری تو دیکھو ۔۔۔ گلزار دکھاتا ہے قفس میں رکھ

امجد جب کسی بات کو منوانا چاہتے ہیں تو ان کا حکیمانہ استدلال قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے ۔۔۔ بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آسان کر دی ۔۔۔ دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

انسان کی فطرت ہے کہ کسی واقعہ کے گذر جانے کے بعد وہ اس کے اسباب اور وجوہ پر سوچتا رہتا ہے اور اپنی فکروں میں اور اضافہ کر لیتا ہے۔ تیر جب کمان سے چھوٹ جاتا ہے تو پھر اسے واپس نہیں لایا جا سکتا ۔ اس لئے کہ گذری ہوئی باتوں پر سوچ بچار کرنا بے نتیجہ اور لاحاصل ہوتا ہے ۔ اسی مفہوم کو بڑی خوبی سے سمجھایا گیا ہے ۔

اسباب و علل کا ذکر کرتے رہیئے ۔۔۔ اپنا فطرت پہ جبر کرتے رہیئے
جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ٹل نہ سکا ۔۔۔ اب یوں ہوتا اس پہ غور کرتے رہیئے

انسان کی فطرت میں نمود و نمائش کی خواہش ہوتی ہے اور اس کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے جاتے ۔ ہر ایک بزعمِ خود اپنے کو سب سے زیادہ قابل اور کامل سمجھتا ہے ۔ اس

رباعی میں خود نمائی اور ہمہ دانی کے دعوے کو باطل قرار دیا ہے۔

گیسو میں ہے بل کہ میرے غم کو دیکھو　　رخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہار کمال میں ہر اک کامل ہے　　سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

ہر بڑے شاعر کا کلام ہر زمانے کے لئے ہوتا ہے۔ اس میں ایک ایسی آفاقی صداقت ہوتی ہے جو زمان و مکان کی قیود کی پابند نہیں ہوتی۔ حضرت امجد کا سارا کلام اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ مثال کے طور پر چند رباعیات ملاحظہ فرمائیں جن کی اہمیت اور افادیت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے:

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے　　مانند حباب ابھر کے اِتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس　　تنکا تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

کچھ وقت سے اک نیج شجر ہوتا ہے　　کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور تیرا ہر کام　　کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

نادانی سے پہلے تو خطا کرتے ہیں　　ہٹ کر کے پھر اور بھی برا کرتے ہیں
جب تم سے کوئی گنہ ہو تو توبہ کر لو　　میلے کپڑے کو دھو لیا کرتے ہیں

حضرت امجد کے کلام میں کہیں تصوف کا رنگ ہے تو کہیں فلسفے کی جھلک ہے۔ کہیں درد و غم کی داستان ہے تو کہیں پند و نصائح کا بیان۔ سارے عالم کا درد ان کا درد ہے اور ساری انسانیت ان کی نظر میں ایک اکائی ہے جس میں دوئی کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ حسب ذیل رباعیوں کے مطالعہ کے بعد حضرت امجد کی شاعری کا یہ رخ پوری طرح پیش نظر ہو جاتا ہے

بے خود میں رہوں تو وہ قریب آتا ہے　　پردے ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے تو میں نہیں رہتا ہوں　　میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

کھیتی مرے فلسفے کی پکتی ہی نہیں
تدبیر سے تقدیر چمکتی ہی نہیں
کھاتی ہے ہمیشہ منہ کی لیکن پھر بھی
یہ کیا وہ کیوں سے عقل تھکتی ہی نہیں

لب پر کس شخص کے دم سرد نہیں
کس کا چہرہ ہے آج جو زرد نہیں
ہر شخص ہے درد مند فرداً فرداً
لیکن کوئی کسی کا ہمدرد نہیں

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تمجید یہ ہے
مخلوقِ خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے

حضرت امجد کی جس رباعی پر بھی نظر پڑتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے بھی یہاں نقل کروں۔ لیکن وقت کی تنگی کا خیال کرکے، اور تین چار رباعیوں کے بعد ان کی دوسری اصناف پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے گی۔ وہ خود ایک مذہبی بزرگ، صوفی صافی اور باخدا تھے۔ لیکن کبھی انہوں نے اپنے ملنے والوں یا معتقدین پر اپنی بزرگی اور شخصیت کا رعب نہیں جمایا۔ خودنمائی اور برتری جتانے کو وہ بہت برا سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک رباعی میں شیخ خودنما کی اس طرح قلعی کھولی ہے۔

کس شان سے شیخ خودنما بیٹھا ہے
ہر چم کوئی سمجھے کہ خدا بیٹھا ہے
صورت میں ہے بایزید سیرت میں یزید
چمڑے پہ ہرن کے بھیڑیا بیٹھا ہے

اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی اور خطا بخشی پر ایک رباعی اور ایک قطعہ میں ایسے مضامین بند کردئے ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد وجد کی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ یوں تو ان کا سارا کلام وجد آفریں ہوتا ہے لیکن ان کے پڑھنے کے بعد یہ احساس اور شدید ہوجاتا ہے کہ امجد کی زبان سے بولنے والا کوئی اور ہے۔ خود حضرت امجد مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے سے کبھی نہیں کہتا بلکہ ایک قوت مجھ سے شعر کہلواتی ہے۔ جس طرح مجھے بتایا جاتا ہے میں من وعن

بیان کردیتا ہوں۔ اس میں میرا کیا کمال ہے۔ میں تو صرف پیام رسانی کا فرض پورا کرتا ہوں
اس رباعی اور قطعہ کے پڑھنے کے بعد آپ پر حضرت امجد کے بیان کی صداقت واضح ہوجائیگی۔

جب شانِ کریمی پہ اتر آتے ہیں　　اپنا رستہ خود آپ بتلاتے ہیں
ان سے ملنے کی جب دعا کرتا ہوں　　آمین آمین خود بھی فرماتے ہیں

میں نے ایک روز ڈرتے ڈرتے پوچھا　　اے خالقِ دوجہاں اے عرش پناہ
کیا میرے گناہ بخش دئے جائیں گے　　اللہ نے فرمایا کہ انشاء اللہ

کراچی آنے سے چند دن پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ دورانِ گفتگو میں مجھ سے فرمایا کہ یہ رباعی غور سے سنو اور جتنا زیادہ غور و فکر کروگے اس کے معنی و مطلب تم پر واضح ہوتے جائیں گے۔ حضرت امجد نے جب یہ رباعی پڑھی تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہورہی تھی۔ ہر مصرعے کو دو دو تین تین بار پڑھتے جاتے تھے اور اپنے خاص انداز میں اس کے معنی کی طرف اشارے بھی کرتے جاتے تھے۔ آج بھی جب میں یہ رباعی پڑھتا ہوں تو وہی سماں میرے پیشِ نظر ہوتا ہے:

یہ فکر کسی دماغ سے نکلی ہے　　یہ مئے بھی کسی ایاغ سے نکلی ہے
تو نور ہی نور میں سراپا ظلمت　　کالک بھی مگر چراغ سے نکلی ہے

اب آخر میں ایک ایسی رباعی پیش کرتا ہوں جس کا غالباً بہت کم اصحاب کو علم ہوگا۔ مجھ سے فرمایا کہ حال ہی میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (گلبرگہ شریف حیدرآباد دکن) کی درگاہ میں حاضری دی تھی۔ اس وقت ہاتف غیبی نے یہ رباعی میری زبان سے کہلوائی۔

مقبول خدائے کائنات است امجد　　مشہور تمام شش جہات است امجد
ہر جا کہ روم بہ ہر کسے می شنوم　　شاہنشاہِ رباعیات است امجد

رباعیات امجد تین حصوں پر مشتمل ہے۔ رباعیِ امجد اول و دوم میں نظمیں اور قطعات بھی شامل کئے گئے ہیں۔

نذرِ امجد ایک طویل مسدس ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور مدینے میں تشریف آوری کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ خرقۂ امجد (مسمّی بہ ...) میں ۳۰ نظمیں رباعی کی بحر میں لکھی ہیں۔ یہ ساری کتابیں کئی بار شائع ہو چکی ہیں۔ چند نظموں اور غزلوں کے اقتباسات بطورِ نمونہ پیش کئے جاتے ہیں جن سے حضرت امجد کی قادر الکلامی اور ہمہ گیری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

گزار دے۔

راہِ خدا میں زندگی مستعار دے ۔ چھننے سے پہلے جامۂ ہستی اتار دے
بہرِ رفاہِ خستہ دلاں اشتہار دے ۔ غم دیدہ دل کے کان میں امجد پکار دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

خطاب پروانے سے۔

او کشتۂ محبت غم سے نہ ڈرنے والے ۔ او ننھے کیڑے سر کی پروا نہ کرنے والے
او شمع محفلِ غم جل جل کے مرنے والے ۔ او جان دینے والے جی سے گزرنے والے
شیدا میں نور کی ہوں تو نار پر فدا ہے
منزل تو ایک ہی ہے رستہ جدا جدا ہے

صدائے درویش۔

دوری سے تری تھک کر جی اپنا نہ ہاروں گا
افلاک کی چوٹی سے تاروں کو اتاروں گا
بگڑی ہوئی قسمت کو رو رو کے سنواروں گا
سو مرتبہ چیخوں گا سو بار پکاروں گا
دے اے مرے مولا دے دے اے مرے مولا دے

جوابِ مولا

خوش ہوتے ہیں ہم تیری صدا سے ۔ ہاں پھر صدا دے دل کش ادا سے
کیوں رو رہا ہے اپنے خدا سے ۔ آ آ آ آ پھر مانگ پھر مانگ

انتخابِ غزل

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا ۔۔۔ کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں ۔۔۔ وہ تماشا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے ۔۔۔ جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

کچھ طلب کرنا کسی سے آبرو کی موت ہے
آرزو کا پورا ہونا آرزو کی موت ہے
وہ اگر ملتے نہیں اس میں بھی ہے کچھ مصلحت
ان کے ملنے میں ہماری جستجو کی موت ہے
دیکھئے کب آئے کس جا آئے کس پردے میں آئے
خستہ جاں امجدؔ کی ایک مدت سے بھی کی موت ہے

جینا اگر ہے تجھ کو تو فرزانہ بن کے جی ۔۔۔ فرزانگی یہی ہے کہ دیوانہ بن کے جی
سُن ان کی نغمہ سازیاں بہرا نہ بن کے جی ۔۔۔ دیکھ ان کی حسن کاریاں اندھا نہ بن کے جی

جب مسندِ فقر پہ بیٹھ گئے شاہی کی تمنا کون کرے
جب مالک کو نین اپنا ہو، کونین کی پروا کون کرے
معبود اگر مشہود نہیں پھر طاعت میں کچھ سود نہیں
مسجود کی جب تک دید نہ ہو موہوم کو سجدہ کون کرے

حضرت ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ طرز ادیب بھی تھے اور انشاء پرداز بھی۔ جمالِ امجد، حجِ امجد، حکایاتِ امجد، پیامِ امجد، گلستانِ امجد، میاں بیوی کی کہانی

امجد کی زبانی' اور ایوب کی کہانی ان کی نثر کے لافانی شاہکار ہیں ۔ ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ نثر نگاری پر بھی انھیں حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملوں، آسان زبان اور دلکش پیرایۂ بیان میں اخلاق و نصیحت رموز و معرفت اور واقعات زندگی کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ کتاب ختم ہوئے بغیر ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ جمالِ امجد خود ان کی سرگذشت ہے ۔ جس میں ان کی لائق و فاضل اور عارف و کامل شریکِ حیات جمال سلمیٰ مرحومہ کے ساتھ تصوف و معرفت کے مسائل پر بحث و مباحثے اور مکالمے درج ہیں ۔ گلستانِ امجد حضرت شیخ سعدیؒ کی گلستان کا آسان اور سلیس زبان میں بامحاورہ ترجمہ ہے ۔ یہ ترجمہ، ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اصل تصنیف کا گمان ہوتا ہے اور کامیاب ترجمے کی یہی شان یہی ہے ۔ میرے خیال میں گلستانِ سعدی کا اس سے بہتر ترجمہ آج تک کسی نے نہیں کیا ۔ حج امجد میں جمال سلمیٰ کے ساتھ حج کے سفر کی داستان بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کی گئی ہے ۔ حکایاتِ امجد میں روزمرہ زندگی کے واقعات سے نصیحت خیز اور عبرت انگیز نتائج کو ایک جگہ قلم بند کر دیا گیا ہے ۔ پیامِ امجد کا موضوع قرآن و حدیث کے اہم اور مشکل مسائل کی تفسیر و تشریح ہے ۔ یہ کتاب ہمارے ملک کے نامور سائنس داں ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کے باربار اصرار پر لکھی گئی تھی ۔ "میاں بیوی کی کہانی" میں بیوی نے اپنی ہی مثال قائم کر کے اپنے شوہر کو سبقِ عبدیت یاد دلایا ہے ۔ ایوب کی کہانی ایک مختصر رسالہ ہے جس میں انجیل مقدس کے ایک قصے کو جس میں حضرت ایوب کا ذکر ہے ۔ اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے :

نثر کا نمونہ

"ہمارے باغِ راحت کی چہکتی ہوئی بلبل ہزار داستان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ۔ اس کی روح دنیوی آلائشوں سے پاک ہو کر وسیع کائنات کی ہم وسعت ہو گئی ہے ۔ وہ تیرہ خاک دان سے نکل کر ایک روشن اور پرنور ستارہ بن گئی جس کے گرد اختر نور کے لئے پیارے چکر لگاتے ہیں ۔ چہیتی روح میری جان' میری ملکی صفات ملکہ میری خدا والی سلمیٰ گئی اپنے خدا کے پاس گئی ۔"

(ماخوذ از سب رس امجد نمبر ۱۹۶۲ء)

خواجہ حمید الدین شاہد

تاثرات نظم "اوٹی"

محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر کی اس لاثانی نظم کے متعلق میں اپنے تاثرات لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ حسن اتفاق سے یہ نظم اس وقت کہی گئی جب کہ میں بھی محترمہ موصوفہ اور ان کے شعر نواز اور مخلص شوہر جناب مرزا ضامن علی صاحب غازی کا ہم سفر تھا۔ ایک عرصہ پہلے ہم لوگوں میں یہ طے ہو چکا تھا کہ بنگلور اور "اوٹی" کا سفر ملکر کریں گے۔ چنانچہ ۱۱ رمئی کو چار آدمیوں کا مختصر سا قافلہ (محترمہ بشیر صاحبہ۔ غازی صاحب اور ان کے جواں سال بھتیجے مرزا دوست علی صاحب اشرف بی ایس سی (عثمانیہ) اور راقم الحروف) بنگلور روانہ ہوا۔ ریل کا سفر اور بنگلور میں قیام کا زمانہ بڑا پر لطف رہا۔ بنگلور سے میسور وہاں سے اوٹی تک موٹر کا سفر رہا" جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس سفر میں ہمارے میزبان مسٹر ولی اللہ ایڈوکیٹ بھی ساتھ تھے۔ جوں ہی ہماری موٹر اوٹی کی پہاڑیوں کی بلندیوں پر چڑھتی گئی محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ کی پرواز تخیل نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ قدرت کے دلفریب مناظر اور فطرت کی رنگا رنگی نے ان پر جذب و کیف کی حالت طاری کر دی ہے۔ اوٹی پہنچنے کے بعد اس کے شاعر نواز ماحول نے جادو کا سا اثر کیا اور ساز شاعری کے تاروں میں ارتعاش پیدا ہوا میں نے موصوفہ سے اوٹی پر نظم کہنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی محترمہ بشیر صاحبہ نے اس نظم کے پہلے تین شعر سنائے" اور میں ان اشعار کی رنگینیوں اور ترنم میں کھو سا گیا۔ اس کے بعد وہ خاموش رہیں اور مجھے بھی ہمت نہ ہوئی کہ اور اشعار کی فرمائش کروں۔ تیسرے روز جب ہم اوٹی سے واپس ہو رہے تھے تو معاً مجھے وہ اشعار یاد آ گئے۔ اور اپنے آپ گنگنانے لگا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم اب واپس ہو رہے ہیں اور اوٹی کے دلفریب مناظر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر آپ اس نظم کو مکمل فرما دیں تو بڑا ہی اچھا ہوگا۔ محترمہ مسکرائیں اور پھر ایک کیف سا طاری ہونے لگا۔ چند منٹ کے بعد ارشاد ہوا کہ میں شعر کہتی جاؤنگی اور آپ انہیں یاد رکھنا میں نے اثبات میں جواب دیا پھر کیا تھا چند منٹ کے

کے وقفہ سے ایک ایک شعر الہام بن کر موزوں ہونے لگا۔ جوں ہی وہ شعر فرماتیں میں دو یا تین دفعہ سے دوہرا کر یاد کر لیتا۔ اس طرح کئی شعر موزوں ہو گئے۔ اوٹی کی پہاڑیوں سے آبشاروں کے گرنے کا منظر عجیب دلفریب تھا۔ میں نے کہا کہ آبشار کو آپ نے تشنہ کلام رکھا۔ چند منٹ کے بعد اس کے جواب میں یہ شعر ارشاد ہوا

شفاف آبشار سمندر کے ہیں سفیر
ہیں جنکے انتظار میں پھولوں کی وادیاں

غرض اوٹی کی سرحد ختم ہونے سے پہلے پہلے یہ نظم مکمل ہو گئی اور میرے حافظہ میں محفوظ رہی۔ بنگلور پہنچنے کے بعد میں نے ان اشعار کو زیب قرطاس کیا اور اب محترمہ موصوفہ کی اجازت سے "سب رس" میں شائع کر رہا ہوں۔ یہ نظم اوٹی کے مختلف جمالیاتی پہلوؤں کا ایک حسین مرقع ہے۔ جمالیاتی ذوق رکھنے والے اصحاب اس شہ کار کے مطالعہ سے یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔

(سب رس بشیر نمبر جولائی ۷۲ء سے ماخوذ)

- اوٹی -

سرگوشیوں میں غرق ہیں کہسار و آسماں
رنگینیوں میں ڈوبے ہیں فطرت کے رازداں

بستی ہے بادلوں کی ترنم کا دیس ہے
اس سرزمیں پہ ہوتا ہے فردوس کا گماں

ہیں جا بجا کرشمۂ قدرت کے شاہکار
رہ رہ کے جگمگاتے ہیں انوارِ لامکاں

رقصاں ہے مرغزاروں کے حسن سکوت پر
کہسار کی جبینوں سے اٹھتا ہوا دھواں

شفاف آبشار سمندر کے ہیں سفیر
ہیں جن کے انتظار میں پھولوں کی وادیاں

ہے کارگاہ ابر گہر بار، یہ دیار
شاہراہوں کے یاں سے گذرتے ہیں کارواں

سرشار ذرہ ذرہ ہے کیفیات سے
ہر جنبش نظر ہے تاثر کی داستاں

چھوتی نہیں ہیں روئے زمیں کی بلندیاں
یاں زندگی بدلتی ہے رخ سوئے آسماں

لاریب! یہ مقام وطن ہے بہار کا!
جس کی خنک فضاؤں میں ہے سوز جاوداں!

خواجہ حمیدالدین شاہد

میرے اساتذہ

یہ داستانِ دلستاں جو جامعہ عثمانیہ سے سینکڑوں میل دور رہ کر لکھ رہا ہوں اس وقت کی ہے جب آتش جواں تھا۔ ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد کی قدیم درسگاہ دارالعلوم ہائی اسکول سے امتحان میٹرک بدرجۂ اول کامیاب کرنے کے بعد عثمانیہ کالج میں انٹرمیڈیٹ کے سالِ اول میں داخلہ لیا۔ میٹرک میں میرے اختیاری مضامین ابتدائی ریاضی اور فارسی تھے چونکہ میں ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اس لئے انٹر سائنس میں اختیاری مضمون حیاتیات کے ساتھ داخلہ لینے کیلئے درخواست کی خانہ پری کرکے کالج کے دفتر میں داخل کردی نوٹس بورڈ پر داخلہ ملنے والے طلبہ کی فہرست شائع ہوئی تھی تو اس میں میرا نام شعبۂ حیاتیات کی بجائے شعبہ اردو فارسی میں درج تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ گذشتہ سال تک ایسے طلبہ کو بھی شعبہ حیاتیات میں داخلہ دیا جاتا رہا جن کے مضامین اعلیٰ ریاضی اور سائنس نہیں تھے۔ میں نے کالج کے پرنسپل مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب سے مل کر اپنی خواہش کا اعادہ کیا اور اپنے مستقبل کے تاریک ہو جانے کا اندیشہ ظاہر کیا تو انھوں نے شعبہ حیاتیات میں مجھے داخلہ دینے سے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کردیا کہ اگر تم اردو فارسی نہ پڑھوگے تو پھر کون پڑھے گا۔ ان دونوں مضامین میں تم نے زیادہ نمبر حاصل کئے ہیں۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ ریاضی میں بھی میں نے ۹۵ فیصد نمبر لئے ہیں تو فرمایا کہ تم نے سائنس نہیں پڑھی ہے اس لئے داخلہ ممکن نہیں۔ اگر تم جیسے لڑکوں کو سائنس میں داخلہ دینا شروع کردوں تو کیا اردو اور فارسی کے شعبے بند کردوں۔ میں نے کہا گذشتہ سال تک تو آپ نے داخلہ دیا تھا اس سال ایسا طرزِ عمل کیوں کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے ذرا ترش رو ہو کر فرمایا کہ اس سال سے پالیسی تبدیل ہوگئی ہے تم کو داخلہ نہیں مل سکتا۔ میں نے کچھ دن تک اردو فارسی اور معاشیات کی جماعتوں میں شرکت نہیں کی اور شعبہ حیاتیات میں شرکت لینے کیلئے صدر شعبۂ حیاتیات پروفیسر سعیدالدین صاحب سے ملتا رہا لیکن مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر بادل ناخواستہ شعبۂ فنون میں شریک ہونا پڑا۔

اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت جتنے کالج تھے وہ سب شہر کی مختلف کرایے کی عمارتوں میں تھے۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں وسط شہر حیدرآباد کے محلہ توپ کا سانچہ اور اس کے گرد و نواح میں

تھیں۔ لیاقت منزل اس کالج کی مرکزی عمارت تھی جس میں کالج کا دفتر بھی تھا اور پرنسپل عبدالرحمن خاں کا
اجلاس بھی یہیں تھا۔ انٹرمیڈیٹ کی انگریزی، معاشیات، عمرانیات اور فلسفہ کی تعلیم کا اسی عمارت میں
انتظام تھا۔ فزیکل انسٹرکٹر اسد علی صاحب اور یونیورسٹی کے ڈاکٹر لطیف سعید صاحب کے کمرے بھی اسی
عمارت میں واقع تھے۔ شعبہ تاریخ جس عمارت میں تھا اس کا نام قانون منزل تھا۔ ایک اور عمارت تھی
جس میں شعبۂ دینیات قائم تھا اس میں حدیث، فقہ، تفسیر غرض جملہ اسلامی علوم کے علاوہ دینیات
کی تعلیم بھی ہوتی تھی اس عمارت کا نام دینیات منزل تھا۔ پہلی منزل میں اردو، فارسی، عربی، ہندی
مرہٹی اور کنڑی وغیرہ کے کلاس ہوتی تھیں۔ معاشیات، تاریخ، عمرانیات، فلسفہ اور انگریزی کے لکچر
صبح سے دوپہر تک ہوتے تھے۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب (خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے) اصول
معاشیات پڑھاتے تھے۔ اور یہ زمانہ ان کے عالم شباب کا تھا۔ اپنے مضمون سے ہٹ کر کوئی بات
نہیں کرتے تھے اصولِ معاشیات پر ان کے لکچر معلومات سے پُر ہوتے تھے۔ اور طلبہ ان کو نوٹ کرتے
جاتے تھے۔ پروفیسر الیاس برنی مرحوم معاشیات ہند کا درس دیتے تھے وہ بڑے اچھے مقرر اور
خوش گو بھی تھے جب وہ بولنے پر آتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ معلومات کا خزانہ لٹا رہے ہیں۔ بڑے
لمبے چوڑے سفید اور تنومند تھے ہمیشہ شیروانی۔ سفید پتلون اور بغیر استری کی ترکی ٹوپی میں ملبوس رہتے
ان کی خشخشی داڑھی تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور مذہب و تصوف سے گہرا شغف تھا۔ اسٹر
یک کار خود چلاتے تھے۔ اس زمانے میں یہ موٹر کار بہت قیمتی تھی۔ ان کے سوائے کسی اور کے پاس
بیش قیمت کار نہیں تھی۔ سنا تھا کہ جب والیٔ ہند حیدرآباد آیا تھا تو حکومت حیدرآباد نے
اسٹاف کیلئے ایسی کئی موٹریں باہر سے منگوائی تھیں جو بعد کو محکمہ عامہ کے قبضے میں دے دی
گئی تھیں چونکہ نواب مہدی یار جنگ کو پروفیسر الیاس برنی صاحب سے خاص عقیدت تھی اس لئے
موٹر کار کم قیمت پر ان کو مل گئی۔

پروفیسر حسین علی خاں مرحوم صدر شعبۂ انگریزی تھے شکل و صورت اور لباس سے انگریز معلوم
ہوتے تھے۔ ہمیشہ سلک کا سوٹ اور فلٹ ہیٹ پہنتے تھے ہمیشہ رولس رائس میں کالج آتے تھے
ان کو مرتے دم تک اسی موٹر کو چلاتے ہوئے دیکھا ہے ان کی بیگم (معصومہ بیگم) جو بعد میں
وزیر ہو گئی تھیں اور بچوں کیلئے علحدہ ایک موٹر کار تھی۔ اس کے شوفر بڑے مقطع ہوتے تھے۔

پبلک پولو کے نکڑ پر کھڑا رہتا تھا ۔ وہ موٹر روک کر مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتے اور اردو میں باتیں کرتے تھے ۔ ایک دن کہنے لگے کہ یہ موٹر کافی پرانی ہو گئی ہے بس اب تو توکلت علی اللہ پر چل رہی ہے ۔
کلاس میں گھنٹی بجنے کے دو منٹ بعد آجاتے ۔ کیا مجال کہ ان کے آنے کے بعد کوئی کلاس میں داخل ہونے کا ہمت کرے ۔ اصول کی سختی سے پابندی کرتے تھے ۔ کلاس میں انگریزی میں گفتگو کریں گے اور کلاس سے باہر اردو میں ۔ میں نے ان کو کلاس میں اردو اور باہر انگریزی بولتے کبھی نہیں سنا ۔ اسی طرح جب یونیورسٹی آتے تو ہمیشہ سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے اور خانگی محفلوں میں جب شرکت کرتے تو شیروانی، پاجامہ اور ترکی ٹوپی میں ملبوس ہوتے ۔ اچھے کھانے کے بڑے شوقین اور نفاست پسند واقع ہوئے تھے ۔ وضعداری اور شائستگی میں وہ اپنی آپ مثال تھے ۔ اگر وہ چاہتے تو وہ وائس چانسلر بن جاتے لیکن ان کو ہمیشہ درس و تدریس سے شغف رہا ۔ ملازمت کے آخری دو سال مجبوراً ان کو پرو ووسٹ کا عہدہ قبول کرنا پڑا ۔ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہو گئے تھے ۔ اپنے شاگردوں کی فلاح و بہبود کیلئے ممکنہ مدد سے دریغ نہ فرماتے تھے چنانچہ مجھے انہوں نے دو سال تک پبلک سروس کمیشن کے اردو انگریزی ترجمے کے امتحان کا ممتحن بنایا تھا ۔ ان کے خانگی کتب خانے میں انگریزی ادب کی بے شمار کتابیں تو تھیں ہی لیکن اردو اور فارسی کی نایاب کتب جمع کرنے کا بھی شوق تھا ۔

ہم کو انٹرمیڈیٹ NON DETAILED پڑھاتے تھے ۔ ان کا انگریزی لب و لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی انگریز بول رہا ہے ۔ بی اے میں گولڈن ٹریژری کی منتخب نظمیں پڑھاتے ۔ پڑھاتے وقت ان کے سامنے ایک طرف کتاب ہوتی اور دوسری طرف ایک نوٹ بک جس میں ان کے اپنے لکھے ہوئے نوٹ تھے ۔ کلاس میں ایک منٹ ضائع کئے بغیر بس لکچر دیتے تھے ۔ گھنٹہ بجتے ہی کتاب بند کی اور سر پر ہیٹ رکھ یا وقار انداز میں کلاس سے باہر نکل کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ۔

انگریزی کے ایک لکچرار مسٹر رامچندرن تھے جو انٹرمیڈیٹ میں POETRY پڑھاتے تھے ۔ مدراسی لب و لہجہ میں لکچر دیتے تھے ایک نظم MICHAEL پڑھاتے وقت خاص انداز میں MICHAEL کہتے ۔ طلبہ نے ان کا نام MICHAIL رکھ دیا ۔ سکندرآباد سے بس میں کالج آتے تھے ۔
جب رامچندرن صاحب کا انتقال ہوا تو کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے انکی میت میں شریک ہو کر اہل خاندان سے تعزیت کی تھی ۔ ہندو مسلم کا امتیاز اس دور کی ذہنیت کو چھو کر بھی نہیں گیا تھا ۔

ڈاکٹر عبداللطیف مرحوم انٹرمیڈیٹ میں ترجمہ اور بی اے میں DETAILED پڑھاتے تھے۔ ہمیشہ سفید شروانی، تنگ مہری کے پاجامے میں ملبوس اور ترکی ٹوپی اوڑھے ہوتے۔ میں نے صرف بعض تقریبوں میں ان کو سوٹ پہنے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے رعب قابلیت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی بطور مزاح بعض طلبہ کو خاص خاص ناموں سے پکارتے تھے۔ میرے ایک ساتھی کو جو بعد میں کٹرا کے لکچرار ہو گئے تھے، پٹواری کہتے تھے۔ کسی کو جنٹلمین کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔

پروفیسر صلاح الدین (خدا ان کو تادیر سلامت رکھے) صاحب تھے تو فلسفے کے استاد لیکن ہمیں بی اے کی کلاس میں ترجمہ کرایا کرتے تھے۔ بڑے منکسر المزاج اور خاموش فطرت کے مالک تھے۔ طلبہ ان کے گھنٹے میں آوازیں نکال کر ان کو تنگ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی خاموشی اور شرافت سے ہار مان کر چپ ہو جاتے۔ بعد میں پروفیسر صلاح الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ ہو کر سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر ویرا بھدرڈو بی اے کلاس میں شکسپیر کا ڈراما پڑھاتے تھے۔ بڑے منحنی اور پست قد، مونچھ داڑھی بالکل صاف، سر پر مدراسی بند دلی کا صافہ، بند کالر کا کوٹ اور پتلون پہنتے تھے۔ جسمانی اعتبار سے بارعب نہ تھے لیکن انکی قابلیت کا سکہ نہ صرف طلبہ بلکہ سب پر جما ہوا تھا۔ سبکدوشی کے بعد یہ بھی پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہو گئے تھے۔ CTROEN موٹر میں سکندرآباد سے کالج آتے تھے جسے شوفر چلاتا تھا۔

امتحان کے جوابی بیاضات جانچنے کے بعد طلبہ کو نصیحت کرتے تھے کہ SPELLING کی MISTAKES نہ کی جائیں۔ مثال کے طور پر فرماتے تھے کہ SHAKESPEARE کو اکثر طلبہ غلط لکھتے ہیں کوئی بغیر E کے کوئی IARE سے وغیرہ۔ ایک طالب علم نے کہا کہ SIR, VIRA BHADRODO'S SPELLING IS MORE DIFFICULT THAN SHAKESPEARE - ساری کلاس ہنسی اور قہقہوں سے گونج اٹھی - ویرا بھدرڈو صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے ہاتھ اور زبان کو دانتوں کے درمیان داب کر خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ہاتھ جوڑ کر (جو ان کی عادت تھی) فرمانے لگے۔

NO, EXAMINER WILL ASK YOU TO WRITE AN ESSAY OR A PAGE EVEN SINGLE SENTENCE ON POOR VIRA BHADRODU.

ان کے اس برجستہ جواب پر ساری کلاس ہنس پڑی اور اپنے استاد کی استادانہ قابلیت کے قائل ہو گئے۔ شعبہ اردو کے اساتذہ میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر سید سجاد، پروفیسر عبدالقادر سروری تھے۔ مولوی عبدالحق صدر شعبۂ اردو تھے۔ ابتدائی ہندی سالِ اول میں پروفیسر دھنیشورا اور سالِ دوم اور سالِ سوم میں پروفیسر ہری شاستری پڑھاتے تھے ایم اے کی کلاس میں ہندی پنڈت ونشی دھر ودیا النکار پڑھاتے تھے۔ اب یہ سب حضرات اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مولوی عبدالحق غالباً ہفتے میں چار دن تشریف لاتے تھے۔ بی اے اور ایم اے کے طلبہ کو درس دیتے تھے مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ انجمن ترقی اردو کو حیدرآباد سے دہلی منتقل کر کے وہیں مقیم ہو گئے اور جامعہ عثمانیہ سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ جب میں انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں شریک ہوا تو اس وقت ڈاکٹر سید سجاد پی ایچ ڈی کرنے کیلئے لندن گئے ہوئے تھے۔ جب میں سالِ دوم میں تھا تو وہ ڈگری لے کر واپس آ گئے تھے۔ چونکہ ان کی بیگم کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے ایک جرمن خاتون سے بیاہ کر کے اپنے ساتھ لائے تھے اس خاتون کے ساتھ ان کی بڑی بہن بھی آئی تھیں۔ یہ دونوں بہنیں ایک ساتھ رہتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی موٹر میں ان دونوں کو ساتھ لے کر باہر نکلتے تھے۔ انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کی جماعتوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کے ذمے نثر کی کتابیں تھیں۔ ڈاکٹر زور صاحب اور سروری صاحب کے استاد رہ چکے تھے۔ عمر ۵۰ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ کلین شیو، کبھی سوٹ اور کبھی شیروانی پہنتے تھے کلاس میں پان کی ڈبیہ ساتھ رہتی تھی۔ بڑے متین اور سنجیدہ انسان تھے۔ بہت کم بات کرتے تھے جو کتابیں ان کے ذمے تھیں ان پر لکچر دیتے تھے ان کے درس تنقیدی انداز لئے ہوتے تھے۔

پروفیسر سروری صاحب میرے والد کے دوست تھے جب میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ ایک بار وہ ہمارے گھر تشریف لائے تھے اس لئے وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ پروفیسر سروری صاحب نے ڈاکٹر زور صاحب سے یہ کہہ کر مجھے ملایا کہ یہ میرے دوست خواجہ شجاع الدین صاحب کے لڑکے ہیں انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم اے تک پروفیسر سروری صاحب نے نظم کی کتابیں پڑھائیں۔ اس کے ساتھ علم عروض پر بھی لکچر دیتے تھے۔ جدید اردو شاعری اور افسانے پر ان کی گہری نظر تھی۔ کبھی سوٹ اور کبھی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ ان کی سواری موٹر سیکل تھی۔ جب یونیورسٹی اڈیکمیٹ منتقل ہوئی تو آسٹن کار خرید لی تھی۔ موٹر خریدتے وقت مجھے اپنے ساتھ سکندرآباد لے گئے تھے جہاں سے یہ موٹر خریدی گئی تھی۔ مجھے اکثر اس موٹر میں ان کے ساتھ یونیورسٹی جانے آنے کے مواقع ملتے رہتے تھے

مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور میں اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ اپنے خانگی کاموں میں مجھ سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو میں بھی ان کے ساتھ کئی سال تک میں نے کام کیا ہے وہ شعبہ اردو امتحانات کے معتمد تھے اور میں نائب معتمد تھا۔ برسوں ہم دونوں نے یہ کام انجام دیا اور ہزاروں ناخواندہ لوگوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔ ہر سال امتحان میں سینکڑوں طلبہ، طالبات اور خواتین شریک ہوتے تھے اور ان امتحانات کے مرکز شہر حیدرآباد کے علاوہ اضلاع، دیہات اور بیرون حیدرآباد مثلاً بمبئی، برار اور میسور میں بھی قائم ہوتے تھے۔ پروفیسر سروری صاحب غالباً ۱۹۴۸ء میں میسور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو ہو گئے کئی سال تک وہاں رہے پھر ڈاکٹر زور صاحب اور ڈاکٹر سجاد صاحب کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں کئی سال تک شعبۂ اردو کی صدارت کے فرائض انجام دے کر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر زور صاحب کی وفات کے بعد کشمیر یونیورسٹی سرینگر میں صدر شعبہ اردو بنائے گئے اور مارچ ۱۹۷۱ء میں سرینگر میں وفات پائی۔ عمر بھر ڈاکٹر زور صاحب کے رفیقِ کار رہے اور مرنے کے بعد بھی ڈاکٹر زور کے ساتھ سرینگر میں پیوند خاک ہوئے۔ رفاقت کی ایسی مثال بہت کم ملے گی۔

ڈاکٹر زور صاحب انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم اے تک تاریخ ادب اردو، تنقید، لسانیات اور دکنی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ درس کیا دیتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طلبہ کے ذہنوں کے گوشے علم ادب کی روشنی سے منور ہو گئے ہیں۔ اپنے ہر طالب علم کو لکھنے کی ترغیب دیتے اور جس میں جو صلاحیت دیکھتے اس کو اس کام کے کرنے کا مشورہ دیتے، شوق دلاتے اور اس سے مضمون لکھاتے انہوں نے اپنے کتنے طالب علموں کو مصنف بنا دیا جنھوں نے بعد میں دنیائے ادب میں نام پیدا کیا۔ مثلاً مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، صاحبزادہ محمد علی خاں میکش، میر حسن، محمد عمر مہاجر، سعادت علی رضوی، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر حفیظ قتیل، جہاں بانو، تسنیم محمود یزدانی، لطیف النساء بیگم، اکبر الدین صدیقی، رشید قریشی، یوسف ناظم، محمد علی منیر، علی حسین زیبا، ملیر پرشاد منگر اور بہت سے۔

ڈاکٹر زور صاحب خوش رو اور جامہ زیب تھے۔ ہر قسم کا لباس ان پر کھلتا تھا۔ یورپ سے آنے پر اکثر سوٹ پہنتے تھے پھر کھدر کی شیروانی اور ٹوپی کو اپنا لیا تھا۔ چائے اور پان کے رسیا تھے خودداری اور عزتِ نفس کا ان کو بڑا خیال رہتا تھا۔ بہت جلد غصہ آجاتا تھا پھر فوراً ہی ٹھنڈے ہو کر ہنسی دل لگی کی باتیں کرنے لگتے۔ ڈاکٹر زور صاحب کی طبیعت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اپنے کام

میں مخلصوں سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔ ان پر تنقید کی جائے تو ٹھنڈے دل سے سن لیتے تھے و
بہت کام کرتے تھے اور دوسروں سے کام لینا بھی خوب جانتے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ
ان کے ساتھ دس سال تک رات دن یکجا رہے اور ادارۂ ادبیات اردو سے مختلف اعلیٰ اور اہ
کام کرنے کے مواقع ملے۔ ان ہی کی رہنمائی میں ۲۲ سال تک میں نے رسالہ سب رس کی ادارت
ادارۂ ادبیات اردو کے مہتمم کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیئے۔ ڈاکٹر زور صاحب کچھ مدت کیلئے
شعبہ اردو رہے پھر دارالعلوم کالج اور چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی سے ۱۹۶۱ء میں سبکدوش ہو
چند دن بھی آرام نہ کرنے پائے تھے کہ کشمیر یونیورسٹی سرینگر میں صدر شعبۂ اردو کی ذمہ داری سنبھالی
موت نے وہاں ان کو زیادہ کام کرنے کی مہلت نہ دی اور ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو اچانک حرکت قلب
بند ہو جانے سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد بزرگوار کا شاندار مزار
اور گنبد حیدرآباد میں تعمیر کروایا تھا اور خود بھی ان کے پائیں دفن ہونا چاہتے تھے لیکن قدر
ان کو سرزمین کشمیر میں پیوند خاک کرنا چاہتی تھی۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

فارسی کے اساتذہ میں ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب صدر شعبہ، ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی ص
(خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے)، پروفیسر عبدالحمید خاں صاحب اور پروفیسر لطیف احمد فاروقی
کے ناموں کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ انٹرمیڈیٹ سے بی اے تک ان اساتذہ سے میں نے فیض ح
کیا۔ ابتدائی عربی علامہ سید ابراہیم صاحب پڑھاتے تھے۔ یہ تمام اساتذہ اپنے طلبہ کے ساتھ ان
مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب بڑے خوش رو اور صاحب ذوق تھے۔
قاری کلیم اللہ حسینی صاحب کی شائستگی، اخلاق اور رہن سہن کا طریقہ قابل رشک تھا۔ پرو
عبدالحمید خاں صاحب نہ صرف اپنے فیض علم سے طلبہ کو مستفید فرماتے تھے بلکہ ضرورت مند طلبہ کی
امداد بھی کرتے تھے۔ ان کا یہ طریقہ تھا ہر کلاس کے طالب علموں کو آغاز سال پر کاپی اور پنسل کا
تھے۔ ہر طالب علم سے شخصی طور پر واقف رہتے تھے۔ ایک دفعہ میرے دانتوں میں تکلیف ہوگ
انہوں نے مجھے "موتی منجن" کی بوتل عنایت فرمائی۔ میری شادی پر تہنیتی نظم کے ساتھ چائے کا
بطور تحفہ دیا۔ اب ایسے استاد کہاں! پروفیسر لطیف احمد فاروقی صاحب بھی طلبہ پر لطف عنایت فرما
تھے۔ بڑے زندہ دل اور باغ و بہار انسان تھے۔ ان کی باتوں میں بڑی دلآویزی تھی۔ میری
پر رسالہ سب رس کیلئے مضامین لکھنے لگے جو کئی شماروں میں چھپ چکے ہیں ان کے انداز تحریر

خواجہ حمید الدین شاہد

اقبال کا تصورِ خودی

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاعرانہ اور مفکرانہ کمالات کے علاوہ عالم انسانیت کو اپنے خاص تصورات اور بے مثال نظریات سے آگاہی بخشی ہے۔ مثلاً تعلیم، وطن، سیاسیات اسلامیات، فلسفہ، تصوف اور بالخصوص خودی کے بارے میں ان کے نظریات اور تصورات اپنی آپ نظیر ہیں۔

اس میں تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ اقبال شاعر حکمت شناس اور حقیقت آگاہ انسان تھے۔ اس لئے ان کا کلام الہامی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے گردوپیش کے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر اپنے قارئین میں بھی آگاہی اور بیداری کا احساس پیدا کیا تھا۔ یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے علامہ اقبال کو علم وادب کی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

علامہ اقبال نے کائنات اور انسان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مشرق کے حکماء اور شعراء مثلاً مولانا رومی، عطار، سنائی، اور رازی وغیرہ کے کلام کو بہ نظر غائر دیکھا تھا اور ان کے خیالات و نظریات سے فیض یاب ہو کر اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی تھی۔ یہاں ہم علامہ اقبال کے کلام کے صرف ایک پہلو" یعنی "تصورِ خودی" پر بات چیت کریں گے۔ لیکن یہ بات پیش نظر ہے کہ اس مختصر وقت میں اقبال کے تصورِ خودی کا سرسری جائزہ ہی لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ موضوع علامہ اقبال کے دوسرے موضوعات کے مقابلے میں بہت وسیع اور زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری صرف شاعری ہی نہیں ہے بلکہ بہت کچھ ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　　کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اقبال کا تصورِ خودی اُن کے پیش رو شاعروں، فلسفیوں اور صوفیائے کرام سے بالکل مختلف ہے۔

علامہ اقبال کے تصورِ خودی پر کچھ کہنے سے پہلے یہ بہت ضروری ہے کہ لفظ "خودی" کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ تصوف کی اصطلاح میں "خودی" کے

یہ معنی خود انسان کی اپنی ذات یا اس کا وجود مطلق ہے۔ خدا کے وجود کے ہوتے ہوئے وجود کا تصور بعید از عقل اور ناممکن ہے۔ صوفیائے کرام ذاتِ باری تعالیٰ کے مقابل کسی قائل نہیں وہ صرف وحدۃ الوجود کو مانتے ہیں اور ذاتِ باری تعالیٰ کے علاوہ کسی اور ذات کا تصور بھی نہیں کرتے ۔

چنانچہ حضرت امجدؒ نے اپنی ایک رباعی میں وحدۃ الوجود کے مسئلے کو پیش کیا ہے :

ہیں مست ہوئے شہود تو بھی میں بھی
ہیں مٹی نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

تو آپ نے دیکھ لیا کہ اہلِ تصوف دو وجود کو تسلیم نہیں کرتے صرف ایک وجود کو مانتے لئے وہ کہتے ہیں کہ جب تک انسان خودی کو نہ مٹائے خدا کے وجود کا عرفان حاصل نہیں اس کے علاوہ خودی کا لفظ انانیت غرور تکبر اور خود سری کے معنوں میں لیا جاتا ہے ا انسان میں خودی یا انانیت باقی ہے وہ خدا کو نہیں پا سکتا۔ غالبؔ نے اسی نظریے کو ا میں پیش کیا ہے ۔ ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا

فارسی اور اردو کے قدیم شاعروں پر تصوف کا یہ رنگ غالب رہا ہے۔ فارسی شاعر صرفِ نظر کر کے جب ہم اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو قدیم شعراء میں ولیؔ، سراجؔ، میرؔ خواجہ میر دردؔ سے لے کر اقبالؔ تک کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں ہے جس کے کلام میں خود بے خودی کا ذکر نہ ہو۔ سراجؔ اور رنگ بادی کے دو شعر سن لیجئے ۔

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری
شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ در

اقبالؔ سے پہلے کے شاعر خودی کے عام مفہوم کو راہِ معرفت میں رکاوٹ سمجھتے تھے انہوں نے خودی کو مٹا کر فنا فی اللہ ہونے کی تعلیم دی۔ لیکن علامہ اقبالؔ خودی کی تلقین ہیں۔ کیونکہ خودی ایک نفسیاتی حقیقت ہے اس کی موت دراصل انسان کی موت ہے حقیقتاً ذوقِ نمود کا وہ فطری میلان ہے جو کائنات کی ہر چیز میں جاری و ساری ہے وہ کہتے ہیں :

ہر چیز ہے محو خود نمائی — ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خدائی

اگر خواہی خدا را فاش بینی — خودی را فاش تر دیدن بیاموز

خودی سے وہ استقلال ذاتی مراد ہے جو ہر انسان کے علم و عمل کو ایک مخصوص دائرے میں نمایاں کرتا ہے۔ اس کی ذات و صفات کے مظاہر متعین کرتا ہے۔ اس کی نشو و نما اور بالیدگی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ ایک حقیقی زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال استحکام خودی کو عرفان ذات اور معرفت الٰہی کے لئے لازمی شرط قرار دیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ — خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال کے ہر خیال میں ایک نئی شان اور ان کے ہر شعر میں ایک آن بان ہے اور یہی ان کی بلندیٔ فکر کی دلیل ہے۔ چنانچہ اقبال حسن و صداقت کو دو الگ اکائیاں نہیں مانتے بلکہ ایک ہی چیز کے دو پہلو سمجھتے ہیں "محبت" کے عنوان سے ان کی نظم کے یہ چند اشعار ان کی ندرت فکر کا ثبوت ہیں۔

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا — اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی — حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں — مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

انہوں نے تصور خودی پر بہت غور و فکر کیا تھا اور اس کے پرانے مفہوم کو نئے مضامین و مطالب کا جامہ پہنایا تھا۔ اقبال کی فکر کا سنگ بنیاد خودی کی نفی نہیں بلکہ اثبات خودی میں مضمر ہے۔ خودی کی منازل، زمان و مکان کی حدود میں مقید نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے طلسم کو توڑ کر عالم ماوراء کی پہنائیوں میں ڈوب جاتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

خودی کی ہے یہ منزل اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر

احساس خودی کی اہمیت کو اپنے ایک فارسی شعر میں اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

پیکر ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

بالِ جبریل میں اقبال نے تصورِ خودی کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر شئے اپنے وجود کو [illegible] نا چاہتی ہے ۔ اقبال انسان کے شعورِ ذات کو اصلِ حیات قرار دیتے ہیں ۔ شعورِ ذات جب پوری طرح نشوونما پا لیتا ہے تو وہ خدا کا رازداں ہو کر اپنی زندگی کے نشیب فراز سے آگاہی حاصل کرتا ہے ۔

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
خودی کیا ہے ، رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے ، بیداریٔ کائنات

خودی کے قدیم تصور کو موجودہ دور میں پستی اور انحطاط کا پیش خیمہ سمجھ کر اس کی سختی سے مخالفت کی تاکہ انسان کا جذبۂ عمل سرد نہ پڑ جائے ۔ اقبال کی نظر میں خودی عبارت ہے ۔ انسان کے روحانی عروج ، اس کے ذاتی ارتقاء اور اس کی خودداری سے ۔ وہ مشرق کو نکبت اور پستی سے نکال کر دعوتِ عمل اور تزکیۂ نفس کی تعلیم دینا چاہتے ہیں ۔ جو شخص جد و جہد سے گریز کر کے راہبانہ زندگی اختیار کرتا ہے ، اقبال اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو انسان کو کارزارِ حیات میں مخالف قوتوں پر غلبہ پانا چاہیے ۔ خودی کی نفی کا فلسفہ قوائے عمل کو مردہ کر دیتا ہے ۔ اس لئے اقبال نے اثباتِ خودی پر اپنا پورا زور صرف کیا ہے ۔ علامہ اقبال نے اپنی کتاب " اسرارِ خودی " میں خودی کی تین منزلیں دکھائی ہیں ۔

پہلی منزل پابندیٔ فرائض اور اطاعت ہے جس سے دل میں سچی حریت اور روحانیت پیدا ہوتی ہے ۔ دوسری منزل ضبطِ نفس ہے یعنی انسان اپنے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرے اور اسے اپنے نفس پر پورا پورا قابو حاصل ہوتا کہ اس سے کوئی نا سزا حرکت سرزد نہ ہونے پائے ۔ تیسری منزل نیابتِ الٰہی کی ہے ۔ صحیح معنوں میں خدا کا نائب بن کر ہی حقائق سے آشنائی ہو سکتی ہے ۔ نائبِ خدا اور خدا رسیدہ بزرگ کی رہنمائی کے بغیر خودی کی بیداری محال اور ناممکن ہے ۔ اسی لئے اقبال خودی کی تکمیل کو حیاتِ انسانی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں ۔

خودی کے مکمل استحکام سے انسان وہ مقام حاصل کر لیتا ہے ۔ جہاں وہ اپنی تقدیر کا خود مالک بن جاتا ہے ۔ گویا خودی کی پہچان دراصل عرفانِ ذات ہے چنانچہ فرماتے ہیں ۔

ی رکھی ہے خالق حق نے تری جبیں میں تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
ی مطلب کو کامل یقین کے ساتھ یوں بیان فرمایا ہے۔
دی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
روں کی گردش سے قسمت نہیں بدلتی بلکہ خودی کی موت حیات و جلال کے زوال کا باعث
ہے۔
ہے ستارے کی گردش نہ بازی افلاک خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت وجاہ
علامہ اقبال "بال جبریل" میں اپنے بیٹے جاوید کو اس طرح نصیحت کرتے ہیں۔
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر
رفانِ خودی کے لئے اقبال ہم کو قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جہاں سے صحیح
حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔
اندکے گم شو بہ قرآن و خبر باز اے ناداں بخویش اندر نگر
مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" (یعنی عرفانِ نفس عرفانِ حق ہے) کی روشنی
انسان کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔ اعمال و کردار کے معیار اور عادات و
ق کی اقدار دنیا میں خود شناسی ہی کی بدولت قائم ہیں۔ خود شناسی ہی باطل کی قوتوں سے
آزما ہو کر حق کا بول بالا کرتی ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال نے اثبات خودی کو بڑی اہمیت دی ہے
نچہ وہ فرماتے ہیں۔
پیکر ہستی ز آثارِ خودی است ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
انسان جب خود شناس ہو جاتا ہے تو اس کے عزائم بلند ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی ذات میں
توانائی پاتا ہے کہ اس کی نظر میں ناممکن کا لفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔ خودی کی بیداری در اصل
ات انسانی کا جوہر ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات خودی کیا ہے بیداری کائنات
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کی اہمیت کی ایک جگہ اس طرح وضاحت کرتے ہیں۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

خودی کے بارے میں علامہ اقبال نے جگہ جگہ اظہار خیال کر کے اس کی اہمیت اور حقیقت بے نقاب کیا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں ۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ — خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

تصورِ خودی جب منتہائے کمال پر پہنچ جاتا ہے تو اقبال کو زندگی کی اہمیت و عظمت احساس و ادراک ہوتا ہے اور وہ اپنے مقام بندگی پر مختلف انداز میں اظہار ناز و نیاز ان کے اس نازِ بندگی کی نیاز مندانہ شان کلامِ اقبال میں جابجا نظر آتی ہے ۔

(۱) ماخوذ از سب رس کراچی جنوری ۱۹۹۰ء

موضوعات میں تنوع ہوتا تھا ۔

دینیات لازم کے پروفیسر مولانا مناظر احسن گیلانی تھے ۔ غالباً ہفتے میں ایک کلاس ہوتی تھی ۔ لکچر اتنا دلچسپ اور معلومات آفریں ہوتا تھا کہ کوئی طالب علم ان کی کلاس سے غیر حاضر نہ ہوتا تھا ۔ بیرونی طلبہ بھی ان کا لکچر سننے کیلئے شوق سے آتے تھے ۔ کالج کے علاوہ ان سے حضرت امجد کے ہاں بھی مجھ سے ملاقاتیں ہوتیں ۔ کبھی کبھی میں ان کے گھر جا کر نیاز حاصل کرتا ۔ وظیفے کے بعد وہ وطن گیلانی چلے گئے تھے میرے خطوط کا بڑی محبت اور شفقت سے جواب دیتے تھے ۔ (صفحہ ۱۲۱)

یہ تھے میرے دلی جذبات ، احساسات و تاثرات اپنے اساتذۂ کرام کے بارے میں اور مخلص دوست اور دانشور ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی کے جشن الماس میں مرتب ہو رہا ہے ۔ اس میں شائع کرنے کی عزت بخشی ۔ یہ میرے لئے بہت بڑی عزت اور بات ہے میں اس جشن کی خوشیوں میں آپ کے ساتھ برابر کا شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ نسل کو عثمانیہ یونیورسٹی کا صد سالہ جشن بھی شاندار طریقے پر منانے کی توفیق ہو ۔ افسوس کہ ا ہم ہنوز ہوں گر

خواجہ حمید الدین شاہد

ایران کے دانشور
قطب شاہی اور آصف جاہی عہد میں

دکن کی اسلامی سلطنتوں میں بیجاپور، گولکنڈہ اور حیدرآباد کو بڑی اہمیت حاصل رہی حیدرآباد فرخندہ بنیاد تو زمانہ قدیم سے علم وفضل کا مرکز اور شعر وشاعری کا گہوارہ رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ایران اور حیدرآباد علم وحکمت اور تمدن وثقافت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے تھے۔ بالخصوص قطب شاہی سلاطین کے عہدِ حکومت میں ایران اور حیدرآباد کے تہذیبی رشتے بہت گہرے اور استوار ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایران کے کئی دانشوروں نے حیدرآباد آکر مستقل سکونت اختیار کی تھی اور اپنے علم وفضل سے یہاں کے لوگوں کو مستفید کرتے رہے چونکہ ان دونوں ملکوں کی زبان اور تہذیب وثقافت مشترک تھی اس لئے باہمی دوستی اور خلوص ویگانگی میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔

حیدرآباد میں فارسی زبان وادب کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی مثال کسی اور جگہ مشکل ہی سے ملے گی۔ شاہانِ ایران اور سلاطین قطب شاہیہ کے مابین سفارتی تعلقات بہت خوشگوار تھے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے عہدِ حکومت (۱۰۲۰ تا ۱۰۳۵ھ) میں بڑے بڑے علماء وفضلا حیدرآباد میں جمع ہو گئے تھے جن میں مولانا حسین آبلی، عشرتی یزدی، علی گل استرآبادی، میر مومن اوائی یزدی، مسیح کاشی اور ملا عبد الحکیم قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے قبل ۱۰۰۰ھ میں ایران کے ایک بہت بڑے عالم اور مدبر میر محمد مومن استرآبادی گولکنڈہ پہونچ چکے تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ان کو وکیل السلطنت یعنی وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کردیا تھا۔ میر محمد مومن جملہ علوم معقول ومنقول میں کامل مہارت رکھتے تھے، بڑے اچھے شاعر تھے اور آئینِ حکومت میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت انہوں نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں

خستہ جانم کہنہ لیکن جاں فشانی تازہ است | عہدِ سلطانِ نو است و عید قسر بانِ نو
یادگارِ جد و عم سلطان محمد قطب شاہ | آں کہ ہندوستان زفیضش گشتہ ایرانِ نو
گر صفاہاں نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ | حیدرآباد از تو شد ، شاہا صفاہانِ نو
خواستم تاریخ فرخندہ جلوت عقل گفت | جملہ عالم نو بہار ی شد ز سلطانِ نو

ان اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایران و حیدرآباد ایک دوسرے کتنے
ملا عبدالحکیم نے عالم آرائے عباسی کی طرز پر قطب شاہی بادشاہوں کی ایک تاریخ نہ فصیح و بلیغ فارسی میں لکھی تھی ۔ سید مراد اصفہانی نے حضرت امیر حمزہ کے واقعات پر ایک مثنوی لکھی جس کے دیباچے میں اس نے سفر حیدرآباد کے تاثرات منظوم کئے ہیں جس کا پہلا شعر

چو بر حیدرآبادم افتادہ راہ
ز شادی رسانم بگردوں کلاہ

علامہ محمد ابن خاتون ، شیخ بہاء الدین آملی اور میر محمد مومن استرآبادی کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے ۔ ان کا شمار دنیا کے بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں میں ہوتا ہے ۱۰۳۴ھ میں سلطان محمد قطب شاہ نے ان کو اپنا سفیر بنا کر ایران بھیجا تھا ۔ محمد قطب شاہ کی وفات کے بعد ۱۰۳۵ھ میں وہ حیدرآباد واپس آگئے اور پیشوائے سلطنت کے عہدے پر فائز ہوئے اس زمانے کا سب سے بڑا اعزاز تھا ۔ ابن خاتون کی تصانیف میں کتاب اربعین ، حاشیۂ عباسی اور شرح ارشاد مشہور ہیں ۔

ملا حسین آملی ، سلطان عبداللہ قطب شاہ کے استاد تھے ۔ شرح نہج البلاغہ ، ہدایت اور رابطۃ العمل ان کی مشہور کتابیں ہیں اس دور کے علما میں فارسی کی مشہور لغت برہانِ قاطع کا مصنف ملا محمد حسین برہانِ تبریزی ، اور ملا نظام الدین احمد شیرازی مصنف حدیقۃ السلاطین قابلِ ذکر ہیں ۔ برہانِ قاطع کے جواب میں مرزا غالب نے قاطع برہان لکھی اور ایک ادبی ہنگامہ برپا ہوگیا تھا ۔

میر رضی دانش بھی اس دور کے ایک باکمال شاعر اور بادشاہِ وقت کے داماد تھے ۔ عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۶۲ھ میں ان کو اپنا نائب مقرر کر کے مشہدِ مقدس روانہ کیا تھا تاکہ روضۂ رضویہ میں بادشاہ کی طرف [illegible]

سلطان ابوالحسن تانا شاہ کی فرمائش پر علی ابن طیفور بسطامی نے حدائق السلاطین لکھی، اس ریخ کے منظوم دیباچے میں اس نے تانا شاہ کے بارے میں حسب ذیل اشعار لکھے ہیں۔

خدایا بہ اعزاز خیر الوریٰ — بحق نجوم سپہر ہدیٰ
کہ آں خسرو عادل پاک دیں — ہمیشہ باقبال بادا قریں
بہ دنیا بماناد بسیا رسال — نگہبان او حضرت ذوالجلال

اس دور کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں میں اختری یزدی، آقا ہدی اصفہانی اور مجلسی اصفہانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ آصفجاہی سلاطین کے ابتدائی دور میں ۱۱۰۵ھ تا ۱۲۰۰ھ کئی ایرانی شاعروں کا پتہ چلتا ہے جو آسمان ادب کے درخشندہ ستارے تھے میر فخرالدین یزدی کے چند اشعار یہ ہیں۔

نیستم گر عاشق روئے تو حیرانم چرا
ورنیم آشفتۂ زلفت پریشانم چرا
گر نہ خال عارضت بردل نمود افغان گری
چوں سپند از آتش شوق تو رقصانم چرا

محمد باقر شہید طہرانی صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے دو شعر یہ ہیں۔

بہار کعبہ و دیر است دلداری کہ من دارم
ندارد ہیچ کس یاری چنیں یاری کہ من دارم
شب و روز ست کار من شہید از کار بگذشتن
نمی آید بکار ہیچ کس کاری کہ من دارم

محمد رضا قزلباش خاں امید ہمدانی جب ایران سے آئے تو بادشاہ نے اپنے مصاحب خاص نصرت جنگ محمد تقی خاں کو ان کے استقبال کیلئے بھیجا اور قلعہ داری کا عہدہ ان کے تفویض کیا۔ امید ہمدانی کے چند اشعار یہ ہیں۔

محو در حال حدیثے از مرید قحبۂ دنیا — چہ می آید از آں مردے کہ باشد کمتر از زن ہم
روشن بود کے شمع بہ شب دارد اعتبار — بے جا نمی خرند بہ ہندوستان مرا

جان میرزا رضا ہمدانی سادات حسینی سے تھے۔ اپنے دور کے فارسی شاعروں میں ان کا

خا یہا تمام تھا نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں۔ ے

تا جلوۂ تو صید نظرمی شود مرا
تارِ نگاہ ، سلک گہری شود مرا

ممنونِ نالہ عام کرد این بزم بےکسی
گاہے رفیق ، دیدۂ تر می شود مرا

ما را رسا ز خاکِ محبت سرشتہ است
ہر جادۂ شکست ، اثری می شود مرا

میرزا علی نقی ایجاد ہمدانی شاہ سلیمان صفوی کے وزیر شیخ علی خاں کے رشتہ دار تھے۔ آصفجاہ کے عہدِ حکومت میں ایک مدت تک صوبۂ حیدرآباد کے دیوان کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ بحیثیت شاعر اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھے۔ تاریخ گوئی میں کوئی ان کا مدِ مقابل نہیں تھا۔ نمونۂ کلام

یار آمد و دمے ز نشست و شتاب رفت
عمرِ عزیز چو نفس با اضطراب رفت

نظر بازم چہ شد گفتی ہمیں از خانہ ما آئم
من از چشم تو فہمیدم کہ از میخانہ می آئی

نہ با سرو الفتی داری ز شوق لالہ می بینی
صراحی در بغل ساغر بکف مستانہ می آئی

آقا صابا مستعد شیوہ بیان شاعر تھے اور غزل گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ان کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

اسیر دام ، بجرم زندگانی را تماشا کن
نہ مُردم از فراقت سخت جانی را تماشا کن

بہ گلشن بی رخت گر سایۂ گل بر سرم افتد
ز پا چوں سایہ افتم ناتوانی را تماشا کن

بیا یک دم بہ بزم مستعد اے غنچۂ خنداں
رخ زردو سرشکِ ارغوانی را تماشا کن

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اس مختصر مضمون میں ایران کے ان چند باکمالوں کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے جن کے سرچشمۂ علم و فضل سے مدتوں تک سرزمین دکن سیراب ہوتی رہی۔

(ماخوذ از سب رس کراچی مئی ۱۹۸۵ء)

بقیہ صفحہ (۱۳۶)

(عبارت) مجلس انتظامی کے رکن اور صاحب طرز ادیب کسری کرشن سنہا ۱۲ اپریل کو رحلت کر گئے۔ انہوں نے اعلیٰ عہدہ دہلی پر فائز رہ کر بھی اردو ادب اور کلچر سے رشتہ استوار رکھا۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے "رم جھم" اور "زمین کا نپ رہی تھی" ادارہ ادبیات اردو سے شائع ہوئے تھے۔ وہ میرے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ آنجہانی کی روح کو شانتی نصیب ہو۔

(ماخوذ از سب رس جون ۱۹۸۵ء)

خواجہ حمید الدین شاہد

یادِ رفتگاں

گزشتہ دو مہینوں میں کئی مسافرانِ راہِ عدم یکے بعد دیگرے داغِ مفارقت دے گئے۔ پروفیسر سلیم چشتی (شارحِ اقبال)، سید قائم مقام حسین جعفری، عالی جونپوری، عبدالرزاق راز، پروفیسر محمد سرور، شریف منور، رفیق احمد خاں (بچوں کے محبوب شاعر)، شرافت نوشاہی کے بعد کراچی کے بزرگ شاعر نازش حیدری دہلوی نے ۱۷؍ فروری کو رحلت کی۔ وہ صاحبِ طرز شاعر اور مشہور صحافی تھے۔ ان کا منتخب کلام "صدیوں کا سفر" چند سال قبل شائع ہوا تھا۔ نواب سید شمس الحسن نے ۲۷؍ فروری کو وفات پائی۔ وہ نواب صدیق حسن خاں کے پوتے اور تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں میں سے تھے۔ جگر مراد آبادی کی شاعری پر کتاب کا مسودہ چھوڑ گئے۔ تحریکِ پاکستان کے مجاہدوں پر کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔

ممتاز شاعر اور نقاد یوسف کامران حرکتِ قلب بند ہو جانے سے سعودی عرب میں ۱۱؍ مارچ کو انتقال کر گئے۔ وہ مشہور شاعرہ اور پاکستان نیشنل سنٹر لاہور کی ریذیڈنٹ ڈائریکٹر محترمہ کشور ناہید کے شوہر تھے۔ ان کا مجموعہ کلام "اکیلے سفر کا اکیلا مسافر" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر محمد صدر الحق جو محقق اور نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے، مارچ کے مہینے میں راہیِ عالمِ بقا ہوئے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "انکشافات" ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔

بزرگ صحافی، ادیب، شاعر اور علمِ نجوم کے ماہر سردار علی صابری نے ۲۹؍ مارچ کو رحلت فرمائی۔ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ قیامِ پاکستان سے قبل "انجام" دہلی کے مدیر تھے۔ اور پاکستان آنے کے بعد بھی "انجام" کراچی سے وابستہ رہے۔ برصغیر کے اکابرِ صحافت میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

کہنہ مشق اور ممتاز نعت گو شاعر منور بدایونی ۲؍ اپریل کو وفات پا گئے۔ ان کی نعتیں

کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں "نشانِ پاکستان" اعزاز عطا کیا تھا۔ حال ہی میں جامعہ کراچی کے قدیم طلبا کی انجمن "یونی گیرینز" نے ان کو پانچ ہزار روپے کا کیش ذر بطورِ نذرانہ پیش کیا تھا۔ وہ ممتاز غزل گو شاعر محشر بدایونی کے برادرِ بزرگ تھے۔

ڈاکٹر عبدالطیف منہاس پروفیسر جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سنٹر نے لندن میں دل کے آپریشن کے بعد ۹ر اپریل کو وفات پائی۔ میت کراچی لائی گئی اور سخی حسن کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ انہوں نے پندرہ روزہ "طبیب" میں "قصہ پارینہ" کے عنوان سے اپنی سوانح حیات لکھنی شروع کی تھی۔ اور ابھی اس کی دو قسطیں ہی شائع ہوئی تھیں۔ میری خواہش پر انہوں نے ڈاکٹر ممتاز حسن پر مضمون لکھا تھا جو اسی شمارے میں شامل ہے۔

مطلوب الحسن سید نے ۲۵ر اپریل کو آخری سانس لی۔ سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۴۴ء تک وہ قائدِ اعظم کے سکریٹری رہے "محمد علی جناح سیاسی جائزہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اپنے دیرینہ ساتھی مرزا جمیل احمد صاحب کے "نوری نستعلیق" کی ایجاد میں نمایاں خدمات انجام دیں کچھ دنوں السٹر ٹیڈ ویکلی آف پاکستان کے ایڈیٹر بھی رہے۔

مولانا محمد شفیع اوکاڑوی پاکستان کے جید عالم اور شعلہ بیان خطیب تھے۔ ۲۴ر اپریل کو حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے آپ کا شمار اہل سنت کے بڑے علماء میں ہوتا ہے مولانا نے تحریکِ پاکستان اور تحریکِ ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ کے جنازے میں ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند شریک تھے۔

بھارت کے حسب ذیل ادیب و شاعر بھی داغِ مفارقت دے گئے۔

احسن علی مرزا حیدرآباد دکن کے پرانے صحافی تھے۔ روز نامہ "سیاست" سے کالم نویس اور تبصرہ نگار کی حیثیت سے تقریباً ۳۰ سال تک وابستہ رہے۔ وہ ایک شریف النفس اور صاحبِ طرز ادیب تھے۔ مجھ سے قدیم روابط اور دوستانہ تعلقات تھے۔

اردو کے بلند پایہ شاعر ساغر نظامی نے ۲۷ر فروری کو دہلی میں وفات پائی۔ وہ کئی سال تک میرٹھ سے ماہنامہ "ایشیا" شائع کرتے رہے۔ کئی برسوں سے وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اردو پروگراموں کے سربراہ کی حیثیت سے مامور تھے۔ بھارت کی حکومت نے ان کی شعری و ادبی خدمات کے اعتراف میں پدما بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔ انہی مرحوم آواز او، ان، ، ۱۱

ں اور گیتوں سے ان کا شمار اردو کے مقبول ترین شعراء میں ہوتا تھا۔ بادۂ مشرق اور ننگ گل دو شعری مجموعے ہیں انہوں نے کالی داس کے ڈرامے "شکنتلا" کا اردو ترجمہ کیا تھا

بھارت کے مشہور اردو ادیب اور صحافی ڈاکٹر اطہر پرویز کا ۱۰ مارچ کو علی گڑھ میں انتقال ہوگیا ئی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ دو ماہی فاظ" علی گڑھ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ بچوں کے ادب پر انھوں نے بیں لکھی ہیں حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے ان کو انعامات سے نوازا۔ حیدرآباد دکن کے صحافی، افسانہ نگار اور شاعر ڈاکٹر نور الحق نے بھی انہی دنوں وفات پائی۔ مرحوم کا شمار ظفر علی خاں اور حمید نظامی کے حلقۂ احباب میں ہوتا تھا۔ پروفیسر سید علی اکبر نے ۱۸ اپریل یدرآباد دکن میں وفات پائی۔ (۹۳) سال عمر پائی تھی۔ مرحوم اپنے دور کے ماہر تعلیم تھے تعلیمات، پرنسپل نظام کالج اور پرنسپل انوار العلوم کالج کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام کئی سال تک ادارۂ ادبیات اردو کے صدر رہ کر حال ہی میں مستعفی ہوئے تھے۔ ان کی خدمات تراف ایک شاندار جلسے میں کیا گیا تھا۔ سہ ماہی انگریزی رسالہ "اسلامک کلچر" کے وائس ن بھی تھے۔

میرے پیارے دوست خواجہ عبدالغفور آئی اے ایس (ریٹائرڈ) ۲۶ اپریل کو داغ مفارقت گئے۔ وہ اپنی بیگم حلیمہ کے ساتھ بذریعہ ٹرین حیدرآباد سے بمبئی جا رہے تھے کہ پونا کے قریب ت قلب بند ہوگئی۔ وہ مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی بمبئی کے سرگرم سکریٹری اور سہ ماہی "امکان" مدیر اعلیٰ تھے۔ وہ اردو کے ممتاز مزاح نگار تھے حال ہی میں "طنز و مزاح کا تنقیدی زہ" پر بمبئی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی۔ یہ مقالہ کتابی صورت شائع ہو چکا ہے ی تصانیف میں لالہ زار، قہقہہ زار اور شگوفہ زار بہت مقبول ہوئی تھیں۔ وہ مہاراشٹرا اردو کی ترویج کیلئے خرابی صحت کے باوجود دن رات معروف رہتے تھے۔ بمبئی کی ادبی ثقافتی سرگرمیاں ان ہی کے دم سے قائم تھیں۔

اللہ پاک مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

(ماخوذ از "سب رس" ڈاکٹر ممتاز حسن نمبر)

(مارچ اپریل ۸۴ء)

عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ فلسفہ ممتاز دانشور اور اقبالیات کے ماہر پروفیسر عالم خوندمیری ستمبر ۱۹۸۳ء کو حیدرآباد دکن میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ گزشتہ ماہ اخبار سیاست حیدرآباد دکن میں ان کی علالت کی اطلاع چھپی تھی اور ان کے علاج کیلئے وہاں کے ایک مصور نے اپنی تصاویر کی نمائش کرکے جملہ آمدنی علاج فنڈ کو دے دی تھی۔ ان کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ نہیں تھی اور انکی موت کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ مرحوم اردو ادب، فلسفہ اور اقبالیات کے ممتاز عالم، نقاد اور دانشور تھے اور پاک و ہند میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اقبال صدی کے موقع پر پاکستان آکر علامہ اقبال کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس بارے میں مجھے خط لکھا تھا جس میں انہوں نے علامہ اقبال سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے مرحوم کو دعوت دینے کیلئے ڈاکٹر معزالدین صاحب ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی لاہور کو پرزور سفارش کی تھی لیکن افسوس کہ کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے دو سال قبل دہلی کے ایک سیمینار میں ان سے ملاقات کی تھی اور ان کا مقالہ سن کر اتنے متاثر ہوئے تھے کہ کراچی واپس آکر مجھ سے فرمایا کہ سمینار میں جس شخص نے اپنی علمیت اور قابلیت سے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ڈاکٹر عالم خوندمیری تھے۔ اقبالیات اور مسلمانانِ ہند کے مسائل پر ان کی کئی اہم کتابیں اور مقالے شائع ہو چکے ہیں اگر اقبال اکیڈیمی لاہور علامہ اقبال سے متعلق ان کی تصانیف اور مقالوں کو دوبارہ شائع کرے تو اہل پاکستان کو مطالعۂ اقبالیات میں بڑی مدد ملے گی۔ میں انکی بیگم خدیجہ عالم خوندمیری اور ان کی اولاد کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ (آمین)

(ماخوذ از سب رس ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء)۔

برصغیر کے ممتاز عالم دین شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے سربراہ اور ماہنامہ "برہان" دہلی کے مدیر مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۱۹۸۵ء ۱۲ مئی کو کراچی میں طویل علالت کے بعد اپنی صاحبزادی مسعودہ سعید کے گھر میں وفات پائی۔ دارالعلوم کورنگی میں تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ میں علمائے کرام اور عمائدین شہر نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق اور مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کے وہ استاد تھے۔ لفٹننٹ جنرل جہانداد خاں گورنر سندھ کی جانب سے ان کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔ برصغیر کے ممتاز صحافی اور "شمع" دہلی کے مدیر حافظ یوسف دہلوی کا ۱۹۸۵ء کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔ اللہ پاک مرحومین کو جنت نصیب کرے۔ آئینہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۱

(ما ۱۴۳) ص

خواجہ حمید الدین شاہد

ڈاکٹر ممتاز حسن

سب رس۔ مارچ۔ اپریل ۱۹۸۱ء نمبر ۳

ایوانِ اردو کے ترجمان "سب رس" کا یہ ساتواں سال ہے۔ اس دوران میں عام شماروں کے علاوہ چودہ (۱۴) خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ اب ساتواں خصوصی شمارہ "ڈاکٹر ممتاز حسن نمبر" پیشِ خدمت ہے۔ ادارہ سب رس نے یادِ رفتگاں کی جو روایت قائم کی ہے اسے علمی و ادبی حلقوں نے بنظرِ استحسان دیکھا اور اس کی اہمیت و افادیت پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر شمارہ بھی آپ کے معیار اور ذوق پر پورا اترے گا۔

ادارہ سب رس پاکستان کے ان دانشوروں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو سب رس کے صفحات میں منضبط کر رہا ہے جو ایک ایک کر کے اس دنیا سے جدا ہو رہے ہیں۔ یہ تحریریں آئندہ لکھی جانے والی تاریخِ ادب اردو کے لیے معلومات کا بیش بہا خزانہ ثابت ہوں گی۔ سب رس کا یہ شمارہ جو "بیادِ ممتاز حسن" شائع کیا گیا ہے اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

گلِ عقیدت کے پھول: کسی ملک یا قوم میں شاذ و نادر ہی ایسے باکمال افراد پیدا ہوتے ہیں جو اس کے لیے باعثِ فخر و مباہات ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم بھی پاکستان کے ان مایۂ ناز اکابرین میں سے تھے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

انہوں نے اپنی بے لوث مساعی اور ان تھک قومی خدمات سے اپنی زندگی ہی میں وہ ناموری شہرت، عزت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی جو ان کے شاندار کارناموں کی بقائے دوام کی ضامن ہے۔ ان کا ذاتی کردار کوہِ ہمالہ کی طرح بلند اور تاج محل جیسا نورانی اور پر وقار تھا۔ ان کے قول و عمل میں ہم آہنگی اور صداقت تھی۔

پاکستان اور اہلِ پاکستان کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے اپنے آخری سانس تک وہ سرگرمِ عمل رہے۔ ان کی ذات میں وہ تمام خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ جو ایک سچے مسلمان اور

جاہ طلبی کی خواہش۔ ان کو صرف اپنے کام سے کام تھا۔ اگر کوئی تمنا یا آرزو ان کے دل میں کروٹیں لیتی تھی صرف یہ تھی کہ مملکت اسلامیہ پاکستان کا ہر شہری زیور تعلیم سے آراستہ ہوکر اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن مصروف ہو جائے اور حسب مقدور اس اہم فریضے کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ یہی ان کا مقصد حیات اور ان کی سرگرمیوں کا نصب العین تھا۔ ان کی ساری توانیاں ملک و قوم کے استحکام اور ترقی کیلئے وقف تھیں۔

ڈاکٹر ممتاز حسن خلوص، ہمیت کا پیکر تھے۔ ان کی سرشت میں دل نوازی اور دلداری فیض رسانی اور ہمدردی کا سلیقہ بدرجۂ اتم جاگزیں تھا۔ بردباری، دلجوئی، خوش خلقی، عجز و انکسار تحمل و ایثار اور عفو و درگزر ان کی شخصیت کے آئینہ دار تھے۔ شرافت و متانت، صداقت و دیانت شفقت و مروت، مشقت و ریاضت ان کی فطرت کے نمایاں جوہر تھے۔ احترام انسانیت ان کا جزو ایمان تھا اور مخلوق خدا کی خدمت کو وہ اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔

وہ مشرقی تہذیب و ثقافت کے پروردہ اور اسلامی اخوت و اخلاق سے آراستہ تھے۔ تہذیب و تمدن کے اقدار کی حفاظت کا ان کو ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ پاکستانی معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے کاموں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ علم و ادب اور ہماری تہذیب و ثقافت کے دلکش مینار اور مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھے کیونکہ ان جیسے باکمال لوگ جن سانچوں میں ڈھلے تھے، اب وہ سانچے ہی ختم ہو چکے ہیں۔ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں۔

علم دوستی اور ادب نوازی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم فکر و دانش اور سیرت و کردار کی اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جہاں دوسروں کی رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی۔ علم و ادب کے بے غرض محسن کی حیثیت سے اہل پاکستان انہیں کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی، دوستوں سے خلوص و محبت، چھوٹے بڑوں کی خیر خواہی حتیٰ کہ اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی ان کا حسن سلوک مثالی تھا۔ یہی وہ امتیازی خصوصیات تھیں جن کی بدولت انہوں نے ہر طبقے کے افراد کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی تھی اور بلاشبہ وہ ملک و قوم کا محبوب ترین اثاثہ بن چکے تھے۔

بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن اقتدار کا نشہ ان کی متوازن طبیعت پر غالب

خواجہ حمید الدین شاہد

غزل

اجہ شجاع الدین کے بڑے فرزند
اجہ حمید الدین شاہد ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۹ء
حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم
یدرآباد کی قدیم درسگاہ دارالعلوم میں
ائی اور امتحان میٹرک بدرجہ اول
پاس کیا۔ جامعۂ عثمانیہ سے ایم اے
رنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں دارالعلوم
کالج میں اردو اور ہندی کے لکچرار
مقرر ہوئے اور تقریباً ۱۴ سال تک
جامعہ سے ملحقہ مختلف کالجوں میں
اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ ادارۂ
ادبیات اردو کو پروان چڑھانے
میں آپ نے انتھک مساعی کی اور حیدرآباد
میں جب تک رہے ادارہ کے مختلف
شعبوں میں بحیثیت رکن تندہی سے
کام کیا۔ جون ۱۹۵۹ء میں پاکستان چلے
گئے اور آج کل کراچی میں سکونت پذیر
ہیں۔ تصانیف میں "اردو کا قدیم ترین
سائنسی ادب" "سرگزشت ادارہ ادبیات

تجھ سے ملنے کے مرے دل میں جو ارماں ہونگے
پھر نئے سر سے مری زیست کے عنواں ہونگے

کیا خبر تھی کہ ترے چاہنے والے اے دوست
تری محفل سے نکلتے ہی پریشاں ہونگے

تیری فرقت میں گزرتے ہیں جو مشکل لمحات
اک نگاہِ غلط انداز سے آساں ہونگے

جانے کیا گزرے گی اسوقت ہمارے دل پر
اپنے ہی شہر میں جب آپ ہی مہماں ہونگے

کون کس حال میں ہے کوئی نہیں پوچھے گا
اپنی ہی فکر میں سب اے دل ناداں ہونگے

جذبِ الفت کا اثر ہوگا تو ہم بھی شاہد
بزم احباب میں اک روز غزل خواں ہونگے

(مجلہ عثمانیہ (جامعہ عثمانیہ نمبر) ۱۹۵۹ء سے ماخوذ)

اردو" "ارمغان امجد" "یادگار صفی" "حیدرآباد کے
شاعر" اور مثنوی تصویر جاناں شائع ہو چکے ہیں
ان کے علاوہ آپ کا کلام مختلف رسائل میں
چھپ چکا ہے۔

نوٹ منجانب ادارہ مجلہ ۶۰ - ۱۹۵۹ء

انٹرویو کے اختتام سے قبل میں نے جناب شاہد سے درخواست کی کہ وہ تخلیق کاروں کے لئے کوئی پیام مرحمت فرمائیں۔ آپ نے کہا کہ تخلیق کاروں کے لئے میرا پیام یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں میں توانائی پیدا کریں۔ یہ بے حد ضروری ہے کہ اپنے فن سے والہانہ وابستگی ہمیشہ بہرصورت برقرار رہے۔ قلم کاروں سے میں یہ بھی کہوں گا کہ وہ معیاری تخلیقات کے ذریعہ اُردو ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کریں۔ نئی نسل کے نام پیام دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ نئی نسل کے لئے صالح ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یاد رکھئے! نئی نسل کی اُردو سے بے اعتنائی تہذیب و تمدن کے زوال کا باعث ہوگی۔

ان پیامات کے مرحمت فرمانے کے بعد جناب شاہد نے مجھ سے معانقہ کیا اور میں نے اُن سے رخصت کی اجازت چاہی۔

ماہنامہ

حیدرآباد

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمایندہ

ماہنامہ شاداب
حیدرآباد

جلد: ۳ — شمارہ: ۳ — مارچ ۱۹۸۶ء — فی شمارہ: ۵ روپے

ہندوستان	خلیجی ملک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ ۵۰ روپے	۱۵۰ روپے	۲۵ ڈالر	۲۰ پونڈ	۱۲۵ پاکستانی روپے
دو سالہ ۹۰ روپے	۲۷۰ روپے	۶۵ ڈالر	۳۶ پونڈ	۲۲۵ " "
تاحیات ۱۰۰۰ روپے	۵۰۰ روپے	۴۵۰ ڈالر	۲۰۰ پونڈ	۲۰۰۰ " "

ترسیلِ زر کا پتہ: 11-5-147، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد میں چھپوا کر ریڈ ہلز، حیدرآباد۔۴ سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

"شاداب" کی تیسری جلد کا تیسرا شمارہ پیش خدمت ہے۔
شاداب اپنے گذشتہ شماروں میں سفر حرمین شریفین (لیڈی الولن کبولڈزینب) اور البدر (قاضی جلیل احمد) قسط وار پیش کر چکا ہے جسے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ گذشتہ شماروں میں "شکار اور شکاری" اور سراغرسانی اور تفتیش کے بارے میں چند اقساط پیش کی گئیں جن کا سلسلہ جاری رہے گا۔ موجودہ شمارہ سے ایک عرب مصنف امین مالوف کی کتاب "صلیب کے سائے میں" کا ترجمہ قسط وار پیش کیا جا رہا ہے یقین ہے قارئین اسے پسند کریں گے۔

ہمیں احساس ہے کہ "شاداب" کے حصہ نظم پر گذشتہ کافی توجہ نہ کی جا سکی، اب اس کی تلافی کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نیز قارئین کی خواہش پر "پسندیدہ اشعار" کا سلسلہ بھی شروع کیا جا رہا ہے۔ قارئین اپنے پسندیدہ اشعار روانہ فرمائیں تو اس مستقل عنوان کے تحت انھیں شریک اشاعت کیا جائے گا۔

"شاداب" آپ کا اپنا ماہنامہ ہے۔ اس کی افادیت اور دلچسپی کو بڑھانے کیلئے آپ کے مشوروں اور تجاویز کو شکریہ کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔

پسندیدہ اشعار *****

خدا کے نام پہ مانگا تو بھیک بھی نہ ملی
ہوس کے نام پہ منہ کھل گئے خزانوں کے

گھڑی وہ کیسی مبارک تھی کل جہاں کے لیے
حرا میں عرش سے اقراء کا جب پیام آیا

مرسلہ: محمد علی الدین قادری
ممبر: مسلم ویلفیر سوسائٹی

خلیل اکمل

سائنسی ایجادات اور ارتقائے تہذیب

ہوائی جہاز

دسویں قسط

پرندوں کو ہوا میں اڑتا دیکھ کر انسان بھی ہوا میں اُڑ خواب دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے ان خوابوں کو حقیقت بدلنے کے لیے پرندوں کی پرواز کا بغور مطالعہ کیا۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچا شئے ہوا میں اُڑ سکتی ہے جو کم وزن ہو اور اس میں توانائی کی شکل کو بدلنے اور صلاحیت ہو۔ چنانچہ اسی اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے RD DE VICE نے پرندوں کے مماثل مشینیں بنانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکا اس کے بعد بہت ہی منظم طریقہ پر پرندوں کی اڑان پر تحقیق کی جانے لگی۔ اور ۱۶۷۲ء کے دوران جان ویلکن (JOHN WILKIN) جو رائل سوسائٹی کا بانی تھا اپنے مشاہدات کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "اگر کوئی پرندہ اپنے ہوا میں حرکت دے کر اُڑ سکتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انسان مشق کرنے کے بعد قدرت کی نقل کر سکتا ہے۔" اس کے بعد ۱۶۷۰ء اور کے درمیان کئی لوگ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنے لگے۔

۱۷۸۲ء کے اواخر میں فرانس میں کاغذ کی صنعت کار کے لڑکوں نے کیا کہ کاغذ کی ہلکی تھیلی میں گرم ہوا بھر کر چھوڑنے سے یہ ہوا میں تیرتی ہے دریافت کے بعد جین فرانکوائز (JEAN FRANCOIS) اور فرانکو (FRANCOIS LAURENT) نے ۱۷ نومبر ۱۷۸۳ء میں گرم ہوا کے غبارہ کو کا ساتھ ہوا میں اُڑایا۔ یہ اُڑان صرف ۶ میل کی تھی جو ۲۵ منٹ جاری رہی ۱۷۸۳ء میں گرم ہوا کے بجائے غباروں میں ہائیڈروجن گیس بھری جانے

اس کے بعد CHARLES اور ROBERT نامی لوگوں نے پہلی تاریخ ساز انسان بردار غبارہ اُڑان کا آغاز کیا۔ کوئی سو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

انیسویں صدی کے وسط سے ہوا میں اُڑنے والی کم وزنی مشینوں کی تیاری کے تعلق سے غور کیا جانے لگا۔ چنانچہ فرانسیسی نژاد ہنری گفرڈ - HENRY GIFFARD نے بھاپ کی قوت سے چلنے والا ۳۵۰ پونڈ وزنی H.P. 3 قوت کا انجن تیار کر دیا جس میں بڑے بڑے پنکھوں کو گھمانے کی قوت تھی۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۲ء میں اس نے اڑان کا تجربہ کیا جس سے بڑے بڑے جہاز تیار کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔
۱۸۹۰ء میں جرمن ہواباز OTTO LILIENTHAL کی خلابازی کی پرواز سے امریکی بہت متاثر اور پریشان ہوئے۔ اس ہواباز نے ایسی ہلکی ہوائی مشین تیار کی تھی جو اڑان کے دوران اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اپنے جسم کو مختلف زاویوں سے حرکت دیتا تھا۔ آخر کار ایک پرواز میں اس کی موت واقع ہوئی۔
اس واقعہ سے دو امریکی جو (WRIGHT BROTHERS) کے نام سے مشہور تھے، بہت غمگین ہوئے۔ یہ دو بھائی بچپن میں پتنگ اڑاتے وقت ہوا میں اڑنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ انھوں نے ہوا میں اڑنے کے لیے بہترین مشین بنانے کی کوشش شروع کی۔ آخر کار ان لوگوں کی کوشش ایک طاقتور ہوائی جہاز کی شکل میں ظاہر ہوئی۔
رائٹ برادرس یعنی ORVILLE WRIGHT اور WILBUR WRIGHT
دونوں ایک پادری کے لڑکے تھے جو اپنی دُکان میں سائیکل کی درستگی کا کام کیا کرتے تھے اگرچہ کہ وہ سائنس کی باقاعدہ تعلیم سے نابلد تھے لیکن وہ اخبارات میں شائع ہونے والے سائنسی تجربات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے امریکی رسالہ "PROGRESS IN FLYING MACHINES" میں شائع کردہ مضامین کا بہت سنجیدگی سے مطالعہ کیا پھر پرندوں کی اڑان کے طریقہ عمل کا تجزیہ کیا کہ وہ کس طرح اپنے پروں کو اڑتے وقت حرکت دیتے ہیں۔ انھوں نے پروں کے بجائے مختلف ڈھنگ کے پنکھے تیار کر دیے۔ جن کو جانچنے کے لیے اپنی دکان میں ایک ہوا سرنگ (AIR DUCT) بنائی، جہاں پنکھوں کی کارکردگی کے اعتبار سے ایک

مخصوص پنکھے کا انتخاب کرکے ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز GLIDER تیار کیا۔ جہاز سے مطمئن ہونے کے بعد FLYER بنایا۔ اس جہاز میں H.P. 12 قوت کا انجن نصب کیا گیا جو ایک زنجیر کی مدد سے پنکھوں کو گھما سکتا تھا۔ یہ انجن پٹرول قوت سے چلتا تھا۔ آخرکار ۱۷ر دسمبر ۱۹۰۳ء میں ایک تاریخ ساز ہوائی اڑان کا ایک کامیاب تجربہ ہوا۔ یہ تجربہ امریکہ کے شہر KITTY HAWK میں انھوں نے اپنے جہاز کو لکڑی سے بنی رن وے (RUNWAY) پر دوڑا کر چالو کیا۔

ORVILLE نے بحیثیت کپتان پنکھوں کے درمیان بنائی ہوئی جگہ پر جہاز کو کنٹرول کرنا شروع کیا۔ جہاز تھوڑی دور تک رینگتا رہا پھر اچانک اڑنا شروع ہوا۔ یہ اڑان کوئی ۱۲ سیکنڈ جاری رہی جس میں ۱۲۱ فٹ مسافت طے کی گئی پھر دوسری پرواز میں WILBUR نے ۸۵۰ فٹ طویل ۵۹ سیکنڈ میں طے کی۔

جہاز کو مزید ترقی دینے کے لیے تجربات کئی سال تک جاری رہے۔ دونوں بھائیوں نے اپنی کوششوں سے جہاز کی رفتار اور مسافت میں اضافہ کیا۔ ہوائی جہاز کو ترقی دینے کا کام یورپ میں بھی جاری رہا۔ جو اس کام میں فرانس کے BLERIOT اور برازیل کے البرٹ SANTOS DEMONT بہت پیش پیش تھے۔ یوں تو ہوائی جہاز میں آئے دن کئی ترمیمات ہوئے لیکن آج بھی دنیا کے بڑے سے بڑے ہوائی جہاز میں سیکل درست کرنے والے برادرس کا اصول ہی کام کر رہا ہے۔

ہوائی جہاز کی ایجاد سے دنیا سمٹ کر قریب آ گئی ہے۔ ہزاروں میل صرف چند گھنٹوں میں طے پا سکتا ہے اس سہولت سے ہم دنیا کے مختلف ممالک سیر سیاحت کے ذریعہ وہاں کی تہذیب و تمدن سے واقفیت حاصل کرنے ہو گئے ہیں رفتہ رفتہ ترقی یافتہ ممالک کے رہن سہن اور زندگی کے طور طریقے معاشرہ میں سرایت کرتے جا رہے ہیں جس سے ہماری تہذیب اور تمدن میں نمایاں فرق آ چکا ہے جو کہ خوش آیند ہے۔ ●●

سکندر توفیق

عہدِ حاضر، اسلام اور خانقاہی نظام

زیرِ نظر مضمون روایتی انداز سے ذرا ہٹا ہوا ہے اور اس کی ہر شق آزادانہ توجہ کی محتاج ہے۔ پہلی شق میں عہدِ حاضر کا تجزیہ، دوسری میں اسلام اور موجودہ سائنسی عہد میں عدم تصادم کی نشان دہی ہے تو تیسری شق میں اس خانقاہی نظام کا تذکرہ ہے جو ایک شاندار ترکہ GOLDEN HERITAGE کی حیثیت سے اب بھی افادیت کا حامل ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسے صحیح خطوط پر چلایا جائے ۔

عہدِ حاضر کا اگر غور سے جائزہ لیا جائے تو ہمیں جو چیز بین طور پر نظر آئے گی وہ ہے تحیّر یا SURPRISE کے عنصر کی عدم موجودگی ۔ یہ دعویٰ واضح ہونے کے باوجود دلیل کا محتاج ہے۔ شاید بعض ظاہر پرست یہ سوال بھی کر بیٹھیں کہ آخر (SURPRISE) یا حیرت کس طرح اور کدھر غائب ہوگئی ان کے تشفی بخش جواب کے لیے پچھلی چند دہائیوں (DECADES) پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے۔ سائنس اور انسانی علم کی مسلسل کامیابیوں نے احساسِ تحیّر کو کند بالکل زائل کر کے رکھ دیا ہے۔ جوہر کی تقسیم (EXPLOSION OF ATOM) چاند کی تسخیر CONQUEST OF THE MOON اور دل کی تبدیلی (HEART TRANSPLANTATION)

• بیتِ ثمین، تلک نگر، حیدرآباد۔ ۴۴

(TEST TUBE BABY) جیسے معرکتہ الارا سائنسی حادثات، جو معجزات سے کسی طرح کم نہیں۔۔۔ اس تیزی سے عمل میں آ رہے ہیں کہ ہمیں ان پر حیرت زدہ ہونے کی کافی فرصت بھی نہیں ملی۔ جس کے بارے میں ایک انگریزی شاعر کے اس عاجزانہ اعتراف کو دُہرایا جا سکتا ہے:

"WE HAD NO TIME TO STAND AND STARE."

اس رویّہ یا ATTITUDE کی صحیح تصویر کشی کے لیے مجھے اخباری زبان کی اصطلاح NEWS VALUE استعمال کرنے کی اجازت دیجئے۔ NEWS VALUE میں MOON WALK اور کسی کرکٹ کے کھلاڑی کی سنچری یا ڈبل سنچری یکساں اہمیت رکھتی ہیں، کیا اس صورتِ حال کی موجودگی میں یہ کہنا کہ آج کی تہذیب موزوں تحیّر SUITABLE SURPRISE کی لذّت کو کھو چکی ہے، اظہارِ حقیقت نہیں؟

اس تہذیبی رویّے CULTURAL ATTITUDE میں جو عدم توازن اور غیر آہنگی مضمر ہے اسے الفاظ میں بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ SPACE TRAVEL اور SPORT KNOCK کو یکساں اہمیت دینا غفلت شعاری اور سہل نگاری ہی نہیں ایک ناقابلِ معافی جرم ہے۔ کیوں کہ ہم اس طرح مقصدِ حیات LIFE OBJECTIVE سے بے خبری ہی نہیں کر رہے بلکہ زندگی کی دیدہ و دانستہ توہین کر رہے ہیں۔ اس جاہلانہ ناقدری کو مولانا روم نے انتہائی بلیغ انداز میں یوں بیان کیا ہے:

علم را بر تن زنی مارے بود

علم را بر دل زنی یارے بود

سائنس اور علم کی ان حیرتناک ایجادات اور دریافتوں کو ہم نے محض صنعت تک محدود کر دیا ہے اور صانعِ حقیقی کے ادراک سے غافل ہو گئے ہیں۔ اسی کے باعث وہ عدم توازن اور غیر آہنگی پیدا ہوئی ہے جس نے آج تہذیب کو (THRILLING SURPRISE) سے محروم کر دیا ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے کے دور میں نسبتاً کم علمی کے باوجود تہذیبی بلندیہ میں تحیّر کا عنصر موجود رہا جس کا ثبوت حضرت سعدی شیرازیؒ کا یہ مصرعہ

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار" اور کسی انگریزی شاعر کے یہ الفاظ:
"SERMONS IN STREAMS & BOOKS IN RUNNING BROOKS."
کافی ثبوت فراہم کرتے ہیں اور مشرق اور مغرب دونوں ہی جگہ زندگی کے بارے میں ایک سنجیدہ رویے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اسی سنجیدہ رویے کے باعث حیاتِ انسانی میں مذہب (چاہے وہ کوئی ہو) کی مجرد اہمیت یا (ABSTRACT VALUE) باقی تھی۔ اور اس طرح کے عدم توازن اور غیر آہنگی کا دور دورہ نہ تھا۔ جو آج موجود ہے۔ آج مذہب کے بارے میں جو DOMINENT یا غالب رویہ ہے وہ مذہب کو ایک LIFE FORCE سمجھنے کی بجائے PERSONAL ORNAMENT یا شخصی لوازم سمجھنے کا ہے مذہب آج اس خاطر خواہ توجہ سے محروم ہے جو اسے ملنی چاہیئے۔ پاکستان میں نظامِ مصطفےٰ کے قیام کی کوششوں سے قطع نظر عراق ایران جنگ اور فلسطین اور اسرائیل کے تنازعے کے موجودہ پس منظر میں میرا یہ کہنا کہ مذہب خاطر خواہ توجہ سے محروم ہے۔ پھر ایک تضاد نظر آئے گا لیکن علامہ خمینی کے اسلامی انقلاب کے بلند بانگ نعرے کے باوجود ایرانی انقلاب ان ضروری اجزائے ترکیبی سے محروم نظر آتا ہے جن کو اسلام میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ تیغ و تبر کے جہاد کے عین درمیان میں بھی محض زبان سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ادا کرتے ہی مشرک اور کافر کی جان بچ جاتی تھی لیکن اس نصِ قرآنی کے باوصف کہ ایک مسلمان کی عزت اور جان دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ محض اس بات پر جنگ کو طول دینا کہ جارحیت کا مرتکب کون ہوا ہے۔ ایک غیر دانشمندانہ اور ایک غیر اسلامی ضد کے سوا اور کچھ منظور نہیں۔ اسی طرح فلسطین اور اسرائیل کی جنگ وطن کی مٹی کے لیے ہے کسی مذہبی سچائی کے لیے نہیں۔
یہ تو رہا اسلام کا حال دوسرے مذاہب جن کی حیثیت آخری وحی یعنی قرآنِ حکیم کے لحاظ سے کالعدم (PROROGUED) یا منسوخ شدہ مذاہب کی ہے گو تکوینی مصلحت سے انھیں بالکل DISSOLVE نہیں کیا گیا ہے

ان کے پیرو بھی ایک سرد مہری کا شکار ہیں۔

اب رہے دہریہ اشتراکی ممالک تو وہ حاضر و موجود سے اتنے سحر زدہ ہو گئے ہیں کہ وہ غائب اور موعود کی طرف توجہ دینے کی سکت نہیں رکھتے۔ ورنہ اپنے ہاتھوں مصنوعی سیارہ (SATELLITES) چھوڑنے والی قوم اور اپنے چھوڑے ہوئے ان SATALLITES کے ORBIT میں REMOTE CONTROL کے ذریعے تبدیلی پیدا کرنے والی قوم کو مخبر صادق علیہ السلام کی اس پیشن گوئی پر ایمان نہ لانے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ قیامت کے قریب خدا بھی اپنے سورج کا ORBIT عارضی طور پر بدل کر اسے مشرق بجائے مغرب سے طلوع کر کے دکھا دے گا محض ایک کار فضول کے طور نہیں بلکہ اس بات کی مہیب علامت کے طور پر کہ اب در توبہ بند ہو چکا قدرت کی کاریگری' سمجھ بوجھ کی رہبری کر کے علم اور سائنس کے ذریعے معجزے دکھا رہی ہے لیکن خرد کے پھندوں میں گرفتار یہ کوتاہ نظر عقل دل تک پہنچنے ہی نہیں دیتے تاکہ وہ ان کا رفیق اور ہمدرد بن سکے اور تحیر کی سنت ابراہیمی یعنی مطالعہ مظاہر فطرت کے ذریعے خالق حقیقی کی معرفت کا ذریعہ بن جائے۔ تحیر کی یہ کمی' اگر غور سے دیکھا جائے تو عقل کے بلوغ کی پیدا کردہ ہے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی علامت بلوغ کے بعد بڑھاپا اور موت دور نہیں رہتے۔ گویا یہ ایک طرح سے قرب قیامت کی بھی علامت ہے اور یہ بات منطق کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے لیکن غائب اور موعود کے علم کے لیے سوائے وحی الٰہی اور پیغمبر رحمت کے کوئی اور ذریعہ توثیقی قوت نہیں رکھتا اور اسی لیے ایسے مذہب' جسے الوہی قبولیت (DIVINE SANCTION) حاصل ہو' ضرورت ہے اور خدا کی قبولیت کی سند رکھنے والا مذہب آج سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں۔

لیکن یہ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج غیر مسلم تو غیر مسلم اسلامی گھرانوں میں پیدا ہونے والے مغرب زدہ ایک عجیب لاپرواہی اور [illegible]

میں مبتلا ہیں بلکہ CONFUSED THINKING کے مرتکب ۔ ان کے دل میں یہ خیال بٹھا دیا گیا ہے کہ ۱۴ سو سالہ پرانا اسلام آج کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا گیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ مغرب کے مشہور نابغے SHAKESPEARE کی طرح قرآن حکیم بھی دنیا کو THE WORLD IS A STAGE قرار دے اور انسانی زندگی کو (ACTING) بتلائے عمل یا ACTION نہیں عمل بھی ایسا جو IS FULL OF SOUND AND FURY SIGNIFYING NOTHING ہو ۔

انسانیت SHAKESPEARE کی اس تشبیہ کو برسہا برس سے سراہتی آرہی ہے شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ یونانیوں کے PHILOSOPHER - KING کی جگہ آج ACTOR-PRESIDENT اور ACTOR RULER نظر آرہے ہیں آج کے مووی اور T.V. اسٹاروں کے چاہنے والوں کی بہتات ال متقین امامہ کی متقاضی بھی نہیں کیوں کہ دنیا کی موجودہ آبادی کے لیے یہ تناسب ۲ فی صد سے بھی کم ہے ۔

اور شاید تشبیہ کے بدل جانے سے شئے کی حقیقت بدل جاتی ہے ۔ قرآنی زبان میں دنیا کو مزرعہ آخرت کہا گیا ہے STAGE نہیں ۔ زندگی یا الحیاۃ الدنیا کو متاع COMMODITY OF INVESTMENT بتلایا گیا ہے ۔ جسے منظور شدہ طریقوں سے مشغول یا INVEST کرنے کا نتیجہ ۷ سے لے کر ہزار ہا گنا تک مل سکتا ہے ۔ یہ طرزِ فکر خود بخود ایک سنجیدہ رویہ کو جنم دیتا ہے، جب دنیا کو اسٹیج اور زندگی کو ڈرامہ سمجھنے کا غیر سنجیدہ رویہ انسان کی اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کا آئینہ دار ہے ۔

سیاسی طور پر جیو اور جینے دو اور SOCIAL COEXISTENCE کے نعرے محض ایک HALFTRUTH ہیں ۔ جن میں پھر مقصدِ حیات سے پہلو تہی کی گئی ہے ۔ ایسے عہدِ حاضر میں مذہب کا نام لینا محض تضیعِ اوقات کے سوا اور کچھ نہیں ۔ اپنے غیر سنجیدہ رویے کا اعتراف کرنے کی بجائے عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ سائنسی دور کے آجانے کے باعث مذہب کو مقبولیت

حاصل نہیں رہی اور اس کا شخصیت ساز اور دنیا سدھار کردار ختم ہو گیا۔ یہ بات دوسرے تحریف شدہ اور منسوخ کردہ مذاہب کے بارے میں صحیح ہو تو ہو اسلام جیسے دینِ فطرت کے بارے کسی طرح صحیح نہیں۔ وہ اسلام جو دعویٰ الٰہی کے مطابق تا قیامت رہے گا۔ ان درمیانی حادثوں سے بے خبر ہے نہ انھیں نظر انداز ہی کرتا ہے اور نہ ان کی موجودگی اسے جھٹلا ہی سکتی ہے اور نہ کسی بنیادی تصادم کا باعث ہو سکتی ہے۔ (یہ اور بات ہے کہ مسلمان ظاہری طمطراق میں کھو کر اپنے آپ کو بھول جائیں۔)

عموماً مغربی مفکرین کی کتابیں پڑھ کر جو تحریف کردہ یہودیت اور عیسائیت ہی سے واقف ہیں اور اسلام کی روح سے قطعاً ناواقف۔ سائنس کو مذہب کے زوال کا باعث بتلایا جاتا ہے اور مذہب اور سائنس کو دو متضاد قوتیں تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک قطعاً غیر اسلامی رویّہ ہے چناں چہ تاریخ کے مطالعے سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ (INQUISITION) اور اس کے نتیجے میں سائنس دانوں کو اختراع او ایجاد کے جرم میں زندہ جلا دینے تک کی سزائیں یورپ میں دی گئی ہیں۔ ارضِ عرب میں نہیں۔ کیوں کہ کوہِ فاران سے جس مذہب کا اعلان کیا اور پوری ارضِ عرب جس مذہب کا گہوارہ رہی ہے وہ صاف طور کہتا ہے کہ اللہ کو یاد کرتے رہنے والوں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ آسمان اور زمین کی خلقت پر غور و فکر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔ جو غور ہی نہیں کرتے بلکہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد اور باطل طور پر نہیں تخلیق کیا ہے۔ تیری ذات اس سے پاک ہے پس تو ہمیں اس آگ کے عذاب سے بچا۔

اسی وحی الٰہی یعنے قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ ہم نے تمام مظاہر کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے اگر انسانی فہم و فراست صنعت کے ساتھ صانع کا بھی ادراک رکھے تو وہ عدم توازن جس کا مضمون کی ابتدا میں تذکرہ کیا گیا ہے پیدا نہیں ہو سکتا ——————

(باقی آئندہ)

مولانا ہادی نقشبندی

برار میں اردو کی سرگرمیاں

(اخبارات و رسائل)

مہاراشٹرا کا مراٹھی نژاد علاقہ برار، جو کبھی عماد شاہیوں کا مسکن اور نوابانِ دکن کا مرجع رہا ہے۔ اردو کو اس علاقے میں مقبول اور عام بنا دیا جو شہروں سے گذر کر قصبات اور دیہات تک میں باوجود سرکاری و کاروباری زبان نہ ہونے کے مراٹھی کی طرح ایک عام بول چال کی زبان ہے۔ یہاں اردو "روزمرہ" دوسرے ہر صوبے کے "روزمرہ" کے مقابلے میں صحتِ زبان سے زیادہ قریب ہے۔ مغربی مستشرقین و ماہرین صوتیات کی رائے ہے کہ دولت آباد (دیوگری) اور چاندہ (چندرپور) کے درمیانی علاقے میں رہنے والے (جس میں برار واقع ہے) ہر زبان کو اس کی صوتی صحت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہیں۔ برار کو اس پر فخر و مسرت ہے کہ عام پسماندگی، بڑے بڑے علمی و ثقافتی مراکز سے دوری، علمی و ادبی ماحول کے فقدان، طباعت و اشاعت کی مشکلات کے باوجود اس علاقے نے اردو زبان کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں یہاں کے چار ضلعوں اور چوبیس تعلقوں میں سینکڑوں اردو پرائمری اور (۶۰) کے قریب اردو ہائی اسکول انتہائی کامیابی سے چل رہے ہیں جن میں بعض ہائر سکنڈری اسکول ہیں نیز دو درجے کے تقریباً ہر کالج میں اردو مضمون کی پڑھائی کا انتظام ہے۔

۵۔ عنایت منزل، بالاپور، ضلع اکولہ ——— مہاراشٹرا

اس مضمون کو صحافت برار تک محدود رکھتے ہوئے آئندہ سطور میں وقت کی کمی کے باعث دو دریبہ کی بجائے صرف برار کے اردو اخبارات و رسائل کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی موقعہ سے دو دریبہ کے اخبارات پر تفصیل سے لکھا جائے گا۔

برار میں انیسویں صدی کے آٹھویں دہے میں اردو صحافت کا آغاز اور پہلا اردو اخبار ۱۸۷۵ء میں جاری ہوا۔ کتابت و طباعت کی دقتوں کی وجہ اکثر دو ماہوار رسائل بیرون برار طبع ہوتے اور ہر صحیفہ نگار کے لیے اجرائے جریدہ قبل کتابت و طباعت کے ساتھ ذاتی پریس کا انتظام ضروری تھا۔ یہ ایک وجہ کتب و اخبارات کی طلب کے باوجود حسب ضرورت کتابوں کی اشاعت اور اچھا اخبار و رسالہ مستقل طور پر جاری نہ رہ سکا۔ یہاں کے شعرا، ادبا و مورخین وہ شہرت و حوصلہ افزائی نہ ہوئی جو دوسرے مقامات کے ادبا کو حاصل ہے ان مشکلات کے باوجود اکثر اخبارات نے طویل زندگی پائی اور ملک و ملت کی زبان و ادب کی بھی خدمت کرتے رہے۔

شمار	اخبارات	مقام اشاعت	مرتب، ایڈیٹر یا ناشر
۱	اردو اخبار، ہفتہ وار	اکولہ	مرزا کریم بیگ
۲	فیروز نگار، ماہوار	کھولاپور	منشی صادق علی قیصر
۳	نور البرار، دو ماہی	ایلچپور	مولانا خطیب سید عظمت
۴	سفیر برار، ہفتہ وار	امراوتی	مرزا عثمان بیگ
۵	خادم، ماہوار	״	خطیب سید مظفر
۶	موعظہ حسنہ،	اکولہ	
۷	البرہان، ہفتہ وار	״	سید زوار حسین عما
۸	البشیر، ماہوار	کھام گاؤں	محمد بشیر الدین البشیر ملکہ
۹	مرقع اردو، ماہوار	امراوتی	محمد ابراہیم شرار
۱۰	بہارستان، سہ ماہی	بالاپور	محمد علیم الدین ایم
۱۱	عزیز وطن، ہفتہ وار	پانڈر کوڑہ	منشی سجاد حسین

۱۲	جدت، ماہوار	اکولہ	قدیر النساء بیگم قاضی کریم الدین
۱۳	صحیفۂ عثمانی، ماہوار	کھام گاؤں	محمد ایوب صابر
۱۴	انیس، ماہوار	ایلچپور	محمد ابراہیم شرار
۱۵	ارمغان، سہ ماہی	بالاپور	ہادی نقشبندی
۱۶	بیداری، پندرہ روزہ	-	"
۱۷	محشر، ماہوار	ایلچپور	محمد ابراہیم شرار
۱۸	امن، ہفتہ وار	اکولہ	ڈاکٹر امام خاں صابر
۱۹	ہم لوگ، "	"	قاضی محمد علی ایم اے ایڈوکیٹ
۲۰	جمیعت "	"	محمد مردان علی نشاط
۲۱	طلب جدید "	امراوتی	حکیم عبدالاحد صاحب
۲۲	پیام "	"	قاضی شیخ احمد
۲۳	لیڈر "	اکولہ	محمد عطا افغانی
۲۴	آواز "	امراوتی	مشکل افکاری
۲۵	پرواز "	"	محمد علی بی اے ایل ایل بی
۲۶	منزل "	اکولہ	قاضی محمد علی ایم اے ایڈوکیٹ
۲۷	صحیفۂ انجمن، ششماہی	کھام گاؤں	محمد حفیظ اللہ خاں بدر
۲۸	تعبیر، ہفتہ وار	اکولہ	شیخ رمضان
۲۹	جاسوسی گردش پبلیکیشنز	"	سعید احمد خاں ایم اے

۱۔ **اردو اخبار** : آج سے پچانوے سال قبل جنوری ۱۸۷۵ء میں اکولہ سے مرزا کریم بیگ مرحوم نے "اردو اخبار" کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا۔ ابتدا ایک سال کتابی تختی پر شائع ہوتا رہا۔ بعد $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ کے اخباری سائز کے آٹھ صفحات پر علاقائی اور دوسری اہم خبروں نیز حکومت آصفیہ کے فارسی اعلانات و احکامات کے علاوہ کبھی کبھار نظمیں و غزلیں بھی شائع ہوتیں۔ اس پرچے سے قبل کسی اور اردو اخبار کی برار سے اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔ بلا شبہ یہ برار کا پہلا اردو اخبار ہے۔

۲۔ **فیروز نگار** : ۱۸۸۵ء میں کھولاپور ضلع امراوتی سے ظریفانہ ماہو

رسالہ منشی محمد صادق قیصر مرحوم نے جاری کیا جو قیصر المطابع لکھنؤ میں طبع ہوتا ۲۰×۲۶/۸ پر کم و بیش سولہ صفحات ہوتے۔ سرورق کے دوسرے صفحے کے مندرجۂ ذیل دستور العمل سے اس زمانے کی صحافت و زبان کا اندازہ ہوتا ہے:

"یہ مخزن الاخبار پُر از کوائف روزگار بلا قید تاریخ مہینہ میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ غزلیات، شعرا، نامدار، نعتیہ و عاشقانہ طرح و غیر طرح لطائف و ظرائف مع دلچسپ مضامین پولیٹیکل و سوشل و خلاصہ اخبار صوبہ برار مختصر خبریں تمام عالم اور ریولو اخبارات وغیرہ درج ہوتے ہیں۔"

۳۔ **سفیرِ برار**: ۱۹۰۸ء میں ۲۰×۲۶/۸ سائز پر مرزا عثمان بیگ مرحوم نے امراوتی کیمپ سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا جو صرف پانچ چھ سال ملک و ملت کی تعلیمی و سیاسی خدمت انجام دے سکا۔ برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۹ء میں قائم ہوئی جس کے ابتدائی سالانہ اجلاس امراوتی و اکولہ کی کامیابی کا سہرا "سفیر برار" کے سر ہے۔

۴۔ **نورُ الابرار**: ۱۹۰۹ء میں مورخِ برار حضرت علامہ خان بہادر مولانا مولوی سید امجد حسینؒ خطیب جامع مسجد دار السرور ایلچپور نے کتاب "تاریخ دکن" الملقب "ریاض الرحمٰن" المشہور بہ "تاریخ امجدی" مطبع خورشیدیہ حیدرآباد سے ۱۸۷۶ء میں فارسی میں طبع کروائی۔ اس "تاریخ امجدی" کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے حضرت ممدوح کے خلف اکبر خان بہادر مولوی خطیب سید عظمت حسین نے بلدہ ایلچپور میں ایک "مطبع نور الابرار" قائم فرماکر ۱۹۰۹ء میں اس پریس سے ایک تاریخی رسالہ "نور الابرار" جاری فرمایا جو زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ جس کی وجہ "تاریخ امجدی" کے اردو عکس "نور الابرار" کا کام تشنہ رہ گیا۔ اگر حضرت ممدوح کے ورثا نے تعاون کیا تو انشاء اللہ "دار الاشاعت خانقاہ نقشبندیہ بالاپور" اس ترجمے کو مکمل کرکے شائع کرائے گا۔

۵۔ **خادم**: خاندان خطیبان ایلچپور بوجہ خاندانی وقار، علم و فضل اور اپنی دینی و تعلیمی خدمات و ہمدردی قوم برار میں ایک ممتاز مقام کا حامل ہے۔ خان بہادر مولانا مولوی خطیب سید عظمت حسینؒ کے برادر مولوی خطیب سید مظہر حسین مظہر مرحوم جو عدالت جی ضلع امراوتی میں مترجم تھے ایک مطبع "اسلامیہ

پریس" عثمانیہ مسجد روڈ کیمپ امراوتی میں قائم فرماکر اسی بنگلے موسوم بہ "قیام گاہ"
۱۹۱۰ء میں ماہنامہ "خادم" جاری فرمایا (جہاں آج کل خاندانِ خطیبان کے ایک
ممتاز فرد صاحب علم و ذوق اور ہمدرد قوم جناب علاؤالدین احمد صاحب ایم اے
ایل ایل بی، جنرل سکریٹری برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مقیم اور ممدوح ہی کی توجہ و
عنایت سے اس میں صدر دفتر برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے) جس نے چند سال
برار کی علمی، سیاسی اور تعلیمی خدمت انجام دی جس کے ایڈیٹر خطیب مظہر مرحوم
خلف اکبر خطیب سید مظفر حسین مرحوم ایم اے ایل ایل بی (علیگ) (جو بعد میں
مدھیہ پردیش لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی لیڈر ہوئے) تھے۔ سرورق پر بطور موٹو یہ شعر
درج ہوتا: ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید او محروم شد

(۶) **موعظۂ حسنیٰ** : ۱۹۱۰ء میں اکولہ سے ایک مذہبی رسالہ جاری ہوا۔
آگرہ میں طبع ہوتا لیکن چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکا۔

(۷) **البرہان** : جنوری ۱۹۲۲ء میں سید زوار حسین عالی سبزواری
مرحوم نے برہان پور میں ایک مطبع "خورشید احمدی پریس" قائم کرکے ایک ہفتہ وار
۲۲×۱۸/۸ کے چھ صفحات پر "البرہان" برہانپور کی مناسبت سے نام رکھ کر جاری کیا
جو اواخر ۱۹۲۴ء میں سید مبین الرحمٰن مرحوم بی اے ایل ایل بی (علیگ) ایم ایل سی
کی توجہ و کوشش سے اکولہ منتقل ہوا۔ مبین مرحوم کے بعد ایک صاحب علم و ذوق بزرگ نواب
عبدالوحید خان صاحب غازی گیوردھا رئیس ناگپور نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی
اور یہ اخبار عالی مرحوم کی رحلت ۱۹۴۹ء تک مومن پورہ اکولہ سے ستائیس سال
پابندی سے اردو زبان و ادب و ملک و ملت کی خدمت انجام دیتا رہا۔ اس کی فائلوں
میں برار کی ربع صدی سے زائد عرصے کی ادبی لسانی، تعلیمی، سیاسی جد و جہد کی تاریخ
پنہاں ہے اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ایک ہی تنہا شخص اس کا مالک
ایڈیٹر، کاتب، طابع و ناشر تھا۔

(۸) **البشیر** : مارچ ۱۹۲۵ء سے کھام گاؤں سے محمد بشیر الدین صاحب بشیر
ملکاپوری نے ایک ادبی، شعری، مذہبی ماہنامہ "البشیر" جاری کیا۔ جس کے نام سے

پہلے سرِ ورق پر " براری اُردو کا ادنیٰ ثبوت " اور تحت میں یہ شعر ہوتا :

برائے اہلِ نظر بے نظیر آتا ہے خوشی کو ساتھ لیے البشیر آتا ہے

(۹) **مرقعِ اُردو** : گورنمنٹ محمڈن اُردو ہائی اسکول امراؤتی ۱۹۰۹ء میں قائم ہوا جس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مصطفیٰ خان مرحوم تھے ان کے بعد غالباً ۱۹۱۰ء میں خواجہ لطیف احمد جریح مرحوم (نبیرۂ خواجہ حالیؒ) بی اے (علیگ) بی ای ایس ہوئے۔ جریح مرحوم کا علی گڑھ اور اُردو سے پشتینی تعلق تھا۔ وہ بیک وقت سر سیدؒ اور حالیؒ کے اسکول کے نمایندہ، مذہبی و ملی درد سے سرشار ایک سچے و پکے مسلمان تھے۔ اپنی ذاتی جدوجہد سعی و کوشش اور اثرات سے اس اسکول کو مسلم یونی ورسٹی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنا دیا جامع مسجد مسلم یونی ورسٹی ہی کے نمونے اور شان کی "عثمانیہ مسجد" اس کے بعد دارالاقامہ، بازی گاہیں، مدرسے کی عمارات و متعلق تعمیر کروائے اور پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب صدیقی اور جناب قادر علی صاحب وغیرہ قابل و ہمدرد اساتذہ منتخب فرما کر اپنے دورِ ہیڈ ماسٹری میں مسلمانانِ برار کے بچوں کی اس طرح تعلیم و تربیت، علمی و ادبی ذوق اور ایسا ماحول پیدا کیا جس نے ابراہیم شرار، تصدق تاجی، غلام الثقلین خان اور رشید کیفی وغیرہ طالب علموں کو پروان چڑھا کر ایک بہترین مسلم نسل تیار کر دی۔ نیز اس دور کے ایک مسلم الثبوت شاعر محمد حیات خاں منظر مرتضیٰ پوری کا مجموعۂ کلام "افکارِ منظر" شائع کروایا۔

انہی کی یادگار میں خواجہ صاحب مرحوم نے ستمبر ۱۹۲۷ء میں اسی مدرسے سے جناب محمد ابراہیم صاحب شرار ایلچپوری کی ادارت میں "مرقعِ اُردو" جاری فرمایا۔ چوبیس صفحوں پر اولاً نگار مشین پریس لکھنؤ میں طبع ہوتا جسے بعد میں جناب محمد تصدق حسین تاجی اور دوسرے طلبائے مدرسہ بہ پابندی عرصۂ دراز تک نکالتے رہے اس پرچے نے طالب علموں میں علمی و ادبی ذوق کے ساتھ مضمون نویسی کا شوق پیدا کیا۔ چوں کہ یہ مدرسہ اپنے اوّلین دور میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتا تھا اس کے اظہار کے لیے طوالت ناگزیر تھی۔

(۱۰) **بہارستان** : برار میں شروع سے اُردو تعلیم کا شوق ہے۔ تحتانوی (پرائمری) اُردو مدارس کی کثرت کی وجہ معلمین کی تربیت کے لیے گورنمنٹ

نے امراوتی میں اُردو نارمل اسکول قائم کیا جو بعد میں کھنڈوہ اور وہاں سے ۱۹۵۶ء میں بالاپور منتقل ہوا جو آج کل "گورنمنٹ اُردو جونیر کالج آف ایجوکیشن" کے نام سے موسوم ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء میں اسی کالج سے ایک علمی ادبی، تعلیمی سہ ماہی رسالہ "بہارستان" جاری ہوا جو ابتداءً فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور میں $\frac{۳۰\times۲۰}{۸}$ سائز کے چھپن صفحوں پر طبع ہوتا جس کے نگراں سید حسین مرحوم ایم اے ایل ایل بی، ایل ٹی (سپرنٹنڈنٹ کالج) و مولوی محمد سلیم مرحوم منشی فاضل معلم ادبیات تھے۔ مدیر مسؤل عبدالوہاب صاحب قلمی معاونین محمد بشیر برہانپوری اور سید عنایت علی آغاز برہانپوری مرحوم رہے۔ آج کل یہ پرچہ دیال پرنٹنگ ورکس دہلی میں طبع ہوکر جناب قاضی شریف الدین احمد صاحب ایم اے بی ٹی کی نگرانی اور جناب محمد علیم الدین صاحب اکولوی ایم اے بی ایڈ کی ادارت میں حسب سنتِ دیرینہ شائع ہوتا ہے جس کا بیشتر حصہ تعلیمی مسائل سے متعلق ہے اور جو گذشتہ ۴۲ سال سے تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے۔

(۱۱) **عزیزِ وطن**: حضرت سید عبدالرؤف شاہ عاصی مرحوم نے دورِ خلافت سے وکالت چھوڑ کر سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ شعری و علمی ذوق بھی جاری رکھا۔ اگست ۱۹۲۸ء میں شاہ صاحب مرحوم کی سعی و کوشش اور مالی اعانت و نگرانی میں پانڈرکیوڑہ ضلع ایلوت محل سے منشی سید سجاد حسین اسرار مرحوم کی ادارت میں (جو اس سے قبل ناگپور سے ہفتہ وار "الحق" اور "اردو اخبار" نکال چکے تھے) جاری ہوا لیکن کچھ دنوں بعد اوائل ۱۹۲۹ء میں پانڈرکیوڑہ سے محمد شرف الدین شرف مرحوم ایڈ، کیٹ کی سرپرستی حاصل کرکے امراوتی منتقل ہوگیا چونکہ مرحوم خود اپنے "عزیزِ وطن پریس" کے کاتب و طابع تھے لہٰذا پریس میں اخبار کے علاوہ دوسری کتب اور رسالہ "مرقعِ اردو" و "بہارستان" وغیرہ بھی طبع ہوتے رہے اور اس طرح منشی مرحوم ایک عرصے تک اپنے پریس "عزیزِ وطن" کے ذریعے خدمتِ اُردو و ملی انجام دیتے رہے۔

(۱۲) **عفت**: ۱۹۳۰ء میں برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دسواں اجلاس ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد مرحوم کی صدارت ۳۰-۳۱ کو ایلچپور میں منعقد ہوا، جس کے لیڈیز

سلسلہ کی ایک تجویز کی تکمیل میں محترمہ قدیر النساء بیگم صاحبہ مرحومہ اہلیہ جناب قاضی سید کریم الدین صاحب مرحوم ایڈوکیٹ ایلوت محل نے کانفرنس کے فوراً بعد اکولہ سے خواتین کا ایک ماہوار علمی، ادبی رسالہ "عفت" اپنی ادارت میں جاری کیا۔ ۴۲ صفحوں پر خورشید احمد پریس اکولہ میں طبع ہوکر ایک سال جاری رہا جو امور خانہ داری کے ساتھ اصلاح نسواں کے مختصر معلوماتی مضامین سے مزین خوبصورت گٹ اپ میں شائع ہوتا۔

(۳) **صحیفۂ عثمانی** : طلبائے انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں کا علمی ادبی مصور ماہنامہ جو جناب محمد ایوب صاحب صابر کی ادارت اور حکیم خطیب سید شبر حسین ایلچپوری مرحوم کی نگرانی میں اگست ۱۹۳۰ء سے مارچ ۱۹۳۱ء تک جاری رہا۔ معیاری، علمی، ادبی، تاریخی، معلوماتی، متنوع مضامین ہوتے جن میں اکثر علاقائی مسائل سے متعلق، شعری حصے میں زیادہ تر تبرکات، اعلیٰ جلی کتابت، دبیز کاغذ، بہترین گٹ اپ $\frac{20 \times 30}{8}$ کے ۳۲ تا ۴۸ صفحوں پر فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور میں طبع ہوتا۔ طلبا و اساتذہ کے ساتھ اکابر برار کے مضامین بھی شامل رہتے۔

(۴) **انیس** : جناب محمد ابراہیم صاحب شرار بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ ایلچپور کو زمانہ طالب علمی ہی سے علمی و ادبی ذوق اور صحافت سے دلچسپی رہی ہے جنوری ۱۹۳۵ء میں اپنے وطن ایلچپور سے ایک ذاتی علمی و ادبی ماہنامہ "انیس" چالیس صفحوں پر نکالا جو یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں طبع ہوتا۔ باوجود مختصر ضخامت کافی متنوع، دلچسپ اور ہر ذوق کی تکمیل کے ر!عد اپنے وزن و مرتبے میں یہ کسی بڑے معیاری ضخیم پرچے سے پیچھے نہیں تھا۔

(۵) **ارمغان** : انجمن ترقی اردو (ہند) بالاپور نے انعقاد "اردو ہفتہ" کے بعد جو بابائے اردو مولوی عبدالحق وغیرہ کی صدارت میں ہوا تھا۔ دسمبر ۱۹۳۷ء میں ایک علمی، ادبی، لسانی تماہی مجلہ "ارمغان" جاری کیا جو $\frac{20 \times 30}{8}$ کے چھیانوے صفحوں پر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوکر دفتر انجمن بالاپور سے راقم کی ادارت میں شائع ہوتا۔ اس کے اجرا کا مقصد علاقائی لکھنے والوں کے مضامین کی اشاعت اور نوخیز نسل کی حوصلہ افزائی تھا جب یہ مقصد پورا ہوتا نظر نہیں آیا تو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مشورہ سے بند کردیا گیا۔

(باقی آئندہ)

مصنف: امین مالوف   مترجم: قاضی جلیل احمد

صلیب کے سائے میں

قاضی جلیل احمد ۔ ریٹیر علاقہ اورنگ آباد دکن کے قاضی خاندان کے چشم و چراغ اور جامعہ عثمانیہ کے مایہ ناز سپوت ہیں۔ چند سال حیدرآباد میں سرکاری ملازمت سے منسلک رہ کر تقریباً ۳۰ سال قبل انگلستان منتقل ہوئے۔ دیارِ غیر میں بھی پڑھنے کی عادت چھوڑی نہ لکھنے کی۔ روزنامہ سیاست حیدرآباد کے مکتوب لندن کے نامہ نگار کی حیثیت سے قاضی جلیل احمد کے مکتوب بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ عرب ممالک کے حالات پر بھی قاضی صاحب کی نہایت گہری نظر ہے۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بارے میں نہایت دلچسپ انداز میں قاضی صاحب نے ایک کتاب "البدر" لکھی جو ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی اور "شاداب" میں قسط وار شائع ہو کر قبولِ عام کی سند پا چکی ہے۔

اب قاضی جلیل احمد نے مشہور عرب مصنف امین مالوف کی تصنیف "صلیب کے سائے میں" کو اپنے دلآویز ترجمہ کے ذریعے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ کتاب ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس پر عیسائیوں کے قبضہ سے شروع ہوتی ہے۔ بعد کے حالات کا تجزیہ امین مالوف نے نہایت مہارت و چابکدستی سے کیا ہے اور قاضی جلیل احمد کے پرکشش ترجمہ نے نہایت کامیابی کے ساتھ ان جذبات و کیفیات کی ترجمانی کی ہے جسے ایک عرب نے عرب دنیا کے بارے میں لکھا ہے۔ اسلامی دنیا کی موجودہ کیفیت کے پیش نظر "صلیب کے سائے میں" قسط وار شاداب میں پیش کی جا رہی ہے۔ یقین ہے کہ قارئین شاداب اس پیشکش کو پسند کریں گے۔ ادارۂ شاداب کو قارئین کے تاثرات کا انتظار رہے گا۔ (ایڈیٹر)

حرفِ آغاز

٭ برہنہ سر اور ژولیدہ مو قاضی ابو سعد ہروی خلیفہ مستظہر باللہ کے دربار میں درّاتا ہوا گھس آیا، اس کے پیچھے ماتم گساروں کی ایک ٹولی گریاں و ماتم کناں دربار میں داخل ہوئی۔ یہ لوگ اس کے ہر لفظ کی تصدیق کر رہے تھے۔ اسی کی طرح ان کے سر منڈھے ہوئے اور داڑھیاں لمبی لمبی تھیں۔ بعض درباریوں نے انھیں خاموش کرنے کی کوشش کی لیکن الہروی انھیں حقارت سے پرے دھکیلتا ہوا وسطِ دربار تک پہنچ گیا اور پھر ایک مشاق خطیب کی طرح یوں گویا ہوا۔

"یا معشر المسلمین تم کیونکر عیش و آرام کی نیند سو سکتے ہو اور باغ کے پھولوں جیسی بے کار اور بے مصرف زندگی بسر کر سکتے ہو جب کہ ملک شام میں تمہارے ہی بھائی بندوں کے لیے اونٹ کی پیٹھ اور گدھوں کے شکم کے سوا اور کوئی ٹھکانا باقی نہیں رہ گیا ہے۔ خونِ مسلم ارزاں ہو گیا ہے۔ حسین و شہزادیاں اپنی بے آبروئی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہیں۔ کیا بہادرانِ عرب اور شجاعانِ عجم اہلِ اسلام کی اس بے عزتی کو یوں چپ چاپ ہی سہہ لیں گے؟"

اس کی اس تقریر نے سامعین کو خون کے آنسو رُلا دیا اور اُن کے دلوں کو مسوس کر رکھ دیا لیکن الہروی ان سے محض آنسوؤں کا خراج لینے تو نہیں آیا تھا۔

"آنسو! تمہارا سب سے نکما ہتھیار ہے"۔ وہ گرجا۔

"اس وقت جب کہ فرنگی جنگ باز جنگ کی آگ دھکا رہے ہیں کیا تم صرف آنسو بہانے پر اکتفا کرو گے؟"

اگر اس نے دمشق سے بغداد تک کا یہ تکلیف دہ سفر گرما کی چلچلاتی دھوپ میں تین ہفتوں کی کٹھن منزلیں طے کر کے کیا تھا تو اس کی غرض و غایت رحم اور ہمدردی کی بھیک مانگنا نہ تھی بلکہ اسلام کے کرتا دھرتاؤں کو اسلام پر نازل ہونے والی مصیبت سے آگاہ کر کے انھیں عمل کے لیے اکسانا تھا تاکہ فرنگی حملے سے جو تباہی اس علاقے میں نازل ہوئی تھی اس کا سدّباب ہو سکے۔

"مسلمانوں کو کبھی ایسی ذلت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا" الہروی نے پھر

کرنا شروع کیا۔ "مسلمانوں کے ملک کو اس سے پہلے کبھی اس بے دردی سے پامال نہیں کیا گیا تھا۔"

اس کے ساتھی جنھوں نے اس کے ساتھ اس طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کی تھیں اُن ہی تباہ شدہ علاقوں کے بچے کچھے لوگوں میں سے تھے، ان میں بعض وہ بھی تھے جنھوں نے القدس کی بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ قاضی ہرادی انھیں بطور خاص اسی غرض سے اپنے ساتھ لایا تھا تاکہ بغداد کے لوگ القدس کی تباہی اس کے چشم دید گواہوں کی زبانی سنیں۔ یہ تباہی صرف ایک ماہ قبل نازل کی گئی تھی۔

جمعہ ۲۲ر شعبان ۴۹۲ھ مطابق ۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء کو فرنگیوں نے چالیس دن کے محاصرے کے بعد بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا لیکن شہر کی تسخیر کا حال بتانے والے اس وقت بھی ان لمحوں کی دہشت سے کانپ رہے تھے۔

وہ فضا میں یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ سرخ بالوں والے لرزہ خیز گورے چہرے جنھوں نے القدس میں قیامت برپا کی تھی اس وقت بھی انھیں دکھائی دے رہے ہوں۔ برہنہ تلواریں ہاتھ میں لیے، سر سے پیر تک زرہ بکتر سے ڈھکے، ان کی تلواروں سے نہ عورتیں محفوظ تھیں اور نہ بچے اور نہ بوڑھے اور ضعیف ہی ان سے کسی رحم کی توقع کرسکتے تھے۔ تباہی اور بربادی سے نہ مسجدیں محفوظ تھیں اور نہ مکان۔

دو دن بعد جب جدال و قتال بند ہوا تو شہر میں ایک مسلمان بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ بعض جو اس افراتفری سے فائدہ اُٹھا کر بھاگ سکے وہ بھاگ گئے۔ باقی ہزاروں اپنے ہی گھروں کے آنگن میں یا پھر مسجدوں کے صحن میں خاک و خون میں تڑپتے چھوڑ دیے گئے۔ ان مرنے والوں میں امام بھی تھے اور علماء بھی، صوفی بھی تھے اور راہب بھی۔ جو اپنے ملکوں سے ہجرت کرکے اس مقدس شہر میں پاک باز زندگی بسر کرنے کے لیے آئے تھے۔ جو کچھ تھوڑے سے لوگ بچے رہے انھیں مجبور کیا گیا ان مرنے والوں کی لاشوں کو ڈھو کر میدان میں لے آئیں اور ان کے ڈھیر یکجا کرکے ان میں آگ لگاتے رہیں اور جب یہ خدمت خلق اختتام کو پہنچی تو ان میں سے بعض کو تہہ تیغ کردیا گیا اور بعض کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔

مسلمانوں کی طرح یہودیوں کی حالت بھی زار تھی۔ جنگ کی ابتدائی ساعتوں میں یہودیوں نے بھی اپنے علاقوں کے دفاع کی کوشش کی لیکن جب شہر کی دیواروں میں رخنے پڑے اور فرنگی نائٹ سر سے پیر تک مسلح گھوڑے دوڑاتے ہوئے اندر داخل ہونے لگے تو یہودیوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ شہر کے سب سے بڑے صومعہ میں جمع ہو کر دعا کرنے لگے کہ خدا اس آفت کو ان کے سر سے ٹال دے حملہ آوروں نے صومعے کا محاصرہ کر لیا اور پھر اس کے اطراف ایندھن کے ڈھیر جمع کر کے ان میں آگ لگا دی۔ کچھ یہودی تو معبد کے اندر ہی ڈھیر ہو گئے اور جو باہر نکلے وہ فرنگی تلواروں کا شکار رہنے۔

اس سانحے کے چند روز بعد جو چند مہاجر یروشلم سے دمشق کو روانہ ہوئے وہ اپنے ساتھ حضرت عثمانؓ کا قرآن بھی لیتے گئے جو دنیا میں قرآن کا سب سے قدیم نسخہ کہلاتا ہے اور جس کی حضرت عثمانؓ اپنی شہادت کے وقت تلاوت کر رہے تھے۔ اہلِ یروشلم کا یہ بے خانماں قافلہ جب شہرِ دمشق کی فصیل کے نیچے پہنچا تو انھوں نے جا نمازیں بچھا کر سجدہ شکر ادا کیا۔ ابو سعد ہرادی قاضی دمشق نے اس قافلہ کا بڑے احترام و محبت کے ساتھ استقبال کیا اور ان کو اپنے شہر میں پناہ دی۔ دمشق کا یہ افغانی النسل قاضی شہر کی سب سے معزز اور قابلِ احترام شخصیت گنا جاتا تھا۔ اس نے اہلِ فلسطین کو نہ صرف پناہ دی بلکہ انھیں آگے کا راستہ بھی سمجھایا۔ اس نے انھیں تسلّی دی کہ ایک مسلمان کے لیے ہجرت باعثِ شرم و ندامت نہیں بلکہ باعثِ عزّ و شرف ہے کیوں کہ خود نبی خدا صلعم نے بھی تو مکّے سے مدینے کی ہجرت فرمائی تھی اور پھر اسی مدینے سے اسلام کا جہاد شروع ہوا تھا اور مکّہ ایک بار پھر بتوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا القدس کے ان مہاجرین کو بھی اپنے آپ کو مہاجر نہیں بلکہ مجاہد سمجھنا چاہیئے۔

اور امرِ واقعہ بھی یہی ہے کہ ہجرت ہر مسلمان پر واجب سمجھی جاتی ہے اگر ملک پر غیر کا قبضہ ہو جائے۔ مشہور اسپینی سیاح ابنِ جبیر جو اس واقعہ کے ایک سو سال بعد ارضِ فلسطین سے گذرا تھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مسلمان ابھی تک ان فرنگیوں کے زیرِ نگیں زندگی بسر کر رہے ہیں اور انھیں وطن کی محبت اتنی عزیز ہے کہ

ہے کہ وہ ہجرت کرکے کسی مسلم ملک میں جانے کا قصد بھی نہیں کرسکتے۔
خدا کے حضور ان کا کوئی عذر کام نہیں آسکے گا۔" وہ اپنے سفرنامے میں
ھتا ہے۔ "کسی مسلمان کے لیے کسی غیر مسلم علاقہ میں رہنا جائز نہیں سوائے اس کے
یہ قیام دوران سفر عارضی نوعیت کا ہو۔'
کیوں کہ اسلامی ملکوں میں سے ان تکلیفوں اور برائیوں سے نجات ملتی ہے
ن سے عیسائی ملکوں میں وہ دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً عیسائی ملکوں میں پیغمبر خدا صلعم
ے متعلق جو نازیبا کلمات سنائی دیتے ہیں' یا غسل و طہارت کی مشکلات یا
سوروں اور بد جانوروں کے بیچ زندگی بسر کرنی۔ خبردار۔ خبردار۔ ان کے
ملکوں میں رہنے سے احتراز کرو۔ تم کو خدا سے معافی مانگنی چاہیئے اور اس کے رحم
تلاش کرنی چاہیئے' اپنے اس گناہ کے لیے۔ ایک اور عذاب عیسائی ملکوں میں
ہنے کا یہ بھی ہے کہ اپنے ہی بھائی بندوں کو قید و سلاسل کی مصیبتیں جھیلتے دیکھنا
پڑتا ہے' جس سے دل ٹکڑے جگر چھلنی ہو جاتا ہے۔

ابن جبیر کے یہ الفاظ اسلام کے نہ سہی لیکن عام مسلمانوں کے جذبات کی
صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے جذبات کی جو ۱۰۹۹ء میں القدس اور
دیگر بلاد فلسطین و لبنان سے ہجرت کرکے دمشق میں جمع ہو گئے تھے۔ اگرچہ اپنا ملک
چھوڑنے پر ان کا دل خون کے آنسو بہاتا تھا پھر بھی انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ دیگر بلادِ
اسلامیہ میں مسلمانوں کے جذباتِ حریت کو بیدار کرکے ان کے حکمرانوں کو فرنگیوں
کے اخراج کے لیے کارروائی کرنے پر آمادہ کریں گے۔ الہرادی کے ساتھ بغداد کا
پُرصعوبت سفر اختیار کرنے کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ امیر المومنین
اور نائب رسول سے اپنی داستانِ غم بیان کرکے امداد کے طالب ہوں۔
لیکن بغداد میں ان کی امیدیں یاس و حرمان میں تبدیل ہو گئیں۔ خلیفہ
المستظہر باللہ نے ان کی مدارات و دلجوئی میں تو کوئی کمی نہیں کی لیکن جہاں تک عملی امداد
کا تعلق ہے معاملہ صفر سے آگے نہ بڑھ سکا۔ حالات کا جائزہ لینے کے لیے خلیفہ
نے سات بڈھوں کی ایک کمیٹی بٹھائی اور اُسے حالات کی جانچ پڑتال کے بعد

سفارشات پیش کرنے کا حکم دیا لیکن یہ وضاحت تحصیل حاصل ہوگی کہ کمیشن نے کوئی سفارش کی نہ کوئی تجویز پیش ہوئی۔

یروشلم پر فرنگی قبضے نے بلادِ اسلامیہ میں کوئی ہلچل پیدا نہیں کی، کسی کے کانوں پر جوں تک بھی نہیں رینگی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تقریباً نصف صدی تک ممالک عرب نے اہلِ فرنگ کی اس یلغار کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ نصف صدی تک قاضی القضات ابو سعد الہروی کی للکار صدا بہ صحرا ہی رہی۔ نصف صدی تک عرب حکمراں اس صلیبی یلغار کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اس کے امکانات کا پوری طرح جائزہ لینے سے قاصر رہے۔ بعض لوگوں نے فوری طور پر اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھال لیا۔ بعض نے حالات کے سامنے سپر ڈال دی اور شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن کا وطیرہ اختیار کیا۔ بعض لوگوں نے حالات پر لاتعلقی کے انداز سے سوچنے پر اکتفا کیا۔ مثلاً دمشق کا وقائع نگار ابن قلانسی ہی کو لیجیے۔ وہ ایک متمول اور باعزت گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اس صلیبی یلغار کے جو حالات درج کئے ہیں وہ ان لوگوں کے بیان کردہ جو کسی نہ کسی طرح اس فرنگی دار و گیر سے متاثر ہوئے تھے لیکن شروع سے آخر تک اس کا طرزِ تحریر ایک ایسے شخص ثالث کا سا ہے جسے اس ہولناک حادثے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ ان محاربات کا محض ایک روزنامچہ کے طور پر احاطہ کرتا ہے۔

اس دلچسپ داستان کی دوسری قسط
آئندہ مہینے پڑھیے ــــــــ

اُردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنا، اُردو کی زندگی اور ترقی کا ضامن ہے۔

عابد صدیقی

ہندوستانی عوام کے شعور کا سفر

عالمی نقشہ پر ہندوستان ایک طاقت بن کر اُبھر رہا ہے۔ بین الاقوامی معاملات
ہمارے ملک کے رول کو دنیا بھر میں پسندیدگی کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے
جانب دار ملکوں کی قیادت کے ساتھ ساتھ کسی بھی تنازعہ کی یکسوئی کے سلسلے میں
وستان کا مثبت رول عالمی امن، باہمی میل جول اور پُرامن بقائے باہم پر ہمارے
متزلزل اور اٹوٹ ایقان کی علامت ہے۔

گذشتہ چار دہوں کے دوران ہم نے سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ معاشی
ں کو ایک انقلابی اور خوش آیند موڑ دیا ہے، آزادی کے بعد سب سے بڑا مسئلہ
ریت کا قیام اور استحکام تھا۔ چناں چہ سیاسی جماعتوں اور عوام کی جانب سے
ری قدروں کو مستحکم بنانے کے لیے کامیاب کوششیں کی گئیں۔ اس مدت میں
ے بھر میں انتخابات ہوئے اور جمہوریت کی حقیقی روح عوام کی زندگی کا ناقابل
ر عنصر بن گئی۔

گذشتہ ۳۶ ـ ۳۷ برسوں کے دوران ان دنیا کے کئی ملکوں میں جمہوریت
ٹ اور سسکتی رہی اور کہیں کہیں تو شخصی اقتدار اور فوجی حکمرانی کے غیض و غضب
جمہوریت کا کھلتا ہوا پھول مرجھا گیا لیکن ہندوستان میں جمہوریت نے حُسن
تی اور توانائی حاصل کی۔ یہی در اصل اس ملک کے عوام کا عظیم کارنامہ ہے۔
دی کے بعد دوسرا بڑا مسئلہ قومی اتحاد کا تھا۔ خاص طور پر ایسے ملک میں
ں مذہب، زبان، ذات پات اور علاقوں کی عدم یکسانیت پائی جاتی ہے۔
م اس قدر آسان نہ تھا۔ ۳۸ برس کی تاریخ کے اوراق الٹیے تو ہمیں ہر دور میں

اور ہر مرحلہ میں قومی اتحاد کا بانکپن صاف جھلکتا دکھائی دے گا۔ ۷۰ کروڑ سے زائد آبادی والے ملک میں یک جہتی اور اتحاد کا استحکام کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ چند فرقہ وارانہ ہنگاموں، علاقائی تنازعات اور لسانی اختلافات کو اگر ہم دوسرے ملکوں کے حالات کے تناظر میں دیکھیں تو ان کی اہمیت سمندر میں ایک قطرہ کی سی ہو جاتی ہے۔

سیاسی آزادی کے بعد ہمارے ملک کے حکمرانوں اور قائدین کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ عوام کو معاشی آزادی سے بھی ہمکنار کیا جائے۔ ۸۰ فیصد دیہات پر مشتمل ہندوستان اپنی آزادی کے وقت ایک پسماندہ اور غریب ملک تھا جہاں زراعت ہوتی تھی، کھیت لہلہاتے تھے لیکن کسان روایت پرستی اور توہمات کے اسیر تھے۔ ہل اور بیل کے سہارے فصلیں کٹتی تھیں۔ مہاجنوں کے استحصال سے زرعی مزدوروں کی زندگی موت سے بھی بدتر صورتِ حال کا شکار تھی۔ ان ۴۸ برسوں کے عرصے میں ہم نے ۲ ـــ ۵ سالہ منصوبے طے کئے ہیں، معاشی ترقی کا یہ سفر اس قدر خوشگوار رہا کہ اب کسان ٹریکٹرس، کیمیائی کھاد، عمدہ قسم کے بیجوں کے ذریعے کاشت کاری کرتا ہے۔ سبز انقلاب نے ہندوستانی کسان کو نہ صرف ایک خصوصی موقف دیا ہے بلکہ ہماری زراعت کو ایک نشاۃ ثانیہ حاصل ہوا۔ چھٹے پنج سالہ منصوبے کے ختم تک ہماری زرعی ترقی نے غذائی اناج کے معاملے میں ہم کو خود مکتفی بنا دیا ہے۔ اب ملک میں پہلے کی طرح اناج درآمد نہیں کیا جاتا بلکہ اب تو صورت حال یہ ہے کہ ہم بعض ملکوں کو اناج برآمد کرنے لگے ہیں۔ ساتویں پنج سالہ منصوبے میں بھی زرعی انقلاب کی اس اسپرٹ کو نہ صرف برقرار رکھا گیا ہے بلکہ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنایا جائے۔ پیداوار کو دوگنی حد تک بڑھایا جائے اور زرعی مزدوروں کو امن و چین کی زندگی فراہم کی جائے۔

ملک کی آزادی کے بعد صنعتی شعبے میں ہم نے ایک ایسے دور کا آغاز کیا ہے جس میں نہ تو مشینوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی اور نہ ہی فیکٹریوں سے

تا ہوا دھواں دکھائی دیتا تھا۔ ہر شے بیرونی ملکوں کی رہین منت تھی،
ندگی کی ہر ضرورت کے لیے ہمیں برطانیہ اور دوسرے ملکوں کے آگے اپنا
ستہ گدائی پھیلانا پڑتا لیکن جواہر لال نہرو کی دوراندیشی، تدبر اور جدید
خیالات سے آراستہ ان کی فکر و نظر نے ہندوستان کو صنعتی شعبوں کے نئے
ت سے روشناس کرایا۔ رفتہ رفتہ ملک بھر میں صنعتوں کا جال پھیلایا گیا
دوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک زندگی کی ہر ضرورت کی تکمیل صنعتی ترقی سے
ن ہو گئی۔

جواہر لال نہرو نے ہر ناممکن بات کو ممکن کر دکھایا صنعتی میدان میں
ری ترقی سے پوری قوم میں اعتماد اور عزت نفس کا احساس جاگ اٹھا
رقی کا یہ شعور ہماری قومی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اب ساتویں
سالہ منصوبے میں بھی معیشت کو زیادہ مستحکم بنانے کے لیے صنعتی اور
یکی ترقی پر زور دیا جا رہا ہے۔ ہر دفتر کارخانے اداروں میں کمپیوٹر کا
اج ہمارے تیز رو مستقبل کی نشان دہی کر رہا ہے۔ وزیر اعظم راجیو
ندھی، اس بات کے خواہاں ہیں کہ اکیسویں صدی کا ہندوستان کمپیوٹر،
رنئی ٹکنالوجی سے لیس رہے صنعتی ترقی کے ذریعہ روزگار کے امکانات
ھتے جا رہے ہیں عوام کو آرام پسند زندگی گزارنے کے مواقع دستیاب
رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر خود اعتمادی کا رجحان غلبہ پا رہا ہے
سی قوم یا ملک کی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

زرعی اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی زندگی میں سماجی انصاف
لین اہمیت رکھتا ہے اگر سماج ناہمواری، امتیازات اور دیگر کئی طرح کی
زیوں کا شکار ہو جائے تو سماجی انصاف کے حصول کا خواب شرمندۂ تعبیر
رہے گا۔

ہندوستانی سماج ایک عرصہ تک روایت پرستی، رجعت پسندی اور
ہم پرستی کا شکار تھا۔ ذات پات کے امتیازات کے باعث سارا سماج
کھلا نظر آتا۔ یہ ساری لعنتیں آہستہ آہستہ مٹتی جا رہی ہیں۔ حکومت

کی جانب سے سماجی انصاف کے لیے کئی طرح کے اقدامات کیے گئے۔ پسماندہ طبقوں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کو کئی طرح کی دستوری مراعات دی گئی تھیں تاکہ وہ اپنی سماجی پسماندگی کے دلدل سے نجات پائیں، اقلیتوں کے لیے علاحدہ کمیشن قائم کیے گئے، ان سب کا مقصد یہی تھا کہ سماج کا کوئی بھی طبقہ خود کو کمزور یا مظلوم نہ محسوس کرے۔ ہندوستانی سماج میں جہیز کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے سرکار نے قانون منظور کیے تاکہ خاندان کی بنیادیں تجارتی رجحان کے بجائے حسن وسلوک اور باہمی میل جول پر قائم ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی سماجی انصاف کی منزل سے ہم ہمکنار نہیں ہو پائے لیکن ہمارے ذہن و فکر کی ترقی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جیسے جیسے ذہن و دل سے جہالت کے اندھیرے چھٹتے جائیں گے ویسے ویسے ہمارے قلوب رواداری، احترام آدمیت اور خلوص کی روشنیوں سے معمور ہوں گے امتیازات کی دیواریں منہدم ہوجائیں گی اور انسانی رشتوں کی بنیاد پر ہندوستانی سماج کی فلک بوس عمارت مستحکم اور پائیدار ہوگی۔

ہندوستانی جمہوریت اب شعور و فکر کی پختگی کی سرحدوں میں اپنے قدم رکھ رہی ہے اس لیے ہمیں توقع ہے کہ تعلیم کی وسعت، تجربوں کی دولت اور ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دینے والی خدمت کے ذریعہ ہم اس ملک کو ترقی، کامیابی، استحکام اور خوشحالی منزلوں تک لے جائیں گے۔ ہم نے اس عرصہ میں سمتوں کا تعین کرلیا، راستوں کی شناخت بھی ہوگئی۔ عوام کے دلوں میں جذبوں کو موجزن کردیا اور ارادوں اور عزائم میں استقامت بھی پیدا کرلی لیکن اب صرف ضرورت اسی بات کی ہے کہ ہمارے شب و روز ان ہی منزلوں کی سمت رواں دواں رہیں۔ یہی ہندوستان کی آزادی کی حقیقی منزل اور جمہوریت کی کامیابی کا نقطۂ عروج ہے۔

ہندوستانی عوام کے شعور کا یہ سفر پُرخطر بھی ہے اور دشوار بھی لیکن منزل اتنی دور نہیں

خدابخش لائبریری پٹنہ میں
چند لیکچر

مغلیہ عہد میں مذہب اور سیاست : منیسوٹا یونیورسٹی، امریکہ
اسکالر ڈاکٹر ساجدہ علوی نے اپنے لیکچر جہانگیر کے حوالہ سے پیش کرتے ہوئے
جہانگیری کی سیاسی اور مذہبی حالت اور جہانگیر کی انتظامی اور مذہبی پالیسی پر
پوری روشنی ڈالی۔ محترمہ ساجدہ علوی نے معتمد خاں' کامگار حسینی' اخلاق جہانگیری
موعظ جہانگیری اور آداب پادشاہان کی صنف کے دو مصنفین دو مصنفین
باقر نجم ثانی اور قاضی نورالدین خافقانی کے حوالہ سے اس عہد کا تفصیلی جائزہ پیش
تے ہوئے بتایا کہ مغل حکمراں مذہب کی تبلیغ اور شریعت کی حفاظت کو اپنا
طمح نظر بنانے کے بجائے سیاسی و سماجی عدل کے قیام کو زیادہ اہمیت دیتے
ے جہانگیر اگرچہ علما اور صوفیہ سے عقیدت رکھتا تھا لیکن حکومت کی پالیسی کے
سلسلے میں علما سے کوئی مشورہ نہیں لیتا تھا۔ یوں وہ عبدالحق محدث دہلوی'
د عالم گوسائیں جذروپ دونوں سے قریب تھا اور مختلف امور میں بات چیت
ا کرتی تھی۔ مغلیہ حکومت میں فوجداری کے قوانین اور عام قوانین یقیناً یکساں
ے لیکن پرسنل لا کی حد تک رعایا کو اپنے مذہبی امور میں مکمل آزادی تھی' اور
ن پر ان کے اپنے رسم و رواج اور مذہبی قوانین کے مطابق عائلی مسائل میں
صلے کئے جاتے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں خفیہ محکمہ بہت ہی منظم تھا اور یہ
ہ عوامی شکایات کو بادشاہ تک پہنچانے میں بہت مستعد تھا۔ ایسی کئی مثالیں
تی ہیں کہ جہانگیر نے ریاستی گورنروں اور ریاستی وزرا اعلیٰ کے خلاف ان شکایات
وجہ سے کارروائی کی تھی۔ اس میں جبری تبدیلیٔ مذہب کی بات بھی شامل تھی۔

مغل حکمراں بغاوت اور فتنہ کو کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سکھوں کے پانچویں گرو سنی مسلمانوں کے ایک اہم بزرگ شیخ احمد سرہندی اور مشہور شیعہ عالم نور اللہ شوستری کے ساتھ جہانگیر نے جو کچھ کیا وہ کسی مذہبی جذبہ کے تحت نہیں تھا بلکہ سیاسی اغراض و مصالح ملک کے تحت یہ کاروائی کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ اس نے عام سکھوں سے کبھی کوئی تعرض کیا نہ شیعہ سنی مسائل اس کے زمانے میں پیش آئے۔

ڈاکٹر ساجدہ علوی نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ جہانگیر جہاں سکھوں کے گرو کی حد سے بڑھی سرگرمی کو پسند نہیں کرتا تھا وہیں مسلم علماء و صوفیہ کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں سخت رویہ رکھتا تھا۔ قضاۃ کے عہدوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام انتظامی اور فوجی عہدوں پر بلا امتیاز مذہب و برادری کے کسی بھی اہل آدمی کی تقرری ہو سکتی تھی اور جہانگیر نے غیر مسلم باکمالوں کو بڑے بڑے مناصب دیئے تھے۔ اکبر کے عہد میں رعایا کے سلسلے میں جو غیر جانب دارانہ اور منصفانہ پالیسی بنائی گئی تھی جہانگیر نے اسے باقی رکھا تھا۔

اُردو صحافت : گورنر اڑیسہ جناب بی این پانڈے نے خدا بخش خطبات کے دوران جملہ معترضہ کے طور پر اردو کے سلسلہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو زبان جو مشترکہ تہذیب کے نتیجہ میں وجود میں آئی صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ آزادی کی جنگ میں اُردو نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور یہ کسی بھی زبان سے پیچھے نہیں ہے۔ انھوں نے اردو کے ایک اہم اخبار سوراجیہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انگریزی دورِ اقتدار میں یہ صرف دس ماہ تک شائع ہوا لیکن دس ماہ کے مختصر عرصے میں اس کے نو ایڈیٹر ہوئے جو یکے بعد دیگرے انگریزی حکومت کے معتوب ہوئے اور جنھوں نے عمر قید اور جلاوطنی کی سزائیں کاٹیں ایسی شاندار مثال کسی دوسری زبان کی صحافت میں نہیں ملتی۔ گورنر اڑیسہ نے اپنی عالمانہ گفتگو میں متعدد اردو رسائل و اخبارات کے نام گنوائے جو آزادی سے قبل غیر مسلم صحافیوں کے زیر ادارت شائع ہوئے تھے۔

اسلام اور ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں تحریف: جناب بی این پانڈے ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور فرقہ پرستی کے سخت مخالف ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی تاریخ کا کھلے ذہن سے مطالعہ کیا ہے۔ موصوف نے خدا بخش خطبات کے تحت مورخہ ۱۹، ۲۰ اور ۲۱؍ دسمبر ۸۵ء کو تین اہم موضوعات پر اپنا لکچر پیش کیا۔ موصوف کے پہلے لکچر کا موضوع تھا: "ہندوستان میں اسلام کی آمد: اسلام اور ہندو مت کا سنگم"۔

دوسرا لکچر "ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں تحریف" کے موضوع پر تھا اور تیسرے لکچر کا موضوع تھا۔ "اسلام کا ورثہ ایک مشترکہ تہذیبی مرقع"۔ جناب بی این پانڈے نے تینوں لکچروں میں ہندوستان کے مشہور اور معتبر مورخین کے حوالے سے چند ایسے بنیادی حقائق پر روشنی ڈالی جس کی طرف سے عہد غلامی کے مورخین صرف نظر کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے فاتح سندھ محمد بن قاسم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ محمد بن قاسم نے سندھ فتح کرنے کے بعد جو سندھ کے باشندوں سے معاہدے کئے تھے ان میں یہ باتیں بھی تھیں کہ کوئی شہری نہیں مارا جائے گا، کوئی عبادت خانہ منہدم نہیں کیا جائے گا، برہمنوں کا جو مقام ہے وہ برقرار رکھا جائے گا۔ مندروں کی تعمیر کرنے اور اپنے مذہبی رسم و رواج کے مطابق زندگی گذارنے کی اجازت ہوگی۔

شری پانڈے نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ ہندوستان میں آنے والے مسلم فاتحین کی تمام باتوں کی ذمہ داری اسلام پر ڈالنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ محمود غزنوی اور اس کے جیسے دوسرے فاتحین کے حملہ کے پیچھے کوئی مذہبی جذبہ نہیں تھا بلکہ محض ملک گیری کی آرزو تھی اور یہی حال دوسرے اکثر مسلم فاتحین کا ہے۔

شری پانڈے نے یوروپین مورخین کی ان غلط حرکتوں پر سخت تنقید کی جنھوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر ہندوستانی تاریخ اور بالخصوص ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کی صورت مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکچر کے دوران اپنی زبانی گفتگو میں اس اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا کہ یوروپین مورخین

کی جمع کردہ تاریخی مواد نے بعد کے ہندوستانی مورخین کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کردیا۔ محققوں نے ان کی کتابوں کی مدد سے ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہا۔

شری پانڈے نے ہندوستانی مسلمان اور ہندوؤں کے درمیان پائے جانے والے مشترک تہذیبی روایات کا تفصیلی ذکر کیا اور ہندوستان کے صوفیٔ کرام کے ملفوظات اور فارسی شعرا کے کلام سے ایسے زرّیں اقوال پیش کئے جن میں محبت کی تعلیم دی گئی ہے۔

ہندوستانی مسلمان کدھر؟

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاذ اور سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" اور ماہنامہ "جامعہ" کے مدیر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے خدا بخش لائبریری میں "ہندوستانی مسلمان کدھر" کے عنوان پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کو اپنا قومی تشخص برقرار رکھنے کے لئے دفاعی نفسیات کی بجائے مثبت طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کا طرۂ امتیاز یہ ہو کہ جہاں کہیں اور جس کسی کے خلاف ظلم ہو رہا ہو، مسلمان اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ کمزوروں کی مدد کرنا، حق کا ساتھ دینا اور جہاں کہیں کوئی مصیبت آئے مدد کے لیے پہنچنا ہمارا شیوہ ہونا چاہیئے۔ مسلمان صرف اپنی مسجد کی حفاظت نہ کریں بلکہ اگر کسی نے کسی مندر کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہو تو اس کے خلاف بھی آواز اٹھائیں۔ مسلمانوں کو یہ حقیقت یاد رکھنا چاہیئے کہ خدمت میں عظمت ہے۔ میں جو باتیں کہہ رہا ہوں وہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ اسی ملک کے زمین آسمان نے ایسے مسلمانوں کو دیکھا ہے۔ دوسروں کی خدمت کرتے تھے اور لوگوں سے محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ صوفیہ کرام اس کی سب سے اچھی مثال ہیں اور آج بھی تصوف کی بعض باتوں سے قطع نظر صوفیہ کرام کا طریقہ ہمارے لئے زیادہ مناسب۔ تصوف کا اپروچ اپنائے بغیر مسلمان یہاں غیر مسلموں میں کوئی کام نہیں کرسکتے مسلمان یہاں پہلے بھی اقلیت میں تھے اور آج جمہوری اسٹیٹ میں بھی وہ اقلیت ہی میں ہیں۔ اس وقت جب وہ حکمراں تھے ان کے سامنے ایک خاص نوعیت

کے چیلنج تھے اور آج کچھ دوسرے قسم کے چیلنج ہیں اور آج کے حالات کا صحیح تجزیہ کرکے ہمیں کوئی سوچی سمجھی راہ اختیار کرنی ہے۔

پروفیسر فاروقی نے حضرت شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید اور سرسید احمد خاں کے حوالے سے ماضی میں درپیش حالات اور ان حالات سے مقابلہ کرنے کی حکمت عملی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین جیسے قومی رہنماؤں کے حوالے سے قومی تشخص کے اہم مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے قومی رہنما جن کی قوم پرستی اور حب الوطنی پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا یہ سب کے سب اس خیال کے حامل تھے کہ مسلمانوں کا مذہبی اور قومی تشخص بہرحال برقرار رہنا چاہیئے اور اس معاملہ میں کوئی ایسی بات قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جو اس تشخص کو نقصان پہنچائے۔

پروفیسر فاروقی نے اپنی گفتگو میں مسلمان اور قومی دھارے کے سلسلہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں کہ مسلمان قومی دھارے سے الگ ہیں لیکن کچھ لوگ جن کا ذہن صاف نہیں ہے۔ مسلمانوں سے "مین اسٹریم" میں شامل ہونے کی بات کرتے ہیں تو ہم ان سے یہی کہیں گے مسلمان اپنی شرائط کے ساتھ مین اسٹریم میں شامل ہوسکتے ہیں اگر وہ شرائط تسلیم کرلی جائیں تو مسلمان مین اسٹریم میں رہ کر ملک میں اپنا اہم سماجی رول ادا کرسکتے ہیں لیکن اگر کوئی گروہ مسلمانوں کو اپنی شرائط کے ساتھ مین اسٹریم میں شامل کرنا چاہے تو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مین اسٹریم میں ہم شامل ہونے کے لیے تیار ہیں لیکن اپنی شرائط کے ساتھ۔

تقلید جامد کے سلسلہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ کسی ایک فقہی مسلک پر اصرار کرنے کے بجائے مذاہب اربعہ اور اہلِ حدیث مسلک کے اندر اگر کوئی مسلک ہمارے مسئلہ کو زیادہ بہتر طور پر حل کردے تو اسے اختیار کرلینا چاہیئے۔ محض کسی خاص فقہی مسلک پر اصرار تقلید جامد ہے۔ انھوں نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مثال دی جنھوں نے ۱۹۲۷ء میں مفقود الخبر

کے مسئلہ میں حنفی مسلک کے بجائے مالکی مسلک کو ترجیح دی تھی۔ اجتہاد کا مطلب اسلام کے فریم ورک کے اندر رہتے ہوئے غور و فکر کرنا ہے نہ کہ اس سے باہر اور چاروں مذاہب اور اہل حدیث مسلک اسلام کے دائرے میں ہیں۔
پروفیسر فاروقی نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ علی گڈھ کے باصلاحیت اساتذہ اپنی قوم کے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے بجائے طویل خدمت کے لیے عرب ممالک چلے جاتے ہیں۔ تعلیمی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ صرف ٹکنیکل تعلیم، میڈیکل انجینئرنگ کی طرف توجہ دینا اور عمرانیات اور سماجیات سے صرفِ نظر کرنا درست نہیں ہے کیوں کہ ذہنی و فکری انقلاب عمرانیات اور سماجیات کے علمار کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی تشویش ظاہر کی کہ لوگ اپنے بچوں کو مقابلہ کے امتحان میں اچھا کرنے کے لیے مذہبی تعلیم نہیں دیتے صرف دنیوی مقابلہ کی تیاری پر زور دینا اور اخروی امتحان کی تیاری نہ کرانا بھی بچوں کے حق میں مفید نہیں ہے۔ انھوں نے روشن خیال مسلم مفکرین کو جو رجعت اور جدت پسندی کے درمیان توازن قائم کرنا چاہتے ہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ عملاً اور اعتقاداً اسلام کی پیروی کریں تب ہی عوام ان کے خیال کو قبول کریں گے اور ان کی پیروی کریں گے۔

قرآن اور سائنس : عثمانیہ یونی ورسٹی کے استاذ، مشہور ہیئت داں پروفیسر صالح محمد اللہ دین نے "قرآن اور سائنس" کے موضوع پر خدا بخش لائبریری میں لکچر دیتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح ہماری زمین، ہمارا چاند اور ہمارا نظامِ شمسی کوئی منفرد حیثیت نہیں رکھتا ہے اور اس طرح کے بے شمار نظام شمسی کہکشاں GALAXY میں موجود ہیں اس طرح اس بات کا بھی امکان ہے کہ ہماری طرح کی مخلوقات دیگر سیاروں پر بھی ہوں۔
پروفیسر اللہ دین نے سورہ شوریٰ کی ۲۹ ویں آیت سے یہ استدلال کیا کہ قرآن کے مطابق دیگر سیاروں میں بھی ذی روح پائے جانے کے امکانات ہیں ۔۔۔ : ترجمہ : اور اس کی (اللہ کی) نشانیوں میں سے پیدا کرنا ہے ۔۔۔

آسمانوں اور زمین کا اور ان جانداروں کا جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھے ہیں اور وہ ان کے جمع کر لینے پر جب وہ چاہے قادر ہے۔

پروفیسر اللہ دین نے قرآن کی روشنی میں سائنسی تحقیقات وانکشافات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ قرآن نے سائنس کی ہمت افزائی کی ہے اور اس نے کائنات میں غور و فکر یعنی سائنسی تحقیقات کو خدا سے قریب ہونے کا ذریعہ بتایا ہے۔ موصوف نے قرآن کی ایسی متعدد آیات کو پیش کیا جن میں کائنات کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس پر غور و فکر کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سورۂ یٰسین کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ چاند، سورج، زمین اور تمام سیاروں کی گردش میں ہونے کا علم ہمیں بیسویں صدی میں ہوا ہے جب کہ قرآن پاک نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہی یہ بات کہدی تھی کہ یہ زمین، چاند اور سورج سبھی فلک میں تیر رہے ہیں۔ اسلام میں علم (سائنس) کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ علم کا حاصل کرنا محمد رسول اللہ نے مسلمان مرد اور عورت پر فرض کیا ہے۔ مہد سے لیکر لحد تک علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ حدیث میں یہاں تک ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے چین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ چین کی مثال اس لیے دی گئی تھی کہ عربوں کے لیے چین تک سفر کرنا نہایت دشوار تھا۔ پروفیسر موصوف نے قرآنی آیات کے حوالہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ وہ خدا کی ذات ہی ہے جس نے انسان کو علم دیا اور چیزوں کی حقیقت (PROPERTY OF THINGS) بتائی اور ایسی چیزوں کا علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اور انسان کو لکھنا سکھایا اور وہ اللہ ہی کی ذات ہے جو انسان کو ظلمات (تاریکی اور جہالت) سے نور (علم اور ایمان) کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ پروفیسر اللہ دین نے کوپرنیکس، آئن اسٹائین اور نیوٹن کے حوالہ سے متعدد سائنسی حقائق اور نظریات بیان کئے اور پھر قرآنی آیات پیش کر کے قرآن کی علمی عظمت پر بھرپور روشنی ڈالی۔

پروفیسر صالح محمد اللہ دین نے ۱۹۵۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم ایس سی

گیا۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک امریکہ میں مقیم رہے۔ ۱۹۶۳ء میں شکاگو یونی ورسٹی سے فلکی طبیعات میں پی ایچ ڈی کی اور ۱۹۶۴ء سے عثمانیہ یونیورسٹی میں علم ہیئت کے استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سائنسی موضوعات پر آپ کے متعدد تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں اور ان موضوعات پر اب تک دو درجن سے زائد مقالات آپ پیش کر چکے ہیں۔ DYNAMICS OF STELLAR SYSTEM کے عنوان سے آپ کی ایک کتاب انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹروفزکس بنگلور سے شائع ہو چکی ہے۔

مذہب اور سماجی تبدیلیاں: خدا بخش توسیعی خطبات کے تحت پہلا خطبہ "مذہب اور سماجی تبدیلیاں" کے موضوع پر دیتے ہوئے جناب علی اشرف صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اپنے ماضی کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے اور ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مستقبل کی تعمیر کرنا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا کہ تنقید کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ماضی کی تمام روایات کو رد کر دیا جائے بلکہ تنقید کا مطلب کھرے اور کھوٹے کا فرق واضح کرنا ہے۔ بہت ساری روایات ایسی ہیں، جنھیں فروغ دینے اور زندہ رکھنے کی ضرورت ہے لیکن جو باتیں تاریخی تجربات کی روشنی میں غلط ثابت ہو چکی ہیں ہمیں انھیں ترک کر دینا چاہیے۔

جناب علی اشرف نے مشہور مورخ مولانا شبلی نعمانی، سید امیر علی، ڈاکٹر طہ حسین، مولانا مودودی اور شیخ اکرام کی تصانیف کے حوالے سے اسلامی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہوئے سماجی اور سیاسی تبدیلیوں اور اس کے اثرات پر غور و فکر کرنے کے لیے فکری بنیاد فراہم کی۔ جناب علی اشرف نے شیخ اکرام کے حوالے سے بتایا کہ امام غزالیؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوّف کو راسخ العقیدہ اسلام میں شامل کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں پر سب سے زیادہ امام غزالی کے افکار و نظریات کے اثرات ہیں۔

موصوف نے اسلامی تاریخ کے حوالے سے کئی اہم نکتے پیش کیے۔

انھوں نے بتایا کہ مسلمانوں میں گروہی اختلافات کی بنیادی وجہ سیاسی اور جاہلی اور گروہی عصبیتیں جو اسلام کے ابتدائی عہد میں دب گئی تھیں، خلیفہ سوم کے زمانہ میں پھر سے ابھرنے لگیں اور بالآخر سیاسی زوال پر منتج ہوئیں۔ اسلام نے شروع ہی سے سماجی تبدیلی کو اپنے دائرۂ کار میں شامل رکھا ہے۔ اور اس کے زیر اثر بہت ساری تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ماضی کا تنقیدی مطالعہ ایک ایسا سنگِ میل ہے جس کے سہارے ہم مستقبل کا فاصلہ کامیابی سے طے کر سکتے ہیں ——

جناب علی اشرف نے ہندوستانی تاریخ کے حوالے سے شیخ احمد سرہندی شاہ ولی اللہ، اور شاہانِ مغلیہ میں اکبر، جہانگیر اور اورنگ زیب کے سماجی اور سیاسی کارناموں پر مختصراً روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ قدامت پسند علماء اور شیخ سرہندی کی نظر میں اکبر کی سب سے بڑی غلطی غیر مسلموں کو حکومت میں برابر کا حصّہ دار بنانا تھا۔ مغل حکمراں حتیٰ کہ اورنگ زیب بھی مذہب اور سیاست کی تفریق کے قائل تھے۔ اورنگ زیب نے امیر خاں کو جو خط لکھا تھا اس میں اس پالیسی کی طرف اشارہ تھا کہ مذہب اور سیاست دونوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ مذہب الگ چیز ہے اور امورِ دنیا بالکل الگ چیز ہے۔ جناب علی اشرف نے شاہ ولی اللہ کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے نہ صرف یہ کہ مختلف فقہی مسلکوں کے اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی بلکہ صوفیا کے مختلف سلسلوں میں جو اختلافات تھے انھیں بھی ختم کرنے پر زور دیا۔

جناب اختر شیرازی نے اسلام کے ان کارناموں پر اجمالی روشنی ڈالی جو اس نے سماجی تبدیلی کے ضمن میں انجام دیئے ہیں اور بتایا کہ اسلام نے نہ صرف یہ کہ غلامی کے رواج کو کم کر دیا بلکہ غلاموں کو سماج میں بڑی عزت اور بلند مقام عطا کیا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی کے ایک عظیم کارنامے کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت شیخ سرہندی نے تصوف کو جاہلی اور خارجی اثرات سے پاک کر کے تصوف کو خالص اسلامی بنیاد فراہم کی،

وحدت الوجود کے نظریہ کو رد کرکے وحدت الشہود کا نظریہ دیا۔ جناب تق
نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ سماجی تبدیلیاں اور سیاسی عروج و زوال
صرف اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ دنیا کی تمام اقوام اور مذ
کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک عام المسلمین کا سوال ہے تو وہ خود
جانتے ہیں کہ انھیں کن حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔ جناب تقی رحیم صاحب
ماضی قریب کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ تقسیم ہند کے مسئلہ میں
مسلمانوں نے مولانا آزاد کو چھوڑ کر جناح کا ساتھ دیا یہ خود اس بات کی علامت
ہے کہ عام مسلمان کن حالات میں کن کی پیروی کریں۔ اس پر غور کرکے اپنا راستہ
متعین کیا۔

جناب علی اشرف نے جواباً بتایا کہ جہاں تک مولانا آزاد اور جناح
سوال ہے تو مسٹر جناح کے لیے فکری مواد خود مولانا آزاد ہی نے فراہم کیا تھا۔
الہلال اور البلاغ کے ذریعے جو فکر انھوں نے بنائی تھی اس کے زیر اثر جنا
کی باتوں کو لوگوں نے مان لیا۔ یہ مولانا کا بڑا المیہ ہے کہ جس فکر کی انھوں نے
آبیاری کی تھی خود ہی اس سے منحرف ہو گئے۔ ○○

جہاں اردو استعمال کی جاسکتی ہے ضرور کیجیے۔
اپنے دعوت نامے اردو میں طبع کروائیے۔
جہاں اردو سمجھی جاتی ہے، اردو کے سوا دوسری زبان
مت استعمال کیجیے۔
جہاں اردو میں درخواست دی جا سکتی ہے، اردو کا ہی
استعمال کیجیے۔
اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھیئے۔

حُسینی جاوید

علامہ یا الاماں

علامہ کے لفظی معنی نہایت دانا اور فاضل (فیروز اللغات) کے ہوتے ہیں
لیکن آج کل معنوں پر اس لیے توجہ نہیں دی جا رہی ہے کہ سارے معنے بے معنی ہو کر رہ
گئے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بھی علاقے کے "شیر خاں" کو لے لیجئے! نام سے یہ ظاہر ہو"
کہ شیر خاں' واقعی شیر ببر جیسے ہوں گے، آواز گرجدار اور چال شیریت سے بھرپور
ہوگی' حملہ آور کو ایک ہی جست میں یہاں سے وہاں پہنچا دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن
جب شیر خاں سے سابقہ پڑے گا تو سارے اندازے غلط ثابت ہوں گے۔ آپ کو حیرت
ہوگی اور ذہن میں یہ سوال بھی اُبھرے گا کہ شیر خاں کے ماں باپ نے معصوم
عوام کے ساتھ اس طرح کا مذاق کیوں کیا ہوگا ۔۔۔!؟

چلیے اسی کو غنیمت جانیے! شیر خان کے والدین کی جانب سے شیر خان
کے پیدا ہوتے ہی شیر خان کا پورا نام اگر "علامہ شیر خان" رکھا جاتا تو کوئی ان کا کیا
بگاڑ لیتا؟ سیکڑوں ہزاروں علاموں کی طرح کیا انھیں بھی برداشت کرنے کی کوشش
نہیں کی جاتی؟

یہ صحیح ہے کہ ان علاموں کی بے استدلال تکرار ثقیل غذا کی طرح زود ہضم
نہیں' لیکن اُسے ہضم کرنے پر ایک زمانہ مجبور ہے۔ خود اس کے لیے کڑوی کسالی
مصلحت آمیز چورن ہی کا استعمال کیوں نہ کرنا پڑے۔

ناقابلِ برداشت باتوں کو قابلِ برداشت بنانے کے دوران یقیناً یہ

● جاگیردار پاؤنڈری۔ اسٹیشن روڈ' اورنگ آباد۔ 431001

کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس بے بسی و بے کسی کو موجودہ سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دینے کی زوردار کوشش کی جارہی ہے۔ اس بے ہنگم عزت افزائی کے لیے بے بسوں اور بے کسوں کو زمانہ کا ممنون و مشکور ہونا چاہیے نیز انھیں اپنے دلوں میں مسرت و انبساط کی لہر بھی دوڑالینی چاہیے کہ وہ اس قابل تو نہیں تھے لیکن انھیں اس قابل سمجھا جارہا ہے۔ قیادت کے نااہل کو اگر "قائدِ عظیم الشان" کے خطاب سے نوازا جائے تو کیا اسے خوشی نہیں ہوگی؟ خوشی ہوگی اور بہت ہوگی۔

بالکل اسی طرح ایک بے دانا (علامہ کے لیے فیروز اللغات میں درج معیار کے برعکس) کو اگر "علامہ" کہا جائے تو اسے بھی یقیناً بہت خوشی ہوتی ہے۔ آج ہمارے آس پاس ایسے کئی بے دانا موجود ہیں جنھیں لوگ ڈنکے کی چوٹ علامہ کہتے ہیں۔ ان علاموں میں کئی علامہ تحتانیہ یونیورسٹی ہی کے فارغ التحصیل ہیں اور اس حقیقت کو (اگر ظاہر ہوگئی) یوں نبھاتے ہیں کہ کل کا میڈل کامیاب آج کے گریجویٹ بلکہ پوسٹ گریجویٹ سے بہتر ہے۔ اس دلیل میں چاہے سچائی ہو نہ ہو، علامہ موصوف کی چرب زبانی اور رکھ رکھاؤ کے نتیجہ میں لوگ ان کی باتوں سے مرعوب ضرور ہو جاتے ہیں۔

ابھی حال میں ایک ایسے ہی "موضوعاتی علامہ" سے ملاقات رہی۔ موضوعاتی ان معنی میں کہ علامے موضوعات میں منقسم ہیں۔ کوئی اخلاقیات کا ماہر تصور کیا جاتا ہے تو کوئی مذہب کا قلمدان سنبھالے ہوئے ہے، کوئی سیاسیات پر حاوی ہے تو کوئی نباتات و حیوانات کا (SPECIALIST) تصور کیا جاتا ہے۔ علامہ شاعر، علامہ افسانہ نگار، علامہ صحیفہ نگار، علامہ مزاح نگار، علامہ طنز نگار اور علامہ فلاں نگار تو قدیم سے موجود ہیں، آج کل ایک اور اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے، یہ ہے:
"علامہ بیہودہ نگار" کا۔ یہ لوگ بیہودہ نگاری کو ادب ہی کی ایک صنف قرار دینے کے اپنے فیصلہ پر اٹل ہیں اور اسے "ڈسکو آرٹ" سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اس قبیل کے علامہ لوگ وہ وہ گل کھلا رہے ہیں کہ اصلی گلوں نے احتجاجاً اب کھلنا چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بازار میں اب صرف کلیاں ہی کلیاں دکھائی دے رہی ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ذکر ہو رہا تھا ایک موضوعاتی علامہ سے!

ملاقات کا، چلئے واپس آتے ہیں اپنی منزل پر ــــ چوں کہ ہم طبعاً انٹروایو پسند واقع ہوئے ہیں اور تخلیق کے دوران ہمارے مزاج میں طموع بھی کچھ زیادہ مقدار میں داخل کر دی گئی ہے، اس لیے تار کے پتنگ کی طرح فرار کے تمام راستے مسدود کر کے ہم زیر بحث علامہ سے گتھم گتھا ہو گئے۔

ہمارا مقصد بس یہی تھا کہ علامہ کی سیاسیات سے اکتساب کیا جائے چونکہ آج کل 'سیاست' کی یہ حالت ہے کہ وہ جاہل سے لے کر فاضل تک کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے اور ہر شخص مخصوص افراد کی حماقت ہی کو سیاست سمجھ رہا ہے۔ ان سے صرف عام بے چینی کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے لیے کہا گیا جس کا انھوں نے یوں جواب دیا ــــ

"عام بے چینی کے اسباب پر روشنی ڈالنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس روشنی کا کنکشن کس ملک کے بجلی گھر سے ہے، ہماری اس دنیا میں دو چار ہی ملک ایسے ہیں جن کے پاس اپنے استحصالی بجلی گھر ہیں۔ کئی ممالک ان کے حلقہ بگوش ہیں یعنی روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ ہر قوت دوسری قوت کو نیچا دکھانا چاہتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زیر تسلط ملکوں میں عدم استحکام کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بے چینی اسی کا حصہ ہے۔" علامہ سیاسیات کی اس روشنی نے ہمارے ذہن کے تاریک گوشوں میں اجالا بکھیر دیا اور اب ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ سیاست کسے کہتے ہیں۔

سیاست کو سمجھ لینے کے بعد کئی اور امور ایسے ہیں، جن کے بارے میں ہمارا ذہن آج بھی اب ب ت ث یا [illegible] چ۔ ج۔ [illegible] تک ہی محدود ہے لیکن ان امور کی نسبت ہم فی الحال علاموں سے اکتساب کے موڈ میں نہیں ہیں کیوں کہ ان لوگوں کی وضاحت سے کوفت ہوتی ہے اور زمانہ کی ستم ظریفی پر دل جل جاتا ہے۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں، علاموں کا کام اپنے عقائد کا پرچار یا اپنے موضوع کی مدافعت ہی ہوتا ہے، ان میں ایک ہی منزل کے راہرو ہونے کے باوجود زبردست نظریاتی تضاد بھی پایا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو باطل قرار دینے میں اپنی ساری

توانائیاں صرف کر دیتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ حقیقی علامہ اس قسم کی سرگرمیوں میں مبتلا نہیں رہتے، لیکن اس ترقی یافتہ دور کی پیداوار "عام علامہ" ہمیشہ ہی نزاعی موضوع میں دلچسپی لیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان جدید علاموں کو علامہ کے بجائے الاماں کہا ہے۔

ایک ایسے ہی علامہ یا الاماں نے بہانگ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ جس کسی نے 'بھینس اور انسانی عقل' دونوں میں سے کسی ایک کی بڑائی ثابت کرنے کی کوشش کی، وہ اسے پانچ ہزار روپے نقد انعام دیں گے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان علامہ نے ایک ایسے شخص کو انعام سے نوازا جس نے انسانی عقل کے مقابلہ میں بھینس کی عظمت و بڑائی کے بارے میں لکچر دیا تھا۔ علامہ کا کہنا تھا کہ انعام یافتہ کی تقریر مدلل تھی کیونکہ اس نے جسم کا مسئلہ چھیڑ دیا تھا اور ظاہر ہے عقل کے مقابلہ میں بھینس کافی لمبی چوڑی ہوتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔

علامہ کے اس فیصلہ پر ہمیں کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ ایک اور علامہ نے ابھی حال میں ایک ایسا ہی انعامی مقابلہ منعقد کیا تھا جس کا موضوع "انڈا پہلے یا مرغی پہلے" تھا۔ بہت سوں کو یاد ہوگا کہ ماضی قریب میں اکثر علاقے کبوتروں کی ٹکڑیاں اڑایا یا لڑایا کرتے تھے، تیتر بٹیر، مرغ اور بکروں کی لڑائی بھی ان کی من پسند سرگرمیوں میں شامل تھی لیکن اب یہ تمام باتیں از کار رفتہ ہو گئیں، علاموں کے لیے جب اس قسم کی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تو یہ لوگ بحث مباحثہ میں زیادہ شدت سے دلچسپی لینے لگے اور بات یہاں تک پہنچی کہ اب بحث یا مباحثہ دونوں پر (اگر دو ہیں) ان کی اجارہ داری قائم ہے، اونچے چبوتروں سے لے کر ہوٹل کے محفوظ گوشوں اور چوراہوں کے عوامی ٹکڑوں پر تک ان کا راج ہے۔ دو چار کو جمع کرکے اگر کوئی اپنے ہاتھ لہرا لہرا کر فنِ خطابت کا مظاہرہ کر رہا ہے تو سمجھ لیجئے یہی 'الاماں' ہیں۔ انھیں بعض لوگ محض اپنی KNOWLEDGE کی بنا پر 'علامہ' سمجھتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خود بھی اپنے آپ کو علامہ ہی تصور کرتے ہیں، اور علامہ کہلوانا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ فی الحقیقت "الاماں" ہیں۔

عـلیم جہانگیر

(طنزیہ)

جدید شودث

علی بابا نے کھل جا سم سم کے کوڈ ورڈز سے جیسے ہی چالیس چوروں کے پوشیدہ دھن پر چھاپہ مارا۔ اس کے گھر گویا نوٹیں چھاپنے کی مشین منتقل ہوگئی۔ علی بابا کی دولت مندی کے تذکرے چارسو بڑی سعادت مندی سے ہونے لگے۔ علی بابا کا پیدائشی جھونپڑا دیکھتے ہی دیکھتے ایسی شاندار کوٹھی میں بدل گیا جس کے سامنے کنگ کوٹھی کی تاریخی اہمیت بھی پھیکی پڑ چکی تھی۔ کہاں وہ وقت کہ علی بابا نہ پوٹی دھوتا تھا اور نہ ہی شوربہ پیتا تھا۔ اب وہ نکڑ والی دکان سے پان، سگریٹ، اور مارکیٹ سے سبزی ترکاری، کبھی کسی ملازم سے ماروتی تو کبھی دوسرے ملازم سے امپالا کاریں منگواتا تھا۔ غرض علی بابا نے بے پناہ مال غنیمت پا کر اپنا ناطہ حال سے جوڑ لیا تھا۔

چالیس چوروں کو لگاتار فینانس میں گھاٹا پا کر فکر لاحق ہوگئی۔ وہ اس شریف ٹھگ کو تلاشنے چل پڑے جو انھیں شرافت میں دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ بالآخر وہ دربدر کی دھول پھانکتے علی بابا تک جا پڑے لیکن مرجینا کی بروقت ہوشیاری سے ان چالیس چوروں کو مفت میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس رات علی بابا کو مرجینا بہت اسمارٹ لگی۔ دوسرے دن لگن منڈپ میں قاضی جی مذہبی فریضے کی تکمیل کر رہے تھے۔ بعد تکمیل علی بابا نے فوری لندن کی راہ لی۔

● آسرا 2.1.88 قاضی واڑہ، اورنگ آباد۔ 431001

علی بابا جب وطن لوٹنے کی تیاری کرنے لگا تو مرجینا نے پوچھا:
"آپ مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟"
علی بابا نے مختصر سا جواب دیا: "ہنی مون منانے۔"
مرجینا نے پوچھا: "وہ کیا ہوتا ہے؟"
علی بابا نے نہایت ہی رازدارانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ساتھ یہاں جو رنگین راتیں گزاری ہیں، اسے ہنی مون کہتے ہیں۔"
مرجینا نے علی بابا کو تین سو ایک سو بیس زردہ کا پان دیتے ہوئے بھولپن سے پوچھا۔ "آپ پہلے بھی ایسی کئی راتیں گزار چکے ہیں، وہ کیا تھا؟"
علی بابا نے بھنّاتے ہوئے کہا۔ "وہ ٹرائیل تھا۔"
علی بابا کو وطن لوٹنے پر معلوم ہوا کہ مرجینا کے پاؤں بھاری ہو چکے ہیں وہ مرجینا کے پاؤں ہلکے کرانے اسے امریکہ لے گیا۔ جہاں اس نے ایک خوبصورت سی بچی کو جنم دیا۔ اس طرح مرجینا نے ہم دو ہمارے دو کے بجائے کُل ملا کر تین لڑکے اور دو لڑکیاں جنم دیں۔ علی بابا ان کی پیدائش پر انہیں اشرفیوں میں تولتا، آتش بازی کرتا، بیک گراؤنڈ میوزک میں نعتیہ قوالیوں سے لے ڈسکو گانوں تک کے کیسٹ نہ صرف دن بھر بلکہ رات تمام بجواتا۔

ایک دفعہ ہم نے اپنا آرام حرام پاکر رپورٹ بھی درج کروائی تھی۔ محکمۂ انتظامیہ سے ہمیں جواب ملا کہ ریڈ لولائسنس کی منسوخی کے ساتھ ہی وہ دفعہ بھی منسوخ ہو گئی ہے جس میں نصف رات کے بعد ریکارڈنگ ممنوعہ تھی۔
علی بابا کے بچے سیانے ہونے لگے۔ ایک دن ہم نے یونہی علی بابا سے کہہ دیا تھا۔ "آپ کے بچے مرجینا کی مار کھا کھا کر لٹھ کو ڈگے بنتے جا رہے ہیں تو آپ کی موٹی موٹی آوازوں میں بے حس ہوتے جا رہے ہیں۔"
علی بابا نے مایوس ہو کر کہا۔ "اس کے سوا کچھ چارہ بھی تو نہیں۔"
ہم نے جواب دیا۔
"چارہ تو بہت ہے۔ چارہ کار نہیں ہے۔" وہ دن ہے اور آج کا

دن، ہم جب بھی ان کے گھر جاتے ہیں کوئی بھی ہم سے بات تک نہیں کرتا۔"
علی بابا نوٹوں کے ہار میں لاڈلوں کی ننھی گردن پھنسا سے تسمیہ خوانی کرواتا
سال گرہ پر فرانس سے کیک منگواتا۔ حاضرین یعنے سامعین ہلکی ہلکی میوزک پہ
"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" گاتے۔ ہمہ اقسام کے باجوں میں علی بابا خاص کر کنیگر کا باجہ
بجواتا۔ جیسے ہر کوئی پسند کرتا۔ بعد قیام و طعام ہر کوئی اپنی طاقت کا مظاہرہ
کرنے میں سبقت لے جانے کی فکر کرتا کہ دعائیں قابل اعتماد نہیں رہی۔
پھر یوں ہوا کہ وہ یکایک معاشی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ علی بابا ہنس
کی چال چلنے میں اپنی چال بھی بھول چکا تھا۔ اِدھر اس کی پہچان دوستوں سے
کم پڑوسیوں سے تعارف اور تعلق بڑھنے لگا۔ اس تعارف اور تعلق میں
دیرپا اور پوشیدہ رنجشیں بھی اپنا اثر دکھانے لگیں۔ پریشانیوں میں علی بابا
کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔ اس خیال کے آتے ہی علی بابا
چالیس چوروں کے بچے کھچے خزانے پر مزید چھاپہ مارنے چل پڑا۔ وقت کافی
گزر چکا تھا۔ اب وہاں کھل جا سم سم کے چٹانی دروازے، گھنے جنگلوں،
خوفناک اور پُرپیچ پہاڑی کی جگہ ایک وسیع میدان تھا جس میں خشخش کی
کاشت کی جا رہی تھی۔ علی بابا کچھ سوچ کر مطمئن اپنے گھر لوٹ گیا۔

کہتے ہیں کہ علی بابا کی بڑی بیٹی کے مناسب جہیز نہ لانے پر ساس نے
اس پر کیروسین چھڑک کر آگ لگا دی۔ بہو ہوشیار تھی۔ اس نے اطمینان سے
چلتے ہوئے ساس کو آغوش میں بھینچ کہا: "ساسو میا اپن ساتھ جیئے تھے،
ساتھ ہی مریں گے، تیرے لیے کون کیروسین لائے گا۔"
منجھلے بیٹے نے حالات میں پری درتن لاتے ہوئے ماں باپ کی
مرضی کے خلاف کسی رانی روپ متی کے ساتھ اپنا گھر الگ لے لیا ہے۔ پچھلے
چند دنوں سے وہ ایک بچہ گود میں لیے گھومتا پھرتا دیکھا جا رہا ہے۔
ہمارے خیال شریف میں علی بابا کا پوتہ بڑا ہو کر بابا کہنے کا بھی درد سر مول نہ لے گا۔
بیوی کا ایک درد ہے جو زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ایک دن ہم

نے دوست سے پوچھا:

"آپ کی اعصابی بیماری کا کیا حال ہے؟"

دوست نے جواب دیا: "وہ پچھلے مہینے سے میکہ گئی ہے۔"

علی بابا کے داماد نے ایسے ہی درد سے پیچھا چھڑانے اپنی بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ میکہ بیرنگ کر دیا ہے۔

علی بابا کا منجھلا بیٹا ذرا غنڈہ قسم کا ہے۔ وہ سر پر ٹوپی ڈالے رامپوری چاقو چلانے میں ماہر ہے۔ علی بابا کے خیال میں پولیس اس کے بیٹے کی جوانی سے جلتی ہے۔ سب سے چھوٹے بیٹے کے دماغ میں خلل ہے۔ علی بابا اسے ولیوں میں شمار کرتا ہے۔ درحقیقت علی بابا ایمان پر اور حق کی باتیں ضرور کرتا ہے لیکن آج کی باتیں نہ تو ایمان کی ہوتی ہیں اور نہ ہی حق پر ہوتی ہیں۔

علی بابا دولت کو سکڑتا دیکھ کر اور گھر گرہستی چلانے صاف شفاف رومال منہ پر ڈالے شراب کشید کرتا ہے۔ لوگ اسے صوفیوں میں شمار کرتے ہیں ہمیں دراصل انسان کی یہی خوبیاں بے حد پسند ہیں۔ وہ بچپن میں نٹ کھٹ اور شریر ہوتا ہے' جوانی میں رنگیلا اور عاشقانہ مزاج بن جاتا ہے' بوڑھاپے میں صوفیانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے' مرنے کے بعد اللہ والا کہلاتا ہے۔ مرجینا نے جن نرم اور نازک ہاتھوں سے سماج دشمن عناصر کا صفایا کیا تھا' اب ان ہی ہاتھوں سے وہ میخانہ چلاتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ علی بابا اور مرجینا کو اپنی شناخت اور پہچان گم ہوجانے کا قطعی ملال نہیں۔ اب وہ بے حد خوش ہیں۔ ان کے گھر پھر سے لکشمی بلکہ مہالکشمی لوٹ رہی ہے۔ کاروبار روز افزوں ترقی پر ہے۔ چھوٹا کنبہ خوشحال کنبہ کے مصداق کوئی اپنی کھال میں تو کوئی اپنی شال میں مست نظر آتا ہے۔ ایک مرتبہ چاندنی رات میں علی بابا کے صحن میں مرجینا کو پھر روایتی انداز میں گیت گاتے دیکھا گیا ہے گیت کے بول تھے: "دیکھو جی چاند نکلا پیچھے کھجور کے"

عابدہ احسانہ

فرض کی پکار

آج اچانک پندرہ بیس برس بعد اس کو میونسپلٹی کے نل کی لائین میں ایک
ــڑا پانی کے لیے کھڑے ہوے دیکھ کر میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا
، کچھ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوگیا۔ کچھ مسرت اور کچھ حیرت کے
جلے جذبات میرے دل کی دھڑکنوں کو بے قابو کیے دے رہے تھے۔
ــکے بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے تھے اور چہرہ ــــ وہ تو بس جھریوں
ــ جال تھا ــــ ہاں پندرہ بیس برس کا عرصہ حالات کو پلٹ دینے کے لیے
نی تو نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانیاں ہی ویرانیاں تھیں ــ البتہ
ــسی کی جھلک آج بھی اس کی آنکھوں میں عنقا تھی۔ اس کی آنکھوں میں
ج بھی ایک عزم مصمم جھلک رہا تھا ــــ جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کو
ــ دیا تھا ــــ

میں اس کو غور سے دیکھنے لگا ــــ جیسے میں اس کی آنکھوں میں عہد
شتہ کی پرچھائیوں کو تلاش کرنا چاہتا ہوں' وہ بھی میری طرف بڑے غور
ــ دیکھ رہی تھی۔ میں اس نگاہوں کی تاب نہ لاسکا اور گڑبڑا کر کہنے لگا۔
رلیشو یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ آج تمہیں یوں ایک گھڑا
ــ کے لیے جدوجہد کرتے ہوے دیکھ کر جانتی ہو مجھکو کتنا دکھ پہنچا ہے۔
ــ عرصہ میں پہلی بار اس کے ہونٹوں کا سکوت ٹوٹا ــــ

سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد' گولڈن تھریشولڈ' ــــ حیدرآباد

میں جانتی ہوں بھیا، اچھی طرح جانتی ہوں، آپ مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں لیکن اصول اصول ہیں، اور پھر آپ کے اور میرے درمیان برسوں سے اصولوں ہی کی تو لڑائی چل رہی ہے۔ ان پچھلے پندرہ بیس برسوں میں، میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بھیا یہاں نہ صرف ایک گھڑا پانی کے لیے بلکہ روٹی، کپڑا اور ایک چھت کے لیے پورا مہینہ جدوجہد کرنا پڑتا ہے اور میں اس زندگی سے مطمئن ہوں۔ بہت مطمئن۔

اچانک اس کا لہجہ سرگوشیانہ ہو گیا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ شاید اس کے لہجہ کا کرب میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر رہا تھا۔ بچپن ہی سے ریشو کے مزاج میں سنجیدگی کا عنصر غالب تھا اور ہر نا انصافی کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض سمجھا کرتی تھی۔ وہ اپنی اسٹوڈنٹ لائف میں کالج یونین سے لے کر مہیلا سبھا فیڈریشن تک کو لیڈ کیا کرتی تھی۔

اُسی زمانے میں جب کہ وہ چھٹیوں میں ہوسٹل سے گاؤں آئی ہوئی تھی اور اس کے کارنامے گاؤں کی محدود فضا میں چوطرف اپنا رنگ جما رہے تھے تب ہی اچانک ہمارے علاقے میں، قریب ہماری حویلی سے کوئی بیس پچیس چھوٹے سے موضع میں فساد ہو گیا۔ اس فساد کی زد میں ہندو مسلم دونوں قوم کے لوگ آ گئے اور کئی زندگیوں کے چراغ گُل ہو گئے۔ کچھ زخمی ہوئے، جو مر چکے تھے، ان کے اہل و عیال روٹی روٹی کو ترس رہے تھے اور یہ تمام خبریں مجھ کو حویلی میں برابر مل رہی تھیں۔

ایسی صورت میں جب کہ الیکشن بھی قریب تھے، ان بے سہارا لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اس لیے میں نے اس موضع کا دورہ کرنے کی ٹھان لی اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ریشو مجھ کو جانے پر آمادہ دیکھ کر خود بھی میرے ساتھ چلنے کے لیے مچلنے لگی، اس کی ضد کے آگے مجھ کو ہار ماننا پڑا اور میں اس کو بھی ساتھ لے کر جب ہم وہاں پہنچے تو متاثرین کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ تقریباً دس بارہ

جھونپڑیاں اور کچھ پکّے مکان جل چکے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کا کُل اثاثہ بھی نذرِ آتش ہو چکا تھا۔ چاروں طرف فضاؤں میں فریادیں ہی فریادیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان کی اِس گمبھیر حالت کو دیکھ کر ریشو رو پڑی۔ اور ہم لوگ اپنے ساتھ لائے ہوئے کپڑے اور غذا کے پیکٹ ان لوگوں میں تقسیم کرنے لگے۔ وہ لوگ امدادی چیزوں کو پاکر ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعائیں دے رہے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ فضا میں ایک معصوم بچّی کے بلک بلک کر رونے کی آواز بلند ہوئی۔ اس آواز کو سُن کر ریشو فوری اس بچی کے قریب گئی اور اس کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ بچّی کسی کی شفیق آغوش کو پاکر بہل گئی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ بچّی کس کی ہے لیکن ریشو نے درمیان ہی میں ٹوک کر کہا۔ "بچے تو بھگوان کا روپ ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا کوئی قوم نہیں ہوتی۔" میں اس کی بات کو نظرانداز کر کے دریافت کر لیا، پتہ چلا کہ یہ رمضانی میاں کی بچّی ہے۔ وہ اور ان کی بیوی فساد کی نذر ہو چکے ہیں۔ یہ سننے کے بعد بھی ریشو اس بچّی کو اپنے ساتھ حویلی لے چلنے پر اڑ گئی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اس کو اس حرکت سے باز رکھوں مگر وہ تھی کہ میرے اشاروں کو نظرانداز کئے جا رہی تھی۔

میں کھُل کر مخالفت بھی نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ میں گیا ہی تھا وہاں اس لیے کہ ان غریبوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنا سکوں۔ مجھ کو مصلحتاً خاموش رہنا پڑا۔ آخرکار ریشو اس بچّی کو اپنے ساتھ حویلی لے ہی آئی۔ حویلی آنے کے بعد میرے ہاتھ سے صبر و تحمل کا دامن چھوٹ گیا۔ اور میں ریشو پر برسنے لگا۔

ریشو آج کی تمہاری یہ حرکت ناقابلِ برداشت ہے۔ آخر تم تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ہو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم میری محبت اور شفقت کا غلط فائدہ اُٹھاؤگی اور چند سال کالج میں پڑھ کر سوشیل ورکر کا ڈھونگ رچا بیٹھوگی۔

یہ سنتے ہی جیسے آتش فشاں کا منھ کھل گیا۔ اس نے اپنی

کے ساتھ میرے سوالوں کے جواب دینے شروع کیے۔

"بھیا! عوام کی خدمت کرنے کا ڈھونگ میں نے نہیں بلکہ آپ نے رچایا ہے اور الیکشن بھی آپ ہی آپ ہی کو جیتنا ہے' مجھ کو نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں بھی اور لوگوں کی طرح اس فساد کو محض ایک اتفاقیہ فرقہ وارانہ فساد پر محمول کر رہی ہوں ــــ تو میں عرض کر دوں کنور صاحب آپ مجھے سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں۔" اچانک اس کا لہجہ بدل گیا ــــ

"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ فساد آپ کا کرایا ہوا ہے۔ محض مومنسٹر کے خلاف ان غریبوں کو بھڑکاتے اور ان غریب لوگوں کے سینے میں بھڑک اٹھنے کے بعد اس کو سرد کرنے کا ناٹک رچا کر ان جاہل غریب لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام بنا کر' ان کی ہمدردیاں اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے ــــ تو کنور صاحب میں صرف آپ سے اتنا ہی پوچھنا چاہتی ہوں کہ ــ جب یہ غریب لوگ آپ لوگوں کی دلچسپی کے اس کھیل کو آسودگی بخشنے برسوں سے اپنے تن من دھن کی قربانیاں دیتے آ رہے ہیں تو کیا انسانیت کے ناطے آپ کا اتنا سا حق بھی ان لوگوں پر نہیں ہے کہ آپ کم از کم ان کے لٹے پٹے خاندانوں کے بے سہاروں کو سہارا دے سکیں ــــ اور پھر جب کہ فساد آپ کے علاقے میں ہوا ہو ــ آپ کہیں گے کہ سرمایہ داری کا دور ختم ہو چکا" اس لیے اس کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی ــــ مگر کنور صاحب آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج سرمایہ داری کے دم توڑ دینے کے باوجود بھی یہ لوگ آپ کو اپنا مائی باپ تصور کرتے ہیں اور آپ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں اگر بات صرف ان کے سمجھنے کی حد تک ہی موقوف ہوتی تو بے شک آپ ان کی سرپرستی سے مستثنیٰ قرار دیئے جاتے لیکن آپ لوگ آج سرمایہ داری کے ختم ہو جانے کے باوجود اس جمہوری حکومت میں بھی اپنے پرانے وقار کے بل بوتے پر ان غریبوں پر حکومت کر رہے ہیں اور ان کو اچھی طرح سے لوٹ کھسوٹ رہے ہیں تو کیا ایسی حالت میں آپ کا یہ فرض نہیں کہ آپ ان کی مدد کریں' ان کو سہارا دیں؟"

"ہیرے ہیرے" میں تالیاں بجانے لگا۔
"رلیشو تم بھاشن بہت اچھا دے لیتی ہو مگر اتنا یاد رکھنا کہ تمہارے ان بھاشنوں کا اس حویلی کی برسوں سے چلی آرہی روایات پر کوئی اثر نہ ہوگا اور نہ ہی میں تمہارے بھاشنوں سے متاثر ہو کر کسی غیر قوم کی لڑکی کو اپنی حویلی میں پناہ دوں گا۔" یہ سن کر وہ پھنکار اٹھی۔

"اگر یہ بات ہے تو کنور صاحب آپ بھی اچھی طرح سے اس بات کو ذہن نشین کر لیجیے گا کہ رلیشو کے فیصلے بار بار نہیں بدلا کرتے۔ اگر یہ لڑکا ہوتا تو اور بات تھی، شاید میں اس کو یہاں رکھنے پر اتنا زیادہ زور نہ دیتی۔ وہ خود اپنے لیے زندگی کی راہیں تلاش کر لیتا لیکن معاملہ ایک لڑکی کا ہے۔ ایسی صورت میں میرے آگے دو ہی راستے ہیں جن میں سے مجھ کو اپنے لیے ایک راستہ منتخب کرنا ہے۔ ایک طرف آپ کا پیار اور اس حویلی سے وابستہ ہر آسائش زندگی ہے اور دوسری طرف فرض کی پکار۔ میں ایک اچھی شہری ہونے کے ناطے فرض کی پکار پر لبیک کہتی ہوں۔ میں اس معصوم لڑکی کی حفاظت کے لیے آپ کو اور آپ کی حویلی اور اس کی ہر آسائش زندگی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

پھر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں مسکرا کر سوچنے لگا، ابھی بچی ہے، طبیعت میں طفلانہ ضد باقی ہے، دو چار دن میں آپ ہی آپ مان جائے گی۔ لیکن رلیشو کو اس رات کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھ پایا۔

اور آج اتنے برس بعد اس کو دیکھ کر میں عجیب سی کیفیت میں ڈوب گیا۔ مجھ کو یوں سوچوں میں گم دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں لیکن ہونٹوں پر وہی پرانی مخصوص پُراعتماد مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگے بھیا؟"

میں اپنی سوچوں کے دائرے سے باہر نکل آیا۔

[illegible]

" ارے کیوں نہیں ہے بھیا۔ آج بھی سوچنے کے لیے بہت کچھ باقی ہے۔
وہ باتیں کرتے کرتے کھانسنے لگی اور کھانسی سے بے قابو ہو کر اس نے گھڑا نیچے رکھ دیا۔ وہ اپنے مدقوق سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبائے کھانسے جا رہی تھی میں اس کو سہارا دینے کھڑا رہا۔ اس کی ہتھیلیاں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں میں گھبرا کر کہنے لگا۔ " ارے ریشو تم کو تو بہت تیز بخار ہے "
وہ اپنے مخصوص لہجہ میں بولی۔ " بہت پرانی خبر ہے، بھیا ذرا گھڑا تو اٹھا لینا۔ لائین تو ابھی کافی لمبی ہے۔ چلو گھر چلتے ہیں۔ آج پانی پڑوس سے لے لیں گے "
میں اس کو آہستہ آہستہ سہارا دے کر گھر لے آیا۔ وہ گھر کا ہے! بس ایک کھولی سمجھ لو، جہاں ضروریات کی نامکمل چیزیں طاقوں پر سجا دی گئی تھیں چارپائی پر ایک خوبصورت سی لڑکی بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ریشو کا یوں بے حال ایک اجنبی کے ساتھ آتے دیکھ کر گھبرا گئی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر کہنے لگی۔
" کیا ہوا اماں ۔۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ کیا کھانسی کا دورہ پھر پڑ گیا ہے، تم بھی اپنی ضد کی پکی ہو، کب تک مجھے یوں زمانے کی نظروں سے چھپائے رکھو گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ ماں تو نہ جا کر مجھ کو پانی لانے دے۔ تم کہاں مانتی ہو، آخر اپنا مزاج بگاڑ ہی لیا نا "
ریشو مسکرا کر کہنے لگی۔ " بس بس بہت کر چکی نصیحتیں، مجھ کو کچھ نہیں ہو گا پگلی، دیکھ تو تیرے گھر کون آیا ہے۔"
خوبصورت لڑکی کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ " یہ کون ہیں ماں ؟ "
" ارے کون ہو گا تیرا ماما ہے "
" سچ" وہ خوشی سے اچھل پڑی لیکن میرے ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکان بھی نہ آ سکی۔ میں خاموشی سے ریشو کو چارپائی پر لٹا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ریشو بہت زرد پڑ گئی تھی۔ کمزوری اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ وہ دھماکہ خیز انداز میں گویا ہوئی۔
" بھیا مجھ کو ٹی۔ بی۔ ہو گیا ہے اور وہ بھی آخری اسٹیج پر ہے۔ میں

سکوں گی۔ آج آپ مجھ سے آ ہی ملے ہیں تو پھر میں آپ سے چند اہم باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نہ چاہتے ہوئے بھی رحم طلب نظروں سے لڑکی کی جانب دیکھنے لگا۔ ریشو مجھ کو اس طرح رحم طلب نظروں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے پاکر گمبھیر مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

"فکر نہ کرو بھیا۔ شمو بھی میری طرح ایک حقیقت پسند لڑکی ہے اور وہ اس کم عمری ہی میں زندگی کی تلخیوں سے آشنا ہو چکی ہے۔ میں نے بچپن ہی سے اس کے اندر ہر زخم اور غم کو ہنستے کھیلتے برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر چکی ہوں کیوں کہ آگے کی لڑائی اسی کو لڑنا ہے۔" ریشو کو بات کرتے کرتے اتنی زبردست کھانسی آئی کہ سلسلۂ کلام ٹوٹ گیا۔ پانی کے دو گھونٹ پی کر اس نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

"ہاں تو بھیا! ڈاکٹر س کا کہنا ہے کہ جب انسان کی زندگی میں غم اور خوشی کا بار بار ٹکراؤ ہوتا ہے تو انسان کے سینے میں ٹی۔بی۔ کے جراثیم جنم لیتے ہیں۔ اور میں پچھلے پندرہ بیس برسوں سے اسی دھوپ چھاؤں کے کھیل کو بڑی ہی دلچسپی کے ساتھ کھیل رہی ہوں اور دیکھو تو میں اپنے سینے میں جنم لینے والے ان ننھے منے کیڑوں کو کتنے جتن سے پال رہی ہوں۔ بھیا! مانتے ہو نا میرے حوصلے کو۔" واقعی میں اس کے حوصلۂ زیست کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا اور سوچنے لگا ریشو ایک لڑکی ہوتے ہوئے بھی اپنے فرض کی تکمیل کے لیے کس حوصلہ کا ثبوت دیتی رہی۔ اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ مجھ کو اداس پا کر کہنے لگی۔

"بھیا یوں سر جھکا کر بیٹھ جانے سے کیا حاصل۔ میں تو ان آخری لمحوں میں بھی، آپ کو پھر ایک بار اپنے اعمال پر غور کر لینے کی صلاح دوں گی۔ اگر آپ چاہیں تو آج بھی اپنے کئے ہوئے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں۔ بھیا! شمع میری تخلیق نہ ہوتے ہوئے بھی مجھ کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہے۔ میں چاہتی تو یہاں آنے کے بعد شادی کر کے اپنی گرہستی آباد کر سکتی تھی لیکن میں نے

اس معصوم کو دربدر کی ٹھوکروں سے بچانے کے لیے اپنے جذبات و احساسات کی قربانیاں دیتی رہی ہوں اور میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ لڑکی کی زندگی میں میرا بھائی خزاں کا پیامبر بن کر آیا تھا اور برسوں پہلے کے گھر اور گھر والوں کو تباہ کر چکا تھا، اس کو میں زندگی کی ہر خوشی دے دوں اور میں اس کی شادی اپنی زندگی ہی میں کسی اچھے گھرانہ میں کر کے اس کی گرہستی کو آباد کرنا چاہتی تھی لیکن —— لیکن — میری یہ خواہش پوری ہونے سے پہلے ہی —— " اتنا کہنے کے بعد الفاظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے اور وہ اپنی بات نامکمل چھوڑ کر کھانسنے لگی۔ بہت سارا خون اس کے کپڑوں پر پھیل گیا، لیکن ریشو پھر ایک بار اپنی حالت پر قابو پانے میں کامیاب
" ہاں تو بھیا میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی —— اور میں اس کو دلہن کے روپ میں دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے جا رہی ہوں۔ بھیا آج پھر میری کشتی ڈوبنے کو ہے، کیا آپ آج بھی مجھ کو سہارا نہ دیں گے۔ آپ چاہیں تو میری ڈوبتی نیا کو کنارے لگا سکتے ہیں —— بھیا آپ شمو کو اپنا لیجئے۔ اپنا کر اپنے ساتھ حویلی لیجائیے اور اس کو کسی اچھے گھر میں بیاہ کر اپنے من کی شانتی حاصل کیجئے۔ میں جانتی ہوں کہ جس دن سے میں نے حویلی کو چھوڑا ہے۔ آپ ایک رات بھی سکون کی نیند نہ سو سکے ہوں گے، سوتے بھی کیسے، ضمیر چین لینے دے تب ہی نا —— آپ پچھلے برسوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ضمیر کی چبھن سے مفر حاصل نہ کر سکے ہوں گے —— اور شاید آپ کی زندگی کا یہی کرب آپ کو یوں دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور کر رہا ہے —— ورنہ آپ اس وقت اپنی حویلی سے دور اس اجنبی شہر میں کیوں آتے —" اور سچ بھی یہی تھا — میں ریشو کے چلے جانے کے بعد حویلی میں ایک دن بھی سکھ چین کی زندگی نہ گزار سکا۔ میرے سینے کی خلش مجھ کو دن بدن پاگل بنا رہی تھی۔ میں اپنے کیے پر بہت ہی نادم اور شرمسار تھا لیکن اس خلش کے باوجود بھی مجھ کو آج تک شمو سے نفرت ہی رہی۔

اور اب اپنی دم توڑتی ہوئی بہن کی آخری خواہش کو سن لینے کے بعد

بھی نہیں شمو کو اپنے سینے سے نہ لگا سکا، یہی تو وہ ظالم لڑکی تھی جس نے مجھ سے میری
بہن کو چھین لیا تھا لیکن میں ان آخری کرب ناک لمحوں میں انکار کر کے ریشو کے
جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا، اس لیے میں نے ریشو کی تسلی کی خاطر
حامی بھر لی۔ اب کی بار ریشو پر کھانسی کا اتنا زبردست دورہ پڑا کہ وہ
سنبھل نہ سکی۔ زیادہ خون خارج ہوجانے کی وجہ سے وہ بالکل ہی نڈھال
ہو چکی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگی۔ میں جلدی سے اپنے
کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے کر سننے لگا۔ شمو بھی میرے قریب آکھڑی
ہوئی۔

"زندگی کا سفر ختم ہوجاتا ہے لیکن پیار کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، ہم
مرجاتے ہیں لیکن ہماری قربانیاں زندہ رہ جاتی ہیں"

"LOVE IS LONG .. LIFE .. IS .. SHORT ..." ریشو ہچکیوں
کے درمیان اپنا آخری سندیس دے کر رخصت ہوگئی، ادھورے سپنوں کا کرب
اس کی آنکھوں میں منجمد ہوگیا تھا۔ کہیں ہونٹوں پر بڑی ہی پرسکون مسکراہٹ
پھیلی ہوئی تھی۔ شمو چند لمحوں تک اپنی ماں کے ساکت جسم کو غور سے دیکھتی رہی
اور کچھ دیر بعد بڑی ہی عقیدت کے ساتھ ماں کے قدموں پر جھک گئی اور
ماں ہی کے الفاظ دہرانے لگی۔ "LOVE IS LONG , LIFE IS SHORT."

شمو کے ہونٹوں سے اپنی بہن کا آخری سندیس سن کر میں اپنے دل پر
قابو نہ رکھ سکا، پتہ نہیں یہ ریشو کے سندیس کا اثر تھا یا شمو کے دلگرفتہ،
پرسوز لہجے کا، شاید شمو کی آواز میں کوئی جادو تھا، جو اپنے ایک ایک لفظ
سے میرے برسوں کے باغی دل کو پسیج رہا تھا۔ میرے سینے میں پلنے والی تمام
کدورتیں دور ہوگئیں اور میرے بازو آپ ہی آپ شمو کی جانب بڑھنے لگے
میں اپنے پاکیزہ جذبات کی پوری شدت کے ساتھ اس کو اپنے سینے میں سمو لیا۔

میری ریشو ۔۔۔ میری بہن ۔۔۔ میری شمو ۔۔۔ میری بیٹی ۔۔۔

شمو میرے سینے میں یوں سما گئی جیسے مدتوں سے اس کو اسی سہارے
کی تلاش تھی ۔۔۔ ●●

بلقیس شبینہ

(کہانی)

صیاد بکھرے دانے

سلیمن تھی تو ان پڑھ گنوار مگر انسان کی فطرت شناسی میں کسی ماہر نفسیات سے کم نہ تھی۔ محلے پڑوس میں گھوم کے ہر گھر کا جائزہ لینا اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے گھر والوں کا دل موہ کر اپنا الو سیدھا کرنا ہی اس کے گزر بسر کا ذریعہ تھا۔

ان دنوں نازیہ کا گھر اس کے سروے کا مرکز تھا ـــــ نازیہ کی کمزوری اس کی پکڑ میں آ گئی تھیں اور وہ بھُس کی ڈھیر میں چنگاری پھوڑنے کے موقع کی تلاش میں تھی۔ گو روپے پیسے کے معاملے میں نازیہ سلیمن کی کسو پر پوری اترتی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن سلیمن بھی سوکھے تلوں سے تیل نکالنا جانتی تھی۔

سلیمن نے نازیہ کے شوہر حامد کو تیز تیز قدم اٹھاتے گھر سے باہر جا دیکھا۔ سمجھ گئی گھر میں ضرور کچھ ہوا ہے۔ نازیہ بھی بھری بیٹھی ہوگی۔ غصے کے عالم میں انسان کو زیادہ کریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انگارے خود دہکے ہوئے رہتے ہیں۔ بڑے نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں اس موقع چلنا چاہیے ـــ اس نے تسبیح اور ڈنڈا سنبھالا اور یا حق اور یا محمدؐ کے نعرے لگاتی ہوئی مکان میں داخل ہوئی۔ دیکھا تو نازیہ کمرے کی دیوار سے کان لگا

٭ معرفت ایم جی رحمٰن اینڈ کمپنی ڈھنڈہ بلیس، اکولہ 444002 مہاراشٹر

اندر کی باتیں سُن رہی ہے۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس نے بوا کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بوا بھی اُسی سانسیں دیوار تلے بیٹھ گئی۔ دونوں بہنیں غصے میں بڑبڑا رہی تھیں ؛

" اماں کو کیا ضرورت تھی بھیا کو زکوٰۃ نکالنے کا کہنے کی " راجی کی آواز غصے سے تھرتھرا رہی تھی۔ " اپنی زندگی میں تو بہت خیرات زکوٰۃ کر چکیں صلہ عاقبت میں ملے گا لیکن اب تو یہ حال ہے گویا خود زکواۃ پر زندگی بسر ہو رہی ہے "

" چپ رہ ! کیا بکتی ہے "۔ بڑی بہن کے پندار پر جیسے بم گر پڑا۔

" سنا نہیں آپ نے ! بھیا کیا کہہ رہے تھے ۔" راجی رو دہانسی ہو کر بولی۔ " ہماری پڑھائی کا خرچ بھی بار گزر رہا ہے مگر میں ضرور پڑھوں گی۔ پڑھ کر نوکری کروں گی اور ان کے کھلائی پلائی لکھائی، پڑھائی کے خرچ کی اک اک پائی چکا دوں گی۔"

" پھر وہی شیخ چلی کی سی باتیں "۔ بڑی بہن زینی نصیحت آمیز انداز میں بولی ۔ " بہت اونچے خواب نہ دیکھا کر گڑیا " اس سے دماغ خراب ہو جاتا ہے "۔

" سُن لیا دونوں بہنوں کی بٹر بٹر " نازیہ دیوار کے پاس سے ہٹ کر پلنگ پر آ بیٹھی۔ بوا بھی وہیں دھرنا دے بیٹھی۔

" گز گز بھر لمبی زبان ہے دونوں کی۔ شادی کے بعد دوسرے ہی دن ڈولیاں واپس آ جائیں گی۔ ایسی لڑکیوں کی ساس نندوں کے ساتھ نباہ ہو سکتی ہے بھلا " نازیہ بوا سے بولی۔ سلیمن نے انکار میں سر ہلا دیا

" آپ کا کیسے ہو رہا ہے "۔ راجی جھٹ پردے سے باہر نکلتی ہوئی بولی۔

" اب بھابی کا چھوڑ دو "۔ زینی بھی جھٹ دروازے میں آ گئی۔

" کٹھ پتلی کی طرح ان کے اشاروں پر ناچنے والا بھیا جیسا کا ٹھ کا گدا ہر کسی کو نہیں ملتا "

" بات کیا کرتی ہو بچھو کی طرح ڈنک مارتی ہو "۔ نازیہ تلملا گئی۔

" آپ بھی کچھ کم چرکے نہیں لگاتیں۔" راجی دانت پیس کر بولی۔

سلیمن نے سوچا اچھا ہے اس معاملے میں میں نے اپنی زبان بند رکھی

ورنہ حیرت بھی ورثے بکھیرو بیتیں یہ لڑکیاں اس نے وہاں سے کھسک جانے
ہی اپنی عافیت جانی۔

مگر جوں ہی دونوں لڑکیوں کو کتابیں بغل میں دبائے کالج کا راستہ
ناپتے دیکھا ویسے ہی نازیہ کے پاس دوڑی آئی۔ جامد بھی گھر پر نہیں تھا
اماں اپنی عبادت میں مصروف تھیں۔ بوا کے لیے میدان صاف تھا۔ پچھلی
پھانسنے کے لیے گویا اس نے چارہ ڈالا۔

"تمہارے گھر کے رنگ ڈھنگ دیکھ کے میں تو دنگ ایج رہ گئی ما
دونوں چھوکریاں انگار کا ایج پولا ہے" اپنی بات کا ردعمل دیکھنے کے لیے اس نے
نازیہ کی طرف دیکھا مگر اس وقت وہ سلائیوں پر پھندے گن گن کر کوئی ڈیزائن
ڈال رہی تھی۔ بوا نے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے دوسرا موضوع چھیڑا۔

"دونوں چھوکریوں کی شادی بنا دیو بی جلدی سے"

"ابھی تو وہ پڑھ رہی ہیں" نازیہ اک سلائی کو دوسری سلائی کے
پھندے میں ڈالتی ہوئی بولی۔

"چھوکری ذات کو اتا کاے کو پڑاتے بی ...؟ کتاں بھی پڑیں گیاں پھر
سسرال کی ایج غلامی میں جائیں گیاں۔ وہ ایج ہنڈی چولا نصیبوں میں آتا"
بوا نے عورت ذات کی وقعت کو دو جملوں میں بیان کر دیا۔ نازیہ اب بھی چپ

"آفرین ہے بوبو تمہارے برداشت کی" سلیمن نے گویا جھیل کے
ساکن پانی میں اک کنکری پھینکی۔ "میں تو تمہارے پاس چار گھڑی بیج آیتوں آ
میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے" نازیہ نے اک ٹھنڈی سانس بھری۔ بوا نے سوچا
پانی میں ہلچل ہونے لگی ہے اک اور کنکری پھینکی جائے۔

"اللہ نے میرا دل ایج ایسا بنایا۔ کس کا دکھ درد دیکھے ایج نئیں جا
میرے سے، تمہاری گرستی کو تمہارے ساس نندان کے ہاتھاں میں دیکھ کے
میرے کلیجے کو بڑا ایج دھکا لگتا ہے"

"کیا کروں بوا" نازیہ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تم تو میری حالت دیکھ رہی ہو" اس نے سلائیاں اور اون نیچے

رکھ دیا۔ بوا دل ہی دل میں بولی مچھلی گل میں آ رہی ہے۔

"ہوواں سوک کے کا نٹا سے ہو گئی یہ بالکل"۔ بظاہر لہجہ بڑا ممتا آمیز تھا لیکن دل میں کہہ رہی تھی "نندوں کے راج میں پلنگ پہ بیٹھ کر مرے ڈھور کے جیسی پھول رئی ہے۔

"دلہن بیگم" سلیمن بڑے منت بھرے انداز میں نازیہ سے بولی۔

"تم کو اپنی مری بیٹی شکورن کی قسم دیتوں مری بس اک بات مان لیو اللہ کے نام میں بڑی اچ برکت ہے بی بی۔ کتوں کے اجڑے گھر بسائی میں نے۔ یہ اچ چکٹی بھر خاک، دو گھونٹ دم کرا وا پانی۔ گنڈا ڈورا۔۔۔ بن پڑھی لکھی چھوکریاں کا ایمان اچ نئیں آتا ایسے باتاں پر۔ چلو نکالو دو ہرے پتے اور دیکھو کیسا چکر چلا تیوں تمارے گھر میں۔ مرد تلوے چاٹیں گا اور ساس نندان تمارے جوتی کے تلے دب کر نئیں رہ گیاں تو میرا نام بدل دینا۔"

نازیہ نے بے یقینی سے بوا کی طرف دیکھا۔ بوا نے جھٹ تسبیح کے دانے گھمانے شروع کر دیئے۔ "یارب۔۔۔ یا مدار"

نازیہ نے چپ چاپ کچھ نوٹ سلیمن کی طرف سرکا دیئے۔ بوا نے نوٹ اٹھا کر جھٹ سینے میں اڑسے اور بولی۔

"اب دیکھو بی زندہ شاہ ولی کا چمتکار۔ پانچ جمعراتاں کے اندر تمارے سارے اچ مراداں پورے ہو ئیں گیاں۔ تمارے نندان کو اٹھانے کا بیڑا ابھی مئیں اچ اٹھاتیوں۔۔۔ اللہ رسول سب کا بھلا کرے۔"

بوا نے بازار سے سات لیموں، سات پان، سات سوئیاں، تھوڑا لوبان اور کالے رنگ کا دھاگہ خریدا۔ اک شیشی میں نل کا پانی بھرتے ہوئے خود سے بولی: "یہ ہو گیا آبِ حیات" اپنے ہی چولہے کی راکھ نکال اس کی سات پڑیاں باندھی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ رہی اکسیر۔"

سب ساماں لے کر نازیہ کے پاس جا دھمکی۔ ساماں کو بڑے احتیاط سے اس بیکے حوالے کیا۔ "لیو بی بی سنبھالو اپنی امانت۔ جان چوکھوں میں ڈال کر

بھلا یہ کام کریوں۔ وہ ہانپتے ہوئے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگی جیسے بہت تھک
گئی ہو۔ پھر بولی:

”جمعے کے دن یہ اود بلاؤ سب کے ناکاں میں اس کی خوش بوئے جا
سنیچر کو زوال کے وقت سات پان میں سات سوئیاں ٹوچ کر چولے میں گاڑ
سو لو۔ شیشی کا آبِ حیات، پوڑیوں میں کی اکسیر، ہور نمبو کا رس، یہ سب
چیزاں کھانے پینے کے ساماں میں ملا کو کیسا بھی کر کے سب کو کھلا دیو۔ او
جمعرات کی بہانٹ کو اُٹھ کر یہ کالا تاگا اپنے کمر پر باندھ لیو بی بی۔ بس پھ
دیکھو سلیمن کا کمال۔ سارا گھر بولیتوں کیا ساری اپچ دتیا تمارے آگو پیچھو
پھریں گی۔“

بوا نے فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ نازیہ کی طرف پھر اپنے ہاتھ
سے اپنے پاؤں دابتی ہوئی تھکے تھکے سے انداز میں بولی۔

”ٹانگاں ٹوٹ گیاں باواجی کی طرف چکراں لگاتے لگاتے۔ جیسی جترا لگ
یہ باوا کے دربار میں۔ موٹراں کیا کہتے گاڑیاں، رکشا، ٹانگے بس چلے ایچ
آرئے لوگ کھیڑے سے پاڑوں سے۔“ سلیمن چادر پھیلا کر وہیں لیٹ گئی اور
آنچل سے ہوا کرتی ہوئی بولی۔ ”بھوت تھک گیوں۔ ذرا سا شکر کا پانی
دیو، دولن میرے کو۔ حلق سوک ریا۔“

”ہاں بوا روح افزا کا شربت لاتی ہوں بنا کر۔“ نازیہ جھٹ سے بولی۔

ہاں! یہ ہوئی نہ بات۔ سلیمن دل ہی دل میں بولی۔ سوکے کنویں سے
کیسا پانی نکل ریا اب۔ شیشے میں اُتر گئی سیانی بلی۔ گویا بولنے اپنے آپ کو دا

اسی طرح وہ نازیہ سے کسی نہ کسی بہانے بیسیوں مرتبہ پیسے لے گئی۔
اک دن نازیہ نے ٹکا سا جواب دے دیا تو سلیمن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
مگر اس کے بگڑے تیور دیکھ کر نازیہ کچھ نرم پڑ گئی۔ بولی۔

”بڑے ہیر پھیر سے اتنے روپے بچا پائی تھی بوا۔ جاؤ تو دمڑی
دمڑی کا حساب لیتے ہیں مجھ سے۔“

”اللہ رسول کے کاماں میں دل چھوٹا نئیں کرنا بی“ سلیمن بڑے

ے مخلصانہ انداز میں بولی پھر آنکھیں بند کرکے تسبیح کے دانے پھیرنے لگی۔ "مونی مُرگی سے کو تو کھڑک ہونے تک نئیں چھوڑوں گی، نام کی سلیمن ہوں۔" بظاہر تسبیح کے دانے ہل رہے تھے اور دل میں ان باتوں کا ورد ہو رہا تھا۔ آخرکار نازیہ نے اسے پچاس کا نوٹ دے ہی دیا۔

اک دن زینی کے رشتے کی بات لے کر آئی۔ لگی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے :—

"بڑا ایچ اچھا رشتہ لائیوں، راج کریں گی منیا تماری۔ تیسا اچھا بولو تو بڑی ماں کے روزے نمازاں کی خیر برکت۔ ایسا گھر مل ریا چھوکری کو۔ بولو تو پوتی کے واسطے حویلی ماڑی باندھ دیں گے۔ ماہر تا کد سے الگ۔ جتا بولو اتا۔ سنا چاندی گہنے پاتے کی تو بات ایچ مت پوچھو۔ تمارے بھی سارے لدّر دور ہو جائیں گے بُو۔"

"آخر کچھ اتا پتا بھی بتاؤگی۔" نازیہ قطع کلام کرکے بولی۔

"نواب برکت اللہ۔" بوا نے بڑے فخر سے کہا۔

"نواب برکت ...." نازیہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر.....!"

"اب تم بولیں گے اس کو عورت ہے جوان جوان بچے ہیں۔"

سلیمن نے نازیہ کے منہ کی بات اُچک لی: "تو سنو! بڑی بیگم بچاری لنگڑی لولی ہو کے ایک کونے میں پڑی ہے۔ بچے سب ایچ جان جمان ہیں زینی سے کچھ واسطہ ایچ نئیں رہیں گا ان کا۔ ہور نواب کو کیا دیکھیتو ... گورا گٹا، لمبا چوڑا، پورا شیر ایچ دکھتا۔ ساٹھ کا ہوے کیا ستر کا... دیکھتا تو جوان سریکا۔ ہور پھر مرد ذات کی اُدمر تھوڑیچ دیکھتے۔" سلیمن نے نازیہ کی طرف دیکھا پھر یاں کی جگالی کرتی ہوئی بڑے شاطرانہ انداز میں بولی۔ "ایسا کہ تو میں نے پچھادیوں بی بی اب مورے پٹانا تمارا ایچ کام ہے۔"

"نہیں نہیں بوا!" نازیہ بولی۔ "حامد اس رشتہ کے لیے ہرگز راضی نہ ہونگے۔"

"ای کیسی عورت ہے ماں تم۔" سلیمن نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اک خدا خدا سے عیباں کو دوسرے خوبیاں کے ساتھ بولنا پڑتا۔ عورت ذرا چاؤ سے پیرت سے باتاں کرے تو میاں کے آنکھیں پر موہ کا پردہ پڑ جاتا۔" سلیمن نے نازیہ کی طرف دیکھا۔ اسے خاموش دیکھ کر پھر پینترا بدلا۔

"زبان بندی کا تعویذ لاتیوں گم سُم باوا کے پاس سے۔ انکار میں زبان اچ نئیں ہلائیں گا کوئی۔ بس ایک پچاس کا پتہ چھوڑ دے دیو جی۔ اس نواب سے تماری نند کا رشتہ جڑ گیا تو تمارے بھی وارے نیارے ہوجائیں گے۔"

بادل ناخواستہ نازیہ نے پھر روپیے دے دیئے۔

نوٹ لے کر بوا گھٹنے پر ہاتھ رکھے اٹھتی ہوئی بولی۔ "اللہ رسول بس ایسے اچ نیکیں کے کام کرائے۔ دوسروں کی خدمت کرتے کرتے اچ میرے آنکھیں موندنا میرے پروردگار ..."

سلیمن کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ اس نے نازیہ سے بھی خوب روپے اینٹھے تھے۔ اُدھر نواب صاحب الگ مہربان تھے۔ زینی جیسی حسین و جمیل تعلیم یافتہ دوشیزہ کو پانے کے لیے۔ لیکن سلیمن کو اندازہ ہوگیا کہ نواب کا معاملہ زینی کے ساتھ طے نہیں ہوسکتا۔ دونوں طرف سے خوب روپے اینٹھنے کے بعد اس نے چاہا کہ اس ناٹک کا اینڈ کر دیا جائے۔

ایک دن موقع پاکر سلیمن زینی کے پاس پہنچی۔ نازیہ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ بھائی بھی گھر پر نہ تھے۔ اس نے جاتے ہی زینی سے کہا۔

"تماری بھابی تمارا رشتہ بڈھے نواب برکت اللہ سے کرائی ہے۔ سب باتاں طے ہوگیا۔ نواب شادی کے واسطے بیس ہزار روپیہ دے دیا۔" زینی یہ سن کر جیسے سناٹے میں آگئی۔

"میرے کو تماری جوانی پہ ترس آگیا بی بی۔" سلیمن نے زینی کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جب اچ آکو بتا ریوں۔"

اس سراغ رسانی کے صلے میں زینی کی طرف سے بھی بوا کو انعام مل گیا۔

پھر داد و تحسین، اظہارِ تشکر الگ۔

گھر آ کر سلیمن نے جھٹ اپنا بوریہ بستر سمیٹا۔ اُسے معلوم تھا نازیہ کے رستے لوٹتے ہی ان کے گھر زبردست ہنگامہ ہوگا اور پھر نازیہ کی عدالت اُسے گواہ کے لیے بلوایا جائے گا اور اس کی ساری پول پٹی کھلنے پر اس کی بوٹی کر دیں گے وہ لوگ۔ اس لیے یہاں سے کھسک جانے میں ہی بہتری ہے۔

اس نے اپنی گٹھری، ڈنڈا اور تسبیح سنبھالی اور ہانپتی کانپتی نواب صاحب ڈیوڑھی پر جا پہنچی۔

"او ندھے خصماں ... اجاڑ ماری کس کی صورت دکھ گئی آج ؟" اس نے ... پر ہاتھ مارا اور دھم سے زمین پر گر پڑی۔ کچھ دیر بعد وہ نواب صاحب ... روبرو تھی۔ چپ چپ سی ... اداس ... آنکھیں چھپکائے، روہانسی صورت ... نواب صاحب نے اس نظر اس پر ڈالی۔ "کچھ پریشانی ہے؟"

"سر سے پاؤں تک پریشا نیچ پریشانی .... میرے کو تو رونا آریا ... صاحب" وہ اپنی خشک آنکھیں دونوں انگوٹھوں سے رگڑنے لگی ... صاحب نے اک ٹک دیکھا پھر انگور کے خوشے سے انگور توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

"نازیہ کے گھر سے آ رہیوں ..." سلیمن نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا ... ران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سارا معاملہ جم گیا تھا۔ لڑکی کا بھائی بھی بس راضی اچ سمجھو مگر ..." ... لنے چلے کو مگر کا بریک لگا کر معاملہ فہم نگاہوں سے نواب صاحب کی طرف دیکھا۔

"پھر ...." نواب صاحب کا لہجہ تجسس آمیز تھا۔

"معلوم نہیں کیسے، لڑکی کو معلوم پڑ گیا۔ سارے گھر کو سر پر اٹھالی ... نے ... زہر اپنے کھا کو مر جاؤں گی بولی۔ ہور میرے کو تو کچا ایچ چبا ڈال تیوں ... لی ... اب کیسی بی اپنا منہ کالا کرتیوں نواب صاب۔ دیس بدر ہو رہیوں۔" ... گھٹنوں پر سر دیئے رونے لگی۔

"کسی قریبی رشتہ دار کے پاس چلی جاؤ' کچھ دن۔"

"میرا کوئی نئیں نواب صاب۔ اِتّی بڑی دنیا میں آپ کے اچ سایہ میں زندگانی گزار رئی تھی... مگر اب ... در در کی ٹھوکراں کھاؤں گی بڑھاپے میں۔"

وہ پھر رونے کی اداکاری کرنے لگی۔

"تمہارے ٹھکانے کا بندوبست ہوجائے گا سلیمن۔" نواب صاحب بولے۔

"اللہ آپ کو لمبی عمر دے نواب صاب۔ ساری عمر سے آپ کا نمک کھاریوں۔ مگر میرے سے آپ کا یہ چھوٹا سا کام بی نئیں ہوا۔ یہ اچ بڑا صدمہ ہے میرے کو۔"

"ارے ہٹاؤ بوا۔" سَو کا نوٹ سلیمن کی طرف پھینکتے ہوئے نواب صاحب لاپرواہی سے بولے۔

سلیمن نے نوٹ اٹھا کر جھٹ پلّو میں باندھا اور نواب صاحب کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔ "آپ کی جوانی سلامت رئے سرکار۔ آپ کے لیے چھوکریوں کا کال نئیں یہ۔ بندی حاضر اچ ہے۔ آپ کے لیے چاند کا ٹکڑا لاؤں گی۔"

٭٭

فارم نمبر ۴
تحت تفصیلات
ملکیت بابتہ ماہنامہ
شاداب' حیدرآباد

زبان بصراحت وقفہ : اردو ماہنامہ "شاداب"
مقام اشاعت : ۴/۱۔۵۔۱۱ 'ریڈ ہلز' حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۴
ایڈیٹر' پرنٹر' پبلشر اور مالک کا نام : محمد قمر الدین صابری
قومیت اور پتہ : ہندوستانی۔ ۴/۱۔۵۔۱۱ 'ریڈ ہلز' حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۴

اس ماہ نامہ کے کوئی اور مالک یا شراکت دار نہیں ہیں۔

میں محمد قمر الدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع اور یقین کی حد تک صحیح ہیں۔ فقط : محمد قمر الدین صابری

ڈاکٹر محمد منشاءالرحمٰن منشاؔ

"زینت عالم"

وہ ہستی جس کے دم سے محفلِ عالم کی زینت ہے
حقیقت میں وہ عورت ہے وہ عورت ہے وہ عورت ہے

یہی ہے جس سے قائم ہے یہاں سنتان انسان کی
یہی عزت ہے انساں کی یہی ہے جان انساں کی

زمانہ جسکو قدرت کا حسین شہ کار کہتا ہے
کبھی کہتا ہے گل جسکو کبھی تلوار کہتا ہے

یہ گل بن کر چمن میں مخزنِ صد رنگ و بو ٹھہرے
بنے تلوار تو ہر رن میں اٹھ کر سرخرو ٹھہرے

یہ وہ موتی ہے جو رنگ اور درج میں سب سے اعلیٰ ہے
یہی وہ شمع ہے جس سے ہر جانب اجالا ہے

خلوص و آشتی کا دل نشیں پیکر اسے کہیے
نگاہ و جان و دل کا اک حسین محور اسے کہیے

اسی کا روپ ہے مریم ہو سیتا ہو کہ ساوتری
یہی ہے صاحبِ کردار مثل فاطمہ بی بی

بڑی صابر بہت شاکر بڑی غم خوار ہوتی ہے
کھلا کر دوسروں کو بارہا بھوکی بھی سوتی ہے

وجود اسکا ہے مرکز درحقیقت خیر و برکت کا
اسی سے نام ہے زندہ جہاں میں اُنس و الفت کا

یہ اپنے گود کے پالوں کو جب جینا سکھاتی ہے
وفورِ درد سہتے ہوئے بھی مسکراتی ہے

اا۔ اے۔ شارکی ٹاون ۔ ناگپور ۔

اسعد گھنڈوی

بہن کے نام

مری بہن مری ماں جائی اے عزیزۂ من
ہے تیرے کرب کا احساس بھی مجھے لیکن
مگر یہ بات جو سمجھا رہا ہوں میں تم کو
ہمیشہ اس کو
تم اپنے ذہن میں ہی رکھنا
بدلتا رہتا ہے یہ وقت
ایک سا نہیں رہتا
کبھی ہے دن تو کبھی رات
تم نے دیکھا ہے
غموں کے بعد
خوشی کا بھی دور آتا ہے
کبھی کبھی تو خوشی کو بھی
ہم ترستے ہیں
غموں کا پھر کوئی
طوفان سا امنڈتا ہے
یہی وہ وقت
جسے امتحان کہتے ہیں
یہی وہ دور جہاں
صبر ہم کو کرنا ہے
اسی کی کر گئے
اسلاف بھی ہمیں تلقین
کسی کا صبر کبھی رائیگاں نہیں ہوتا
مری بہن مری ماں جائی اے عزیزۂ من
ہے تیرے کرب کا احساس بھی مجھے لیکن
جو تم نے لکھا ہے
اے بھائی اب مرے گھر میں
اب ایک پل بھی سکوں کا
نہیں گذرتا ہے
تمہیں ہے نندوں سے شکوہ
بہت ستاتی ہیں
جہیز لائی ہو کم
اس کا طعنہ دیتی ہیں
تمہاری ساس بھی تم کو بہت رلاتی ہیں

ہیڈ ماسٹر - ایم ایس - پردیسی پورہ - کھنڈوہ

ہر اک بات میں جھڑکی ہے
گالیاں ہیں بہت
کہاں تلک میں کروں صبر اب نہیں ہوتا
پڑوسنوں سے کوئی بات کر نہیں سکتی
کوئی سہیلی مرے گھر میں آ نہیں سکتی
میں پر کٹا ہوا پنچھی ہوں اُڑ نہیں سکتی
کوئی بھی حرف زباں پہ میں لا نہیں سکتی
مری بہن مری ماں جائی اے عزیزۂ من
بجا ہے ٹھیک ہے
ہر گھر میں ایسا ہوتا ہے
طرح طرح کے ستم اس پہ ڈھائے جاتے ہیں
اسی طرح سے دلھن آزمائی جاتی ہے
دلھن کی چرب زبانی ہی
اس کی دشمن ہے
ہر ایک بات جو بولو تو تول کر بولو
مری بہن مری ماں جائی اے عزیزۂ من
بہن سمجھتی ہے یہ ہی
کہ میری بھابی نے
ہمارے بھائی کا سب پیار
ہم سے چھین لیا
تمہاری ساس بھی شاید یہی سمجھتی ہے
کہ تم نے ان کے ہی بیٹے کو
اپنے بس میں کیا
[illegible]

مری بہن مری ماں جائی اے عزیزۂ من
ہو جس طرح سے بھی
نندوں کے دل کو تم جیتو
انھیں یہ سمجھو کہ ہیں
یہ مری سگی بہنیں
تم اپنی ساس کی جھڑکی کو
سمجھو ماں کا دُلار
تم اپنی شیریں کلامی سے
سب کو بانٹو پیار
ادب ملحوظ رہے جس طرح زباں کھولو
بُرا بھلا کوئی بولے
تو ہنس کے تم بولو
پھر اس کے بعد تم دیکھو
بہار آئے گی
کلی کلی ہر غنچہ کی مسکرائے گی
تمہاری گود ہری ہوگی
مسکراؤ گی
یہ وقت بدلے گا
ہاں ہاں ضرور بدلے گا
مری بہن مری ماں جائی اے عزیزۂ من
یہ وقت بدلے گا
ہاں ہاں ضرور بدلے گا

آظہر الدین آظہر

دہشتوں

روز اخبار کی سرخیاں دیکھ کر ننھی بوڑھی جواں ارتھیاں دیکھ کر
یہ اُجڑتا ہوا گلستاں دیکھ کر خون روتا ہے دل مہرباں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

عصمتوں کے خزانے بکھرنے لگے بے گنہ جسم سے سر اترنے لگے
وحشتوں کا یہ عالم کہ ڈرنے لگے لوگ اپنی ہی پرچھائیاں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

کیوں ہے گجرات تصویر شمشان کی کیا ہے پہچان ہندو، مسلمان کی ؟
موت کہہ دو کہ ارزاں ہے انسان کی بھاریہ خون کی ہولیاں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

دل پریشان ہے عقل بھی دنگ ہے آسماں دور ہے اور زمیں تنگ ہے
بھیمڑ کا کیا ملی گذشتہ کا بھی رنگ ہے یاد آتا ہے ماضی نشاں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

ختم کب ہو گی بارش فسادات کی ریت کس دھرم کی ہے یہ کس ذات کی
یہ سسکتے ہوئے جلتے حالات کی وہ لکھیں تو مگر داستاں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

یوں تو وہ دن کو بھی رات بتلائیں گے   اونچ اور نیچ سب ذات بتلائیں گے
سب کی قسمت کے حالات بتلائیں گے   کنڈلیاں چھوڑ کر راشیاں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

کل کے حالات بھی تو تمہیں یاد ہیں   کل تھے آزاد یا آج آزاد ہیں
ہنس رہے ہیں کہ ہم پھر بھی برباد ہیں   لوگ آزاد ہندوستاں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

ہیں تصادم شہروں کے اب آئے دن   زخمیوں کی ہے کیا اصل تعداد گن
خون جمتی ہوئی لاش سے کھائیں گھن   یہ محکمے کی کوتاہیاں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

لوٹ کر گھر جلا تا ہی سیوا ہوئی   چند روزہ سہاگن تھی بیوہ ہوئی
زندگی اس کی اب جان لیوا ہوئی   ٹوٹی پھوٹی ہوئی چوڑیاں دیکھ کر
چُپ رہا چُپ رہا آسماں دیکھ کر

جھانکتے چیتھڑوں سے بدن دیکھ لو   بھوک و افلاس کا یہ وطن دیکھ لو
ننھے بچوں کا دیوانہ پن دیکھ لو   وہ جھپٹتے ہیں جب روٹیاں دیکھ کر
چپ رہا چپ رہا آسماں دیکھ کر

یوں نہ جل پائیں گی آئے دن بستیاں   فرقہ وارانہ مٹ جائیں گی ہستیاں
کچھ تو قانون میں لائیے سختیاں   جرم بھاگے گا قانون داں دیکھ کر
چُپ رہا چُپ رہا آسماں دیکھ کر

زندہ لاشوں کے تاجر بھی انساں ہیں   اور گلشن کے گلچیں نگہباں ہیں
کس لیے آپ اظہر پریشان ہیں   آشیاں دیکھ کر بجلیاں دیکھ کر
چُپ رہا چُپ رہا آسماں دیکھ کر

غزلیں

ڈاکٹر محبوب راہی

ہر نفس کے ساتھ ہے اپنی انا کا سلسلہ
منقطع کیونکر ہو بندوں سے خدا کا سلسلہ

شہر کی مسموم تہذیبی ہوا کا سلسلہ
آ گیا ہے گاؤں تک مکر و ریا کا سلسلہ

کھو کھلے اندھے عقیدوں پر نہ تکیہ کیجئے
جوڑ کر رکھیے دُعاؤں سے دوا کا سلسلہ

اب بھی شمرِ وقت ہیں ہر گام پر نیزہ بدست
اب بھی جاری ہے وہی کرب و بلا کا سلسلہ

رفتہ رفتہ پھیلتا جاتا ہے ہر اک ذہن میں
عصبیت کی جان لیوا اک وبا کا سلسلہ

موت کیا ہے درمیاں دونوں کے بس اک مرحلہ
اِس جہاں سے اُس جہاں تک ہے بقا کا سلسلہ

بھیڑیوں کو چھوٹ دے کر آپ ہی بتلایئے
ختم ہو سکتا ہے کیا جور و جفا کا سلسلہ

قتل، ہنگامے، فساد و شورش و غارت گری
بن چکا ہے اب تو یہ سب بارہا کا سلسلہ

قیس سے، رانجھا سے اور فرہاد سے ہوتا ہوا
مجھ پر آ کر ختم ہوتا ہے وفا کا سلسلہ

آپ اپنا راستہ راہی بنا لیتا ہوں میں
کیا ضروری ہے مجھے پھر رہنما کا سلسلہ

گلزاری مسجد، بارسی ٹاکلی۔ 444401
ڈسٹرکٹ: اکولہ

ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد

رازِ دل اپنی نگاہوں میں چھپا لیتے ہیں!
خود کو اقرارِ محبت سے بچا لیتے ہیں

یہ بھی احساسِ شناسائی بہت اچھا ہے
دیکھ کر مجھ کو وہ پتھر تو اٹھا لیتے ہیں

ہم سے دیوانوں کو ساحل کی نہیں کوئی طلب
بڑھ کے طوفان کو سینے سے لگا لیتے ہیں

میری نظروں میں جو پڑھتے ہیں رموزِ چاہت
شرم سے اپنی نگاہوں کو جھکا لیتے ہیں

بات کرتے ہیں جہاں لوگ خلوصِ دل کی
وقت آتا ہے تو دامن کو بچا لیتے ہیں

عزم والے نہیں ہوتے ہیں رہینِ منت
اپنی منزل کا پتہ خود ہی لگا لیتے ہیں

ظرف والے کہیں جھکتے ہیں بھلا اے ساجد
اپنا ماحول تو یہ خود ہی بنا لیتے ہیں

نزد نچی مسجد، جلال پورہ، کھام گاؤں، مہاراشٹرا

غزل

ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد

کبھی مسکراہٹ، کبھی اشک پیہم، کبھی بن کے اک نغمۂ روح پرور
اب اس طرح آ نے لگا درد تیرا مری زندگانی میں پہلو بدل کر
خزانہ مسرت کا دل میں ہے پنہاں یہ دولت نہ ڈھونڈے مسرت کے جویا
کہستاں کہستاں، بیاباں بیاباں، گلستاں گلستاں، سمندر سمندر
ہر اک شئے جہاں کی سپردِ فنا ہے فقط اک محبت کہ حاصل بقا ہے
ابھی زندہ ہے نامِ فرہاد، خسرو نہ دارا ہے باقی نہ باقی سکندر
یہی ہے اگر نو بہاروں کا عالم تو گلشن کی دنیا خزاں کس کو سمجھے
جب اہلِ گلزار کی زندگی ہے کہیں موجِ طوفاں کہیں شنعِ صرصر
نہ دل میں محبت نہ آنکھوں میں الفت نہ چہروں پہ تاباں ضیائے مسرت
اب ان منزلوں تک بشر آ چکا ہے تمدن کے خوش رنگ جادے پہ چل کر
یہ بغض و عداوت کے شعلوں کا عالم، زمانہ تو جل کر بھسم ہو چکا ہے
کوئی اب ذرا مجھکو یہ تو بتائے ابھی آ ئے گا کیا کوئی روزِ محشر
جو معلوم ہوتی ہمیں یہ حقیقت کہ دنیا بیاباں کو کہتی ہے گلشن!
تو ہرگز نہ لفظوں کے دھوکے میں آتے نہ آتے کبھی اپنے گھر سے نکل کر
ذرا ایک قطرے پہ نظریں جما لے، ذرا ایک قطرے کو دل میں بسا لے
ذرا ایک قطرے کی گہرائی پالے سمندر کے اے معرکہ زن شناور

قطعہ

ندا ہائے فردا سے بے تاب ہو کر زمانہ نئی کروٹیں لے رہا ہے
سنبھل کر رہے اب ذرا تختِ شاہی خبردار ہو جائیں اورنگ و افسر
نئی زندگانی ہے اب بحر و بر میں، نئی زندگانی ہے اب دشت و در میں
نئی زندگانی ہے کوہ و کمر میں، یہ جدت کے انداز اللہ اکبر

روف رحیم

والد محترم حضرت تاباں کی یادیں

"یادیں"

یادوں کا وہ ایک بارِ گراں چھوڑ گئے ہیں
جینے کے لئے کچھ تو یہاں چھوڑ گئے ہیں

وہ چھین گئے ہیں مری نیندیں مرے سپنے
حصے میں مرے آہ و فغاں چھوڑ گئے ہیں

معیار بنایا تھا جنھیں علم و عمل کا...
وہ دل میں مرے دردِ نہاں چھوڑ گئے ہیں

آنکھوں میں بسے تھے جو کبھی نور کی صورت
آنکھوں کے لئے اشکِ رواں چھوڑ گئے ہیں

لے کر تو چلے تھے وہ مجھے جانبِ منزل
رستے میں مگر نالہ کناں چھوڑ گئے ہیں

وہ نیک صفت نیک عمل حضرت تاباں
عقبیٰ میں مزے میں ہیں، جہاں چھوڑ گئے ہیں
حیران ہے رحیم آخری دیدار دکھا کر
وہ سوز بہ دل شعلہ بہ جاں چھوڑ گئے ہیں

قطب الدین ماہر صادقی

غزل

میں پھر سے شہرِ نگاراں کی سمت جا نہ سکا
کسی بھی دشت میں اپنا مکاں بنا نہ سکا

سبھی زمانے میں ہنستے ہیں یوں تو دیکھا ہے
میری طرح سے کوئی اور مسکرا نہ سکا

وہ انجمن تیرے جلووں سے آج روشن ہے
جسے میں اپنے لہو سے بھی جگمگا نہ سکا

دیئے تھے وقت نے کچھ ایسے زخم بھی مجھ کو
کہ جن کی کوئی زمانے میں تاب لا نہ سکا

چمن میں یوں تو ہنسے گل بھی کھل کھلا کے مگر
کوئی بھی تیرے تبسم کی بات لا نہ سکا

یہ بدنصیبی نہیں ہے تو اور کیا ماہر
تھا جام ہاتھ میں لب سے مگر لگا نہ سکا

خدمتگار محلہ، مہو - ضلع اندور - ایم پی

غزل

جاوید اشرف فیضی

نے کہا کہ انجمن آرائیوں میں ہوں
دوست میں تو صرف تماشائیوں میں ہوں

تو کہاں سمجھتا ہوں میں دور آپ سے
ایک لمحہ آپ کی تنہائیوں میں ہوں

یہ گو اپنے آپ سے سمجھو جدا مگر
جانتا ہوں روح کی گہرائیوں میں ہوں

ہجو میری تو یہ لکھو مرا پتہ
نڈو سمجھے کہ عشق کی دانائیوں میں ہوں

ت سے آسماں کی بلندی نہ پا سکا
زمیں پہ بھی نہیں گہرائیوں میں ہوں

مالش میری ہو گئی ہے وقفِ شاعری
رف فیضی! قافیہ پیمائیوں میں ہوں

معرفت - نیشنل ٹیلرس
مین روڈ - ملاورکیلا

غزل

غریب بدایونی

سبھی دیکھے ہیں جانے یہ بنا ہے کس کا آئینہ
مرا چہرہ بہر صورت ہوا جس تس کا آئینہ

جو اہلِ درد و غم کا درد اپنے دل میں رکھتا ہے
نظر آتا ہے اسکا دل، دلِ مفلس کا آئینہ

نظر آئیں تو حاصل ہو ہمیں کیفیتِ بادہ
کہ اُس ظالم کی آنکھیں ہیں گلِ نرگس کا آئینہ

ہمارے سامنے ہے ذکر اُس روئے منوّر کا
ہمارے سامنے ہے حسن کی مجلس کا آئینہ

یہ شیشہ اپنی فطرت میں بڑے اوصاف رکھتا ہے
بنا لیں ہم بھی اپنے دل کو چاہے جس کا آئینہ

میرے عشق و محبت کا کوئی گوشہ نہیں دھندلا
ملے گا صاف اور شفاف تم کو اس کا آئینہ

معرفت - نیشنل ٹیلرس
مین روڈ - ملاورکیلا

رباعی علامہ مشرقی مع تراجم

راہے کہ بمنزل نرساند کفر ست　　طاعت کہ حکومت نہ دہاند کفر ست
ہر عسر کہ یسرش نہ ہویداست خطا　　اسلام کہ غالب نہ کناند کفر ست

وہ راہ جو منزل نہ دکھائے ہے کفر　　طاعت جو حکومت نہ دلائے ہے کفر
آسانی کا امکاں نہیں مشکل ہے غلط　　وہ دین جو غالب نہ بنائے ہے کفر

سید معز الدین قادری ملتانی

جس راہ سے منزل نہ ملے دھوکہ ہے　　طاعت بھی حکومت جو نہ دے دھوکہ ہے
آسانی نتیجہ ہے سدا سختی کا　　اسلام جو مغلوب رہے دھوکہ ہے

حسن الدین احمد

ہاں کفر ہے جو راہ کہ منزل پہ نہ جائے　　ہاں کفر ہے طاعت جو حکومت نہ دلائے
وہ عسر غلط یسر نہ ہو جس کے بعد　　ہاں کفر ہے اسلام جو غالب نہ کرائے

عبدالمقتدر خاں ناظم

وہ کفر ہے منزل کو نہ پہنچائے جو راہ　　وہ کفر ہے طاعت، نہ ملے جس سے :
تکلیف سے راحت نہ ملے، گمراہی　　وہ کفر ہے اسلام، نہ ہو جس سے توشا

میر ولایت علی

جو رہ سوئے منزل نہ چلے کفر ہے کفر　　طاعت جو حکومت نہ کرے کفر ہے کفر
تکلیف جو راحت نہ بنے عین خطا　　اسلام جو غالب نہ رہے کفر ہے کفر

عبدالقیوم خاں باقی۔

ڈاکٹر نصرت چودھری

برہن

خط میرے سامنے ہے اور میں سوچ رہی ہوں
تمہارے الفاظ میں یہ نرم آنچ
کسی دہکتے لمحہ سے عبارت ہے
رات ویران ہے
دور تک سیاہ اندھیرے
قرونِ وسطیٰ کے کسی روایتی عفریت کی طرح منھ پھاڑے
میرے منتظر ہیں

میں نادان
اب بھی سوچ رہی ہوں کہ شاید تم آجاؤ
اور پھر اچانک
کوئی خوبصورت سی ان کہی بات
ہمیں یاد آجائے
اور میں شرم سے دوہری ہوکر
اپنی پلکیں جھکالوں

دستک ہوئی
کیا واقعی تم آگئے ہو یا

رفیقہ شعبۂ اُردو (کارسپانڈنس)، جموں یونیورسٹی۔ جموں توی 180001 (کشمیر

میری سماعت مجھ سے انتقام لے رہی ہے
پھر دستک ہوی
ہاں مجھے یاد آیا
تم میرے دل کی دہلیز پر کھڑے صدیوں سے دستک دے رہے ہو
مگر میں کواڑ کس طرح کھولوں
تم کیا جانو
اس دنیا نے کتنی زنجیریں
مجھے پہنا دی ہیں
میں تمہاری آواز سنتی ہوں
مگر ہل نہیں سکتی ——

شاداب شاداب

ہمیشہ کی طرح دسمبر کا "شاداب" کا شمارہ اپنے "شباب" پر ہے۔ خصوصاً نوجوانوں کا خصوصی نمبر ہونے کے سبب بے حد پسند آیا اس خصوصی شمارہ کا ہر ورق دلچسپی سے بھرپور اور علم و عمل سے لبریز ہے۔ خصوصاً عبدالحی صاحب کی تلخیص "محبت: جنس اور انداز" حقیقت سے قریب ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے ویسے شاداب کا ہر ورق پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاداب کو نکھارنے سنوارنے میں یقیناً آپ کی انتھک محنت شامل ہوگی۔ اس شمارہ کی کامیابی میں آپ کو اور تمام مجلس مشاورت کو مبارک باد دیتی ہوں خصوصاً میرے استاد جناب منشاالرحمٰن خاں منشا صاحب کو ان کی بہت ہی پیاری نظم "جوانوں کے نام" پر انہیں میرا سلام اور مبارکباد پہنچا دیجئے گا۔ خدا کرے آپ کے شاداب کو ہمیشہ ترقی و کامیابی ملے اور آپ کا شاداب ہمیشہ ترو تازہ و شگفتہ رہے۔ نیک خواہشات کے ساتھ:

شگفتہ ہاشمی
(شکاگو، امریکہ)

ڈاکٹر آئی ام ساجد

(تاثرات)

متاعِ لوح و قلم

ماہنامہ شاداب 'کا جنوری فروری ۸۶ء کا خاص نمبر (جناب خواجہ حمید الدین شاہد اور اعجاز حسین کھٹا نمبر) دیکھ کر جہاں بے پایاں مسرت ہوی وہیں حیرت بھی ہوی کہ اتنے قلیل عرصے میں مدیر 'شاداب' نے اتنا ضخیم' خوبصورت' معیاری اور جہاں شخصیتوں پر بہ اعتبار مواد اتنا بھرپور نمبر اردو ادب کے شائقین کو بطور تحفہ پیش کیا۔ یہ ایک قابلِ قدر اور سراہے جانے کے لائق اقدام ہے جس کی تعریف نہ کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔

معروف ادیبا کے اعزاز میں اس قسم کا نذرانہ عقیدت پیش کرنا ایک انوکھا اور قابلِ ستائش کارنامہ ہے' جس کے دیرپا اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاداب کا یہ خاص نمبر اردو ادب کے سرمائے میں ایک یادگار اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب نے بڑی اچھی بات کہی کہ جناب مشفق خواجہ صاحب کو ہندوستان میں آمد پر ڈاکٹر مالک رام صاحب نے اس تعلق سے ایک کتاب پیش کرکے اپنی نوعیت کا پہلا کام کیا تھا۔ اب دوسری بار یہ کارنامہ شاداب نے اس ڈھنگ سے کر دکھایا کہ نقشِ اول سے نقشِ ثانی زیادہ اہمیت و افادیت اختیار کر گیا۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ جذبات' احساسات' محبت و عقیدت اور اچھا ادب سرحدوں کا پابند نہیں ہوتا اور اس کا کھلا ثبوت شاداب کا خاص نمبر ہے۔

---

٥ نند کچھی مسجد' کھام گاؤں (بلڈانہ)

خواجہ حمید الدین شاہد صاحب اور اعجاز حسین کھٹا صاحب کے تعلق سے تاثرات اور مضامین پڑھ کر ان جانثاران اردو کی عظمت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوا کہ انھوں نے دیارِ غیر میں بھی اپنے وطن کا نام اونچا رکھا، اس کی عظمت میں اضافہ کیا۔ اس خاص نمبر کے یوں تو سارے ہی مضامین اچھے ہیں لیکن ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب، محمد منظور احمد صاحب، غیاث متین صاحب، محترمہ طیبہ بیگم، احمد جلیس صاحب، ڈاکٹر حبیب ضیا صاحبہ اور پروفیسر محمود حسین صاحبان نے کافی متاثر کیا اور معلومات میں اضافہ کیا۔ خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کے گراں قدر مضامین اور غزلیات بھی بے حد پسند آئیں۔ اسی طرح اعجاز حسین کھٹا صاحب کا طنز و مزاح سے بھرپور کلام بھی متاثر کیے بنا نہ رہ سکا۔ اگر کھٹا صاحب کے تعلق سے دو تین تفصیلی مضامین مزید شامل ہوجاتے تو اس خاص نمبر کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ــــ

بہرحال اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ آپ نے اپنی انتھک محنت کے ذریعہ ایک یادگار نمبر نکال کر اپنا فرض اور حق ادا کر دیا۔ آپ نے ایک بہت اچھے کام کا آغاز کیا ہے۔ یہ پیش رفت رائیگاں نہیں جائے گی اور جب بھی اور جہاں سے بھی اس قسم کا کام ہوگا شاداب اور ھدیٰ شاداب کو توصیفی الفاظ سے یاد کیا جائے گا۔

اس یادگاری خاص نمبر پر میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ ••

آپ اردو کے بہی خواہ ہیں تو
اردو مطبوعات، نہ خود مانگ کر پڑھیئے
نہ اوروں کو عاریتاً دیجئے۔

ماہنامہ

حیدرآباد

ادبی ، دینی و سماجی اقدار کا

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

جلد (۳) | اپریل ۱۹۸۶ء | شمارہ (۴)

مجلس مشاورت

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	۲۰ پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ 90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 ″ ″
حیات 1000 روپے	2500 روپیہ	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 ″

ترسیل زر کا پتہ : 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد-4 آندھرا پردیش

ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

سپریم کورٹ نے مسلمانوں کے پرسنل لا میں دخل دیتے ہوئے جو شاہ بانو کا فیصلہ کیا اور مرکزی حکومت کو یہ ہدایت دی کہ مسلمانوں کو شامل کرتے ہوئے تمام ہندوستانیوں کے لئے مشترک و یکساں سیول کوڈ بنائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عام مسلمان خواب غفلت سے جاگے اور مسلمانوں کے علماء نے بھی اپنی ذمہ داری کو جانا۔ رائے عامہ ہموار ہوئی اور ہمارے نوجوان اور ہر دلعزیز وزیر اعظم نے اس محدود مسئلہ کی حد تک ایک بل موجودہ پارلیمنٹ میں پیش کر دیا۔ اس بل میں یہ صراحت ہے کہ طلاق کے بعد مطلقہ کی گذر بسر کی ذمہ داری مطلقہ کے ان اقرباء پر ہوگی جو مطلقہ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد کے وارث ہوتے ہیں۔ یہ اقرباء اسی تناسب سے ذمہ دار ہوں گے جس تناسب سے وہ جائیداد میں حصہ پاتے ہوں۔ اگر ان میں کوئی نادار ہو تو دوسروں پر اس کی ذمہ داری ڈال جائے گی اور اگر سب نادار ہوں تو وقف بورڈ سے یہ گذارہ دلایا جائے گا۔

یہ قانون اصول نصفت پر مبنی ہے اور مطلقہ خاتون کی عزت نفس کو بھی برقرار رکھتا ہے جو موجودہ فوجداری قانون کے تحت سابقہ شوہر سے گذارہ حاصل کرنے میں باقی نہیں رہتی کہ جس سے اختلاف کی بناء پر علحدگی ہوئی اس سے سروکار رکھنا خوش آئند نہیں ہو سکتا مسلم خواتین بل ۱۹۸۶ء میں خواتین کے حقوق کی حفاظت ایسے مناسب اور موزوں طریقے سے کی گئی ہے کہ غیر مسلم خواتین پر نافذ کر دیا جائے تو ان کے حقوق کی حفاظت بھی بہتر اور پسندیدہ طریقے پر ہوگی۔ غیر مسلم خواتین کی صورت میں وقف بورڈ کی بجائے ہندو اوقاف کی طرف سے ایسی رقوم ادا کی جا سکتی ہیں۔

مرکزی بل کے علاوہ ایک اور خوش آئند قدم امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے اٹھایا گیا ہے۔ موصوف نے خانقاہ رحمانی مونگیر میں قوانین شریعت کی ضابطہ بندی اور تدوین کے تاریخ ساز کام کا آغاز کروایا ہے۔ افتتاحی جلسہ میں انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے انسانوں کو نفع پہونچانے والی چیزوں کو عام

کردیا ہے۔ ہوا اور پانی کی سب کو ضرورت ہے۔ ان کی کوئی قیمت نہیں۔ مذہب کا بھی یہی حال ہے جو انسان کی رہبری و رہنمائی کے لئے ہے۔ مذہب سب کے لئے ہے اس پر سب کا حق ہے۔ مذہب اسلام نے جس طرح ماضی میں انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کی ہے اسی طرح آج بھی رہنمائی کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے معاشرتی مسائل کی خاطر علماء کے احتجاج پر انگریزوں نے ۱۹۳۷ء میں شریعت اپلیکیشن ایکٹ بنایا جس کی رو سے پرسنل لا کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اس ایکٹ میں (۱۱) عنوان ہیں۔ جن میں فریقین کے مسلمان ہونے کی صورت میں قرآن و حدیث کے مطابق فیصلے دیئے جاتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان گیارہ عنوانات پر مسائل کو دفعہ وار قانونی انداز میں مرتب کرایا جائے۔ یہی کام اب شروع کیا گیا ہے۔ اس کام کی تکمیل وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مولانا رحمانی نے جامعہ رحمانی کے علماء کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی کو بھی اس میں شریک کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ مسودہ کی ترتیب و تکمیل کے بعد ملک کے دیگر علماء اور اداروں سے بھی مشورہ کرلیا جائے تاکہ بالاتفاق اس عظیم کام کی تکمیل ہو۔

سکندر توفیق

اسلام اور عہدِ حاضر
خانقاہی نظام

دوسری قسط

آج حال یہ ہے کہ HALLEY کے COMET کو دیکھنے کی ساری دنیا میں زور و شور سے تیاریاں جاری ہیں لیکن کسی کو سورہ نجم کی وہ قرآنی آیت جس کی طرف عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹرانومی کے پروفیسر صاحب نے نشاندہی فرمائی تھی کہ قرآن حکیم میں خدا نے اپنے بارے میں ربّ شعریٰ ہونے کی خبر دی ہے یاد بھی نہیں آتی۔ برسوں نظروں، دوربینوں اور سائنسی آلات کی پہنچ سے باہر رہنے والا یہ COMET یا دمدار ستارہ آخر کہاں چھپ جاتا تھا؟ کہیں قرآن میں بیان کردہ سبع سموات یا سات آسمان حقیقی تو نہیں؟ کیوں نہ اس حقیقت کا اعتراف کرلیا جائے اور ان کے بنانے والے پر ایمان لایا جائے لیکن لوگ غیر منطقی رویہ اپنائے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں جن آیات اور نشانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ظاہر ہے وہ صرف اجمالی ہی ہوسکتی ہیں، تفصیلی نہیں لیکن اس اجمال میں جو تفصیل مضمر ہے اس تک عقل انسانی نہایت آسانی سے پہنچ سکتی ہے۔ انسان کے لیے خداوند تعالیٰ نے تمام مظاہر کائنات کو مسخر کردیا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر خدا نے انسان سے کہیں زیادہ طاقتور حیوانات کو اس کے لیے مسخر کردیا ہے۔ جس کا اشارہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ انسانی صنعت کاری کے ضمن میں نوح علیہ السلام

بیت شمیم۔ تلک نگر، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۴۴

کا خدائی نگرانی میں کشتی تیار کرنے کا تذکرہ موجود ہے۔ داؤد علیہ السلام لوہے سے زرہیں بنانے کی صنعت کا تذکرہ بھی ہے تو ذوالقرنین کی نگرانی میں لوہے اور تانبے کی دیوار بنانے کا ذکر بھی ہے اور سلیمان علیہ السلام کے تختِ رواں کا حال بھی۔ اگر ہم ان چیزوں کے لیے ضروری علوم کا کھوج لگائیں تو (METALLURGY، CHEMISTRY، PHYSICS) وغیرہ وغیرہ سے ہر علم اشارہ ضرور مل جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہم نے آدمؑ اسماء کا علم عطا کیا جس سے فرشتے بھی لاعلم تھے۔ اس طرح قرآن حکیم میں تمام سائنسی ایجادات اور دریافتوں کی گنجائش موجود ہے جو اب تک میں آئی ہیں یا آئندہ عمل میں آئیں گی ان میں بیل گاڑی سے لے کر SPACE - SHIP. تک سب ہی شامل ہو جاتے ہیں۔ ان مثالوں سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عہدِ حاضر کی سائنسی ایجادات اسلام کے خلاف نہیں جاتیں ان مثالوں سے قرآنی دعوؤں کے صحیح ہونے کے امکانِ غالب کا ثبوت ثابت ہو جاتا ہے۔ جب انسانی طبیب اور سرجن مُردہ آنکھ کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، دل کو بدل سکتے ہیں تو کیا خالقِ کائنات مُردہ اور خاک شدہ اجسام کو پھر زندہ نہیں کر سکتا؟

سائنس کے تبدیل ہونے والی THEORIES کو چھوڑ کر، جن پر خود سائنس دانوں میں اتفاق رائے نہیں ہوتا۔ کوئی ٹھوس اور حقیقی ایجاد کو غلط ثابت نہیں کرتی۔ یہ اور بات ہے کہ کسی ایجاد کا غیر صحت مندانہ استعمال انسانی دلوں کا اغوا کر کے مذہب سے بیزار کر دے۔

اسلامی شرع کے بارے میں بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر اعضا کی پیوندکاری TRANSPLANTATION OF EYES کے بارے میں کوئی حکم نہیں ملتا لیکن راقم الحروف کی رائے میں یہ اعتراض صحیح نہیں، قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع کے ذریعہ یہ بظاہر لاینحل مسئلہ، مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ انسانی جسم کے وہ اعضاء جن کا نعم البدل قدرتی طور پر مہیا نہیں کیا جاتا وہ خدا کی خصوصی ودیعت

ہیں ان کو بطور عطیہ دینے کا انسان کو کوئی اختیار نہیں لیکن جن چیزوں کی مسلسل افزائش ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً خون ہم اس کا عطیہ دے سکتے ہیں۔ معاشرتی طور پر دیکھا جائے تو خون کا عطیہ زیادہ مفید ہے جب کہ آنکھ وغیرہ کی ضرورت ان ضعیف افراد ہی کو ہوتی ہے جو اپنی سماجی اہمیت تقریباً ختم کر چکے ہوتے ہیں۔ ایک اپاہج زندگی کو چند سال کے لیے اور طول دے دینا انسانی معاشرے کے لیے زیادہ مفید بھی نہیں۔ خیر کثیر یا THE GREATEST GOOD OF THE GREATEST NUMBER کے اصول کو پیش کرنے والے مذہب کا یہ تقاضہ ہے بھی نہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے مثال کے طور پر قرآن حکیم کے قصاص کے حکم ہی کو لیجئے۔ قصاص کا حکم دیتے ہوئے قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ یہ انسان کے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو ـــ قرآنی حکمت کے خلاف جا کر ماہر عمرانیات نے CAPITAL PUNISHMENT کے خلاف آواز بلند کی لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام ممالک میں جرائم کی تعداد ان ممالک سے کہیں زیادہ ہے جو اب بھی قرآنی حکمت پر چل رہے ہیں اور قصاص اور ہاتھ کاٹنے کے ذریعہ خدا کے حکم کو خدا کی مخلوق پر جاری کرتے ہوئے نہیں جھجکتے۔ (MISPLACED SYMPATHY) کوئی مفید چیز ہے بھی نہیں۔ اس بسیط حقیقت کو مولانا روم نے شکست دوست سے زجاجہ دوست کو خود دوست کے اشارے پر شکست کرنا قرار دیا ہے۔ اس میں قصاص سے لے کر جہاد تک ہر عمل شامل ہو جاتا ہے۔

نافرمان زندہ انسانوں کے بارے میں تو یہ حکم ہے لیکن انسانی لاشوں کو مثلہ کرنے کی ممانعت ہے۔ موت کے احترام میں جنازے کو دیکھ کھڑا ہو جانا اور چالیس قدم ساتھ جانے اور کندھا دینے کی سنت ہے۔ کیوں کہ موت آخرت کا دروازہ ہے اسی لیے احترام کی مستحق ـــ اگر ہم ماہرین عمرانیات کے محدود علم اور ہمدردی کے غیر ضروری جذبے یا MISPLACED SYMPATHY سے کام لے کر اعضا کے عطیے کے اصول کو قبول کر لیں تو وہ دن بھی آسکتا ہے جب کفن چوروں کے ساتھ ساتھ سماج میں اعضا چوروں کا بھی اضافہ ہو جائے۔

آج کے ان مسئلوں کا حل اسلامی فقہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے اور

اس کے لیے اجتہاد کی ضرورت بھی نہیں جو لوگ اس بات سے واقف ہیں وہ عموماً اجتہاد کی دہائی بھی نہیں دیتے۔ اجتہاد کا نعرہ زیادہ تر وہ مغربی تعلیم یافتہ لوگ ہی بلند کرتے ہیں جو نہ تو عربی سے واقف ہیں نہ قرآن کی تلاوت کے عادی اور نہ اس پر تفکر کے اہل نہ انھیں حدیث و فقہ سے ہی کما حقہ واقفیت ہے۔ حتیٰ کہ وہ فرائض اور سنن بھی عملی طور پر ادا نہیں کرتے۔

اجتہاد کے جواز میں جو چیز پیش کی جاتی ہے وہ ہے مرورِ ایام یا قدامت۔ چوں کہ اسلامی فقہ چودہ سو سال سے رائج ہے لہٰذا اب ہمیں اس میں تبدیلی کرنی چاہیئے خود بدلے بغیر قرآن کو بدل دینے کی یہ خواہش اور اس پر مفید نتائج کی امید ایک ایسا عجیب و غریب طرزِ عمل ہے جس کی کوئی منطقی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ ہم کسی دوا میں دوسرے اجزا کی ملاوٹ کرکے غیر خالص دوا سے خاطر خواہ علاج کی توقع نہیں رکھتے لیکن قرآن کے روحانی علاج میں مادیت کے اجزا کو شامل کرنے پر مصر ہیں۔ اس قرآنی تاکید کے باوجود کہ دین پر چلنا ہے تو اس میں کلی طور پر داخل ہو جانا چاہیئے۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن میں بیان کردہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ پر غور کرنا چاہیئے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کی اپنی گود میں ہوئی۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اگر فرعون کا بیٹا ہی بنے رہتے تو فرعون کی موت کے بعد یہودیوں کو آزادی دلانے کا موقع بھی شاید ان کو مل جاتا لیکن اس طرح اس بات کا سدِباب نہیں ہو سکتا تھا جسے ہم فرعونیت کہتے ہیں۔ ہم بھی مادیت کے دامن سے لپٹے رہ کر چند دنیوی فائدے ممکن ہے حاصل کر لیں لیکن نہ تو اس طرح دینی تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں اور نہ ہی فلاحِ دارین کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں مغربیت اور مادیت سے دامن چھڑانا ہی پڑے گا اور حالات یہ بتا رہے ہیں کہ وہ دن زیادہ دور بھی نہیں جب مادیت اور مغربیت مفلوج ہو کر رہ جائے۔ مادیت پرستانہ نظام نے دنیا کو جن پیچ در پیچ مسائل میں الجھا دیا ہے ان میں سے دو بڑے مسائل ایک تو سود پر

بنی معیشت اور وہ سب سے سماج میں عورت کا مقام ہیں۔ سود کو قرآن نے حرام قرار
یا اور انفرادی طور پر عورت اور مرد کے نیک اعمال کا پورا پورا اجر دیے کا اعلان کیا۔
وراثت اور ملکیت میں عورت کے حقوق تسلیم کیے' اس کے باوجود عورت اور مرد
کے دائرۂ عمل کو الگ الگ قرار دیا۔ عورت کی مملکت گھر کی چار دیواری تک
محدود رہی تو مرد کی جولانگاہ باہر کی دنیا ہے۔ یہ ایسا متوازن اور فطری
DIVISION OF LABOUR ہے جس کا اعتراف اب مغربی مفکرین بھی کرنے لگے
ہیں۔ چناں چہ عہدِ حاضر کے مشہور عظیم محقق ٹوائین بی نے قدیم یونان سے لے کر
آج کے امریکہ تک کی تہذیبوں کا جائزہ لیا ــــ اور اسے یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ
قوموں اور تہذیبوں کے عروج اور خوش حالی کا دور وہی دور رہا ہے
جب کہ عورت کا مقام "گھر" تھا۔ مساوات کے نام پر عورت کو شکم اور
معاش کے دُہرے بوجھ تلے دبا دینا' انسانیت' انصاف اور سچی ہمدردی سے
بہت بعید ہے لیکن حوا کی بیٹی سادہ لوح ہونے کے باعث مساوات کے
دلفریب نعرے سے مسحور ہو کر نہ صرف یہ ظلم برداشت کر رہی ہے
بلکہ اس کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس کے ایک مطالبہ کے باعث باغِ بہشت
سے نکلنا پڑا تھا' آج کے مطالبے کے باعث گھر کے امن سے محروم ہونا
پڑ رہا ہے چناں چہ ٹوائین بی نے امریکن عورت کی سکون سے محروم تگ و دو
کی زندگی کی مثال دی ہے۔ کینیڈا کی حال ہی میں منعقدہ کانفرنس اسلام کے
فطری نظام کو رد کرنے کی دھن میں پھنس کر رہ گئی اور مسئلہ' زن وہاں
کا وہیں ــــ اصل بات تو یہی ہے کہ انسان جب تک فطرت کے خلاف
جانے کی کوشش کرتا رہے گا' اس کی الجھنیں بڑھتی ہی رہیں گی ــــ
PROGRESS یا ترقی کا معیار OBJECTIVE دنیا کی تسخیر اور خود اپنی شخصیت
کے SUBJECTIVE عنصر سے مکمل ہم آہنگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مظاہر
فطرت PHYSICAL PHENOMENA کی تسخیر ترقی کا محض ایک پہلو
ہے۔ یہی سب کچھ نہیں اور مذہب اسی خلاء کو پُر کرنے کے لیے بھیجے
جاتے رہے ہیں حتیٰ کہ آخری الہامی مذہب یعنی اسلام میں کھلے الفاظ میں

اور حتمی طور پر یہ کہہ دیا گیا کہ یہ دین فطرت ' دین قیم اور تکمیل شدہ ہے جسے خدا نے انسانوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پسند کر لیا ہے :

اکملت لکم دینکم اور رضیت الاسلام دینا

بات کا اعلان ہے ۔

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام خدا کا آخری پیغام ہے اور بہر صورت ہو کر رہے گا لیکن اس کی کیا صورت ہوگی کیا " پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم سے " کی تکرار ہوگی یا کہنہ دماغ ہی ملت کی امامت کے لیے اٹھ کر کھڑے جائیں گے ۔ اس بارے میں پیش قیاسی ممکن نہیں ۔ ہاں اتنا ضرور کہا ہے کہ مسلمانوں اور اسلام کے تمام اداروں کو اپنے فرض کا احساس اپنے کردار کو ادا کرنا چاہیئے ۔

" خانقاہ " اسلام کا مترادف نہیں لیکن اسلام کا ایک اہم ادارہ ہے ۔ خصوصاً ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کی تاریخ خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین چشتی کے اجمیر میں قیام سے شروع ہوتی ہے ۔ محمد بن قاسم اور حضرت داتا گنج بخش کا تذکرہ اس لیے بھی غیر ضروری کہ یہ علاقے اب ہندوستان کا حصہ نہیں رہے ۔ الغرض آج کے ہند کی تاریخ میں خانقاہ اور پیران خانقاہ نے نہایت مثبت اور دیر ادا کیا ہے ۔ حضرت خواجہ معین چشتی ' خواجہ قطب الدین بختیار ' خواجہ نظام الدین اولیا ' خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی ' خواجہ سید گیسو دراز بندہ نواز کی مبارک زندگیوں پر نظر ڈالی جائے تو شمال ۔ جنوب تک ان کی مقناطیسی شخصیتوں کی کرشمہ آرائی نظر آتی ۔ یہی حال کلیر شریف سے لے کر بنگال تک کا ہے ۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہمیں خانقاہ کے ادارے ناقدری نہیں کرنی چاہیئے ۔ یہ ناقدری اسی طرح اندوہناک طور بھیا ہو سکتی ہے جس طرح مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں خلافت کے ادارے کا لپنے دینی ورثے کو محض اس لیے نیست و نابود کر دینا یا اس سے کتنا

کر لیتا کہ اس میں چند قابلِ اصلاح برائیاں در آئی ہیں کوئی تعمیری قدر و قیمت نہیں رکھتا ــــــ

لیکن آج حال یہ ہے کہ خانقاہ میں شریعت پہ چلنے کا نہ اہتمام کیا جاتا ہے اور نہ شریعت کا احترام۔ اب خانقاہ روایات اور رسوم و رواجات RITES AND RITUALS کا مبدا بنی ہوئی ہے۔ ہر قسم کے رسوم و رواج کی طرح رسم و رواج خانقاہی بھی جاذب توجہ اور عوامی دلچسپی کے سامان رکھتی ہے لیکن اس عوامی دلچسپی کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کا احساس دلانے اور ہماری حمیت کو جگانے آج کے حالات کافی ہیں۔ سپریم کورٹ کے ہاتھوں شریعت کی من مانی تاویل کی شکل میں وقت نے ہمیں عبرت کا تازیانہ لگایا ہے تاکہ ہم اب بھی ایک اور نیک ہو جائیں۔

لیکن آج کی بیشتر خانقاہوں کو دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کبھی یہی ادارہ اسلام کے منبع، سرچشمہ اور قلعہ کا کام دیتا تھا۔ آج کی خانقاہیں قسمت کے ماروں کی پناہ گاہ ہیں یا REFUGE ہیں یا پھر شاطروں اور نفع خوروں کا میدان عمل ــــــ اب یہاں شخصیت کی تعمیر اور کردار سازی کی طرف توجہ دی جاتی ہے نہ اسلام کی اشاعت کی طرف ــــــ اگر ایک طرف جمعہ کی فرض نماز ہو رہی ہو اور دوسری طرف گدی نشین حضرات اور متولیانِ درگاہ زائرین کو مزار شریف کی زیارت کروا رہے ہوں تو یقیناً عملی طور پر لا الٰہ الا اللہ کا درس پس پشت پڑ جاتا ہے اور شریعت عملی طور پر چکنا چور ہو جاتی ہے حالاں کہ مثال کے طور پر خواجہ معین الدین چشتیؒ کی سوانح حیات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ہجوم استغراق میں بھی اذان سنتے ہی نماز ادا کرنے کھڑے ہو جاتے تھے یا استغراق جیسا کہ تصوف اور طریقت کا شدید رکھنے والوں کو بھی [illegible] خدا کے سامنے حضوری قلب کی کیفیت کا نام ہے خواجہ بزرگ اسی حضوری [illegible] سمجھتے تھے اور حفاظت کی اسی نماز کو ترجیح دیتے تھے جس کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ اسی لیے اپنے خدام کو حکم دے رکھا تھا کہ استغراق کے عالم میں بھی نماز کے لیے جھنجھوڑ دیا جائے۔

کیا ہوگا ہوں کے متولی اور خانقا ہوں کے گدّی نشین اس سبق کو فراموش کر چکے ہیں یا غیر ضروری سمجھتے ہیں؟

خواجۂ بزرگ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ حتیٰ کہ عرب کے ریگستان کی جگہ اپنے قیام کے لیے راجستھان کے ریگستانوں میں اجمیر کو اپنا دارالمقام بنایا اور شرع کی پابندی کو اپنی زندگی بنائے رکھا۔ سنتوں کی ادائیگی میں بڑی عمر میں بھی نکاح کی سنت ادا کی۔

یہ دو چیزیں یعنے شریعت کی پابندی اور سنت کی ادائیگی ایسی ہیں جو اکتساب کے دائرے میں آتی ہیں ورنہ خواجہ غریب النواز کی کرامتیں تو عطائے الٰہی تھیں جو کلیتہً وہبی ہوتی ہیں اور اسی لیے اکتساب کی سرحدوں کے ماوراء۔ ظاہر ہے کہ آج کوئی بھی لکڑی کی کھڑاویں کو کفر کی تادیب کے لیے فضا میں خود اپنے اختیار وارادے سے نہیں اڑا سکتا۔ لیکن جس طرح خواجۂ بزرگ نے ایک غریب کسان کی ہمدردی میں فی الفور دہلی کا سفر اختیار کیا تاکہ اس کسان کو اپنے کھیتوں کی ملکیت کی شاہی سند مل جائے اور اتنا توقف بھی گوارا نہ کیا کہ اپنے آنے کی اطلاع اپنے مرید حضرت قطب الدین بختیار کاکی ہی کو دے دیتے۔ انسانی ہمدردی، اخوت اور اطاعت رسول صلعم کا یہ وہ سبق ہے جو ہم آج بھی سیکھ سکتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

دراصل ہمدردی کا یہ جذبہ قرآنِ عظیم میں بیان کردہ وحدتِ انسانی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ عباد الرحمٰن کو بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ، خدائے واحد کے بندے سمجھ کر، ایک کنبہ کے ارکان سمجھ کر اظہارِ ہمدردی کرنا تمام صوفیوں کا مسلک رہا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط اور گمراہ کن ہے کہ مسلمان صوفی وحدتِ ادیان کے قائل تھے یا قائل ہو سکتے ہیں۔ "تم رام کہو یا رحیم مطلب تو اسی کی ذات سے ہے" ہر ایک کو خوش کرنے والی شاعری ضرور ہے لیکن یہ کسی بھی مسلم صوفی کا نہ تو مسلک رہا ہے نہ مسلک ہو سکتی ہے۔

(سلسلہ جاری ہے)

مولانا حامدی نقشبندی

برار میں اردو کے سرگرمیاں

(اخبارات و رسائل)

گذشتہ سے پیوستہ

(۱۶) بیداری: راقم الحروف نے ۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن علی گڈھ کا پندرہ روزہ اخبار "بیداری" جاری کیا جو ۲۶×۲۰ کے اخباری سائز کے آٹھ صفحات پر نیشنل پرنٹنگ پریس علی گڈھ میں طبع ہوتا۔ اعلیٰ کتابت و طباعت کے ساتھ ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ میرے بعد محمود فاروقی بی اے آنرس ایم اے (علیگ) اور ابوالخیر صدیقی بی اے ایل ایل بی (علیگ) نکالتے رہے۔

سرسید علیہ الرحمۃ کی چالیسویں برسی کے موقع پر ۲۷ مارچ ۱۹۴۲ء کو میں نے اس پرچے کی ایک خاص اشاعت "سرسید نمبر" شائع کی۔ جس میں قائد اعظم، بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ سید سلیمان ندوی، سر عبدالقادر، ڈاکٹر کنور محمد اشرف، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر خواجہ السیدین، ڈاکٹر محمود احمد، پروفیسر محمد حاذق، ابراہیم جلیس اور ڈاکٹر معین احسن جذبی وغیرہ نے اپنے پیامات، مضامین اور شعری تخلیقات کے ذریعے سرسید کو خراج عقیدت پیش کیا جو تاریخ صحافت میں بارگاہ سرسید میں پہلا نذرانہ تھا۔

میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں "مسلم یونیورسٹی اسکول میگزین" "علی گڈھ میگزین" کے علاوہ دوسرے انگریزی و اردو پرچوں کی ادارت کی ہے لیکن ان تمام کا

عنایت منزل، بالاپور، ضلع اکولہ (مہاراشٹرا)

کسی نہ کسی ادارے سے تعلق تھا۔ "بیداری" میری ذاتی کوششوں کی تخلیق تھا جسے فہرست میں شامل کیا جا رہا ہے۔

(۱۷) محشر: جناب محمد ابراہیم صاحب شرار محتاجِ تعارف نہیں۔ ایک عام پہچانی شخصیت ہے کسے خبر تھی کہ ذہنی و فکری طور پر ایک سولہ سترہ سالہ کامیاب کو اس درجہ متاثر کرے گی کہ وہ کمرۂ وکالت سے ترک وکالت کر کے محراب و جبہ وعظ و تلقین کے ساتھ درس قرآن دیتا نظر آئے گا اور صاحب "مرقع" و "انیس" ادبی میدان سے یہ یک جست مذہبی ماہنامہ "محشر" کے ذریعے مستقل اسباق عربی سکھانے کا کام لیں گے۔ جنوری ۱۹۵۲ء سے ۲۲×۱۸/۸ کے بتیس صفحے آگرہ اخبار پریس آگرہ میں طبع ہو کر یہ مذہبی رسالہ اولاً ایلچپور سے بعد میں چاند خاں آکولہ سے "محشر پریس" کے قیام کے ساتھ ۱۹۵۹ء تک شائع ہوتا تا آنکہ انجمن اسلام بمبئی نے اپنے مدارس فوقانیہ کے معلم عربی و دینیا کے لیے شرار صاحب کی خدمات حاصل کر لیں۔ "موعظ حسنیٰ" کے بعد یہ برار مذہبی ماہنامہ تھا جو اپنی آٹھ سالہ خدمات کے بعد بند ہو گیا۔

(۱۸) "امن": "امن" کے ساتھ ڈاکٹر امام خان صاحب صابر کا تصور لازم ملزوم ہے۔ گذشتہ ۱۹ سال سے یہ باحوصلہ نوجوان برار میں "امن" کے ذریعے اردو کا چراغ جلائے ہوئے خود شباب سے شیب میں پہنچ گیا لیکن اپنی تر اسکیموں سے نوجوانوں میں حوصلہ و امنگ کی جوت پیدا کر رہا ہے۔

۱۹۵۲ء سے ۲۸×۱۷/۴ کا یہ چار ورقی ہفتہ وار ہر پنجشنبہ کو پابندی سے جاتا ہے۔ پہلے وکاس لیتھو میں چھپتا تھا اب "تاج آفسیٹ آکولہ" میں طبع "تاج" کے ساتھ اس کے جواں سال جواں ہمت مالک عطا افغانی کا مسکراتا نظروں میں گھومنے لگتا ہے جس نے برار میں اردو طباعت و کتابت کا ایسا معیار قائم کر دیا ہے جس سے ڈاکٹر زور مرحوم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ برا اردو دعوت ناموں کا کثرت سے استعمال عطا افغانی کے موکار قلم کا ثمر ہوا اور تاج پریس کی کشش و سہولت ہے۔ خدا کرے کہ صابر و افغانی کا "امن" کو حیاتِ طویل عطا فرمائے۔

(۱۹) "ہم لوگ" عبدالصمد صاحب جاوید نے آکولہ سے ۱۹۵۵ء میں $\frac{۲۲}{۱۷}$ پر "ہم لوگ" جاری کیا۔ جاوید میں جوانی کے ساتھ شوق، مطالعہ و مشاہدہ اور خوب سے خوب تر کی تلاش تھی جس نے اسے حالات سے متاثر کیے بغیر اپنی صحافتی صلاحیت کے بھرپور مظاہرے کا موقع دیا۔ "ہم لوگ" کے مختصر چار صفحوں میں عطا افغانی کی خفی کتابت سے وہ سب کچھ آجاتا جو ایک اچھے اخبار کے لیے ضروری ہے۔

صمد جاوید کی تحریرات، کارٹون اور شعری تخلیقات نے ایسا ماحول بنایا جس نے نوجوانوں میں حوصلہ دانش کے ساتھ خودی و خود اعتمادی پیدا کرتے ہوئے عمل کی دعوت دی۔ اس کے اداریے اکثر ہندوستان کے موقر جرائد نے اپنے کالموں میں پیش کئے لیکن اواخر ۱۹۶۰ء میں جاوید غم روزگار کا متحمل نہ ہو سکا۔ مسلسل کام نے صحت متاثر کر دی۔ نتیجتاً "ہم لوگ" جاری نہ رہ سکا۔ بعد میں روزنامہ "انقلاب" بمبئی میں کام کرتے رہے اور ۲۸ مارچ ۱۹۸۰ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔

(۲۰) "جمعیت" قاضی سید غیاث الدین مرحوم کی سرپرستی اور شری برج لال بیانی آنجہانی کی امداد سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو "جمعیت" کا پہلا پرچہ جناب مروان علی خان صاحب نشاط ایم اے ایل ایل بی وکیل کی ادارت میں $\frac{۲۷}{۱۷}$ کے چھ صفحات پر محمد عطاء اللہ خان افغانی پرنٹر و پبلشر نے وکاس لیتھو میں چھپوا کر دفتر "جمعیت" ہاشم سیٹھ لائبریری آکولہ سے شائع کیا۔

اس پرچے کی اشاعت کے محرک ۱۹۵۶ء کے عام انتخابات تھے جس کے اختتام پر ۱۹ جولائی ۱۹۵۶ء میں پینتیس شماروں کی اشاعت کے بعد یہ پرچہ ختم ہو گیا۔

(۲۱) "طلاپ جدید" ۱۹۵۶ء میں $\frac{۲۷}{۱۷}$ کے چار صفحات پر حاجی محمد ابوالحسن مرحوم ممبر پارلیمنٹ کی سرپرستی اور جناب حکیم عبدالاحد صاحب برہم نظمی بھوپالی کی ادارت میں ہفتہ وار "طلاپ جدید" جاری ہوا جس کی طباعت نیشنل لیتھو پریس آکولہ اور اشاعت امراوتی سے عمل میں آتی۔

حکیم برہم نظمی باوجود پیشہ طباعت میخانۂ اردو کے پرانے غم گسار اور کہنہ مشق صحافی تھے۔ شعری ذوق، علم و ادب سے دلچسپی اور سیاست کی بازی گری ان کی زندگی

کا مستقل مشغلہ رہا ہے۔ ان مصروفیتوں کے باوجود پرچے کی محدود گنجائش میں صحافت کی پوری چاشنی کے ساتھ علاقائی ضرورتوں کے مطابق حکیم صاحب نے اس میں معنویت وتنوع قائم رکھا لیکن ۱۹۵۸ء میں یہ نذر سیاست ہوگیا اور مرحوم بھی داغ مفارقت دے گئے۔

(۲۲) "پیام": جناب الحاج شیخ احمد صاحب نے اپنی سیاسی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر ستمبر ۱۹۵۶ء میں ۱۷×۲۷/۴ کے چار صفحوں پر امراؤتی سے ہفتہ وار "پیام" جاری کیا جو نیشنل لیتھو آکولہ میں طبع ہوتا۔ تقریباً دو سال جاری رہا۔

(۲۳) "لیڈر": محمد عطاءاللہ صاحب افغانی مالک "تاج آفسیٹ" آکولہ کا بڑا بیشتر حالیہ مجریہ اخبارات کے ادارۂ تحریر و طباعت سے قریبی رابطہ رہا ہے جس کی وجہ اکثر انھیں اجرائے اخبار کا جوش آتا رہتا ہے اور شاید "لیڈر" کا اجراء بھی اسی کا نتیجہ ہو۔ بہرکیف ۱۷×۲۷/۲ کا یہ چار ورقی ہفت روزہ اپنی صوری ومعنوی حیثیت سے افغانی کی صلاحیتوں کا کامیاب مظہر ہے جو ۱۲/ جنوری ۱۹۵۷ء کو جاری ہوکر چند اشاعتوں کے بعد بند ہوگیا اور مرحوم بھی ۱۸/ اگست ۱۹۸۲ء اردو صحافت اور طباعت سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔

(۲۴) "آواز": جناب مشکل افکاری صاحب ایک اچھے شاعر و نثر نگار ہیں۔ جوشِ خدمت میں عوام میں بیداری اور اپنے حقوق کی حفاظت کا احساس پیدا کرنے کی خاطر یہ ہفت روزہ "آواز" امراؤتی سے بلند کی جو ۲۱/ مارچ ۱۹۵۸ء سے ۱۷×۲۷/۴ کے چار صفحات پر نیشنل لیتھو پریس آکولہ میں طبع ہوکر تقریباً پانچ سال جاری رہی اور نامساعد حالات کا شکار ہوگئی۔

(۲۵) "پرواز": جناب محمد علی صاحب بی اے ایل ایل بی امراؤتی نے ۱۷×۲۷/۴ کے چار صفحات پر ۲۱/ مئی ۱۹۵۸ء کو امراؤتی سے جاری کیا جس کی طباعت نیشنل لیتھو پریس آکولہ میں ہوتی۔ چند ماہ جاری رہ کر یہ "پرواز" بھی صحافتی قبرستان میں دفن ہوگئی۔

(۲۶) "منزل": جناب قاضی محمد علی صاحب ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ نے جناب محمد ابراہیم صاحب بسمل بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ کے تعاون سے یوم آزادی ۱۵/ اگست

یہ ہفت روزہ اکولہ سے ۲۷ء کے ساتھ پر جاری کیا۔

"مولانا آزاد تعلیمی قانونی اسکیم" ملت کے لیے نقصان رساں اور اردو کی موت کا موجب ہوتی جس کے خلاف وحدت کا تعلیم یافتہ، ذی فہم، روشن خیال طبقہ متحدہ طور پر سینہ سپر ہو کر میدان میں نکل آیا۔ ان شاہین صفت نوجوانوں کے حوصلوں و امنگوں کے اظہار و احتجاج کے لیے خصوصی طور پر "منزل" کا اجرا عمل میں آیا جس کی نمایندگی و رہنمائی جواں سال، جواں ہمت قاضی محمد علی کر رہے تھے۔ "منزل" کی پانچ ماہ مختصر زندگی اس مقصد کی تکمیل کے بعد ۲ر جنوری ۱۹۶۱ء کی اشاعت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس کے اٹھارہ شماروں کے تقریباً ایک سو صفحات میں پھیلے ہوئے فکر انگیز اداریے، مقالے اور مضامین اپنے تنوع اور معنویت کے ساتھ گہرائی و گیرائی رکھتے ہیں۔

قاضی محمد علی کی یہ پہلی صحافتی کوشش ان کی ذکاوت و فراست اور ذوق علمی کے ساتھ معاملہ فہمی اور حصول مقصد میں لگاتار سعی و کوشش کی مظہر ہے۔ ذی احترام خاندان شیوخ بانور شاہ بابو کے اس قابلِ فخر قاضی زادے سے ملت کو بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

"منزل" آغاز سے اختتام تک نیشنل لیتھو پریس آکولہ میں چھپا جس کے لائق و فاضل مالکین جناب غازی الرحمن صاحب بی اے ایل ایل بی و جناب غنی الرحمن صاحب بی اے ایل ایل بی نہ صرف اس مقصد میں ملت کے ساتھ تھے بلکہ ہر قومی مسئلے میں شریک اور تقریباً گزشتہ بیس سال سے اپنے پرنٹنگ پریس کے ذریعہ اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور آج تک برار سے جتنے پرچے نکلے تقریباً وہ تمام انھیں کے پریس میں طبع ہوئے۔

(۲۷) "صحیفۂ انجمن": انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں مسلمانان برار کی متحدہ و متفقہ عزم و کوشش کی یادگار واحد قدیم یادگار ہے جس کی شاندار عمارات، مدرسہ، طلبا اقامہ معلمی، اساتذہ کی قیام گاہیں اور وسیع و عریض بازی گاہیں گزشتہ چالیس سالہ مشترکہ ملی سعی و کوشش کی مظہر ہیں اور اپنے ساتھ ایک عظیم شاندار تاریخ رکھتی ہیں۔

اس ادارے کا پہلا ماہنامہ "صحیفۂ عثمانی" تھا بعد میں صدر پرنسپل [illegible]

جناب محمد حفیظ اللہ خاں صاحب بیتاب مرحوم ایم اے بی ٹی (اسسٹنٹ ایل ارڈ) کی توجہ و کوشش سے مارچ ۱۹۶۷ء سے یہ دو ماہی ادبی و تعلیمی ششماہی مجلہ منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا جس کے نگران و ناظم جناب غلام کبریا خان صاحب شبلی بی ایس سی بی ایڈ اور جناب بدرالدین صاحب انصاری ایم اے بی ایڈ بی ٹی ایچ (علیگ) ہیں اور فرائض ادارت طلبا کا ایک بورڈ انجام دیتا ہے۔

صحیفۂ انجمن $\frac{20 \times 30}{8}$ کے ایک سو بارہ صفحوں پر تنویر پریس لکھنؤ میں طبع ہوتا ہے جس میں طلبا و اساتذہ کی علمی، ادبی، تعلیمی و شعری نگارشات اپنی صوری و معنوی ہر حیثیت سے لائق ستائش ہیں۔ توقع ہے کہ یہ مصور مجلہ بہ پابندی اپنی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے آئندہ بھی شائع ہوتا رہے گا۔

(۲۸) "تعبیر": شیخ رمضان صاحب کا تعلق ایک ایسے پسماندہ گولی طبقے سے ہے جو نہ صرف دینی و معاشرتی لحاظ سے بلکہ تعلیم میں بھی بہت پیچھے ہے۔ یہ اور ان کے احباب چھوٹو چودھری وغیرہ عرصے سے اپنے اس طبقے کی خدمت و اصلاح میں مصروف ہیں اور "تعبیر" کا اجرا بھی غالباً اسی مقصد کی تکمیل کی ایک کڑی ہے جو ۱۰ ستمبر ۱۹۶۹ء سے $\frac{22 \times 18}{4}$ کے چار صفحوں پر آج پریس بمبئی میں طبع ہو کر آکولہ سے شائع ہوتا ہے۔

شیخ صاحب کا علمی ادبی ذوق کافی بلند اور صحافت سے بھی لگاؤ ہے توقع ہے کہ ان کا پرچہ نہ صرف اپنے طبقے بلکہ ملک و ملت کی بھی بیش از خدمت انجام دے گا۔ ان کا عزم جوان ہے لہٰذا پرچے کی کامیابی سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

(۲۹) "جاسوسی گردش پبلیکیشن آکولہ": ۱۹۸۱ء کے اواخر میں سعید احمد خان صاحب ایم اے نے جو محکمہ تعلیمات سے متعلق ہیں اپنے چند رفقا کی اعانت سے آکولہ میں ادارہ "جاسوسی گردش پبلیکیشن" قائم کیا جس نے خان موصوف ہی کی تصنیف کردہ تین ناول "نشہ اترتا ہے"، "کھنڈروں کا قیدی" اور "دہشتستان" $\frac{20 \times 30}{8}$ کے سوا سو سے پونے دو سو صفحات میں شائع کی ہیں۔ اچھی کتابت و عارف الرحمٰن خان صاحب کے گلشن پریس کی اعلیٰ طباعت اور ناول سے متعلق تصویری

باقی صفحہ ۲۸۱ پر

ڈاکٹر مجید بیدار

معراج العاشقین میں اسلامیت کے لوازمات

اسلام اور اسکی تعلیمات کی توسیع اور اشاعت کیلئے دنیا کے ہر کونے میں کسی نہ کسی ولی، کسی نہ کسی صوفی، مجذوب اور ابدال کے وجود کا ثبوت ملتا ہے اور ہر خدا پرست انسان نے دین کی اشاعت کیلئے موقع اور محل کی مناسبت سے مختلف طریقے اختیار کئے اور یہ طریقے مختلف مسالک اور سلاسل کی نمائندگی کرتے ہیں جن میں ایک مسلک "صوفیانہ طرز" کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

معراج العاشقین صوفیانہ طرز کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں اسلامی طرز زندگی گذارنے کے لئے "صوفیانہ طریقے" کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو فرد کی اصلاح کو اجتماعی اصلاح کا درجہ دیتا ہے اس اعتبار سے اگر کسی انسان نے اپنی زندگی سنوار لی اور ہر انسان نے یہی طرز اختیار کیا تو لازمی طور پر تمام انسانوں کی زندگی سنور سکتی ہے اسی لئے فرد کی اصلاح کو اسلام میں افضلیت حاصل ہے۔ معراج العاشقین میں فرد کی اصلاح کیلئے پانچ طریقے بتائے گئے ہیں۔ جن کو عملی طور پر اختیار کرکے ایک فرد صالح زندگی گذار سکتا ہے۔

معراج العاشقین کا مقصد ہی اسلامی تعلیمات کی تشریح اور وضاحت ہے اسی لئے یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں ہر مرکزی موضوع کے تحت کئی ذیلی موضوعات کا ذکر بھی صراحت کے ساتھ موجود ہے ایسے ہی ذیلی موضوعات میں اسلامی زندگی کے سلسلے میں معراج العاشقین کے مصنف کے مذہبی تصورات کا اظہار بھی ابھرتا ہے جسے معراج العاشقین میں اسلامیت کے لوازمات کے عنوان سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

مولانا آزاد کالج - اورنگ آباد -

لوازمات کی تکمیل کرنی ضروری ہے جیسے معراج العاشقین میں صدق، عدل، حیا، شجاعت اور عنایت کے عنوانات سے واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا گیا ہے :-

"اے محمد! اللہ نے تجھے اپنی قدرت کا پیشوا کیا۔ بندیاں کوں خبر دینا، صدق نبوت ہے عدل ولایت ہے۔ حیا قدرت ہے۔ عنایت بخشش رب کی ہے۔ اے محمد! صدق شریعت کی بندگی ہے جس میں صدق ہے او مسلمان ہے۔ قال علیہ السلام الصدق ینجی والکذب یہلک اس کے معنی سچے کوں راحت ہے جھوٹا ہلاک ہے۔ عدل طریقت کی پیروی ہے۔ جس میں عدل ہے او مومن ہے۔ حیا حقیقت کا حال ہے جس میں مردم آزاری نہیں او انسان ہے۔ شجاعت معرفت کی چال ہے جس میں اپنی ہور خدا کی پہچانت ہے او بندہ ہے عنایت ہما بوج تمام پر ہے توحید کے رہ میں آدم اور حوا یعنی اس تن کی پہچانت نفسانی خلائق پاک ہوئے تو شریعت میں بیٹے بولتے ہیں۔

اس بیان کی روشنی میں ایک فرد اس دنیا میں چار حیثیتوں سے زندگی گذارتا ہے جیسے مسلمان، مومن، انسان اور بندہ کے روپ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں ایک فرد کی شہریت بھی چار حصوں میں قائم رہتی ہے۔ یعنی فرد بذات خود فرد ہوتے ہوئے بھی اسکی شہریت چار حیثیتوں سے قائم ہو جاتی ہے۔ جیسے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

۱۔ علاقائی شہریت۔ جس علاقہ میں پیدا ہوا وہاں کا شہری

۲۔ ریاستی شہریت۔ جس ریاست میں پیدا ہوا وہاں کا شہری

۳۔ ملکی شہریت۔ جس ملک میں پیدا ہوا وہاں کا شہری

۴۔ بین الاقوامی شہریت۔ تمام ممالک ایک سماجی اکائی ہونے کے ناطے بین الاقوامی شہری

شہریت کی اس جدید تقسیم کے مقابلے میں جب معراج العاشقین کے بیان کا جائزہ لیا جاتا ہے تو فرد کی اصلاح اور اسکی ہمہ جہتی ترقی کے لئے اختیار کردہ تمام طریقے اسلامی لوازمات میں شامل ہیں اور جنکی وضاحت اس انداز میں کی جاسکتی ہے۔

صدق : شریعت کی بندگی ہے اور جسمیں سچائی ہے وہ مسلمان ہے۔

عدل : طریقت کی پیرہن ہے جس میں انصاف ہے وہ مومن ہے۔

حیا : حقیقت کا حال ہے جس میں مردم آزاری نہیں وہ انسان ہے

شجاعت : معرفت کی چال ہے جس میں اپنی اور خدا کی پہچان ہے وہ بندہ ہے۔

معراج العاشقین کے مطابق فرد کی زندگی میں صدق، عدل، حیا، اور شجاعت جیسی صفات کا ظہور ہونے لگے تو وہ مسلمان سے مومن، مومن سے انسان اور پھر انسان سے بندہ کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے اور بندگی ہی اسلامیت کی روح ہے۔ معراج العاشقین کے مصنف نے یہاں ثابت کیا ہے کہ اسلام کے لازمے میں بندگی اختیار کرنا ہے جسے مسلمانیت، مومنیت اور انسانیت پر بھی برتری حاصل ہے۔

اسلامیت کے لوازمات کو ظاہر کرنے کے لیے مدارج کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جس طرح ایک فرد کی زندگی بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے سے مربوط ہے اسی طرح ایک مسلمان کی زندگی بھی مسلمان، مومن، انسان اور بندہ سے مربوط ہے اور جس انسان نے یہ مدارج طے کر لئے وہی کامل اسلامی فرد کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ارتقاء کے ان مدارج اور ان کے مقامات کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامیت کے ان لوازمات میں سے کسی ایک درجے پر آکر فرد رک جائے تو اس کے ارتقاء میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا اختتام تو صرف اور صرف شجاعت یعنی بندگی ہی پر ممکن ہے۔

جس طرح ایک نالے کو قرار نہیں اور وہ ندی میں جا ملنے کے لئے بے قرار رہتا ہے اور ندی فطری طور پر دریا سے وابستہ ہونے کے لئے بے چین جبکہ دریا، سمندر سے وابستگی اختیار کرنے میں منہمک اسی طرح دنیا میں وجود میں آنے کے لئے ایک فرد کی صلاحیتیں اسے بے چین رکھتی ہیں اور اسے راہ مل جائے تو اسکی فطرت میں مسلمانی شامل ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ جب عدی بن حاتم طائی نے حضور کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا اور لوگوں نے عدی کے والد حاتم طائی مرحوم کی سچائی اور سخاوت کے واقعات سنائے تو حضور اکرم صلعم نے کہا کہ بیشک وہ مسلمانوں میں سے تھا۔ یہ واقعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ فرد کی بے چین طبیعت اسے مسلمان بنا سکتی ہے بشرطیکہ اس میں تجسس ہو اور وہ حق کی تلاش میں رہے جس طرح نالے ندیوں میں، ندیاں دریاؤں میں اور دریا سمندر میں تبدیل ہوتے ہیں اسی طرح فرد کی طبیعت اسے مسلمان سے

مومن اور مومن سے انسان اور انسان سے بندہ بناویتی ہے۔ مگر اس کے لئے صدق، عدل، حیا اور شجاعت کی جو شرطیں عائد کی گئی ہیں انکی تکمیل لازمی ہے۔

معراج العاشقین میں اسلامیت کے لوازمات کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی شرطوں کو بھی واضح کیا گیا ہے اور پھر آخر میں ان تمام مدارج کے حصول کے بعد بھی معاملہ کو "عنایت" پر چھوڑ دیا گیا ہے یعنی فرد ان تمام درجوں کا حصول بھی کرلے تو جب تک خدا کی عنایت نہیں ہوگی اس کی ذات سے کشف و کرامت ممکن ہی نہیں۔ معراج العاشقین کے مصنف نے فرد کی ذات کو منور کرنے کے لئے سچائی، انصاف، حیا اور بہادری کو ذرائع کا درجہ دیا اور ثابت کیا کہ ان کے ذریعہ فرد کی نہ صرف ذات روشن ہوسکتی ہے بلکہ اسکی شخصیت میں بھی نکھار پیدا ہوسکتا ہے۔

یہاں اس بات پر توجہ بھی لازمی ہے کہ فرد، ذات، شخصیت اور ہستی کے روپ میں نمو پانے والا انسان کس طرح لازوال ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے معراج العاشقین کی رو سے عنایت خداوندی لازمی ہے۔ فرد، ذات، شخصیت اور ہستی کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ سچائی کو اپناتے ہوئے انصاف کا رویہ اختیار کیا جائے۔ حیا کا دامن تھامتے ہوئے بہادری کا مظاہرہ کیا جائے جب یہ تمام خصوصیات کسی فرد کی ذات میں شریک ہوجاتی ہیں تو اس کی شخصیت میں خدائی صفات کا ظہور ہوتا ہے اور یہی صفات ہستی کو مٹا کر خدا کی بندگی میں منہمک کر دیتے ہیں۔ معراج العاشقین کے مصنف کے نزدیک بندگی ہی اسلامیت کے لوازمات کی حرجت ہے اور اسی سے فرد، ذات، شخصیت اور ہستی کے نشیب و فراز مٹ جاتے ہیں۔

معراج العاشقین میں اسلامی تعلیمات کی روح کو اسلامیت کے لوازمات کے روپ میں پیش کیا گیا ہے اور یہی موضوع تصوف کے وسائل کو لئے ہوئے ہے۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ارکان اسلام کی پابندی فرائض زندگی میں داخل ہے اور ان کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اگر انسان سچائی، انصاف، حیا اور شجاعت کو اپنی زندگی کا لازمہ بنالے تو نہ صرف تکمیل ذات ممکن ہے بلکہ تحسین شخصیت کے ساتھ فنائے ہستی حاصل ہوجائے گی اور یہی ہستی کا فنا ہونا مکمل اسلامیت کی دلیل ہے۔

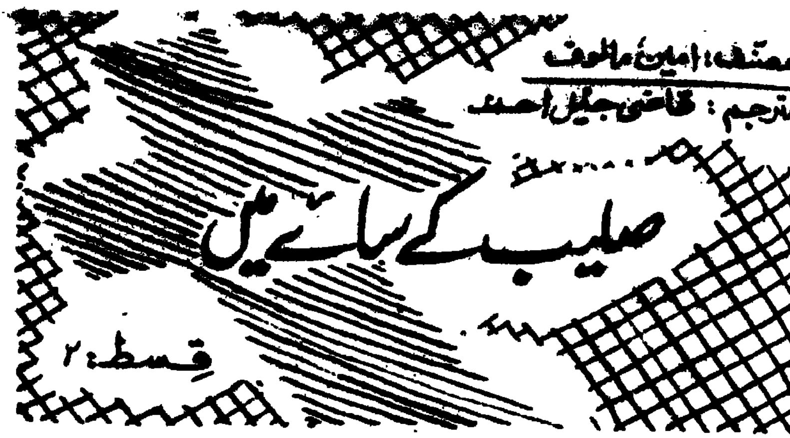
معراج العاشقین میں ارکان اسلام کے ساتھ اسلامی لوازمات کی شمولیت کا ذکر شعار اسلامی کے قطعی خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام صرف ارکان کی تکمیل کا نام نہیں بلکہ وہ ارکان

تکمیل کرنے والے سے کن تقاضے رکھتا ہے جسکی مثال پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی زندگیوں سے
ول دی جاسکتی ہے کہ پیغمبری ملنے سے قبل حضرت محمد صلعم صادق، امین، عادل، باحیا اور شجیع تھے
ت اوصاف کی بدولت حضرت محمد صلعم کو تمام افراد، ذاتوں، اشخاص اور ہستیوں پر برتری حاصل تھی
راسی افضلیت کی بناء پر جب ذات خداوندی نے حضرت محمد صلعم کو پیغمبریت سے نوازا تو انکار کی
ئی صورت باقی نہیں رہی اور ان ہی اوصاف کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت ممکن ہوسکی
س کا لازمی مطلب یہی نکلتا ہے کہ جس اسلام کو قبول کرنے والے میں اسلامیت کے لوازمات کا
مل پیرائی ہوگی، نہ صرف اس کا مرتبہ بلند ہوگا بلکہ ان ہی اسلامی لوازمات کی بدولت فرد، ذات
خصیت اور ہستی میں ایک بہت بڑا انقلاب نمودار ہوتا ہے جو مسلمان کو مومن کے درجے سے
ھاکر انسان کے مرتبہ پر لاتا اور پھر اُسے خدا کی بندگی میں پیش کر دیتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تصوف سے وابستگی رکھنے والے علماء اور اولیاء نے
یشہ روحانیت اور باطن کی صفائی پر زور دیا ہے۔ معراج العاشقین کے اس بیان سے واضح
ہو جاتا ہے کہ روحانیت کی اثر پذیری اور باطن کی اصلاح کے لئے کسی غیر فطری طرز کو اپنانے
کی ضرورت نہیں بلکہ انسان اسلامی شعار اپناتے ہوئے یعنی ارکان اسلام کی تکمیل کرتے ہوئے
سلامیت کے لوازمات یعنی سچائی، انصاف، حیا، اور شجاعت کو اپنی زندگی میں داخل کر لے
. روحانی فیوضات کے ساتھ ساتھ باطن کی اصلاح کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے اور
سی باطن کی اصلاح کی وجہ سے انسان میں خود کو اور خدا کو پہچاننے کا سلیقہ آجاتا ہے۔
ی طرح معراج العاشقین میں اسلامیت کے لوازمات کے ذریعہ "من و تو" کی شناخت کا مسئلہ
یش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلامیت کے لوازمات کی وجہ سے بندگی جیسے وصف کی بنیاد
قی ہے اور اسلام کا اولین مقصد ہی انسان کو بندۂ خدا بنانا اور اسے خدا کی بندگی میں دینا ہے

معراج العاشقین کی تحریر کا مقصد ہی ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل تھا۔ جو تمام تر اسلامی
شعار سے وابستہ رہے اور اسلامی طرز ہی زندگی گزارنے کو وقار کا ذریعہ بنالے۔ چنانچہ تصوف کے
ذریعہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور توسیع پر توجہ دی گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی ماحول
میں اسلامی تعلیمات کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ ہندوستانی مذاہب بھی سچائی، انصاف پسندی
شرم و حیا اور بہادری کو بلند نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان ہی اوصاف کی افضلیت کو برقرار رکھتے

ہوئے ہندوستانی مزاجوں کو اسلام کے قریب کرنے کے لئے معراج العاشقین میں اسلامیت کے کے لوازمات کے ذریعہ رابطہ استوار کیا گیا ہے۔ یہی وجہ رہی کہ جنوبی ہند میں بہت کم عرصے میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ معراج العاشقین کے مصنف نے اسلام کی اشاعت کے لئے ایک خالص فطری اور نفسیاتی طریقہ اختیار کر کے ہندوستانیوں کو دائرہ اسلام میں شامل کرنے کی کوشش کی اور یہ کوشش نہ صرف کامیاب رہی بلکہ اسقدر اہمیت حاصل کر گئی کہ اسلام سے عدم واقفیت رکھنے والے بھی اسلامیت کے لوازمات کی وجہ سے اسلام سے قریب ہونے لگے۔ اس طرح معراج العاشقین میں اسلامیت کے لوازمات کے ذریعہ مصنف نے دو کارنامے انجام دیئے ایک تو اس نے انسان کو بندگی میں دے دیا اور دوسرے غیر اسلامی معاشرہ کو متاثر کر کے اس میں اسلامی فکر کے لئے نرم گوشے پیدا کر دیئے اور اسی عمل نے جنوبی ہند میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے سازگار ماحول پیدا کر دیا۔ جنوبی ہند میں حضرت بندہ نواز رح کے علاوہ کوئی ایسا جید عالم دکھائی نہیں دیتا جس نے اپنے کردار اور عمل سے ہندوؤں کو قریب کیا ہو۔ چونکہ معراج العاشقین میں "اسلامیت کے لوازمات" کے ذریعہ "اتحاد" کی فضا پیدا ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور دکن میں یہ کام حضرت خواجہ بندہ نواز رح نے ہی کیا ہے۔ اس لئے تمام بیرونی شہادتوں کے باوجود داخلی شہادتوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ معراج العاشقین حضرت بندہ نواز رح کی ہی تصنیف ہے اور چودھویں صدی عیسوی میں حضرت بندہ نواز رح کے علاوہ کسی اور بزرگ نے دکن میں ایسے کارنامے انجام نہیں دیئے جو دو قوموں کے اتحاد کے ضامن بن سکیں۔ حضرت بندہ نواز رح کے کشف و کرامات سے بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے جنوبی ہند کی قوموں میں اتحاد کی روح پھونکی اور اسلامی ارکان کے علاوہ اسلامی لوازمات کو بنیاد بنا کر دکن میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لئے "معراج العاشقین" لکھی۔ چونکہ معراج العاشقین میں حضرت بندہ نواز رح کے کردار اور عمل کا پرتو موجود ہے اور ان کی زندگی اور تعلیمات کا عکس پایا جاتا ہے اسی لئے معراج العاشقین کو حضرت بندہ نواز کی تصنیف ہی کا درجہ دیا جائے گا۔ اس موضوع پر علحدہ عنوان کے ذریعے بحث کی گئی ہے اور داخلی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ معراج العاشقین حضرت مخدوم علی ہجویری بیجاپوری کی تصنیف نہیں ہوسکتی بلکہ دکن میں عوامی طور پر درس و تدریس کو شریفانہ پیشہ تصور کرتے ہوئے تبلیغ اور اشاعت اسلام کے پیش نظر وعظ و نصیحت کے ذریعے اسلامی معاشرہ تشکیل دینے والے صوفی حضرت سید محمد بندہ نواز رح ہی کی تصنیف قرار دی جاسکتی ہے



☆ صلیبی یلغار (۱۰۹۶ سے ۱۱۰۰)

"اہل فرنگ کے طور طریقوں کو دیکھو۔ دیکھو کہ وہ کتنی جوانمردی سے اپنے مذہب خاطر جنگ کرتے ہیں جبکہ ہم مسلمانوں سے کسی جوش جہاد یا کسی تعلق خاطر کا اظہار ہیں ہوتا۔" (صلاح الدین)

اس سال دھیرے دھیرے خبریں آنی شروع ہو گئی تھیں کہ فرنگی فوجیں بحیرہ رمورا کو پار کر کے ایشیا کے ساحل پر پہنچنے لگی ہیں قلیج ارسلان نے جس کی مملکت کے حدود ان فرنگی صلیبیوں کے مقام اجتماع سے قریب تھے ان خبروں کی تصدیق کے لیے پنے جاسوس روانہ کیے۔

قلیج ارسلان کی عمر اس وقت بمشکل سترہ سال کی تھی۔ وہ پہلا مسلم حکمراں تھا جس کو رنگی حملے کی اطلاع سب سے پہلے ملی اور مسلمانوں میں یہ پہلا ترکی سلطان تھا جس نے ان حملہ آوروں کو پہلی شکست دی لیکن ساتھ ہی پہلا حاکم بھی وہی تھا جسے بالآخر صلیبی جنگ والوں کے آگے ہار ماننی پڑی۔

جولائی ۱۰۹۶ء میں قلیج ارسلان کو خبر ملی کہ فرنگیوں کی ایک بھاری جمعیت قسطنطنیہ کی سمت آگے بڑھ رہی ہے۔ گو اسے پتہ نہ تھا کہ فرنگیوں کی اس نقل و حرکت کا مقصد کیا ہے لیکن اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ حالات دگرگوں ہونے والے ہیں۔

قلیج ارسلان کی مملکت ایشیائے کوچک کے بڑے حصے پر محیط تھی جو اس نے یونانیوں سے چھین کر حاصل کیا تھا۔ اس کا باپ سلیمان اس علاقے کا جو آج کل ترکی کہلاتا ہے' پہلا ترک حکمران تھا۔ اس مملکت کا صدر مقام نکائیہ (NICAEA) تھا۔ نکائیہ کی فوج ترک گھوڑ سواروں پر مشتمل تھی لیکن رعایا کی اکثریت عیسائی تھی اور قلیج ارسلان جانتا تھا کہ کسی بھی صلیبی حملے کے وقت عیسائی رعایا کی ہمدردیاں اپنے ہم مذہب حملہ آوروں کے ساتھ ہوں گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ لوگ قلیج ارسلان کو محض ایک وحشی سردار سے زیادہ نہیں سمجھتے اور دل سے اب بھی بے سی لس ایلکسیس کومی نس قیصر روم ہی کو اپنا بادشاہ مانتے تھے اور ہر نماز میں اسی کی فتح و نصرت کی دعا کی جاتی تھی۔ ایلکسیس دراصل یونانی شہنشاہ تھا لیکن زمانہ دراز سے یہ لوگ اپنے آپ کو رومی شہنشاہیت کا قائم مقام تصور کرتے تھے اور اسی مناسبت سے عرب بھی ان کو رومی کہنے لگے تھے اس لیے قلیج ارسلان کے باپ نے جو ملک یونانی شہنشاہ سے لڑ کر حاصل کیا تھا عرب مورخین اسے بھی سلطنت روم کا علاقہ لکھتے ہیں۔

ایلکسیس کومی نس اس دور کی سب سے باوقار شخصیت تھی۔ قلیج ارسلان بھی اس کی شخصیت سے متاثر تھا جو ہمیشہ سنہری اور روپہلی قباؤں میں ملبوس رہا کرتی تھی۔ نفاست سے تراشی ہوئی داڑھی' دلکش آداب و اطوار اور تیز چبھتی ہوئی کینہ پرور آنکھیں ــــ قسطنطنیہ اس کا پایۂ تخت تھا اور اس کی مملکت بازنطینی مملکت کہلاتی تھی۔ قسطنطنیہ نکائیہ سے تین دن کی مسافت پر تھا۔ قلیج ارسلان کے دل میں بھی اس مملکت کو زیر کر کے قسطنطنیہ کی دولت سے اپنے آپ کو مالا مال کرنے کی آرزو چٹکیاں لیا کرتی تھی لیکن اسی کے ساتھ اسے ہر وقت ایلکسیس کی طرف سے خدشہ لگا رہتا تھا کہ کب یورپی جنگ بازوں کی مدد لے کر وہ اس کی مملکت پر چڑھ دوڑے۔ جہاں اس کی اپنی آنکھیں للچائی نظروں سے قسطنطنیہ کی طرف دیکھا کرتی تھیں وہ جانتا تھا کہ ایلکسیس کی نگاہیں بھی نکائیہ سے بے خبر نہیں ہیں۔

اگرچہ بازنطینی فوج جو برسوں کے اندرونی خلفشار کی وجہ سے پارہ پارہ ہوتی جا رہی تھی اور نکائیہ سے تنہا ٹکر لینے کی نہ ان میں طاقت تھی اور نہ ہمت لیکن

ایلکسیس بیرونی امداد کے بل بوتے پر ایسی جرات کرنے کے موقف میں ضرور تھا۔ بازنطینیوں کو ہمیشہ یورپی نائٹوں کی مدد حاصل رہا کی ہے۔ ۱۰۹۶ء تک بے شمار فرنگی یاتری اور ہتھیار بند نائٹ عیسائیوں کے مقامات مقدسہ کا دورہ کر چکے تھے اور مقامی باشندوں کے لیے ان کی شکلیں اب اجنبی نہیں رہی تھیں۔ بیس سال پہلے جب کہ قلیچ ارسلان ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس کی فوج کے معتبر سرداروں نے اسے یہ قصہ سنایا تھا۔ ان سنہری بالوں والے قسمت آزماؤں میں ایک شخص روسل اف بے لیوں ایشیائے کوچک میں ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا بلکہ اس نے قسطنطنیہ پر چڑھائی بھی کی تھی۔ اس وقت گھبرائے ہوئے بازنطینی حکمرانوں نے مدد کے لیے قلیچ ارسلان کے باپ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور مدد کی درخواست کی۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا جب اس نے بے سی لیس کے پیام بردار کو اپنے آگے مدد کے لیے گڑگڑاتے دیکھا۔ اس کے جواب میں ترک رسالہ آگے بڑھا اور روسل کے مقابلے میں بے سی لیس کی مدد کی اور اسے شکست دی۔ بے سی لیس نے بھی سلیمان کی گود سونے اور جواہرات سے بھر دی اور اسی وقت سے بازنطینی حکمران اہلِ فرنگ کی طرف سے ہمیشہ مشکوک اور مشتبہ رہا کرتے تھے لیکن بازنطینی شہنشاہوں کے پاس چونکہ ہمیشہ لڑنے والوں کی کمی رہا کرتی تھی اس لیے انھیں اپنی فوج میں ہمیشہ کرائے کے غیر ملکی لوگوں کو بھرتی کرتے رہنا لازمی تھا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف اہلِ فرنگ بلکہ کئی ترک سردار بازنطینی پرچم لے کے فوجوں میں شامل اور صلیبی پرچم یا شہد دکھائی دیتے تھے اور انہی ترک سرداروں کی بدولت قلیچ ارسلان کو جولائی ۱۰۹۶ء میں پتہ چلا کہ ہزاروں کی تعداد میں اہلِ فرنگ قسطنطنیہ پہنچ رہے ہیں۔ ان یورپی حملہ آوروں کا ایشیائی قسمت آزماؤں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ان میں نہ صرف آہن پوش نائٹ اور بے شمار پیدل شمشیر زن اور تیر انداز شامل تھے بلکہ ان کے ساتھ ان کی عورتیں اور بچے بھی آئے تھے۔ اسی طرح بے شمار کئی جھگڑے لگانے ضعیف العمر لوگ بھی ان کے ساتھ تھے ان کی حالت ایک ایسے تباہ حال قافلہ کی سی دکھائی دیتی تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مقام کرنے پر مجبور ہو گیا ہو۔ کہتے ہیں کہ ان

نسب کیا بیٹھ پر کپڑے کی دو دو جیبوں کی مدد سے صلیب کا نشان بنا ہوتا تھا۔ گو نوجوان سلطان کے لیے ان کے عزائم سے واقف ہونا مشکل تھا پھر بھی اس نے اپنے خبر رسانوں کو حکم دے رکھا تھا کہ ان لوگوں کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھیں اور پل پل کی خبر اسے پہنچاتے رہیں۔ احتیاطی طور پر اس نے اپنے قلعے کی دفاعات کی اچھی طرح پھر ایک بار چھان بین کر لی تاکہ اگر کوئی سقم ہو تو اسے دُور کیا جا سکے۔ نکائیہ کی دیواریں ایک فرسنگ (۶ ہزار میٹر) سے زیادہ طویل تھیں جن میں ۲۴۰ برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ شہر کا جنوب مغربی علاقہ اسکانیوں جھیل کی بدولت قدرتی طور پر محفوظ تھا۔

بالآخر ماہ اگست کے ختم ہوتے ہوتے خطرے کی حقیقی نوعیت کا اندازہ ہو گیا بازنطینی جہازوں کی راہ نمائی میں افرنگی بحری بیڑہ نے بالآخر فاسفورس کو عبور کر لیا اور تپتی چلچلاتی دھوپ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ لوگ ساحل سے آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ جہاں جہاں سے گذرے انھیں یہی کہتے سنا گیا کہ وہ مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اگرچہ راہ میں انھوں نے بہت سے کلیساؤں کو بھی لوٹ کر مسمار کیا تھا۔ ان کا سردار ایک راہب تھا جس کا نام پیٹر تھا۔ مخبروں نے اس فوج کی تعداد کئی لاکھ بتائی لیکن کوئی یہ نہ بتا سکا کہ ان کا قصد کس طرف کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قیصر روم انھیں سے وی ٹاٹ میں آباد کروانا چاہتا تھا جہاں اس سے پہلے بھی کئی کرائے کے فوجیوں کو ٹھہرایا جا چکا تھا اور جو نکائیہ سے ایک دن سے بھی کم کے فاصلے پر تھا۔

سلطان کے دربار میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ایک طرف ترکی رسالہ بالتصدیق حملے کے لیے تیار تھا دوسری طرف خبر رسانوں اور مخبروں کی پہنچائی ہوئی خبروں کا تانتا بندھا ہوا تھا جو چھوٹی سے چھوٹی بات کی اطلاع بھی سلطان کو پہنچا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر صبح ان فرنگیوں کے غول کے غول اپنے فوجی کیمپ سے نکل کر آس پاس کے دیہاتوں میں پھیل جاتے اور سارے کھیتوں کھلیانوں کو لوٹ کھسوٹ کر تاراج کر دیتے لیکن سلطان اور اس کے مشیروں کے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی اور نہ ہی انھیں اس پر کوئی تشویش لاحق ہوئی۔ پورے ایک مہینے تک یہی لیل و نہار جاری رہے۔

وسط ستمبر میں ایک دن فرنگ کے معمول میں اچانک تبدیلی محسوس کی گئی۔
شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اب اطراف و اکناف کے دیہاتوں میں لوٹ کھسوٹ کیلئے
کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا اس لیے انھوں نے خود نکائیہ کا رُخ کیا اور سلطان کی سرحدوں
کو پار کر کے کئی دیہاتوں میں داخل ہو گئے گو یہ سب کی سب عیسائی بستیاں تھیں
لیکن ان سے بھی انھوں نے اناج اور غلّے کا مطالبہ کیا اور جنھوں نے بھی دینے میں
لیت و لعل سے کام لیا' ان کے گھروں کو اُجاڑ کر انھیں تہہ تیغ کر دیا۔ کہا جاتا ہے
کہ بچوں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔

قلیج ارسلان اپنی ساری چوکسی کے باوُجود اس اچانک حملے کے لیے تیار
نہ تھا اور اس خبر کے پہنچتے پہنچتے فرنگی حملہ آور خود اس کی دیواروں تک آ پہنچ
گئے اور شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے فرنگی کیمپ سے دھواں اٹھنے
لگا تھا۔ ابتدا میں سلطان نے سواروں کا ایک رسالہ حملہ آوروں کا راستہ روکنے
کے لیے روانہ کیا لیکن ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ فرنگیوں نے اسے بہ آسانی کاٹ
کر رکھ دیا۔ بچے کھچے سواروں نے نکائیہ کی فصیلوں کے اندر پناہ لی۔ ہراول
دستے کی اس افسوس ناک تباہی کو اپنے لیے باعث شرم اور بے آبروئی سمجھ کر
قلیج ارسلان فوری ایک جوابی حملے کے حق میں تھا لیکن اس کے سرداروں نے
مخالفت کی کیوں کہ اب رات ہونے ہی والی تھی اور فرنگی اپنے کیمپ کو واپس
لوٹ رہے تھے۔ انتقام کے لیے ابھی بہت وقت پڑا تھا۔

تاریخ کے اس دلچسپ لیل و نہار کی داستان جاری
ہے۔ آیندہ ماہ تیسری قسط پڑھنا نہ بھولیے۔

آپ اردو کے بہی خواہ ہیں تو
اردو مطبوعات نہ خود مانگ کر پڑھیے
نہ اوروں کو عاریتاً دیجئے۔

ین. محمد واجد حسین

جہیز ایک فرسودہ لعنت

میری یہ آواز دھوم دھام سے ہونے والی ان شادیوں اور جہیز کی رسم کے خلاف اُٹھی ہے وہ فرسودہ جہیز جس کی وجہ سے آج نہ جانے کتنی ہی معصوم بے گناہ لڑکیاں اپنی جان سے ہاتھ دھونے پر مجبور ہو رہی ہیں۔ کتنے ہنستے کھیلتے گھرانے تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ کتنی ازدواجی زندگیاں تلخیوں کے سائے تلے بت رہی ہیں اور کتنی ہی ایسی نئی نویلی دولہنیں جن کے ہاتھوں کی مہندی تک ابھی ہلکی نہیں ہوی، سسرال والوں کے ہاتھوں زندہ جل کر ہلاک کی جا رہی ہیں۔ دراصل یہ قصور کسی اور کا نہیں بلکہ ہمارا قصور ہے جو ہمارے سماج میں ہے۔

جہیز کیا ہے؟ عام زبان میں سنّت ہے۔ جواب صرف احادیث کی کُتب کے اوراق کی زینت ہے لیکن آج کی خاص زبان میں لاٹری کا ٹکٹ جسے ہر حال میں کامیابی ملتی ہے۔ یہ آج کا فیشن اور سفید پوش لیڈروں کا سیاہ کارنامہ ہے۔ اس سفید پوشی میں ہزاروں معصوم اور بے گناہ ابلاؤں کا خون بھی شامل ہے مگر ہم اسے دیکھ نہیں پاتے ہیں کیوں کہ ہماری آنکھوں پر بے حسی کا چشمہ چڑھا ہوا ہے۔ جو ہر رنگ کو زائل کر کے صرف سفید رنگ کو ہی سامنے لاتا ہے۔

دورِ جدید کے حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینے پر واقعی ایک نفرت سی دل کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیب، اخلاق اور اسلامی طور طریقے سے بالکل الگ ہو چکے ہیں۔ چوں کہ آزاد خیالی اور

تہذیب یافتہ ہونے کے فخر نے ہم کو بالکل اندھا اور پاگل بنا دیا ہے۔ فیشن کا بھوت ہم پر اس طرح سوار ہو چکا ہے کہ اس رو میں بہہ کر اپنے دائرے سے بہت دور نکل چکے ہیں جہاں سے لوٹ کر آنا بہت مشکل ہے۔ انسان کے اندر اگر خودداری نہ ہو تو وہ انسان، انسان ہی نہیں۔ ہر انسان تو آدمی ضرور ہوتا ہے مگر آدمی کو انسان بننے کے لیے انسانیت کے زیور سے مزین ہونا ضروری ہے لیکن آج ہمارے اندر خودداری نام کی کوئی چیز نہیں بلکہ خودغرضی کسپر جام ہو گئی ہے۔ خاص کر جہیز کے معاملہ میں دیکھا جا رہا ہے کہ لڑکے والے بڑی بے رحمی سے لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔

جہیز اور تلک سماج کے لیے ناسور بن گئے ہیں اور یہ ناسور روز بروز ایک سنگین اور خوفناک روپ اختیار کر کے معاشرے میں طاعون کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ جس سے سماج کی ساری قدریں پامال ہو رہی ہیں، آج کل تو یہ مرض ایک مقدس اور پاکیزہ رشتے کے درمیان آہنی دیوار کی شکل میں حائل ہو رہا ہے محض جہیز کی خاطر بہوؤں کو زندہ جلانے کے دردناک واقعات مسلسل ہو رہے ہیں۔ ہر روز اسی سلسلے کے خطرناک و دردناک واقعات سے اخبارات کے کالم بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس جہیز کے خطرناک ناگ نے بے شمار بے گناہ معصوم لڑکیوں کی جانیں لے لی ہیں۔ جب ہماری سماجی تنظیموں کے نمایندے اس پیچیدہ مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو صرف ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ قوانین سخت سے سخت بنائے جائیں۔ مگر اس عمل شاذ ہی کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ جہیز کم ہونے کی بنا پر بہوؤں کو زندہ جلانے کے واقعات کی روک تھام کے لیے جو قوانین پہلے سے موجود ہیں کیا اسے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ مجرموں کو سزا دینے سے قاصر ہیں۔

دراصل آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ایک نمائشی زمانہ ہے جسے عرف عام میں "دنیا دکھاوا" کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ دنیا دکھاوا نہ ہو تو دنیا کیا دیکھے گی ..... کیا کہے گی ..... آج کے اس دور میں یہی خیال ہر ایک کو

پریشان کررہا ہے اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ شادیوں میں کافی قیمتی سامان
بھرپور جہیز دینا اور لینا ایک معنوں میں منھ سے من مانی مانگ کر لینا
بات ہوگئی ہے۔ یہ جہیز کی رسم موجودہ دور میں کافی خطرناک ناگ ہے۔
جس کے سامنے بے قصور و بے گناہ معصوم لڑکیاں اپنی قیمتی جانیں بے بسی
سے گنوار ہی ہیں۔ آج کے اس دور میں لڑکے والوں کی مانگ یعنی جہیز
سمجھئے پوری ہونے میں ذرا بھی کسر یا کمی ہو جائے تو بے چاری دلہن کی خوشیوں
کا خاتمہ ہی سمجھئے گویا جہیز نہ ہوا بلکہ فرشتۂ اجل ہوگیا۔ لڑکے والوں کے
"جہیز" کا نام سنتے ہی معصوم لڑکیوں کے اور ان کے غریب و نادار والدین کے
ہوش و حواس اُڑ جاتے ہیں۔ بے اختیار ان کی آنکھیں چھلک اُٹھتی ہیں
ان معصوم کنواری لڑکیوں کے دل کانپ جاتے ہیں لیکن برخلاف اس
لڑکے والوں کے چہروں کی چمک دمک دیکھئے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا
زندگی کا سارا دار و مدار صرف اس "جہیز" پر ہی ہے۔

جہیز نہ صرف بیماری ہی نہیں بلکہ قانون کی بھی علامت ہے۔ اگر
خود ہم ڈر، خوف یا مصلحت کی بنا پر غور نہیں کرتے اس وجہ سے
سماج بالکل برہنہ ہو جائے گا۔ ہماری لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوں گی اور
سماج کے خوبصورت چہرے پر ایک کالا دھبا لگ جائے گا۔

یہ خطرناک رسم و رواج ہندوستان ہی میں بہت زیادہ عام ہے۔
لعنت نے دنیا کی نظروں میں ہندوستان کو رسوا کر دیا ہے لیکن آج ہمار
اس ملک کی رسوائی اور نیک نامی کی فکر کسی کو نہیں ہے۔ جب آج کا معاشرہ
صغیرہ کو معاف کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوتا۔ جب کہ اللہ تبارک
اپنے بندوں کے بڑے سے بڑے گناہوں کو بھی ان کے توبہ کر لینے پر معاف
فرماتا ہے تو پھر یہ ظالم انسان اس گناہِ کبیرہ کو کیوں برداشت کر لیتے ہیں۔
وحشت و بربریت کے خلاف وہ موثر کاروائی کیوں نہیں کرتے کہ اس
کے غریب طبقہ کی بہو، بیٹیوں کو اس زہریلے ناگ سے نجات حاصل ہو سکے
اصلاحی تنظیمیں اور جماعتیں تلک و جہیز کی برائیوں سے لوگوں

کرتے رہیں ورنہ ہمارے معاشرے میں پھیلا ہوا خطرناک زہریلا ناگ اور بھی بھیانک روپ اختیار کرے گا اور سماج کو ان گنت ہولناکیوں میں مبتلا کر دے گا۔

فیشن کی اس چوکھٹ پر سینکڑوں کنواری لاشیں تڑپ رہی ہیں، کراہ رہی ہیں لیکن ان مظلوم ابلاؤں کی چیخ و پکار کو ہم سن نہیں سکتے کیوں کہ ہوس کے پھاہے ہم نے اپنے کانوں میں ٹھونس رکھے ہیں۔ جو ہر آواز کو دبا کر صرف کھنکتے ہوئے سکوں کی آواز کو ہمارے کانوں تک پہنچنے دیتے ہیں۔ جہیز ہمارا نفسیاتی مسئلہ بھی بن چکا ہے۔ کچھ لوگ نفس سے مجبور ہو کر ناک کی اونچائی قائم رکھنے کے لیے جہیز بخوشی دیتے اور زبردستی جہیز لیتے بھی ہیں اور اگر ذرا بھی یہ گمان ہوا کہ ناک کی اونچائی میں کمی آ جائے گی تو اس سبب کو ہی ختم کر دیتے ہیں، جو کہ اونچائی کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔

جہیز ایک ایسی مشین ہے جسے چلانے کے لیے کوئلہ اور پانی کی جگہ نوجوان لڑکی اور اس کے غریب والدین کا خون دیا جاتا ہے۔ جہیز ایک تیز اور نوک دار تلوار ہے جو ہماری کنواری بہنوں اور بیٹیوں کی مانگ میں سیندور کی جگہ خون بھر رہا ہے۔ ہماری مظلوم بہنیں قبرستان کو آباد کر رہی ہیں کچھ جو جان دینے سے گھبراتی ہیں وہ بالاخانوں کی زینت بن گئی ہیں۔

جہیز ایک ایسا زہریلا ناگ ہے جو ہماری تہذیب و تمدن کو رات دن ڈس رہا ہے جس سے کہ ہمارے معاشرے کی فضا زہر آلود ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا خون سفید ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ ہماری غلط حرکات کی وجہ سے .... اسلام ایک اہم اور موثر ہتھیار ہے جس کا صحیح استعمال کر کے ہم ایک مثالی معاشرے اور تہذیب و تمدن کا سنگ بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ سماج سے اونچ نیچ اور امیری غریبی کے بے ہودہ جذبات کو ختم کر سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ایک سنت ادا ہو جائے گی اور جس کا بڑا ثواب ملے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے کہ جہیز دنیا کی فلاح و بہبود بھی بن جائے اور ہم ثواب کے مستحق بھی بن جائیں؟ ایک مثال یہ ہے کہ جہیز ایک

ریا الورہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے اس کا صحیح استعمال ہمارے لیے باعث افتخار اور ثواب ہے۔ دنیا کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہے اور اس کا غلط استعمال ہمارے لیے باعثِ ذلت وگناہ ہے۔ دنیا کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے، اس کا استعمال کس طرح صحیح ہو سکتا ہے اس کے لیے جہیز محمدیؐ کو غور سے دیکھنا ہوگا۔

ہم چودہ سو سال پیچھے کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے نبی کریمؐ نے اپنی لاڈلی اور چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ کا نکاح کتنی سادگی سے کیا تھا۔ آپ نے صاحبزادی کو جو جہیز دیا وہ صرف بان کی ایک چارپائی، چمڑے کا ایک گدا، جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑوں پر مشتمل تھا۔ ہم تھوڑا غور کریں یہ اس دو جہاں کے سردارؐ کی بیٹی کا نکاح تھا جو اگر چاہتے تو کیا نہیں دے سکتے تھے لیکن آپ کی ذاتِ پاک مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ تھی۔ آج ہم اس طرح نہیں تو کچھ نہ کچھ سادگی سے تو ضرور کام لے سکتے ہیں۔

آج کل ہندوستان بھر میں سماج کے اندر جس زور و شور سے جہیز کا رواج چل رہا ہے میں اس طرف توجہ دلاتا ہوں جس کو دیکھ کر ہم سب کو طے کرنا چاہیئے کہ آج ہمارے یہاں جہیز کا جو رواج زور و شور سے چل رہا ہے اس کے خلاف ہم سب کو ٹھوس اور سخت اقدام اٹھانا چاہیئے۔ آج ہم سب کو متحد ہو کر اس فرسودہ جہیز کے خلاف ملک گیر پیمانے پر ایک باقاعدہ تحریک چلانی چاہیئے اس تحریک میں خصوصاً لڑکوں و لڑکیوں کو حصہ لینا چاہیئے تاکہ اب کسی اور معصوم لڑکی کی قیمتی زندگی تباہ نہ ہو سکے۔

آج اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم جہیز کے لین دین کے خلاف ہیں لیکن تنہا اس کے خلاف صدا بلند کریں تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ اس سلسلے میں یہی سوچتے ہیں تو آپ کی بہت بڑی غلطی ہے۔ اس وجہ سے کہ ہو سکتا ہے آپ جیسے خیالات رکھنے والے نہ جانے کتنے لوگ ہوں جو یہ سوچ رہے ہیں کہ ہماری یہ آواز کون سنے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس قطار میں ہوں گے۔ ان کی آواز میں آواز ملانے والا کوئی اور مل جائے تاکہ یہ آواز زیادہ دور تک پہنچ سکے۔ لیکن میں اتنا کہوں گا کہ کسی کی پرواہ کیے بغیر ہر شخص اکیلے اکیلے ہی قدم آگے بڑھائے تو ہم یہ دیکھیں گے کہ کچھ عرصے کے بعد ہمارے قدم سے قدم ملاتا ہوا ایک زبردست کارواں پائیں گے۔ ●●

سید جعفر ادیب

صحیفۂ فطرت یعنی کائنات

سلسلہ کیلئے دیکھئے شاداب اکتوبر ۸۵ء

پودوں کی جڑوں میں خوردبینی حیوانات دبیکٹریا کی دنیا آباد ہوتی ہے جن کا عمل کیمیاوی ہوتا ہے۔ یہ حیوانات زمین کی نائٹروجن کھا کر ایک رس خارج کرتے ہیں۔ جس میں نائٹروجن کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نائٹروجن حیات نباتات کا جزو اعظم ہے اگر یہ حیوانات یعنی بکٹریا نہ ہوتے تو کوئی پودا اُگ نہ سکتا تھا قابل غور مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری پرورش کے لئے حیرت انگیز انتظام کر رکھا ہے اور یہ "اشرف المخلوق" یعنی انسان اپنی بقا کے لئے اس ذلیل ترین مخلوق کا کس قدر محتاج ہے مگر یہ حیوانات دبیکٹریا) نظر آجاتے تو حشرات الارض کا لقمہ بن کر ہوجاتے ان کا نظر نہ آنا اللہ تعالیٰ کی دوسری رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۃ واقعہ میں ارشاد فرماتا ہے ۔ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ترجمہ: اچھا پھر بتلاؤ کہ تم جو کچھ (تخم وغیرہ) بوتے ہو اس کا تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں، اسی طرح سورۃ واقعہ میں ارشاد فرماتا ہے اَفَرَءَیْتُمْ ... تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ترجمہ: اے کھیتی باڑی کرنے والو کبھی غور بھی کیا کہ اصل کسان کون ہے؟ ہم یا تم۔ قدرت کی اس کارگذاری پر غور فرمائیے ۔ یہ حقیقت ہے کہ کھیتی کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو سہولتیں پیدا کر دیا ہے، ورنہ کہاں انسان اور یہ کہاں کھیتی باڑی"

جرمنی کا ایک عالم فطرت یا ہیبر (HABER) نے کیمیاوی عمل نائٹروجن کو کثیر تعداد پیدا کیا جس سے گیہوں کی جنگ بالکل آسان ہوگئی اس عالم نے

16-4-688 ۔ نزد ریلوے سگنل چنچل گوڑہ ، حیدرآباد

میں نائٹروجن اور ہائیڈروجن تیار کرنے کیلئے اتنا بڑا کارخانہ لغونا ویرکے (LEUNAWERKE)
میں قائم کیا جسکی تعمیر میں پچاس لاکھ پونڈ صرف ہوئے اس میں گیارہ ہزار مزدور نو ہزار
پانچ سو صناع، ایک سو پچاس علماء کیمیا کام کرتے ہیں اور ہر روز نو ہزار ٹن کوئلہ
مغرب کے علماء نباتات نے صدیوں کی کد و کاوش کے بعد نباتات میں نر اور مادہ
کا نظریہ قائم کیا ہے لیکن قرآن حکیم نے ہمارے اُمّی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ
۱۳۶۲ سال پہلے یہ ہانگ دہل سورۂ ذاریات میں اعلان کیا وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا
زَوْجَيْنِ - (۵۱/۴۹) ترجمہ: ہر چیز کے لئے ہم نے نر و مادہ جوڑے پیدا کئے، قرآن
مجید الہامی کتاب ہونے کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا۔ جب کہ اس تاریک
ترین زمانہ میں رسول عربی فداہ امی ابی نے ایک حقیقت کو بے نقاب کر دیا جسے آج
جدید ترین اور ماڈرن نظریہ سمجھا جاتا ہے جس کا تعلق حقیقت سے بعید ہے۔
ساڑھے نو کروڑ میل کی مسافت سے سورج کی کرنیں آتی ہیں۔ جو بخارات
آبی کو ہوا کے کندھوں پر لاتی ہے۔ بجلیاں چمک چمک کر زمین کی نس نس میں خون حیات
دوڑاتی ہیں۔ اور بلندی فضائیں نائٹروجن کا بیش بہا ذخیرہ کھیتوں کو پہونچاتی ہیں،
چشمے اندرون پہاڑ سے معادنیں کی ایک دنیا ہمراہ لے کر ہماری زمین کی طرف بڑھتے
ہیں۔ جڑیں ذخائر ارض کو جذب کر کے جزو نباتات بناتی ہیں۔ تب کہیں جا کر
ہمیں غذا میسر ہوتی ہے۔
پھلوں کو جنگلی جانوروں اور پرندوں سے محفوظ رکھنے کے لیئے قدرت نے
کئی تدابیر اختیار کی ہیں مثلاً بادام اور اخروٹ کے چھلکے سخت بنا دیئے ہیں اور ان
پر کڑوے غلاف چڑھا دیئے ہیں۔ سنگترے اور انار کا چھلکا اس قدر کڑوا ہوتا ہے
کہ کوئی حریص جانور اس پر منہ ڈالنے کی ہمت تک نہیں کرتا۔ قدرت کی کمال صناعی
ملاحظہ ہو کہ وہی زمین ہے۔ درخت وہی ہیں اور پہونچانے والی شاخیں وہی ہیں
لیکن انار کا چھلکا سخت کڑوا ہے اور دانے میٹھے ہیں ایک میٹھاس تیار کر رہا ہے اور
دوسرا کڑواہٹ حالانکہ دونوں پاس پاس ہیں لیکن ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں
ہو سکتے۔ اس دقیق صناعی اور ایمان افروز نظم و نسق کی جسقدر داد دی جائے کم ہے

اخروٹ، بادام اونچے پہاڑوں پر پیدا ہوتے ہیں جہاں برف وغیرہ کی وجہ سے میدانی جانور نہیں پہونچ سکتے۔ ہاں گلہری اور چوہوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے قدرت نے ان کے چھلکے سخت بنا دیے ہیں۔ جہاں گلہری اور چوہوں کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے قدرت نے ان کے چھلکے سخت بنا دیئے ہیں تاکہ گلہری اور چوہے نقصان نہ پہونچا سکے۔

انسانی بدن کی مشین کو دو چیزوں کی سخت ضرورت رہتی ہے شکر اور نشاستہ یہ ہر دو اجزاء کھجور میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ کئی کئی ماہ ہمارے پاس چولہا نہیں جلتا تھا۔ ایک صحابیؓ نے پوچھا کیسے گزارہ ہوتا تھا تو آپ نے فرمایا کھجور اور پانی پر یہ حقیقت ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے کھجور میں پوری غذائیت رکھ دی ہے۔

جس کا نظام ربوبیت اسقدر حیرت انگیز ہے تو اس کیلئے "الحمد للہ رب العالمین" کہنا نہایت موزوں ہے جس نے عالموں کو اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ کوئی کسی کا محتاج نہیں ہے۔ یہ سب سامان قدرت نے اپنی طرف سے مہیا کر دیا ہے۔

کچھوا تین سو سال، بعض مچھلیاں کو ۱۵۰ سال کی عمریں رکھتی ہیں، عقاب ۱۰۸ سال، کتا ۵۰ سال، گھوڑا ۴۰ سال، گائے ۲۵ سال، بلی ۴۰ سال، مرغی ۳۰ سال، بطخ ۵۰ سال، مگرمچھ ۴۰ سال زندہ رہتی ہے۔

شتر مرغ ۲۰ سے ۳۰ سال تک انڈے دیتا ہے۔ پھر ان کے تین حصے کرتا ہے ایک حصہ زمین میں دفن کر دیتا ہے۔ دوسرا حصہ دھوپ میں رکھ دیتا ہے اور تیسرے کو سیتا ہے۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو دھوپ والے انڈوں کو توڑ توڑ کر بچوں کو پلاتا ہے۔ جب وہ ختم ہو جاتے ہیں تو مدفون انڈے نکالتا ہے اور ان میں سوراخ کر دیتا ہے اس مواد کو کھانے کے لئے چیونٹیاں اور دیگر حشرات الارض جمع ہو جاتی ہیں۔ جنھیں پکڑ پکڑ کر بچوں کے آگے ڈالتا ہے۔ جب بچوں کے معدے کافی قوی ہو جاتے ہیں تو وہ پتھر تک کھا جاتے ہیں۔

مکھی کئی ہزار آنکھیں رکھتی ہے لیکن اس کو عنکبوت یعنی مکڑی کا جالا نظر نہیں آتا۔ مکڑی جیسا بے بس جانور اس پر قابو پالیتا ہے اور دوسری طرف مکھی کی قوت کا اندازہ لگائیے وہ ہمیں دن بھر ستاتی ہے نہ آرام سے سونے دیتی ہے اور نہ کام کرنے دیتی ہے۔ ہماری غذا کی پاکیزگی اور نفاست ہم سے چھین لیتی ہے۔ اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر انسان مکھی کے سامنے بے بس ہے تو الٰہی قانون کی مخالفت کرنے والے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کیسے بچ سکیں گے مقام عبرت ہے۔

مثلاً چیونٹی، ہر بل میں چار قسم کی چونٹیاں ہوتی ہیں۔ ملک، ملکہ، مزدور اور سپاہی ان حشرات الارض کی اس عقل و دانش کا مطالعہ ایک مغربی حکیم کو متاثر کر دیا۔ وہ کہتا ہے ان بے مقدار اشیاء کی تکوین یعنی پیدائش میں اللہ تعالیٰ نے عقل و دانش، قوت تخلیق اور کمال صناعی کا کیسا حیرت آفریں مظاہرہ پیش کیا ہے اس سے بڑھکر ڈاکٹر ٹیلینس اڈورڈ لکھتا ہے کہ چیونٹی کے ساتھ خدا کی خاص رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک کیڑا پیدا کیا ہے۔ جس کو افس کہتے ہیں۔ چیونٹی اس کیڑے سے جنگ کرنے کے بعد اس پر غالب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کو گلاب کی پتیوں میں لا کر اس کی اچھی پرورش کرتی ہے۔ جب یہ کیڑا کھا پی کر موٹا تازہ ہو جاتا ہے تو یہ چیونٹی اس کیڑے کے بدن سے ایک قسم کا شیریں مادہ چوستی ہے۔ گویا یہ کیڑا چیونٹی کی گائے ہے۔ جس سے وہ دودھ پیتی ہے۔ کتنی حیرت انگیز تحقیق پیش کیا ہے۔ قربان جائیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت پر ---

(باقی آئندہ)۔

خلیل اکمل

سائنسی ایجادات اور ارتقاء تہذیب

ریڈیو والو

گیارھویں قسط:

الیکٹرانک سائنس ہماری زندگی کے تقریباً ہر شعبہ پر اثر انداز ہے خصوصاً تعلیم، صنعت و تجارت، تفریح اور دفاع میں استعمال ہونے والے سبھی آلات میں چند کل پرزے ایسے ہیں جن کی بدولت ہم آواز، ساز و نغمہ اور شکل و صورت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بغیر کسی فرق کے دیکھ سکتے ہیں ان کل پرزوں میں ریڈیو والو یا الیکٹران ٹیوب کو کلیدی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اس کے بغیر الیکٹرانک ٹکنالوجی مفلوج ہو کر رہ جائے۔ ریڈیو والو بیسویں صدی کی اثر آفرین ایجاد ہے۔ انیسویں صدی کی ایجاد "برقی مقناطیس" کی طرح اس ایجاد سے بھی ٹکنیکی ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔ ریڈیو والو کئی ایک الیکٹرانک اختراعات کا ایک اہم جز ہے۔ جن میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون، عصری فونوگراف، بات کرتی ہوئی تصویروں کے آلات جیسے VIDEO اور پروجیکٹر شامل ہیں۔ ریڈیو والو کی ایجاد کا سہرا فرانسیسی سائنسداں ڈی ما فارسٹ (DE LEE FOREST) کے سر ہے۔

۱۸۸۳ء میں امریکی سائنسداں ایڈیسن (EDISON) نے بجلی کے بلب کی ایجاد کے بعد یہ سوچا کہ اگر بلب کے اندر ایک برقیرہ ڈال کر باہر سے اس کا ایک برقی سرکٹ سے جوڑ دیا جائے تو برقی رو اس برقیرہ سے بہنے لگے گی۔ ایڈیسن اس خیال کو کامیابی سے ہمکنار نہ کر سکا لیکن ۱۸۹۶ء میں مارکونی نے جسے وائرلیس ٹیلی گرافی کا بانی کہا جاتا ہے، ریڈیائی اشاروں کو پہچاننے کے لیے ایک آلہ

گلاس کی نلی کا استعمال کیا جس میں ہیلیم بھر دیا جاتا تھا۔ اس ہیلیم میں برقی شرارے ملتے ہی چنگاریاں پیدا ہوتی تھیں۔ لاسلکی کا یہ طریقہ یوں تو انیسویں صدی کے اواخر تک چلتا رہا لیکن اس دوران بہت ہی حساس آلہ کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی۔ آخرکار ۱۹۰۴ء میں مارکونی کے طریقہ کی بنیاد پر انگلینڈ کے سائنسداں فلمنگ (FLEMING) نے ریڈیو اشاروں کو حاصل کرنے کا ایک ترقی یافتہ طریقہ دریافت کیا۔ اس نے گلاس کی نلی سے ہوا خارج کرکے اس کے دونوں سروں پر دو برقیرے CATHODE اور ANODE نصب کر دیئے۔ انوڈ کو کیتھوڈ کے مقابلہ میں مثبت POTENTIAL پر رکھا گیا۔ کیتھوڈ کے گرم ہوتے ہی الکٹران کا ایک طرفہ اخراج عمل میں آتا ہے۔ اس اختراع کا نام DIODE تجویز کیا گیا۔ ڈیوڈ کو اس کی خصوصیت کی بنا پر بجلی کے خودکار سوئچ (SWITCH) اور A.C. برق کو D.C. برقی رو میں تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈیوڈ کی ایجاد سے الکٹران ٹیوب کی ابتدا تو ضرور ہوئی لیکن یہ بہت ہی کمزور ریڈیو اشاروں کو حاصل کرنے سے قاصر رہا۔ لی ڈی فارسٹ نے اس مسئلہ کی یکسوئی ڈیوڈ کے اندر ایک تیسرا برقیرہ داخل کرکے کر دی۔ دراصل اس نے اس تیسرے برقیرے کو کیتھوڈ اور انوڈ کے درمیان نصب کرنے سے الکٹران کے بہاؤ کو کنٹرول کرنا آسان ہوگیا۔ فارسٹ نے اس برقیرہ کا نام کنٹرول گرڈ CONTROL GRID اور آلہ کا نام ٹرایوڈ (TRIODE) رکھا۔ آج ریڈیو میں اشاروں کو پہچاننے کے لیے ڈیوڈ اور بڑا کرنے کے لیے ٹرایوڈ استعمال کیے جاتے ہیں۔

فارسٹ کی طبیعت میں بچپن سے ہی سائنسی رجحان پایا جاتا تھا۔ جب جرمنی کے سائنسداں HERTZ نے ریڈیو لہروں کی خصوصیات دریافت کیا تو اس وقت فارسٹ صرف ۱۵ سال کا تھا اس نے YALE یونیورسٹی کے پروفیسر J.W. GIBBS کی رہنمائی میں ایک مقالہ HERTZIAN لہروں پر لکھا جس نے اس کو ڈاکٹریٹ (Ph.D) کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس نے چھ سال کی تحقیق کے بعد ریڈیو والو ایجاد کیا جس کو تمام ایجادات میں اہمیت حاصل ہوئی۔

ا پہنٹ کے ٹرلیوڈ والو سے ریڈیو اشاروں کو عملی اعتبار سے باقاعدہ بنا کر
دور دراز مقامات کو ترسیل کرنا ممکن ہو گیا۔ ان اشاروں میں موسیقی اور
نسانی آوازیں شامل ہیں۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں ائفل ٹوئر EIFEL TOWER سے
ترسیل کردہ فونوگراف کی موسیقی مارسیلز میں سنی گئی اور ۱۹۱۰ء میں
ویارک کے اوپرا ہاؤز (OPERA HOUSE) سے مشہور گائیک ENRICO
CARUSO کے گائے ہوئے نغمے بھی ترسیل کئے گئے۔

۱۹۲۰ء میں فارسٹ نے ایک دوسرا چیلنج قبول کیا اس نے خاموش
تصویروں کو بولتی فلم میں تبدیل کیا۔ وہ فارسٹ ہی تھا جس نے آواز کی
لہروں کو فوٹوگرافی کے متحرک فیتہ پر منتقل کیا۔ یہی اصول آج بھی بولتی فلم
میں برقرار ہے۔ یوں تو ریڈیو والو نے ترقی کے کئی منازل طے کئے ہیں
لیکن عصری والو میں آج بھی فارسٹ کا بنیادی اصول کام کر رہا ہے
گرچہ والو میں چند اور عناصر کا اضافہ کر کے ان کے نام TETRODE اور
PENTODE رکھ دیئے گئے ہیں اور بعض ٹیوب کے خدوخال گھٹا دیئے
گئے ہیں ——— یہاں تک کہ انگور کی سائز کے والو کو سیٹلائیٹ میں سینکڑوں
میل فضا میں مواصلات کے لیے استعمال کیا جانے لگا ہے۔

غرض ریڈیو والو اگرچہ کہ ایک معمولی سا پرزہ ہو لیکن یہ الکٹرانک
ٹکنالوجی کا روح رواں ہے جس کے بغیر ہمارے معاشرے کی ترقی ٹھپ
ہو کر رہ جائے۔ ۰۰

محمد مرتضیٰ خان فائز

سُرَاغ رسَانی

Detection

پانچویں قسط :

قبل اس کے کہ میں والد صاحب قبلہ کی سراغ رسانی جرائم یا ان کے سراغ میں لائے ہوئے مقدمات کے حالات لکھنا شروع کروں۔ یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس فن کی نسبت کچھ مختصراً لکھوں اور ساتھ ہی ان اصطلاحات کو بآسانی فہم زبان میں کردوں، جن کو اہلیانِ پولیس اور سراغ رساں حیدرآباد دکن میں مقامی طور پر استعمال کیا کرتے تھے تاکہ عوام بہ آسانی ان کا مطلب جہاں کہیں بھی وہ آگے چل کر استعمال ہوئی ہیں سمجھ سکیں۔

فن سراغ رسانی کو یوں سمجھ لیجئے کہ وہ فن ہے جس کی مدد سے انسانی لغزشوں کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ سراغ رسانی جرائم کے لفظی معنی اس سے زیادہ نہیں کہ مرتکبینِ جرم (CULPRITS) کو نامزد کیا جا کر ان کا پتہ چلا لیا جائے لیکن اصطلاح فن سراغ رسی جرائم (DETECTION OF CRIMES) مجرمین کا صرف نامزد کر کے ان کا پتہ چلا لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کی گرفتاری اور ان کے خلاف اس قدر شہادت کی فراہمی بھی اس میں داخل ہے کہ جس سے وہ قانونی نقطۂ نظر سے مجرم قرار پاکر عدالت سے سزایاب کرائے جا سکیں۔

اس فن کی نسبت یہ سمجھ لینا کہ وہ ایک تقدیری معاملہ ہے اگر قسمت نے ساتھ دیا تو کوئی مقدمہ سراغ رسیدہ ہو گیا اس کا پتہ چل گیا اور قسمت خراب ہوی تو وہ عدم سراغ (UNDETECTED) رہ گیا اور ملزم یا ملزمین

نہ پکڑے جا سکے۔ ایک حد تک درست نہیں ہے۔ مفتشین میں خود اعتمادی (SELF CONFIDENCE) تھوڑی سی عام فہم (COMMON SENSE) اور اس فن سے شغف ذاتی ہو تو کامیابی بالعموم یقینی ہے۔ فرائض منصبی۔ ITIES (DUTY) کے انجام دے لینے اور ذاتی دلچسپی لے کر کام کرنے میں بڑا فرق ہے۔ سراغ رسانی کے لیے صبر، استقلال، ہمت اور اقتضائے وقت کے لحاظ سے کام کرنے کی صلاحیتوں کا موجود رہنا بہت ضروری ہے۔

فوٹوگرافی، میڈیکل جیورس پروڈنس، بھنک سے اڑ جانے والی اشیاء، رنگوں اور روشنائی وغیرہ میں تمیز کرنے کے طریقوں فن شناخت ابہام اور فن شناخت خط و تحریر اپنی اپنی جگہ مستقل فن ہیں۔ ان سب فنون میں مہارت حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اگر ان کے بنیادی اصولوں سے واقفیت حاصل کر لی جائے تو یہ سراغ رسانی میں بڑی ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ بہ وقت ضرورت ان فنون کے ماہرین سے مشورہ اور امداد لی جانے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔

ناولی سراغ رسانی اور عملی سراغ رسانی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ناول کا سراغ رساں عملی مشکلات سے بے بہرہ رہ کر کام کرتا ہے۔ وہ ناول نگار کے پرواز تخیل اور زور قلم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قوانین ملک سے آزاد وہ کام کرتا ہے اور اس کے وسائل اور ذرائع لامحدود ہوتے ہیں۔ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہوتی اور جو اس کے دل میں آتا ہے وہ کر گزرتا ہے۔ برخلاف اس کے حقیقی سراغ رساں کو قوانین ملک کے تحت کام کرنا پڑتا ہے، اس کے ذرائع محدود ہوتے ہیں وہ تو اپنا حلقہ بھی بلا اجازت نہیں چھوڑ سکتا ہر ہر قدم پر عملاً اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہر معاملہ میں وہ اپنے اعلیٰ عہدے داروں کے پاس جواب دہ رہتا ہے اس لیے ناولی سراغ رسانی عملی سراغ رسانی میں کوئی مدد دے نہیں سکتی۔

اغراض سراغ رسانی جرائم کے لیے جرائم کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ گروہ اول میں ایسے جرائم داخل کیے جا سکتے ہیں جو

مرتکبین کا سراغرساں کو علم نہیں ہوتا اور ان کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ مثلاً چوری[1]، ڈاکہ[2]، نقب[3] یا حصول مال کے لیے قتل وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے گروہ میں ایسے جرائم داخل ہیں جن کے مرتکبین سے خود مستغیث (COMPLAINANT) واقف رہتا ہے۔ مثلاً بلوہ[4]، جس بے جا، خیانت[5]، دغا[6] اور خصومت سابقہ کی وغیرہ سے قتل وغیرہ۔ گروہ اول کے جرائم کی سراغرسانی اور تفتیش (INVESTIGATION) کو مرتکبین کا پتہ چلا کر انھیں نامزد کرنے کے بعد ان کو گرفتار کرنا اور ان کے خلاف شہادت فراہم کر کے انھیں عدالت سے سزایاب کرانا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے دوسرے گروہ کے جرائم میں اتنی مشکلات پیش نہیں آتیں۔ ان میں ملزمین نامزد ہی رہتے ہیں۔ ان کو گرفتار کر کے شہادت فراہم کی جا سکتی ہے اور اس شہادت کی ترتیب کا کام مفتش کو کرنا پڑتا ہے جو نسبتاً آسان کام ہوتا ہے۔

سراغرسانی جرائم کا سب سے بڑا مقصد مقدمات عدم سراغ کا پتہ چلانا ہے بہ الفاظ دیگر مقدمات عدم سراغ کی تعداد میں ایک طرح کی کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ہر عہدے دار اپنی بساط کے مطابق اس کمی کے لیے طریقے اختیار کرتا ہے۔ اچھے مفتش دن رات سخت محنت کر کے مجرمین کا پتہ چلا کر ان کی تعداد کم کرتے ہیں تو بعض سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً جرم کی اطلاع کے باوجود کئی کئی دن تک جرم کو نمبر پر ہی نہیں لیتے اور مستغیث کو بار بار تھانہ پر آنے کہا جاتا ہے۔ وہ بے چارہ تنگ آ کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح اخفاء جرم (CONCEALMENT) سے کام لیتے ہیں۔ اگر اس سے کام نہ چلا اور جرم کو نمبر پر ہی لینا پڑا تو اس کو عدم اصلیت (NON COMMITTAL) میں ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مستغیث کے ذرائع آمد و خرچ کا جائزہ لینا

---

[1] THEFT [2] DECOITY [3] BURGLARY

[4] RIOHNG [5] BREACH OF TRUST [6] CHOATING.

مع کیا جاتا ہے۔ اس کے دوست احباب، عزیز و اقارب پر گرفت کی
ہے اور اس کوشش میں کوئی معمولی سا موقعہ جرم کی عدم اصلیت میں
کا مل گیا تو اس سے استفادہ کیا جاتا ہے یا پھر مستغیث ہی کے کسی
عزیز پر شبہ قائم کیا جا کر اس کو حراست (CUSTODY) میں لینے کی فکر کی جاتی
ہے۔ مستغیث اپنے عزیز کو پولیس کے حوالے کے بجائے مال سے ہاتھ
دھو لینے کو ترجیح دیتا ہے اور اس طرح سلسلۂ سراغ براری کی کارروائی ختم
باقی ہے۔ یہ طریقے نہ صرف خلافِ قانون ہیں بلکہ انتہائی خطرناک ہیں۔
ایسا کرنے والے منتش بہت جلد بدنام ہو جاتے ہیں۔

کوشش کے باوجود اخفاء یا عدم اصلیت جرم میں ناکامی ہو تو پھر
فوری حربہ کے طور پر اصل تفتیش ترک کر کے مستغیث کی طمانیت کی خاطر اور عہدیداروں کو
منانے کی خاطر چند مشتبہ اشخاص (SUSPECTED PERSONS) کو محض شبہ
(SHEER SUSPICION) پر کسی موثر اور قوی مواد کے گرفتار کر لیا جاتا ہے
جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقبالِ جرم کرانے کی خاطر یا تو ملزم پر تشدد کیا
جاتا ہے یا ترغیب و تحریص سے کام لیا جاتا ہے یہ دونوں ہی طریقے
قانوناً ممنوع ہیں باوجود اس کے اہلیان پولیس ان سے کام لیتے ہیں نہ صرف ہمارے
ملک میں بلکہ متمدن ممالک میں بھی وہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جن کو تیسرے
درجہ کے طریقے (THIRD DEGREE METHODS) کا نام دیا گیا ہے۔

والد صاحب قبلہ نے کبھی جرائم کے اخفا کا طریقہ جرائم عدم سراغ یابی کی
لیے استعمال نہیں کیا۔ سراغ براری جرائم کے لیے انھوں نے چند اصول اپنائے
جن سے انھیں اکثر کامیابی ہوئی اس سے اسی فیصد مقدمات ان کے سراغ رسیدہ
ہے۔ جس زمانہ میں والد صاحب قبلہ کی تفتیش کے متعلق بعض طرح کی شہرت تھی۔ اکثر کا
یہ تھا کہ وہ کسی مجرم کی صورت کو دیکھتے ہی پہچان جایا کرتے تھے کہ وہ چور ہے
مجرم ہے یا نہیں۔ اور بعض کا خیال تھا کہ وہ ملزمین پر خوب سختی DETERRENT
SEVER کرتے اور ہمیشہ تشدد VIOLENCE سے کام لیا کرتے تھے۔ جس
وجہ سے ہر شخص ان کے پاس اقبال کر لیتا۔ یہ دونوں خیالات بھی غلط ہیں

درشت نہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ جب تک کسی شخص کے خلاف اس کا مجرم باور کرنے کا فی مواد نہ مل جائے اسے گرفتار (ARREST) ہی نہ کیا جائے کافی اور موثر مواد ملنے کے بعد وہ کسی پر ہاتھ ڈالتے، بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ ملزم ارتکاب جرم سے نہ صرف اقبال کرتا بلکہ کچھ مال بھی برآمد کرا دیتا اور باقی مال نہ دیتا۔ ایسی صورت میں مال کی برآمدگی (RECOVERY OF PRO-PERTY) کی پہلے مختلف ترکیبیں کی جاتیں اور جب سب ناکام ہو جاتیں اور سختی کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہتا تو مجبوراً آخری حربہ کے طور پر وہ سختی بھی کیا کرتے لیکن نہایت احتیاط اور معینہ حدود کے اندر ہی ملزم کی جسمانی حالت اور اس کی قوتِ برداشت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے طریقے اختیار کئے جاتے جس سے ملزم کے جسم پر کوئی سختی کے علامات یا نشان نہ پڑیں، جب کبھی سختی کی نوبت آتی تو اس کا لحاظ رکھا جاتا کہ ملزم کی مہلت (POLICE REMAND) کب ختم ہو رہی ہے۔ اختتامِ مہلت سے عین قبل کبھی سختی روا نہ رکھی جاتی کیونکہ ملزم کے عدالت میں شکایت کرنے کا احتمال رہتا۔ مہلت کے اختتام سے کم از کم چار پانچ روز پہلے سختی کا حربہ استعمال کرنا ہوتا تو کر لیا جاتا اور اس کے بعد نہیں۔

سراغ رسانی کے لیے کوئی خاص مقررہ طریقے یا مدونہ اصول وضوابط نہیں کہ ان پر عمل کرنے سے یہ کہا جا سکے کہ کامیابی یقینی ہے، والد صاحب قبلہ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ذیل کے طریقہ کار پر سلسلہ وار عمل کرنے اپنے ماتحتین پر زور دیا کرتے تھے۔

۱۔ سب سے پہلے جوں ہی کسی جرم کی اطلاع ملے۔ (FIRST INFOR-MATION REPORT) اسے درج کیا جائے۔ اِلّا ان صورتوں کے جہاں جرم کو غیر پر لینا ان کے لیے قانوناً ضروری نہ ہو، یا حالات اس کے متقاضی ہوں کہ ملزمین کی گرفتاری کے لیے فوری اقدامات کر دینا از بس ضروری ہو۔

۲۔ اس کے بعد معائنہ موقعہ (SPOT INSPECTION) کیا جائے اور معمولی سے معمولی، باریک سے باریک شئے، چیز، علامات یا نشانات کو اغراض تفتیش کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔

۳۔ معائنہ موقع کرتے سے اگر کوئی طریقہ ارتکاب جرم ۔ MODUS OPERAN متعین کیا جاسکے تو طریقہ ارتکاب جرم کا تعین کرنا اور اس طریقہ پر ام کرنے والوں کے متعلق جیل ہسٹری صیغہ شناخت کے ریکارڈ سے اور یگر ذرائع سے معلومات حاصل کرنا۔

۴۔ مقام واقعہ پر یا اس کے اطراف واکناف میں یا اور طور پر معمولی چھوٹی سے چھوٹی اشیاء، علامات، یا اطلاعات سے اس واردات کے حالات کے یش نظر نتائج اخذ کرنا۔

۵۔ فنِ دریافت وانکشافِ واقعات (ART OF QUESTIONING AND INTERROGATION. کی روشنی میں ملزمین اور مشتبہ اشخاص سے انکشافات کی تفصیلات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرانا۔

۶۔ بہ شرط ضرورت بعد گرفتاری جامہ تلاشی (PERSONS SEARCH) اور انہ تلاشی (HOUSE SEARCH) احتیاط سے لینا۔

۷۔ سابقہ سزا یاب (EX.CONVICTS) و عادی جرائم (HABITUAL OFFENDERS.) افراد پر نگرانی۔ ان سے میل جول اور ان کے حالات کی جانچ سے بعض اوقات بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان پر نگرانی رکھنا۔

۸۔ عوام اور پبلک سے خوشگوار تعلقات رکھ کر ان کا تعاون حاصل کرنا۔

۹۔ مال مسروقہ کی خاص نوعیت یا اس کی خاص وجہ شناخت بعض وقات مرتکبین کی گرفتاری کا باعث ہو سکتی ہے۔ جہاں کہیں مال کی نکاسی ممکن ہے وہاں اس کی تشہیر کرانا۔

۱۰۔ جرائم خلاف مال (CRIMES AGAINST PROPERTY) میں مال کی برآمدگی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے مال کی برآمدگی کے لیے حالات کے لحاظ سے ترکیبیں سوچنا اور مال برآمد کرنا۔

متذکرہ صدر اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کے حصہ اول میں الدصاحب قبلہ کے سراغ میں لائے ہوئے ہزاروں مقدمات میں سے چند کے الات حسب ذیل عنوانات کے تحت قلمبند کئے گئے ہیں۔

۱۔ اقتصادیات ۲۔ معائنہ موقعہ ۳۔ طریقہ ارتکاب جرم۔
۴۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نتائج اخذ کرنا ۵۔ خفیہ دریافت و انکشاف واقعات ۶۔ گرفتاری۔ جامہ اور خانہ تلاشی
۷۔ سابقہ سزایاب و عادی جرائم پر نگرانی ۸۔ عوام کا تعاون۔
۹۔ خاص علامات شناخت حال ۱۰۔ مال کی برآمدگی کی ترکیبیں۔

اس کے علاوہ بعض مخصوص قسم کے جرائم کی نسبت یہ عنوانات ذیل والدہ کے تفتیش کردہ دو چار مقدمات کے حالات بھی اس کتاب میں لکھے گئے ہیں

۱۔ پوٹلی بازی اور اٹھائی گیری (PICK POCKETING AND LIFTING)
۲۔ خیانت مجرمانہ۔ جعلسازی CRIMINAL BREACH OF TRUST FORGERY & CHEATING.)

(باقی آئندہ)

سلسلہ صفحہ (۱۸)

جاذب نظر خوبصورت سہ رنگی سرورق جو شکیل اعجاز کے موکار قلم کے رہین منت ہیں ان کی خصوصیات ہیں۔

برار کی سنگلاخ زمین شور میں اس ادارہ کو جاسوسی ناولوں کی اشاعت میں اولیت حاصل ہے، نیز مقامی روزمرہ اور بول چال کے خصوصی انداز کو لیے ہوئے شگفتہ و رواں زبان میں اس نواح کے نوجوانوں کی یہ سعی و کوشش ہر طرح لائق ستائش ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ قلت وقت کی وجہ یہ سطور قلم برداشتہ لکھی جا رہی ہیں اور سوائے کتب خانہ خانقاہ نقشبندیہ بالاپور کے کسی اور سے استفادہ کا موقع نہ ملا جس کی وجہ ممکن ہے نادانستہ طور پر کوئی اخبار یا رسالہ رہ گیا ہو یا کہیں کوئی اندراج صحت کے خلاف ہو جس کے لیے معذرت کے ساتھ توقع ہے کہ جو صاحب بھی اس کی نشاندہی فرمائیں گے انشاءاللہ بعد تشکر آئندہ کسی موقع سے اصلاح کر دی جائے گی۔ بوجہ عدم وصول معلومات "منادی" "آکولہ اور "چرخ" کھولاپور اس فہرست میں شامل نہ ہو سکے۔ ٥

شکار اور شکاری

شیر

(۶) ۔

شیر کی یہ عادت ہے کہ کھلی ہوئی جگہ میں بیٹھ کر نہیں کھاتا بشرطیکہ شیر چاندنی میں کنارے پر بیٹھ کر کھانا ناپسند نہیں کرتا اگر کوئی شکار جھاڑ کے قریب پڑا ہوا ہو تو گھانس میں سے اپنا پنجہ آگے بڑھا کر نہایت سے گھانس میں گھسیٹ لیتا ہے۔ محفوظ مقام کی تلاش میں ندی کو پار کرنا ہو تو اس سے گریز نہیں کرتا۔ ایک دفعہ کنوٹ ضلع عادل آباد میں ندی کے اس کنارے میدانی حصہ میں شیر نے گاؤں کی بھینس ماری۔ ندی کے پار بھی گھنا جنگل ہے۔ ندی میں کافی پانی تھا مگر شیر بھینس کو منہ میں دبا کر پار کر گیا اور گھنی جھاڑی میں بیٹھ کر کھا گیا۔ شیر دن میں دو مرتبہ صبح و شام پانی پیتا ہے اگر آدمیوں کا شبہ ہو جائے تو دوپہر تک پانی پر نہیں آتا۔

شیر معمولاً رات کو شکار کرتا ہے مگر مویشی خور دن کو بھی جانور مار لیتا ہے آدم خور کا تو کوئی وقت ہی نہیں ہے۔ بالعموم شیر اندھیرا ہونے سے پہلے جائے پناہ سے نکل جاتا ہے اور رات کو ۱۵۔ ۲۰ میل تک چکر لگاتا ہے۔ اگر دو گاروں میں دس میل سے زیادہ فصل ہو تو عموماً دو شیر خیال کئے جاتے ہیں۔ شیر جنگل میں نکل کر سیدھا پانی پر جاتا ہے سورج ڈھلنے سے قبل سے رات کے نو بجے تک اور صبح چار بجے سے نو بجے تک پانی پر آنے کا وقت ہے۔ چلنے میں تھوڑی تھوڑی دور پر ٹھیرتا ہے اور جانوروں کی آواز سنتا ہے۔ سردی کے موسم میں صبح ہوتے

ہی کوئی میں داخل نہیں ہوتا بلکہ دھوپ نکلنے کے بعد جسم کو گرم کرکے اندر جاتا ہے۔ گرمی کے زمانے میں تیز دھوپ میں نکلنے شیر تیار نہیں ہوتا۔ دھوپ میں ہانکا ہو تو بہت آہستہ آہستہ درختوں کے سایہ کی آڑ لیتا ہوا چلتا ہے جہاں موقع مل جائے جھاڑی میں دبک جانے کی کوشش کرتا ہے اور بڑی مشکل سے آگے بڑھتا ہے۔ سانبھر، چیتل، نیل، جنگلی بکری، سور، سارسل وغیرہ ان سب جانوروں کا شیر شکار کرتا ہے بعض اوقات جنگلی بھینسہ، ریچھ یا بور بچہ کو بھی مار کر کھا جاتا ہے۔ اوسطاً ہر پانچویں، چھٹے روز جانور مارتا ہے پھر بھی تازہ جانور موقع پر مل جائے تو مار لیتا ہے۔ جانور کھانے کے بعد شیر اپنے جسم کو زبان سے چاٹ کر اچھی طرح صاف کرتا ہے۔

جنگلی کتوں سے شیر بہت ڈرتا ہے۔ یہ کم بخت ایسی بلا ہے کہ موقع مل جائے تو جنگل کے ہر جانور کو کھا جاتی ہے بعض دفعہ ان کے (۳۰ — ۴۰) تک کے غول بھی دیکھے جاتے ہیں۔ یہ اطراف سے گھیر لیتے ہیں تو شیر زمین پر چت پڑ جاتا ہے یا کسی درخت سے پیٹھ لگا کر سامنے کے پنجے اٹھا کر بیٹھ جاتا ہے۔ بعض شکاریوں نے لکھا ہے کہ جنگلی کتوں کے ڈر سے انھوں نے شیر کو درخت پر چڑھا ہوا دیکھا۔ جس جنگل میں جنگلی کتے آئے سارے جانور جنگل چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

شیر میں عمر کے ساتھ تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ نوجوان شیر اندھیرے کے قبل ہی پانی پینے آجاتا ہے اور اپنے مارے ہوئے جانور پر بھی دوسرے دن بعض اوقات دوپہر میں بھی کھانے کو چلا آتا ہے۔ تجربہ کار شیر اندھیرا ہونے کے بعد پانی پر آتا ہے اور گاؤں پر دن کے وقت نہیں آتا۔ نوجوان شیر سے کبھی جنگل میں مقابلہ ہو جائے تو دانت نکال کر بھبکی دیتا ہے تھوڑی دیر کھڑا ہو کر چلا جاتا ہے۔ پرانے شیر اس طرح مل جائیں تو بھبکی وغیرہ دیے بغیر لاپرواہی سے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور غراتے ہیں۔ کم عمر شیر جب ہانکے میں نکلتے ہیں تو بے تحاشا ادھر ادھر دوڑتے ہیں اور آواز بھی دیتے ہیں

ایک دفعہ چنور میں شیر کا ہانکہ کرایا گیا۔ دو پٹھے تیلے مگر بچا توں سے بہت دور سے چھپتے ہوئے بھاگے۔ ایک طرف پہاڑی کا حصہ ایسا تھا کہ ۱۲-۱۳ فیٹ بلند ایک چٹان تھی۔ چٹان پر جانے کا سوائے چھلانگ مارنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ ان دونوں پٹھوں نے تیزی کے ساتھ اس چٹان پر کودنے کی کوشش کی۔ چھلانگ لگائی، پھر نیچے دھپ سے گرے اور ایک مرتبہ کوشش کی۔ مگر ناکام ہو کر ایک اسٹاپوں کی لائن میں سے ہو کر پکارتے ہوئے نکل گئے۔ اگر کوئی شیر پہلے ہانکوں کا تجربہ اٹھا کر بچ نکلا ہو اور آوازیں بھی اس پر پہلے ہوں تو وہ بھی اکثر اوقات ہانکا توڑ کر نکل جاتا ہے۔ ہانکہ توڑتے وقت کئی آدمیوں کو زخمی کر دیتا ہے۔ بھاگتے ہوئے آدمی پر شیر حملہ کرتا ہے تو چھوٹی چھوٹی دو، تین آوازیں دیتا ہوا لیپ بھاگتا ہوا آدمی کو پکڑ لیتا ہے۔ بعض وقت قریب آکر کھڑا ہو کر جسم کو تول کر پھر حملہ کرتا ہے۔

زخمی شیر حملہ کرتا ہے تو بھونتا آدمی کو ران کے پاس پکڑ کر دو تین مرتبہ کترتا اور جھنجھوڑتا ہے، پھر جھنجھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص شیر کی نظر کے سامنے درخت پر چڑھ جائے تو شیر فوراً بھاگ جاتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ شاید انسان اس کو نقصان پہنچائے گا۔ شیر بعض دفعہ مٹی پر لوٹتے ہیں بنڈی کے راستے پر کی مٹی جو نرم ہو جاتی ہے ان کے لوٹنے کے لیے کام دیتی ہے۔ پاخانہ کرنے سے قبل پچھلے پاؤں سے مٹی اچھال کر جگہ صاف کر دیتے ہیں۔ شیر گائیوں اور بھینسوں کے منڈ سے پر حملہ نہیں کرتا البتہ ان میں سے کوئی جانور علاحدہ ہو تو مار لیتا ہے۔ اگر منڈ کے درمیان شیر آجائے تو بھینس سینگھوں سے شیر کو ہلاک کر دیتی ہے۔

شیر اپنے کھاے ہوئے باقی ماندہ کارے پر بہت سنبھل کر ادھر ادھر دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ آتا ہے تھوڑی دور چلتا ہے پھر کھڑا ہو کر آواز سنتا ہے۔ پھر چند قدم چلتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے۔ چاندنی رات ہو تو کھلے میدان میں نہیں چلتا بلکہ حتی الامکان درختوں کے سایہ میں سے چلتا ہے۔ پتھریلی زمین پر شیر کے پنجوں کی دھپ دھپ آواز سمدار جانوروں کے

پاؤں کی آواز سے علاحدہ معلوم ہوتی ہے اور پتوں پر بھی ایک خاص قسم کی سپ سپ کی آواز آتی ہے۔ شیر کی چال کے متعلق یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ چلنے میں اس کا سیدھا پاؤں اور سیدھا ہاتھ ایک ساتھ اور پھر بایاں پاؤں اور بایاں ہاتھ ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں گویا جسم سیدھے ہاتھ اور سیدھے پاؤں پر بہ یک وقت اور بائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں پر بہ یک وقت سہارا لیتا ہے۔ بہ نسبت ہاتھ کے پاؤں آگے بڑھنے کے بعد کسی قدر پہلے زمین پر ٹکتا ہے۔ اس طرح اس کی کمر اور جسم بالکل نہیں ہلتا اور رات کے وقت بالکل ایک سایہ حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے صرف کان ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں جو کبھی مکھی وغیرہ لگنے سے شیر ہلاتا رہتا ہے۔ کان پر کسی چیز کا لگنا شیر کے لیے ناگوار ہوتا ہے۔ ریچھ کی چال بھی پیر اٹھانے میں شیر کے مماثل ہوتی ہے مگر بھرا اور بور بچّہ کی مختلف ہوتی ہے۔ بور بچّہ کے چلنے میں پاؤں آگے بڑھ کر زمین پر ٹکنے کے وقت اسی طرف کا ہاتھ آگے بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ لپکتے مارے ہوئے جانور پر سے ہنکالا جانے کی صورت میں شیر عموماً بآسانی ہٹ جاتا ہے۔ علاوہ صورتوں کے ایک تو جب وہ کئی دن کا بھوکا ہو اور دوسرے جب اس نے سور یا سار سل مارا ہو۔ ایسی حالت میں شیر کو ہٹانے کی کوشش کرنا خطرناک ہے۔ معمولاً بھی دو ایک آدمیوں کے ڈرانے دھمکانے سے نہیں ہٹتا، البتہ (۵-۶) آدمی جائیں تو ہٹ جاتا ہے اگر لاعلمی میں کوئی شکار کے پاس چلا جائے تو بڑے زور سے دھمکاتا ہے۔ شیر کو کھانے کے ابتدائی حصہ میں بھی شیر بہت جھنجھلا ہوتا ہے اور جب شکار کو پکڑے ہوئے اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اور کسی طرف مطلقاً توجہ نہیں کرتا جب شکاری گارا باندھ کر بیٹھا ہوا ہو تو شیر کو مارنے کا بہترین وقت یہی ہے۔ جب شیر پورا اپنے گارے پر دوبارہ آتے ہوئے گولی چل چکی ہو تو وہ پہلے مرتبہ گارا کرتے ہی کھا لینے کے بعد دوبارہ پھر نہیں آتا۔ بعض یہاں تک ڈر جاتے ہیں کہ بندھے ہوئے جانور کو مارتے ہی نہیں۔ سور اور سار سل کے گارے پر سے نہ ہٹنے کے کئی وجوہ شکاریوں نے لکھے ہیں۔ بعض کا یہ

خیال ہے کہ الو کا گوشت شیر کو بہت پسند ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ جنگلوں میں کبھی شیر ان کا شکار کرتا ہے، اس لیے نہیں چھوڑتا۔ مسٹر ہینڈرسن لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک شیر کا بچہ پالا تھا جس نے کبھی سور کا شکار نہیں کیا تھا مگر باوجود اس کے جب کبھی سور کا گوشت اس کو دیا جاتا تو بڑے مزے سے کھاتا اور اس کو چھوڑتے میں بڑی ضد کرتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ بڑی دقت سے شیر ان کو مارتا ہے اس لیے اس کے دل میں ان کی قدر زیادہ ہوتی ہے نر جنگلی سور شیر سے اچھی طرح مقابلہ کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سور کبھی غالب بھی آجاتا ہے مگر زیادہ تر شیر سور کو مار کر کھا جاتا ہے مگر کم عمر شیر نر سور پر حملہ نہیں کرتا۔ بعض بڑے نر سور کے دانت (۱۰) انچ تک لمبے ہوتے ہیں اور وزن (۳۵۰) پونڈ تک یا اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور یہ مسئلہ ہے کہ سور جب حملہ پر آمادہ ہو جاتا ہے تو سوچ سمجھ کر حملہ کرنے اور ڈٹے رہنے میں دنیا کا کوئی جانور اس کے برابر جری نہیں ہے۔ مادہ سور کو چھوٹا شیر بھی بآسانی مار لیتا ہے۔

کبھی کبھی ایک کولا یا سیاہ گوش شیر کے ساتھ ہوتا ہے جس کو لوٹھہ بھالو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی آواز دیتا ہوا چلتا ہے جس کو انگریزی میں (PHEAL) کہتے ہیں۔ کولے اس طرح ببر کے ساتھ بھی رہتے ہیں۔ کرنل پیٹرسن نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ (افریقہ میں) ایک مقامی واقف کار شکاری نے کیمپ میں آکر اطلاع دی کہ قریب ہی فاصلہ پر ایک ببر کے جوڑے نے نیبرہ (گورخر) کا شکار کیا ہے اور اس کو ابھی کھانا شروع کیا ہے۔ پیٹرسن بندوق لے کر وہاں پہنچ گئے۔ میدان میں لمبی گھاس کے قریب ایک بڑا ببر اور مادہ گورخر کے گارے پر نظر آئے۔ ان کے ساتھ ہی ایک کولا بھی گارے کے پاس بیٹھا ہوا نظر آیا۔ یہ دور میں لگا کر حیرت کے ساتھ دیکھتے رہے کولا اپنی دُم کو دبائے ہوئے کبھی گورخر کے قریب جاتا مگر جب یہ زیادہ قریب پہنچ جاتا تو ببر ایک جھنکی بتاتا یہ فوراً پیچھے ہٹ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد جب

ببر کھانے میں منہمک ہو جاتا تو پھر یہ قریب پہنچنے لگتا۔

پیٹرسن صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ ببر گولہ کو کبھی نہیں مارتے۔ بھوک کی حالت میں وہ دوسرے ببر کو تک کھا جاتے ہیں مگر گولا پھر بھی مستثنیٰ ہے۔ بعض شکاری کہتے ہیں کہ شیر کی آنکھوں میں مسمریزم کی قوت ہوتی ہے۔ انسان اور چھوٹے چھوٹے جانور مثلاً چیتل، ہرن، جنگلی بکری وغیرہ شیر کی آواز پر یا اچانک سامنا ہونے پر بے حس و حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکثر سننے میں آیا ہے کہ شیر کی آواز کے ساتھ ہی سانبھر بھی قریب سے آواز دیتا رہتا ہے مگر بھاگتا نہیں، اس کے متعلق بھی خیال یہی قائم رہتا ہے کہ دہشت اور خطرہ کا شدید احساس ان کو مفلوج کر دیتا ہے۔ ببر کے متعلق یہ لکھا ہے کہ جب اس کو کئی دن تک شکار نہیں ملتا تو یہ جنگل میں جہاں جانور موجود ہوں، پہنچ کر یکایک زور زور سے دھاڑنا شروع کر دیتا ہے اور جانور اس آواز سے بدحواس ہو کر جدھر منہ اٹھے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ببر کے منہ میں جا رہے ہیں۔ شیر بھی بعض دفعہ شکار کا پیچھا کرنے کے دوران میں دھاڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا مقصد جانور کو مرعوب کرنا ہوتا ہے جس سے وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر بھول جائے۔ بعض دفعہ یہ بھی سننے میں آیا کہ شیر ایک بیل کو پکڑ کر کھاتا رہا اور دوسرا بیل چند قدم کے فاصلہ پر کھڑا رہا۔ یہ تمام ڈر اور دہشت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر شیر میں مسمریزم کی قوت ہوتی تو ہر انسان کا جو اس سے آنکھ ملائے متاثر ہونا ضروری تھا مگر برخلاف اس کے بہت سے شکاریوں نے اپنے تجربے تحریر کیے ہیں کہ وہ کس طرح شیر سے آنکھ ملا کر بے حس و حرکت کھڑے ہونے کا عمل کر کے اس کے حملے سے بچ گئے۔ اور زندہ سلامت واپس آ گئے۔

سنسنی خیز واقعات کا سلسلہ جاری ہے
باقی آئندہ پڑھیے۔

انوار احمد نشتر

تیکھے اور منفرد لب و لہجہ کا شاعر محبوب راہی

ڈاکٹر محبوب راہی مہاراشٹر کے علاقہ ودربھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ علاقہ ایک عرصہ
تک ادبی اعتبار سے بنجر سمجھا جاتا رہا ہے حالانکہ قدیم وقتوں سے یہاں شعر و سخن کا ذوق دلوں
میں پرورش پاتا رہا ہے یہ اور بات ہے کہ ذرائع ابلاغ اور وسائل کی ترسیل کے فقدان کے
باعث اس علاقے کے شعراء کی تخلیقات ہندوستان کے دیگر علاقوں تک نہ پہنچ سکیں۔ اس
علاقے کے شعراء کی گمنامی کی ایک اور وجہ ان کی قناعت پسندی اور کم کوشی بھی ہے۔ یہاں
کے بہت کم شعراء نے اپنے کلام کے نشر و اشاعت کی طرف توجہ دی گویا یہاں سخنوری تو تھی لیکن
اس پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ محبوب راہی اس علاقے کا پہلا شاعر ہے جس نے اس دبیز
پردے کو چاک کیا اور ہندوستان کے گوشے گوشے کو اپنے اشعار کی تب و تاب سے جگمگا دیا
انہوں نے معیاری رسائل و جرائد میں مسلسل اپنا کلام شائع کروا کر ادبی حلقوں میں اپنی شناخت مستحکم
کی۔ محبوب راہی بے حد زود گو اور پرگو شاعر ہیں۔ بالعموم زود گو شعراء کے کلام میں رطب و
یابس بھی کچھ بھرا ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر راہی کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔ انہوں نے بڑی
طویل غزلیں کہی ہیں نظمیں بھی لکھی ہیں۔ حمد و نعت کا حق بھی ادا کیا ہے۔ رباعیات کی
صورت میں سمندر کو کوزے میں بند بھی کیا ہے گویا تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے
تنقیدی و تجزیاتی نظر سے دیکھیے پر ان کے کلام میں کہیں زبان کی لغزش یا فنی جھول نظر نہیں
آتا۔ بلکہ ان کی ہر تخلیق پر نظر ڈالی جائے تو سے

"کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"

ڈاکٹر راہی ایک منفرد لب و لہجہ کے حامل ہیں جس کا انہیں خود بھی احساس ہے۔

کھوا: خان محمد اصغر حسین جونیر کالج۔ آکولہ (مہاراشٹرا)

فرماتے ہیں ؎

اے راہی منفرد ہے میری ہر بات کہ میرا ہم زباں کوئی نہیں ہے ۔

ان کے لہجہ میں تیکھا پن ہے لیکن یہ تیکھا پن خنجر کی طرح نہیں چبھتا۔ تکلیف نہیں پہونچاتا بلکہ نوک سوزن کی لطف انگیز خلش بخشتا ہے۔ ان کا طنز ان کی شاعری کو نئی نئی جہتوں سے مالا مال کرتا ہے۔ غزل کے رنگ روپ کو مزید سنوارتا نکھارتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ترے لہجے کی رنگت پا کے راہی غزل کا رنگ تیکھا ہو گیا ہے

جس طرح تلخ و تند شراب بے حد سرور بخش اور کیف آگیں ہوتی ہے اسی طرح محبوب راہی کا طنز آمیز، تیکھا، کٹیلا لہجہ ان کے کلام کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ محبوب راہی ہم عصروں میں اپنی مخصوص اور منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "ثبات" کے پیش لفظ میں ڈاکٹر مظفر حنفی رقمطراز ہیں ۔

"محبوب راہی اس لحاظ سے جدید تر نسل میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں کہ وہ اپنا لہجہ اور اپنی آواز رکھتے ہیں۔ ایک ایسا لہجہ اور ایک ایسی آواز جو پیشروؤں کے لہجے یا آواز کی بازگشت نہیں"

ابتداً محبوب راہی روایتی انداز کی غزلیں کہتے تھے۔ اس دور کے کلام کا نمونہ ان کے تیسرے مجموعۂ کلام "بازیافت" میں مل جاتا ہے لیکن روایتی انداز کی غزلوں میں بھی انہوں نے ہمیشہ نئی بات کہنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے۔ بہت جلد وہ روایت سے دامن کش ہو کر جدیدیت کی جانب مائل ہو گئے لیکن انہوں نے اپنی فکر کی جڑیں روایت کی زرخیز زمین سے وابستہ رہنے دیں اور جدید غزلوں میں روایت کی چاشنی بھی گھولتے رہے ۔ ؎

دل اپنا مائل جدت تو ہے مگر راہی طلسم حسن روایت نہ سر سے نکلے گا ۔

نام نہاد جدیدیوں نے مبہم علامتیں تراشیں، غیر مانوس تشبیہات اور بعید از فہم استعارات اختراع کئے اور جدیدیت کے زعم میں زبان و بیان سے کچھ ایسی کھلواڑ کی کہ شاعری حرف الفاظ کا گورکھ دھندا بن کر رہ گئی۔ محبوب راہی کے یہاں ایسی بے راہروی نہیں ملتی وہ اس بے لگامی کو پسند نہیں کرتے ان کا یہ شعر ان کے رجحان کی عکاسی کرتا ہے ۔

زباں کے حسن سے کھلواڑ عام ہے راہی روایتوں کے جھمیلے میں شاعری تنہا

راہی کے یہاں مبہم علامتیں گنجلک تشبیہیں اٹ پٹی ترکیبیں اور معمہ نما اشعار نہیں اس لئے

روایت کے علمبرداروں نے انکی جدید غزلوں کو جدیدیت کے دائرے سے خارج قرار دیا جدید
جیسے پیچیدہ نہ ہوتے ہوئے نہایت تحمل کے ساتھ راہی صاحب نے فرمایا۔

ایک صحت مند روایت کا ہے پرتو ان میں　　میرے اشعار میں جدت جو نہیں ہے نہ سہی

بے شک راہی صاحب کے کلام میں صحت مند روایت کا پرتو جھلکتا ہے۔ جدت اور روایت کے اس حسین امتزاج نے انکی غزلوں کو ایک اچھوتا حسن اور دلوں کو چھو لینے والا تاثر بخشا ہے۔
لیجیے اب ڈاکٹر محبوب راہی کے کلام کی گوناگوں خصوصیات کا سرسری جائزہ لیتے چلیں۔ راہی نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ بہاروں اور خزاؤں سے گزرے ہیں لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حصے میں بہاریں بہت کم آئی ہیں خزائیں بہت زیادہ یا پھر انسانی فطرت کے مطابق انہوں نے خزاؤں کا اثر زیادہ قبول کیا ہے اسی لئے ان کے کلام میں جا بجا محرومی، زمانے کی قدر ناشناسی اور درد و کرب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ لفظ کرب ان کی شاعری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ درج ذیل اشعار ان کے اس کرب کا آئینہ ہیں۔

مجھ سے وابستہ ہے ہر کرب حیات　　میں ازل سے ہوں اذیت آشنا
کرب تشکیک غم ذات لئے پھرتے ہیں　　عصر حاضر کی علامات لئے پھرتے ہیں
ضبط کا جتنا اثاثہ ہے اٹھالے جائینگے　　اب مہاجن کرب کے مجھ سے نہ ٹالے جائینگے
ساری دنیا ہوئی نا خاکستر　　دیکھ لے کرب ذات کا انجام

انگریزی کے ایک نقاد نے کہا ہے۔

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE, THAT
TELL OF OUR SADDEST THOUGHTS

(ہمارے شیریں ترین نغمے وہی ہوتے ہیں جو ہمارے غمناک ترین خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔
یہ بات راہی صاحب کے کرب انگیز اشعار پر بالکل صادق آتی ہے۔ عصر حاضر کا ہر شخص کسی نہ کسی کرب کا شکار ہے اس لئے ان کے یہ اشعار ہر دل کی دھڑکن بن گئے ہیں۔

ہر شخص ہے بے مہری حالات کے ہاتھوں　　روٹھا ہوا، بپھرا ہوا، جھلایا ہوا سا

واقعی راہی صاحب نے اپنے ماحول اور انسانی نفسیات کا نہایت ۔ باریک بینی سے

ہر ذہن منتشر پہ مسلط ہے ان دنوں　　محرومیوں کی تیرگی ہے آگہی کا کرب
افلاس کے نیزوں پہ لاشیں ہیں امیدوں کی　　جسموں کی صلیبوں پہ لٹکتے ہوئے چہرے

یہ تو ہوئی عوام کی حالت۔ اب ذرا ہندوستان کے ناگفتہ بہ حالات پر بھی ایک طنز ملاحظہ کیجئے نہ

میرے اس ہندوستان جنت نشاں میں کیا نہیں　　بھوک ہے، امراض ہیں، افلاس ہے، سب کچھ تو ہے

ہندوستان میں بھوک، امراض اور افلاس کی فراوانی کا بیان کرتے ہوئے ہندوستان کو "جنت نشان" کہنا۔ پھر یہ سوال کہ "یہاں کیا نہیں ؟ اور بڑی ستم ظریفانہ معصومیت کے ساتھ جواب دینا "سب کچھ تو ہے" ایک ایسا چبھتا ہوا طنز ہے جسے ہر حساس انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں اترتا محسوس کرتا ہے ۔ ڈاکٹر راہی اپنے زمانے، ماحول اور احباب سے بھی شاکی ہیں ۔ انہیں شکایت ہے کہ ان کے فن کی وہ قدر و قیمت نہیں ہوئی جس کا وہ مستحق ہے بلکہ اکثر ناانصافی سے نوازا جاتا رہا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

داد و دہش کی ہر قسمت تقسیم ہوئی ناانصافی میں　　ہم جیسوں کو طنز ملے یا تحقیر ملی تضحیک ملی

آج شاعر کو صرف واہ واہ پر ٹرخا دیا جاتا ہے لیکن خالی خولی تعریف سے شاعر کا پیٹ تو نہیں بھر سکتا۔ بقول راہی

راہی تعریف کے ان کھوکھلے شبدوں کے سوا　　آج کچھ اور بھی اردو کا کوئی مانگے ہے

میرٹھ کے لہجے میں ہندی الفاظ کی خوبصورت اور دلکش آمیزش کے ساتھ یہ شعر کہہ کر راہی نے اردو کے تمام شعراء کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا ہے۔ چلیے صاحب کچھ اور نہ ملے کم از کم شاعر کے فن کی قدر تو ہو لیکن وہ بھی نہیں ۔ صرف اقتدار، مال و زر کی پوجا ہو رہی ہے۔ راہی صاحب شکوہ بہ لب ہیں ؎

کچھ قدر اقتدار کی کچھ مال و زر کی ہے　　قیمت کہاں جہاں میں متاعِ ہنر کی ہے

ارباب اقتدار و حیثیت نے اکثر شاعروں کی سرپرستی فرمائی ہے لیکن راہی صاحب کا تجربہ کچھ اور ہے

خشک ہیں یہ سبھی سمندر چل　　پیاس ہی اپنا ہے مقدر چل

پھر اپنے آپ کو نصیحت فرماتے ہیں کہ "اے ایاز حد خود را بشناس"

بھول مت اپنی حیثیت راہی　　اپنی حد رسا کے اندر چل

ان حالات سے گذرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کا دیوان بھی ردی کے مول

جائے گا۔ ارباب اردو کی قدر ناشناسی پر کیسا گہرا طنز ہے

راہی کچھ دن بعد ہر حلوائی کی دوکان پر　　　　میری کویتائیں سرکے دیاں بیچے جائیں گے

اس شعر میں ضمیر "میری کا" اور "میرے" کا طرف راہی صاحب کے لئے نہیں بلکہ تمام اردو شعراء خود میں سموئے ہوئے ہیں۔ جب راہی دیکھتے ہیں کہ آجکل شاعری کے نام پر سب کچھ کھپ رہے تو سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

اب آؤ لین دین کریں سنگ و خشت کا　　　　دنیا میں کا شناس یہ گوہر سمیٹ لو

ان کے دوست انوار نشتر کا بھی یہی خیال ہے کہ

دنیا فدا ہے کانچ کے ٹکڑوں پہ آج کل　　　　بہتر یہی ہے خاک میں ہیرا پڑا رہے

شاید ہر دور میں ایسا ہوتا رہا ہے اسی لئے تو فارسی کے ایک قدیم شاعر نے کہا ہے ؎

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالاں　　　　طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینم

لیکن ان حالات کے باوجود راہی نے عزم و حوصلہ کا دامن نہ چھوڑا۔ پوری تندہی سے سخن میں مشغول رہے۔ تیشے سے پیکر تراشتے رہے۔

راہی پیہم تیشۂ افکار سے　　　　تو یہ تو تخیل کے پیکر تراش

انہوں نے دنیا سے نظریں پھیر کر مشغلۂ شعر و سخن کو اپنا رفیق و دمساز بنا لیا ؎

جو مرا ہمدم تنہائی رہا ہے راہی　　　　اک مرا مشغلۂ شعر و سخن تھا کیا تھا

ڈاکٹر راہی اپنی خودداری اور انا کو مجروح ہونے سے بہر صورت محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ حق گوئی بے باکی، خلوص، ایثار اور بے غرضی جیسی صفات عالیہ سے متصف ہیں لیکن جب ان اوصاف کی ناقدری دیکھتے ہیں تو انہیں الزام قرار دینے لگتے ہیں ؎

انا، حق گوئی، بے باکی، خلوص، ایثار، ہمدردی　　　　ہر اک الزام تیرے نام سے منسوب ہے راہی

انا کا احساس اتنا بڑا شدید ہے لیکن یہ انانیت نہیں بلکہ جذبۂ عزت نفس ہے۔ ان کے احساس کا عکاس یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

فقیری میں انا کا تقاضا دیکھ عالم　　　　کہ جیسے صاحب املاک تقاضہ

انہوں نے اس انا کے ہاتھوں بے حد نقصانات بھی اٹھائے ہیں۔ اسکی چبھن بھی محسوس کی ہے

چبھن لمحہ بہ لمحہ مرے ذاتی تجربہ کی　　　　ذرا سا جھکا ہوتا تو ہر لمحہ کھٹک ایسی تھی

لٹا دے اس کو کسی کا سے نہ ہو جو دیا — وہ سب کچھ اک سوالی کا حق تھا اس کو لازم تھا

میری انا کہ جس کو وسائل سے انحراف — ویلک بہ رقتا خدا ہے جس کا استعارہ ہی

ان کی خودداری انہیں کسی کے آگے سر جھکانے سے روکتی ہے۔ دنیا اسے انکی سرکشی سے تعبیر کرتی ہے

جھکے رہتے تھے آتے جاتے جو ہر اک دہلیز پر — ہم بڑے سرکش تھے ہم لوگوں کے سر ایسے نہ تھے

اگر کوئی صاحب ثروت انہیں نواز نا بھی چاہے تو وہ بڑی بے نیازی سے کہہ دیتے ہیں ؎

کیجئے لطف و کرم مفلسوں ناداروں پر — بار گزرے گی مگر بات یہ خودداروں پر

راہی صاحب خودنگر خود بیں اور خود شناس ہیں ؎

خود شناسی ہے اک احساس انا مجھ میں بھی ہے — میں خدا ہرگز نہیں لیکن خدا مجھ میں بھی ہے

تاریخ شاہد ہے کہ زمانہ انا پسندوں کا دشمن رہا ہے۔ منصور حلاج جیسے عاشق صادق نے جب انا الحق کہا تو انہیں دار پر لٹکا دیا گیا۔ پھر بھلا زمانہ راہیؔ صاحب کو کیونکر بخشتا ؎

خود آگہی کی خطا کا تھا مرتکب راہیؔ — زمانہ اس کو بالآخر معاف کیا کرتا

اس پر بھی راہیؔ صاحب کا جذبۂ انا انہیں شکست تسلیم کرنے سے روکتا ہے ؎

شکست ذات کا پھر اعتراف کیا کرتا — میں اپنی طبع رسا کے خلاف کیا کرتا

راہی صاحب خود بھی فکر معاش میں مبتلا رہے ہیں اوروں کو بھی فکر معاش میں دربدر بھٹکتے دیکھا ہے جس کی ترجمانی وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

میں خود اپنے آپ کو کر لوں تلاش — اتنی تو فرصت دے دے فکر معاش

پیٹ کے مسئلے بلاتے ہیں — کارخانے دکان دفتر چل

ہر پیکر حیات کو سانسوں کی ہے تلاش — ہر زندگی ہے چند نوالوں کی کھوج میں

کیا پائے گا پھر وسعت افکار کہ راہیؔ — روٹی کے جھمیلوں میں ہے الجھایا ہوا سا

لیکن راہیؔ صاحب روزی روٹی کے جھمیلوں میں الجھتے ہوئے بھی وسعت فکر رکھتے ہیں وہ حوصلہ مند انسان کی طرح نامساعد حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے چمنستان شعر و ادب کو اپنے خون دل سے سینچ رہے ہیں۔ محبوبۂ غزل کی زلفیں سنوار رہے ہیں اور خالصتاً تغزل کے ایسے شعر بھی کہہ رہے ہیں ؎ ۔

حسن پہ تیر سے اک کیا کھوں — رنگ چاند کا ہے روپ سونا ہے

ے بجو پھن میں کوئی ان کہی سی بات — پھر شرم سے سمٹ کے نہائے تو دیکھنا

راہی اپنے اشعار میں شعوری طور پر صنائع بدائع کا اہتمام تو نہیں فرماتے پھر بھی ان کے
صنعت تضاد، صنعت تلمیح، حسن تعلیل وغیرہ کی مثالیں جابجا مل جاتی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے

نور سے دن رات سے وابستہ ہے — زندگی کتنے تضادات سے وابستہ ہے

سائل کے یزید آئے ہیں بیعت لینے — گرم پھر معرکۂ کرب و بلا ہے مجھ میں

بتوں کے شہر میں بے سود ہے — رام سیتا اور لچھمن کی تلاش

ہے دریاؤں کو ندیوں کو شب و روز — وہ لاکھ سمندر سہی پیاسا ہے یقیناً

حب نے اپنی غزلوں میں بیشتر مقامات پر ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو ان اشعار
یا مزید اضافہ کے موجب ہوئے ہیں۔ سے

ے جہانِ عافیت ہشیار باش — آدمی کرنے چلا ہے سر و ناش

سا خیالات پہ چھا جاتا ہے — راہی جب ہوتی ہے اشعار کی کومل ورشا

صاحب کی ادبی فتوحات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ان کا تخلیقی سفر نامہ بے حد طویل ہے
نون ان تمام کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس میں صرف ان کی غزلوں پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے
وں نے دیگر اصناف سخن کے علاوہ بچوں کے لئے بھی بڑی دلکش نظمیں تخلیق کی ہیں اور
لا رنگ اور گل بوٹے کے نام سے دو مجموعوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے خواتین
ت پر بھی لکھا ہے۔ تحقیقی تنقیدی اور طبعزاد مقالے بھی تحریر کئے ہیں۔ بہت کم لوگ
یا کہ وہ مفلس قارعلان کے قلمی نام سے طنز یہ مزاحیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور اس مزاح
رسائل میں چھپتے بھی ہیں۔ راہی صاحب نے ایک مدت میں حالات کی ردبڑ کھا کر لگائی ہوں
تے ہوئے شعر و ادب کی جن ناقابل تسخیر چوٹیوں پر شہرت و ناموری کے پرچم لہرائے ہیں اس
نظر ان سے ادبی بہت سی توقعات وابستہ کی جائیں تو بے جا نہ ہوگا۔

عابدہ رخسانہ۔ ایم اے

یہ لوگ — یہ رشتے

ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ منزل کی جانب تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس تیز رو سفر میں صبا کمپارٹمنٹ میں بیٹھی تھکے تھکے انداز میں سیٹ کی پشت سے سر ل کھڑکی کے باہر تیزی سے گذرتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ اور اسکو ایسا محسوس ہو رہا یہ ہر لمحہ بدلنے والے مناظر کسی بھیانک جنگل کے نہیں بلکہ خود اس کی اپنی زندگی کے ہیں۔ پچھلے دو تین برسوں میں کچھ اسطرح اس کی زندگی پر اثر انداز ہوئے کہ خدا کی پناہ — ہوئے کرب ناک لمحات کا تصور آتے ہی اس کا زاویۂ نظر بھی بدل گیا وہی مناظر جو ابھی دیر پہلے اس کے تھکے ہوئے ذہن کو آسودگی بخش رہے تھے وہ اب اسکی نظروں میں خ چبھنے لگے۔ سورج دور پہاڑیوں کی اوٹ میں ڈوب رہا تھا۔ اور شام کا اندھیرا اپ پھیلائے دن کے اجالوں کو اپنی آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شام کے اس منظر صبا کو اپنی زندگی کی وہ اداس شام یاد آ گئی جو اس کے حق میں شامِ غم ثابت ہوئی۔ صبا لگی۔ وہ شام میری زندگی کی بے حد اداس شام تھی۔ اُس روز صبح ہی سے آسمان پر گھنے ب چھائے ہوئے تھے۔ اور دوپہر کے ڈھلتے ڈھلتے ہر سو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہوائیں بھی رک رک کر چل رہی تھیں۔ جیسے کسی آنیوالی ناگہانی آفت کے خوف سے سہمی جا رہی ہوں۔ میں اداس من کو بہلانے کے لئے یوں ہی چنبیلی کے منڈوے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اور ہاتھ پھول توڑنے لگی۔ امی سامنے ورانڈے میں تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھی پان کی گلو بنا بنا کر خاص دان میں رکھ رہی تھیں مجھکو یوں سرِ شام پھول توڑتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگ اے پگلی لڑکی کیوں سرِ شام ہرے بھرے منڈوے کو اجاڑ رہی ہے۔ کہیں اسی طرح تیری ز نہ اجڑ جائے۔ کہتے ہیں سرِ شام ہرے بھرے جھاڑوں کو چھوتے سے وہ ہمارے حق

۔ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

کرتے ہیں ۔ میں توہمات کی قائل تو نہ تھی لیکن پھر بھی اچانک ڈر گئی ۔ پر سر سے پیر تک کانپ
گئی ۔ بالآخر سرِ شام امّی نے یہ کیا کہہ دیا ۔ اُف خدایا یہ بے سبب اداسی ۔ یہ بڑھتی ہوئی بے چینی
امّی کو یوں ٹوکتا ہے آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے ۔ میں منڈیر کے پاس سے ہٹ گئی اور سیدھی
تخت پر امّی کے قریب ہی بیٹھ گئی ۔ ادھر کچھ دنوں سے امّی کافی مضمحل نظر آ رہی تھیں ۔ ان کا
بلڈ پریشر کافی حد تک بڑھ چکا تھا ۔ اور پرہیزی غذا کی وجہ سے کافی کمزور ہو چکی تھیں
امّی کچھ دیر بعد پاندان بند کر کے وہیں لیٹ گئیں ۔ میں نے امّی کو پہلے کبھی یوں سرِ شام
لیٹے ہوئے نہیں دیکھا تھا ۔ امّی اس شام ایسے لیٹیں کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں ۔ خون کا دباؤ
بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے ان کے دماغ کی رگیں پھٹ چکی تھیں ۔ وہ اچانک مجھے
بھری دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں ۔ میرے ابو پہلے ہی گذر چکے تھے ۔ ابّو کے انتقال کے بعد
سے امّی ہی سارے گھر کو سنبھالی ہوئی تھیں ۔ ہمارا کل اثاثہ دو چھوٹے سے مکان تھے
جن میں سے ایک میں ہم خود رہتے تھے اور دوسرا مکان کرایہ پر اٹھا رکھا تھا ۔ اسی کے کرایہ
سے ہماری گذر بسر ہوتی تھی ۔ میں اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے امّی نے میری پرورش خاصے
ناز و نعم سے کی تھی ۔ وہ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھیں ۔ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ کیا کرے
گی لڑکی زیادہ پڑھ لکھ کر ۔ وہی چولہا چوکہ سنبھالنا ہے لیکن مجھکو بچپن ہی سے پڑھنے
کا بہت شوق تھا ۔ اور امّی میرے اس شوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میری تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا
لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بھی میں نے کبھی بھی مغربی تہذیب کی تقلید کرنے کی
کوشش نہیں کی ۔ شاید یہ میری ماں کی تربیت اور ماحول کا اثر تھا ۔ میں ایک مشرقی لڑکی
ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اصول پرست بھی تھی ۔ میں اور ماں نے ملکر زندگی گذارنے کے
چند ضوابط ترتیب دے رکھے تھے ۔ میری منگنی بچپن ہی میں میرے خالہ زاد بھائی اشرف
سے ہو چکی تھی ۔ اشرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حد تک مغربیت
میں ڈوبا ہوا تھا ۔ خالو ابا آئی ۔ اے ۔ ایس آفیسر تھے ۔ رات دن گھر پہ پارٹیاں اور
ناچ گانا ہوتا رہتا تھا ۔ کبھی کبھی امّی ان لوگوں کی حد سے بڑھتی ہوئی مغرب کی اندھی
تقلید کو دیکھتے ہوئے گھبرا جاتیں کہ میرا اس گھر میں کیسے گذارا ہوگا لیکن پھر وہ خالہ امّی کی
محبت و خلوص کا خیال کر کے مطمئن ہو جایا کرتی تھیں ۔

امی کے انتقال کے بعد خالہ امی چالیسویں تک میرے پاس رکی رہیں پھر انہوں نے مجھکو بھی اپنے ساتھ چلنے کی صلاح دی۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن اکیلے کیسے رہتی ۔ چاروناچار خالہ امی کے ساتھ ان کی کوٹھی چلی آئی۔ یہاں آنے کے بعد کچھ دنوں تک تو سب ہی ایک میری دلجوئی میں لگے رہے۔ مگر آہستہ آہستہ ان لوگوں کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ امی کو گذرے ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مجھکو حالات کی سنگینی کا احساس دلادیا گیا کہ میں اس گھر کی ایک معزز فرد نہیں بلکہ ان کے ٹکڑوں پر پلنے والی ایک بے سہارا لڑکی ہوں۔ حالانکہ خالہ امی ہمارے دونوں مکان فروخت کرواکر اس کی رقم اپنے استعمال میں یہ کہہ کر لا چکی تھیں کہ اب ان مکانوں کی دیکھ بھال کون کرے اب رہا رقم کا مسئلہ تو آگے لڑکی کی پرورش بھی تو ہم ہی کو کرنا ہے۔ خالہ امی کا رویہ دن بہ دن ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔ ایم۔ اے مکمل کر لینے کے بعد خالہ امی نے مجھکو تعلیم ترک کردینے پر مجبور کردیا۔ کہنے لگیں دیکھ لڑکی اب تیرے ماں باپ تو اس دنیا میں تیرے ناز اٹھانے کیلئے زندہ نہیں رہے۔ اس لئے عقلمندی کا ثبوت یہی ہے کہ تم حالات سے سمجھوتہ کرلو۔ اور میں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ تعلیم ترک کرکے گھر بیٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ خالہ امی نے ساری گرہستی کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈالدیا۔ اور میں نے اس بوجھ کو بوجھ نہیں بلکہ ایک فرض سمجھ کر اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ مجھکو مطمئن کرنے کے لئے یہی دلاسہ کافی تھا۔ میں اس گھر کی ہونے والی بہو ہوں۔ لیکن میرا یہ دیرینہ خواب بھی بہت جلد ٹوٹ گیا۔ کیونکہ گھر میں ان دنوں ہما کے کافی چرچے ہونے لگے تھے۔ خالہ امی اور گھر کے سب ہی افراد ہما کو پسند کرچکے تھے لیکن پھر بھی مجھکو اشرف پر اعتماد تھا کہ وہ مجھکو بے سہارا چھوڑ کر کسی اور کے ہونے پر راضی نہ ہوسکیں گے لیکن یہ بھرم اس دن ٹوٹا جب خالہ امی اور سب لوگ اشرف کی شادی کی بات چیت طے کرنے کے لئے لڑکی کے گھر چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں اداس بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ سوچیں صبا غور کرنے لگی اُف میں کہاں کھو گئی تھی۔ شاید ماضی کے اوراق الٹنے میں الجھ گئی تھی۔ فضا میں گڑگڑاہٹ کی آواز گونج رہی تھی۔ ٹرین پٹریاں بدل چکی تو تھوڑی دیر بعد اپنے معمول پر آگئی۔ اب فضا میں صرف چھک چھک کی آواز جیسے سروں میں گونج رہی تھی۔ ماحول قدرے پرسکون ہوا تو صبا کو ماضی کی یادوں نے پھر سے آن گھیرا۔ ادیادوں کی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی کڑیاں پھر جڑنے لگیں۔ ہاں اس وقت میں

سوچوں میں گم تھی کہ اچانک اشرف میرے کمرے میں آکر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگے ۔ صبا شاید تمکو معلوم ہوچکا ہوگا کہ امی وغیرہ ہما کو دیکھنے اور بات پکی کرنے کے لئے گئے ہوئے ہیں ۔ یہ تو ایک رسمی سی بات ہے ورنہ ہما کو پہلے ہی سب لوگ دیکھ چکے ہیں اور منتخب بھی کر چکے ہیں ۔ صبا میں تم کو دھوکہ میں نہیں رکھنا چاہتا ۔ یہ انتخاب امی کا نہیں بلکہ ایک طرح سے خود میرا اپنا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ تم میری بچپن کی منگیتر ہو لیکن تمہارا اور میرا میل نا ممکن ہے ۔ کیونکہ تم آج کی اونچی سوسائٹی کے ایٹی کیٹس سے یکسر ناواقف ہو اور تم ایک چھوٹی موٹی سی لڑکی ہو ۔ جبکہ میں آج کی سوسائٹی کا روح رواں ہوں ۔ میں ایک من موجی انسان ہوں ۔ اور تم صوم صلوٰۃ کی پابند لڑکی ہو ۔ میرا جو فرینڈ سرکل ہے اس میں تم جیسی دقیانوسی لڑکی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ ہاں ہما کی بات اور ہے وہ لڑکی نہ صرف آج کی سوسائٹی کے ایٹی کیٹس سے واقف ہے بلکہ وہ سوسائٹی میں اچھی طرح سے "move" کرنا بھی جانتی ہے ۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ وہ دولتمند طبقہ کی ایک معزز فرد کی بیٹی بھی ہے ۔ وہ اپنے جہیز میں لاکھوں روپے کا سامان بھی لائے گی ۔ سوچو تو صبا اس سازوسامان سے سوسائٹی میں ہماری کتنی عزت بڑھے گی ۔ سماج میں ہمارا وقار بنے رہے گا ۔ بہرحال مجھکو ہما جیسی اپ ٹو ڈیٹ الٹرا ماڈرن لڑکی چاہیے جو نہ خود اصول وضوابط کی بندھن میں جکڑی رہے اور نہ ہی مجھکو جکڑ کر رکھ سکے ۔ بلکہ سوسائٹی میں گھل کر رنگ میں اپنے آپ کو رنگ سکے ۔ اس کے برخلاف اگر میں تم جیسی دقیانوسی بے سہارا غریب لڑکی سے شادی کرلوں تو ہماری سوسائٹی کیا کہے گی ۔ ہمارا وقار مجروح ہوجائیگا ۔ صبا "I am so sorry" ۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں ۔ تم میرا خیال چھوڑ دو ۔ میں بچپن ہی سے اشرف کو اپنا آئیڈیل مانتی رہی ۔ اور میں انکی کافی عزت بھی کیا کرتی تھی ۔ لیکن انکے خیالات جان لینے کے بعد مجھکو ان سے سخت نفرت محسوس ہونے لگی ۔ اشرف اپنی بات مکمل کرکے میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے میں نے ان سے کہا ۔ اشرف صاحب جب آپ مجھکو اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہی کر رہے ہیں تو پھر سنیئے میں بے شک نہ صرف ایک مشرقی لڑکی ہوں بلکہ ساتھ ہی اصول پرست بھی ہوں ۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مشرقی لڑکیاں بار بار اپنا جیون ساتھی نہیں بدلا کرتیں ۔ بچپن ہی سے امی یہ ذہن نشین کرا چکی تھیں کہ آپ ہی میرے سب کچھ ہیں اور میں بھی احساس کے ساتھ ہمیشہ پاتی رہی ۔

ر آج اتنے برس گذر جانے کے بعد آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کو بھلا جاؤں
یہ ناممکن ہے۔ میں آپ کے علاوہ کسی اور کا تصور کرنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ رہا آپ کی پسند یا
نیڈیل تو آپ جن اوصاف والی لڑکی کی تمنا کر رہے ہیں۔ اس قسم کی لڑکیاں کم از کم میرے
نا میں لڑکیاں نہیں بلکہ ہمارے سماج کی زندہ لاشیں ہیں۔ جن لوگوں کی زندگی میں اصول وضوابط
میں ہوتے وہ بہت جلد راستہ بھٹک کر کھائیوں میں گر پڑتے ہیں ہاں البتہ یہ سچ ہے کہ میں
پ جیسے لالچی انسان کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی کیونکہ میں ایک غریب لڑکی ہوں۔ میں آپکی
وس کو آسودگی بخشنے کے لئے لاکھوں روپے کا جہیز فراہم نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی میں سماج میں
پکی جھوٹی کھوکھلی بنیادوں پر کھڑی ہوئی عزت کو بڑھا سکتی ہوں۔ لیکن پھر بھی میں جیسی ہوں
بھی ہوں۔ برسوں سے آپ کے ساتھ منسوب رہی ہوں۔ مہربانی کرکے مجھکو اپنا لیجئے۔ اگرچہ یہ
الفاظ کہتے ہوئے مجھکو سخت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔ میں یوں بے سہارا ہو کر کہاں دربدر
ٹھوکریں کھاتی پھروں گی۔ اشرف بے چینی سے پہلو بدل کر کہنے لگے۔ نہیں صبا یہ ناممکن ہے
تم وقت کی نزاکت اور تقاضوں کو سمجھو اور حالات سے سمجھوتہ کر لو۔ ہاں میں اتنا کر سکتا ہوں کہ
تمہارے لئے کوئی دوسرا مناسب رشتہ تلاش کروں۔ تم خوبصورت بھی اور تعلیم یافتہ بھی۔ تمہیں
کوئی بھی اپنا سکتا ہے۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا آپ میرے لئے رشتے ڈھونڈیں گے۔
جسکو آپ قبول نہ کر سکے اس کو آپ کی برادری کیا قبول کرے گی۔ اشرف کی پیشانی پر بل پڑ گئے
اگر کوئی قبول نہ کرے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ زندگی گذارنے کے لئے یہی ایک راہ تو نہیں
اور شاید اس راہ پر چلتے چلتے تم کو کوئی اچھا ہمسفر بھی مل جائے۔ میں اشرف کی اس طرز گفتگو
کو برداشت نہ کر سکی اور چیخ پڑی۔ بس کرو اشرف بہت ہو چکا۔ آپ اس طرح تو میری
نسوانیت کو رسوا نہ کیجئے۔ آپ یہ ساری باتیں ایک ایسی لڑکی سے کہہ رہے ہیں جس نے
نسوانی وقار کو قائم رکھنے کے لئے اپنی پوری زندگی اصول پرستی کی نذر کر دی ہے۔ ٹھیک ہے
جب آپ کا یہی فیصلہ ہے تو پھر میں بھی آپ کے کہنے کے مطابق اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ
ہی نکالونگی۔ اور اپنی ساری زندگی آپکے نام پر گذار دونگی۔ آج کی لڑکی اتنی کمزور نہیں
جتنی آپ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ ہم تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہماری تعلیم
ہے۔ اشرف کا فیصلہ سن لینے کے بعد میں پھر سے اپنی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کی کرچیں سمیٹنے لگی

لگ گئی ۔ اب میں اور زیادہ دن ان لوگوں پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی ۔ میں ہر روز اخبار میں ضرورت ہے کا کالم بڑی توجہ سے پڑھتی ۔ مختلف نوکریوں کے بہت سارے اشتہار میری نظروں سے گذرتے رہے لیکن میں نظر انداز کرتی رہی کیونکہ وہاں میری نسوانیت خطرے میں تھی اس مختصر سے عرصے میں جتنی ٹھوکریں میرا مقدر بنیں ان سے مجھکو اچھی طرح یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ عورت کو گھر سے باہر قدم نکالنے سے پہلے اچھی طرح سے سوچ لینا چاہیے کیونکہ گھر سے باہر قدم نکالتے ہی ہر قدم قدم پر کوئی نہ کوئی رہزن ، رہبر کی شکل میں چھپا رہتا ہے میں ان رہزنوں کے ڈر سے اپنی شخصیت پر کوئی ایسا پردہ ڈال لینا چاہتی تھی جسکی وجہ سے میں سارے زمانے کے لئے ایک قابل احترام شخصیت بن جاؤں اور میری طرف اٹھنے والی ہر نگاہ میں احترام ہی احترام ہو ۔ بے باکی اور چھچھورپن نہ ہو ۔ ان ہی دنوں اشرف کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی ۔ میں یہ سب خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہی ۔ اشرف اپنے آئیڈیل کو پا کر بہت خوش تھے ہر روز کلب جاتے اور رات دیر گئے لوٹتے ۔ وقت گذرتے دیر نہیں لگتی تین مہینے کا عرصہ پلک جھپکتے گذر گیا ۔ پھر تین مہینے بعد ایک دن اشرف شراب کے نشے میں ڈوب کر ڈرائیونگ کر رہے تھے کہ ان کی کار ایک الیکٹرک پول سے ٹکرا گئی ۔ اس ایکسیڈنٹ میں وہ ایک پیر سے معذور ہو گئے ۔ کچھ دن تک تو ہما ان کی جی جان سے خدمت کرتی رہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ پھر سے اپنے مشاغل میں ڈوبنے لگیں ۔ تھوڑے عرصہ بعد وہ اشرف کی کمی کو ان کے دوست اجمل کی قربت میں بھولنے لگیں ۔ اور آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے پھر ایک دن پتہ چلا کہ وہ اشرف سے طلاق لے رہی ہیں ۔ یہ سن کر تو میں سکتے میں آ گئی ۔ آخر کار وہ طلاق لینے میں کامیاب ہو گئی اشرف اور خالہ امی جس سوسائٹی کی پوجا کیا کرتے تھے اسی سوسائٹی کی دیوی ان کے منہ پر ایسی کالک پوت گئی کہ انکو اپنے چہروں کی شناخت باقی نہ رہی ۔ اچھی نوکری کیلئے میری تلاش اب بھی جاری تھی ۔ کہ اچانک میری امید بر آ گئی ۔ اخبار میں ایک اشتہار چھپا تھا کہ "منی پور کے چلڈرن ہوسٹل کے لئے ایک لیڈی وارڈن کی ضرورت ہے" پوسٹ گریجویٹ کو ترجیح دی جائے گی ،، اس اشتہار کو پڑھ کر میں بڑی حد تک مطمئن ہو گئی ۔ کیونکہ یہ بہت ہی مناسب نوکری تھی ۔ میں نے خط و کتابت کے ذریعہ ہوسٹل کے حکام سے تمام تفصیلات فراہم کر لی ۔ پتہ چلا کہ چھوٹا مقام ہونے کی وجہ سے وہاں کوئی بھی آنے پر راضی نہیں ہے ۔

اسی لئے مجھے تمام اسنادات اور ضروری کاغذات کے ساتھ فوری پہونچنے کے لئے کہا گیا۔ میں فوراً ہی متھا پور جانے کی تیاری کرنے لگی۔ مجھکو اب میرا روپ واپس مل چکا تھا۔ اب میں صرف اور صرف ایک ماں تھی۔ مقدس ماں۔ میں سفید ساڑی میں ملبوس ہوکر آنچل سے اپنے سر کو اچھی طرح ڈھک کر خالہ امی کے پاس آکھڑی ہوئی اور کہا کہ۔ خالہ امی ... آپنے مجھکو اتنے دن سہارا دیا۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھول پاونگی۔ لیکن آخر کب تک آپ لوگوں پر بوجھ بنی رہتی چنانچہ میں نے ایک اچھی سی نوکری تلاش کرلی اور آج جا رہی ہوں۔ یہ سنتے ہی خالہ امی ایک لمحہ کے لئے سکتے میں آگئیں اور پھر مجھے سینے سے لگاکر رو پڑیں۔ شاید ان کو اپنی زیادتی کا احساس تھا اور آنسو شرمندگی کے تھے۔ پھر انہوں نے چپکے سے کچھ روپیے میرے ہاتھوں میں تھما دیئے اور کہا کہ کچھ پیسے ہیں لڑکی اپنے پاس رکھ۔ کہیں پردیس میں کچھ پریشانی نہ ہو خالہ امی سے خاموشی سے رخصت ہوکر جب میں اشرف کے کمرے کی طرف جانے لگی تو میرے پیر کانپنے لگے۔ میں ان کے بستر کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ اتنے مختصر عرصہ میں کافی کمزور ہوچکے تھے۔ ابھی پیر کا زخم پوری طرح مندمل نہیں ہو پایا تھا۔ اشرف! میں جارہی ہوں۔ مجھکو متھا پور میں وارڈن کی نوکری مل گئی ہے لیکن اشرف میری ایک بات یاد رکھنا۔ انسان کی زندگی میں نشیب وفراز آتے ہی رہتے ہیں۔ ایسے وقت کبھی بھی پست ہمت نہیں ہونا چاہیے بلکہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے۔ آپ ہمت سے کام لیجئے اور پھر سے ایک نئے راستے کی تلاش میں جٹ جائیے۔ پہلے جن پرخار راہوں پر چل کر اپنے کو لہولہان کر چکے ہیں۔ اب انکو بھول جائیے۔ میں جارہی ہوں میں پہلے بھی آپ کی تھی آج بھی آپ کی ہوں اور ہمیشہ آپ کی رہونگی۔ اشرف کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ روندھی ہوئی آواز میں کہنے لگے۔ صبا میں تم سے بہت شرمندہ ہوں آج میں تمہاری مشرقیت اور تمہارے اصولوں کا قائل ہوچکا ہوں لیکن آج میں اتنا تہی داماں ہوں کہ تمکو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ حتیٰ کہ میں تمکو روک بھی نہیں سکتا۔ میں نے افسردگی سے کہا۔ اگر آپ تہی داماں نہ بھی ہوتے اور مجھکو رک جانے کے لئے کہتے تب بھی نہ رکتی۔ کیونکہ یہ میرے نسوانی وقار کا سوال ہے۔ ایک بار آپ نے مجھکو ٹھکرا دیا سو ٹھکرا دیا۔ آپ کے مشورے کے مطابق میں اپنے لئے زندگی کی راہ تلاش کرچکی ہوں۔ مجھے اس راہ پر چلنے کی اجازت دیجئے۔ خدا حافظ

صبا کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اس کے رخسار پر آگئے۔ نمی کے احساس سے وہ چونک پڑی

ـ وہ خیالات کے گرداب میں ایسا پھنسی کہ وقت کا کچھ احساس ہی نہ رہا۔ شام ڈھل چکی
۔ اور ٹرین کی رفتار میں آہستہ آہستہ کمی آ رہی تھی ۔ شاید اسٹیشن قریب آ رہا تھا ۔ وہ آنکھ
آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ کر سامان اکٹھا کرنے لگی ۔ ٹرین جھٹکے کے ساتھ رک گئی ۔ بمبئی پہ
یا تھا ۔ ٹرین رکتے ہی قلیوں نے ہلّا بول دیا ۔ ایک قلی آگے بڑھ کر اس کا سامان اٹھایا ۔ کہاں
ئی ماتا جی ۔ رکشہ بلاؤں ۔ ماتا جی ۔ صبا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کرنیں پھیل گئیں لفظ ماتا جی
ں اس کے لئے کتنا احترام اور عقیدت تھی اسی لفظ کے سحر میں ڈوبی ہوئی وہ مسکراتی ہوئی
ں منزل کی جانب بڑھ گئی ۔

سلہ صفحہ (۷۲)

ـ ٹریننگ سنٹر قائم کیا اور پہلے مرحلہ میں دس افراد کو کپڑوں پر چھپائی اور نقاشی
تربیت دی ۔ چونکہ یہ بھائی دیہی بے روزگاروں کی خود روزگار اسکیم' گرامودیا'
محض کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث استفادہ کرنے سے قاصر تھے ۔ اس لئے انھوں نے
نے چوتھے بھائی شری کے پی ملا ریڈی جو انٹرمیڈیٹ کامیاب ہیں' کی اعانت اور دلچسپی
اپنا چھوٹا کارخانہ قائم کرلیا ۔ اور دیہی بنک سے مالی امداد حاصل کی مختلف کاروباری
ں اور دشواریوں سے نمٹنے کے بعد ان چار بھائیوں نے لنگیاں' ساڑیاں اور نقشی
پر جات کے نمونے تیار کرنے شروع کردیئے جن کی مارکیٹ میں مقبولیت بڑھتی گئی ۔
لیپاکشی ایمپوریم جو حکومت آندھرا پردیش کے زیر نگرانی چلایا جاتا ہے' ان
شیاء کا خریدار ہے ۔ اور اس نے لنگیوں اور بیڈشیٹس کی فراہمی کے آرڈر دیئے
ں ۔ روزگار کے بڑھتے ہوئے امکانات دیکھ کر سنڈیکیٹ بنک بنگنا پلی برانچ نے
میں قرض فراہم کیا تاکہ وہ اپنے کاروبار کو مزید ترقی دے سکیں ۔ ان چار بھائیوں نے
ی محنت اور کوششوں کے نتیجہ میں نہ صرف قرض کی رقم واپس کردی بلکہ مزید
جوانوں کو بھی یہ فن سکھا رہے ہیں تاکہ وہ اپنا روزگار آپ پیدا کرنے کے اہل بن سکیں ۔

پسماندہ طبقات کی معاشی ترقی

پسماندہ طبقات کی معاشی ترقی کے لئے جو ریاستی آبادی کے ۵۰ فی صد حصہ پر مشتمل ہیں، ستمبر ۱۹۷۴ء میں ۵۰ کروڑ روپے کے منظورہ سرمایہ حصص سے آندھرا پردیش پسماندہ طبقات کواپریٹیو فینانس کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان طبقات کے عدام سرمایہ کی کمی، فنی جانکاری کی عدم دستیابی اور مارکٹنگ سہولتوں کی غیر موجودگی کے باعث اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے قابل نہیں تھے۔ اس خلاء کو پُر کرنے کی غرض سے کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔

یہ کارپوریشن پسماندہ طبقات کی معاشی امدادی اسکیمات کی عمل آوری کے لئے ادارہ جاتی سرمایہ اکٹھا کر کے ضلع سوسائٹیوں کو "مارجن رقم" جاری کرتا ہے۔ ضلع سوسائٹی کا نظم و نسق ایک بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ذمہ رہتا ہے جس کا چیرمین ضلع کلکٹر اور جس کا سکریٹری سوسائٹی کا اکزیکیوٹیو آفیسر ہوتا ہے۔

مارجن رقم کارپوریشن مستفیدین کو کسی اسکیم یا پراجکٹ کی جملہ لاگت ۲۰ فی صد مارجن رقم کے طور پر فراہم کرتا ہے اور مابقی ۸۰ فی صد سرمایہ بینکوں یا امداد باہمی اداروں سے فراہم کرتا ہے۔ مارجن رقم کے استحقاق کے لئے استفادہ کنندہ کو درج فہرست پسماندہ طبقات سے ہونا چاہیئے جس کی آمدنی (سالانہ) ۶۰۰۰ روپیوں سے زیادہ نہ ہو۔ اسکیم کی لاگت عام حالات میں زیادہ سے زیادہ ۲۵۰۰۰ روپیوں سے متجاوز نہ ہو۔

سال ۷۵ - ۱۹۷۴ء سے سال ۸۵ - ۱۹۸۴ء تک کے درمیانی دہے میں حکومت کی جانب سے ۲۷ء ۲۰ کروڑ روپیوں پر مشتمل رقم فراہم کی گئی۔ سال ۸۶ - ۱۹۸۵

کے لیے ۵۰ء۴ کروڑ روپیوں کی گنجائش مہیا کی گئی ہے۔

کارپوریشن کی اسکیمات

"معاشی امداد اسکیم برائے درج فہرست پسماندہ طبقات" "مارجن رقم قرضہ جات" قانون تحدید اراضی ۱۹۷۳ء کے تحت پسماندہ طبقات کو مفوضہ فاضل اراضیات کی ترقی و بہتری" "مفوضہ اراضیات میں آب پاشی اسکیمات کا فروغ" "ماہر صناعوں کے لئے خصوصی روزگار پروگرام" "تربیتی و پیداواری یونٹس" وغیرہ۔ یہ ہیں چند اسکیمات جو کارپوریشن کی جانب سے شروع کی گئی ہیں۔ تجویز ہے کہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۲۲۵۰ لاکھ روپے لاگت کی اسکیمات کا آغاز کر کے ۵۶۰ پسماندہ طبقات کے خاندانوں کا احاطہ کر لیا جائے۔ موازنہ میں مارجن رقم کے لئے ۵۰ء۴ لاکھ روپیوں کی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

حجاموں اور دھوبیوں کو مالی امداد

حکومت نے حجاموں اور دھوبیوں کے لئے مفت مالی امداد اور ساتھ ہی ساتھ مارجن رقم و بینک قرضوں کی فراہمی کے لئے ایک اسکیم شروع کی ہے تاکہ وہ صاف ستھرے اور حفظ صحت پر مبنی حجامت خانے اور لانڈریاں قائم کر سکیں۔ حکومت کی جانب سے اس اسکیم کی خاطر ۱۵ لاکھ روپے برائے امداد اور ۱۳ لاکھ روپے بہ ضمن مارجن رقم فراہم کئے گئے ہیں۔ یہ اسکیم پوری ریاست میں روبہ عمل لائی جارہی ہے لیکن مالی امداد صرف شہری علاقوں کی اسکیمات کے لئے ہے۔ مالی امداد کی حد جملہ لاگت کا ۱۵ فی صد یا ایک ہزار روپے (جو بھی کم ہو) ہے۔ مارجن رقم انفرادی اسکیم کی جملہ لاگت کے ۲۰ فیصد کے مساوی منظور کی جاتی ہے اور مابقی رقم شیڈولڈ بینکوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ سال ۸۲-۸۱ء میں اسکیم کے آغاز سے اب تک ۳۴ء۲۲ لاکھ روپیوں کے مساوی رقم سے استفادہ کیا جا چکا ہے اور ۴۹۲۴ افراد مستفید ہوئے ہیں۔

اس طرح جناب این ٹی راما راؤ چیف منسٹر کی فعال قیادت میں حکومت آندھراپردیش پسماندہ طبقات کو اپریٹیو فینانس کارپوریشن کے ذریعہ ریاست میں پسماندہ طبقات کی برق رفتار معاشی ترقی کے لئے مثبت اور کارگر اقدامات کر رہی ہے۔

(محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ)

قلم کاری فن کی مقبولیت
چار بھائیوں کی محنت کا ثمر

قلم کاری یعنی کپڑوں پر پینٹنگ (نقاشی) ریاست آندھرا پردیش کا ایک روایتی فن ہے۔ یہ فن دست کاری کی مہارت کا ایک نمونہ ہے جس کی اہمیت ہنوز برقرار ہے۔ آندھرا کے اکثر اضلاع میں یہ فن بہت ہی مقبول ہے اور افراد کے لئے وسیلۂ روزگار بنا ہوا ہے۔ ہم یہاں ان نوجوانوں کا تذکرہ کر جنھوں نے آندھرا پردیش کے ضلع کرنول میں اس فن کو نہ صرف روشناس ا اپنے لئے اور دوسروں کے لئے روزگار کے مواقع مہیا کردیئے۔

کے رام نارائن ریڈی، کے رام پلا ریڈی، اور بی وینکٹ ریڈی یہ تینوں ہیں جو کرنول کے ایک تعلقہ بنگنا پلی کے ایک دیہات تنگا ترد میں رہنے خاندانی اور مالی دشواریوں کے باعث وہ صرف مڈل اسکول تک تعلیم حاصل اور اچھے روزگار کی تلاش میں مصروف ہوگئے۔ ان کا میلان زیادہ تر د فنون کی طرف تھا۔ چنانچہ انھوں نے قلم کاری آرٹ کو ترجیح دی۔ مقامی انھیں کوئی ایسا استاد میسر نہیں تھا جو انھیں اس فن سے واقف کراتا۔ بالآخر گئے جہاں انھوں نے قلم کاری آرٹ سنٹر میں ایک سال تربیت حاصل کی۔ گاؤں تنگا ترد واپس آکر انھوں نے اپنے فن کو بطور پیشہ اپنا لیا۔ ڈسٹرک کرنول اور ڈسٹرکٹ رورل ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے ان کے کاروبار کو بڑھاوا دینے کے لئے مالی امداد فراہم کی۔

ضلع کلکٹر کی ہدایت پر ان بھائیوں نے تنگا ترد میں ۸۰ ہزار روپئے کی

د یا تھا

مفلس فاروقی

جدید آدمی نامہ

فتنوں کی پوٹلی ہے قیامت ہے آدمی
دنیا کے سر پہ ایک مصیبت ہے آدمی

اک یادگار دورِ جہالت ہے آدمی
اب بھی اسیرِ کشف و کرامت ہے آدمی

جس کا ہر ایک لفظ ہے دیوار قہقہہ
ایک ایسا اشتہارِ حماقت ہے آدمی

دن رات جوڑ توڑ فریب اور سازشیں
ہر لمحہ محوِ کارِ سیاست ہے آدمی

لاتا ہے خالی سیپیاں تہہ سے سمیٹ کر
غواصِ بحرِ فہم و فراست ہے آدمی

دھبے کمینگی کے چھپانے کے واسطے
اوڑھے ہوئے نقابِ شرافت ہے آدمی

باطن میں جھانکیے تو ہے شیطان سر بسر
ظاہر میں یوں تو آدمی صورت ہے آدمی

ڈرتا ہے صرف اس سے کہ بیوی کہیں جسے
سر تا پا ورنہ پیکرِ جرأت ہے آدمی

لتھڑا ہوا ہے جرم کی دلدل میں سر بسر
کیچڑ میں سینے حیائی کی لت پت ہے آدمی

مجموعۂ تضاد عجیب الوجود ہے
سر تا پا اک عجوبۂ قدرت ہے آدمی

دیکھے جو کوئی غور سے آجائے اس کو گھن
اس درجہ آج قابلِ نفرت ہے آدمی

مفلسؔ کو پھر بتاؤ بھلا منہ لگائے کون
دولت جو ہے تو صاحبِ عزت ہے آدمی

نزد گلزاری مسجد - پارسی ٹاکلی ۴۴۴۴۰۱ ضلع اکولہ - مہاراشٹرا

اسد کھنڈوی

عورت نامہ

پاک مریم بنام ہے عورت
قابل احترام ہے عورت
اس میں سیتا کی پارسائی ہے
ہاں بہت نیک نام ہے عورت
رابعہ بصری بن گئی جب البصری
عورتوں میں امام ہے عورت
کہیں رطشا کا حسن رعنائی
عشق کے زیر دام ہے عورت
پاکبازی یہ ہے قرآن گواہ
تجھ کو میرا سلام ہے عورت

کہیں لیلےٰ ہے ہیر ہے عورت
حسن میں بے نظیر ہے عورت
رانی جھانسی کی ہے کبھی اندرا ہو
شہ سے بڑھکر وزیر ہے عورت
باز کے ساتھ رانی روپ متی ہو
آدمی کی مشیر ہے عورت
کوہکن ہے تلاش شیریں میں
اور خود جوئے شیر ہے عورت
میری اس بات پر فرشتے گواہ
مادر حوا خطیر ہے عورت

تلخ و شیریں شراب ہے عورت
خار کیوں ہو گلاب ہے عورت
چلتا پھرتا سا ایک جادو ہے
سامری کا جواب ہے عورت
حسن سے تیرا دل بھی روشن ہے

ہیڈماسٹر ۔ ایم ایس ، ۶ دسمبر ۱۶ ۔ ۲ ۔ ۰ ۔ ۔

مہر ہے ماہتاب ہے عورت
دل کی دنیا میں اس سے ہلچل ہے
ایک ابھرتا شباب ہے عورت
سب فریس و فہیم ہیں حیراں
فلسفہ کی کتاب ہے عورت

کہیں مینا ہے جام ہے عورت
کہیں زر کی غلام ہے عورت
روپ دھارے ہے جب یہ کیلر کا
پھر ہوس کی غلام ہے عورت
ہے کہیں ملکہ قلو پطرہ
عیش کوشی کا نام ہے عورت
اور پھولن کے روپ میں دیکھو
ڈاکوؤں کی امام ہے عورت
اس کے ہر پل میں ہیں ہزاروں روپ
ایک بدلتا نظام ہے عورت

آدمی کا وقار ہے عورت
یوں بہت ہوشیار ہے عورت
جہیز کے نام سے بکی ہے کہیں
آدمی کا شکار ہے عورت
جب بھی شیطان کی گود میں کھیلی
پھر گنہ کا مدار ہے عورت
اس پہ الزام ہے وفائی ہے
باوفا باشعار ہے عورت
اس نے پیدا کیئے رسول و نبی
پھر بھی دنیا میں خوار ہے عورت

ڈاکٹر عصمت چودھری

پاگل خواب

یوں نہ پاگل خوابوں کو
دل میں جگہ دو
اور
اشکوں کا زہر
پیتے رہو
جب کوئی کسی کو پالیتا ہے
تو وہ آرزو فنا ہو جاتی ہے جو کسی کی
یاد کا چراغ
روشن رکھتی ہے
اور تم
جو مجھے اتنے عزیز ہو
کہ میں تمہارے دل کے نہاں خانوں میں
ایک میٹھی یاد
ایک کسک بن کر زندہ رہنا چاہتی ہوں
کیا مجھے کھونا اک پانا نہیں

وصل کی خوشبو
ہجر کی راتیں
یہی تو ہماری زندگی ہے
بچھڑ بچھڑ کر اچانک ملنا
یہی خوبصورت سا ساحل
تو ہمارے بحرِ محبت کا کنارا ہے
اسی لیے تو کہتی ہوں
یوں نہ پاگل خوابوں کو
دل میں جگہ دو
کہیں ایسا نہ ہو
تم مجھے پاکر ہمیشہ کے لیے کھو دو
اگر ایسا ہوا
تو میں کس دل میں زندہ رہوں گی

فاطمہ

کوئی بھی اس جہاں میں کسی کا نہیں
ذکر رشتوں کا چاہے کہیں بھی تھمے
زندگی نام کیسا ہی رکھ لے مگر
بات سمجھنے کی ہے جس کی جس سے نبھے

ثریا صولت حسین

غزل

محترمہ ثریا صولت حسین کی غزل شمارہ
مارچ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی ہے
سہ موم کی شمع سب جلاتے ہیں
میں نے اپنا جگر جلایا ہے
محترمہ ثریا نے اپنا جگر جلا کر جذبہ کی جو
شمع پیدا کی جناب کاتب نے "جگر" کی
نے "گھر" لکھ کر اسے اندھیرے میں
بنا دیا۔ مزید ستم ظریفی یہ کی کہ
"صولت حسین" کو "سولت حسین" بنا دیا
محترمہ ثریا کی توجہ دہانی کے باوجود وقت
پر اس کی تصحیح نہ کی جا سکی۔ پوری
غزل کی دوبارہ اشاعت سے معذرت
تلافی مقصود ہے۔

ایڈیٹر

کس نے یوں نیند سے جگایا ہے
کس کو میرا خیال آیا ہے

موم کی شمع سب جلاتے ہیں
میں نے اپنا جگر جلایا ہے

داغ سینے میں رخ پہ ویرانی
پھر بھی ہونٹوں نے گل کھلایا ہے

آمد فصل گل ترے صدقے
میں نے پھر آشیاں بنایا ہے

چاند نکھرا ہے خوش نصیبوں کا
حسن والو! فریب کھایا ہے

اب نہیں مجھ کو آرزو تیری
میں نے سو بار آزمایا ہے

سبزہ و گل نہیں مرا حاصل
جلوۂ مختصر دکھایا ہے

کس نے غم خانۂ ثریا کی
شمع بیمار کو بجھایا ہے

رفعت رحیم (ایم اے)

غزل

مٹنا عروجِ عشق کا انجام ہے یہی
جلتے ہوئے پتنگوں کا پیغام ہے یہی

ہر دم ہے ان کا ذکر مرا کام ہے یہی
آرام کی جو پوچھو تو آرام ہے یہی

چوکھٹ پہ تیری سجدے گلی کے تری طواف
دیوانۂ وفا کا فقط کام ہے یہی

پیار اے فقیہہِ شہر کوئی جرم تو نہیں
مجھ پر ہوس پرستوں کا الزام ہے یہی

کیوں ان کی چشمِ مست کو دیکھا نہ کیجیے
نشہ یہی، شراب یہی، جام ہے یہی

دار و صلیب اس کے مقدر میں آئیں گے
حق گو کا حق پسند کا انعام ہے یہی

دو میٹھے بول پیار کے چاہوں گا اور کیا
مجھ کو خرید لو کہ مرا دام ہے یہی

تم نے کہا جو پیار سے "دیوانہ" ایک بار
اب ذات میں سمایا ہوا نام ہے یہی

چاہا ہے اس کو ٹوٹ کے، پوجا ہے رات دن
ہم پہ زمانے والوں کا الزام ہے یہی

جو دلنشیں ہے پھر وہی پہلو نشیں بھی ہو
افسوس آج کل طلبِ عام ہے یہی

میں جس طرف سے گزروں کرم ہے یہ آپ کا
کہتے ہیں لوگ عاشقِ ناکام ہے یہی

وہ آگئے ہیں بزم میں اب دل کی خیر ہو
تھا جس کا انتظار وہی شام ہے یہی

جس کو دیارِ یار کی منزل نہ مل سکی
قسمت میں اس کے گردشِ ایام ہے یہی

اک دردِ عشق سینکڑوں دردوں کی ہے دوا
بیشک علاجِ رنجش و آلام ہے یہی

جب فرقِ حسن و عشق میں باقی نہیں رحیم
سمجھو کمالِ عشق کا اتمام ہے یہی

پوچھا تھا جس رحیم کو ازراہِ التفات
بندہ نواز، بندۂ بے دام ہے یہی

20-5-525 ـ شکر گنج، حیدرآباد ـ ۵۰۰۲۶۵

بشارت کیف نیازی

ڈاکٹر خواجہ علی انجم

غزل

اسیرِ دام ہو کر رہ گیا ہوں
میں طشت از بام ہو کر رہ گیا ہوں
نہ آئی صبحِ خنداں زندگی میں
برنگِ شام ہو کر رہ گیا ہوں
میں جب سے مبتلائے غم ہوں تیرا
شغلئے عام ہو کر رہ گیا ہوں
کسی کی بے نیازی کی بدولت
خیالِ خام ہو کر رہ گیا ہوں
گھٹائیں کالی کالی چھا رہی ہیں
میں وقفِ جام ہو کر رہ گیا ہوں
دلوں کی ترجمانی کرتے کرتے
صدائے عام ہو کر رہ گیا ہوں
مٹا کر ہستیٔ موہوم اپنی
برائے نام ہو کر رہ گیا ہوں
میں جب سے کیف ہوں کیفِ مکمل
سراپا جام ہو کر رہ گیا ہوں

وہ غمگسارِ محفلِ یاراں کدھر گئے
خیبر لوگانِ جشنِ بہاراں کدھر گئے
چرچے تھے جن کے حسن کے عالم میں پیہم
فخرِ جہاں وہ رشکِ غزالاں کدھر گئے
ایک دور ایسا آئے گا پوچھیں گے ہم تو
کس بل وہ تیرے گردشِ دوراں کدھر گئے
رہتی تھیں جن کے دم سے سدا محفلیں جواں
وہ افتخارِ حلقۂ یاراں کدھر گئے
قدموں کو جن کے چھوتی تھیں ہر بار منزلیں
وہ دین کے داعی غازیٔ دوراں کدھر گئے
گلشن میں راج زاغ و زغن کا ہے آج بھی
وہ طوطیانِ فخرِ بہاراں کدھر گئے
دیکھو ٹھہر نہ جائے کہیں نبضِ کائنات
انجم سے پوچھو عیسیٔ دوراں کدھر گئے

عزیز نگر گلشن، حیدر گوڑہ،
حیدرآباد۔ ۲۹

صدر شعبۂ اردو جی۔ ایس۔ کالج
کھام گاؤں، ضلع بلڈانہ

غزلیں

سلیم محی الدین

آئینوں کے سنورنے کا موسم کہاں ؟
اس کی پلکوں پہ ڈھونڈوگے شبنم کہاں

ہے وہ دل کی حویلی نہ دروازہ ہے
اب بجے گا کوئی کھل جا سم سم کہاں

بند جس میں تھا اک خوشبوؤں کا جہاں
کھو گیا ہے نہ جانے وہ البم کہاں

الجھے دھاگے سلجھنے بھی پائیں اگر
میری سوچوں میں شامل ہے ریشم کہاں

آج کی شام تو سونی سونی لگی !
کوئی دہلیز پر آنکھ تھی نم کہاں !

میری نظریں جسے ڈھونڈھتی ہیں سلیم
آج اخبار میں ہے وہ کالم کہاں

گاڑی پورہ ، پربھنی

نعمت ... [illegible]

گرنا ہی ہے اگر تو گریں آ...
کب تک غذریں گے ہم بھلا او...

نکلے تھے لوگ گھر سے بڑی آ...
مایوسیاں خرید کر لوٹے دکا...

برسات تک میں لوٹ سکوں گا
رونے بھی دو لپٹ کے پرانے ...

یاد آگئیں مجھے کئی بھولی ...
بچے جو لے کے اترے کھلو...

بچے کو اپنے روتے ہوئے ...
کیسے بھلا وہ چاند کو چھت پر

لرزاں تھے سب کے ہاتھ اندھیر...
کاغذ پہ کون رات کا منظر

جب یاد آئے ٹوٹے گھروندے
یہ سوچ کر بہل گئے بچپن کا کھ...

آواز دیتے رہ گئیں تنہائیا...
پھر بھی وہ روٹھ کر مرے گھر...

دائرہ ادبیہ ، مہادیوا ، سہر...
٢٣١ - ٨ ، بہار ...



خصوصی شمارہ قیمت: (۱۰) روپے ٭ مئی ۱۹۸۶ء ٭ اقبال نمبر

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا
نمایندہ ماہنامہ

جلد: ۳
شمارہ: ۵

شاداب

حیدرآباد

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ	90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
حیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز، حیدرآباد سے شائع کیا۔

ترسیل زر کا پتہ:
11-5-147، ریڈ ہلز،
حیدرآباد-4 (اے پی)

فہرست

حرفِ اوّل

شاعرِ مشرق اقبال نے مشرق و مغرب دونوں عالموں کے علوم سے استفادہ
سلام سے رہنمائی حاصل کی اور ساری انسانیت کے مسائل کو اپنی شاعری کا مطمعِ
بنایا۔ ان کا پیام عام ہے اور ساری دنیا کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اقبال
لکوٹ میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بڑا حصّہ لاہور میں گزرا جو اب پاکستان
ہے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ شاید اس وجہ سے بھی کہ اقبال نے
اکثریتی صوبوں کی علاحدہ ریاست کی بات پیش کر کے پاکستان کا تصور
تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبال کے ساتھ کسی قدر سرد مہری
گئی۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہندوستانی دانشور اقبال شناسی میں
پیش ہیں۔ مطالعہ اقبال کے ضمن میں یہ ظاہر ہوا ہے کہ اسلامی فکر و نظر
ساتھ ساتھ اقبال محبِّ وطن ہند بھی ہیں اور ہندی فلسفہ و فکر کے خوشہ چیں
۔ اہلِ ہند ان کے اسی قدر مخاطب ہیں جس قدر اہلِ اسلام۔

حیدرآباد سے اقبال کا ابتدا ہی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اقبال اور
یات کی پذیرائی میں حیدرآباد کو کئی اعتبار سے اوّلیت حاصل ہے۔
کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد سے بڑے اہتمام سے
ئع کیا گیا جب کہ "بانگِ درا" کی اوّلین اشاعت ستمبر ۲۴ء میں ہوئی۔
رآباد ہی میں جنوری ۱۹۳۸ء میں اقبال کی زندگی میں مسلم کلچرل سوسائٹی
زیرِ اہتمام جشنِ اقبال منایا گیا جس کی صدارت ولی عہد سلطنت اعظم جاہ
ورنے کی۔ اپریل ۳۸ء میں اقبال کی رحلت پر سب سے پہلے اور سب سے
تعزیتی جلسہ حیدرآباد کے زمرد محل تھیٹر میں ہوا جس کی صدارت بلبلِ ہند

مسز سروجنی نائیڈو نے کی۔ اسی سال بزم اقبال حیدرآباد کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے پرجوش اور کارکرد صدر نواب حسن یار جنگ نے بڑے نمایاں کام کیے "مرقع اقبال" اور "فلسفۂ عجم" فارسی اور عربی میں اولین کتابوں کی اشاعت کا سہرا بھی اسی بزم حیدرآباد کے سر ہے۔ فرزند دکن نواب حسن یار جنگ نے پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی اقبالیات پر بڑا گراں قدر کام کیا۔ فکر اقبال اور پیام کو عام کرنے کے لیے نواب بہادر یار جنگ مرحوم اور پروفیسر غلام دستگیر رشید نے ہفتہ وار درس اقبال کا سلسلہ شروع کیا۔ حیدرآباد کی سرزمین سے وہ نامور اقبال شناس پیدا ہوئے یا حیدرآباد میں ہی پروان چڑھے جن کی بلند پایہ تصانیف مطالعہ اقبال میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

آزادی کے بعد اقبالیاتی سرگرمیوں میں کچھ تعطل پیدا ہوا مگر حیدرآبادیوں نے اسے پھر سے تیز تر کر دیا۔ ۱۹۵۹ء میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد قائم کی گئی اور ۱۹۷۴ء میں پبلک سوسائٹیز ایکٹ کے تحت اس ادارہ کو رجسٹر کر دیا گیا۔ اس کے اولین صدر ڈاکٹر عالم خوندمیری مرحوم منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں جناب سید خلیل اللہ حسینی صدر چنے گئے۔ جن کی رہنمائی میں اکیڈمی آج بھی سرگرم عمل ہے۔

اکیڈمی کے تحت ہر ماہ محفل اقبال کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ طلباء اور نوجوانوں کے لیے درس اقبال کا انتظام ہے۔ ہر سال سمینارس ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۷ء میں وسیع پیمانے پر اقبال صدی تقاریب منائی گئیں۔ اکیڈمی میں ایک کتب خانہ قائم ہے، جہاں اسکالرس و محققین کے لیے کتب، رسائل، خطوط و تصاویر کا قابل لحاظ ذخیرہ موجود ہے۔ اکیڈمی کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالہ "اقبال ریویو" شائع ہوتا ہے جس کے ایڈیٹر جناب منظور احمد منظور ہیں اور جس میں ماہرین اقبالیات اور اصحاب علم و دانش کے مضامین شریک ہوتے ہیں۔ اقبالیات کے متعلق اب تک دس کتابیں شائع کی جاچکی ہیں۔ ۱۹۸۵ء سے اقبال ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے

ب میں قابلِ قدر خدمات انجام دینے والے اہلِ علم اصحاب کو دیا
پہلا ایوارڈ حیدرآباد کے ممتاز اسکالر اور ماہرِ اقبالیات پروفیسر
دستگیر رشید کو دیا گیا۔
بالیات میں حیدرآباد کی اولیت کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔
پہلی بار عالمی اقبال سمینار منعقد کر رہا ہے جس میں پوری
ہرین اقبال اور دانشور جمع ہو رہے ہیں۔ ماہنامہ شاداب
تبال نمبر کے ساتھ اس میں شریک ہے جسے اپنے
کے تعاون سے بہت کم وقت میں مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے۔

ضروری اطلاع

اداب نے
دو سال پورے
۔ تیسرا سال شروع
امید ہے کہ آپ نہ صرف سابقہ زرِ سالانہ روانہ فرمائیں گے
ریداری سے بھی نوازیں گے۔ شاداب کو وی۔پی سے
اس لیے پسند نہیں ہے کہ آپ کو وی۔پی کے غیر ضروری
بچایا جائے۔ رقم منی آرڈر سے بھجوائی جائے تو نوازش

— ایڈیٹر

وجیہہ الدین احمد

اقبال اور حیدرآباد

ستمبر ۱۹۴۸ء تک جس جغرافیائی وحدت کو ممالک محروسہ سرکاری عالی کہا جاتا تھا اس کا وجود ہندوستان کے نقشہ میں ایک جزیرہ کی طرح نظر آتا تھا۔ سیاسی تلاطم سے بھرپور ہندوستانی سمندر میں ایک محفوظ اور پرسکون جزیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ سماجیاتی اور تمدنی اعتبار سے سارا ہندوستان ایک اکائی رہا ہے۔ شمال میں تلواریں چلی ہیں تو لہو کے چھینٹے جنوب پر بھی گرے ہیں۔ بحر ہند میں طوفان آیا ہے تو اس کی موجیں کشمیر سے ٹکرائی ہیں لیکن اس کے باوجود بندھیاچل کا جنوبی علاقہ ایک نسبتاً پرسکون تمدن کا آئینہ دار رہا ہے۔ دراوڑی تہذیب کی نشانیاں شمال میں شاید نظر نہ آسکیں لیکن آریائی تہذیب کے کتنے پہلو دکن میں نظر آتے ہیں۔ دراوڑی زبانوں کے ادب کی پذیرائی شمال میں کبھی نہیں ہوئی لیکن سنسکرت ادب کو جنوب نے سینے سے لگایا۔ دراوڑی زبانیں شمال میں آج تک بھی بولی اور سمجھی نہیں جاتیں لیکن جنوب نے ہند آریائی زبانوں کو نہ صرف گلے لگایا بلکہ اپنے خون جگر سے سینچ کر انھیں پروان چڑھایا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دکن کے باشندے اطراف سے زیادہ اقدار پر نظر رکھتے ہیں۔

بہمنی سلطنت کے قیام سے کر آصف جاہی سلطنت کے زوال تک

لکچرار، ڈگری کالج، جگتیال۔

شاہان دکن نے ہمیشہ عدل و انصاف کے ساتھ ایک طرف رعایا پروری کی تو دوسری طرف ادب اور فنون لطیفہ کی اس طرح قدردانی اور سرپرستی کی کہ آج تک باکمال اولین کے کارنامے قومی اثاثہ سمجھے جاتے ہیں۔ بادشاہ اور امراء چونکہ اپنے مرتبے کے لحاظ سے باکمالوں پر سونا برساتے تھے تو عوام اپنے عزم و حوصلے کے مطابق ان کی قدر افزائی کرتے تھے اور اب تک کرتے آرہے ہیں۔

ماضی قریب میں جو پذیرائی اقبال کی ہوئی اس کی مثال تاریخ ادب میں مشکل سے ملے گی۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال پر کسی بادشاہ یا وزیر نے زر نہیں برسایا، انہیں سونے میں تولا نہیں گیا، انہیں خلعتیں نہیں عطا کی گئیں لیکن عوام نے ــــ اور سب سے پہلے دکن کے عوام نے ــــ اس کی جتنی قدر افزائی کی وہ قدر و قیمت میں ہفت اقلیم کی بادشاہت سے کہیں زیادہ ہے۔

بقول عبدالرؤف عروج ــ "حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد ہی میں اقبال کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ کلیات اقبال کے نام سے شائع ہوا۔ حیدرآباد ہی میں اقبال کی زندگی میں پہلی مرتبہ ان کا جشن منایا گیا۔ حیدرآباد میں ہی ان کی وفات پر پہلا سب سے بڑا تعزیتی جلسہ ہوا۔ حیدرآباد ہی میں سب سے پہلے مرکزی بزم اقبال قائم کی گئی۔ حیدرآباد ہی میں وہاں کے ادیبوں اور نقادوں نے ادب میں اقبالیات کا اضافہ کیا۔ حیدرآباد ہی نے یوم اقبال اور ہفتہ اقبال کی روایت عام کی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی تاریخ کے آخری دور میں بھی اقبال کی یاد کو سینے سے لگائے رکھا۔ اقبال حیدرآباد شناس تھے اور حیدرآباد اقبال شناس۔"

چنانچہ ۱۹۱۰ء میں جب اقبال حیدرآباد آئے تو ان کی جیسی آؤ بھگت ہوئی ویسی کسی اور شاعر یا ادیب کی نہیں کی گئی۔ وہ مسٹر اور مسز حیدری کے مہمان رہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کی ضیافت کی۔ حیدرآباد کے معززین سے ان کی ملاقات کروائی گئی۔

ان کا مجموعہ کلام "کلیات اقبال" ۱۹۲۳ء میں عبدالرزاق راشد نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ خود راشد نے ایک عالمانہ مقدمہ لکھا، جو

۱۳۶ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ بانگِ درا سے پہلے اس کلیات کی اشاعت اقبال سے اہلِ حیدرآباد کی گہری عقیدت کا ثبوت ہے۔

جب اقبال جامعہ عثمانیہ میں لکچرس دینے کے لیے ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد آتے ہیں تو انھیں شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ حضور نظام آصف سابع ان سے ملاقات فرماتے ہیں اس ملاقات کے لیے درباری لباس کے التزام سے انھیں مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔

جنوری ۱۹۳۸ء میں ان کی زندگی ہی میں 'مسلم کلچرل سوسائٹی' کے زیرِ اہتمام جشنِ اقبال منایا جاتا ہے جس کی صدارت اعظم جاہ بہادر ولیعہد سلطنت کرتے ہیں۔ مسلم کلچرل سوسائٹی اقبال کے مشورے سے اسلامی تہذیب کی تحقیق و مطالعہ کے لیے قائم کی گئی تھی۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں اقبال کی رحلت پر سب سے پہلے اور سب سے تعزیتی جلسہ حیدرآباد کے زمرد محل تھیٹر میں ہوا، جس کی صدارت مسز سروجنی نائیڈو نے کی۔ اسی سال بزمِ اقبال حیدرآباد دکن کی بنیاد ڈالی گئی۔

بزمِ اقبال کے قیام کا مقصد اقبال کا تحقیقی مطالعہ اور ان کے کلام و پیام کی خاطر خواہ اشاعت تھا۔ نواب حسن یار جنگ کی صدارت میں اس بزم نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۸ء تک بڑے نمایاں کام انجام دیئے۔ جس میں یوم ہائے اقبال کے انعقاد، نمائشوں کے علاوہ اضلاع میں شاخوں کا قیام، بمبئی اور لکھنؤ میں شاخوں کا قیام شامل ہیں۔ "مرقعِ اقبال" اور "حیات والموت فی الفلسفۃ الحکیم اقبال" کی اشاعت کا سہرا بھی اسی بزم کے سر ہے جو اقبالیات میں اولین کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ نواب بہادر یار جنگ مرحوم، پروفیسر غلام دستگیر رشید نے اپنے طور پر درس ہائے اقبال کا سلسلہ شروع کیا، جس سے نوجوانانِ حیدرآباد نے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، ڈاکٹر ظہیر الدین الجامعی

عزیز احمد، میر حسن الدین اور عبدالواحد حسینی کے علاوہ اور بہت سے اہلِ علم و قلم حضرات نے اقبالیات پر کتابیں شائع کیں۔

۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدرآباد کے بعد کچھ جمود کا سا عالم طاری رہا۔ تاہم بزمِ فاروق، اس کے بعد بزمِ احباب اور پھر مجلس تعمیرِ ملت نے "شمعِ اقبال" روشن رکھا۔

جناب سید خلیل اللہ حسینی، جن کی حرکی قیادت میں مجلس تعمیرِ ملت حالات کے چیلنج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھی، نے یہ محسوس کیا کہ فکرِ اقبال کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانے کے لیے ایک بار پھر منظم کوششیں ضروری ہیں۔

اس وقت جبکہ اقبال کا نام لینا بھی غالباً جرم سمجھا جاتا تھا اس جواں ہمت نے دو روزہ یومِ اقبال کا اعلان کر دیا۔

۱۸ اور ۱۹ مئی ۱۹۵۷ء کو یومِ اقبال کی دو روزہ تقاریب منعقد ہوئیں جناب بی کشن لال میر بلدیہ صدر استقبالیہ اور جناب مصباح الدین شکیل معتمد استقبالیہ کی کوششوں نے ایک بار پھر ماضی کی یاد تازہ کر دی۔ جناب یمن زبیری معتمد نمائش نے بڑی تندہی سے نمائشِ اقبالیات کا اہتمام کیا۔ جو تین روز تک جاری رہا اور جسے زائد از بارہ ہزار افراد نے دیکھا۔

یومِ اقبال کا افتتاح جناب بی گوپال ریڈی وزیرِ خزانہ نے کیا۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر جمہوریۂ ہند، ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین معتمد مرکزی وزارتِ تعلیم، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر رشید احمد صدیقی (مرحوم) کے پیامات کے علاوہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر ظہیر الدین الجامعی، پنڈت ونشی دھر ودیالنکار، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر راج کشور پانڈے، ڈاکٹر غلام عمر خاں، ڈاکٹر حفیظ قتیل (مرحوم)، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، پروفیسر عالم خوندمیری (مرحوم) نے مخاطب کیا۔ نمائشِ اقبالیات کا افتتاح نواب مہدی نواز جنگ نے کیا۔

یومِ اقبال کے کامیاب اقدام نے حوصلوں کو بلند کر دیا۔ چنانچہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۷ء کو اقبال اکیڈمی کی بنا ڈالی گئی جس کے پہلے صدر ڈاکٹر عالم خوندمیری (مرحوم)

مختلف ہوئے۔

اقبال اکیڈمی نے مختصر سے عرصہ میں اقبالیات میں جو اضافہ کیا وہ یقیناً قابلِ رشک ہے، خصوصاً اس وقت جب کہ بے سروسامانی سامانِ سفر ہو۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

صفحہ ۲۲ سے آگے:

ہے کہ کائنات مطلوب و مقصودِ مومن نہیں ہے۔ تسخیر کے بعد فقر استغنا مردانِ حق کے لیے سلمانی و سلیمانی ہے۔ اسی خلقِ عظیم کا نبی کریم صلعم کا سرِ نہاں "الفقر فخری" ہے۔ میرِ کارواں، حکیم امت اقبال نے رہِ حیات کے رہ نوردو رہ نشیں کے لیے "اطیعوا اللہ" نشانِ منزل بنا کے قوم کو رمزِ حیات سے آشنا کیا۔ شعر ہے:

محفل از شمع نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم

صفحہ ۶۴ سے آگے:

اس پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ سود خوری کو اقبال نے بھی اقتصادیات کے لئے سم تصور کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی لعنتوں اور اس کے تباہ کن نتائج کے بارے میں انہوں نے بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ سود کی لعنت کے سلسلہ میں اقبال نے اشتراکیت کے نظام معیشت کے علمبردار لینن کی زبانی سرمایہ دارانہ نظام کے مظالم اور زبردست تہذیب شکایت اپنی ایک نظم "لینن" (خدا کے حضور میں) کی ہے۔ لینن خدا سے پوچھتا ہے اے خدا انسانیت ان کے ہاتھوں کب تک تباہ برباد ہوتی رہے گی۔ لینن "سود" کی لعنت کے بارے میں کہتا ہے۔

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں ‌ ‌ ‌ گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے ‌ ‌ ‌ سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگِ مفاجات
[illegible]

۱۱

پروفیسر ثمینہ شوکت

اقبال ایک اجنبی ایک رازداں

اقبال ایک اجنبی ایک رازداں' یہ بظاہر انمل عنوان اقبال کی سہ رخی شاعرانہ شخصیت کو دیکھنے کی ایک سعی ہے۔ اقبال شاعرِ فطرت' اقبال شاعرِ وطن اور اقبال شاعرِ ملت۔ اجنبی کی اصطلاح یہاں اس لیے استعمال کی گئی کہ وہ پاکستان میں مدفون ہیں یا یہ کہ ان کی شاعری اور شخصیت کو ہندوستان کے جغرافیائی حدود میں غیر ملکی سمجھا جانے لگا ہے[1]۔ لفظ اجنبی دراصل اس ذہنی رجحان اور عملی رویّے (ATTITUDE) کا ترجمان ہے جو اقبال نے زندگی کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ جس طرح ایک اجنبی شخص نئے ملک کی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے ایک میٹھی بے چینی' ایک دبا دبا سا خوف اور آگہی کی بے پناہ خواہش لیے قدم رنجہ ہوتا ہے کچھ اسی طرح اقبال نے اس عالمِ رنگ و بو کو جانچنے' پرکھنے اور سمجھنے کی سعی کی ہے۔

اقبال اپنے مزاج کی افتاد سے جویائے راز تھے۔ زندگی کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے کے قائل نہ تھے۔ چاہتے تھے کہ زندگی کی ماہیت ان کے سامنے آئینہ ہو جائے۔

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بتایا راز اس کی نگاہ سے چھپایا

---

[1] ملاحظہ ہو "محبِ وطن اقبال" مظفر حسین برنی ص ۲۰

کہ گروہ حیات اور کائنات کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ وہ جب اولادِ آدم کو دیکھتے ہیں جن کی اکثریت بس جیسے جانے پر عمل کر رہی ہے تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس اجنبی دنیا میں تنہا رہ گئے ہیں۔ ایک ایسی روح جس کا کوئی محرم نہیں کوئی ہمنوا نہیں۔ یہ احساس وہ بنیادی حدِ فاصل ہے جو انھیں ہم جلیسوں میں بھی اجنبی بنا دیتا ہے۔

درحقیقت اقبال حیات سے غیر مطمئن تھے اور ان کی اس بے اطمینانی کا سب سے بڑا سبب وہ تضاد تھا جو ان کے اطراف بلکہ خود ان کی شخصیت میں رچا ہوا تھا۔ اس تضاد کا اعتراف خود اقبال نے کئی جگہ کیا ہے۔ نظم 'عاشق ہرجائی' میں انھوں نے اپنے آپ کو "مجموعۂ اضداد" کہا ہے اور پوری نظم میں متضاد خصوصیات گنوائی ہیں۔

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے
ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعتِ پرواز سے
اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے ہے عجب بے تاب تو

اپنی شخصیت کی اس گوناگونی پر، اپنی سرشت کی اس سیمابی پر، طبیعت کی اس تلون کیشی پر اقبال نازاں بھی ہیں اور حیراں بھی۔ برہمن نژاد ہو کر حق پرست ہوتا، مغرب کی سائنسی اور فنی ترقیوں کے معترف ہوتے ہوئے، مشرق کی بڑائی کے لیے کوشاں ہونا، مدرسہ اور خانقاہ سے "غمناک" ہونے کے باوجود اسلام کی جمعیت کے لیے متردد ہونا، یہ سب ان کی شخصیت کے تضاد کی نشان دہی کرتے ہیں۔ شاعری کے متعلق کہتے ہیں:

کوئی دیکھے تو میری نَے نوازی   نفس ہندی مقامِ نغمہ تازی

کلام میں جگہ جگہ جنون و خرد، کفر و ایمان، علم و یقین، خودی و بیخودی

حب الوطنی اور آفاقیت کی تکرار ہے جو شاعر کے دل کی کیفیتوں کی رستخیز کی نمائندہ ہے۔ شخصیت اور شاعری کا یہ حال تھا اس پر مستزاد بیسویں صدی کے خارجی اور داخلی تضادات کو بھی اقبال کی زلف۔ میں نگا ہوں نے دیکھ لیا تھا۔ عوام الناس کی رجائیت زدہ بے پرواہی COMPLACENCE کا شکار، اقبال نہیں تھے۔ یہ تضادات ان کی زندگی میں ELECTRON ور (PROTON) کی طرح دو مثبت اور منفی برقی عناصر ہیں جو اقبال کے کلام میں ایسی مقناطیسیت پیدا کرتے ہیں جس کی جانب کھینچے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس مقالے میں اقبال کا جائزہ لینے کے لیے ہم ان کی آفرینش سے ہیں اس لمحۂ آخرست سے آغاز کریں گے جس کے بعد عمل کا کوئی امکان بھی باقی ہیں رہتا۔

اقبال کا کلام واپسیں ہے ڈاکٹر قریشی کا انتظار ہو رہا ہے کہ جان یہ ب اقبال کے لب وا ہوتے ہیں۔

سرود رفتہ باز آید کہ نہ آید نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

اقبال وہ خوش نصیب شاعر تھے کہ چمن حیات ہی سر آمد روزگار ماعروں میں جن کا شمار تھا یہ ایں ہمہ یہ احساس "ایں فقیرے" "دگر دانائے ز" وہ مجموعۂ اضداد ترکیبیں ہیں جن کی ہر کیفیت میں نیا جلوہ پیدا ہے۔ سچ یہ ہے کہ پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی کوئی "دانائے ز" نظر نہیں آتا۔ اقبال کے لیے ماتم بھی اقبال ہی کے الفاظ میں:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

"دیدہ ور" اور "دانائے راز" مان لینے کے بعد اقبال کو اجنبی (OUT SIDER) ہم کیوں کہہ رہے ہیں کیا اس کا کوئی جواز بھی ہے؟ یہ جواز ہی حیات موجود کو رد کر دینے کا رویہ ہے۔ حیات موجود سے بے اطمینانی

اور اسے رد کر دینے ہی کے باعث اقبال ایک نئے پیام بر کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ اپنے پیام کے بارے میں بہ بانگِ دہل اعلان کرتے ہیں:

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

یہاں اقبال نے اپنے لیے بڑی سادگی سے "عشق کے دردمند" لقب اختیار کر لیا ہے۔ "عشق کے دردمند" ہونے کا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے۔ اگر ہم اقبال کے کلام کا ایک سرسری جائزہ بھی لیں۔ وطن کی سرشار ہوکر "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"، "تصویرِ درد"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اور "ہمالہ" جیسی نظمیں لکھیں۔ "ہندوستاں ہمارا" جس کے بارے میں اقبال کی وفات کے بعد گاندھی جی نے انکشاف کیا تھا کہ "میں نے بڑودہ جیل میں بارہا یہ گیت گنگنایا ہے"۔ وطن کی کے سرور میں بھی اقبال کی نگاہیں ان برائیوں سے صرفِ نظر نہ کر سکیں اس جنت نشان میں جہنم کی چنگاریوں سے کم نہ تھیں۔ گاندھی جی کی کے باوجود ذات پات کی تفریق کلنک کا ٹیکہ بنی ہوئی تھی۔ اقبال کو اس احساس تھا کہ یہ وہی تو ہندوستان ہے جو اہنسا کے علمبردار گوتم کی سرزمین ہے، سنت کبیر اور نانک کی جنم بھومی ہے اس کے باوجود:

آہ شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

اس کھلی کھلی تبدیلی کو دیکھ کر اقبال تلقین کرتے ہیں:

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

محبت سے ہی پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

محبت جو قوموں کے حق میں نسخۂ کیمیا ہے ملک و قوم، رنگ و نسل سے بے نیاز ہو کر روحانی شیرازہ بندی کے لیے "عقیدہ" اور محبت ہی اٹوٹ رشتہ ہے۔ اسی کو یگانگت کی بنیاد بنانے کی پُر زور وکالت "اقبال کا رزِ کلام ہے۔

قرآن کی رو سے دنیا کے تمام انسان ایک شجرِ واحد کی شاخوں کے مماثل ہیں لیکن اقبال کی چشم جہاں بیں نے دیکھا اور دلِ دردمند نے محسوس کیا تھا کہ ہندوستان نسلی تفریق سے داغ داغ ہے تو یورپی قوموں نے جغرافیائی مذہبی اور لسانی اور نسلی معبود بنا کر تمام نوعِ انسانی ہی کے حصے بخرے کر دیئے تھے۔ زمانے سے وہ اخوت اور محبت مفقود ہو گئی تھی جو تمام انسانوں کو ایک رشتے میں منسلک کرتی ہے۔ وطنیت اور ملوکیت یورپ کے تراشیدہ وہ بُت ہیں جن پر انسانیت بھینٹ چڑھا دی جاتی ہے، کہتے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اس آگہی کے بعد اقبال کے نقطۂ نظر میں عظیم تبدیلی رونما ہوی۔ کہتے ہیں:

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

وہی اقبال جنھوں نے ہندوستاں ہمارا لکھا تھا، سارا جہاں ہمارا کا ترانہ چھیڑ بیٹھے۔ ' سارا جہاں ہمارا ' وحدتِ انسانی کا نظریہ ہے۔ اقبال کے ذہنی پس منظر میں یقیناً "اَلارضُ لِلّٰہ" کا تصور کارفرما تھا، جس کی رو سے

کوئی قطعۂ زمین بھی کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں ہے۔ ملوکیت خدا کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کا نام ہے۔ خدا کے نائب کی حیثیت سے تمام انسان برابر کے حق دار ہیں۔ اقبال کی یہ تعلیم کوئی نئی چیز نہیں تھی لیکن اشتراکیت کی خوں آشام تحریک کے جواب میں اسلام کی اس تعلیم کی یاد دہانی ایک 'بروقت اقدام' کی حیثیت رکھتی ہے۔

اقبال کے عصر میں ہندوستان کے انسان کا المیہ یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے ہاتھوں ذلت و پسپائی، شکست و ناکامی کا نشانہ بن کے رہ گئے تھے ب یہ ذلت و ناکامی ہندوستانیوں کو اپنی تقدیر کی طرح اٹل معلوم ہوتی تھی، خاص طور پر مسلمان جنھوں نے راست طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کھائی اور ہزیمت اٹھائی۔ اقبال کو سب سے زیادہ "مریض اور بیمار قوم" نظر آئی۔ "جبریت" کے احساس سے دنیا "فریبِ ہستی" اور عالمِ مثال تھی جس کے نتیجہ میں جمود طاری تھا۔ زندگی ندہ انسانوں کی زندگی نہیں تھی۔ دنیا اور تقدیر کے بارے میں مسلمانوں کے ایسے نظریات عجمی اور ہندی فلسفے کی دین تھے جو دینِ اسلام سے م آہنگ نہ تھے۔

اقبال کے نقطۂ نظر سے اصلِ حیات ہی جذبۂ "عشق" ہے۔ اس عشق مرکز کوئی ایک فرد نہیں ہے بلکہ نوعِ 'اشیا اور کائنات یہ سب پر یط ہے۔ یہ عشق وہ ہے کہ جس پر موت بھی حرام ہے۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

"ساقی نامہ" لکھتے ہوئے اقبال کو اپنے عشق کی حرارت اور تب و ب پر اتنا اعتماد بھی ہے کہ قوم کے جوانوں کے لیے دعائے آرزومندی میں یوں لب کشا ہوتے ہیں:

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   مرا عشق میری نظر بخش دے

جوانوں کو دعائے عشق اس لیے کہ عشق رازِ عمل ہے۔ عمل کے لیے

ﮨﻤﯿﺰ ﮨﮯ۔ ﻋﺸﻖ ﻧﮧ ﮨﻮ ﺗﻮ ﮨﻨﮕﺎﻣۂ ﻋﺎﻟﻢ ﮔﺮﻡ ﮨﻮ ﻧﮩﯿﮟ ﺳﮑﺘﺎ۔ ﺣﺮﺍﺭﺕِ ﻋﺸﻖ ﮨﯽ ﮐﯽ ﺑﺪﻭﻟﺖ ﺳﺮﻣﺎﯾۂ ﺍﺿﻄﺮﺍﺏ ﻭ ﺻﺒﺮ ﮐﺎ ﺍﮨﺘﻤﺎﻡ ﮨﮯ۔ ﺟﻤﺎﻝِ ﻋﺸﻖ ﻭ ﻣﺴﺘﯽ ﯾﮧ ﺻﻮﺭﺕ ﺗﻮ ﭘﯿﺮﺭﻭﯼ ﻧﮯ ﻧﻮﺍﺯﯼ ﮨﮯ ﺗﻮ ﺟﻼﻝِ ﻋﺸﻖ ﻇﺮﻑِ ﺣﯿﺪﺭﯼ ﮨﮯ۔ ﺗﺒﮭﯽ ﺗﻮ ﮨﮯ ﺍﻗﺒﺎﻝ ﮐﮩﺘﮯ ﮨﯿﮟ:

ﺟﻤﺎﻝِ ﻋﺸﻖ ﻭ ﻣﺴﺘﯽ ﻧﮯ ﻧﻮﺍﺯﯼ ﺟﻼﻝِ ﻋﺸﻖ ﻭ ﻣﺴﺘﯽ ﺑﮯ ﻧﯿﺎﺯﯼ
ﮐﻤﺎﻝِ ﻋﺸﻖ ﻭ ﻣﺴﺘﯽ ﻇﺮﻑِ ﺣﯿﺪﺭ ﺯﻭﺍﻝِ ﻋﺸﻖ ﻭ ﻣﺴﺘﯽ ﺣﺮﻑِ ﺭﺍﺯﯼ

ﻋﺸﻖ ﮐﮯ ﺍﺱ ﺳﺮِّ ﻧﮩﺎﮞ ﮐﮯ ﺁﺷﮑﺎﺭ ﮨﻮﻧﮯ ﮐﮯ ﺑﻌﺪ ﯾﮧ ﺣﻘﯿﻘﺖ ﺑﮭﯽ ﮐﮭﻞ ﮔﺌﯽ ﮐﮧ ﻋﻘﻞ ﮐﺎ ﻧﻮﺭ "ﭼﺮﺍﻍِ ﺭﺍﮦ ﮨﮯ ﻣﻨﺰﻝ ﻧﮩﯿﮟ ﮨﮯ" ﺍﻭﺭ ﺍﺳﯽ ﻟﯿﮯ ﺭﮦ ﻧﻮﺭﺩِ ﺷﻮﻕ ﮐﻮ ﻋﻘﻞ ﺳﮯ ﺁﮔﮯ ﮐﯽ ﻣﺴﺎﻓﺖ ﻃﮯ ﮐﺮﻧﯽ ﭼﺎﮨﯿﮯ۔ ﺍﺳﺮﺍﺭِ ﺣﯿﺎﺕ ﮐﮯ ﺭﺍﺯﺩﺍﮞ ﮐﻮ ﻣﻌﻠﻮﻡ ﺗﮭﺎ ﮐﮧ ﻋﻘﻞ ﺗﺸﮑﯿﮏ ﺍﻭﺭ ﺑﮯ ﯾﻘﯿﻨﯽ ﭘﯿﺪﺍ ﮐﺮﺗﯽ ﮨﮯ۔ ﻓﻠﺴﻔﯽ ﻋﻠﻢ ﮐﮯ ﻓﯿﻀﺎﻥ ﺳﮯ ﺁﺭﺍﺳﺘﮧ ﺗﻮ ﮨﻮﺗﮯ ﮨﯿﮟ ﻋﺸﻖ ﮐﮯ ﻋﺮﻓﺎﻥ ﺳﮯ ﻣﺤﺮﻭﻡ ﮨﯿﮟ۔ ﺍﻓﻼﻃﻮﻥ، ﺍﺭﺳﻄﻮ ﺍﻭﺭ ﮨﯿﮕﻞ ﺟﯿﺴﮯ ﻓﻠﺴﻔﯿﻮﮞ ﺳﮯ ﺟﻮ ﻧﮧ ﮨﻮ ﺳﮑﺎ، ﻭﮦ ﺭﺍﺯ ﺍﻗﺒﺎﻝ ﺟﯿﺴﮯ ﺻﺎﺣﺐِ ﺟﻨﻮﮞ ﻧﮯ ﭘﺎ ﻟﯿﺎ ﺗﮭﺎ۔

ﺗﮍﭖ ﺭﮨﺎ ﮨﮯ ﻓﻼﻃﻮﮞ ﻣﯿﺎﻥِ ﻏﯿﺐ ﻭ ﺣﻀﻮﺭ
ﺍﺯﻝ ﺳﮯ ﺍﮨﻞِ ﺧﺮﺩ ﮐﺎ ﻣﻘﺎﻡ ﮨﮯ ﺍﻋﺮﺍﻑ

ﮨﯿﮕﻞ ﮐﺎ ﺻﺪﻑ ﮔﮩﺮ ﺳﮯ ﺧﺎﻟﯽ ﮨﮯ ﺍﺱ ﮐﺎ ﻃﻠﺴﻢ ﺳﺐ ﺧﯿﺎﻟﯽ
ﺷﻮ ﺧﺮﺩ ﮐﮯ ﭘﺎﺱ ﺧﺒﺮ ﮐﮯ ﺳﻮﺍ ﮐﭽﮫ ﺍﻭﺭ ﻧﮩﯿﮟ

ﺍﺱ ﺣﻘﯿﻘﺖ ﮐﮯ ﻣﺤﺮﻡِ ﺭﺍﺯ ﺍﻗﺒﺎﻝ، ﻋﻘﻞ ﮐﯽ ﺣﯿﻠﮧ ﺳﺎﺯﯼ، ﻧﮕﮧ ﮐﯽ ﻏﺮﺑﺖ ﮐﮯ ﺍﻭﺭ ﺍﺣﺴﺎﺱ ﮐﯽ ﺗﮩﯽ ﺩﺍﻣﻨﯽ ﭘﺮ ﺭﻭﺷﻨﯽ ﮈﺍﻟﺘﮯ ﮨﻮﺋﮯ ﻋﻘﻞ ﺍﻭﺭ ﻋﺸﻖ ﮐﮯ ﺑﻨﯿﺎﺩﯼ ﺗﻀﺎﺩﺍﺕ ﮐﺎ ﺍﺱ ﻃﺮﺡ ﺟﺎﺋﺰﮦ ﻟﯿﺘﮯ ﮨﯿﮟ:

ﻋﺸﻖ ﺗﻤﺎﻡ ﻣﺼﻄﻔﯽٰ، ﻋﻘﻞ ﺗﻤﺎﻡ ﺑﻮﻟﮩﺐ
ﮔﺎﮦ ﺑﮧ ﺣﯿﻠﮧ ﻣﯽ ﺑﺮﺩ ﮔﺎﮦ ﺑﮧ ﺯﻭﺭ ﻣﯽ ﮐﺸﺪ

ﻋﺸﻖ ﺩﻡِ ﺟﺒﺮﺋﯿﻞ ﻋﺸﻖ ﺩﻝِ ﻣﺼﻄﻔﯽٰ
ﻋﺸﻖ ﺧﺪﺍ ﮐﺎ ﺭﺳﻮﻝ ﻋﺸﻖ ﺧﺪﺍ ﮐﺎ ﮐﻼﻡ

ﻋﺸﻖ ﮐﮯ ﻣﻀﺮﺍﺏ ﺳﮯ ﻧﻐﻤۂ ﺗﺎﺭِ ﺣﯿﺎﺕ ﻋﺸﻖ ﺳﮯ ﻧﻮﺭِ ﺣﯿﺎﺕ ﻋﺸﻖ ﺳﮯ ﻧﺎﺭِ ﺣﯿﺎﺕ

اسی جذبۂ عشق کی بدولت انسان محض مشتِ خاک نہیں۔ مفسرِ حیات بال لکھتے ہیں کہ یہ "خاکِ زندہ" ہے۔ وہ خاکِ زندہ جو تابع ستارہ نہیں بلہ "جس نے سے ہیں تقدیر کے چاک"۔ شہیدِ کربلا حضرت حسینؓ کو بال "امامِ عاشقاں" سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت حسینؓ نے اپنے عمل سے جس حسنِ عمل کا دنیا کو درس دیا ہے ملت کی آبرو اسی سے قائم ہے۔ رد ہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ یہ وہ حریت ہے جو کسی سلطانِ جا لہ آگے نہیں خدائے قادرِ مطلق کے آگے سر بہ سجود ہے۔ یوں تو ہر زندگی نجام فنا ہے لیکن وہ موت جس پر زندگی نثار ہو' فنا حرام ہو'۔ اقبال اسی ستیٔ مقدس کے حضور یوں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں:

آں امامِ عاشقاں پورِ بتول — سروِ آزادے ز بستانِ رسول
بہرِ آں شہزادۂ خیر الملل — دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل
سرخ رو عشقِ غیور از خونِ او — شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ او
درمیانِ امت آں کیواں جناب — ہمچو حرفِ قل ہو اللہ در کتاب

اور حضرت معین الدین اجمیری نے "حقا کہ بنائے لا الہ است حسین" مہ کر طے کر دیا قصہ تمام۔ کلمۂ لا الہٰ جو دراصل خودی کا سرِ نہاں ہے جو جہاں روحِ رواں ہے' جو ذوقِ نمود ہے جو اندیشۂ بے باک ہے۔ لا الہٰ الا اللہ ولولۂ شوق ہے وہ ولولۂ شوق جو عروجِ آدمِ خاکی کا سرِ نہاں ہے۔

لا الہٰ اپنی نہاد میں وہ حکمِ اذاں ہے جس سے شبستانِ وجود لرز اٹھا ہے وہ اعلائے کلمۃ الحق ہے جس سے باطل کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ وہ جنبیٔ اقبال وہ بھٹکا ہوا راہی جس نے کہا تھا:

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

جو پائے راز سے ایک قدم آگے بڑھ کر صاحبِ منزل نظر آتا ہے سے یہ اعلان کرتا ہے:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

عالمِ آب و خاک و باد کی حقیقت سے آگہی کے بعد من و تو کے حجابات بھی باقی نہ رہے، کہتے ہیں:

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا اللہ!

مئے لا الٰہ الا اللہ سے جب خمیرِ اقبال لبالب لبریز ہو گیا، اجنبی جنبی نہیں رہا، رازداں ہو گیا۔ ایک کفِ خاک و بے بصر خود نگر ہو گئی، ۔دشناس ہو گئی، کائنات اب طلسمِ رنگ و بو نہیں رہی اصلِ شہود و شاہد و مشہود کا راز مل گیا۔

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

ہ وسیع اسلام کے رازداں اقبال، اسلام کے بنیادی عناصر کو یقینی اور ؛وال حقائقِ زندگی جانتے تھے۔ تصورِ توحید و وحدتِ انسانی کے لیے ی نظریۂ حیات تھا منتشر اقوام و اطلل کی شیرازہ بندی کے لیے وحدتِ سانی کا یہ پیام اساسی اعتبار سے ایک روحانی انقلاب کا پیام تھا۔ سلام میں فرد بہ حیثیت فرد بے مقام ہے، جب تک ملت سے وابستہ ہو۔ کہتے ہیں:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ردتا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

اقبال کی نگاہِ دقیقہ رس نے دیکھ لیا تھا کہ یورپی قوموں کی پھیلائی ی تشکیک، الحاد و لادینی کی یورش اور مادیت کی یلغار سے بتکدۂ غات میں وہ غلغلۂ ہائے الاماں برپا تھا کہ عقیدہ اور ایمان سلامت لے نا بھی دشوار تھا۔ خانقاہوں سے وہ صوفی کہ:

جبر" تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر۔ عجم کے خیا
کھو گئے تھے۔ ملا اور مولوی اس یورش کے جواب میں تقدیر پر
زمانے کو برا بھلا کہتے یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا بیٹے کا شیوہ
رہے تھے۔ قرآن کی آیت "لاتسبوالدہر" جو شمع ہدایت بن سکتی تھ
دی گئی تھی۔ اس کا جو المناک انجام ہو سکتا تھا راز داں اقبال سے پوشیدہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

اقبال کی فکر بلند نے ادراک کر لیا تھا کہ افکار اور ائمّہ کا وہ آ
نہیں ہے جس نے مسلمانوں کو دنیا کا سرتاج بنا دیا تھا۔ تعمیر، تشک
تزئین حیات کے خواب سے بھی مسلمان بے نیاز ہو چکے تھے۔ آ
بے نیشی نے مریض بنا دیا تھا۔ یورپ کی لادی ہوئی نئی تہذیب
زندگی کو مادیت اور اجسام کی تگ و دو بنا کے رکھ دیا تھا۔ روح
جسم کی افزائش ہی کی طرح ضروری ہے۔ اس سے صرف نظر کرنا
اقبال نے سمجھایا:

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت وجاہ

من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

خودشناسی اور خود آگہی کے زینے سے انسانیت کی منزل اعلیٰ
تک رسائی کے لیے اقبال نے حرکی نظریۂ حیات (DYNAMIC THEORY
OF LIFE) پیش کیا جس کا مظہر اتم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی
ذاتِ گرامی ہے۔ بغیر کسی آئیڈیل کے شعر گوئی محض لفاظی رہ جاتی ہے
اقبال کے شعر سحرِ حلال ہیں کیوں کہ ان کے وجدان نے معراج سے نکلو انجیں
کا راز حاصل کیا تھا۔ کہتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کے کلام میں "اطیعوا الرسول" کا پیام ہمہ گیر معنوں میں استعمال
ہوا ہے وہ طاعت جو زندگی اور طرزِ زندگی ہی نہیں طرزِ فکر کا بھی احاطہ
کرتی ہے۔ طرزِ فکر جس کے لیے فقہی اصطلاح "نیت" ہے۔ طاعت کے
نہاک کو اقبال نے کبھی شوق اور کبھی عشق سے تعبیر کیا ہے۔ جاوید اقبال
کے نام کہتے ہیں:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

دیارِ عشق میں مقام پیدا کرنے کے لیے خود جذبۂ عشق مہمیز ہوتا
ہے۔ عشق کا لازمہ حرکت اور عمل ہے۔ رازداں اقبال نے جبریل اور
ابلیس کو SYMBOLIC طور پر استعمال کر کے نہ صرف یہ کہ اردو شاعری کو
نئی وسعتوں سے روشناس کیا ہے بلکہ عمل کی بھی دو صورتیں بتائی ہیں۔
عمل صحیح اور عمل قبیح۔

عمل صحیح یا عمل صالح جو ممد حیات اور معاونِ حیات ہوتا ہے
جس سے انسان کی خودی آشکار ہوتی ہے۔ پھر خودی اور خودنمائی میں
امتیاز دکھانے کے لیے جبرئیل اور ابلیس کے مابین مکالمہ اسی کاوش کی
ایک کڑی ہے۔ اقبال کی خودی، خودنمائی کے برعکس ایک مستقل بالذات
وصف ہے۔ کلیسائی رہبانیت، عجز و انکسار اور نفس کشی اور خانقاہوں میں
یونانی اور ہندی فلسفے کے زیر اثر تشکیل شدہ خود فراموشی سے ممیز خود آگہی

ہے جس سے انسان کی ذات اور صفات کی نمود ہوتی ہے۔ اقبال کی خودی، عمل ہی کی متقاضی نہیں، عمل صالح کی جویا ہے۔ صرف عمل سے یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو، طوفان ہی طوفاں برپا ہو سکتے ہیں لیکن عمل صالح جو جذبۂ عشق کی دین ہوتا ہے ہے خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

خودی صرف شعورِ ذات ہی نہیں، اثباتِ ذات کا نام ہے اور اثباتِ ذات کے مظاہر تعمیر اور تسخیر کی اعلیٰ صلاحیتوں میں رونما ہوتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں خودی خدا کی ذات میں گم ہونا نہیں ہے۔ خدا خالق کونین ہے تو انسان خالقِ تہذیب ہے۔ اثباتِ خودی کا ولولہ جب زیادہ تیز ہوتا ہے تو انسان صانعِ مطلق سے اپنی صناعیوں، ترتیب و تنظیم کی داد طلب کرتا ہے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال جانتے تھے کہ خدائی تو اہتمام خشک و تر ہے۔ خدا کا مطلوب اصلی انسان ہے جس کے لیے یہ کائنات تخلیق کی گئی ہے تاکہ انسان تسخیرِ کائنات کر کے ہم رتبۂ خدا ہو۔ شعورِ ذات اور اثباتِ ذات کے مرکب سے جس خودی کی تشکیل ہوتی ہے اس کی تسخیر اور تعمیر کی حدیں بھی بیکراں ہوتی ہیں۔ پہاڑ اس کی طاقت سے سمٹ کر رائی بن جاتے ہیں مردِ خود آگاہ کے لیے ساری دنیا اس کی میراث ہوتی ہے۔ خودی کی رفعتوں میں انسان سوچتا ہے:

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں

رازداں اقبال کہتے ہیں:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

"تو نہیں جہاں کے لیے" ایک "رازِ الوندی" ہے، ایک رمز بلیغ

(باقی صفحہ پر)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اقبال کا نیا مکتبِ فکر

مدینہ طیبہ کی ادبی انجمن میں ایک تقریر

حضرات! میرے لیے اللہ تعالیٰ اور حاضرینِ مجلس کے سامنے شرمندہ ہونے کی بات ہے کہ میں جوارِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی مبارک مسجد (مسجد نبوی) کے زیرِ سایہ آپ کے علاوہ دنیا کی کسی اور ہستی کا ذکر اور اس کا بیان کروں۔ ایک عرب شاعر نے کسی موقع پر جو کہا تھا وہ اس محل و مقام پر برمحل ہے۔ ملاحظہ ہو:

ولما نزلنا منزلا ظلہ الندی انیقا و بستانا
من النور حالیا اجد لنا طیب المکان وحسنا
منیً، فتمنینا، فکنت الامانیا

جب ہم ایسی جگہ پر اترے جسے شبنم نے شاداب و سیراب کر رکھا تھا اور نو دمیدہ پھولوں سے وہ سجا ہوا تھا تو مقام کے حسنِ دل آویزی سے ہمارے دل میں خوابیدہ آرزوؤں نے انگڑائی لی۔ ہم نے آرزوئیں کیں لیکن حاصلِ آرزو تمہاری ہی ذات تھی۔

یہی وہ جگہ ہے جسے آخری آسمانی پیغام کی طراوت اور صحبتِ نبوی کی نکہت و نگاہ کی جنت بنا دیا ہے اس لیے یہاں اس ہستی کا ذکر ہونا چاہیے جس کی ذات بابرکات سے اس شہر کو ہمیشہ کے لیے شرف و اعزاز حاصل ہوا۔ جس کی بعثت نے نئی زندگی اور حقیقی معنویت پائی۔

مگر میں یہاں ایک ایسے شخص کا ذکر کرنے جارہا ہوں جس کا تعلق ذاتِ نبوی ﷺ سے گہرا اور مضبوط تھا اور یہی بات اس محل و مقام میں رجمِ قدیم محاورہ کے مطابق مسجدِ نبوی ﷺ سے ایک تیر کے فاصلہ پر ہے اس تذکرہ کا جواز پیدا کرتی ہے۔

ہمارے عظیم شاعر محمد اقبال کا یہ حال تھا (جس کا میں عینی گواہ ہوں اور مسجدِ نبوی کے جوار میں اس کی گواہی دیتا ہوں) کہ ذاتِ نبوی روحی فداہ کا ذکر تو بڑی چیز ہے۔ آپ کے شہر مدینہ ﷺ کے نام پر ان کی آنکھیں اشک بار اور ان کا دل بے قرار ہو جاتا تھا۔

یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ میں فارسی میں ان کے دو شعر پڑھوں کیوں کہ یہاں فارسی جاننے والے بھی موجود ہیں وہ کہتے ہیں:

باایں پیری رہ یثرب گرفتم   نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام   کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

جن کا مفہوم یہ ہے کہ "میرے دوستوں کو بڑی عمر میں مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم سفر اور ذوق و شوق پر تعجب ہوا۔ اور وہ کہنے لگے کہ یہ عمر اور طویل سفر؟ یہ تکلیف مالایطاق ہے، اس پر میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ جانتے نہیں کہ پرندہ دن بھر صحراؤں میں آوارہ پھرتا اور فضاؤں میں اڑتا رہتا ہے لیکن جب دن ختم ہونے لگتا ہے تو اس کو اپنا آشیانہ یاد آتا ہے اور وہ تیر کی طرح اڑ کر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح مدینہ منورہ ایک مسلم کے طائرِ روح کا آشیانہ، اس کی عقیدت کا ٹھکانہ اور اس کے روحانی سکون و سرور کا خزانہ اور آخری ٹھکانہ ہے تو میں ایسے میں اپنے آشیانہ کی طرف کیوں نہ پرواز کروں، جبکہ شامِ زندگی قریب ہے۔"

دوستو اور بزرگو! میں ادب کو ایک زندہ وجود سمجھتا ہوں جس کے پہلو میں درد بھرا دل، باشعور و زندہ احساس، پختہ عقیدہ اور اس کا واضح و معین نصب العین ہوتا ہے۔ رنج و الم سے اور اسبابِ مسرت سے وہ مسرور ہوتا ہے اور اگر ادب ایسا نہیں تو وہ جامد اور بے جان مجموعہ ہے

کے نقش و تراشے اور بے ساختگی کی دلبندیوں سے زیادہ قریب ہوتا ہے جو ہر خیال میں صرف جی بہلانے اور وقت گزاری کا مشغلہ نہیں بلکہ وہ بلند شریفانہ اغراض و مقاصد تک اور فطرتِ انسانی کو متاثر کرنے کا بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہے آپ مجھے اجازت دیں کہ آپ کے سامنے وہ اشعار پڑھوں جن سے اس عظیم شاعر کے عقیدہ اور اس کے اس ادبی نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے جس پر اقبال کا پورا شعری و فکری دبستان قائم ہے۔

اقبال کا عقیدہ یہ ہے کہ ادب میں اس وقت تک جان نہیں پڑتی جب تک کہ وہ اپنی زندگی اور توانائی دھڑکتے دل کی گہرائی سے نہیں حاصل کرتا اور خونِ جگر سے سیراب نہیں ہوتا وہ ایک شعر میں اس مضمون کو ادا کر دیتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

میں یہاں دوبارہ اجازت لے کر پہلے اردو میں ان کے اشعار پڑھتا ہوں پھر عربی میں ان کی تشریح کروں گا۔ وہ فرماتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اقبال کا یہ نظریۂ شعر و ادب دنیائے علم و فن میں ایک انقلابی نظریہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں اس کام کیلئے ایسے شخص کو منتخب کیا جس نے

فلسفۂ قدیم وجدید اور ادب وفن کا یکساں اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اقبال ایک
عرصہ تک یورپ کی موقر دانش گاہوں (جامعات) میں رہے۔ جہاں انھ
اپنے علم وتحقیق و مطالعہ کے نتائج پیش کئے اور یورپ کے مفکرین
جامعات کے اساتذہ کی عالی صحبتوں میں وقت گزارا، لیکن اللہ تعا
انھیں اسلام کے عالمگیر پیغام کے لیے منتخب کیا تھا اور انھوں نے اس
رسانی کے لیے شعر وادب کی زبان اختیار کی کیونکہ ادب کی زبان ذوق
کی زبان اور مضطرب وجدان اور سوز دروں کی ترجمان ہوتی ہے" ا
نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ پیغام پہنچایا اور شعر وادب کو غیر معمو
حد تک متاثر کیا اور اردو شعر گوئی میں ایک نیا مکتب فکر قائم کیا انھ
ادب وشاعری کو نئی ترکیبیں، نئے خیالات اور نئے معانی ومفاہیم
اور اس کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا۔

اقبال کی عظمت میں چند عوامل وعناصر کی خصوصی کارفرمائی ر
ہے جن میں پہلا مقام عقیدہ کا ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے
میری مراد یہ نہیں کہ وہ اسلام کی صحت وصداقت پر پختہ عقیدہ ر
یہ تو مسلمان کے لیے شرط اوّل ہے اور اس میں ان کی خصوصیت نہیں،
مراد یہ ہے کہ وہ اس سے آگے بڑھ کر اسلام کی قائدانہ صلاحیت
آخری اور منتخب اور واحد پیغام ہونے پر پختہ عقیدہ اور غیر متزلزل
رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ صرف ایمان ہی سفینۂ حیات کو ساحل
تک پہنچا سکتا ہے اور وہی دنیا کو جاہلیت، ہر طرح کی بت پرستی، ا
کی غلامی، خواہشوں کی پرستاری اور مادہ و معدہ کی اسیری اور چاکری
رہائی دلا سکتا ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دانائے سبل مولائے
ختم الرسل سمجھتے ہیں۔ جنھوں نے غبار راہ کو فروغ وادی سینا عطا کیا۔

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سبل ختم رسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

انھوں نے ایک شاعر ادیب کی حیثیت سے ایک نمایاں اور ممتاز کردار ادا کیا اور برصغیر ہند و پاک کی نئی تعلیم یافتہ نسل پر ایسا گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا جو عصر حاضر کے عظیم مفکروں اور ممتاز شخصیتوں میں کسی کے یہاں نہیں پایا جاتا ہے چناں چہ ان کے بعد آنے والا کوئی شاعر، ادیب اور اہلِ قلم ایسا نہیں جو ان سے کم و بیش متاثر نہ ہوا ہو۔ یہ بات میں تاریخ ادب سے اپنے تعلق اور دلچسپی کی روشنی میں کہہ رہا ہوں کہ کم از کم ہند و پاک کا تقریباً ہر ادیب و شاعر اقبال سے الفاظ و اسالیب، تعبیرات و تراکیب اور خیالات و استعارات میں فیض یاب ہوا ہے۔ ان میں شاید ہی کسی کو یہ دعوا ہو کہ وہ اقبال سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا ہے حتیٰ کہ وہ بھی جو اپنے خیالات و رجحانات میں اقبال سے اختلاف رکھتے ہیں وہ سب شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے قائل ہیں اور ان کے فن کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔

کسی توانا شخصیت کا یہی راز ہے۔ ادب میں قوت و اثر تبھی پیدا ہوتا ہے، جب اس کے پیچھے کوئی موثر اور بلند و بالا شخصیت ہو، جو فکری دنیا میں اپنا اثر و نفوذ قائم کر لے اور زبان و اہلِ زبان کی دنیا میں ایک نیا مکتبِ خیال وجود میں لائے۔ ایسا کرشمہ اہلِ قدیم میں مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۶۷۲ھ) کے ذریعہ رونما ہوا، جن کی نغمہ سرائیوں، نکتہ سنجیوں اور حقائق و معارف کا سایہ صدیوں تک عجم کے مکاتبِ خیال اور شعر و ادب پر نظر آتا ہے۔ عجم کے تمام ادبی مکاتبِ خیال پر اثر ڈالنے والے ایسے ہی محدودے چند اشخاص میں شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی (م ۶۹۱ھ) وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ اقبال سے متعلق لکھے جانے والے رسالوں اور کتابوں کی تعداد دو ہزار تک پہنچ چکی ہے۔

دسمبر ۱۹۷۷ء حکومت پاکستان کے زیر اہتمام لاہور میں اقبال کا صدسالہ جشن منایا گیا تھا، اس میں جو مقالات پڑھے گئے تھے اس میں

ایک مقالہ میں بتایا گیا تھا کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اقبال پر جو کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ہیں ان کی تعداد دو ہزار ہے، یہ ان مقالات، بحث اور خطبات کے علاوہ ہے جو رسائل میں شائع ہوئے یا جلسوں میں پیش کیے گئے۔" (رسالہ 'معارف')

بعض محتاط اور ثقہ لوگوں کا کہنا ہے کہ یورپ کی اور دوسری زبانوں مثلاً انگریزی، جرمن، فرنچ، فارسی اور عربی میں کسی شاعر نے اپنے اور اپنے مکتب فکر کے لیے اقبال جیسی مقبولیت نہیں حاصل کی۔ نہ انگریز شاعر و ادیب شکسپیر نے نہ اطالوی شاعر دانتے اور نہ ہندوستانی رابندر ٹیگور نے نہ عربی کے جادو بیان شاعر ابوالعلا المعرّی نے، یہ اقبال ان کی عظیم پھر قوت ایمان و پختہ عقیدہ اور پھر فکر و وجدان کے نتیجہ میں ظہور پذیر ادب جب وجدانی قوت سے خالی ہوتا ہے تو وہ نقل و محاورات بن جاتا ہے اور تمثیلی و تقلیدی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ وجدانی قوت ادب کو طاقتور بناتی ہے اور اس میں بقا و دوام کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور اسے عوامی مقبولیت عطا کر کے دلوں کی دھڑکن بنا دیتا ہے۔ ادیب کے پاس اگر قلب و وجدان نہ ہو تو وہ کسی اداکار کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے وجدانی قوت سے امتیازی طور پر سرفراز کیا تھا۔

اسی طرح ادیب و شاعر کے لیے (بلکہ میں اس سے آگے بڑھ کر کہوں گا کہ کسی ملت کے لیے بھی) معین ہدف، واضح نصب العین اور کوئی کامل اسوہ و نمونہ ہونا چاہیے۔ اقبال خود کہتے ہیں:

"میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی جناب میں عصر حاضر میں امت اسلامیہ کے حال زار کا شکوہ کیا۔ اس پر یہ جواب ملا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ امت دل تو رکھتی ہے مگر کوئی دل دار و محبوب نہیں جانتی کہ اس کی محبت کا محل و مصداق کون ہے۔"

شبے پیشِ خدا بگریستم زار | مسلماناں چرا زارند و خوارند؟
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم | دلے دارند و محبوبے ندارند؟

تو شاعر و ادیب اور کسی قوم و معاشرہ کے رہنما اور صاحب فکر و نظر کے لیے کسی مرکز محبت کا وجود ضروری ہے، جس کی طرف وہ اپنے جذبہ محبت و سرشاری کا رُخ پھیر سکے۔ اللہ کی ان نعمتوں میں جن سے اقبال سرفراز ہوئے عقیدہ کی قوت اور اس دین پر ناز کرنے کی عزت و سعادت بھی ہے جس کے سبب وہ اپنی وسیع و عمیق فلسفیانہ تحقیقات کے باوصف اسلام کو دینِ انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ سمجھتے تھے اور وہ جب آپ کو یاد کرتے تھے تو ان کے جذبات میں تلاطم برپا ہو جاتا، اور ان کی طبیعت بے اختیار اور آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں۔

یہاں مجھے ان کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ انگریزی دور میں ایک بڑے ہندو والئ ریاست نے انھیں مغل بادشاہوں سے اپنے آباء و اجداد کو ملی ہوئی اسندیں اور دستاویزیں پڑھنے اور انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے بلایا، کیوں کہ اقبال بیرسٹر اور قانون داں بھی تھے۔ والئ ریاست نے ان کے لیے ایک عمدہ کوٹھی میں قیام کا انتظام کیا اور جس کمرہ میں ان کو آرام کرنا تھا اسے امیرانہ شان سے سجایا اور تمام اسباب راحت فراہم کیے اور اقبال کو وہاں ٹھہرایا۔ اچانک ان کو خیال آیا کہ شاید کوئی کمی اور کوتاہی رہ گئی جس کی مجھے خبر نہ ہو، چناں چہ وہ اچانک ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو انھیں فرش زمین پر لیٹا ہوا پایا وہ اس مکلف مسہری پر نہیں سوئے تھے جو ان کے لیے تیار کی گئی تھی۔ مہاراجہ نے معذرت کرتے ہوئے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ یہ مسہری چھوڑ کر زمین پر کیوں آرام فرما رہے ہیں؟ علامہ اقبال کچھ دیر خاموش رہے پھر ان کے اصرار پر کہا کہ مجھے خیال آیا کہ مجھے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے اور جن کے سبب مجھے یہ شرف و اعزاز ملا ہے وہ زمین پر معمولی بستر پر سوتے تھے۔ تو مجھے اس مرصع و مکلف مسہری اور نرم و گداز بستر پر کیسے نیند آتی؟ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس کا اس ہندو والئ ریاست پر بھی اثر ہوا۔

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

در شبستان حرا خلوت گزید   قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم   تا بہ تخت خسروی خوابید قوم

جس سردار کی امت نے تاجِ کسریٰ کو پامال کیا، وہ خود بوریے پر سوتے تھے، جن کے غلام تختِ شاہی پر سوئے، وہ راتوں کو جاگ کر بسر کرتے تھے۔ چند راتیں آپ نے غارِ حرا کی خلوت میں گزاریں، جس کے نتیجے میں ایک نئی امت ایک کامل دستور اور ایک مضبوط سلطنت وجود میں آ گئی۔"

میرے دوستو! ہم نے یہ وجدانی قوت کھو دی ہے (مجھے معاف کریں) جب ہم بعض ادیبوں اور اہلِ قلم کی تحریریں پڑھتے ہیں تو اس پردہ کے پیچھے وہ ایک ماہر اداکار نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات بڑے بلیغ الفاظ اور اعلا اسلوب میں ادا کرتے ہیں مگر طبیعت پر ان الفاظ کا کوئی دیرپا اثر نہیں ہوتا اور ہم جلد ہی ان سے دامن جھاڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ زندہ شعر جس کا گہرا اور دیرپا اثر رہتا ہے اور وہ فکر و شعور پر محیط ہو جاتا ہے۔ وہ شعر ہے جو دل سے نکل کر دل تک پہنچتا ہے اور جو بات دل سے نکلتی ہے دوسرے دل میں گھر بناتی ہے اور زیادہ تر ایسی ہی چیزیں ہیں۔ اس حقیقی اور زندہ ادب کی حاجت صرف عالمِ اسلامی ہی کو نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانی کو ہے۔

میرے دوستو! ہم اس سطحی و سرسری ادب کے بوجھ سے دب گئے ہیں جو ہر صبح و شام ہمارے سامنے آتا ہے اور جس میں ہم بے جان صورتیں اور شیشہ اور پتھر کی مورتیں دیکھا کرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ہمارے اندر نئی زندگی اور نئی روح پھونک دے۔ جو ہمارے اندر نئی زندگی اور نئی روح پھونک دے۔ قرآن کریم نے زبانِ فصیح کی قدر و قیمت کو بطورِ خاص نمایاں کیا ہے اور اپنے آپ کو "عربی مبین" کا شاہکار بتایا ہے قرآن کو ہرگز کسی خارجی شئے کی ضرورت نہیں۔ اللہ سبحانہٗ تو دو عالم سے بے نیاز ہے مگر وہ قرآن کی زبان کو عربی مبین بتاتا ہے۔

قرآن شریف میں آتا ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ، وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ

اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَھُمْ۔
(اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس قوم کی
زبان میں تاکہ وہ انھیں سمجھا سکے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صرف قابلِ فہم زبان دے کر انھیں بھیجا، بلکہ یہ ہے کہ انھیں فصاحت و بلاغت کے ساتھ بھیجا، قرآن میں لسان کا مفہوم یہی ہے وہ زبان جس میں بچہ بولتا ہے اور غیر قادر الکلام آدمی بھی بات کرلیتا ہے۔ وہ مراد نہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انا اعربکم، انا قریشی واسترضعت فی
بنی سعد بن بکر۔
(میں تم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں، میں قریشی ہوں اور
میں نے بنی سعد بن بکر میں پرورش پائی ہے۔)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ادب کی قدر و قیمت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ان من البیان سحرا" وان من الشعر حکمۃ،
بعض کلام سحر اور بعض اشعار حکمت ہوتے ہیں۔

اس امت کے افضل ترین افراد فصیح و بلیغ بھی تھے۔ آپ کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، کے خطبات میں زبان و ادب کے جیتے جاگتے نمونے ملیں گے۔ اسی طرح خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم اور کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین (جن میں سرفہرست حضرت علی رضی اللہ عنہ، ہیں) کے خطبات میں دل کش ادبی نمونے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ "نہج البلاغہ" کا مکمل طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ، کا کلام و تحریر ہونے کی تاریخی طور پر ذمہ داری نہیں لی جاسکتی لیکن جو ان کا اصلی کلام ہے، وہ ادبِ عالیہ کا حصہ ہے۔ اسی طرح اسلام کی اصلاحی و علمی تاریخ کے مشاہیر داعی ہونے کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ سیدنا عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) مقبولین و واصلین حق میں تھے اس کے ساتھ جب آپ ان کے اصل و محفوظ خطبات پڑھیں گے تو آپ کو بادل گرجتے، بجلیاں کوندتی اور دریا موجیں

مارتا ہوا نظر آئے گا۔ اور ہمیں اسی نعرہ اثر کی ضرورت ہے۔

اقبال کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے فطری شعری ک
انسانیت اور اسلام کے مفاد میں استعمال کیا' ان کے لیے شعر و ادب کی ش
پر نمایاں جگہ حاصل کرنا بہت آسان تھا۔ جیسا کہ ان کے بہت سے معا
نے حاصل بھی کیا مگر اس سے انکار کرتے ہوئے انھوں نے اپنی عام ش
فنی صلاحتیں اسلام اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کردیں اور
طرح انھوں نے برصغیر ہند و پاک اور فارسی بولنے والے ممالک ایران
کے لاکھوں نوجوانوں کے دلوں میں اسلام پر اعتماد و اعتقاد کو بحال کیا اور عش
صلی اللہ علیہ وسلم کا شعلۂ جوالا فروزاں کردیا۔ کاش انھوں نے اپنے ادب
کو عالمگیر بنانے کے لیے عربی زبان استعمال کی ہوتی۔ جس کے وہ طالب
عرصہ تک لندن یونی ورسٹی میں اپنے استاد پروفیسر نکلسن کی نیابت میں
معلم بھی رہ چکے تھے۔ جب میں نے ان کی بعض نظموں کا عربی ترجمہ سن
انھوں نے اس کو سمجھ لیا اور پسند کیا اور خود حماسہ کے بعض عربی اش
جو ان کو پسند تھے اور ان کے مذاق کے مطابق تھے لیکن کسی زبان کی
اور چیز ہے اور اس میں شعر کہنا اور اپنے دلی خیالات ادا کرنا اور بات

الحمد للہ کہ عالم عربی میں بڑے علماء و مفکرین' ادباء و مصنفین
دانش گاہوں' تحقیقی اداروں اور کتابی ذخیروں کی کمی نہیں مگر وہاں اق
کوئی عبقری شاعر نظر نہیں آتا۔ اگرچہ امیر الشعراء احمد شوقی نہ صرف
بلکہ اپنے عصر کے عظیم عرب شاعر تھے۔ اور جدید عربی شاعری میں ان
اسلامی جذبات اور ایمانی نغمات ملتے ہیں۔ ان کے بعد حافظ ابراہیم کا
مقام ہے مگر عالم عربی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوسرا کوئی
سامنے نہیں آیا جو اقبال کی جگہ لے سکے۔ اور ان کی طرح طاقت ور اور موثر
اسلامی قافلہ کی حدی خوانی کرسکے۔ جو دل کے تاروں کو چھیڑ دے اور دلو
میں مقناطیسی لہریں بکھیر دے اور ادبی و اسلامی معاشرہ اور ادب عرب
قلب و ضمیر میں اتر جائے۔ (مسلسل ۵۵ پر)

سکندر توفیق

اقبال کا پیام
آج کی مسلم اقلیتوں کے نام

عنوان سنتے ہی یقیناً کئی احباب ازراہ استہزا یہ کہہ اٹھیں گے کہ جس شخص کا انتقال پاک ہند کی آزادی سے ۹ سال قبل ہو چکا ہو وہ کس طرح ۱۹۸۶ء کے ہندوستانی مسلم اقلیت کے نام کوئی پیام دے سکتا ہے۔

۱۹۳۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہنے والے شاعر کے کلام میں ۱۹۸۶ء کے مسائل سے برد آزما مسلمانوں کے لئے کسی معنی خیز پیام کا موجود ہونا بظاہر ایک نہایت ہی مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے انسان کتنا ہی بڑا (GENIUS) یا نابغہ کیوں نہ ہو عالم الغیب ہرگز نہیں ہوتا قریباً پچاس سال پہلے آج کے ٹھوس اور حقیقی مسائل کا ادراک کرنا اور پھر ان کا تدارک۔ یک ان ہونی سی بات ہے پھر یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ اقبال کے کلام میں آج کی سلم اقلیتوں اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کوئی قابل عمل اور مفید پیام ہے؟

س سوال کا جواب اقبال کے کلام کے SOURCES یا مبداؤں پر ایک نگاہ ڈال لینے سے ل جائے گا۔ اقبال نے خود ان کے اپنے اعترافات کی روشنی میں، جن عناصر کو اپنی شعری کر کا مبدا قرار دیا ہے وہ ہیں قرآن حکیم، سنت رسول اللہ صلعم اور مثنوی مولانا روم۔ اور یہ لیے SOURCES ہیں جن پر مرور ایام کا کوئی نقصان دہ اثر مرتب نہیں ہوا ہے اور نہ ہی یہ غلامی کے طریقے" کا درس دیتے ہیں۔ قرآن کی تفسیر، سنت کی تنویر اور رومی کی تحریر نے ان کے لئے ایک ایسی چھٹی حس SIXTH SENSE فراہم کر دی تھی جس سے وہ "آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر" وقت سے پہلے ہی دیکھ لینے پر قادر ہو گئے تھے۔ ملہم غیب کے اشارات سے اقبال کے صریر خامہ کو نوائے سروش کا درجہ مل گیا تھا۔

چنانچہ آزادی کے قبل کے پرآشوب دور میں اقبال کی نگہ نکتہ بیں نے آنے والے دور کا ایک

[illegible]

ے خواب دیکھا جس کی تعبیر پاکستان کی صورت میں سامنے آئی۔ اس تاریخی حقیقت کو مسٹر رام لال نے
ا کتاب "ہندوستانی مسلمان" INDIAN MUSLIMS میں نمایاں طور پر شارٹ کیا ہے۔
لیکن ۱۹۴۴ء میں قلعہ احمد نگر میں حراست کے دوران پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب
تلاش ہند" DISCOVERY OF INDIA" میں علامہ اقبال اور تحریک پاکستان کے بارے میں
انکشاف کیا کہ اقبال تقسیم ہند کے موئد نہیں رہے تھے۔ چنانچہ

چنانچہ وہ رقمطراز ہیں۔

The Hindu and Sikh delegates at the Round table Conference had been perturbed by the report they had received in London of the speech of the Punjab poet Sir Mohammed Iqbal to the Annu[al] Session of the Muslim league in 1930 - Iqbal's address turned out to be the forerunner of the Idea of Pakistan - He had said 'The Muslim demand for the creation of a Muslim India within India is therefore perfectly just ..... I would like to see the Punjab, the North-West Frontier province Sind and Baluchistan amalgamated into a single State"

(INDIAN MUSLIMS: RAMLAL P.P 230-231

جواہر لال نہرو لکھتے ہیں

Iqbal was one of the early advocates of Pakistan and yet he appears to have

absurdity - Edward Thompson has written that in the course of conversation, Iqbal had told him that he had advocated pakistan because of his position as president of the Muslim league session, but he felt sure that it would be injurious to India as a whole and to Muslims specially - probably he had changed his mind, or he had not given much thought to the question previously as it has assumed not importance then - His whole out look on life does not fit in with the subsequent developments of the Idea of pakistan or division of India -" [DISCOVERY OF INDIA - P.P - 354-55]

مسٹر رام لال اور پنڈت نہرو کی ان متضاد شہادتوں کو غیر صحیح سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی - لیکن شہادتوں سے نتیجہ اخذ کرنے میں ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے عجلت سے اندیشہ ہے کہ ہم اقبال کو تضاد کا انبار سمجھنے لگیں جو یقیناً ان کی عظمت کے لئے کوئی خوش آئند چیز نہیں

راقم الحروف کی نگاہ میں ان دو شہادتوں کی موجودگی میں اقبال کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک ایسے Visionary کی تصویر ہے جس نے اپنے خواب کی تعبیر کا پورا پورا احاطہ کر لیا ہو - یہ بظاہر تضاد دراصل تضاد نہیں بلکہ ان کی ہمہ گیریت کا ثبوت ہے - ان کی ذہانت یکطرفہ Lop-Sided نہیں تھی بلکہ کمالِ آگہی کی اس اعلیٰ سطح پر پہنچ چکی تھی جہاں تصویر کے دونوں رخ یکساں طور پر نمایاں رہتے ہیں۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے لیے جہاں انکی نظر میں پاکستان ناگزیر دکھائی دے رہا تھا تو وہیں مسلم اقلیتی علاقوں کے لئے آزمائش اور

اور ابتلا کا پیش خیمہ ۔

پھر پاکستان کے حصول میں جو ذہنی اور روحانی انقلاب مضمر تھا اقبال کی ژرف بیں نگاہیں اُسے بھی اچھی طرح دیکھ رہی تھیں اور انہیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ مسلمان دینی اور روحانی طور پر ابھی اس سطح سے کہیں نیچے تھے جہاں "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" پر پوری طرح منطبق ہو سکے چنانچہ قیام پاکستان کے فوری بعد پیش آنے والے واقعات نے اقبال کے اندیشوں کو برحق ثابت کر دیا ۔ پاکستانی مسلمانوں نے خود میں اسلامی صفات پیدا کئے بغیر گویا اپنے خطۂ خاک کو احرام باندھ دیا تھا ۔ ورنہ غیر اسلامی طور طریق کی وہی بہتات جو پہلے تھی، اب بھی موجود رہی گویا ساری قوم سارقِ دولت دین تھی ۔ اسی لئے شرعی حد بھی جاری ہوئی اور دست چپ یعنی ہنگال کو کاٹ کر الگ کر دیا گیا ۔ اقبال تقسیم کے بارے میں اگر متذبذب ہو گئے تھے تو اسی وجہ سے کہ مردانِ مومن کے ظہور سے قبل یہ سیاسی انقلاب وجود میں آنے کے لئے بے تاب تھا ۔

اقبال کا کلام یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ پاکستان ہو کہ ہندوستان، مسلمانوں کے تعلق سے ہر دو جگہ کے مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے ایک کامل مسلمان ۔ مرد مومن جو انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر کا نمائندہ ہوتا ہے لیکن مسلم اکثریتی علاقوں اور مسلم اقلیتی علاقوں کے لئے ان کے Symbols علاحدہ علاحدہ ہیں مسلم اکثریتی علاقے کے لئے ان کا symbol شاہین ہے تو مسلم اقلیتی علاقوں کے لئے چاہے وہ ہندوستان میں ہو یا کسی اور جگہ ـــــ ان کا symbol جگنو ہے ۔ اس بنیادی بات کو سامنے رکھ کر ہم اس پیام کی تشکیل بآسانی کر سکتے ہیں جو اقبال آج کی مسلم اقلیت کو دے سکتے تھے ۔

ہندوستان ایک آزاد جمہوریہ ہے ۔ ایک ایسی Secular یا دہریتی جمہوریت جس میں کسی مذہب کو سرکاری مذہب کا درجہ حاصل نہیں ۔ لہٰذا ہندوستان میں پائے جانے والے تمام مذاہب چاہے ان کا تعلق اسی سرزمین سے ہو یا نہ ہو، ایک ہی درجہ رکھتے ہیں ۔ خواہ وہ ہندو مت ہو یا جین مت، بدھ مت ہو یا سکھ ازم، پارسی مذہب ہو یا عیسائیت اور اسلام دستورِ ہند کی نگاہوں میں یکساں حیثیت کے حامل ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ پیرووں کی کثرت کے باعث کسی مذہب کو کوئی سیاسی یا معاشی فائدہ حاصل ہو جائے ۔ لیکن یہ افادہ شمار کا افادہ ہے وقار کا افادہ نہیں ۔

لام جیسا کہ واضح ہے اقلیت کا مذہب ہے - چنانچہ سید عابد حسین اپنی مشہور کتاب
"ہندوستانی مسلمانوں کا نوشتۂ تقدیر" The Destiny of Indian Mu
قمطراز ہیں کہ مسلمان ایک Political Minority یا سیاسی اقلیت بھی ہیں اور
اقلیت Cultural Minority بھی۔ اس تاریخی جبریت سے روگردانی ممکن نہیں
دوسری طرف یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ دہریتی قومی حکومت Secular
National کے باعث نہ کوئی آقا ہے اور نہ کوئی غلام ــــ مسلمان بھی بہ حیثیت
یکساں حقوق رکھتے ہیں ۔ اس صورت حال کی موجودگی میں کسی تحریک آزادی
Separation Move کی بھی نہ کوئی گنجائش ہے نہ جواز ۔
اس شکنجہ میں مسلم اقلیت کا کیا کردار ہونا چاہیے؟ اگر ہم اقبال کے کلام میں اس اہم سوال
تلاش کریں تو کچھ مضمرات نمایاں ہوتے نظر آتے ہیں ۔
اقبال کے نقطہ نظر سے تمام ہندوستانی دو زمروں میں منقسم نظر آتے ہیں ۔ مسلم اور غیر مسلم
ــــ اقلیت میں ہونے کے باعث ــــ جگنو کے Symbol کے سزاوار ٹھہرتے ہیں تو
لم "پروانے" کے حقدار ۔
پروانہ ایک پتنگا، جگنو بھی ایک پتنگا ۔ وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا
بھنا غیر ضروری ہے کہ جگنو کی یہ "روشنی" ایمان اور اسلام کی روشنی ہے ۔
جگنو کی حیثیت سے مسلم اقلیت کا سب سے اہم فریضہ ایک "درد مشترک" کا احساس ہے
رحیات میں آج اجنبیت alienation مسابقت' Competition
مادہ پرستی Vested Interest کا جو بھیانک اندھیرا ہر نیم روز سے ٹپک ٹپک کر
اجا رہا ہے اس کا اتنا عمیق ادراک کرنا جو اسے بے اختیار یہ کہنے پر اکسا دے

اللہ نے دی ہے مجھکو مشعل چمکا کے مجھے دیا بنایا
کیا غم ہے جو راہ ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کرونگا

جگنو کا یہ Symbol آج کی مسلم اقلیت کے لیئے شاہین سے زیادہ معنی خیز
ہے کیونکہ اسے "شب کی سلطنت" Secular Government میں دن کا سفیر بننا
- جہاں دوسروں کے حوالے سے اس پر "راہ میں روشنی" کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے
خود اپنی ذات کے تعلق سے اس پر یہ ذمہ داری بھی ہوتی ہے کہ وہ سے

نکلا کبھی گھن سے آیا کبھی گھن میں ، کی متلون کیفیت سے نکل کر اپنی روشنی کو زیادہ مستحکم اور زیادہ استوار بنائے

اس مقصد کے حصول کے لئے ایک سہ رخی عمل کی ضرورت ہے

۱۔ ملی اتحاد ۲۔ اسلام سے عملی عقیدت ۳۔ اسلامی اداروں سے گہری وابستگی

اس عمل کو متحرک بنانے کے لئے آج خود مسلمانوں میں اسلام کی تبلیغ ضروری ہے۔ تبلیغ کی جگہ نشاۃ ثانیہ یا تجدید کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا تھا لیکن مسلمان آج اسلام سے کچھ اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ اس کے لئے تبلیغ کا لفظ ہی موزوں دکھائی دیتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال معنکہ کا نہیں آہ و بکا کا متقاضی ہے۔

مسلمان آج گویا " ایک زندہ کفن پوش " بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں اقبال کہتے ہیں۔

ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں یا چاک کریں مرد کِ ناداں کے کفن کو

اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ تبلیغ ــــ خود مسلمانوں میں تبلیغ ــــ کے ذریعہ مسلمان کے قلب و نگاہ کو جو ظاہر بینی اور اسباب پرستی کا کفن پہن چکے ہیں " ظاہر " کی غلامی سے آزاد کرالیا جائے ــــ تبلیغ کے ذریعہ ایمان بالغیب کو تازہ کیا جائے۔ آج بظاہر ستودہ صفت مسلمانوں کا بھی حال یہ ہے۔

دل ہے مسلماں تیرا نہ میرا تو بھی نمازی میں بھی نمازی

نماز مسلم اور کافر میں حد فاصل کا امتیاز رکھتی ہے لیکن سچا ایمان بالغیب ہی نماز کو اصل نماز بنا سکتا ہے۔ بلکہ تمام شعائر اسلام کو ان کی اصلی حیثیت عطا کر سکتا ہے ورنہ حال یہ ہے۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

لہٰذا ایمان بالغیب کی زیادہ سے زیادہ آبیاری کی ضروری ہے۔ توحید کو ایک concept یا تصور کے طور پر قبول کرنے کی بجائے ایک زندہ قوت Live Force بنانے کی ضرورت ہے۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟ خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟

مسلمان کا ایک ہی جواب ہے خدائے واحد و یکتا ۔ لیکن یہ منطقی جواب ہی کافی نہیں منطق اور فکر سے ماورا اس جواب کو مسلمانوں کے رگ و ریشے میں اس طرح پیوست ہو جانا چاہیے کہ وہ ملت کے لیے کیف و سرور اور مستی کا رنگ اختیار کرے تو غیروں کے لیے بھی اسکی چھوٹ اندھیروں کو کاٹتی محسوس ہو سے

ملتے چوں می شود توحید مست قوت و جبروت می آید بہ دست

مختصراً یہ کہ توحید کا مسئلہ علم الکلام کی بجائے حیاتِ مسلم کا ذاتی احتشام بن جانا چاہیے جس کے لئے نہ حکومت کی قید ہے نہ اکثریت کی

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللّٰہ

آج کی مسلم اقلیتوں کو اسلام کے دورِ اولین کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ مکی اور اولین مدنی دور کو ۔ مکی دور سراسر ایمان کی پیدائش اور پرورش سے عبارت ہے تو اولین مدنی دور مسلموں کے ساتھ معاہداتی زندگی کا آئینہ دار ۔ مکی دور میں کارِ جہانبانی کا بوجھ نہ تھا۔ صرف جہدِ روحانی کا دور دورہ تھا۔ زمانے کا شکوہ کرنے کی بجائے مسلمانوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ اسی ناسازگار زمانے کے باعث انہیں دولت توحید کو جو محض وراثتاً حاصل ہوئی ہے ذاتی جوہر بنانے کا موقع مل رہا ہے ۔ اس تب و تاب کو جگانے سے ہی خس و خاشاک سے رہائی ممکن ہے ۔ اس تب و تاب کو پانے کے لئے اقبال کا مشورہ ہے ۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

برائی سے بھلائی کا پہلو نکالنا اور "افتاد" کو عصا بنا لینے کی یہ خو، قومِ رسولِ ہاشمی کا سب سے بڑی خصوصیت ہے ۔

لیکن اس جوہر کو تربیت خلا میں نہیں ہوتی ۔ اس کی پرداخت اور پرورش کے لئے مخصوص اداروں اور روایات کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ ادارے ناپید کبھی نہیں ۔ یہ ادارے ہیں مسجد، مکتب اور خانقاہ ۔

دورِ غلامی میں ان اداروں کی عظمت میں کمی اور انحطاط ضرور واقع ہوا حتی کہ

مسجد جیسے الوہی مقام کا یہ حال ہوا تھا۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

اور مسلمانوں کو اس کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ آج جب ملک ایک متلاطم سمندر کی کیفیت پیش کر رہا ہے موجوں کی اس کشاکش میں "برگ گل" کو سفینہ بنا لینا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اسی لئے موجود Recognised اور Established اسلامی اداروں سے منحرف ہونے کے بجائے انہیں پوری طرح اپنا کر اُن خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے - جو ان اداروں میں در آئی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اقبال کو کہنا پڑا تھا۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اب اس صورت حال کو بدلنا چاہیے - کیونکہ سرکاری مدارس دینی تعلیم کی ذمہ داری نہیں لیتے اور تہذیبی اور تاریخی ورثہ کے پردے میں صنمیات Mythology کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ یہ صورتحال مسلمان بچوں کے لئے کافی پریشان خیالی کا باعث ہو رہی ہے۔ اس لئے ہندوستان کی مسلم اقلیت کا یہ فرض اولین ہونا چاہیے کہ وہ دستور میں دی گئی ضمانت سے فائدہ اٹھا کر اپنے نونہالوں کو ایک ایسی روحانی اساس فراہم کر دے جس سے ان کے کردار کی تعمیر توحید کے خطوط پر ہو سکے۔ اقبال کہتے ہیں۔

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا ہے خونِ فاسد کیلئے تعلیم مثلِ نیشتر

یہ تعلیم وہ تدریس نہیں جو سرکاری مدارس میں دی جا رہی ہے۔ سرکاری مدارس کی تدریس حصولِ معاش کے لئے ضروری سہی عاقبت کے بارے میں بالکل گونگی ہے۔ اقبال نے اس کا صحیح تجزیہ اس طرح کیا ہے۔

شیدائیِ غائب نہ رہ، دیوانۂ موجود ہو غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر

اس زہر کا تریاق مکتب و خانقاہ کی تجدید ہے۔ لیکن موزوں خطوط پر، آج کے مدارس کی تابانی میں انداز کہن بھی نو بھی ہے۔ تاکہ مسلم نونہال توحید پرست، خوددار اور بے نیاز بن کر نکلیں چنانچہ England میں بھی اب ایسے اسکول ہیں جہاں سائنسی علوم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جا رہی ہے تو ہندوستان کی بعض خانقاہوں میں فنی Technical تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ لیکن ان کوششوں میں "تحریک" Movement کی سی روح نہیں۔ اس کی وجہ غلط کاری اور بے اعتمادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ ایک عام احساس ہے کہ اقبال خانقاہ کے بہ حیثیت ایک ادارے کے انتہائی مخالف
یہ تاثر ان کے جوش بیان کی وجہ سے پیدا ہوا ہے ۔ ایک "سفاک مسیحا" کی طرح انہوں نے
خانقاہ میں در آنے والے امراض پر نشتر زنی کی ہے ۔ بالکل اسی طرح جس طرح انہوں نے مکتب
کے جامد اور وقت سے بے خبر نصاب پر عمل جراحی کیا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ
مکتب اور خانقاہ دونوں اداروں کے دشمن تھے ۔ صحیح نہیں ۔ مرشد رومیؒ، حضرت مجدد الفؒ
اور محبوب الٰہیؒ کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے اور بایزید بسطامی سے خوشہ چینی کرنے والے
شاعر کو اس ادارہ کا دشمن قرار دینا جہاں ان جواہر پاروں کی تربیت ہوئی تھی ۔ محل نظر ہے اقبال
خانقاہ کی انفرادی برائیوں کے ضرور دشمن ہیں ۔ دوسروں کو ترک دنیا کی تعلیم دے کر نذرانوں کے
ذریعہ حصول دنیا کی کاوشوں نے انہیں خانقاہ سے نا امید کر دیا تھا اور وہ انتہائی کرب سے
چیخ اٹھے تھے ۔ خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے ؟
خانقاہی نظام گدی نشینی کے رزم آرائیوں کا چکر بن گیا ہے ۔ خانقاہ جس روحانی قدر کا
تقاضا کرتی تھی وہ کہیں باقی نہ رہا تھا ۔ "سود خوار و والی و ملا و پیر" ایک ہی صف میں کھڑے
عوام کا استحصال کرتے نظر آتے تھے اور اس استحصال کو تیز تر کرنے کے لئے "رہبانیت" اور
عیسائی تصور کی کافی اشاعت ہو رہی تھی ۔ اسی لئے اقبال کو کہنا پڑا تھا ۔
ہیں زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن " اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ
وہ خانقاہ کو عقابوں کا نشیمن سمجھتے تھے اور بہ حیثیت ایک اسلامی ادارے کے اس کے
مخالف نہ تھے ۔ ان کی ساری شکایات کا حاصل تھا ۔
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن
ایسی خانقاہوں سے اقبال تو کیا خود مریدان خانقاہ بھی خوش نہیں تھے ان کو یہ احساس
ہو چلا تھا

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی ۔۔۔ گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

اپنے تجزیے سے اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد کہ

رہا نہ صوفی میں سوز مشتاقی ۔۔۔ فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

تھا جہاں مدرسہ شیری و شہنشاہی ۔۔۔ آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی

انہوں نے بہ بانگ دہل یہ مشورہ دیا تھا ۔ "اے پیر حرم رسم و رہ خانقاہی چھوڑ" اور

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

رسم شبیری کی پہلی شرط حق گوئی و بے باکی ہے۔ رہبانیت کی بجائے تسخیر کائنات کا عزم دنیا کو اصل معنوں میں وہی چھوڑ سکتا ہے جس نے پہلے دنیا کو اپنے قابو میں کر لیا ہو۔ ورنہ انگور کھٹے ہیں کہنا تصوف نہیں۔ اصل چیز "فقر غیور" ہے اور اس کی تربیت صرف اور صرف خانقاہ ہی میں ممکن ہے کیونکہ خانقاہ کردار سازی کا ہمہ وقتی ادارہ ہوتی ہے۔

آج کے حالات اس بات کا تقاضہ کر رہے ہیں کہ خانقاہ میں ایک نئی روح پھونکی جائے۔ مسلمان ترقی پسندی کے سبب سے یا خانقاہ کی موجودہ کوتاہیوں کے باعث اس ادارے کو تلف نہ کردیں ورنہ جس طرح مصطفیٰ کمال نے خلافت کی بیخ کنی سے دنیائے اسلام کی مرکزیت کو تہہ گور کر دیا اسی طرح خانقاہ سے دستبرداری بھی ہمارے حق میں مضر ہوگی۔

اس کی بجائے اس اسلامی ادارے کو جو قانونی، دستوری، اور روایاتی مراعات سے مزین ہے برقرار رکھ کر اس کی تشکیل نو اور اصلاح کی جائے۔ اس ادارے کو پھر مفید اور فعال بنایا جائے خانقاہ رزم حیات سے پسپا ہو کر پناہ لینے کا ایک مقام یا ایک Retreat نہ رہے اور نہ زندگی سے فرار کا وسیلہ بنے۔ اسے کردار سازی کی اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر لینا چاہیے۔ اسے ایک ایسی روحانی تربیت گاہ بن جانا چاہیے جہاں جوانوں کو خارا شگافی اور خارہ گذاری سکھائی جاتی ہے۔ جہاں ان کی پریشان نظری اور ژولیدہ خیالی کا علاج کیا جاتا ہو سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ایمان اور ایقان کے جوہر کو اور تاباں کیا جاتا ہو کیونکہ غلامی سے بتر ہے بے یقینی۔ آج کے حالات میں خانقاہوں کو روحانی اور فنی دونوں طرح کی تربیت کا مقام یعنے ورکشاپ Workshop Seminary بن جانا چاہیے

اداروں کو ترک کرنے کی بجائے اصلاح اور ترمیم ہی ایک اثباتی عمل ہے اس اثباتی عمل سے پہلو تہی نہ صرف غلط ہے بلکہ انتہائی مہلک بھی۔

ملی۔ اتحاد اسلام سے عملی عقیدت اور اسلامی اداروں سے والہانہ وابستگی، ان شرائط کو پورا کرنا ہمارا فرض اولین ہونا چاہیے۔ اب رہے حوادث اور سانحات زمانہ تو اقبال کا کہنا ہے۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے — وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

حفاظت اور مدافعت کا فطری قانون مسلمانوں کے لئے بھی ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ
دانت کے بدلے دانت متعلقہ اصول کے باوجود مسلمانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بازو سے
بیدردلی انتقام پر عفو کو ترجیح دیتا ہے۔ قرآن میں قتل سے بڑھکر فساد اور فتنہ کو برا ٹھہرایا
گیا ہے۔ اس وسیع النظری اور راست روی کے ساتھ مسلمانوں کو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے
کا خوگر لینی چاہیے۔

خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

اقبال تسلی دیتے ہوئے یاد دلاتے ہیں۔

"ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

جب فراست مومن حاصل ہو جائے تو یہی حل مشکلات بھی ہوتی ہے۔

مردانِ کار ڈھونڈھ کے اسباب حادثات — کرتے ہیں چارۂ ستم چرخ لاجورد

یہ چارہ panacea اور علاج کامل اقبال کی رائے میں یہ ہے کہ

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو — ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

حصارِ دیں میں داخل ہونے کا واحد طریقہ مشیت ایزدی پر یقین کامل اور سنت محمدیؐ پر
عمل پیہم ہے۔ ہندی مسلمانوں اور تمام مسلم اقلیتوں کے لئے آج اقبال کا سب سے بڑا پیام قضائے
الٰہی کو اپنی رضا بنالینا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی — کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا

یہاں اس باریک لیکن اہم ترین فرق کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ تقدیر کی پابندی اور تقدیر پر
اعتماد دو علحدہ چیزیں ہیں اقبال نے اس فرق کو واضح کرنے کے لئے کہدیا ہے۔

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

تقدیر کی پابندی انسان کو بے عمل بنا کر چھوڑ دیتی ہے جبکہ تقدیر پر اعتماد عمل کے لئے مہیز
کا کام انجام دیتا ہے اور انسان کو سعی سے محروم نہیں کرتا چنانچہ اقبال کہتے ہیں

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے — جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک

اور یہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں۔

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں — ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

تقدیر پر اعتماد کا طریقہ اقبال ان الفاظ میں سکھاتے ہیں

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

"لا یخلف المیعاد" گویا سبق تقدیر پر اعتماد اور استغنا کا سبق ہے ۔ اسی لئے اقبال نے کہا تھا۔

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

یہاں استغنا اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے یہ استغنا تقدیر پر پختہ یقین ہی کے باعث حاصل ہوتا ہے ۔ اسی استغنا کا کرشمہ ہے کہ "مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو تصوف کا بھی ایک اعلیٰ مقام ہے جسے "مقام تفویض" کہتے ہیں ۔ دوسری طرف اسی استغنا کے باعث شکوہ سنجی کی قبیح عادت پیدا نہیں ہو پاتی ۔ شکوہ سنجی دراصل Self pity [illegible] کی ایک شکل ہے جو شخصیت کو گھلا کر رکھ دیتی ہے ۔ اسی لئے سارے ماہرین نفسیات اسے ایک مہلک ترین مرض قرار دیتے ہیں ۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں"

"اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر گردش دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ

زبان پر گلہ نہ لانے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انسان اپنے آپ کو ذرہ بے مقدار سمجھنے لگے یا کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے ۔ اقبال اس کا بھی ازالہ کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں ۔

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

محرومی اور کشاکش کو آزمائش سمجھ کر ثابت قدم رہنا ہی ایمان کی دلیل ہے مسلم اقلیت کو یہ سمجھ لینا چاہیے ۔ سہ

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

اس لئے ناسازگار حالات سے بالکل ہراساں نہیں ہونا چاہیے ۔

رفیقش گفت اے یار خرد مند اگر خواہی حیات اندر خطر زی

دمادم خویشتن را بر فساں زن ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی

چونکہ "خطر تاب و تواں را امتحاں است عیار ممکنات جسم و جاں ہست

اس کسوٹی سے بچنا ممکن ہی نہیں ۔ بلکہ اقبال تو یہ کہتے ہیں کہ خطرات اور حوادث سے عاری

زندگی زندگی نہیں افتادگی ہے۔ کاروزار حیات کے نشیب و فراز سے معروف پیکار رہنا ہی زندگی کو زندگی بناتا ہے۔ الذین قتلوا اللہ کو لطف حیات عطا کرتا ہے حیات کی انتہائی صورت موت ہے جس کا یہ احوال ہے کہ "موت کا ایک دن معین ہے" جب تک وہ دن نہ آئے اس وقت تک قضا خود انسان کی محافظ بنتی رہتی ہے۔ پھر عاقبت پر یقین رکھنے والے مسلمان لے لئے موت آخری منزل نہیں یہ تو بس ماندگی کا وقفہ ہے ع

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر ۔۔۔ کیا ہوا اگر گلشن ہستی میں، مانند نسیم ارزاں ہے موت کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت ۔ دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

موت سے فرار کا کوئی امکان ہی نہیں اس لئے مسلمان کو یہ ایمان رکھنا چاہیے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظام کائنات

قرون اولی کے مسلمان یہ راز جان چکے تھے اسی لئے اقبال تصدیق کرتے ہیں کہ انہیں موت کا نہیں خدا کا ڈر تھا ۔ آج کے مسلمانوں کو بھی یہی احساس بلکہ یقین پیدا کر لینا چاہیے اور اس کا طریقہ وہی لا یخلف المیعاد ہے ۔ جس سے مسلمان کے دل کو "ان وعد اللہ حق" کا اطمینان حاصل ہوتا ہے پر خطر زندگی سے مسلمان کو یہ احساس ہوتا ہے ۔

زمانہ برا فروخت آتش نمرود   کہ آشکار شود جوہر مسلمانی

اس جوہر مسلمانی کی چمک اجتماعیت سے اور زیادہ نکھر آتی ہے ۔ اسی لئے تو اسلام کی شریعت میں نماز با جماعت کو انفرادی نماز پر کئی گنا فضیلت حاصل ہے ۔ اسی لئے اقبال ملت سے رابطہ استوار رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

نہ رہ اپنوں سے بے پرواہ اسی میں خیر ہے تیری   اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا مبہاں دکھا دے کے قریب فراق انگیز کی کوئی قیمت نہیں

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے   مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق   کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

اس جذب اندروں کے پیدا کرنے کے لئے جو نسخہ کیمیا ہے وہ ہے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا اسوہ حسنہ ۔ اسی پر چلکر ایک مسلمان خاکی رہتے ہوئے بھی نوری نہاد ہو جاتا ہے

جہاں دل بے نیاز ہو جانے Vested Interest یا مفاد وابستگی ہو شکراؤ، تشتّت اور افتراق کا سب سے بڑا سبب ہے بار نہیں پا سکتی اور مسلمان ایک کامل مردِ مومن بن جاتا ہے جس کی تصویر اقبال نے یوں کھینچی ہے ۔

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دلفریب اس کی نگاہ دل نواز

اس منصب کے حصول کے لئے سب سے ضروری شرط " سادہ زندگی" ہے غازۂ رنگ تکلف سے پاک وہ نانِ جویں جو خوشامد، تملق اور ذہنی غلامی سے دور رہ کر حاصل کی جائے مسلمان کو دلِ حیدر عطا کر دیتی ہے" ندرِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی "یہی تو مسلمان کا زیور ہیں مسلمان اقلیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آج سادہ زندگی محض ایک اخلاقی نیکی ہی نہیں بلکہ ایک ملی ضرورت ہے ۔ جاہ پرستی اور اسراف انفرادی جرم وگناہ ہی نہیں اقدام خودکشی کی طرح بد عمل ہے آج کفایت شعاری اور جفاکشی اخلاقیات کا ایک مستحسن اصول ہی نہیں آج کے حالات میں یہی بقا کی حکمت عملی Strategy of Survival ہے ۔ اسراف سے پاک سادہ اور جفاکش زندگی جو اخوت اور اتحاد سے سرشار ہو مسلمان کی رگ و پے میں ایک ایسا لچک پیدا کر دیتی ہے جس سے بقول اقبال

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہر کہیں ہے ۔

سادہ زندگی میں حرص و ہوس، اسراف و جاہ پرستی اور نمود و نمائش کی اندھی دوڑ کا امکان نہیں رہتا ورنہ نمود و نمائش اور حصولِ جاہ و اقتدار کی یہ تگ و دو تو ایسی ہوتی ہے اس میں پھنسا ہوا انسان، اقبال کے الفاظ میں' سطرِ قرآں کو بھی چلیپا کر دیتا ہے اور بت پندار کو اپنا خدا بنا لیتا ہے ۔ اور جب بت پندار کی پرستش کرنے لگے تو وہ باطنی طور پر مسلمان ہی باقی نہیں رہتا بلکہ مسلم کے درجے سے گر جاتا ہے ۔ یہی اس کا زوال ہے ۔ زوال بندۂ کا بے زری سے نہیں وہ تو غریبی میں نگہبانی خودی کا عادی ہوتا ہے ایسی نگہبانی کہ جس باعث ہے منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

جب ایسا مومن پیدا ہو جاتا ہے جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار ہو تو پھر اغیار کے سامنے پر شور تبلیغ کی حاجت تک نہیں پڑتی ۔ مستیٔ کردار سے محروم مسلمان کی گرمیٔ گفتار بے سود رہتی ہے ۔ اسی لئے جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال تبلیغ کی سعی سے پہلے تعمیرِ

لو ضروری قرار دیتے ہیں۔ کردار کا سایہ گفتار کی بجلی سے زیادہ پر اثر رہتا ہے گرمئ گفتار سے فہم و فراست کو لاجواب تو کیا جاسکتا ہے قلب و روح کو نہیں جیتا جاسکتا۔ مستی کردار جب تک جلوہ فرما نہ ہو تبلیغ کی زبانی کاوش مفید بھی نہیں۔ مستی کردار پیدا ہو جائے تو پھر دانش گفتار کے بغیر اغیار کی تالیف قلب ہوتی ہی رہے گی۔ اس مستی کردار کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سمندر اس کوزہ میں بند نظر آتا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

اس پس منظر میں اسلام کا محض ایک عددی اقلیت کا مذہب ہونا، اسلام کی ترویج میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ مستی کردار رکھنے والا مسلمان جوہر آئینہ ایام ہوتا ہے اور یہی زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے یہ اور بات ہے کہ ابھی ؎

خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام ۔ اگر وہ اپنے مقام سے آگاہ ہوجائے تو یہی آگہی صحیح انقلاب بن جائے گی اقبال اسی لئے یاد دلاتے ہیں

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا
جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

اس پیام کی صورت گری ایک یقینی بات ہے۔

عارضی ہے شانِ حاضر سطوتِ غائب مدام
اس صداقت کو محبت سے ہے ربطِ باطن تیاق

اقبال کا جاوداں پیام۔ یہی ہے ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

صرف مسلمان کا مسلمان بن لینا ضروری ہے۔

ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

عابد صدیقی

اقبال کی شاعری میں
حب الوطنی اور ہندی تہذیب

اقبال مادرِ ہند کے عظیم المرتبت شاعر تھے ان کی شاعری اور فلسفیانہ تصورات میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کے عناصر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اپنے وطن کے ذرہ ذرہ سے انہوں نے بے پناہ محبت کی ہے اس کا ثبوت، ان کی شاعری اور افکار سے ملتا ہے۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے اور اقبال کے نزدیک یہ ایک شریفانہ انسانی جذبہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وطن سے ان کی وابستگی ہر دور میں قائم رہی چنانچہ زندگی کے آخری ایام میں بھی وطن کی محبت نے انہیں غافل نہیں رکھا چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ " ہم سب ہند کے ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم کرہ ارض کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت کرتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں ہے"

اقبال کو اپنے وطن عزیز سے ایک سچے محب وطن کی طرح پیار تھا ان کے ہاں وطن اور متوطن کی حیثیت زمین اور درخت کی نہیں تھی کیونکہ درخت زمین میں پیوست رہتا ہے اور زمین کا ہو کر رہتا ہے اقبال کے نزدیک وطن اور اس کے باشندے کی حیثیت مشرق اور آفتاب کی ہے آفتاب مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ اس کو مشرق سے ربط و نسبت ہے یعنی مشرق اس کا وطن ہوا لیکن وہ اپنے وطن کا ہو کر نہیں رہتا بلکہ افق در افق ساری دنیا میں نور پھیلاتا ہے۔ اس بات سے واضح ہوا کہ اقبال کی وطنیت ان کے آفاقی تصور کی منافی نہیں

پریس انفارمیشن بیورو۔ گورنمنٹ آف آندھرا۔ حیدرآباد

بلکہ اس کی توسیع شدہ صورت تھی اکثر یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ اقبال بعد میں وطنیت کے خلاف ہو گئے تھے ایسا نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ان کی وطن پرستی پر شبہ کیا جا سکتا ہے جواہر لال نہرو کی وطن پرستی ہر طرح کے شبہ سے بالاتر ہے لیکن انہوں نے بین الاقوامیت کے جذبہ کو بڑھاوا دینے کے سلسلہ میں جو نمایاں کارنامے انجام دیئے - کیا اس سے وطن پرستی پر کوئی حرف آسکتا ہے - ؟

سنہ ۱۹۰۵ء میں ابھی کانگریس کے سرکردہ قائدین قومی تحریک کا پرچار کر رہے تھے جب کہ اقبال کے قومی تصورات کی روشنی پہلے ہی ملک بھر میں پھیل چکی تھی - یہ دور ان کا وطن سے ان کی شدید وابستگی کا آئینہ دار ہے انہوں نے حب الوطنی اور قومی اتحاد و یکجہتی کے تصورات انتہائی موثر اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا جس سے ہر ذی شعور ہندوستانی کے دل میں وطن سے محبت کے ایک شدید جذبہ کی کسک جاگ اٹھتی ہے اس طرح اقبال کو ہندوستان کی آزادی اور آبرو کا اتنا ہی خیال تھا جتنا کہ اتحاد کے بڑے بڑے علمبرداروں کو مسلمانوں کو بیدار کرنے کا انہیں غیرت دلانے اور خودی کا جام پلانے میں اقبال کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی اور اپنے دیس والوں کی فکر میں ہندوستان کو آزاد کرائیں -

ان کی مشہور نظمیں " ہمالہ " پرندے کی فریاد ، نیا شوالہ ' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت صدائے درد ' ترانہ ہندی اور تصویر درد اسی عہد کی دین ہیں

انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام " بانگ درا کا آغاز " ہمالہ " سے کیا ہے - ہمالہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کی عظمت اور بزرگی کی علامت ہے یہ عظیم سلسلہ اپنے کوہ ہمالہ کی شاندار روایتوں تہذیبی قدروں اور عظمت رفتہ کا امین ہے - آسمان کو چھوتی ہوئی روحانیت ہمالیہ کے روپ میں اس کی عظمت کے نقوش کو مرتسم کرتی ہے

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اقبال نے ہمالہ کو کوہ سینا سے برتر موقف دیا ہے وہ کہتے ہیں :-

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

ایک اور شعر میں انہوں نے ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کو متعین کیا ہے ؎

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو

اس ہند کے ایک اور شعر میں اقبال ہمالیہ کی چوٹیوں پر جمی برف کو دستارِ فضیلت سے پرکستے ہیں جو ایک طرح سے مادرِ وطن کی قدیم علمی فضیلت کا اعتراف ہے۔ انہوں نے ہمالیہ کے ذریعہ ہندوستان کی قدیم تہذیبی و تاریخی قدروں، روحانی عظمت اور قدامت پسندی کو اپنے مخصوص شاعرانہ لب و لہجہ میں سمجھانے کی کوشش کی ہے ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط جمایا اور سارا ملک غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں سسکنے لگا تھا ایسے وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ اس تسلط اور ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی جائے اور جذبۂ آزادی ہر دل کی دھڑکن بن جائے چنانچہ اقبال نے بھی آزادی کا خواب دیکھا تھا۔ غلامی سے نفرت اور آزادی کی ایک بے چین آرزو نے ان سے پرندے کی فریاد لکھوائی جس میں آزادی کے اسی شدید جذبے کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ پرندے کی تمثیل کے ذریعہ اقبال ایک محکوم قوم کی حالتِ زار بیان کر رہے ہیں جسے ظالم صیاد یعنی انگریزوں نے آزادی کی نعمت سے محروم کر دیا ہے۔ پھر وہ ان آزاد قوموں سے اپنا مقابلہ کرتے ہیں جو آزادی کی لذتوں سے بہرہ ور ہیں۔ اس نظم میں ALLEGORY کا رنگ موجود ہے لیکن غلامی و آزادی کا ایک واضح تصور بھی ابھرتا ہے۔ ہندوستانی قوم کے احساسات کو پرندہ کی زبان دی گئی ہے ان کی یہ نظم بڑی حد تک تحریکِ آزادی کے اس ابتدائی دور کی عکاسی کرتی ہے جو دعاؤں اور التجاؤں کا دور سمجھا جاتا ہے۔ اقبال کی اس نظم کو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ بڑی خوبصورت نظم ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے ساقی نامہ میں اشاریتی پیرایہ میں ہندوستانی قوم کی بیداری اور آزادی کے حصول کے لئے ان کی جد و جہد کو بیان کیا ہے۔

۱۹۱۹ء میں جلیانوالا باغ کے دردناک مناظر سے اقبال تڑپ اٹھے انہوں نے

ندوستانی عوام کو سامراج کے ہتھکنڈوں اور ظلم و جبر سے خبردار کرتے ہوئے شہیدوں کو منظوم راج عقیدت پیش کیا۔

ہر زائیر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ   غافل نہ ہو جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم   تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

جب گاندھی جی حکیم اجمل خاں وغیرہ جیسی عظیم شخصیتوں نے وطن کی آزادی کے لئے جیل کی صعوبتوں کو برداشت کرنے پر خوشنودی ظاہر کی تو اقبال اس جذبے سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے وطن کے ان عظیم سپوتوں کو اس طرح اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا کہ:

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں فطرت مگر   کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست   ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

اقبال نے اس ملک کے ذرہ ذرہ سے پیار کیا ہے اور جہاں انہیں عظمت و قدرت اور حسن جلیل و حسن جمیل کی پرچھائیاں نظر آئیں وہاں ان کا دل فرطِ مسرت اور وفورِ محبت سے جھوم اٹھا چنانچہ ان کی نظر میں خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا ہے اور ہند کی ہمالیہ اور دل والی بات انہیں یورپ میں بھی نظر آئی۔ اسی طرح جغرافیائی وطنیت کے جذبے کی شدت اور ان کے والہانہ انداز کی کارفرمائی ہمیں ترانۂ ہندی میں ملتی ہے۔ اس ترانہ نے سرفروشانِ آزادی کے حوصلوں کو آہنی طاقت بخشی تھی اور دلوں کو گرمانے کا کام کیا تھا۔ اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں اس درجہ قومی احساس کی حامل نظم نہیں لکھی گئی۔ یہی خصوصیت تھی کہ اقبال کا یہ ترانہ ہماری قومی شاعری کے اعلیٰ ترین نمونوں میں شامل کیا گیا ہے۔ وطن سے اس درجہ عقیدت اور وابستگی کا یہ احساس اقبال کی ہندوستانیت پسندی کا مظہر ہے وہ لکھتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

بلبل کو گلستاں سے جو نسبت ہے وہ کسی توضیح کی محتاج نہیں ہے ہندوستان کے لئے گلستان اور ہندوستانیوں کے لئے بلبل کا استعارہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے اس نظم کا ہر شعر مادرِ ہند سے ان کی گہری اور اٹوٹ نسبت کی عکاسی کرتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یونان اور روم اور مصر کی ساری قدیم تہذیبیں مٹ چکی ہیں لیکن ہندوستانی تہذیب

اور اس کی بلندی کا نام ونشان ابھی تک باقی ہے۔

اقبال ہند کی گنگا جمنی تہذیب کے پرستار تھے انہوں نے مذہب کو ایک عظیم قوت سے موسوم کیا ہے جو اختلافات اور نفاق نہیں بلکہ محبت اور یکجہتی کا درس دیتا ہے۔ ہمارا مذہب خواہ کچھ ہو لیکن یہاں ہماری ہندوستانیت ہمیں ایک دھاگے میں پروئے رکھتی ہے اس لئے ہر شہری کے دل میں یہ احساس جاگزیں رہے کہ ہم ہندی ہیں اور ہمارا وطن ہندوستان ہے۔ اقبال کا یہ شعر سیکولرزم کے تصور کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے کہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا   ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبال نے وطن کی ہر عظمت کو سلام کیا ہے انہوں نے اپنی شاعری میں وطن کے ہر ہر پیکر کو سمو دیا ہے اور پھر ان کی یہ محبت بے وجہ نہیں ہے۔ وہ ایک باشعور انسان ہیں جن کی وابستگیاں جذبات کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس وطن کی وہ خصوصیات اور اعلیٰ قدریں ہیں جو اس وابستگی کی بنیاد بنتی ہیں۔ ہندوستانی بچوں کے قومی گیت میں وطن سے وابستگی کا جواز استدلالی انداز میں مل جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ملک کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آتی ہوئی محسوس کی تھی جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے خدا کا پیغام سنایا تھا اور جس ملک میں گرونانک نے وحدت الٰہی کو عام کیا تھا وہی شاعر کا وطن 'ہندوستان' ہے۔ اس ملک نے دنیا کو اپنے علم و ہنر سے اس قدر فیضیاب کیا کہ یونانی بھی ہندوستان کی علمی برتری پر حیران و ششدر رہ گئے۔ اس نظم میں اقبال نے ہندوستان کی حقیقی تصویر کو شاعرانہ لب و لہجہ عطا کیا ہے اور آخر میں جس خوبی سے انہوں نے اپنے وطن کی محبت وایک مصرعہ میں ظاہر کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی، وہ کہتے ہیں۔

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

اسی طرح نیا شوالہ، صدائے درد اور تصویر درد بھی مادر وطن سے ان کی والہانہ محبت کی مثالیں ہیں جس میں ہندوستانی تمدن کی جھلکیاں اور ہمارے عظیم قومی و مذہبی روایات کی تجلیاں ملتی ہیں اس بیش قیمت تہذیبی ورثہ سے اقبال کی وابستگی ان کے عظمت کردار کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔

اقبال نے ہندوستان کو قومیت اسلام کے لئے فارس و شام پر ترجیح دی ہے۔

اور دہلی کو خانقاہِ عظمت اسلام سے موسوم کیا ہے وہ لکھتے ہیں

سرزمین دلی کی مسجود دلِ غم دیدہ ہے
ذرہ ذرہ میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہِ عظمت اسلام ہے یہ سرزمیں

ہے اگر قومیت اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء کے دوران اقبال یورپ میں مقیم رہے لیکن وطن کی یاد سے بیگانہ نہیں رہے۔ دلی کو یاد کرتے ہیں کہ

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی

دہلی کے علاوہ اقبال نے کشمیر کو بھی اپنا خراجِ تحسین ادا کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

لیکن انہوں نے کشمیر کی غربت اور مفلسی پر آنسو بھی بہائے ہیں۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ کشمیر کی سیاسی زندگی پر اقبال کی شخصیت کا بھی کافی اثر ہو ہے نیشنل کانفرنس کی تشکیل میں اقبال کے مشورے شامل تھے۔

چنانچہ ابتداء میں کشمیر کی سیاسی تنظیم صرف مسلمانوں تک محدود رہی اور اس کا نام مسلم کانفرنس رکھا گیا لیکن اقبال نے شیخ عبداللہ مرحوم کو مشورہ دیا تھا کہ تاوقتیکہ دوسرے طبقے بھی ان کی تحریک سے وابستہ نہ ہو جائیں اس کی کامیابی کے امکانات موہوم ہیں اور اس کے بعد ہی مسلم کانفرنس کا نام تبدیل کر کے نیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ پھر کشمیر کے مسلم عوام نے مل کر جاگیردارانہ نظام اور سامراجیت کی ریشہ دوانیوں کے خلاف آواز اس جدوجہد نے اقبال کے اشعار سے وجدان حاصل کیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں برطانوی وزارتی مشن سے بات چیت کے سلسلہ میں یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ نواب یا راجواڑوں کے بجائے کانفرنس کے نمائندے اس بات چیت میں حصہ لیں گے۔ اس وقت بعض گوشوں اختلاف کیا گیا تھا لیکن عبداللہ کی قیادت میں کانفرنس نے کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ بلند کیا یہ نعرہ دراصل اقبال کے ان اشعار سے اخذ کیا گیا تھا جس میں اقبال نے لیگ آ

سے خطاب کیا تھا ۔

اقبال نے ہندوستانی عوام میں آزادی کی لگن پیدا کی ہندوستانیوں کی جہالت، پسماندگی، محنت سے گریز توہم پرستی، تقلیدی رجحانات اور تنگ نظری انہیں خون کے آنسو رلاتی تھی ۔ انہوں نے اپنی نظم " شعاعِ امید" میں انتہائی ایمائی انداز اختیار کرتے ہوئے ملک کی حقیقی تصویر پیش کی ہے مذہبی قائدین کی غفلت اور فرائض منصبی سے گریز، غرض کئی خامیوں کی اس نظم میں نشاندہی کی گئی ہے ۔

اک شوخ کرن شوخ مثال نگہ حور آرام سے فارغ صفتِ جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

وطن سے عقیدت و محبت کا عالم شدت اختیار کر جاتا ہے اور ان کی نظر میں سرزمین ہند خاور کی امیدوں کا مرکز بن جاتی ہے جس کی مٹی کو وہ اپنے اشکوں سے سیراب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دنیا ہی کو نہیں بلکہ چشم مہ و پروین کو بھی ہندوستان سے روشنی ملتی ہے اس سرزمین سے غواص معانی پیدا ہوئے ہیں جن کی عظمت کی مثال نہیں ملتی ان ہی احساسات کو اقبال نے نظم کا خوبصورت اور لطیف پیرہن دیا ہے ۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی جن کے لئے ہر بحر پرآشوب ہے پایاب

اور آخر میں ہندوستان کی حالت زار بیان کرتے ہیں کہ اتنی عظمت و رفعت کے باوجود ملک کے عوام غفلت اور بے آسودگی کا شکار ہیں ۔

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

مذہبی علماء کا یہ حال ہے کہ انہیں قوم و ملک کی اصلاح کی کوئی فکر دامن گیر نہیں ہے بلکہ ان کی حالت تو یہ ہے کہ

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اقبال نے مرید ہندی کی حیثیت سے خود کو پیش کیا ان کی یہ نسبت دراصل ہندوستان سے تھی اور انہوں نے دیگر نسبتوں کے مقابلے میں اپنے ہندی ہونے کو اہمیت دی بلاشبہ اقبال نے اپنے افکار و نظریات اور جذبہ و احساس کے ذریعہ ثابت کر دکھایا کہ ہندوستان سے ان کی وابستگی کتنی اٹوٹ ہے اور کس قدر مستحکم ہے یہ تعلق اور یہ عقیدت ایک عہد تک محدود اور مخصوص نہیں رہی بلکہ ہمیشہ انہوں نے اپنے وطن کی فکر کی اور ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے اس ملک کی تعمیر نو میں حصہ لیا۔ ہندوستان اور ہندوستانی عوام پر اقبال کے احسانات ناقابل فراموش ہیں ان کی وطن دوستی اور ہندوستانیت پسندی آج بھی ہمارے لئے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ ••

صفحہ ۳۲ سے آگے:

شعر و ادب میں یہ تاریخی قائدانہ اور انقلابی کردار تھا جسے اقبال نے اپنے زمانہ اور معاشرہ میں ادا کیا ہے میں نے اس مبارک شہر اور اس مبارک شام کے مبارک وقت سے کام لیتے ہوئے ادباء و اہل قلم ناقدین اور عرب کے مورخین کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی کہ وہ عربی ادب کے اس اہم اور نازک پہلو کی طرف بھی توجہ کریں جو فاسد رجحانات کو صالح و صحت مند رجحانات میں بدل سکتا اور ادب کو سفلی جذباتیت سے اٹھا کر اعلا مقاصد تک پہنچا سکتا ہے۔

قرآن نے اپنے معجزانہ انداز میں فاسد و سقیم اور تخریبی ادب کو زخرف القول غرورا (ملمع کاری اور فریب) کے بلیغ اور معنی خیز الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ہم سطحیت کے عہد میں جی رہے ہیں۔ ہمارا سابقہ زیادہ تر سفلی ادب سے ہے۔ مگر ہمارے اور عصر حاضر کی اور خاص طور پر عالم عربی کی بڑی ضرورت صالح اور مقصدی ادب ہے۔ جو قوت و زندگی سے بھرپور اور جو بلند و آسمانی اور عالمگیر اسلامی و انسانی پیغام کا حامل و علمبردار۔ اس موقع پر میں یہی کہہ سکتا تھا اور اسی پر میں اکتفا کرتا ہوں کہ وقت تنگ ہے اور مسجد نبوی شریف میں ہمیں نماز عشا کی سعادت حاصل کرنی ضروری ہے۔

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی

علامہ اقبال اور امام بوصیریؒ

صاحبِ قصیدہ بردہ

امام بوصیری مصری ساتویں صدی ہجری کے ایک ممتاز عالم دین اور عربی زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ پورا نام محمد بن سعید ہے۔ مصر کے ایک قریہ بوصیر میں پیدا ہوئے۔ سال ولادت معلوم نہیں ہے البتہ ۶۹۴ھ آپ کا سال وفات ہے۔ ان کے حالات میں بعض مصنفوں نے لکھا ہے کہ مخطوطات کی نقل کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ اس زمانے کے مشہور صوفی ابوالعباس احمد المصری کے شاگرد تھے۔

ایک روایت کے مطابق امام بوصیری پر فالج کا اس قدر شدید حملہ ہوا تھا کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے تب آپ نے ایک سو پینسٹھ اشعار پر مشتمل ایک نعتیہ قصیدہ لکھا۔ یوں تو اس قصیدہ کا عنوان الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریہ ہے لیکن یہ زیادہ تر قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور و مقبول ہوا۔ عربی زبان و ادب کے بیشتر نقادوں کی یہ رائے ہے کہ حضرت حسان بن ثابتؓ (صحابی رسول اکرم) کی نعت کے بعد عربی زبان میں قصیدہ بردہ سے بہتر نعت نبیؐ نہیں لکھی گئی۔ پچھلے آٹھ سو سال کے دوران قصیدہ بردہ کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ (۱۹۴۰ء کے آس پاس جب راقم الحروف میٹرک کا طالب علم تھا تو مضمون عربی کے نصاب میں قصیدہ بردہ شامل تھا اور ہمیں کے استاذی ڈاکٹر ابوالفضل مرحوم

سے قصیدہ بردہ کا ورد کر لیا تھا۔)

امام بوصیری کی یہ ارمغانِ نعت دربارِ نبویؐ میں مقبول ہوئی۔ عالم رویا میں بوصیری نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنی چادرِ مطہر عطا فرما رہے ہیں، اس طرح جب آپ خواب سے بیدار ہوئے تو مرضِ فالج سے مکمل طور پر شفایاب ہو چکے تھے۔

علامہ اقبال کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی، جب بھی نامِ مبارک زبان پر آتا تو آپ زار و قطار رونے لگتے تھے حضور باری تعالیٰ میں تو شعر کی زبان میں ناز و نیاز برتتے تھے لیکن بارگاہِ رسالتؐ میں ذرا سی بے ادبی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اقبال کی ایک رباعی ہے ؎

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

علامہ قصیدہ بردہ کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ اپنے بعض مکتوبات اور مثنویوں، خاص کر رموزِ بے خودی اور پس چہ باید کرد . . . کے نعتیہ اور عرضِ حال کے اشعار میں انھوں نے امام بوصیری کا ذکر کیا ہے۔ (یہ تو بالکل واضح ہے کہ مصر کے قریہ بوصیر کی مناسبت سے امام محمد بن سعید بوصیری کہلاتے تھے لیکن علامہ اقبال نے انھیں بصیری لکھا ہے)

واضح ہو کہ علامہ اقبال نے قصیدہ بردہ کے بعض اشعار کے مضمون کو اپنے کلام میں سمویا ہے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔

احلّ امتہ فی حرز ملتہ — کاللیث حلّ مع الاشبال فی اجم (بوصیری)

امتش در حرزِ دیوارِ حرم — نعرہ زن مانندِ شیراں در اجم (اقبال)

لما دعا اللہ داعینا لطاعتہ — باکرم الرسل کنا اکرم الامم (بوصیری)

پس خدا برما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را (اقبال)

ام ہبت الریح من تلقاء کاظمۃ   أو أومض البرق فی الظلماء من اضم (بوصیری)
صورتِ دُودِ کبود بجلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلیاں
گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں (اقبال)

پہلی دو مثالیں رموزِ بیخودی اور تیسری مثال بالِ جبریل سے لی گئی ہے۔ کوہِ اضم نواحِ مدینہ میں واقع ہے اور کاظمہ مدینہ میں۔

رموزِ بیخودی میں عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین کے عنوان کے تحت اقبال نے جو اشعار لکھے ہیں انھیں فارسی کے نعتیہ ادب میں اونچا مقام دیا جا سکتا ہے، اس میں اقبال نے جو باتیں بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

سب سے پہلے تو شاعر قرآنِ مجید کی تعلیمات کو بیان کرتا ہے لیکن اسے شکایت ہے کہ عجمی مسلمان یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ یوروپی فلسفہ بیان کر رہا ہے۔ (اشارہ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کی طرف ہے۔) دوسری بات یہ کہ وہ حسن پرستی اور تشکیک کے منازل میں بھٹکتا رہتا ہے (بحمد اللہ اب وہ ان کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہے۔) تیسری بات یہ کہ وہ عاشقِ رسول ہے جسے دیارِ نبوی سے اس کو بربطِ سلمٰی (عربوں کے انداز کی اسلامی شاعری) عطا ہوئی ہے جو امام بوصیری کو عطا کی جانے والی چادرِ مطہر کی طرح مقدس ہے اور آخر میں شاعر کی یہ دعا ہے کہ اسے باعمل بننے کی سعادت نصیب ہو اور وہ یہ آرزو کرتا ہے کہ اس کا مدفن مدینہ ہو۔

تا مرا افتاد بر رویت نظر — از اب و ام گشتۂ محبوب تر
عشق در من آتشی افروخت است — فرصتش باد اکہ جانم سوخت است
نالۂ مانندِ نی سامانِ من — آن چراغِ خانۂ ویرانِ من
اے بوصیری را ردا بخشیدہ — بربطِ سلمٰی مرا بخشیدہ
ذوقِ حق دہ این خطا اندیش را — اینکہ نشناسد متاعِ خویش را
دانۂ کم پائندہ تر گردان مرا — آبِ نیسانم گہر گردان مرا

از دست تیز دیگر اجزائے من وائی امروز دم خوشیم غرومانی من
کو کیم را دیدۂ بیدار بخش مرقدی کا نورسایۂ دیوار بخش

غالباً اواخر جنوری ۱۹۳۴ء سے علامہ کو گلے کی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ اپنے ایک مکتوب میں علامہ لکھتے ہیں:

"مجھے تقریباً دو ڈھائی ماہ سے (ACUTE LARYNGITIS) کی شکایت ہے، جس کی وجہ سے بولنے یا عام طور پر کلام کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ بہت علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ لندن انشاء اللہ اگلے سال جاؤں گا۔"
(مکتوب نمبر ۵۶ حصہ اول ۶/ اپریل ۱۹۳۴ء)

دیگر مکتوبات مثلاً ۱۱۶، ۱۲۵ (حصہ دوم) میں بھی گلے کی تکلیف کا ذکر ہے اگلے سال یعنی ۱۹۳۵ء (۲۳/ مئی) میں علامہ ایک صدمۂ جانکاہ سے دوچار ہوئے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ (والدۂ جاوید اقبال) انتقال فرما گئیں۔ علامہ اقبال کی زندگی کے آخری چار سال بیماری کی نذر ہو گئے۔ وہ بغرض علاج بھوپال بھی جاتے رہے۔ ان کا قیام سر راس مسعود (سر سید کے پوتے) کے ہاں تھا کہ ۳/ اپریل ۱۹۳۶ء کی شب کو انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں خواب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"۳/ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سر سید علیہ الرحمہ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں، "تم کب سے بیمار ہو؟" میں نے عرض کیا۔ دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا۔ "حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرو۔" میری آنکھ اسی وقت کھل گئی۔ اور اس عرض داشت کے چند شعر جو اب طویل ہو گئے ہیں، میری زبان پہ جاری ہو گئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے نام کے ساتھ یہ عرض داشت شائع ہوگی۔ ۴/ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں RING عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے ..." (مکتوب ۲۴۵ حصہ اول اپریل ۱۹۳۶ء)

مثنوی بس چہ باید کرد .... ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سرورکائنات کے حضور اقبال کی عرض داشت شامل ہے۔ یہ عرض داشت کل ۱۶۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترس مرگ

اس عرض داشت میں شاعر حضور اکرم ؐ کے ان احسانات کا ذکر کرتا ہے آپ نے عالم انسانی پر کئے ہیں۔ پھر وہ مسلمانوں کے زوال و انحطاط پر نوحہ کناں ہے اور ان کی اصلاح قلبی کا آرزومند ہے۔ مگر شاعر کی ذاتی التماس یہ ہے کہ اول تو اسے حج و زیارت کی توفیق ارزانی ہو اور دوسرے یہ کہ اس اس کی صحت بحال ہو تاکہ وہ مسلمانوں کو نئے اور تازہ افکار سے مستفید کر سکے۔ اقبال عرض کرتے ہیں کہ بیماری نے صبح کی تلاوت قرآن کی لذت چھین لی ہے۔ (آواز بیٹھ جانے کی طرف اشارہ ہے۔) اور دواؤں کی ناگوار بو و تلخی نے ذوق و شام کو پراگندہ کر دیا ہے، پس امام بوصیری کی طرح ان کی بھی چارہ سازی فرمائی جائے ؎

اے پناہِ من حریم کوئے تو | من بامیدے رمیدم سوئے تو
نغمۂ من در گلوئے من شکست | شعلۂ از سینہ ام بیروں نجست
در نفس سوز جگر باقی نماند | لطف قرآن سحر باقی نماند
آہ زاں دردے کہ در جان و تن است | گوشۂ چشم تو داروئے من است
چوں بصیری از تو می خواہم کشود | تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است | در خطا بخشی چو مہر مادر است

جان ز مہجوری بنالد در بدن
نالۂ من وائے من اے وائے من

ڈاکٹر آفاق فاخری

اقبال اور علم اقتصادیات

اقتصادیات کا تعلق انسانی زندگی کے شب و روز سے ہے۔ اقبال کو زندگی بھر اقتصادیات سے دلچسپی اور لگاؤ رہا۔ مگر انہوں نے اقتصادیات کا مطالعہ ضمنی طور پر کیا ہے کیونکہ ان کا غالب اشتغال شعر، فلسفہ، سیاست اور قانون سے رہا ہے۔ اسی باعث اقتصادیات کے مطالعہ میں انہوں نے براہ راست دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اس امر کے ثبوت کے لئے اقبال کی پہلی نثری تصنیف "علم الاقتصاد" کے پیش لفظ سے ایک اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں جسے ممتاز حسن صاحب نے تحریر کیا ہے۔

خود اقبال نے مجھ سے بیان کیا کہ کیمبرج کے زمانے میں انہیں وقتاً فوقتاً یہ احساس ہوتا تھا کہ فلسفے میں ان کا انہماک ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اسی احساس کے پیش نظر وہ کیمبرج کی دانش گاہ سے اقتصادیات کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے تاکہ اپنی شخصیت میں توازن قائم رکھ سکیں [۱]

علم الاقتصاد" اقبال کی پہلی نثری تصنیف ہے جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی دوبارہ ۱۹۶۱ء میں اقبال اکیڈمی کراچی نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو زبان میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے اپنی اہمیت اور افادیت کی بنیاد پر لاثانی تصنیف ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کی تحریک پروفیسر آرنلڈ نے کی تھی۔ اقبال کا یہ ایسا نثری کارنامہ ہے جس پر اردو دنیا ہمیشہ فخر کرے گی۔ اس کتاب میں ترتیب وار علم الاقتصاد کی اہمیت اور اس کی قدر، حق الغرب، زر کاغذی، اعتبار اور اس کی ماہیت

---

[۱] علم الاقتصاد، شیخ محمد اقبال، اقبال اکیڈمی کراچی صفحہ ۳

جلال پور۔ ضلع فیض آباد، یوپی ۹ م ۱ م ۲۲

پیداوار، دولت کے حصہ دار کے تحت لگان، سود، منافع، اجرت، مقابلہ تامکمل کا اثر، دستکاروں پر اور مال گذاری، آخری حصہ میں وجہ معیشت، جدید ضروریات کا پیدا ہونا اور صرف دولت کے عنوانات کے تحت نہایت بلیغ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ مذکورہ باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی یہ تصنیف اقتصادیات کے موضوع پر کتنا ہمہ گیر کارنامہ ہے۔ اقبال نے اپنے اقتصادی نظریہ کی وضاحت اس کتاب کے دیباچہ میں کی ہے۔ جس سے کتاب کے موضوع اور اس کی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

علم الاقتصاد، انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے یہ امر مسلم ہے کہ یہ انسان کے معمولی کام کاج اس کے اوضاع واطوار اور اس کے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتی ہے بلکہ اس کے دماغی قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسان کے سیل رواں میں احوالِ مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندہ ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے۔

درج بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ اقبال کو اقتصادیات و معاشیات سے کس حد تک لگاؤ تھا انہوں نے اقتصادی مسائل پر جس انداز سے گفتگو کی ہے اس سے ان کی مفکرانہ مزاج اور وسعت علم و مطالعہ کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ابتدا میں اشتراکیت ایک اقتصادی یا معاشی نقطۂ نگاہ اور حقوق کے لئے لائحۂ عمل تھا، روس کے اس اشتراکی انقلاب کی وجہ سے اقتصادیات کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ مگر اس کے سبب الحاد اور مادیت بھی یکجا ہو گئے روحانیت اور اخلاقیات انسانی زندگی سے قطعی طور پر معدوم ہونے لگے مسلم اقوام اور مشرق کے لوگوں کی معاشی پسماندگی اور پستی کا ایک بہت بڑا سبب مذہبی اشتراکیت ہی ہوئی تھی۔ اقبال نے اس مسئلہ پر بار بار غور کیا۔ چونکہ اس سے انسان کی اقتصادی معاشی اور سماجی زندگی متاثر ہوئی ہے اسی لئے انہوں نے ہمیشہ اشتراکیت کے اقتصادی

ظام کے اس پہلو کی مذمت کی ہے جس میں انسانیت کی تذلیل اور سرمایہ دارانہ نظام کا
سور کارفرما نظر آتا ہے ؂

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

اقبال کے اقتصادی نظریہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے معاشرتی اور سماجی ارتقار کے لئے قومی تعلیم کو لازمی وسیلہ تصور کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم اور اقتصادی ترقی کو اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے لازم و ملزوم قرار دیا ہے جس سے ایک خوشحال اقتصادی نظام کا وجود عمل میں آتا ہے تعلیم سے عوام کی محنت کی کارکردگی اور اس کی ذہانت ترقی کرتی ہے اور اخلاقی اطوار سنورتے ہیں، اسی باعث انہوں نے اپنی شاعری میں متعدد جگہ تعلیم کی اہمیت اور اس کی افادیت پر کافی زور دیا ہے بلکہ تعلیم کو امراض ملت کی دوا اور خون فاسد کے لئے نشتر کہا ہے ؂

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا — ہے خونِ فاسد کے لئے تعلیم مثلِ نیشتر
رہبر کی ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے — واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمانِ خضر

اقبال کی شاعری میں بعض بعض جگہ ان کے اقتصادی خیالات کا انعکاس ملتا ہے۔ لینن (خدا کے حضور میں)، فرشتوں کا گیت، فرمانِ خدا (فرشتوں سے) اور کارل مارکس کی آواز نظموں میں خصوصاً ان کے اقتصادی نظریئے کی وضاحت ملتی ہے جس میں انہوں نے عوامی زندگی اور قومی اقتصادیات کی ہم آہنگی اور اس کی ناہمواریوں پر حکیمانہ تنقید کی ہے کہیں کہیں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی کھلے لفظوں میں مذمت کی ہے جس سے قومی اقتصادیات مجروح ہوتی ہے اور معاشرتی نظام میں ناپائیداری اور عدم استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔

اقبالؒ کے اقتصادی نظریہ کی وضاحت کے لئے یہاں پر ان کے ایک خط کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں مسلمانوں کی غربت و افلاس اور اقتصادی زبوں حالی کو کتنی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا اس کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا بتاریخ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء اقبال نے ایک مکتوب میں غربت و افلاس کے شکار عوام کے اقتصادی مسائل خصوصاً روٹی کے مسئلہ پر اظہار کیا ہے۔ سود خوری اور سرمایہ داری کی

سخت مذمت کی ہے۔

اقبال کے اس نظریہ کی جھلک ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے انہوں نے غریب و نادار عوام اور کمزوروں کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔ اور اپنے پیغام سے ساری انسانیت کے لہو کو گرمانے کے علاوہ مزدوروں میں بھی جوش، ہمت اور حوصلہ کا جذبہ بھی پیدا کیا ہے انہوں نے غریبوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمہ کی ترکیب بھی بتائی ہے اور ایک ایسے نظام معاشرت کی بشارت بھی دی ہے جس سے مضبوط قومی اقتصادیات کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ غریبوں اور مزدوروں کو زندگی کرنے کے فن سے بھی آگاہ کیا ہے۔ بال جبرئیل کی مشہور نظم "فرشتوں کا گیت" کے تحت " فرمانِ خدا (فرشتوں سے) کے چند اشعار بطور نمونہ دیکھیے

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے ۔۔۔ کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ ۔۔۔ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی ۔۔۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

مغرب کے سود خوری کے نظام کی اقبال نے شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے چونکہ اسلام نے بھی اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس سود کی لعنت سے سارا اقتصادی نظام متاثر ہوتا ہے یہ فلاحی معاشرہ کے لئے ناسور کا حکم رکھتا ہے۔ یہ معاشی اور اقتصادی طور پر نہایت خطرناک چیز ہے جس معاشرہ میں اس کا چلن ہوتا ہے اس میں کبھی استحکام نہیں پیدا ہو سکتا سود خوری کے مسئلہ پر قرآن و سنت کی روشنی میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب "سود" میں اس کی شرعی حیثیت کو اس طرح واضح کیا ہے۔

قرآن میں اور بھی بہت سے گناہوں کا حکم آیا ہے اور ان پر سخت وعیدیں بھی لیکن اتنے سخت الفاظ کسی دوسرے گناہ کے بارے میں وارد نہیں ہوئے، اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قلمرو میں سود کو روکنے کے لئے سخت کوشش فرمائی۔

سلہ بحوالہ اقبال اور مودودی، مرتبہ ڈاکٹر محمد حیات عوزی مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سنہ ۱۹۸۱ء صفحہ

ڈاکٹر رحمت علی خان

علامہ اقبال اور آتشی شیرازی

علامہ اقبال لاہوری بیسویں صدی عیسوی کی وہ جدید عہد کی شخصیت ہیں جنھوں نے سارے سماج کی تشکیل جدید کی کوشش کی۔ کم از کم تین نسلوں کے اذہان ان کے پیغام سے متاثر ہوئے۔ اگر دانشور کی تعریف یہ ہو سکتی ہو کہ وہ ایسا شخص ہے جسے تمام مروجہ علوم سے واقفیت ہے اور وہ ایک ایسا پیغام لوگوں تک پہنچا رہا ہو جس سے متاثر ہو کر چند اور لوگ مزید سوچنے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح علم و عمل کو فروغ ملے تو علامہ اقبال ضرور دانشور قرار پائیں گے لیکن اس وقت ہمارا موضوع بحث اقبال کی شخصیت اور شاعری نہیں ہے۔
ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس عظیم الشان شخصیت کے ماخذ کیا ہیں۔ اقبال کے مشہور و معروف ماخذوں سے تو سبھی واقف ہیں مگر آج ہم ان کے ایک قطعاً غیر معروف ماخذ سے آپ کا تعارف کروائیں گے۔

جس زمانے میں راقم الحروف "شاہان عادل شاہیہ کے عہد میں فارسی ادب" پر کام کر رہا تھا تو سالار جنگ میوزیم کے کتاب خانہ میں ایک نادر مخطوطہ "مثنویات آتشی" نظر سے گذرا۔ جب بہ نظر غائر اس کا مطالعہ کیا گیا تو ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے اقبال کا لب و لہجہ اور بلند خیالی، ہمارے شاعر آتشی شیرازی میں سمو دی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اقبال نے اپنے دورۂ حیدرآباد یا سیاحت لندن کے دوران کلیات آتشی کا مطالعہ کیا ہو اور اس سے اثر انداز بھی

صدر شعبۂ مخطوطات و کتب خانہ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد۔

ہوئے ہوں۔ قبل اس کے کہ ہم آتشی شیرازی کے خیالات پیش کریں، بہتر ہوگا کہ اس کی مختصر سوانح حیات بھی قلم بند کر دی جائے۔

مخطوط مثنویاتِ آتشی شیرازی سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام محمد امین تھا۔ اس کے اجداد عرب الاصل تھے لیکن اس کے دادا سرزمین ایران کی طرف روانہ ہوئے اور شیراز کو اپنا مستقر بنایا۔ یہ یہیں پیدا ہوا۔ یہ لوگ خاندانی طبیب تھے۔ اس نے تکمیل تعلیم کے بعد "لار" کو اپنا وطن بنایا۔ شاید یہیں اس نے "آتشی" کے تخلص کے ساتھ شاعری بھی شروع کی ہو۔ اپنے کئی معاصرین کی طرح یہ بھی اپنے تمام خاندان کے ہمراہ سمندر کے راستے دکھن آیا۔ بیجاپور کو بطور جائے قیام انتخاب کیا اور تمام عمر یہیں رہا گو آتشی شیرازی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں بیجاپور آیا لیکن اس کی شہرت و عزت محمد عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں ہوئی۔ وہ خط نستعلیق کا بھی ماہر تھا۔ آتشی اور الٰہیائے قرابانی کو ایک شخصیت قرار دینا ہماری نظر میں غلط ہے۔ مشہد تاریخ فتوحاتِ عادل شاہی سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ساداتِ آتشی سے تھا۔ بادشاہ وقت کے علاوہ وہ وزیر مصطفےٰ خاں کا بھی درباری شاعر تھا۔ اپنے زمانہ کا بہترین شاعر تھا۔ کئی امراء کا اس نے کامیاب علاج کیا۔ بادشاہ اور امراء سے اُسے کافی مالی فائدہ ہوا۔ ظہوریؔ اس کا بہترین دوست تھا۔ آتشی شیرازی کی تاریخِ وفات معلوم نہیں لیکن وہ ۱۶۵۸ء/ ۱۰۶۹ھ میں بقیدِ حیات تھا اور علی عادل شاہ ثانی کی رسم تاج پوشی میں بھی شریک تھا۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اثنا عشری شیعہ تھا لیکن وسیع النظری اس کا شعار تھا۔ مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ قانع، صاحبِ اخلاق اور صوفی المزاج تھا۔ علم کے ساتھ عمل پر یقین رکھتا تھا۔ ایرانی ہونے کے باوجود اسے دکن اور اس کے باشندوں سے خلوص اور محبت تھی۔ اپنی شاعری میں اس نے کئی مقامی زبان کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کبھی دکنی میں بھی خامہ فرسائی کی ہو۔ آندھرا پردیش اورنٹیل لائبریری، حیدرآباد میں جو "دیوانِ آتشی" ہے وہ ہمارے شاعر کا نہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر دلیور سے نے

آتشی شیرازی کا مختصر تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ مستشرقین میں صرف اسٹوری نے اس کا ذکر کیا ہے۔

۳ آتشی شیرازی کے کلیات کا قدیم ترین نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے جسے شیخ محمد صادق نے ۱۶۴۳ء/ ۱۰۵۳ھ میں تحریر کیا۔ اس کلیات میں قصائد، قطعات، غزلیات، رباعیات اور مثنویات وغیرہ جمع کئے گئے ہیں۔ قصائد و قطعات زیادہ تر نواب مصطفیٰ خان کی مدح میں ہیں۔ پہلی مثنوی "عادل نامہ" خود محمد عادل شاہ کے حکم سے لکھی گئی۔ دوسرا اہم نسخہ "مثنویاتِ آتشی" ہے جو کتاب خانہ سالار جنگ میوزیم میں بڑی اچھی حالت میں موجود ہے۔ اس کی اہمیت یہ بھی ہے کہ خود شاعر نے اپنے ہاتھ سے اپنی مختصر سوانح حیات لکھی ہے۔ اس نسخہ میں ایسی تین مثنویات ہیں جو انڈیا آفس لائبریری کے نسخہ میں دستیاب نہیں ہیں۔ اس نسخہ کے کاتب نعمت اللہ اور شیخ عبدالسلام ہیں۔ اوراق کی تقطیع بڑی ہے اور خط کافی خوبصورت نستعلیق ہے۔ تقریباً ۴۰۰ اوراق ہیں۔ پہلی مثنوی اخلاقی ہے جس کا عنوان "ہدایت نامہ" ہے۔ دوسری مثنوی "محبت نامہ" ہے جو طویل ترین مثنوی ہے اور اس کا موضوع تصوف ہے۔ تیسری مثنوی نظامی کی مشہور مثنوی "مخزن الاسرار" کی تقلید میں منظوم کی گئی ہے جس کا نام "بحر الانوار" رکھا گیا ہے۔ تینوں مثنویات کا انداز بیان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ مشہور ایرانی شعرا کے علاوہ شاعر نے معاصرین شعراء میں سے ظہوری، ملک قمی، سنجر، باقر خورد کاشی اور حسی کاشانی کا ذکر کیا ہے۔ آتشی بغیر "خودی" کا نام لیے جو اوصاف بیان کرتا ہے وہ اقبال کے خیالاتِ خودی سے کافی مماثل ہیں۔

۳ آتشی شیرازی سے دو سو برس بعد اقبال کا ظہور ہوا اور انھوں نے قوم کو فلسفۂ خودی، احترامِ آدمی اور نوجوانوں کی بیداری کی تعلیم دی۔ اقبال ان کے پیغام اور ان کی شاعری سے ہمارے ناظرین مجھ سے زیادہ واقف ہیں اور اس کے اسرار و رموز ان پر زیادہ واضح ہیں لہٰذا کلامِ اقبال

مختصراً دیکھتے ہوئے ہم آتشی شیرازی کے اشعار پیش کریں گے، جس کے مطالعہ سے خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ آتشی اور اقبال کے کلام میں کس قدر مماثلت ہے اور یہ اشعار ہم نے صرف انہی مثنویات سے لیے ہیں جو جدید آباد میں موجود ہیں۔ آیئے پہلے کلامِ اقبال کا ایک سرسری جائزہ لیں:

ہستیٔ مہر از زمین محکم تر است پس زمین مسحورِ چشمِ خاور است
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل او در آرزو پوشیدہ است
خستگی ہائے تو از ناداری است اصلِ دردِ تو ہمیں بیماری است

زندگی مضمونِ تسخیر است و بس آرزو افسونِ تسخیر است و بس

شکوہ سنجِ سختیٔ آئین مشو از حدودِ مصطفےٰ بیرون مرو

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو در سواد دیدہ ہا آباد شو

از گِلِ خود آدمی تعمیر کن آدمی را عالمی تعمیر کن

ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است ناتوانی را قناعت خواندہ است

گر فنا خواہی ز خود آزاد شو گر بقا خواہی بخود آباد شو

فارغ از خوف و غم و وسواس باش پختہ مثلِ سنگ شو، الماس باش

می شود ہر مو درازی خرقہ پوش آہ ازیں سوداگران دین فروش

واعظان ہم صوفیان منصب پرست اعتبارِ ملتِ بیضا شکست

در دلِ حق سِر نگنو نیم ما — وارثِ موسیٰ و ہارونیم ما

ناتوانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش

عقل گوید شاد شو آباد شو — عشق گوید بندہ شو آزاد شو

غنچۂ از خود بچمن تعمیر کن — شبنمی خورشید را تسخیر کن

نغمہ خیز از زخمۂ زن ساز مرد — از نیاز او دو بالا نازِ مرد

پوششِ عریانیِ مرداں زن است — حُسنِ دلجو عشق را پیراہن است

اب آتشی شیرازی کے کلام کی طرف آیئے۔ یہاں ذہنِ عالی میں یہ امر بطورِ خاص ملحوظ رہے کہ یہ کلام آج سے چار سو سال قبل معرضِ وجود میں آیا تھا۔

شاد ساز خاطرِ احباب باش — چون درایں مزرعہ درآئی آب پاش

دوستدارِ مصطفےٰ و آل باش — از پیِ آموز قانونِ معاش

راحت آزادگان در محنت است — عیب بیدردی طبعی علت است
میوۂ ناپختہ را قیمت کم است — خربزہ چو خام باشد شلغم است

آدمیت بہترین کارہا است — بوی آن زینتِ گلزارِ ما است

رنج بہتا دیگران راحت برند — بادہ شو تا مئے گساران نت خورند

از بلیناس و فلاطون کم مشو — غافل از هنگامهٔ عالم مشو

این جہان جلاگہ کردارِ تست — زشت و زیبا ہرچہ باشد از تست

ہر کہ خلق نیک دارد آدم است — پایهٔ دیوار نامش محکم است

از مقامِ درد می گویم سخن — درد دارد نالهٔ آوازِ فن

صحبت نادان وبالِ جان بود — یار نادان آتشِ سوزان بود

زن نکو خاتونِ شیرین خو ! — بود آبِ حیات چشمہ رو

اگر خاتونِ منزل دردمند است — اساسِ خانہ دایم سربلند است

دلت را تازہ گردانیت بآداب — نمد بر آتشت یا دلبری آب

زنان را بدگلو تا نیک کردی — کہ بدگفتن نباشد شرطِ مردی

زنان را عزت و غیرت بکار است — زن عاقل امیر نامدار است

بزن نتوان نمودن بد قماری — کہ زن دارد دکانِ شرمساری

اس مختصر جائزہ سے قارئین نے جان لیا ہوگا کہ آتشی شیرازی بھی شاید علامہ اقبال کے فکری مآخذوں میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ ●

اقبال اور اس کا عہد

مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی

مندرجہ بالا نام کی کتاب جگن ناتھ صاحب آزاد کے ان تین لکچروں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے جموں و کشمیر یونیورسٹی کے لیے توسیعی لکچروں کے طور پر لکھے تھے۔ مگر وہاں پڑھے نہیں گئے۔ ان تینوں لکچروں کے عنوان یہ ہیں:

۱۔ شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر

۲۔ اقبال کے کلام کا متصوفانہ لب ولہجہ

۳۔ اقبال اور اس کا عہد

کتاب کا نام "اقبال اور اس کا عہد" تیسرے لکچر کے عنوان کی بنا پر تجویز کیا گیا۔ جگن ناتھ آزاد ہماری زبان کے مشہور و معروف اور بزرگ شاعر تلوک چند محروم کے بڑے قابل بیٹے اور نہایت ہی شریف و پاکیزہ طبیعت کے انسان ہیں۔ ایک آدھ چھوٹے موٹے مضمون سے قطع نظر موصوف کی یہ پہلی کاوش ہے جس سے مجھے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔

آزاد نے اس کتاب کے صفحہ ۹۱ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ آپ (آزاد) ۱۹۴۴ء میں ایم اے کے طالب علم تھے اور یہ کہ آپ محترمی جناب سید عابد علی عابد لاہوری کے شاگرد ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ذاتی جوہر اور سید صاحب کی شاگردی نے آزاد کی طبعی صلاحیتوں کو ترقی دینے میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ اگر سید صاحب بھولے نہ ہوں، مجھے بھی قیام لاہور کے زمانہ میں ان کی خدمت میں

حاضر ہونے کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے جو ممکن ہے درست نہ ہو کہ جناب آزاد نے بی ٹی ہو
کے بعد ایم اے کیا ہے اور غالباً آپ کا بی ٹی ہونا ایم اے ہونے سے تا...
دن پہلے کی بات ہے کیوں کہ اتنا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے آزاد کو
پہلی مرتبہ ہال روڈ پر واقع 'ادبی دنیا' کے دفتر میں اس وقت دیکھا تھا جب
وہ بی ٹی کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے یا امتحان سے فارغ ہو چکے تھے
اور نتیجے کا انتظار تھا۔ ہاں یہ بات اچھی طرح یاد نہیں کہ آزاد کس سے بات چیت
کر رہے تھے۔ کسی اور سے یا مولانا صلاح الدین احمد صاحب سے۔ اتفاق کی
بات ہے کہ موضوع گفتگو اقبال کی شاعری کا اسلامی تصور ہی تھا جس کے
بارے میں آپ نے اپنی اسی زیر نظر کتاب کے پہلے مقالے میں بڑی قابلانہ
موثر اور لائق توجہ گفتگو کی ہے اور میرا خیال اقبال کی اسلامی شاعری کے متعلق
اس وقت بھی قریب قریب ایسا ہی تھا جو آزاد اب بیان کر رہے ہیں
اور اگر میں خود اس موضوع پر اب بھی کچھ لکھوں تو شاید آزاد سے اچھا
نہیں لکھ سکوں گا۔

مجھے آزاد کی سادگی اور بھولے پن اور خلوص سے باتیں کرنا اب تک
یاد ہے اور اب جب بمبئی میں گذشتہ فروری ۶۱ء کے "جشن شاعر" کے
مشاعرہ میں اسٹیج پر ان کے صاف صاف خیالات اور اشعار سنے اور پھر آزاد کی
اس کتاب کو پڑھا تو صاف محسوس ہوا کہ ان کا آئینۂ دل اسی طرح صاف اور
پاک ہے۔ جس طرح آغاز جوانی میں تھا۔ الحمدللہ

اب اصل کتاب پر آیئے تو اتنا کہنے میں تکلف نہیں کہ آزاد اقبال
کی شاعری کے ہندوستانی پس منظر کے موضوع پر اس طرح اور اتنا نہیں
لکھ سکے جتنا اور جیسا کہ وہ کہہ سکتے تھے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کے سامنے
وہ تنگ نظر گروہ کھڑے ہیں جو ہر آزاد رائے سے چاہے وہ کتنی ہی علم و
بصیرت اور اخلاص پر مبنی ہو، ٹکرانے اور الجھنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں
اور آزاد اس کے لیے نہیں کہ ان میں کسی ایک سے بھی الجھیں۔ اس لیے

بہتر یہی ہے کہ ع

تنہا خورید بادہ کہ تکفیر می کنند

یونہی سا اشارہ کیا اور آگے نکل گئے ورنہ ظاہر ہے کہ اقبال وحدتِ حق اور انسانیت کے قائل تھے اور ظہورِ حق کے شیون میں سے ظہورِ محمدی ایک نمایاں اور بلند و بالا اور ممتاز ترین شانِ ظہور تھی اور کون نہیں جانتا کہ جلوہ حسن و جمال کی رنگا رنگی میں سے ہر ایک رنگ یا ایک شان عشقِ پرستار کا کام بنا دینے کے لیے بس ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ملکوں اور زبانوں کے بزرگوں اور مشاہیر کے محاسن کے گن گانے کے ساتھ ہی محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبان پر آتے ہی بمصداق:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے اس بے پناہ جذبہ شوق و عشقِ محمدی کا مظہر موقع بہ موقع اکثر و بیشتر پہلی منظومات کے نعتیہ اشعار کے علاوہ جاوید نامہ جو اقبال کی زندگی میں شائع ہوا ___ اور "ارمغانِ حجاز" موصوف کی وفات کے بعد منصۂ شہود پر آیا، کے وہ منظوم حصے بھی ہیں جن میں آنحضرتؐ سے خطاب ہے یا آپ کے متعلق اظہارِ جذبہ و شوق کیوں کہ اقبال کو آنحضرتؐ ہی کی ذات پاک میں انسانی کمالات نقطۂ عروج نظر آتے ہیں۔ پس حق یہی ہے کہ حق ایک ہے اور ظہورِ حق کے مظاہر پے شمس بازغہ ایک ہے مگر اس کے طلوع کے مطالع الگ الگ۔

جامی: ؎ بحریست موج ہزاراں ہزار   روئیست یکے آئینہ ہا لیک ش

جس کا ثبوت یہ ہے کہ بلبل کو جوشِ بہار میں، محبوبِ حقیقی کے حسن و جلوہ گلہائے رنگا رنگ میں نظر آتا ہے اور اسے ان مظاہرِ حسن پر فدا پر مجبور کرتا ہے اور بلبل بے تاب ہو کر پھلواری کے پھولوں سے لپٹتی او ان کے حضور گاتی اور شوق و وجد میں پرواز ی رقص کرتی دکھائی دیت نادان اس کو محض نالہ سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں اسے عاشق و معشو

راز دینا اور ہنگامِ وصل کی بے اختیاری اور گریہ مسرت و خاد معانی سمجھتے ہیں:

آنکوں کہ را دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اس شعر کے اور طرح بھی معنی ہو سکتے ہیں مگر مجھے یہاں یہ معنی پسند ہیں کہ گل و بلبل اور ان کے ماحول کی سرمستانہ حالت دیکھنے اور سمجھنے کی چیز ہے، کسی سے پوچھنے کی نہیں کہ بلبل شیدا نے عالمِ الوہیت و جذب و شوق میں پھول کے کان میں کیا منتر پھونک دیا کہ وہ کھل اٹھا اور بادِ صبا نے کیا سنا کہ رقص و وجد میں آگئی جسے دیکھ کر امیر کو کہنا پڑا ـــ

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

یا بقول مولانائے روم عشق و حسن کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گی ـــ

ہر دم بلباسِ دگر آں یار برآمد ـ دل بردو نہاں شد

پس حق کا ظہور از منہ و السنۂ مختلفہ میں کسی حق آشنا کی نگاہ سے مظاہرِ حسن کی گوناگونی کے ساتھ اپنی مرکزی یکتائی حسن کے ساتھ کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے ـ

اقبال کا اسلام اسلام کا نعرہ اور مسلم و مومن کو انسانیت کی بہترین اور اعلیٰ ترین مثال یا مورتی قرار دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ سوامی وویکانند یا مہاتما گاندھی جی یا راج گوپال چاری اور رادھا کرشنن وغیرہ کا سناتن دھرم کا نعرہ لگانا یا کسی مسیحی پروٹسٹنٹ یا کیتھولک کا مسیحی صداقت یا کلام الٰہی کی صداقت و حقیقت (REALITY) کا اعلان کرنا ـ غرض کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر یا حکیم یا مصلح یا روحانیت کے مشعل بردار کے کلام کا مطمح نظر اور انسانی اخلاق و کردار و شرف کی بلندیوں کے امکانات کا آخری نقطہ وہی ہوا کرتا ہے جو وہ اپنے کلام میں کسی اپنے ہیرو یا ممدوح کی ذات میں بتاتا ہے ـ وہ والمیکی ہو یا وید و یاس یا تلسی داس یا زمانۂ حال کے بنگالی زبان کے بھارتی ٹیگور یا اردو کے انیس و دبیر کے ان کے ممدوحوں کی دو تصویریں

یں۔ ایک اصلی تاریخی اور دوسری شاعرانہ بلند پروازیوں کی صنعت کاری
ے حقیقت واقعی ہے اور دوسری امکانات کا سلسلۂ ناپیدا کنار۔ وہ
غرب میں ڈانٹے یا شیکسپیر یا ملٹن یا ثاں الشانی جرمنی یا فردوسی، سنائی،
رومی، نظامی اور سعدی ایران میں اور اقبال ہندوستان میں۔ غرض کوئی
ہی ہوان سب کو ایک ہی چیز کی تلاش ہے۔ ان کے نزدیک حسنِ حقیقی
یک ہے اور اسی کی جلوہ ریزیاں ہیں کہ ان سے روحِ شاعر و حکیم متاثر
ہو کر نغمہ سرائی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اقبال ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگے مرغِ چمن!

سب کا خیال ایک ہے، پیرایۂ بیان میں اختلاف بھی ہے اور ان کے
مدوح کی مثالی شخصیت کا تمام جدا اور محاسن کے پہلو یقیناً ایک دوسرے سے
ختلف ہوں گے اور ہیں بھی۔ اس اختلاف حتیٰ کہ تضاد کے ساتھ تمام زبانوں کے
ور زمانوں کے تمام باکمالوں کا ذہنی انسانِ کامل ایک ہی رہا ہے۔ محبوب کے
ام اور مقام میں زبان و بیان اور نظر اندازِ نظر کی پردہ داریاں ضرور موجود
یں۔ تاہم ذات ایک ہے اور منزل بھی ایک ہے۔ راستے مختلف ہیں۔ سنگِ میل
ی جدا جدا ہیں۔ ماضی کی تاریخ اور آج کے احوال پر نظر ڈالو۔ انسانیت
کے قافلے ہیں کہ آگے پیچھے قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں اور ہر قافلے
قائد یا راہبر سب کے جدا جدا ہیں اور وہ الگ الگ اسماء ہی سے موسوم
یں اس کے باوجود ان کا قبلۂ اعمال ایک ہی ہے۔ ان کی اصطلاحیں، بولیاں
بولیاں اور لہجے جدا جدا ہیں۔ تمام راہرو اپنے اپنے رہبروں یا قائدوں
سے مانوس و مالوف ہیں اور ان کے نقشِ قدم پر کچھ بوجھ کر یا بے سمجھے
بوجھے آگے سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ جن کی نگاہ اس "نکتہ"
ور اس "نقطہ" پر ہے۔ وہ سفر میں عقل اور پوری تیز روی سے کام لے کر
باہم تسابق سے کام لے رہے ہیں اور جو اس "نکتہ" سے غافل ہیں یا وہ
نقطہ" ان کی نظر سے اوجھل ہے وہ باہم الجھ کر منزل کو کھوٹا کرنے میں

گے رہتے ہیں۔

اقبال کا کلام پڑھو۔ اس میں بعنوان ہائے مختلف انھیں سوالوں کا جواب پھیلا ہوا دکھائی دے گا کہ اقبال کی نظر میں اسلام کیا ہے اور وہ مسلم کسے سمجھتا ہے۔ پس اقبال جب اسلام یا مسلم کے لفظ کا استعمال کرتا ہے تو اسلام کے لفظ سے مراد وہ خوبیاں ہیں جن کو وہ ایک انسان میں دیکھنا چاہتا ہے، کیوں کہ اس کی نظر میں وہی خوبیاں انسانیت کی معراج اور وہی اسلام ہے اور جس شخص میں اسے وہ خوبیاں نظر آتی ہیں اسی کو وہ مسلم قرار دیتا ہے دل کہ اقبال کی نظر میں ملک اور وطن، رنگ اور نسل میں اسلام مقید نہیں، ان نسبتوں اور حد بندیوں سے بلند و بالا ہے۔ اقبال کا اسلام صفات حسن کا نام ہے اور ان صفات سے موصوف ہستی مسلم ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک قوم بھی "مسلم" کہلانے والی ضرور ہے۔ وہ قوم بھی اسی نام سے موسوم رہے گی جب تک وہ خود اپنے لیے کوئی دوسرا نام تجویز نہ کرلے۔ اس کے ہر فرد یا بلا امتیاز تمام افراد کو بحیثیت مجموعی شاعر کے ذہنی تصور مجموعہ یا نمونہ تسلیم کر لینا آسان نہیں۔ یہی حال دنیا کے دوسرے حکما، علما، شعرا اور مذاہب کی مذہبی اصطلاحوں اور ان کے مواد و مصادیق کا ہے، یا اسلام اور اصطلاح مسلم کا ہے۔

جب اقبال اپنی ذہنی اور حکیمانہ بلند پروازیوں سے موجودہ حالت یا یعنی پیداوار بابا آدم خاکی نژاد کو دیکھتا اور واقعاتی سطح پر آتا ہے تو پھر وہ عام طور پر مسلمان کہلانے والوں، سیدوں، شیخوں، عام ہندوؤں اور برہمنوں اور عیسائیوں وغیرہ سب پر بے تکلف نکتہ چینی بھی کرتا ہے بلکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اوروں سے زیادہ خود مسلمان کہلانے والوں پر سخت تنقید کرتا ہے۔ غرض وہ انسانوں کے کسی بھی ایک نام سے موسوم و مشہور" نہ کہ "موصوف" طبقہ کی کمیوں اور کجرویوں کو مجموعی طور سے بے نقاب کرتا ہے یا ایک ایک کا نام لے لے کر ان کی موجودہ خصوصیات" معائب کی نشان دہی کرتا ہے تو لحنِ قول کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنے

والے سطحی خیال یا تنگ نظری کے حلقوں میں گھرے ہوئے محدود خیال کے لوگ اس کے مثالی نظریہ یا مثالی انسان کو اپنے گرد و پیش کے برعکس ہندنام زنگی کا فور کو اقبال کا مخاطب اور ایک حقیقت خیال کرکے حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ مثلاً ایک طرف اقبال اپنے برہمن زادہ ہونے پر فخر کرکے علان کرتا ہے کہ میں برہمن زادہ ہوں اور فلسفہ میری آب و گل میں ہے یسے مواقع پر اقبال "برہمن" کو علم و فلسفہ کا مجسمۂ حسین و صحت مند ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف "برہمن" پر دور تنگی کا اعتراض بھی کرتا ہے مثلاً :

بمن گوید کہ از تسبیح بگزر
بدوشِ خود برو زُنّار خود را

یہ شعر اقبال کی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں سے ہے جو اقبال کی وفات کے عد شائع ہوئی لیکن یہی خیال ان کی ابتدائی اردو نظم "نیا شوالہ" میں بھی بالفاظِ یگر موجود ہے :

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بُتوں سے سیکھا
واعظ کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے

پس شعر کا مطلب یہ نہیں کہ "برہمن" کو "بتوں" نے اپنوں سے بیر رکھنا سکھایا ہے یا خود خدا نے واعظ کو جنگ و جدل سکھایا ہے بلکہ اقبال کا مطلب یہ تھا ہ "برہمن" نے بتوں کی خاموشی سے یہ سمجھ لیا کہ بتوں کی رضامندی کے لیے ذات پات اور اونچ نیچ کا فرق اور چھوت چھات کی پابندی ضروری ہے ور میں صرف میں جو کہ چوبیس گھنٹے بتوں کی سیوا کے لیے مندر میں دھرنا یے بیٹھا رہتا ہوں پوتر ہوں اور میرے سوا باقی تمام منش ماتر قابلِ نفرت ہیں تو اچھوت ضرور ہیں اور جو لوگ اسنا اور سنا اچھوت نہیں پھر بھی "برہمن یوتا" سے فروتر ذات کے ضرور ہیں اس لیے وہ حق نہیں رکھتے کہ ان کو برہمن کے مقابلہ میں" واعظ" جسے انسان کو انسان سے ملانا اور باہم لوگوں و میل جول سکھانا چاہیئے تھا اور خدائے واحد کے تمام بندوں کو کلمۂ واحدہ پر جمع کرنا تھا وہ مسکین دن رات اور موقع وبے موقع اپنی واعظانہ ترانیوں کی بھول بھلیاں میں اُلجھ کر "کتاب اللہ" سے صرف یہی سیکھ پایا کہ

اس کی اپنی ملت بابرکات کے علاوہ سب بندگانِ خدا جو ذرا بھی اس کے مسلک سے الگ تصور کئے جا سکتے ہیں، دوزخی ہیں، اس کا یقین یہ ہے کہ جنت و رضوانِ الٰہی کی تنہا مستحق اگر کوئی ذات ہے تو صرف وہی ایک یا کسی قدر وہ جو اس کے ظلِ عاطفت میں پناہ گزیں ہیں۔

دیکھو اقبال "ملاؤں" سے ناراض ہیں لیکن ایک بڑے سرخیلِ ملایان۔ ہاں بہت ہی بڑے ملا یعنی مولانائے روم کو اپنا مرشدِ روحانی تسلیم کر کے انہی کی معیت میں ایک عالمِ بالا نہیں بلکہ عوالمِ بالات اور ملکوت سماوات والارض کی سیر بھی کرتا ہے۔ اقبال "حافظ" یا اس کے نظریۂ حیات سے ناراض بھی رہا ہے لیکن حافظ کی زبان اور اس کے پیرایۂ بیان اور حافظ ہی کی والہیت عشق و سرمستی سے بے نیازی تو کیا برتتا اپنے کلام کو اسی شیرازی شراب میں شرابور اور حافظ ہی کے کلام کے دو آتشہ میں رچا بسا کر دنیائے علم و ہوش میں پیش کر دیتا ہے۔ اقبال رسمی تصوف اور موجودہ رو بہ زوال، مسخ شدہ بے روح پیری اور پیرزادگی اور سجادہ نشینی سے خفا بھی ہے لیکن روحِ تصوف ہے کہ اس کے کلام کے مشامِ جاں میں بشدت جاری و ساری ہے۔ پس فرق ہے دیکھنے اور سمجھنے کا، حقیقت کا نہیں معرفت کا ہے۔

اقبال انسانیتِ کاملہ کا متوالا ہے۔ وہ انسانیت کاملہ کے ہی صفات سے موصوف نمونوں کو جب بھی کسی ملک یا قوم یا کسی فرد یا کسی رنگ اور کسی زبان کے بولنے والے لوگوں میں پاتا ہے تو بے تکلف اسی کو اپنی "مسلم" و "مومن" کی تعریف کی مد میں لے آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ تکلف اور بناوٹ سے نہیں کہتا بلکہ اسے قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبی کریم اور مسلم کہلانے والی قوم کے کاملوں کے بیانات میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔

جب حقیقت یہی ہو تو وہ اس میں تکلف سے کام کیوں لے۔ بناوٹ کا اس میں شائبہ تک بھی کیوں خیال کیا جائے، حقیقت وہی ہے جو اقبال ظاہر کرتا ہے اسی لیے اگر وہ کسی نامی کے نام اور اس کے کام میں دو رُخی بات پاتا ہے تو بے تکلف ٹوک دیتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں قدیم شعرا اور حکما اور علما اور اصفیا کے کلام اور ارشاد کی طرح انسانیت کا نقطۂ عروج پیش کیا گیا ہے جس کی بلندی تک پہنچنے کے لیے انسانی نسلیں آدم سے خاتم تک بلکہ از آدم تا ایں دم یا ابتدائے ظہور حیات اور نامعلوم دہور و عصور سے ساعی و جاہد ہیں اور باوجود مسلسل کوشش کے کوئی جماعت بحیثیت اس نقطۂ کمال انسانی پر فائز ہو گئی ہو جو داعی کا منشا اصلی تھا۔ ایک غور طلب سوال ہے کہ کسی جماعت کی فتوحات کے بعد تمام انسانی کمالات ختم ہو چکے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوتا رہا ہے کہ ہر عصر میں اس دور کے حالات کے مطابق اللہ کے بندوں کی ایک جماعت ایک صادق و مصدوق کی صداقت اور کلام الٰہی کے زیرِ تربیت اپنے دوسرے معاصرین سے بحیثیت مجموعی بدرجہا ممتاز اور نمایاں ہوتی رہی ہیں، لوگ کتنے ہی اعلیٰ درجہ کے ہوں مگر ان کے مدارج میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے کسی کو نعوذ باللہ برا تو کیا اور کیوں کہا جاتا، اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے ادنیٰ کہنے کی بھی جرأت نہیں کی جاتی چاہیئے جیسے آفتاب و ماہتاب اور خنک تاب ستارگان کہ سب روشن ہیں مگر سب کی روشنی ایک نہیں، ایک سی نہیں، البتہ ان میں تنقیص کسی کی بھی نہیں کی جاسکی۔ یہی اسی مفہوم کو قرآن حکیم میں یوں ادا کیا گیا کہ:

لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (الحدید ۲۷)

یعنی وہ شخص جس نے راہِ حق میں اپنے تمام وسائل کو فتح یاب سے پہلے خرچ کیا اور اپنے تمام جائز ذرائع کو حق کی کامیابی کے لیے صرف کیا اس آدمی کے ایسا نہیں ہو سکتا جس نے یہ خدمتیں انجام نہیں دیں۔ پہلا دوسرے سے بہرحال بہتر و بزرگ ہے۔ اسی کے ساتھ دونوں کی خدمات خدا کے حضور میں مقبول ہیں سب سے علیٰ قدرِ مراتب وعدۂ انعام کیا ہے لیکن جو حقیقت واقعی ہے وہ خدا سے پوشیدہ نہیں۔

پس ہر تحریک، صالح و اصلح میں خود بانی و موسس یا اس سے جس قدر ملتے جلتے اس کے کچھ پیرو یعنی مطمعِ نظر کے قریب ضرور ہو سکتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیئے لیکن کسی کامل و اکمل نے ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ یہ نہیں کہا کہ میرے مقام سے آگے اور کوئی مقام ہے ہی نہیں۔ کہا تو یہی کہا :
" رَبِّ زِدْنِی فِیکَ تَحَیُّراً " یا التجا کی تو یہی کی رَبِّ زِدْنِی عِلْماً اسی بات کو اقبال نے اس شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یا بقول حافظ ؎

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسی می آید

یہی وجہ ہے کہ محبوبیت کا عکس خیالوں میں زیادہ لفظوں میں بہت کم تو موجود ہے مگر مظاہر صوری میں چشم ظاہر ہیں اور جویائے کمال روح کو کسی منزل پر قرار نہیں۔ اس کی پکار ہمیشہ یہی رہتی ہے " روشنی اور روشنی "
یا بقول حالی ؎ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

جب بلندیوں اور بلند پروازیوں کا یہ حال ہو تو کوتاہیوں کو کیوں نظر انداز کیا جائے اسی لیے تسلیم کیا گیا ہے کہ عوام کی نیکیاں کاملوں کی کمزوریاں ہیں۔ اس سلسلے میں ابنِ یمین کا محرمانہ قول غور طلب ہے کہ :

نہ دیدم من از آدمی ہیچ کس کہ اخلاقِ اُو جملہ باشد نکو
ہنرمند را ایں قدر بس بود کہ گویند ایں است بس عیب او "

لفظ و معنی یا خیال و عمل کے مظاہر جویا سے جاتے ہیں، جویائے حق کی نگاہ کسی نہ کسی نقطے یا کسی نہ کسی مظہر حسن پر ٹھہرتی ضرور ہے کیونکہ اسے حقیقت کی جھلک کسی نہ کسی ایک وجود میں کسی حد تک نظر ضرور آتی ہے۔ بس جھلک ہی وہ بھی عارضی طور پر۔ انگلی ایک نقطے پر رکھ دیتے یا حقیقت سکے بہتے دریا

کی طرف اشارہ کر دینے میں متامل یقیناً رہتی ہے اور جب بھی بے تابی سے کسی طرف ہاتھ بڑھاتا تو اس بڑھے ہوئے ہاتھ نے کسی کا ہاتھ تھام لینے کے بجائے حیرت سے اپنی ہی انگلی کو اپنے ہی دانتوں میں دبا لیا۔

مطلب یہ کہ حسن یا اس مظہر حسن میں کمی نہیں، مگر جویائے حق کو ایسا لگتا ہے کہ روح کی سیرابی کے لیے ابھی کسی اور چیز کی ضرورت باقی ہے، پس انسان کا عالم جستجو میں کسی مقام پر ٹھہر جانا اس کی منزل ضرور ہے لیکن آخری منزل نہیں، محض عارضی مقام ہے۔ روحانی تکان یا عالم حیرت جب دور ہوگا تو جویائے حق کمر ہمت باندھ کر پھر جادہ پیما ہو جائے گا۔

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

غرض زندہ روح کی پکار ہمیشہ یہی رہی ہے، یہی رہتی ہے کہ اور تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر...

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آزاد نے مشاعروں میں حصہ لینے والے بعض بدنام کنندوں کی سوئے حالی کی طرف نام لیے بغیر اشارہ کیا ہے، کسی کا نام نہ لیا، بہت اچھا کیا، مگر بدقسمتی سے ایسے لوگ صاف ستھرے مجمعوں میں آ ہی جاتے ہیں یا کسی حسن ظن کی بنا پر بلا لئے بھی جاتے ہیں مگر ان کی بدحالیوں، زشت احوالیوں اور بیان کی برہنگی اور حرکات کی ناشائستگی کی وجہ سے ان کے پردہ داروں کی پردہ داریاں اکثر وبیشتر ناکام رہتی ہیں۔ میں تو مدتوں سے مشاعروں میں عموماً جاتا نہیں ہوں لیکن آزاد کے اشارے سے خیال آتا ہے کہ غالباً ایسے حالات کم و بیش آج کل کے بڑے مشاعروں میں دکھائی دے ہی جاتے ہیں، پینے پلانے والے آزاد سہی لیکن نشے میں ڈوب جانے والوں کو اس کا ہوش کہاں کہ سامعین کی اکثریت کسی ایک بھی آدمی کی اس قسم کی گھناؤنی اور عریاں رسوائیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے وہاں نہیں جایا کرتی۔ پی کر بہکنے والوں کو پینے اور بہکنے کا حق

سہو لیکن مجلس ادو خیر ہائے مجلس کا بھی احترام کوئی چیز ہوتا ہے۔ حالات کو دیکھ کر سوچنا پڑے گا کہ ایسے مجمعوں میں کسی بھی حیثیت سے شامل ہو کر اس قسم کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا مناسب ہے یا نامناسب۔

اقبال کی شاعری کا انکار بعض باکمالوں نے اپنے لیے مزید طرۂ امتیاز و شہرت و ناموری کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی کمال نہیں، صفت بات یہ ہے کہ اقبال کا کلام ایک آئینہ ہے اس میں ہر صاحبِ فن کے خد و خال کی تصویر نمایاں طور پر نظر آسکتی ہے۔

آزاد کے پہلے مضمون سے مجھے ایک بڑی مفید بات معلوم ہوئی، جس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں وہ یہ کہ اقبال کے "جاوید نامہ" کے "جہاں دوست" سے مراد "وشوامتر" نہیں "شیوجی" ہیں، اگرچہ میرے لیے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ خود اقبال کے نزدیک "جہاں دوست" سے کون بزرگ مراد تھے "وشوامتر" یا "شیواجی" کچھ بھی ہو، اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ دیوار بہ دیوار پڑوسیوں کے ادب و تاریخ و معتقدات سے تسلی بخش اور گہری واقفیت ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے گھر سے واقف ہونا اور یوں بھی محض مفروضات اور مظنونات سے علم کی دنیا میں کام نہیں چلتا۔

آزاد جس ادب و احترام سے حضرت نبی کریمؐ کا نام لیتے ہیں وہ سبق ہے تمام مذہب کے ماننے والوں کے لیے کہ وہ اپنے محبوب و معلوم بزرگوں کی طرح دوسرے مذاہب و اقوام کے اکابر اور محبوب و معلوم بزرگوں کا نام بھی مناسب ادب و احترام سے لیا کریں۔ گو یہ بات دیکھا دیکھی بھی ہو سکتی ہے اور محض اخلاقی لحاظ سے بھی مگر مناسب یہی ہے کہ پہلے پوری ہمدردی سے دوسروں کے مذہبی ادب کو پڑھایا جائے، کیوں کہ دوسروں کا احترام صحیح معلومات ہی سے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ہمارا فرض ہے کہ اپنی ہی نہیں دوسروں کی مذہبی کتابیں بھی اصلی زبان میں نہ سہی کم از کم تراجم ہی کی مدد سے پڑھیں اور اس ہمدردانہ مطالعہ کی روشنی میں اپنے ہمسایوں کے روحانی اخلاقی اور فلسفیانہ ذہنی خزائن کی سیر کیا کریں۔

محب وطن اقبال پر

جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے "اقبال اور قومی یکجہتی" پر کلیدی خطبہ بھوپال یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۴ر جنوری ۱۹۸۶ء کو بھوپال میں پڑھا۔ یہ خطبہ انگریزی میں تھا جسے موصوف نے اپنے دوست ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کی مدد سے اردو میں منتقل کیا اور ساہتیہ اکیڈمی ہریانہ کی جانب سے شائع کیا گیا تو عام طور پر قدردانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند ماہ میں اس کی پہلی اشاعت ختم ہو گئی۔ جناب برنی کے احباب نے اصرار کیا کہ دوسرا ایڈیشن کچھ اضافوں کے ساتھ شائع کیا جائے۔ چوں کہ یہ کتاب انگریزی، اردو اور ہندی کے علاوہ بنگالی، آسامی اور تامل زبانوں میں بھی شائع ہو رہی ہے اور مزید زبانوں میں اس ترجمہ کا امکان ہے اس لیے جناب برنی نے ان تمام اشعار اور نظموں کو متن میں بلا کم و کاست درج کر دیا ہے جن کے حوالے اور اقتباسات ابتداً مختصر دیے گئے تھے تاکہ علاقائی زبانوں کے تراجم پڑھنے والے اقبال کے چیدہ اشعار اور نظموں سے بھی متعارف ہو جائیں۔ غرض خطبہ پر اس طرح نظر ثانی ہوئی کہ یہ کتابچہ سے ترقی کر کے "کتاب" بن گیا اور اس "کتاب" نے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ جو اقبالیات میں ایک اچھوتے موضوع پر پہلی سنجیدہ اور محققانہ کوشش ہے

اور اسے بجا طور پر ایک نئے نام "محبِ وطن اقبال" کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

جناب برقی "برن (بلند شہر) کے ایک ذی علم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس میں علم و ادب کی خدمت کی ایک طویل روایت رہی ہے۔ ۱۴ راگست ۲۲ء کو بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد ۱۹۴۸ء میں آئی اے ایس امتحان میں کامیاب ہوئے اور اڑیسہ اور مرکز مختلف ذمہ دار اور ممتاز عہدوں پر کام کرتے ہوئے ۱۹۸۱ء میں سکریٹری وزارت داخلہ کے عہدے سے ناگالینڈ وغیرہ کے گورنر بنائے گئے۔ اس وقت بھی ہریانہ کے گورنر ہیں۔ ملکی اور قومی خدمات کی اس طویل اور مصروف زندگی میں بھی علم و ادب سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ علامہ اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفہ کا مطالعہ کرتے رہے اور بھوپال یونیورسٹی نے جب آپ کو کلیدی خطبہ دینے کے لیے مدعو کیا تو نہایت اچھوتے اور اہم عنوان پر اپنے مطالعہ کا نچوڑ اس خطبہ میں سمو دیا اور اقبال کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر اور نمایاں کیا جس طرف بہت کم توجہ کی جا رہی تھی بلکہ اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

آپ نے اپنی کتاب میں اقبال کی وطن پرستی، ہندوستانی فکر و فلسفہ کا اثر، تحریک آزادی، قومی یک جہتی نجی زندگی کے آئینہ میں، اقبال اور پاکستان اور نظر باز گشت کے ابواب کے تحت اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفہ کو پیش کیا ہے۔

پہلے باب "وطن پرستی" کے تحت لکھتے ہیں کہ "اقبال پکے محب وطن، مذہبی رواداری کے پُرزور حامی اور ہندوستانی فلاسفروں اور سنتوں کے مدح خواں تھے۔ اسلام سے اپنی گہری وابستگی کے باوصف ہندی فکر و فلسفہ کے عمیق مطالعہ کے بعد اس کی اصل روح سے بیحد متاثر ہوئے تھے۔" اقبال نے ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں اپنی نظم "نالہ یتیم" پڑھ کر ملک گیر شہرت حاصل کی۔ لیکن جب اس کے بعد اپنا پہلا مجموعۂ کلام "بانگ درا" (۱۹۲۴ء) شائع کیا تو اس کی ابتدا، ہمالہ سے کی جس میں اقبال نے ہندوستان کی قدیم تہذیب کے گن گائے ہیں اور ہمالیہ کو ہندوستان کے

تحفظ اور سالمیت کا نگہبان بنایا ہے نیز ان کا ترانہ ہندی" ان کی وطن پرستانہ شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے بھی ترانہ ہندی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس ترانہ کی شانِ نزول بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اقبال کے دوست لالہ ہردیال گورنمنٹ کالج میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ YMCA کے ممبر بھی تھے۔ ایک دن سکریٹری سے کچھ جھڑپ ہو گئی اور ہردیال نے "ینگ مینس انڈین اسوسی ایشن" کی بنیاد ڈال دی۔ کلب کے افتتاحی جلسہ کے لیے اقبال کو صدارت کے لیے مدعو کیا گیا۔ تین بجے شام کو جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا چھ بجے شام جلسہ شروع ہو گیا اور اقبال نے بجائے خطبۂ صدارت کے

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

پڑھنا شروع کر دیا۔ حاضرین پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ کیا یہ محبتِ وطن اقبال کی آواز نہیں ہے؟

"ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" میں بھی اقبال نے مختلف مذاہب کے ہوتے ہوئے ملک کی وحدت اور یکجہتی کا گیت گایا ہے۔ "بچوں کی دعا" میں بھی بچے "وطن کی زینت" بننے کی دعا کرتے ہیں۔ "نیا شوالہ" ناقدین اقبال کے مطابق ہندو مسلم اتحاد پر اقبال کی بہترین نظم ہے۔

اقبال کی شاعری کے دوسرے دور میں انھوں نے نظریۂ قوم پرستی سے بیزاری کا اظہار کیا یہ دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ان کے قیامِ یورپ کا زمانہ ہے۔ جہاں قومیت پر مبنی مغربی تہذیب اپنی تباہی کی طرف بڑھ رہی تھی اور اقبال نے پیشن گوئی کی تھی کہ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ بعد میں اقبال نے وطن پرستی اور قوم پرستی میں فرق کیا بلکہ بین الاقوامی وطنیت کو بھی پیش کیا جس میں "اتحاد و اتفاق" قوموں کے باہمی امن و آشتی پر ہو اور جس میں عظمتِ انسانی کا بول بالا ہو اور دورِ آخر کے کلام میں جذبہ حب الوطنی کا پھر سے اظہار شروع ہو گیا۔ اقبال کا ایمان تھا کہ وطن سے غداری سب سے بڑا اور گھناؤنا جرم ہے "جاوید نامہ" میں اسفل السافلین میں وطن کے غداروں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن : ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن

اپنے ملک سے ان کی محبت ٹیپو سلطان کی زبان سے ادا شدہ ان اشعار میں بھی ظاہر ہوتی ہے جو دریائے کاویری کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔

باب "ہندوستانی فکر و فلسفے کا اثر" میں جناب برنی نے بتایا ہے کہ اپنی شاعری کے اولین عہد میں اقبال نے ویدوں کے ایک اشلوک کو اردو میں نظم کیا تھا۔ ویدانت کے علاوہ اپنشدوں سے بھی متاثر تھے۔ نیز اقبال نے گوتم بدھ کو پیغمبروں میں شمار کرتے ہوئے "جاوید نامہ" میں ان سے اپنی ملاقات کو نظم کیا ہے۔ اقبال نے سنسکرت بھی پڑھی تھی چناں چہ "گایتری" کا ترجمہ کر کے اپنے تمہیدی نوٹ میں لکھا کہ "سنسکرت لفظوں کی باریکیوں کا آج کی مروجہ زبان میں ترجمہ آسان نہیں ہے۔ "گایتری" جو شیرینی اور نغمگی سے بھرپور حرف و صوت کا بے مثل مرقع ہے تقریباً ناقابل ترجمہ ہے میرے اشعار اچھے ہیں تاہم میری نظم کو "گایتری" نہیں کہا جا سکتا۔ اقبال بھگوت گیتا کے فلسفۂ عمل سے بھی بہت متاثر تھے اور سنسکرت کے مشہور شاعر "بھرتری ہری" سے بھی۔ اپنے دوسرے مجموعہ اردو "بال جبریل" کے شروع میں اقبال نے بھرتری ہری کے اشلوک سے ماخوذ یہ شعر درج کیا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اقبال دوسرے مذاہب کے رہنماؤں اور شخصیتوں کے احترام کے قائل تھے۔ ہندوستانی اوتاروں اور سنتوں کا احترام کرتے تھے۔ انھوں نے رام چندر جی پر اپنی نظم میں ان کی بہادری، پاکیزگی اور انسانیت کی گہری محبت کی تعریف کی۔ گرونانک پر اپنی پُراثر نظم میں ان کے نظریہ توحید کو سراہا۔ حتیٰ کہ اپنے ہم عصر "سوامی رام تیرتھ" سے متاثر ہو کر ان پر ایک خوبصورت نظم لکھی، جب بھی موقعہ ملا، ہندوستان کی تعریف کی۔

باب "تحریک آزادی" میں جناب برنی نے اس رنج و کرب کی نشاندہی کی ہے جو ہندوستان کے غلام ہونے پر اقبال محسوس کرتے تھے۔

ان کی ابتدائی نظم " ہمالہ " سے لے کر " فریادِ ہندوستان " کی غلامی پر ایک احتجاجی نظم ہے۔ اقبال نے سودیشی تحریک کی حمایت کی، مغرب کی غلامی پر لعنت بھیجی، مغرب کی عیاری و چالاکی کا طلسم چاک کیا اور اقوامِ مشرق کو بیداری و آزادی کی بشارت دی، فلسفۂ خودی کو پیش کرتے ہوئے اپنی عزتِ نفس کو پہچاننے اور فکر کی تعمیر میں لگ جانے کا پیغام دیا تاکہ یہ غلام قوم خود اعتمادی، خود شناسی اور تعمیرِ خودی سے روشناس ہو۔ ان کے نظریہ خودی میں " آدمِ نو " کی پیدائش کا پختہ عقیدہ بھی پوشیدہ ہے ، " آدمیت ، احترامِ آدمی ، باخبر شو از مقامِ آدمی "

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

" قومی یکجہتی ہندوستانی زندگی کے آئینے میں " میں جناب تنہا نے باب " اقبال کے غیر مسلموں سے تعلقات " پر روشنی ڈالی ہے۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد سے ان کے تعلقات بے ریا دوستی، پر خلوص محبت اور ایک دوسرے کی گہری عزت و احترام کا نمونہ ہیں۔ سر جوگیندر سنگھ سے اقبال کے قریبی تعلقات تھے جنھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پرپوتی شہزادی بمبا دلیپ سنگھ کو اقبال سے ملایا۔ اس ملاقات میں اور خواتین بھی تھیں جن میں سے ایک نے اقبال کو پھول پیش کیا اور دوسری اپنی گود میں خوبصورت بلی لیے بیٹھی رہیں۔ اقبال کی نظمیں " پھول کا تحفہ عطا ہونے پر " اور " ... کی گود میں بلی دیکھ کر " اس موقعہ کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔

اقبال کے ایک اور قریبی دوست سردار امراؤ سنگھ تھے جو مشہور فنکار امرتا شیرگل کے والد ہیں۔ سردار صاحب نے اقبال پر نواب ذوالفقار علی خاں کی انگریزی میں لکھی ہوئی پہلی کتاب کا پیش لفظ لکھا اور اس میں شریک رہے اقبال کی نظموں کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ سروجنی نائیڈو کو اقبال سے بڑی گہری عقیدت تھی۔ اقبال کو اپنے برہمن نژاد ہونے پر ناز تھا۔ مختلف فرقوں کے افراد سے قریبی تعلق رکھتے " آفتاب " جیسی نظم لکھنے اور خصوصاً اپنی نظم " رام " میں ان کو " امام " اور " چراغِ ہدایت " کہنے پر اقبال کو اپنے بعض کٹر ہم مذہب

کی نظر میں معتوب ہونا پڑا ، کسی نے اس بارے میں کفر کا فتویٰ بھی جاری کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جاہلانہ فتویٰ کی بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی جیسے جید عالم دین اور دیگر علماء نے بہت لعن طعن کیا اور یہاں تک لکھا کہ اگر علامہ اقبال جیسا عاشق رسول اور نہایت مخلص مسلمان بھی کافر ہے تو مسلمان کون ہے ؟ شاید اسی لیے اقبال نے کہا :

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا !

اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

باب " اقبال اور پاکستان " میں جناب برنی نے مختلف حوالوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ پاکستان جس شکل میں وجود میں آیا وہ اس کے قطعاً حامی نہیں تھے۔

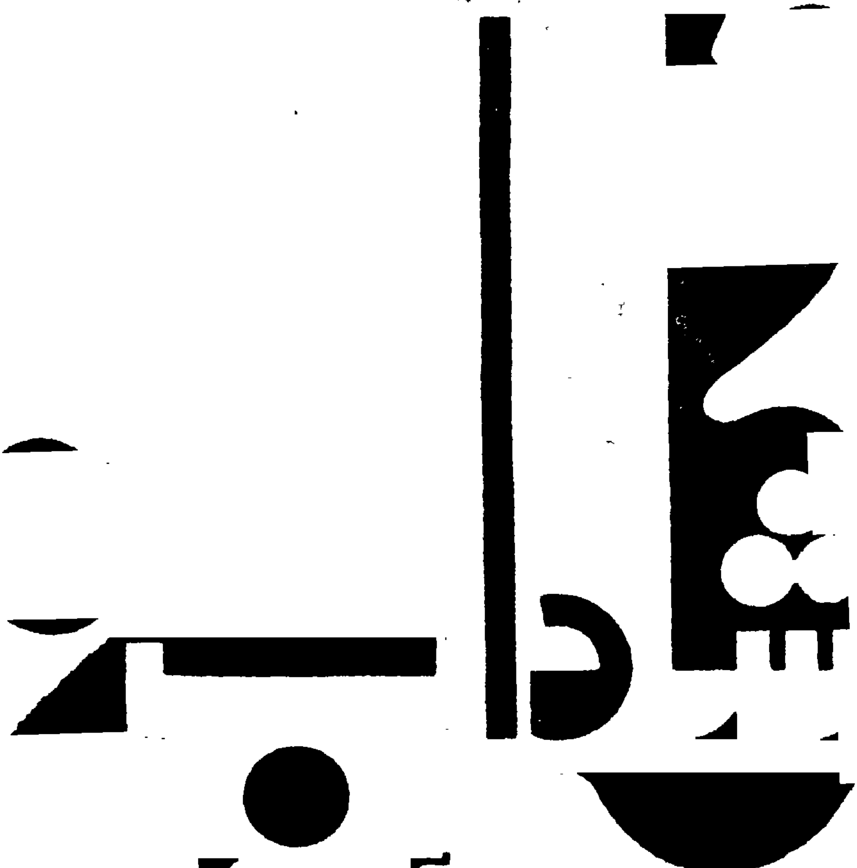
کتاب کے آخری باب " نظر بازگشت میں جناب برنی نے اپنا تجزیہ یا خلاصہ پیش کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندوستانی فکر کو اقبال کی سب سے بڑی دین ان کا نظریۂ خودی ہے۔ " یقین محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم " اقبال کا پیام ہے ۔ جناب برنی نے بڑی بالغ نظری ، محنت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے جو اقبال کی حب الوطنی کے بارے میں ہو سکتی ہیں ۔ انھوں نے اقبال کی شخصیت اور شاعری کے ایسے گوشے بے نقاب کئے ہیں جن کے مطالعے سے اقبال کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے ۔

مختصراً یہ کتاب اقبالیات میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے اور دور حاضر کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے ۔ جناب برنی نے جس عرق ریزی اور جگر کاوی سے تحقیق کی ہے اور جس تلاش و جستجو سے قومی یک جہتی کے زاویہ نگاہ سے اقبال کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے اور جس مدلل انداز میں اسے پیش کیا ہے اس کے لیے وہ قابل مبارک باد ہیں ۔ جناب برنی نے کتاب میں اقبال کی شاعری کے دوسرے گوشوں پر بھی لکھنے کا وعدہ کیا ہے ' اردو والوں کو اور اقبال کے پرستاروں کو اس کا انتظار ہے

"محب وطن اقبال" ہریانہ ساہتیہ اکادمی چنڈی گڑھ نے شائع کی ہے خوبصورت کتابت و طباعت

JUN 1986

ماہنامہ



حیدرآباد

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۳ — شمارہ ۶

جون ۱۹۸۶ء

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری — مینجنگ ایڈیٹر: علی الدین قادری

مجلسِ مشاورت

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دوسالہ 90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 〃
حیات 1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 〃

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل
آرٹ پرنٹنگ پریس [illegible] حیدرآباد میں چھپوا کر
ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

ترسیلِ زر کا پتہ:
11-5-147 ریڈ ہلز
حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش

قیمت فی شمارہ ۵ روپے

فہرست

حرفِ اوّل

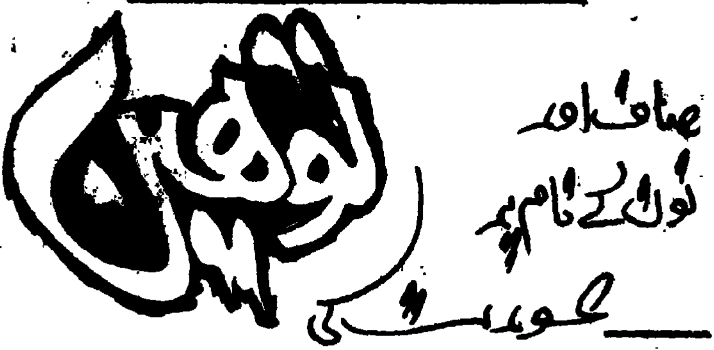
ہمارے گرے ہوئے تعلیمی معیار کے بارے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ پرائمری، سکنڈری اور سکنڈری تعلیم کا معیار تو نہایت پست ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب ہمارا امتحانی نظام حکومتِ ہند نے جو دستاویز "تعلیم کی چنوتی" CHALLENGE OF EDUCATION ی کیا ہے اس کے فقرہ 4.126 میں واضح نشان دہی کی گئی ہے کہ جب تک موجودہ امتحانی ڈھانچہ کو بدلا نہ جائے گا، طریقۂ تعلیم میں بہتری نہ لائی جاسکے گی۔ سالانہ امتحان سے قطع نظر طلباء تعلیمی کیفیت کا لحاظ کرتے ہوئے مسلسل درجہ بندی نہ کی جاسکے گی اور اعلیٰ تعلیمی مقاصد حل نہ ہوسکیں گے۔

نصاب اور طریقۂ تعلیم کی تبدیلی نہایت ضروری ہے۔ آج طلباء کی تعلیمی کیفیت یہ ہے کہ کی اکثریت سالانہ امتحان کے پرچہ سوالات پڑھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی۔ اگر کوئی ھ بھی لیں تو ان سوالات کا مطلب نہیں سمجھ سکتے اور بہت کم تعداد جو سوالات کا مطلب پاتی ہے ان کا خاطر خواہ جواب دینے کے موقف میں نہیں ہوتی۔ طلباء کی بہت کم تعداد جو الات کے مناسب جوابات دے پاتی ہے وہ مدرسہ کی تعلیم کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ خانگی ٹیوشن رتیاری کی بناء پر ہوتا ہے۔ مدرسوں میں نصابی کتب اور ٹیچنگ ایڈز کی کمی سے قطع نظر اساتذہ ملف وجوہ کی بناء پر محنت سے نہیں پڑھاتے اور جو کچھ پڑھاتے ہیں وہ طلباء کے پلّے نہیں پڑتا۔ اساتذہ کا کہنا ہے کہ طلباء میں بنیادی کمزوری ہوتی ہے۔ ہائر سکنڈری کے اساتذہ پرائمری و سکنڈری اساتذہ پر الزام دھرتے ہیں۔ وجہ جو بھی رہی ہو اس بنیادی کمزوری کی وجہ سے عت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ بھی طلباء کی سمجھ میں نہیں آتا اور جب کچھ سمجھ ہی میں نہ ئے تو جماعت میں طلباء کی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اور وہ غیر حاضر اور غیر متوجہ ہونا شروع دیتے ہیں اور سالانہ امتحان کے وقت پڑھنے اور محنت کرنے کی بجائے دوسرے غیر قانونی طریقے استعمال کرکے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ امتحانی نظام ہی ختم کردیا جائے۔ اور سالانہ امتحان کی بجائے ہفتہ واری، ہنتہ ماہی اور ششماہی امتحان کا طریقہ رائج کیا جائے۔

زرعی یونیورسٹی راجندر نگر اور ہوم سائنس کالج سیف آباد میں یہی طریقہ رائج ہے ہر تمام میں طلباء طالبات نصاب کے مقررہ حصہ پر مشتمل یونٹ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں ۔ ہفتہ کے پانچ دن جو تعلیم ہوتی ہے اس حد تک چھٹے دن امتحان ہوجاتا ہے ۔ چار ہفتوں کی تعلیم کے بعد ایک ماہانہ امتحان ہوتا ہے اور تین مہینوں کی تعلیم کے بعد جملہ یونٹ پر مبنی ایک امتحان ہوتا ہے اور اس یونٹ کی تعلیم ختم ۔ دوسری تماہی میں دوسری یونٹوں کی تعلیم ہوتی ہے ۔ اگر کسی طالب علم نے پہلی تماہی کی کسی یونٹ میں کم نمبرات حاصل کئے ہوں اور وہ اس میں اپنے گریڈ کو بہتر بنانا چاہتا ہو تو اسے اختیار ہوتا ہے کہ بعد کی تماہی میں اس یونٹ کو زائد پیش کر کے اس کی دوبارہ تعلیم حاصل کرے اور اس میں زیادہ نمبر لے کر بہتر گریڈ حاصل کرے ۔ اس طرح ایک حصۂ نصاب کی صرف تین ماہ تعلیم ہوتی ہے اور ہفتہ واری ماہانہ اور تماہی امتحان ہوتے ہیں ۔ اور ان تینوں امتحانوں میں حاصل کردہ نمبرات اور دوسرے تعلیمی ریکارڈ کی بناء پر نمبرات دیئے جاکر کامیابی کی سند دی جاتی ہے ۔ اس طریقہ کی خوبی یہ ہے کہ ہفتہ واری وقفہ سے تھوڑا تھوڑا پڑھا کر امتحان لیا جاتا ہے اور اس کے نمبرات بھی کورس کی کامیابی میں شمار ہوتے ہیں ۔ طالب علم کو پڑھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی ۔ اُستاد بھی بخوبی پڑھاتا ہے ۔ اور طالب علم کی عدم دلچسپی اور ناکامی کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا ۔ موجودہ نصاب اور تعلیمی ایڈز کو قائم رکھتے ہوئے اس امتحانی نظام کو نافذ کیا جاسکتا ہے اور تعلیمی معیار کو بڑھایا جاسکتا ہے ۔

اس طریقۂ تعلیم و امتحان سے مزید فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح تعلیم پاکر طلباء انٹرنس امتحانوں میں بآسانی کامیابی حاصل کرسکیں گے ۔ فی الوقت تقریباً ہر اعلیٰ، فنی، ٹکنیکل یا پی جی کورس میں داخلہ کے لئے ایس ایس سی یا ڈگری امتحان میں کامیابی کافی نہیں ہے ۔ اس کے بعد انٹرنس امتحان میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی کے بعد ہی آگے تعلیم میں داخلہ مل سکتا ہے ۔ اور یہ انٹرنس امتحان ESSAY ٹائپ نہیں ہوتے بلکہ OBJECTIVE ٹائپ امتحان ہوتے ہیں ۔ ہمارے طلباء کو ESSAY ٹائپ امتحانات کے بعد OBJECTIVE ٹائپ امتحان کی تیاری میں بڑی مشکل ہوتی ہے ۔ جب ہمارے مدارس میں سالانہ ESSAY ٹائپ امتحان کی بجائے ہفتہ واری، ماہانہ اور سہ ماہی OBJECTIVE ٹائپ امتحان ہوں گے تو اس امتحانی نظام کے بعد طلباء بآسانی انٹرنس میں شرکت اور اعلیٰ نمبرات حاصل کرنے کے موقف میں ہوں گے ۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ



اِدھر کئی دنوں سے مسلم پرسنل لا اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ پر بھارت میں لوگ اپنے اپنے خیالات پیش کر رہے ہیں۔

قرآن مجید کی ۲/۲۴۱ آیت کے حوالہ سے مطلقہ کو نان و نفقہ MAINTENANCE کی بات بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں اس مطالعہ میں سے لوگ صحیح رُخ پر سوچ کر فیصلہ کر سکیں اور معاملہ کی اصل نوعیت تک پہنچ سکیں، اس کے لیے چند باتیں پیش خدمت ہیں:

ایک حقیقت: اول تو یہ کہ قرآن مجید کو دوسرے تو کیا خود مسلمانوں کی ۹۹٪ فیصد تعداد نہیں جانتی ہے کہ قرآن مجید میں ۱۱۴ سورتیں ہیں ۶۲۳۶ آیات ہیں۔ یہ ایک آسمانی کتاب ہے جو اس کائنات کے خالق و مالک نے اپنے خاص بندے محمدؐ پر ۲۳ برس میں نازل کی۔ یہ کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے۔

قرآن اور عورت: اب ہم دیکھیں گے کہ عورتوں کے بارے میں قرآن نے کیا کیا احکامات دیئے ہیں اور موجودہ بحث اور عدالتی کارروائی میں کیا چیز نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ پہلی بات یہ کہ قرآن مجید ۲/۲۴۱ میں طلاق شدہ عورتوں کو فائدہ پہنچانے کی بات کہی گئی ہے۔ یہ بات پوری قانونی تفصیلات اور حالات

کے ساتھ جو آیت نمبر ۲/۲۲۶ سے شروع ہوئی ۲/۲۳۱ تک بیان کی گئی ہے اس پر اگر نظر ڈالی جائے تو بات کا صحیح رخ سامنے آجائے گا۔ آیت نمبر ۲/۲۲۶ سے ۲/۲۳۱ کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا بیٹھیں ان کو چار مہینے سے زیادہ قسم پر تعلقاتِ زوجیت میں رکاوٹ ڈالے رکھنے کی اجازت نہیں۔

قسم نہ کھانا: خاندانی زندگی میں بہت سی الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں کبھی کوئی مرد اپنی بیوی سے تعلقات توڑنے کی قسم کھا بیٹھے تو یہ قسم وہ چار ماہ سے زیادہ تک نہیں چلا سکے گا۔ اسے لازماً قسم توڑنا ہوگی اور دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا یا دس مسکینوں کے تن ڈھک جائیں اتنے کپڑے پہنانے ہوں گے یا دونوں میں سے کوئی ایک بہ قدرت نہ ہو تو تین روزے رکھنے ہوں گے۔ مرد کے لیے یہ ایک روحانی سزا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کے بارے میں کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ قسم نہ کھا بیٹھے اس کا آگے اسے خیال رہے اس حکم میں عورت کو بلا وجہ تنگ کرنے والے مرد پر روک لگادی گئی۔

تین حیض: طلاق پانے والی عورت یا طلاق لینے والی عورت اپنے آپ کو روکے رکھیں یعنی دوسری شادی نہ کریں جب تک، انھیں تین بار حیض نہ آجائے۔ اگر انھیں حمل ہو تو اس کا بھی اظہار کریں اس مدت میں مرد رجوع کرے تو دونوں اپنا گھر سنوار آسانی کے ساتھ بسالیں اور جھگڑے کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ اصلاح اور خاندان کے سدھار کی بات ہر ایک کو دیکھنی چاہیئے، عورتوں کو بھی ایسے حقوق ہیں جیسے مردوں کے ہیں۔ مرد کو خاندان میں صرف انتظامی درجہ حاصل ہے

طلاق صرف دو بار: طلاق کا حق مرد کو صرف دو بار ہے اس دو بار کی طلاق کو رجعی طلاق کہتے ہیں۔ آدمی مقررہ مدت تک اپنا قول واپس لے لے تو بیوی اسی کی رہی لیکن طلاق گنتی میں آگئی کہ طلاق ایک یا دو پڑ چکی ہیں۔ اس مدت میں عورت کو رکھنا چاہے تو

پچھلے طریقے سے رکھے اور رکھنا ہو تو تیسری طلاق کے بعد اب مرد کو حق نہیں رہا کہ اس عورت پر اپنے خاوند ہونے کا دعوےدار بنا رہے بلکہ دونوں میں علاحدگی ہو جائے گی۔ اس صورت میں عورت کو جو بھی مال و زر اور جائداد دیا گیا ہوگا اسے واپس لینے کا مرد کو حق نہیں۔

خلع یا خلاصی : کوئی عورت اپنے مرد سے تنگ آ چکی ہو تو وہ سماج کو اپیل کرکے اس آدمی سے طلاق حاصل کرسکتی ہے، جسے خلع کہتے ہیں یعنی فارقتی یا خلاصی یہ ایک طرح کی ایسی طلاق ہے جو عورت نے گویا خود حاصل کی ہے۔

ایلا کا ہمدرد : کوئی مرد کسی عورت کو تنگ کرکے یا ظلم کرکے اسے روک نہیں سکتا کیوں کہ ناری ابلا ہے اس لیے سماج اس کی مدد کو آگے آئے گا اور خاندانی نظام میں عورت ہی سے چوں کہ سارے رشتے ناطے بنتے ہیں اور جڑتے ہیں نیز BLOOD RELATION بھی عورت ہی کے تعلق سے جڑتے ہیں اس لیے پورا سماج اس کی مدد کے لیے کھڑا رہے گا۔ مرد کو اچھی طرح سے عورت کے درجے و مرتبے کا خیال کرکے اس کی ضروریات پوری کرنے کا عہد قائم رکھتے ہوئے نباہ کرنا ہے ورنہ چاہے تو طلاق دے کر چھٹی کر دیں۔

جبر نہیں مرضی : یاد رکھنا چاہیئے کہ نکاح کے وقت 'لگن' ہندو میں جڑتے وقت پہلے عورت سے پوچھا جاتا ہے اگر عورت اجازت دے تب ہی اس کا نکاح اس کی پسند کے مرد سے ہو سکتا ہے۔ عورت اگر "نہ" کر دے (مسخ کردے) تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی شادی جبری طور پر نہیں کرسکتی حتیٰ کہ اس کے باپ کو بھی یہ حق نہیں۔

اسلامی نکاح : میں چاہوں گا کہ ہمارے قارئین اسلامی نکاح کی تھوڑی سی جھلک بھی دیکھ لیں۔

شادی بیاہ کو عربی زبان میں نکاح کہتے ہیں۔ نکاح کا مطلب ہے

ندھن میں بندھنے کا۔ اس موقع پر کوئی بزرگ باعزت اور مذہبی شخصیت دلہا دلہن کو نکاح کے بندھن میں باندھتے ہیں۔

شادی کے اس موقع پر تین اور حضرات نکاح کی کارروائی میں ہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک دلہن کی طرف سے مقرر کیا گیا وکیل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ لڑکے کی طرف سے منتخب کردہ گواہ ہوتے ہیں۔ وکیل پہلے اس عقد کے متعلق لڑکی کی رضامندی پوچھتا ہے اور اس سوال کے جواب میں لڑکے کی طرف سے دو گواہ شامل ہوتے ہیں کہ لڑکی نے ہاں کہہ دی۔ اسلام میں لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کے والد اور وارث بھی اس کی شادی یا نکاح نہیں کرسکتے۔

عربی زبان میں اسے ایجاب و قبول کہتے ہیں

ایجاب وقبول : ہماری سادی زبان میں اسے تجویز اور منظوری کہتے ہیں (PROPOSAL & APPROVAL) لڑکی سے نکاح کی تجویز لے کر گواہوں کے سامنے لڑکے سے قبول کرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد نکاح رجسٹر میں ان سب کے دستخط ہوجاتے ہیں اس کے بعد قاضی صاحب یا عہدیدار جس کی دیکھ ریکھ یا جس کی دیکھ ریکھ میں یا نگرانی میں نکاح کی رسم ادا ہوئی آپ جو بیان کرتے ہیں اسے خطبہ کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ نکاح کی بہت

خطبہ نکاح : اہمیت بتائی اور نکاح کی کارروائی کا اہم جز بتایا۔ خطبہ خدائی مقدس آسمانی کتاب قرآنِ مجید کی چند آیات اور احادیث رسول پر مشتمل ہوتا ہے جو بے حد مفید خاندانی نصیحت کے جواہر سے بھرپور ہوتا ہے۔

مہر ایک ایسی رقم کو کہا جاتا ہے کہ جو

مہر ایک مالی ضمانت : مقامِ نکاح پر سماج کی گواہی میں لڑکا لڑکی کو ادا کرتا ہے یا ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس مہر کی حیثیت اور اہمیت یہ ہے کہ جب ایک لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنے آپ کو ایک مرد سے نکاح

ذریعہ ہے تو اس کے حقوق کی حفاظت بھی ہونی ضروری ہے۔ قدرت کی
سے کسی متاثر کردینے والی آزمائش کی گھڑی آنے پر اس لڑکی کو کسی کے
ہاتھ نہ پھیلانا پڑے بلکہ ایسا وقت پڑنے پر اس کے پاس خود انتظام
نے کا سہارا موجود رہے یا وہ اپنی مرضی سے اپنے مہر کی رقم کا استعمال
طور پر کرے اسی میں مہر کی روح آ گئی ہے دوسرے الفاظ میں اس عورت
SOCIAL IN-SURANCE بھی کہا جا سکتا ہے اس مہر کو کسی ایک ہی رقم
باندھ لینا مفید نہیں، حالات کو دیکھتے ہوئے جسے دونوں طرف کے
مل کر آپسی رضامندی سے مہر کی رقم مقرر کریں۔ یہ رقم لاکھوں کروڑوں
ہو سکتی ہے یا بہت کم بھی۔ عورت کے حق کی حفاظت کا یہ ایک
یعہ ہے اور سہارا ہے۔ لیجیے اب نکاح ہو گیا۔ گھر سنسار شروع ہوا۔

ازدواجی : مگر انسانی زندگی جھگڑے بکھیڑوں سے بھری ہوتی ہے۔ بیماری، بھوک، ترک وطن، فساد، خاندانی
سے، ساس بہو کے جھگڑے، اولاد کا مسئلہ، مزاج میں ان بن، گناہ
خطرے، اندیشے جیسے شراب، جوا، زنا، بدکاری، فضول خرچی وغیرہ یہ
حالات کبھی کسی جوڑے پر آئے تو طلاق دینا کسی مرد کے لیے جان چھڑانے
ضروری ہو جاتا ہے اور کبھی یہی حالات کسی عورت کے لیے عذاب
جاتے ہیں کہ ایسے مرد سے طلاق لینا یا حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے
یک طرح کی ایسی قدرتی حالت ہے کہ اگر انسانی جوڑوں کو طلاق کا
حاصل نہ ہو اور عورت کو طلاق حاصل کرنے کا یعنی خلع کا حق نہ
تو پھر ایسے جوڑوں کو گناہ یا عذاب کی زندگی مجبوراً گزارنی پڑے گی
ق شدہ عورت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ اس میں سے ہر قسم کی عورت
لیے الگ احکامات کے تحت (MAINTENANCE) دینا مرد کے
مہ ہے۔

ایک حادثہ : ۲۳ر اپریل ۱۹۸۵ء کو ہندوستان کی سپریم کورٹ کا فیصلہ جو شاہ بانو کیس میں دیا گیا، پورے ملک میں

چرچے کا موضوع بنا ہوا ہے۔ مسلم علماء اور دانشور بھی اپنی اپنی رائے لکھ رہے ہیں ہمارے وطن کے دوسرے بھائی بھی اس پر اظہارِ خیال فرما رہے ہیں۔

قدرت کا ایک عجیب اور حسین ترین شاہکار عورت ہے۔ عورت نہ ہوتی تو اس دنیا کی رنگینیاں اندھیاروں میں بدل جاتیں۔ ایسے موقعہ پر ہر ایک کو اس عورت سے ہمدردی ہونا قدرتی بات ہے جو طلاق کا شکار ہوتی ہے لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کہیں ہم نے اندھادھند ایسی باتیں تو نہیں چلا رکھی ہیں جس کے سبب اس دکھیاری کو اور مصیبت میں ڈال دیا جائے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم نے تو ایک ناری کو ابلا کو سہارا دیا ہے اور اسے MAINTENANCE دلایا۔

انصاف کے نام پر گالی : میں چاہوں گا کہ اب ہم اصل واقعہ کی طرف توجہ دیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک عورت چاہے اس کے شوہر نے اسے طلاق دی ہو یا خود اس نے طلاق حاصل کی ہو، دوسری شادی جب تک نہ کرے وہ اپنے اسی پہلے شوہر کی بیوی بدستور باقی رہے گی کیا یہ بات کسی ناری کے لیے کسی باعزت عورت کے لیے گالی کے ہم معنی نہیں جب انصاف کی زبان میں عورت کو یہ کہا گیا ہے کہ :

"..WIFE INCLUDES A WOMAN WHO HAS BEEN DIVORCED BY OR HAS OBTAINED DIVORCE FROM HER HUSBAND AND HAS NOT REMARRIED

نکما کام چور : ہم جو دنیا میں رہتے ہیں کہ جس میں کئی ایسے نکمے کام چور اور شیطان صفت بھی موجود ہیں جو غربت یا کسی اور سبب اپنی بیوی سے جسمانی پیشہ کرا کے پیٹ بھرتے ہیں۔ اب کوئی عورت سماج میں یا کسی قانونی مذہب کے تحت اس ظالم شوہر سے چھٹکارا حاصل کرتی ہے تو ہم اس کی مدد کرنے کی بجائے اسے گالیاں دیتے ہیں نہیں جب تک تو دوسری شادی نہ کرلے اس ظالم مرد کی وائف (WIFE) ہے یہ بات انسانی اخلاقیات یا سماجی انصاف سے میل کھاتی ہے کیا یہ جملہ کسی بھی عورت کو

بچے کا اپنی عزت اور ناموس عزیز ہو گالی نہیں ہے۔

عورت کو ۷/۹/۵ روز آنہ: پھر کورٹ کے اس ترقی پسند سماج میں عورت کی یہ قیمت لگائی ہے۔ کہ ایسی حالت میں ۲۲/۱۷۹ (ایک سو اناسی روپے بیس پیسے) ماہانہ خرچ طے ہے گا جو بعض حالات میں (۵۰۰/-) پانچ سو روپے ماہانہ تک جا سکتا ہے جو بڑھ کر بھی ۱۶/۶۶ (سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے) روزآنہ پر رک گیا ہے۔

غریبی میں آٹا گیلا: اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب ہم دس ماہ ایک مخصوص رقم ایسی مظلوم عورت کے لیے مقرر کردیں گے تو کیا یہ عورت اتنی حقیر رقم میں اپنا گزارہ کر سکے گی۔ روٹی، کپڑا اور مکان تو کیا یہ رقم تو صرف علاج میں بھی پوری نہ پڑے گی۔ یہ انصاف ہے۔ قرآن میں سورہ طلاق میں کہا ہے کہ:

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ

(سورہ طلاق آیت نمبر)

یعنی خرچ کا بوجھ ہر ایک معاملے میں ہر ایک کی حیثیت اور حالات کو دیکھ کر فیصلہ میں لایا جانا چاہیئے جسے روزی زیادہ ملتی ہو اس پر زیادہ بار ڈال دیا جانا چاہیئے اور جس کی مالی حیثیت کم ہو اس پر اس کی حیثیت کے مطابق خرچ کا بوجھ ڈال دیا جائے۔

آسمانی قانون بمقابلہ انسانی قانون: اب اس قرآنی حکم کو انصاف کی ترازو میں تول کر دیکھو تو ہم کو دکھائی دیتا ہے کہ اگر کوئی عورت کسی غریب مزدور کی مطلقہ ہے تب بھی یہ رقم دس ماہ اسے پوری نہیں ہو سکتی اس لیے کہ حساب لگانے پر ۷/۹/۵ پیسے روز آنہ ملے گا آج کل کے اس مہنگائی کے زمانے میں یہ رقم اس کے کس کام کی۔ میرے خیال میں تو ایک بھکارن بھی اس سے زیادہ پیسہ دانا جمع کرتی ہوگی۔ پھر عدالتی فیصلے میں

یہ بھی قبول کیا گیا ہے کہ اسے بڑھا کر چاہا جائے تو اسے پانچ سو روپے ماہانہ کیا جاسکتا ہے۔ چلیے یہ بھی ایک لطیفہ ہوا کہ اب بڑھا کر اگر کوئی عادل منصف چاہے تو پانچ سو روپے ماہانہ کر دے۔ یعنی روزانہ ۱۶/۶۶ پیسے۔ واہ بھئی واہ۔ عورت کے روزانہ خرچ کی بھی خوب رہی۔

مطلقہ کو گالی: کیا یہ انصاف کی عدالت کے شایانِ شان ہے کہ ایک طرف تو مطلقہ عورت کو چاہیے اس نے اپنی ضرورت سے خود ہی طلاق لی ہو پہلے تو گالی دے کر اسے اپنے سابق شوہر کی بیوی بنائے رکھنے پر اصرار ہو پھر اسکا پر دیا کر کے خرچ دلائی جائے تو صرف ۵/۹۷ پیسے یا عدالت بہت مہربان ہوئی ۱۶/۶۶ پیسے روزانہ کسی شاعر نے بھلے ہی اپنے ترنگ میں کہا ہو مگر یہ بات یہاں پوری طرح فٹ ہوگئی ہے ؎

نرالی ہے عدالت مدعی خود جس کے قاضی ہیں
یہاں جو بے خطا نکلے اسے چھوڑا نہیں کرتے

ولہٰ رے بے چاری عورت اس کی کھانا خوراکی میں بھی خوب بڑی قیمت دی گئی ہے۔ ہندوستان میں کسی بھلے مانس کو جاننے میں دشواری نہیں کہ یہاں ایک رکشہ کھینچنے والے کی بیوی بھی اتنی سی رقم میں اپنا خرچ کھانا، کپڑا، دوا، علاج نہیں چلا سکے گی۔

مکان دیجیے مکان: اب قرآن کی سنیے، وہ کہتا ہے:
أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ (سورۂ طلاق آیت ۶)

"طلاق والی عورتوں کو عدت گزارنے کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق رہنے سہنے کا مکان بھی دینا مرد کے ذمہ ہے۔"

اب یہ بتایا جائے کہ قرآن جیسے عورتوں کو مکان کا سہارا دیا کہ مکان نہ ہو تو یہ عورت بھلا کہاں رہے گی۔ آپ نے اسے ۵/۹۷ لطف دے دلادیئے اب وہ سڑک پر بیٹھے گی یا کسی جنگل میں گزارا کرے یا پھر وہ کہیں مکان کرائے پر لے۔ اس زمانہ میں کرایہ کا مکان دو سو سے پانچ سو روپے

نکتہ علما مشکل ہے اس پر پکڑی الٹ ـــــ تو کیا یہ بات انصاف کے ترازو
پر برابر بیٹھتی ہے ؟ یا قرآن کی بات زیادہ انصاف کی ہے۔
اب ایک خطرناک رُخ کی طرف بھی ہمارے اس عدالتی فیصلہ کا اثر پڑے گا
کہ عورت اپنے اس سابقہ گھر میں تو آنے سے رہی۔ البتہ منی آرڈر کی رقم
۲۰/۱۷۹ پتہ نہیں آپ اس کو کس پتہ پر بھیجیں گے جبکہ بیچاری وہ بے مکان ہے۔
منی آرڈر پہنچے نہ پہنچے ہو اگر

منی آرڈر یا نکاح ثانی میں رکاوٹ : رحم دل ہوگا تو وہ اس مطلقہ عورت
کی قیام گاہ پر MAINTENANCE کی رقم ادا کرنے پہنچ جائے گا یا دونوں کے
دل اس وقت قابو میں ہوں گے ایسی حالت میں بھی عورت پر بڑا ظلم ہوگا۔
اسے طلاق دے دینے والا شوہر اس کی جائے مقام پر آنا جانا جاری
رکھے ہوئے ہے تب تو اور بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ کوئی دوسرا آدمی
اس عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے اور کیسے کوئی اس بات کی جرأت
کرسکے گا اس صورت میں تو عورت ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔
بے سہارا بے مکان عورت خدا نہ کرے

حمل کا ذمہ دار کون؟ کہ کہیں اگر حاملہ (PREGNANT) ہوگئی تو
اس بچے یا بچی کا باپ آپ کس کو بتائیں گے۔ سابقہ شوہر کو؟ یا پھر کسی اور کو!
اور بچہ کی پیدائش کا بار کون اٹھائے گا ، بچہ کی پرورش کون کرے گا ؟
اور کہاں ہوگی۔ سابقہ شوہر کے گھر میں تھی نہیں یا ہر مہینہ آپ نے ۲۰/۱۷۹
کا منی آرڈر اسے پہنچا دیا لیکن مکان نہیں تھا ، حفاظت نہیں تھی ، کوئی سہارا
نہیں تھا ـــــ
اب ایک اور پہلو بھی سامنے ہے ،

اب تو میں آزاد ہوں : قرآن مجید نے بچہ کی پرورش کی پوری
ذمہ داری مرد پر ڈالی عورت پر قطعی نہیں ، عدت پوری ہوئی یا وضع حمل ہوا
عورت نے آزادی پائی ، اپنی پسند کا نکاح کرلے اور نہ کرے تو اس کی مرضی۔
سماج میں اس کے خونی رشتہ (BLOOD RELATION) تک بھی دو رشتہ نہیں۔

باپ کے مال کی حقدار، ماں کی وارث، اولاد کی وراثت میں بھی اس کو حق ہے حتیٰ کہ قرآن نے کہا،

وعلی الوارث مثل ذالک

وراثت کا آسمانی قانون : " اخراجات کا بوجھ اسی طرح وارثوں پر بھی ڈال دیا جائے گا"

حتیٰ کہ حدیث شریف میں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس کا کوئی وارث ولی (GUARDIAN) نہیں اس کا میں خود ذمہ دار ہوں، دوسرے معنوں میں سماج یا پنچایت یا حکومت اس عورت کی کفالت کرے گی۔ ایک عورت کو نکاح کا پیغام دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کنواری ہو یا بیوہ ہو چکی ہو، یا شادی کے بندھن والی ہو تو طلاق پاکر (WIFE) بیوی یا زوجہ کی حیثیت سے آزاد ہو چکی ہو یا خلع حاصل کر کے خود طلاق لے کر آزادی کا پروانہ لے لیا ہو کسی کی بندھک نہ ہو تب ہی کوئی شریف آدمی اس سے شادی کی بات سوچ سکتا ہے اور خاندان کے لوگ بیچ میں دلچسپی لے کر نکاح کا پیغام اس عورت تک پہنچانے کو ہلچل کریں گے۔

لیکن جب ہم اپنے قانونی فیصلہ میں

سابقہ شوہر کی سدا سہاگن : طلاق شدہ عورت کو یا خود اس نے اپنی مرضی سے طلاق لی ہو تب بھی اسے اپنے اسی سابق شوہر کی بیوی WIFE ہونے کا TITLE دیتے ہیں تو بہرحال ایسی عورت سے نکاح کرنا تو درکنار بلکہ نکاح کا پیغام دینا (جواب تک کسی کی وائف بنی ہوئی ہے) کس کی ہمت ہو سکتی ہے، اس میں تو خون خرابے کا ڈر ہے کہ کسی کی وائف سے ہم شادی کرنے چلے ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک کو جان لینا چاہیئے کہ شادی بیاہ کسی ایک کے کہنے سے نہیں ہوتا اس میں جب تک مرد اور عورت دونوں اس فیصلے پر نہ پہنچ جائیں شادی بھلا کیسے ہوگی؟ اور کس سے ہوگی؟ کوئی مرد یا عورت چاہے کہ میں شادی شدہ ہو جاؤں اور اس کا جوڑا اسے نہ ملے تو MARRIAGE

ملتا ہے پھر بڑی عجیب بات ہے کہ ہم اپنے فیصلے میں کہتے ہیں:

AND HAS NOT RIMARRIED.

ورت اس کی والف ہے، جب تک دوسری شادی نہ کرلے۔

لیکن انصاف والوں

ت کو دوسری شادی کی اجازت کب؟ سے بڑے ادب سے

ت ہے کہ دوسری شادی اس عورت سے کون کرنے تیار ہے،

بے نے اب تک کسی کی والف بنا رکھا ہے، آپ کو چاہیئے تھا کہ کوئی

ت خود ہی مقرر کرتے کہ عورت کو آزادی کا پروانہ کس تاریخ کو

ن میں مل جائے گا۔ کچھ تو ہو، قرآن مجید نے عورت کے لیے بحال

وقت حالات کے تحت مقرر کر دیا۔

طلاق میں تین حیض، حیض نہ آوے تو تین ماہ۔

قسم کی حالت میں چار ماہ۔

حمل کی حالت میں وضع حمل تک۔

شوہر کی موت ہو جائے تو چار ماہ دس دن اور پھر ایک سال

کی وصیت۔

طلاق کے بعد اولاد کا تمام خرچ مرد پر، حتیٰ کہ

سے پھنسے : گود کے بچے کو دودھ پلانے پر بھی جبر نہیں کیا

ہے تو دودھ پلائے گی وہ بھی دو سال کے اندر آ رہے ہے اور پالنا منظور

سال کا کھانا، خرچ، مقام اور ہر طرح کی سہولت پر رضامند اور پوری

سے اپنی مرضی سے چاہے اس خدمت کو قبول کر کے وقت دے دے

ی کا استعمال کر کے اپنی پسند کا دوسرا نکاح کرلے۔ ع:

آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے

بھائیو! یہ حقیقت کی دنیا ہے سیہ ہندوستان

سے جہاں سے اچھا؟ ہے۔ خدا کے نیک بندوں کا ملک ہے۔ رشی

دیش ہے یہاں مذہب کا تحفظ ہے اور رہے گا۔ آپ ہندوستان

میں رہ کر یورپ کی بات کرتے ہیں۔ بے چارے یوروپ والے ایسے ہی قانون سازی سے بے موت مر رہے ہیں۔

خاندان ایک بے حد پیچیدہ مجموعہ ہے خاندانی

خاندانی پیچیدگی : زندگی کا نظام مختلف اور متنوع پہلوؤں کے درمیان تناسب قائم کرنے سے وجود میں آتا ہے، اس تناسب میں اگر معمولی فرق پڑ جائے تو پورا مجموعہ بگڑ کر رہ جائے گا۔

سستی عیاشی مہنگی شادی : اس کی مثال مغربی ممالک کے وہ قانون ہیں جو نکاح اور طلاق کے روایتی اصلاح کے نام پر بیسویں صدی میں بنائے گئے۔ ان قانونوں میں سے ایک یہ تھا کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق دے تو مطلقہ بیوی کو اسے مسلسل رقم دینا ہوگی۔ حتیٰ کہ اس کی آخری عمر تک، اس کا گذارہ بھی اسے دینا پڑے گا۔ یہ قانون بظاہر عائلی زندگی میں اصلاح کی خاطر بنایا گیا تھا، مگر وہ مغرب کے لیے الٹا پڑا، جب لوگوں نے دیکھا کہ بیوی کو طلاق دینے کی صورت انھیں اس کی بہت بڑی قیمت دینی پڑتی ہے تو لوگوں میں نکاح کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عورت و مرد نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہنے لگے۔ چناں چہ مغرب کی جدید نسل میں آدھے سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو غیر منکوحہ بیویوں کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں۔

یوروپ کے عام آدمی

میری بیوی کون؟ منکوحہ یا معشوقہ : کیا تو بات ہی کیا ہے۔ میں آپ کو برٹرینڈ رسل (BERTRAND RUSSEL) جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت ہی ذہین (بلکہ نوبل پرائز یافتہ) ہے، اس شخص کی بات بتلاتا ہوں، اس نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں مگر ذہنی موافقت نہ ہونے کی وجہ سے تینوں کو طلاق دینا پڑا، یہ طلاق اس کو بہت مہنگا پڑا طلاق کے بعد اس کو اپنی بیویوں کو جو ہزاروں ڈالر کی رقم ادا کرنی پڑی اس نے اس کی معاشیات کو تباہ کر دیا۔ مطلقہ بیویوں کو بھاری ادائیگی برٹرینڈ رسل کو اتنی مہنگی پڑی کہ اس کے بعد اس نے نکاح کا طریقہ چھوڑ دیا اس کے

بعد بھی اگرچہ مستقل طور پر ایک عورت اس کے ساتھ رہی جس کو وہ اپنی "لو یا گرل فرینڈ" "میری بیوی" کہتا ہے مگر اس کی یہ بیوی غیر منکوحہ تھی۔ اپنی بعد کی زندگی میں وہ غیر منکوحہ بیوی کا شوہر بنا رہا۔

مال دار لوگ کنواری لڑکیاں بیاہ کر لائیں گے

گنا چوس پالیسی: اور دو چار سال اس عورت کی جوانی کا رس چوس کر اسے طلاق دیدیں گے اور خوبصورت حسین لڑکی کو بے سہارا بے گھر کر کے آپ کا قانون اس ایلائی بے سہارا عورت کو ۷۹/۲۰ یعنی روزانہ پانچ روپے بیس پیسے دلانے کا حکم لگا کر گھر جا بیٹھے گا۔ پتہ نہیں یہ حقیر رقم کا منی آرڈر بھی ملے گا یا نہیں؟ اس طرح مال دار طبقہ حسین عورتوں کو گنے کی طرح چوس کر سڑکوں پر پھینکتا جائے گا اور قانون منہ تکتا رہے گا کہ عورت کے حق میں فیصلہ دے کر عورت کو اس نے نفع پہنچایا یا اسے بے قیمت کر دیا۔

اس طرح غریب طبقہ کے

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری: لوگ (مرد) جب یہ رقم دینے کو تیار نہ ہوں گے تب بیچاری طلاق شدہ عورت زندہ جلائی جائے گی۔ جس طرح جہیز کے نام پر بیچاری قتل ہوتی ہے اسی طرح نان و نفقہ کے مسئلہ پر (MAINTENANCE) بھی انھیں جلایا جائے گا کہ کون جائے عدالت اور کون دے بہتر ہو کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری' والی کہاوت کے مصداق عمل ہو' کیوں کہ غریب مرد یا ظالم مرد اسے تاعمر نفقہ دینے کی سکت نہ رکھتا ہو تو وہ عورت کی جان کا دشمن بن جائے گا۔

کیا یہ قانون اس بے سہارا عورت کے لیے نفع ہوا یا اس کی بے عزتی اور جان کے خطرے کا سبب ہوا؟ پڑھے لکھے لوگ ذرا سوچ سمجھ کر اس معاملہ میں غور کریں' وکیل ہر طرف کی دیکھنی چاہیئے تصویر کے دونوں پہلو بتائے جائیں گے تو انصاف میں آسانی ہوگی' ورنہ پھر اس قانون کا رواج بڑھ جائے "اور قتل مشکوک ہو کر رہ جائے گی برادری کے تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور

بھیانک اور وحشیانہ سماج میں ہم سب جینے کو مجبور ہوں گے۔

عورت سماج کی بنیاد: ابھی تک ہمارا بھارتی سماج شادی بیاہ کے معاملے میں مقدس 'عزت' 'ناموس' آبرو' شرم و حیا' لاج کا نمائندہ رہا ہے' سماج میں عورت کی عزت و ناموس خطرے میں پڑ جانے سے سماج کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی اور عورت ایک بکاؤ چیز ہوگی اور سر بازار قانون کے ذریعہ مقدس اور پاکیزگی کے لحاظ سے مجروح اور بے حرمت ہو جائے گی۔

پوچھو جو نہ معلوم ہو؟ اچھا ہو کہ قرآن مجید اور اس کے لانے والے کے احکامات اور تفصیلات کی آگاہی حاصل کی جائے۔ سمجھ دار لوگ بحث میں حصہ لیں تو اچھا ہوگا۔ جو لوگ قرآن کی دو ایک بات سے واقف نہ ہوں' ان کو اس مسئلہ میں جاننے والوں سے پوچھنا چاہیئے' ورنہ ان کے لیے خاموشی بہتر ہے۔

اگر مجھے کسی عدالت نے ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کر کے قرآن کے بارے میں سوالات کیے تو انشاء اللہ میں اپنی ۲۵ سالہ مطالعہ قرآنی کی زندگی کو ان کی خدمت میں پیش کر کے عورت کے مقام کو بتا سکوں گا لیکن بازاری باتوں کی طرح ڈھونگی قسم کی بحث میں حصہ لینا کسی عالم کا کام نہیں' یہ ہر کوئی جان لے

کی پرتوں کو کھولتا اور اجاگر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جمال گیاوی نے خوش نویسی کا حق ادا کیا۔ صفحہ ۳۸ پر مقطع ہے:

صورتِ زادِ سفر اے راہی لے کے میں عزم سفر جاؤں گا

دوسرے مصرعے میں "میں" کتابت میں چھوٹ گیا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۴۲ پر یہ شعر:

عطا ہو میری بھی آنکھوں کو برق کی تاثیر مرے بھی سینے میں اک آفتاب رکھ دیتا

یہاں بھی دوسرے مصرعے میں لفظ "بھی" متروک ہے۔ یہ غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں — اور کاتب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کتابت کو اغلاط سے پاک رکھا۔ ایک اچھوتی کتاب خوب صورت پیرہن میں ہے۔ اور اس کی قیمت 25/- روپے کچھ زیادہ نہیں ہے — اس کے تقسیم کار ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکٹ' دریا گنج نئی دہلی 110002 ہیں۔

(ایڈیٹر)

مصنف : امین مالوف
مترجم : قاضی جلیل احمد

صلیب کے سائے میں

— قسط ۳ —

ایک دو ہفتوں کے بعد صلیبی حملہ آور پھر اسی ارادے سے آگے بڑھے لیکن اس بار قلیج ارسلان کو ان کے ارادے کی خبر پہلے ہی سے لگ گئی تھی - اور وہ ان کا استقبال کرنے کے لئے تیار تھا - حملہ آوروں میں نائیٹوں کی ایک کمپنی کے علاوہ لوٹ مار کرنے والوں کا ایک غول بھی شامل تھا - انہوں نے نکانیہ پہنچ کر شہر پر حملہ کرنے کے بجائے شہر کے گرد چکر لگا کر ایک قریبی گڑھی پر جس کا نام زرگورڈن تھا قبضہ کر لیا -

اب سلطان خود میدانِ عمل میں آیا - اور اپنی فوج کے ساتھ زرگورڈن کو گھیر کر اس کا محاصرہ کر لیا - اس وقت صلیبی حملہ آور نشے میں دھت اپنی فتح کی خوشیاں منا رہے تھے اور انہیں پتہ نہ تھا کہ وہ غنیم کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے ہیں - کیونکہ اس گڑھی کے سارے ذرائع آب شہر پناہ کے باہر تھے - اور محاصرہ کی صورت میں پناہ لینے والوں کی پیاس بجھانے کی قلعے میں کوئی سبیل نہ تھی - دیکھتے ہی دیکھتے فرنگیوں کی حالت زار ہونے لگی - اور نوبت بہ اینجا رسید کہ انھوں نے سواری کے جانوروں کا خون اور پیشاب پینا شروع کر دیا - وہ بے تابی سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے کہ زبان پر چار بوندیں ہی ٹپک کر ان کی پیاس کی تسکین کا سامان پیدا کریں - لیکن زمین سخت تھی آسمان دور تھا - اور آسمان پر بادل کا کوئی شائبہ بھی موجود نہ تھا - ایک ہفتہ کے اختتام پر بالآخر ایک نائٹ نے جس کا نام رینالڈ تھا اس شرط پر ہتھیار ڈالنے پر رضامندی ظاہر کی کہ اُسے زندہ اور سلامت شہر سے جانے دیا جائے گا اور قلیج ارسلان کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ رینالڈ تبدیلِ مذہب کر کے مسلمان ہونے اور ترکوں کی فوج میں شریک ہو کر فرنگیوں سے لڑنے بھی آمادہ ہو گیا تھا - چنانچہ اسی شرط پر اُسے اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو قید کر کے شام اور وسطِ ایشیاء کے مختلف شہروں کو روانہ کر دیا گیا اور باقی لوگوں کو تہِ تیغ کر دیا گیا -

اس فتح سے گو سلطان کا سر فخر سے بلند ہو گیا لیکن پھر بھی اس نے اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا ہی رکھا اور اپنے فوجیوں کو مالِ غنیمت لوٹنے کی ایک دن کی مہلت دینے کے بعد اس نے پھر

سے فوجی نظم وضبط بحال کرنے کا حکم جاری کردیا۔ فرنگیوں کے ۶ ہزار جانوں کا نقصان ہوا تھا۔ لیکن (۲۶) سے چوگنا فوج اُن کی ابھی موجود تھی اور یہی وقت تھا کہ ان پر حملہ کرکے ان کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جاتا ۔ قلیج ارسلان نے ایک چال چلنے کی ٹھانی ۔ اس نے دو یونانی مخبروں کو سی دی ٹاٹ کے فوجی کیمپ اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ وہاں پہنچ کر یہ خبر اڑائیں کہ زرگورڈن میں رینالڈس کی فوج بہترین حالت میں ہے بلکہ انہوں نے تو نکانیہ پر بھی قبضہ کرلیا ہے اور اب نکانیہ سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت میں وہ سی دی ٹاٹ والوں کو کوئی حصہ دینا نہیں چاہتے ۔ ادھر ترک فوج ایک مناسب مقام پر فرنگیوں کی گھات لگاکر بیٹھ گئی ۔

جیسا کہ یقین تھا اس جھوٹی خبر پر سی دی ٹاٹ میں بڑے غیض وغضب کا اظہار کیا جانے لگا ۔ ایک مجمع جمع ہوگیا اور رینالڈس کے خلاف لعن طعن کے نعرے بلند ہونے لگے ۔ اور یہ طے پایا کہ بلاتوقف نکانیہ کا رخ کرکے رینالڈس کی تنبیہ کی جائے ۔ لیکن عین وقت پر زرگورڈن کا ایک شکستہ حال لٹا پٹا فوجی سی دی ٹاٹ پہنچ گیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کے ہولناک انجام سے مطلع کیا ۔ قلیج ارسلان کے جاسوسوں نے سمجھا کہ اب کھیل بگڑ چکا ہے وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوچکے ہیں اس لئے کہ اکثر دانایانِ فرنگ نے جلد بازی کرنے کے خلاف صلاح دینی شروع کردی تھی ۔ جلدی اور افراتفری نے ضبط وسکون کے لئے جگہ خالی کردی ۔ جو لوگ عملی کارروائی کے خلاف تھے، انہیں بزدل اور ڈرپوک کہہ کر رد کردیا گیا ۔ اور جو برافروختہ تھے ان کی صلاح درست مانی گئی ۔ اور یوں قلیج ارسلان کی چلی ہوئی چال کامیاب رہی اور جاسوسوں نے حسبِ منشا اطلاع دے دی ۔

۲۱ر اکتوبر ۱۰۹۶ء کی صبح فرنگیوں نے سی دی ٹاٹ میں اپنے کیمپ سے خروج کیا ۔ قلیج ارسلان کی فوج بھی راستے کی پہاڑیوں میں چھپی ان کی آمد کی منتظر تھی ۔ تھوڑی ہی دیر میں فرنگی سواروں کے مرکبوں کے پاؤں کی گرد فضا میں اڑتی دکھائی دینے لگی ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے فرنگی رسالہ قریب آپہنچا یہ فوج کئی سو نائٹوں پر مشتمل تھی جو سر سے پیر تک لوہے کے خود اور زرہ بکتر میں ملبوس تھے اور فوج کے آگے آگے چل رہے تھے ۔ ان کے پیچھے پیادہ فوج کی بھاری تعداد تھی ۔ اتنے میں سورج سلطان کی سپاہ کی پشت کی طرف سے طلوع ہوکر فرنگیوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا ۔ سلطان نے اپنے سرداروں کو تیار باش کا حکم دیا ۔ اور پھر اس کے دوسرے حکم پر ایک ہزار کمانوں سے چھوڑے گئے تیر عقابوں کی طرح دشمن پر جھپٹے ۔ پہلے ہی چند لمحوں میں کئی نائٹ تیروں سے زخمی ہوکر زمین پر آرہے ۔ اُن کے بعد پیادوں کی باری آئی ۔

دست بدست جنگ کی نوبت آنے تک فرنگی فوج میں بھگدڑ پڑ گئی تھی ۔ جو لوگ بچے تھے وہ

اپنے کیمپ سی دی ٹاٹ کی طرف فرار ہونے لگے ۔ جہاں لوگ ابھی ابھی خواب سے بیدار ہونے لگے تھے ایک معمر پادری صبح کی عبادت کروا رہا تھا کہ بھاگنے والوں کے پیچھے ترک فوج کے سوار بھی کیمپ میں داخل ہونے لگے ۔ کیمپ میں چاروں طرف ہراسانی پھیل گئی جس کا منہ جدھر اٹھا وہ اُسی طرف کو دوڑنے لگا ۔ بعض لوگوں نے دوڑ کر ساحل سمندر کے قریب ایک قلعہ میں پناہ لی اور قلعے کے دروازے بند کر لیے ۔ سلطان نے بلا وجہ خطرات مول لینا مناسب نہ سمجھا اور اپنی فوج کو واپسی کا حکم جاری کیا ۔ کچھ لوگوں کو بازنطینی جہازوں نے بچا لیا ۔ اور اس طرح تین چار ہزار آدمیوں نے جان بچائی ۔ فوج کا سردار راہب پیٹر جو اس وقت قسطنطنیہ میں تھا وہ بھی بچ گیا ۔ باقی فوج کا خاتمہ ہوگیا ۔ نوجوان عورتوں کو بطور مال غنیمت سرداران فوج میں تقسیم کر دیا گیا یا پھر غلام بنا کر بیچ دیا گیا ۔ یہی حال اکثر کم سن لڑکوں کا بھی ہوا ۔ باقی فرنگی فوج جس کی تعداد ۲۰ ہزار سے کسی طرح کم نہ ہوگی موت کے گھاٹ اتار دی گئی ۔

قلج ارسلان کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا ۔ اس نے فرنگیوں کی ایک بڑی فوج کا خاتمہ کر دیا تھا جب کہ خود اس کی اپنی فوج کے جانی نقصانات بہت کم ہوئے تھے ۔ اپنے قدموں کے اطراف بکھرے اس مال غنیمت کو دیکھ دیکھ کر اس کا سر فخر و غرور سے تن گیا ۔ لیکن اس فتح کی سلطان کو بہت بڑی قیمت چکانی پڑی ۔ کیوں کہ اس فتح سے سلطان کو اپنی فوج کی برتری اور دشمن کی کم تری کا احساس پیدا ہو گیا تھا ۔ اس کی وجہ سے وہ دشمن کی نقل و حرکت سے غافل ہو گیا ۔ چنانچہ موسم سرما میں جب دوبارہ ایک بڑے بحری بیڑے کے قسطنطنیہ کی سمت آمد کی اُسے اطلاع پہنچائی گئی تو سلطان نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا ۔ نہ صرف سلطان بلکہ اس کے بہترین اور تجربہ کار سردار بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جب چاہے دشمن کو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیا جائے گا ۔ چنانچہ فرنگیوں کی طرف پہلی سی توجہ مبذول کرنے کے بجائے اس کی توجہ اب ہمسایہ ترک ریاستوں کی طرف مبذول ہو گئی تھی ۔

ویسے سلطان کا اس طرف توجہ کرنا کچھ غلط بھی نہ تھا ۔ ان ہی ترک ہمسایوں سے لڑتے ہوئے اس کے باپ سلیمان نے ۱۰۸۶ء میں جان دی تھی ۔ قلج ارسلان کی عمر اس وقت بمشکل سات برس تھی ۔ اور اُسے کئی وفادار سرداروں کی ریجنسی میں اپنی عمر کو پہنچ کر زمام حکومت ہاتھ میں لینا تھا ۔ اسے اقتدار سے دور رکھنے کے لئے ایران لے جایا گیا ۔ اس بہانے سے کہ یہاں اُس کی زندگی کو خطرہ ہے ۔ اور گو وہاں اسے بہت ناز و نعمت اور بڑی عزت اور تعظیم کے ساتھ خادموں اور نوکروں کی ایک چھوٹی سی فوج کے درمیان رکھا گیا لیکن بہت قریب سے اس کی

نگرانی بھی ہوتی رہی ۔ اس کے میزبان، بہ الفاظِ دیگر اس کے داروغہ ہائے زنداں کوئی اور نہیں اسی کے خاندان کے افراد یعنی سلجوقی امیر تھے ۔

گیارہویں صدی ہجری میں اگر کوئی نام چین کی سرحد سے لے کر فرنگیوں کی سرزمین تک مشہور تھا تو وہ تھا سلجوقیوں کا نام ۔ وسطِ ایشیاء سے نکل کر مشرقِ وسطیٰ کے ممالک مثلاً عراق، شام، فلسطین اور لبنان میں چند ہی سالوں کے اندر اندر سلجوقی ترکوں نے اپنے ہزاروں ترک رفیقوں کی مدد سے افغانستان سے بحیرۂ روم کے ساحل تک سارے علاقہ پر قبضہ کر لیا ۔ ۱۰۵۵ء سے بغداد کا خلیفہ امیرالمومنین نائب رسول اور عباسی خلافت کا نام لیوا، کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہی ۔ اصفہان سے دمشق تک اور یروشلم سے لکانیہ تک سارے علاقوں کے حکمران یہی سلجوقی ترک تھے ۔ اور ہر جگہ انہی کا حکم چلتا تھا ۔ سو سو سالوں میں پہلی مرتبہ پورا مشرقِ وسطیٰ ایک خاندان کے زیرنگیں آیا جس نے اسلام کی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ بحال کرنے کی قسم کھائی تھی ۔ بازنطینی روم جس کو سلجوقیوں نے پامال کیا پھر کبھی طاقت حاصل نہ کر سکا ۔ ان کا سب سے بڑا صوبہ اناطولیہ میں سلجوقی گھس آئے یہاں تک کہ قسطنطنیہ بھی سلجوقی تاخت سے محفوظ نہ رہا ۔ بازنطینی شہنشاہ بہ شمول ایلکسیس نے ایک کے بعد ایک ایلچی رومتہ الکبریٰ پوپ کے پاس مدد کے لئے روانہ کرنے شروع کئے اور اس سے اسلام کی اس بڑھتی ہوئی لہر کو روکنے کے لئے امداد کی اپیلیں کرنے لگے ۔

ایسے جلیل القدر خاندان سے تعلق رکھنے پر قلیج ارسلان بھی فخر محسوس کرتا تھا ۔ لیکن اس ظاہری یک جہتی سے متعلق اسے کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہ تھی ۔ کیوں کہ ان لوگوں میں دراصل سرے سے کوئی یک جہتی تھی ہی نہیں ۔ اپنی خیر چاہتے ہو تو حریف کو قتل کرو ۔ یہی ان کی پالیسی تھی ۔ قلیج ارسلان کے باپ نے ایشیائے کوچک کو فتح کیا تھا لیکن اس میں اس کے بھائیوں سے کوئی مدد نہیں ملی تھی اور جب اس نے آگے بڑھ کر جنوب میں ملک شام میں پیش قدمی کرنی چاہی، تو اسی کے ایک برادرِ عم زاد نے اسے قتل کر دیا ۔ قلیج ارسلان کو جبراً اصفہان میں روک رکھا گیا اور اس کی ریاست ٹکڑے ٹکڑے ہو کر انہی سلجوقی امیروں میں تقسیم ہو گئی ۔ اور جب ۱۰۹۲ء میں ان قید کرنے والوں میں آپس میں نزاع برپا ہوئی تب جا کر قلیج ارسلان کو رہائی نصیب ہوئی ۔ اور اس نے اپنے باپ کے علاقے پر دوبارہ قبضہ کیا ۔ ابتداء میں اس کا اقتدار بمشکل حوالی کفائیہ تک محدود تھا ۔ اور اس وقت اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی ۔

اپنی فوج کے سرداروں کے مشورہ سے اس نے اپنی مملکت کا ایک حصہ کبھی جنگ، کبھی قتل اور کبھی چال بازی کی مدد سے حاصل کیا ۔ وہ فخر کیا کرتا تھا کہ اس نے زیادہ تر وقت محل کے بجائے گھوڑے

کی پیٹھ پر گزارا ہے۔ تاہم جب فرنگیوں کی یلغار شروع ہوئی تب تک بازوالیسی سلطنت کی تگ و دو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ایشیائے کوچک میں اس کے حریف اب بھی بہت طاقت ور تھے البتہ اس کی قسمت سے شام اور ایران کے سلجوقی جو اُن میں سب سے زیادہ طاقت ور تھے آپس میں دست بگریباں تھے۔

مشرق میں اناطولیہ کے ویران پہاڑی علاقوں میں ان دنوں جو امیر حکمران تھا اس کا دانش مند تھا۔ دیگر ترکی امیروں کے برخلاف جو اکثر جاہل اور ناخواندہ تھے۔ یہ امیر علم و فضل سے آراستہ تھا۔ اور بہت جلد وہ ایک رزمیہ کا ہیرو بھی بن گیا جس کا نام تھا کارنامیات دانش۔ وہ ایک آرمنی شہر ملاٹیا کا حکمراں تھا جو انقرہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اس حکایت کے مصنف کے خیال میں اس شہر کی فتح نے ایشیائے کوچک میں اسلام کی راہ ہموار کی اور آج کا ترکی اسی فتح کی دین ہے۔ ملاٹیا کی جنگ کا آغاز ۱۹۰۷ء میں اس وقت ہوا جب فرنگی بیڑہ قسطنطنیہ میں داخل ہو رہا تھا۔ ادھر دانش مند نے ملاٹیا کا محاصرہ کیا ادھر نوجوان سلطان نے حریف کی اس معروفیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے باپ کے ملک کی بازیابی کے لئے منصوبہ بندی شروع کردی۔ اور اپنا فوجی رسالہ لے کر خود بھی ملاٹیا پہنچ گیا تاکہ دانش مند کو شہر کی تسخیر سے باز رکھ کر کامیابی کی سربلندی حاصل کرنے سے باز رکھے۔ فریقین ایک دوسرے پر چھاپے مارنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت جب قلیج ارسلان ایک فیصلہ کن جنگ کی منصوبہ بندی کر رہا تھا ایک خبر رساں نے اطلاع دی کہ فرنگیوں نے پھر ایشیا کا رخ کیا ہے اور ان کی فوج پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں آبنائے باسفورس کو عبور کر رہی ہے۔ لیکن قلیج ارسلان کو اس سے کوئی تشویش لاحق نہ ہوئی۔ اس کے خیال میں تشویش کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کس طرح فرنگ سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔ لہذا ملاٹیا کا محاصرہ اٹھانے کے بجائے سلطان نے ایک چھوٹی سی فوج قلعہ والوں کی ہمت بندھانے کے لئے اور خصوصاً اپنی بیوی کو دلاسا دینے کے لئے نکانیہ روانہ کردی۔ نکانیہ میں قلیج ارسلان کی بیوی حاملہ تھی اور وضع حمل کا زمانہ قریب تھا۔ اس نے سوچا جیسے ہی دانش مند کا فیصلہ ہو جائے گا نکانیہ کو واپس لوٹ آئے گا۔

قلیج ارسلان پوری تندہی کے ساتھ دانش مند سے برسرپیکار تھا کہ ایک اور ہرکارہ نکانیہ سے تازہ ترین خبریں لے کر پہنچا۔ اب اُسے پتہ چلا کہ اوائل ماہ مئی میں فرنگی نکانیہ کی دیواروں کے نیچے پہنچ گئے اور انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ گذشتہ موسم گرما کے برخلاف اس مرتبہ یہ حملہ آور محض پیچھے چلا ... لوٹ کرنے والوں کی جماعت نہ تھی بلکہ ہزاروں کی تعداد میں زرہ بند نائیٹوں کی ایک

بڑی منظم فوج تھی۔ ساتھ ہی بے سی لس کے سپاہی بھی اب کی بار ان کے ساتھ تھے۔ قلیچ ارسلان نے اپنے سپاہیوں کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی لیکن خود اس کا اطمینان قلب رخصت ہوچکا تھا۔ کیا اُسے ملاٹیا کو خیرباد کہہ کر اپنے حریف کو نام آوری کا موقعہ دینا چاہیئے؟ کیا ملاٹیا کو چھوڑنے کے بعد بھی وہ اپنے شہر کو دوبارہ حاصل کرسکے گا؟ کیا اس طرح دونوں طرف سے اس کی ہار نہیں ہوگی؟ اپنے معتمد سرداروں سے طویل صلاح ومشورے کے بعد ایک راستہ سجھائی دیا۔ وہ خود دانش مند کے پاس صلح کا پیغام لے کر جائے گا۔ اور اُسے بتائے گا کہ کس طرح شہنشاہ روم نے بیرونی امداد کے ذریعہ سارے ایشیائے کوچک پر قبضہ کا منصوبہ بنایا ہے۔ اور کیسے اس علاقے کے سارے امیروں کے لئے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اور آپسی جھگڑے کو ختم کرنے کی اپیل کرے گا۔ دراصل دانش مند کے جواب دینے سے پہلے ہی قلیچ ارسلان نے اپنی فوج کا ایک حصہ لکانیہ کی جانب روانہ کردیا تھا۔

کئی دنوں کی گفت وشنید کے بعد قلیچ ارسلان اور دانش مند میں ایک عارضی صلح نامہ طے پایا۔ اور قلیچ ارسلان کو مراجعت کا موقعہ ملا۔ لیکن لکانیہ کے قریب جو نظارہ اُسے دیکھنے کو ملا اس نے اس کی رگوں میں خون کو منجمد کردیا۔ ہزاروں لاکھوں کا ٹڈی دل شہر کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ ہر طرف منجنیقیں اور دروازہ شکن آلات کی بھرمار تھی۔ قلیچ ارسلان کے سرداروں نے بیک زبان یہی کہا کہ اب محاصرہ اٹھانے کے لئے جنگ کرنے کا خیال عبث ہے۔ دشمن اس قدر طاقت ور ہے کہ اس وقت مقابلے کا خیال بے کار ہے۔ لیکن نوجوان سلطان دشمن سے دو ہاتھ کئے بغیر مقابلے سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ تھا۔ ۲۱ رمئی کو دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ جانبین کے ہزاروں آدمی کام آئے لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔ اب سلطان نے محسوس کیا کہ مقابلے کا خیال واقعی فضول ہے۔ وہ اپنے سارے آزمودہ کار لشکر کو ایک شہر کی تسخیر کے لئے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فوج ہے تو شہر پھر کبھی فتح ہوسکتا ہے۔ فوج اگر ایک بار تباہ ہوجائے تو سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ یہ سب سوچ کر اس نے شہر کے لوگوں کو اپنا آخری پیغام بھجوایا اور اندرون ملک روانہ ہوگیا۔ اس کے بعد اسے پھر کبھی لکانیہ کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

ضروری اطلاع: ماہنامہ شاداب نے اپنی زندگی کے دو سال پورے کرلئے ہیں۔ تیسرا سال شروع ہوچکا ہے۔ امید ہے کہ آپ نہ صرف سابقہ زرسالانہ روانہ فرمائیں گے بلکہ تجدید خریداری سے بھی نوازیں گے۔ شاداب کو وی پی سے بھجوانا ہمیں اس لئے پسند نہیں کہ آپ کو وی پی کے غیر ضروری صرفہ سے بچایا جائے۔ رقم منی آرڈر سے بھجوائی جائے تو نوازش ہوگی۔

— ایڈیٹر —

سکندر توفیق

عہدِ حاضر، اسلام اور خانقاہی نظام

(تیسری اور آخری قسط)

اللہ کے بے شمار نام ہیں لیکن قرآن حکیم اور حدیثِ نبوی میں صرف ۹۹ نام ہی مذکور ہوئے ہیں لہٰذا ان ہی ناموں کو شرفِ قبولیت حاصل ہے۔ باقی تمام اسمائے الٰہی ـ بے شک مختلف مذاہب میں خدا کے نام سہی ـ ان کی حیثیت اب متروک الفاظ کی سی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے مسٹر Mr اور شری کی مثال ہی کافی ہے۔ انگریزوں کے اثر سے آزاد ہوجانے کے باعث اب ہم بہت کم مسٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی لغوی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ " یا مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام" والے رویہ کو بظاہر صلح کل اور خیر سگالی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ منافقانہ طرزِ عمل ہے جس کو صوفی تو رہے ایک طرف ایک عام شریف انسان بھی اچھا نہیں کہہ سکتا۔ اول یہ تو یہ محض شاعری ہے دوسرے صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اپنی بات کو سمجھانے کے لئے مخاطب کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا چاہیئے۔ لیکن ان اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا کہ تمام صوفی وحدتِ ادیان کے قائل اور ہر مذہب کو سچا اور نجات دہندہ مذہب سمجھتے تھے، ایک انتہائی گمراہ کن بات اور بہتان ہے۔ اپنی ابتداء میں یہ الہامی مذاہب اپنے دَور اپنے خطہ کے انسانوں کے لئے بے شک سچے اور صحیح تھے لیکن پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کسی مذہب کو شرفِ قبولیت Legal tender یا Divine Sanction حاصل نہیں رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو غزواتِ محمدی سے لے کر خواجہ معین الدین چشتیؒ کی جے پال جوگی کے خلاف جدوجہد سب ہی فضول، لایعنی اور لغو قرار پاتیں۔ اس سلسلے میں اکثر اوقات مسلمان صوفی میاں میر کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ بات بہت عام ہے کہ سنہری گردوارہ Golden Temple کا سنگِ بنیاد مسلمان صوفی میاں میر نے رکھا تھا۔ لیکن میری نظر سے یہ بات نہیں گزری کہ کس وقت یہ وہ

پتہ: ثمین ـ تلک نگر ـ حیدرآباد ۴۴ ۵۰۰۰

پیش آیا ۔ گرونانک کے سفرِ حج کے فوری بعد یا اس سے پہلے ۔۔ اگر یہ واقعہ حج کے فوری بعد پیش آیا تھا تو ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ میاں میر بھی، ایک عام مسلمان کی طرح ۔۔ حاجیوں کے بارے حسن ظن رکھتے تھے ۔ شاید اس وقت تک گرونانک کی قلب کی ماہیئت بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ انہوں نے کسی نئے فرقے کا اعلان کیا تھا ۔ اگر یہ بات ثابت بھی ہوجائے تو اسے ہم ایک صوفی کی انفرادی غلطی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ اسے وحدتِ ادیان کا ثبوت اور نظیر ٹھہرانا انتہائی غلط بات ہوگی ۔

لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج کی خانقاہیں "اپنے اپنے مذہب کی پیروی کرو" کے خاموش نعرے سے گونج رہی ہیں ۔ یہ بات ایک سیاسی پلیٹ فارم پر ہی اچھی لگتی ہے خانقاہ میں نہیں ۔۔ یہ " مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا " کا بے محل استعمال ہے ۔۔ خانقاہ، جو اصل معنوں میں خانقاہ ہے اسلام کی صراطِ مستقیم اور دینِ قیم ہی کو حق ٹھہرائے گی اور باطل کو باطل کے نام ہی سے پکارے گی ۔ چاہے اسے بیر رکھنا ہی کیوں نہ کہا جائے ۔ اسی کو قرآن حکیم میں اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ کہا گیا ہے ۔ یعنی بنیادی اور اصولی باتوں میں کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کیا جائے ۔ لکم دینکم ولی الدین کی مکی آیت سمجھوتے کی نہیں لاتعلقی کی نقیب ہے ۔ اسی لئے بعض مفسرین نے سورۃ کافرون کو منسوخ کہہ دیا ۔ ملاحظہ ہو "معارف القرآن" صفحہ ۸۳۴ ۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد شفیع مصنف معارف القرآن فرماتے ہیں کہ "صحیح یہ ہے کہ یہاں لکم دینکم کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو کفر کی اجازت یا کفر پر برقرار رہنے کی ضمانت دیدی گئی ہے بلکہ اس کا حاصل وہی ہے جو لنا اعمالنا ولکم اعمالکم یعنی جیسا کروگے ویسا بھگتوگے ۔ اس لئے جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورت منسوخ نہیں ۔

راقم الحروف بھی یہی سمجھتا ہے کہ یہ آیت سمجھوتے یا صلح کی نہیں لاتعلقی کی نقیب ہے ۔ اور اسی قدر سخت ہے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو عاق کردے ۔ یہ آیت اعلانِ جہاد سے زیادہ سنگین ہے کیونکہ جہاد میں کم از کم تادیب کے ذریعہ اصلاحِ حال کی سعی کا تعلق خاطر تو شامل رہتا ہے ۔

ہماری آج کی خانقاہیں، تہذیبی، معاشی اور سیاسی دباؤ میں آکر غیر مسلموں کے ساتھ وسیع النظری اور رواداری کا بے مہار رویہ اپنائے ہوئے ہیں ۔ لیکن مسلمانوں اور اپنوں کے ساتھ ایسی شدید تنگ نظری، بغض اور عداوت ہے کہ جس کی مثال ملنی مشکل ہے ۔ پہلے تو طریقت کے چودہ خانوادوں یعنی قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ،

تہذیب وغیرہ میں بے وجہ برتری اور کم تری ڈھونڈنے کی کوشش ہے تو دوسری طرف شریعت پر چلنے والے عام مسلمان کی۔ جو کبھی بھی طریقت کا دعویٰ نہیں کرتے ۔ جا و بے جا گرفت اور لعنت ۔ ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہیئے ۔

ابھی حال ہی کی بات ہے کہ آندھرا کے ایک علاقہ میں ITI کے قیام کے لئے مسلمانوں ایک Educational Society تشکیل دی۔ باقاعدہ رجسٹری کرانے کے بعد کچھ چندہ بھی جمع کر لیا گیا۔ اور ایک صاحب خیر نے بقیہ رقم تقریباً ایک لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ جیسے ہی یہ بات عام ہوئی سنت والجماعت کے نام پر بہت سے مسلمان ان صاحب خیر کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ انجمن کے کرتا دھرتا تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں لہذا چندہ نہ دیا جائے ۔

تبلیغی جماعت جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہے کوئی مذہبی فرقہ نہیں۔ بلکہ کلمہ گویوں کا ایک اجتماع ہے جس میں حنفی، شافعی، مالکی وغیرہ تمام مسلم فرقوں کو شامل ہونے کی اجازت ہے۔ لیکن خانقاہ نشینوں نے اس بات کا کوئی لحاظ نہ رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا آج تقریباً دو تین سال سے یہ رقم تشنۂ تکمیل اور ITI کی تجویز ادھوری ہی ہے ۔ آج مسجدوں میں تبلیغی جماعت اور نام نہاد سنت والجماعت میں مناقشے چلتے رہتے ہیں اس کا ایک سبب Mutual Communication یا باہمی رابطے کی کمی بھی ہے اور بعض صورتوں میں کینہ، ضد اور ذاتی مفاد بھی ۔

ذرا خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ پر نظر ڈالیئے ۔ آج سے آٹھ نو سو برس پہلے خواجہ غریب النواز نے چلّہ دینے کا وہی طریقہ اختیار کیا تھا جو ان سے صدیوں بعد مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں تازہ کیا۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دو نہیں پورے بیس سال کا چلہ دیا اور اپنے پیر خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ قریہ بہ قریہ پھرتے اور علم دین حاصل کرتے رہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کے لوگ خانقاہوں کے عبا پوشوں سے زیادہ عملی طور پر خواجہ غریب النواز کی پیروی کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ کے لئے غیر دینی ماحول سے نکل کر، سفر کے ماحول میں ہمہ تن دین کی طرف رجوع ہو کر اپنے دل و دماغ اور اپنی نفسیات کو دینی بنانے کے لئے کوشاں ہیں ۔

خانقاہ نشین بزرگوں کو طالبانِ حق کی ان کوششوں پر مسرور ہونا چاہیئے تھا اور ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے تھی اور بعض بزرگوں نے یہ کیا بھی ہے۔ لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو

اس تحریک کے مخالف ہی رہے۔ حالانکہ قرآن حکیم میں بھی مجاھدون یعنی کوشش کرنے والا قاعدون یعنی محض بیٹھے رہنے والوں پر ترجیح دی گئی ہے۔ تبلیغی جماعت اور جاہیے بھی کیا صرف طرزِ صحابہؓ پر اپنے قول وفعل کی بنیاد رکھنا۔ افراط کی طرف جاکر حفظِ مراتب کو ترک کر پیرانِ پیر کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لگانا خود پیر دستگیرؒ کے عمل سے انحراف ہے تو تفریط طرف جاکر بزرگانِ امت کی توہین کرنا بھی کوئی مستحسن بات نہیں ـــــ اس آپسی اختلاف کو اب ختم کر دینا چاہیئے۔

سنت والجماعت کی دہائی دینے والے خانقاہ نشین شیوخ و حضرات نہ صرف یہ کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ۲۰ سالہ چلہ کو فراموش کر دیتے ہیں، وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ پیرانِ پیر رح امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے نہیں امام حنبلؒ کے مسلک پر عمل پیرا تھے۔ حالانکہ آج قادری سلسلے کے اکثر بزرگ حنفی ہیں۔

یہ بات بطور اعتراض کے عرض نہیں کی گئی بلکہ اس سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ اختلاف الائمہ کے نمونے پر امت مرحومہ کے یہ اختلافات امت کے لئے زحمت کا نہیں رحمت کا باعث ہونا چاہیئے۔ جس طرح ایک درخت کی مختلف شاخیں شکل، جسامت اور طول وعرض میں الگ ہوتے ہوئے بھی اصلاً ایک ہی ہوتی ہیں اور ان پر لگنے والے پھل بھی ایک ہی نام اور مزے کے ہوتے ہیں اسی طرح تبلیغی جماعت بھی ہے۔ جو محض مسلمانوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کوشاں ہے۔ مسلمانوں میں تبلیغ کے نقطہ پر اچنبھا ظاہر کرنے والے اس بات کا احساس تک نہیں کرتے کہ صورتِ حال اتنی بھیانک ہوگئی تھی اور مسلمان اسلام سے عملی طور پر اتنی دور ہوگئے تھے کہ باقاعدہ تبلیغ کے پیمانے پر کلمۂ طیبہ اور اوامر ونواہی کو سمجھانے کی ضرورت لاحق ہوگئی تھی۔ یہ صورتِ حال خانقاہوں کی بہتات کے باوجود برقرار تھی۔ اہلِ خانقاہ نے کبھی اس طرف توجہ نہ دی۔ حالانکہ ایصالِ ثواب کے مقصد سے فاتحہ خوانی کے لئے لوگ خانقاہوں کے شیوخ اور مساجد کے پیش اماموں کی طرف دوڑتے رہے لیکن خانقاہ نشینوں نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ آیا یہ عمل محض عقیدتاً ہے یا بے علمی کی وجہ سے ضرورتاً۔ ان اہلِ غرض کو سورۂ فاتحہ یاد بھی ہے کہ نہیں۔ ایصالِ ثواب کی فاتحہ خوانی کے جواز یا عدم جواز پر تبلیغی جماعت یا ان کے ہم خیال مسلمانوں سے مناقشہ اور تصادم کی بجائے بہتر طریقہ تو یہ ہوتا کہ وہ اپنے زائرین کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں سورۂ فاتحہ سکھاتے، طریقۂ فاتحہ کو عام کرتے کیونکہ بے غرضانہ ایصالِ ثواب اسلام کے منافی نہیں۔

تبلیغی جماعت کی عملی تربیت کی کوششیں خدا کے فضل سے بہت کامیاب رہی ہیں اور عوام میں

ین سے قربت اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوچکا ہے۔ اب وہ وقت آ[illegible] ہے کہ اس تحریک کو Decentralize کیا جائے تاکہ ہندوستان کے قریہ قریہ میں مذہبی شغف ایک مستقل مقام حاصل کرلے۔ اس اہم کام کو خانقاہیں اپنے ذمہ لے سکتی ہیں۔ اور پھر ایک بار شرع متین تعلیم کا منبع اور سرچشمہ بن سکتی ہیں جیسا کہ وہ خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے زمانے میں تھیں۔ یہی وہ موقع ہے جب مقامی خانقاہ یا مسجد اپنا کردار ادا کرسکتی ہے جو باتیں سفر میں پوری طرح نہیں سیکھی جاسکتیں اور مزاج کا جزو نہیں بن سکتیں۔ ان کی مسلسل تربیت کی اہم ضرورت تکمیل کا راستہ اس طرح نکل سکتا ہے۔ سرکاری تعلیم گاہوں سے دینی تعلیم کے ختم ہوجانے کے باعث اب یہ اور بھی ضروری ہوگیا ہے۔

اوقاف کے قوانین کے باعث خانقاہوں کو دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم و تدریس کے مواقع حاصل ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانا وقت کی پکار پر لبیک کہنے کے مترادف ہے۔

Institute of Sufism اس خصوص میں بڑا کام یہ کرسکتا ہے کہ ہندوستان کا ایک بڑا MAP یا نقشہ تیار کرے جس میں حال و ماضی کی تمام خانقاہوں کی نشاندہی کی گئی ہو۔ اس سے کم از کم آپس میں ربط پیدا کرنے کے لئے مقام اور پتہ کی سہولت تو نکل آئے گی اور Sufism کو سمجھنے کی خواہش رکھنے والوں کو رہنمائی بھی مل سکے۔

اس طرح طریقت کے حصول کے متلاشی بھی اس نقشے سے فائدہ اٹھا کر منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے۔

"طریقت" شریعت کی روح یا باطن کا نام ہے جس کی منزلِ آخر عشقِ الٰہی ہے — اور عشقِ الٰہی ہی سے تخلیقِ انسانی کا مقصد اولین پورا ہوتا ہے۔ "شریعت" مختصراً کہا جائے تو سنت پر مومن کے حق کا اثبات کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ جب کہ طریقت خدا کا محب اور محبوب بننے دونوں ہی کی سبیل پیدا کرتی ہے، صحن خانقاہ ہی آفاق و انفس کی تسخیر گاہ ہے۔ یہیں پر اسرارِ عشقِ الٰہی آشکارا ہوتے ہیں۔ ان اسرار کا اس مضمون میں تذکرہ کرنا ناممکن ہے۔ انہیں سمجھنے کے لئے ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی تصنیف "رموزِ عشق" اور "قرآن و تصوف" کا مطالعہ کافی ہوسکتا ہے۔ اور یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ طریقت، تصوف، یا سلوک آپ چاہیں جو نام دیں، احسان اور تزکیۂ نفس Purification or Excellence کی اعلیٰ منزل ہے جس تک کسی بندے کی رسائی ہوجائے تو یہی فوزاً عظیما یا سب سے عظیم کامیابی ہے۔

اس منزل کی نشاندہی ایک حدیث قدسی سے ہوتی ہے:

جب بندہ شریعت کے فرائض کے بعد نوافل پر مواظبت کرتا اور دل سے حق تعالیٰ سے تقرب چاہتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں ۔

" ہمیشہ بندہ نوافل سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس کو چاہتا ہوں تو میں اس کا کان ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے میں اس کی آنکھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہوجاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے :

" اس کا دل ہوجاتا ہوں جس سے وہ سمجھتا ہے اور زبان ہوجاتا ہوں جس سے وہ بات کرتا ہے"۔ (رموزِ عشق ص۹۱-۹۲)

اس اقتباس کو پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب آگاہ کرتے ہیں کہ " یہ وہ مقام ہے جہاں زیادہ گفتگو نہ کرنی چاہیئے ۔ یہ منزلۃ الاقدام (قدم لڑکھڑانے والی) منزل ہے ۔ بہت سے لوگ یہاں گمراہ ہوگئے ہیں لیکن جو عشقِ الٰہی میں ریاضتیں کرکے ثابت قدم رہے ان کے بارے میں سب ہی کی متفقہ رائے ہے کہ

ہر کہ را سوخت آتشِ عشقے — طالعش سعد و فالِ فیروز است
نالۂ عاشقانِ محنت کش — مشعلِ آتشِ گنہ سوز است

یہاں عاشقانِ محنت کش کے الفاظ مکمل اور مسلسل توجہ کے محتاج ہیں ۔ اس لئے بیعت کے ذریعہ کسی سلسلہ سلوک میں شامل ہوجانا اور نسبت قائم کرلینا ہی کافی نہیں ۔ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رح کا سلسلۂ عالیہ قادریہ ہو کہ خواجہ معین الدین چشتی رح کا سلسلہ چشتیہ بہشتیہ ہو یا کوئی اور سلسلۂ تصوف ـــ تقریباً ہر سلسلہ کے بارے میں ایسی روایتیں مشہور ہیں کہ اس سلسلے میں داخل ہوجانے والے محض نسبت کی بدولت نجات پالیں گے ۔ چاہے انفرادی اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں ـ چنانچہ " خواجہ غریب النواز" نامی سوانح حیات میں کتاب کے مصنف جناب شبیر حسن چشتی نظامی صاحب نے صفحہ ۵۹ پر ایک روایت نقل کی ہے :

" ایک روز آپ (خواجہ معین الدین چشتی رح) حسبِ معمول طواف (کعبہ) میں مشغول تھے ۔ شانِ کریمی کا ظہور ہوا ۔ ندا آئی " اے معین الدین میں تجھ سے راضی ہوں میں نے تجھے بخش دیا مانگ کیا مانگتا ہے ۔ خواجہ غریب النواز نے مسرت سے بیخود ہوکر جبینِ نیاز آستانۂ محبوب پر رکھ دی اور عرض کیا " اے میرے پروردگار میرے سلسلے میں

جو داخل ہوں ان کی بخشش کا طالب ہوں۔ ندا آئی تیری دعا قبول ہوئی۔ قیامت تک ترے سلسلہ میں جو داخل ہوگا اُسے بخشش دوں گا "۔

راقم الحروف سلسلۂ چشتیہ بہشتیہ میں بھی بیعت لے چکا ہے اور سلسلۂ قادریہ میں بھی۔ اس روایت کے غلط یا صحیح ہونے کے بارے میں کچھ کہنا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن سورۂ ھود میں بیان کردہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ جب کنعان دوسرے کافروں کے ساتھ غرق ہوا تو حضرت نوح نے خدائے تعالیٰ سے عرض کیا کہ آپ نے میرے اہل و عیال کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ تو انہیں خدا کی طرف سے تنبیہ کی گئی کہ نسب کی ٹھوس معاشرتی حقیقت کے باوجود ایمان نہ لانے کے باعث کنعان کا شمار حام، سام اور یافث کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ ع

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو تو پسر لائقِ میراثِ پدر کیوں کر ہو

سلسلۂ سلوک میں بیعت کرنے والے اپنے پیر کی ہدایات پر مکمل طور پر چلیں۔ خواجۂ بزرگ کے ملفوظات میں یہ واضح الفاظ موجود ہیں: "سلوک کی پہلی سیڑھی شریعت ہے"۔ ملاحظہ ہو صد ۱۷۳۔ دوسری جگہ ارشاد ہے" نماز خدا کی امانت ہے۔ اس کی پوری پوری حفاظت کرنی چاہیئے ۱۱؎ اور یہ کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا" صد ۱۷۴۔ اسی کتاب کے صد ۱۸۶ پر" قیامت کے دن پیر و مرشد اپنے مریدوں کو بخشوائیں گے" کی جو طمانیت دی گئی ہے وہ اسی صورت میں لائقِ اعتنا رہتی ہے جب مرید تاریخ بیعت سے لے کر موت تک سچا مرید رہے۔ اور سچا مرید رہنے کی تنہا صورت یہی ہے کہ وہ اپنے پیر کی تعلیمات پر پورا پورا عمل کرے ورنہ بیعت کے بعد بھی فاسق، فاجر اور بدعمل میں مبتلا اشخاص کو خود پیر ہی اپنا مرید نہ سمجھیں گے اور ان سے بری الذمہ ہی رہیں گے۔ جب نسب جیسی جسمانی نسبت عمل کے باعث کالعدم ہو جاتی ہے ارادت بھی سوءِ عمل کے باعث بے معنی ہو جاتی ہے۔ ارادت کوئی ایسی بیرونی مہر یا SEAL نہیں جسے پیشانی پر ثبت کر دیا جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے دائم و قائم ہو جائے۔ یہ تو بحرِ معرفت میں مسلسل پیراکی کا نام ہے اور وہی ساحلِ مراد تک پہنچ سکتا ہے جو محنت کش ہو۔ مجھے پھر ایک بار دہرانے دیجئے

نالۂ عاشقانِ محنت کش مشعلِ آتشِ گنہ سوز است

■■■

قاضی جلیل احمد

صدر انور سادات کی یروشلم یاترا اور مسئلۂ فلسطین

۱۹۵۱ء میں اُردن کے موجودہ حکمراں شاہ حسین کے دادا شریف عبداللہ کو مسجدِ اقصیٰ کی سیڑھیوں پر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور اس قصور کی پاداش میں کہ انہوں نے تقسیمِ فلسطین کے تعلق سے خفیہ طور پر اسرائیلیوں سے گفتگو کی تھی۔ اسی طرح اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں صدر جمال عبدالناصر نے مصر اور اسرائیل کے درمیان آپسی سمجھوتہ کروانے والے ایک درمیانی شخص سے کہا تھا کہ "عرب اور اسرائیل کی دنیا میں بہت فرق ہے۔ مثلاً اگر اسرائیل کا وزیر اعظم بن گوریان مجھ سے ملاقات کرنے قاہرہ آئے تو واپسی پر تل ابیب میں اس کا استقبال ایک ہیرو کی طرح ہوگا۔ لیکن اگر اس کی جگہ میں مذاکرات کے لئے تل ابیب جاؤں تو واپسی پر کسی حریت پسند کی گولی میرا استقبال کر رہی ہوگی"۔ لیکن پچیس سال کے اندر اندر آج دنیائے عرب میں بالعموم اور مصر میں خصوصاً تیز تبدیلی آئی ہے کہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۷ء کو زعیمِ مصر انور سادات نے تل ابیب نہیں بلکہ خود یروشلم جاکر اسرائیل کی پارلیمنٹ میں اسرائیل کو قانونی طور پر تسلیم کیا اور واپسی پر گولی تو کجا مخالفت میں ایک نعرہ بھی بلند نہیں ہوا بلکہ مصری عوام کی طرف سے ان کا اتنا والہانہ استقبال ہوا کہ دیکھ کر دنیا دنگ رہ گئی۔ سطورِ ذیل میں اسی امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی اور مسئلۂ فلسطین پر اس کا کیا اثر پڑا۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جہاں تک عرب حکومتوں کا تعلق ہے اُن میں سے کسی کو بھی فلسطینیوں کے حق خود ارادیت اور آزادی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے برخلاف انہوں نے ہمیشہ اپنے مفاد کے لئے اس مسئلہ کا استعمال کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران شریف مکہ کے فرزند امیر فیصل نے صیہونی تحریک کے صدر شام وائزمن سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آخر الذکر اگر حکومت برطانیہ پر اپنے اثر اور رسوخ کی بدولت فیصل کو ملک شام کی حکومت حاصل کرنے میں مدد کرے تو اس کے عوض فیصل ارضِ فلسطین میں بڑے پیمانہ پر یہودیوں کی آبادکاری کے حق کو تسلیم کرے گا۔ اسی طرح اعلانِ بالفور

جنگِ عظیم کے بعد فلسطین میں یہودیوں کی تعداد جب چند ہزار سے بڑھ کر ۱۹۳۶ء تک چار لاکھ سے تجاوز کر گئی تو فلسطین کے عرب باشندوں میں اس یہودی آبادکاری کے خلاف ایسا ہیجان برپا ہوا کہ اس کے فرو کرنے میں برطانوی حکومت کے چھکے چھوٹ گئے۔ تب اس نے عرب حکمرانوں کو لندن میں مدعو کر کے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے اثر اور رسوخ سے کام لے کر فلسطین کے اس سیاسی بحران کو ٹھنڈا کرنے میں مدد دیں تو حکومت برطانیہ ایک رائل کمیشن قائم کر کے فلسطینی عربوں کے مطالبات پر غور کرے گی۔ دنیائے عرب کے ان حکمرانوں نے کان دبا کر اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی اور تحریک آزادی فلسطین کی اُس دہکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کے بعد ایک کمیشن آتے اور جاتے رہے لیکن فلسطین میں یہودی آبادکاری نہ رکنی تھی اور نہ رکی۔ اسی طرح اُسی شریف مکہ کے دوسرے فرزند شریف عبداللہ نے جو اُردن کا امیر تسلیم کر لیا گیا تھا، U.N.O. کے فیصلے کے مطابق ویسٹ بنک کے علاقے میں فلسطین کی عرب حکومت کے قیام میں مدد دینے کے بجائے سارا علاقہ خود ہی ہڑپ کر بیٹھا اور جس کو اس کے پوتے حسین نے جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں شکست فاش سے دوچار ہو کر یہودیوں کے ہاتھ کھو دیا۔ ۱۹۴۸ء میں جن سات عرب ملکوں نے اسرائیل کے خلاف جنگ میں حصہ لیا اُن میں سے کسی کو بھی ایک آزاد فلسطینی مملکت کے قیام اور فلسطینی باشندوں کے حقِ خود ارادیت سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ اسرائیل کا وجود اُس علاقہ میں اپنے لئے خطرہ کا باعث سمجھتے تھے۔ اور اسی وجہ سے اسرائیل کے وجود کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنے پر متحد ہو گئے تھے۔ لیکن سال ہا سال تک اس سدِ سکندری سے سر پھوڑنے کے بعد انھیں پتہ چل گیا کہ یہ روگ ان کے بس کا نہیں ہے تو فلسطینیوں سے اُن کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرنا انہوں نے ترک کر دیا۔

آزادیٔ فلسطین کی تحریک جون ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے بالکلیہ عرب حکومتوں کے زیرِ اثر تھی۔ قاہرہ ریڈیو اسٹیشن تحریک آزادی فلسطین کی تائید میں نشریات عمل میں لائی جاتی تھیں۔ غازہ ویسٹ بنک اور گولان کے علاقوں سے اسرائیلی حدود میں توڑ پھوڑ کی کارروائیاں ہلکے پیمانے پر عمل میں لائی جاتی تھیں لیکن مسلمہ طور پر آزادی فلسطین کی ذمہ داری انہی عرب حکومتوں کے کندھوں پر ڈالی جاتی تھی جن کی سرحدیں اسرائیل سے ملتی تھیں۔ لیکن جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے مقابلہ میں مصر، اُردن، شام کی ذلت آمیز شکست کے بعد جس میں نہ صرف سارا بچا کھچا فلسطین بلکہ سینائی اور گولان بھی [illegible] ان حکومتوں کے ہاتھ سے نکل گیا تب فلسطینیوں نے سوچا کہ اپنی آزادی کے لئے بالکلیہ عرب حکومتوں پر تکیہ کرنا [illegible] ہے۔ چنانچہ انہوں نے P.L.O. کے نام سے ایک ادارہ آزادیٔ فلسطین کی تحریک کو

آگے بڑھانے کے لئے قایم کیا - اور یاسر عرفات کی قیادت میں پی ال او کی تنظیم عسکری اور سیاسی
ونوں محاذوں پر آگے بڑھنے لگی -

اب اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شخصیتوں سے قطع نظر ان طاقتوں پر نظر کی جائے جو
رب معاشرہ کے پس پردہ کارفرما تھیں اور ان ہی کی چھاپ متعلقہ حکومتوں پر بھی تھی ۔ اُن میں
ردن اور جزیرہ نمائے عرب کے ملکوں میں قبیلہ واری نظام رائج تھا جن کے شیوخ کا اجتماعی مفاد
نا حکومت کا مفاد تھا ۔ چنانچہ اردن کے شاہ حسین نے بلیک ستمبر کی اندوہ ناک خوں ریزی کے دوران
پی قبائلی وفاداریوں پر تکیہ کرکے پی ال او کا صفایا کیا تھا ۔ یہ علاقے دنیائے عرب کے سب سے زیادہ
س ماندہ علاقے تھے اور تیل کی دولت ہنوز ان کے ہاتھ نہیں آئی تھی ۔ اس کے برخلاف شام، لبنان
ورمصر علمی، فنی اور سیاسی اعتبار سے دنیائے عرب میں ممتاز گنے جاتے تھے ۔ ان ہی علاقوں کے کارخانہ
ار، صنعت کار، بنک کار، یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور طالب علم، صحافی، دانش ور اور مدبر اپنے
اپنے ملک کی حکومتوں پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتے رہتے تھے ۔ ان سب کا تعلق زیادہ تر
مڈل کلاس سے تھا ۔ مصر میں فوجی انقلاب اور شاہ فاروق کی معزولی کے بعد جو حکومت معرض وجود میں
آئی وہ بھی اسی مڈل کلاس کے زیر اثر تھی ۔ کیوں کہ ان انقلابیوں کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا ۔
اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی حکومتیں اگر اتنی تنگ نظری کا اظہار نہ کرتیں جتنا
کہ ڈلس اور ایڈن کے دور میں ہوا تو مصر کبھی روسی حلقہ اثر میں شامل نہ ہوتا ۔

اوایل سنہ ۵۰ء میں مصر کی سیاسی اور مدنی زندگی ان ہی انقلابی فوجی افسروں کے گرد گھومتی
تھی لیکن ان افسروں کا بہرحال تعلق متوسط طبقے سے تھا ۔ چنانچہ مصر میں سوشلزم کے حق میں جو
اقدامات کئے گئے ان کی وجہ سے بڑی تعداد میں صنعت کار، ماہرین فن، ڈاکٹر، انجینیر اور ملازمت پیشہ
لوگ اسٹیٹ ایڈمنسٹریشن کی اونچی اسامیوں پر فائز ہو گئے اور حکومت کی مشینری پوری طرح اس
طبقہ کے ہاتھ میں آگئی جس طبقہ سے یہ لوگ آئے تھے ، اور اس طرح وہ لوگ ملک کی ساری معیشت
کو کنٹرول کرنے لگے ۔ جون سنہ ۶۷ء کی شکست اور خصوصاً انور سادات کے برسر اقتدار آنے کے بعد
جب سوشلزم کو ترک کرکے حکومت نے الانفتاح کے نام سے ایک OPEN DOOR معاشی پالیسی کو اپنایا
تو ان ہی لوگوں نے جن کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے اب نجی شعبہ کا رخ کیا اور یوں ملک کی معیشت
پر ان کی گرفت علیٰ حالہٖ باقی رہی ۔ یہ وہ لوگ تھے جو غیر ملکی سرمایہ کے ایجنٹ بن کر اپنی زندگی کو
آسودہ بنانا چاہتے تھے ۔ ان کے پیش نظر صرف اپنا مفاد تھا ۔ فلسطینیوں کا مفاد تو کجا انہیں خود اپنے
ملک کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا ہی ان کا مطمح نظر تھا

اصل یہی فرق ہے یورپ کے بورژوا اور تیسری دنیا کے بورژوا کے درمیان، یورپی بورژوا
ستقبل کو فوری مفاد پر قربان نہیں کرتا، اس کے برخلاف عرب بورژوا کی اپنی کوئی معاشی پالیسی نہیں
وتی، وہ صرف یورپ کا ایجنٹ ہے اور اُسے صرف اپنے کمیشن سے سروکار ہے۔ چنانچہ اب یہی لوگ
سرائیل کی شراکت میں اپنے تمول اور خوش حالی کے خواب دیکھنے لگے۔ سادات کے دورۂ یروشلم میں
ن عناصر کو اپنے تمول اور خوش حالی کے خواب کی تعبیر نظر آئی۔ اور نتیجتہً مصر کے ذرائع ابلاغ
ورے زور و شور کے ساتھ سادات کی دور اندیشی، بالغ نظری اور جواں ہمتی کا ڈھنڈورہ پیٹنے لگے۔

جون ۱۹۶۷ء کی شکست کے بعد جب فلسطینیوں کے ریفیوجی کیمپ میں یاسر عرفات کی قیادت
ں ایک نئی قیادت ابھری جس نے اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ کرنے کا عزمِ مصمم کر لیا تو ان کی یہ
ادروی ان ملکوں کو شاق گزرنے لگی جن کی حدود میں یہ کیمپ واقع ہوئے تھے۔ ان تمام ملکوں میں
۱۹۶۸ء سے ہی یہ پروپگنڈہ شروع ہو گیا کہ گو عالم عرب ان پناہ گزینوں کے لئے اتنا کچھ کر رہا ہے
یکن شکر گذار رہنے کے بجائے یہ لوگ الٹا ہمارے ہی سر چڑھتے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے اُردن
ے شاہ حسین نے ان کے خلاف پروپگنڈہ شروع کیا اور ایک سال کے اندر اندر اُردن کے قبائلی کی رائے
امہ کو اس حد تک فلسطینیوں کے خلاف بھڑکایا کہ ستمبر ۱۹۷۰ء کے معرکہ دار و گیر میں ہزاروں فلسطینی مرد
ورتیں اور بچے حسین کے سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے لیکن اُردن والوں کے کانوں پر جوں
ھی نہیں رینگی۔ اسی طرح شام اور مصر کی حکومتوں نے اپنے اپنے علاقوں میں پی ال او کی اتنی مشکیں
سیں کہ ان علاقوں میں وہ دم مارنے کے قابل بھی نہ رہے۔ مصر میں خود صدر ناصر کے دور میں کئی
رصدائے فلسطین ریڈیو کی نشریات بند کی گئیں۔ مثلاً جب امریکہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ راجرس کے
یش کردہ سیاسی منصوبے پر صدر ناصر نے عمل کرنا منظور کر لیا لیکن پی ال او کی طرف سے اس منصوبے
کی اسی شدت کے ساتھ مخالفت جاری رہی تو ناصر نے صدائے فلسطین ریڈیو کی نشریات بند کروا دیں۔

سطور بالا سے یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد گو عالم عرب نے پی ال او کی
نمائندہ حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا پھر بھی ہر جگہ پی ال او کی عسکری شاخ الفتح کی کارروائیوں کو ملک
دشمنی کی نظر سے دیکھا جاتا اور عرب حکومتوں کے جذبہ فداکاری اور اہل فلسطین کی ناسپاسی اور
ناشکر گذاری کا چرچا کیا جاتا رہا۔ یہ پروپگنڈہ اتنا منظم اور موثر تھا کہ ان تمام ملکوں کی رائے عامہ
اہل فلسطین کے متعلق عموماً اور پی ال او کے متعلق خصوصاً یکسر تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ قبرص کی ہائی جیکنگ
کے دوران جب الاہرام اخبار کے چیرمین یوسف سباعی کی موت واقع ہوئی تو مصری ذرائع ابلاغ
نے رائے عامہ کو اس حد تک برافروختہ کیا کہ لوگوں نے آج کے بعد فلسطین سے ہمارا کوئی ناطہ نہیں"

سے نفرت [illegible] شروع کردیے حالانکہ یاسر عرفات نے کھلے الفاظ میں اس ہائی جیکنگ کی مخالفت کی تھی اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد سے تحریک فلسطین کی قیادت دوبارہ عرب حکومتوں کے ہاتھ میں آگئی۔ کیونکہ اس جنگ میں مصر اور شام کی فوجوں نے میدانِ جنگ میں کافی جی داری کا ثبوت دیا تھا۔ اگرچہ کہ وہ اس وقت بھی کوئی واضح کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ پھر بھی اس کا اثر یہ ہوا کہ پی ایل او کی عسکری قیادت سے متعلق انگلیاں اٹھنی شروع ہوگئیں کہ یہ لوگ تو محض فوجی لباس پہن کر اپنے ہی ملک کے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے والے ہیں۔ اُن سے تو آج تک اپنے ملک کی ایک چپہ زمین بھی آزاد نہیں کرائی جاسکی۔ ان کی وجہ سے اسرائیل لبنان میں کھلے بندوں دہشت گردی کررہا ہے اور یہ لوگ اس کے خلاف کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس کے بعد شام کی حکومت نے لبنان میں فلسطینی خون کی جو ہولی کھیلی اُسے لوگ ابھی بھولے نہیں ہوں گے۔

اگر ہم ایک لمحہ کے لئے سادات کے دورۂ یروشلم کے حسن و قبح پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ہمیں فوری طور پر واضح ہوجائے گا سادات کا یہ سفر کسی لحاظ سے بھی کوئی دوراندیشانہ فعل نہ تھا۔ اس سفر کے نتیجے میں سادات کے ہاتھ ایسی کوئی چیز نہیں آئی جو اس کے بغیر نہیں آسکتی تھی۔ اس سفر کے نتیجے میں اس نے نہ صرف اسرائیل کو عملی اور قانونی دونوں حیثیتوں سے تسلیم کرلیا بلکہ اپنے ۱۹۷۳ء کی جنگ کے ساتھیوں یعنی اُردن اور شام کو تنہا چھوڑ کر یک طرفہ طور پر اسرائیل سے دوستی اور عدم جنگ کا معاہدہ بھی کرلیا۔ اسرائیل سے یک طرفہ معاہدہ صلح اور اسرائیل کو قانونی طور پر تسلیم کرنے کی شرائط پر تو صدر ناصر کے زمانے میں بھی صلح ہوسکتی تھی۔ چنانچہ بارہا امریکہ اور اسرائیل نے خفیہ طور پر اقوام متحدہ میں مصر کے نمائندوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ سینائی میں جون ۶۷ء کی سرحدوں تک اسرائیلی فوجوں کی واپسی کی شرط پر صلح ہوسکتی ہے بشرطیکہ مصر ویسٹ بینک اور گولان کے معاملے سے قطع تعلق کرلے۔ لیکن ناصر نے ہر بار ایسی یک طرفہ صلح سے انکار کیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک شام اور اُردن کی ناؤ کو بھنور میں چھوڑ کر خود کنارے لگ جانا بدترین قسم کی غداری تھی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انور سادات کچھ زیادہ ہی رومانی مزاج کا حامل تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر میں فراخ دلی کا مظاہرہ کروں تو دشمن بھی فراخ دلی پر مجبور ہوجائے گا۔ چنانچہ ایک پریس کانفرنس میں اس نے یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا "اصل مسئلہ عرب علاقوں پر اسرائیلی قبضے کا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ ہے اس نفسیاتی دیوار کو ڈھانے کا جو عرب اور اسرائیل کے درمیان کھڑی کردی گئی ہے" لیکن وہ یہ بھول گیا کہ یہ نفسیاتی دیوار اُن یہودیوں نے کھڑی کی ہے جنہوں نے بزورِ شمشیر لاکھوں فلسطینی عربوں کو ان کے ملک سے نکال باہر کیا اور ان کی جائیداد اور املاک پر

قبضہ کئے بیٹھے جو آج بھی گولان کی بلندیوں اور دریائے اُردن اور نہر سویز کے پانیوں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اور دنیا کی رائے عامہ اور سکیورٹی کونسل کی قراردادوں کے باوجود اپنی جارحیت سے حاصل کردہ علاقہ کی ایک چپہ زمین کی واپسی پر راضی نہیں ہیں۔ ڈان کے ہوٹے کی طرح سادات اس نفسیاتی دیوار کو ڈھانے چلا تھا جس کو اسرائیل نے اپنے عمل سے تعمیر کیا تھا اور اب اپنی برتر فوجی طاقت کی مدد سے سہے تھامے ہوئے تھا۔

سادات کے دورۂ یروشلم سے وہ نفسیاتی دیوار تو گیا گرتی البتہ عربوں کی اپنے علاقوں کی حفاظت کی قوت بھی ختم ہو گئی۔ کیونکہ یہ طاقت ان کے آپسی اتحاد اور اتفاق میں مضمر تھی اور جس پر اس یاترا سادات ضرب پڑی۔ سادات کے اس اقدام سے عرب حکومتوں میں زبردست پھوٹ پڑی۔ لیبیا، شام، الجیریا اور جنوبی یمن نے مصر سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے۔ اور سادات نے اپنے سفیروں کو واپس طلب کر لیا۔ اسی طرح جہاں امریکہ کی فیاضی سے اسرائیل کی طاقت میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا وہیں مصر کی طاقت میں دن بدن کمی ہوتی چلی گئی۔

سادات اور اس کے حواریوں کی طرف سے بار بار اس امر پر زور دیا جا رہا ہے کہ مصر کو اس سفر سے بیش قرار فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ مصر نے سنائی میں اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس حاصل کر لیا ہے سویز کنال میں جہاز رانی کی بحالی، سنائی کے تیل کے چشموں پر دوبارہ مصر کا قبضہ اور ٹورازم کی بڑھتی آمدنی سے مصر کی معیشت میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ بیگن سنائی میں بسائی گئی اسرائیلی بستیوں سے تخلیہ کے لئے کسی صورت آمادہ نہ تھا۔ لیکن سادات کی نیک نیتی کے آگے اس کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ لیکن دیکھا جائے تو اُن میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس سفر کے بغیر بھی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ نہر سویز میں جہاز رانی، کیسنجر کی شٹل ڈپلومیسی کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی اور تیل کے کنویں بھی اس کے فوری بعد مصر کے ہاتھ آگئے تھے اور ان دونوں کی وجہ سے ٹورازم اضافہ بہرحال ہونا ہی تھا۔ اب رہا سنائی کی واپسی کا معاملہ تو جن تحفظات کے ساتھ سنائی کا ریگستان مصر کو واپس ملا ہے ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر نے یہ علاقہ اپنے اقتدار اعلیٰ کو کھو کر حاصل کیا ہے کیونکہ اب اس علاقے میں وہ کوئی کام اسرائیل اور امریکہ کی مرضی کے خلاف نہیں کر سکتا اور امریکہ کو یہ حق کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے ذریعہ دیا گیا ہے کہ وہ مصر کو کبھی بھی ایسی کارروائی سے باز رکھے جو اسرائیل کی دانست میں اس کے مفاد کے خلاف ہو۔

اب رہی بات مسئلہ فلسطین کے حل کی تو امر واقعہ یہ ہے کہ باوجود بار بار فلسطینیوں کا نام زبان پر لانے کے، سادات کبھی کا اس مسئلے سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ اسمٰعیل فہمی جو سادات کے دورہ یروشلم

کے زمانے میں مصر کا وزیر خارجہ تھا اور جس نے یروشلم جانے کے بجائے اپنی خدمت سے استعفیٰ دینا پسند کیا تھا اپنی کتاب NEGOTIATING FOR PEACE IN THE MIDDLE EAST میں سادات اور اسرائیل کے وزیر دفاع عذرا وائزمن کے درمیان ایک گفتگو کو یوں درج کیا ہے :

"سادات نے کہا ہم نے پی ال او کو اس معاملے سے الگ کر دیا ہے وہ اپنے رویہ کی وجہ سے دراصل اس لائق ہی نہیں ہیں کہ ان کو صلح کی گفتگو میں شریک کیا جائے۔ اب اس مسئلہ کا تعلق صرف غازہ اور ویسٹ بینک کے باشندوں تک ہی محدود رہے گا جو ان علاقوں میں مقیم ہیں۔ شاہ حسین اس مفاہمت میں شریک ہوتا ہے یا نہیں اس کی بھی مجھے پرواہ نہیں ۔ ویسٹ بنک اور غازہ غیر فوجی علاقے ہوں گے کیونکہ مسئلے کا حل تب ہی ہو سکتا ہے جب اسرائیل کو اپنی سلامتی کی پوری طرح طمانیت حاصل ہو' اور اس کے لئے ہم کوئی نہ کوئی قابلِ عمل فارمولا ڈھونڈ نکالیں گے "

اسمٰعیل فہمی سمجھتا ہے کہ وائزمن کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا ۔ وہ کہتا ہے خدا کا شکر ہے کہ اس گفتگو کے موقعہ پر اھرن بارک میرے ساتھ موجود تھا ورنہ اسرائیل میں کوئی بھی میری بات پر یقین نہیں کرتا کہ سادات کو فلسطینی مملکت کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔

صفحہ ۶۰.... " ہمارے طلباء کا تعلیمی معیار" میں تعلیمی معیار کے پست ہونے پر بحث کی گئی ہے اور اس کی اصلاح کے راستے بھی سجھائے گئے ہیں۔ آج ہمارے بچوں کی تعلیمی پستی کا جو حال ہے اس کے پیش نظر جناب سید علی اکبر صاحب جیسے ماہرین تعلیم کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ یہ تمام مضامین جو علمی موضوع پر لکھے گئے ہیں' ہمارے تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں بڑے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں ۔ جناب منظور احمد منظور صاحب ہمارے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جناب سید علی اکبر صاحب کے ایسے مضامین منتخب اور شائع کئے ہیں۔ کتابت جناب محمد غالب سنے کی ہے جو بڑے منجھے ہوئے کاتب ہیں۔ کتاب کا ادارہ ادبیات اردو سے شائع ہونا خوبیٔ طباعت و تزئین کی ضمانت ہے۔ قیمت پندرہ روپے بہت کم ہے۔ ایوان اردو' پنجہ گٹہ روڈ' حیدرآباد ۰۰۰ ۴۸۲ ۵۰۰ سے مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر ایم۔آئی۔ساجد

شعرائے برار کا مختصر جائزہ

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ملک حسن کے فرزند ملک محمد نظام الملک نے احمد نگر میں اور بیجاپور کے صوبہ دار یوسف عادل شاہ نے جب اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرلیں تو برار کے صوبیدار فتح اللہ عماد الملک نے بھی اپنے نام کا خطبہ پڑھوالیا۔ اس طرح برار میں عماد شاہی حکومت قائم ہوئی۔ اور عماد شاہیوں کی یہ حکومت برار میں ۸۹۴ھ سے ۹۸۲ھ تک قایم رہی۔ ان کا دارالحکومت ایلچپور قرار پایا۔ جہاں علم و فن، ادب اور فنونِ لطیفہ، معمار، اور سپاہ وغیرہ کثیر تعداد میں آباد ہوگئے تھے۔ گویا عماد شاہی حکومت ہر اعتبار سے ایک فعال اور ترقی پذیر حکومت تھی۔

برار چونکہ دکن کا ہی ایک حصہ تھا لہذا یہاں کی معاشرت اور ماحول پر دکھنی اثرات پوری طرح مرتکز ہوئے اور ظاہر ہے کہ شعر و ادب اس سے مستثنیٰ نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ لہذا برار میں بھی شروع ہی سے نامور شعراء کی کمی نہیں رہی جنھوں نے اپنی معیاری شاعری کے ذریعہ نہ صرف برار کی حدود پار کی بلکہ دکن اور پورے ملک میں معروف ہوئے۔ ان کی اعلیٰ شاعری کے پیشِ نظر تذکرہ نویسوں اور تاریخ نویسوں نے نہ صرف اُن کے حالاتِ زندگی قلم بند کیئے بلکہ نمونۂ کلام بھی جا بجا تحریر کیا۔ برار کے شروع دَور کے شعراء میں محمد میاں محرمؔ، آقا محمد امین صفاؔ، میر لطف علی خاں لطفیؔ، شاہ غلام حسین، میر شمس الدین فیضؔ (ملک الشعراء) شاہ باقر حسین باقرؔ، بھوانی پرشاد نفیسؔ، نواب نامدار خاں پنی مہدوی اور امجد حسین خطیب امجدؔ (چراغِ برار) وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان شعراء نے برار کے نام کو اونچا کیا۔ اور چہار عالم میں مشہور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعراء کا ذکر کئی مخطوطات، ادبی تاریخی تذکروں اور رسائل میں ملتا ہے۔ شرط یہی ہے کہ ڈھونڈنے والی نظر چاہیئے۔

نزد کھجی مسجد۔ کھام گاؤں 444303 (ایم۔ایس)

ادھر اپریل ۹۸ء کے ماہنامہ "شاداب" میں جناب انوار احمد نشتر صاحب اکولہ نے اپنے مضمون "بیسویں صدی کے منفرد لہجے کا شاعر محبوب راہی" میں سرزمین برار کو ادبی اعتبار سے ایک بنجر علاقہ لکھا ہے۔ جو بڑی حد تک غلط بیانی پر مبنی ہے۔ اب پتہ نہیں یہ انتہائی عقیدت کا اظہار ہے یا حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ یا مبالغہ آرائی کی کوئی نئی قسم کہ موصوف نے ڈاکٹر محبوب راہی کی وہ مدح سرائی کی کہ عقل و فہم چکرا کر رہ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر محبوب راہی برار کے ایک اچھے شاعر ہیں زود گو ہیں، کافی اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ ساتھ جدید انداز میں اچھا کلام کہنے کی کامیاب کوشش بھی کرتے ہیں۔ ہم خود اس بات کے معترف ہیں نہ کہ منکر۔ اور نہ ہی جناب انوار احمد صاحب نشتر سے ہماری کوئی ادبی یا ذاتی رنجش ہے نہ ان بن۔ لیکن معاملہ شعرائے برار کے مقام و مرتبہ اور ان کی ادبی حیثیت کے تعین کا ہے۔ (خصوصاً اس لئے بھی کہ راقم الحروف نے "ودربھ میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقاء" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ قلمبند کیا اور برار و ودربھ کی شعری روایات سے کماحقہ واقف ہے) اگر آج تاریخ کو صحیح طور پر پیش نہ کیا گیا تو ممکن ہے آنے والے تذکرہ نویس، تاریخ نویس، مقالہ نگار اور اسکالرز اسی بات کا اعادہ و تکرار کریں گے جو حقیقت سے دور کی بات ہوگی۔ آیئے انوار احمد صاحب نشتر کے مضمون کی روشنی میں شعرائے برار کا مختصر سا جائزہ لیں۔

انوار صاحب لکھتے ہیں "یہاں (برار) کے بہت کم شعراء نے اپنے کلام کے نشر و اشاعت کی طرف توجہ دی۔ گویا یہاں سخن وری تو تھی لیکن اس امر پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ محبوب راہی اس علاقے کا پہلا شاعر ہے جس نے اس دبیز پردے کو چاک کیا اور ہندوستان کے گوشے گوشے کو اپنے اشعار کی تب و تاب سے جگمگا دیا۔ انھوں نے معیاری رسائل و جرائد میں مسلسل اپنا کلام شائع کروا کر ادبی حلقوں میں اپنی شناخت مستحکم کروالی" ـــــ پتہ نہیں کس اعتبار سے انوار صاحب برار کے شعراء پر یہ الزام عاید کر رہے ہیں کہ وہ گمنامی کے پردے میں پڑے ہوئے تھے۔ نیز انھوں نے نشر و اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی جب کہ حالات کچھ اور ہی گواہی دے رہے ہیں۔ برار کے شروع دور کے شعراء کا ذکر اوپر آچکا ہے اور متوسطین میں کچھ ایسے اہم نام ہیں جنھیں کسی طور نظر انداز نہیں جا سکتا۔ بلکہ انھیں آبروئے برار کہا جا سکتا ہے۔ کون ہے جو منشی محمد حیات خاں مظہر مرتضی پوری، (افکارِ مظہر) محمد معصوم احسان بالاپوری (کلام احسان) عبدالکریم شائق کھام گانوی (غالب برار) گلشیر خاں بہبر دیو لگھانوی (شہادت امام حسین کی اپیل) عبدالوہاب اسعد پاتوری (دیوانِ اسعد) مسرور پاتوری (دیوانِ مسرور) خواجہ لطیف احمد جریح اور

سٹر حمزہ خاں جذبی (شعلۂ اول و دوم) جیسے شعرائے کرام کو فراموش کرسکتا ہے۔ یہ
نہ صاحبِ دیوان ہیں بلکہ برار کی شعری و ادبی روایات کے پاسبان و امین ہیں۔
یہی نہیں ان کے کچھ بعد کے شعرا بھی اپنی اہمیت و افادیت، سخن وری و پابندی سے کبھی
نہیں۔ ان میں قیصر مدنپوری (آبشار، طوفان و ساحل) پروفیسر منظور حسین شور (نبضِ دوراں،
مد الرشید کیفی، عبدالمجید کارکرے (زخمِ بہاراں) صابر براری (جامِ طہور اور کئی مجموعے) شاہ
مد الرؤف عاصی، خورشید آرا بیگم خورشید (شعاعِ خورشید) منصور کارنجوی (رنگِ حیات) پروفیسر
یب الرحمٰن صدیقی (ماہرِ علمِ عروض) عبدالحکیم ذاکر (مدیر ماہ نامہ کلام) بشیر ملکاپوری (مدیر ماہ نامہ
نیر) مرحوم بشیر احمد شہید اکولوی (شباب و شیب) اور پروفیسر شارق نیازی امراوتوی وغیرہ
نہ صرف برار کے نام کو روشن کیا بلکہ برار کے ادبی معیار کو بہت اونچا اٹھایا۔ اور یہ سب بھی
تر د اشاعت کے مراحل سے خوب اچھی طرح گذر چکے ہیں۔ طوالت کے خوف سے کئی اہم شعراء
نام حذف کرنے پر مجبور ہونا پڑا جن کی اہمیت و افادیت اور ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا
سکتا۔ اب اس حقیقت کی روشنی میں جائزہ لیں کہ گمنامی (شعرائے برار کی) والی بات کہاں
۔ درست ہے؟

اب رہا یہ سوال بقول انوار احمد نشتر صاحب کہ "محبوب راہی اس علاقے کا پہلا شاعر ہے جس
ء اس دبیز پردے کو ...... شناخت مستحکم کروائی"۔ تو بلا تردد کہنا پڑے گا کہ یہاں انوار احمد
احب نے مبالغہ آرائی کی حدوں کو چھونے کی کوشش کی ہے۔ پتہ نہیں کس بناء پر ایسا سمجھ لیا ہے
ب کہ متذکرہ بالا سطریں شاہد ہیں کہ برار میں ایک سے بڑھ کر ایک نامور، نغز گو، صاحبِ دیوان،
۔قی پسند، معیاری اور معروف شعراء کی کمی نہیں رہی جنھوں نے ملک کے گوشے گوشے کو اپنے اشعار کی
ب و تاب سے جگمگایا ہے اور معیاری رسائل و جرائد میں بھی کثرت سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ادبی
لقوں میں آج بھی ان کے نام کا شہرہ اور احترام باقی ہے۔ پھر یہ کس طرح باور کرلیا جائے کہ
جناب ڈاکٹر محبوب راہی اس علاقہ کا پہلا شاعر ہے"، جب کہ حقائق اوپر درج کر دیئے گئے ہیں۔
درج بالا شعراء سے ہٹ کر دورِ حاضر میں ڈاکٹر محبوب راہی کے ہم عصروں میں بھی ایسے باکمال
شعراء کی کمی نہیں جو علاقہ برار سے تعلق رکھتے ہیں اور شہرت میں، عمر میں اور تجربہ اور سخن وری
میں بھی کسی طرح پیچھے نہیں۔ تب ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کس طرح کیا جائے گا؟ اب ڈاکٹر
منشاء الرحمٰن خاں منشا ہی کو لیجئے جن کے کئی شعری مجموعے (یا دواوین) شائع ہو چکے ہیں۔ ہر
۔معیاری و غیر معیاری پرچے میں، اخبارات، رسائل و جرائد میں کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ مشاعروں

کے کامیاب شاعر ہیں، ایک اچھے مقرر، اسکالر، مقالہ نگار، تبصرہ نگار، دیباچہ نگار، محقق، مضمون نگار اور کئی ادبی و تعلیمی تحریکات سے منسلک ہیں اور غضب کے زود گو بھی۔ ان کے علاوہ برار کے نامور اور معروف شعراء میں جناب غنی اعجاز، صفدر وردؔ، عظیم انجم شیدے گانوی، راشد اللہ خاں جوہر مرحوم، ضیاء زخمی، منظور ندیم بالاپوری، سبحان انجم، فنی ایوت محلی، حیدر بیابانی اور راقم الحروف ہیں۔ جو کثرت سے شائع ہوتے ہیں، مشاعروں میں شوق و رغبت سے سُنے جاتے ہیں۔ اچھے اور معیاری شعر کہتے ہیں اور نشر و اشاعت کے مراحل سے بھی بخوبی گذرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کے مقام کا تعین کس طرح اور کیسے کیا جائے گا؟ ہاں اگر الجبرا کے کلیہ کے مطابق یا جغرافیہ کے کسی اضافی نقطۂ کے پیشِ نظر پارسی ٹاکی کو ہی برار تسلیم کر لیا جائے تو بے شک ڈاکٹر محبوب راہیؔ (صاحب) اس علاقے کا پہلا شاعر ہے جس نے اس دبیز پردے کو چاک کیا"، ہمیں اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

انوار احمد صاحب نے آگے چل کر مزید لکھا ہے کہ "تنقیدی و تجزیاتی نظر سے دیکھنے پر ڈاکٹر محبوب راہیؔ کے کلام میں کہیں زبان کی لغزش یا فنی جھول نظر نہیں آتا"۔ اس تعلق سے عرض ہے محترم کہ تنقید نگاروں نے غالبؔ جیسے شاعر (جس نے اپنے تمام شعری سرمایے میں سے انتخاب کر کے صرف "دیوانِ غالبؔ" شائع کروایا۔ بقیہ سارا کلام تلف کر دیا) کو نہیں بخشا، میرؔ کو نہیں چھوڑا اور اقبالؔ کو بھی نہیں بخشا۔ اگر صحیح معنوں میں تنقید نگار تنقید و تجزیہ پر آمادہ ہو تو ناممکن ہے کہ وہ اپنی نوکِ قلم کو روک لے بشرطیکہ وہ رجوع ہو ورنہ ہماری خوش فہمیاں ہمیں مبارک کہ ہمارا کلام تنقید و تجزیہ سے بالاقسم کی کوئی چیز ہے۔

ایک اور جگہ انوار احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ "راہی صاحب کی ادبی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان کا تخلیقی سفر نامہ بے حد طویل ہے"۔ محض ایک اضافی جملہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ ہر معروف شاعر و ادیب کی فتوحات کا دائرہ اور تخلیقی سفر وسیع و طویل (کسی حد تک) ہوتا ہی ہے۔ مزید آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں کہ "تحقیقی، تنقیدی اور طبع زاد مقالے بھی تحریر کئے ہیں" (ڈاکٹر محبوب راہیؔ صاحب نے) بہتر ہوتا کہ ان رسائل و جرائد کے مختصر نام بھی پیش کر دیئے جاتے جن میں راہی صاحب نے تحقیقی، تنقیدی اور طبع زاد مقالے لکھے ہیں اس طرح ہمارے علم میں اضافہ ہوتا اور ہم مستفیض بھی ہوتے جب کہ ہم نے اس تعلق سے نہ کہیں کوئی مقالہ پڑھا نہ سنا۔ (اور اگر اشارہ پی، ایچ ڈی کے مقالے کی طرف ہے تو وہ ایک الگ موضوع ہے ایک اہم شخصیت پر ہے جو محترم ہے) جب بات تحقیقی، تنقیدی اور طبع زاد مقالات کی چل ہی پڑی ہے تو مجبوراً انتہائی معذرت کے ساتھ

بقیہ صفحہ ۴۸ پر

سید بدر احمد

قاضی عبدالودود
اور
ان کا طرزِ تحقیق

(یوم قاضی عبدالودود پر خدابخش لائبریری پٹنہ میں پڑھا گیا)

قاضی عبدالودود صاحب کے انداز 'طرز' طریق اور اسلوب تحقیق پر مختلف ناقدوں نے اپنے
پنے نظریئے کے تحت مختلف رائے قائم کی ہے۔ کسی نے اسے Dictational کہا' کسی نے تجزیی
ی نے اسے "سائنٹفک قطعیت" کا نام دیا' کسی نے "ریاضیاتی صراحت" کا' کسی نے اسے ان کی
بور Exactness سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی اصطلاح قاضی صاحب کے مخصوص تحقیقی
اج کا پورا پورا احاطہ نہیں کر پائی۔

قاضی عبدالودود متفقہ طور پر ہندوستان میں نہ صرف اُردو بلکہ فارسی کے بھی سب سے بڑے
قق تھے۔ اور یقینی طور پر ان کی اس برتری اور عظمت کا سبب ان کا منفرد طرزِ تحقیق ہی ہے۔
اضی صاحب کے طرز یا طریقِ تحقیق پر کچھ بھی کہنے سے قبل یہ فیصلہ کر لینا ضروری ہے کہ اُردو میں
لتے۔ طریقِ تحقیق رائج ہیں یا اُردو کے تحقیقی ادب کے سرمایے میں کتنی طرز کی تحقیق کے نمونے دستیاب
ں۔ اس کا ایک آسان جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جتنے محقق ہیں اتنے ہی طریقِ تحقیق بھی ہیں۔ مگر
یری ناقص رائے میں اُردو کے تمام تحقیقی سرمائے کو صرف تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ دوربینی تحقیق (Telescopic Research)۔ اس طرزِ تحقیق میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے
یادہ حقائق کا دور ہی سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ جیسے کسی بلند پہاڑی پر کھڑے ہو کر دوربین سے اطراف و
جوانب کا جائزہ لیا جائے۔ اس طریقِ تحقیق کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ چیزیں گرچہ دور ہی سے دیکھی
ئی ہوتی ہیں مگر ان کو پیش اس انداز سے کیا جاتا ہے جیسے محقق نے علٰحدہ علٰحدہ تمام چیزوں کا قریب
سے مطالعہ کیا ہے۔

اس قسم کی تحقیق کی مثال میں باستثنائے چند وہ تمام تحقیقی مقالے پیش کیے جا سکتے ہیں

شعبۂ اُردو ۔ بہار یونیورسٹی

ن کا مقصد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لینا ہی ہوتا ہے ۔

۴۔ سرسری تحقیق ۔ (Glancial Research) اس طریق تحقیق میں حقائق گرچہ نزدیک سے یکھے گئے ہوتے ہیں مگر سہولت پسندی یا مشقت کی ضرورت نہ محسوس کرنے کے سبب ان کا ایک سرسری طائرانہ جائزہ لیا جاتا ہے ۔ مگر ان کی پیش کش اس سلیقے سے ہوتی ہے کہ عام قاری کے لئے اسے یا الہام ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں ۔

اس قسم کی تحقیق کے نمونے عموماً یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی تحقیقی نگارشات میں ملتے ہیں ۔

۳۔ خورد بینی تحقیق (Microscopic Research) اس طریق تحقیق میں چھوٹی بڑی ہر بات باریکی اور گہرائی سے تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس سے حاصل نتیجہ کو بلا کم و کاست تحریر بھی کیا جاتا ہے ۔ اس میں ذاتی تاثرات اور رائج مفروضات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ۔ ایک ایک تہ اس خورد بینی طریقہ کار میں کافی اہم اور نتیجہ خیز ہوتا ہے ۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کی بھی ہمیت ہوتی ہے ۔

اس قسم کی تحقیق صرف ان ہی محققوں کے یہاں پائی جاتی ہے جنھوں نے زندگی بھر صرف تحقیق ہو اور تحقیق کے سوا کچھ نہ کیا ہو ۔ ایسے لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکنے لائق ہے اور لاشبہ قاضی عبدالودود ان میں سر فہرست ہیں ۔

قاضی صاحب نے اپنے لئے اسی طریق تحقیق کو ابتداء سے ہی پسند کیا اور دوسروں سے بھی ں کی امید رکھی ۔ انھوں نے اکثر موضوعات پر نہ لکھنا قبول کیا مگر لکھا اسی وقت جب ان کی تحقیق و ان کے معیار پہ پوری اتری ۔ قاضی صاحب کے تحقیقی سفر میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں ۔ مصحفی کے کئی قلمی دواوین ان کے پاس تھے ۔ انھوں نے مصحفی پر متعدد مضامین لکھے ۔ اپنی زندگی یں مصحفی پر وہ حرف آخر سمجھے جاتے رہے لیکن ارادہ رکھنے کے باوجود وہ دیوان مصحفی کو نہ ایڈٹ ر سکے نہ اس کا مقدمہ ہی لکھ سکے ۔ وجہ تساہلی نہیں بلکہ وہی Perfectness ہے ۔ جب تک وہ خود طمئن نہ ہو جاتے تب تک وہ اسے دوسروں کے سامنے پیش نہیں کر سکتے تھے ۔ کلیم الدین احمد نے ن کے پاس "تذکرہ عشقی" کا عکس دیکھا تھا جسے انھوں نے بوڈلین لائبریری لندن سے منگایا تھا ۔ ان کے بیان کے مطابق قاضی صاحب نے اسے چھپوانے کے ارادے سے اس کی کتابت بھی کرائی تھی دوبار ۔ مگر وہی خورد بینی ذہن کہ جب تک ایک پہلو بھی تشنہ ہے اس پر کچھ بھی لکھنا بے سود ہے ۔ "تذکرہ عشقی" وہ نہ شائع کرا سکے ۔ قاضی صاحب نے خود کلیم الدین احمد سے اردو ادب کی تاریخ لکھنے کو کہا اور اپنا بھرپور تعاون دینے کا یقین بھی دلایا ۔ مگر دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور جو مواد

لندن، پیرس اور دوسرے یورپی شہروں کی لائبریریوں میں تھا وہ اس وقت حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ قاضی صاحب اس پر بھی تیار نہ ہوئے کہ بعد میں انھیں حاصل کرکے ضروری اضافے کر لئے جائیں۔ یہ تھا قاضی صاحب کا طریقِ تحقیق اور یہ تھے قاضی عبدالودود۔

قاضی صاحب کا نظریہ تھا کہ ہر محقق کو ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ جس موضوع پر وہ قلم اٹھا رہا ہے اس پر جب وہ حاوی نہ ہو اسے لکھنے کا حق نہیں۔ اس سلسلے میں وہ کسی تاویل کے قائل نہ تھے۔ جب، جہاں اور جس کی تحریر میں انھوں نے بے ضابطگی دیکھی اسے ہرگز نہ بخشا۔ بالتخصیص ان کی کسی کتاب کسی مضمون کو اٹھا لیجیے، کہیں سے دیکھیے، یہی باریک بینی، یہی گرفت، یہی بے باکی ہر جگہ جلوہ فرما ہے۔

خواجہ احمد فاروقی نے "میر؛ حیات اور شاعری" میں میر سے متعلق سمجھ دیا کہ انھوں نے ناسخ کی طرح ہندوستانیت سے بالکل قطع تعلق نہیں کیا تھا۔ قاضی صاحب نے گرفت کی اور ناسخ کے کلام سے ہندوستانیت کی مثالوں کا ایک انبار کھڑا کر دیا۔ میر کی ہندوستانیت کی رد کرنے کے لئے انھوں نے صرف الفاظ کا سہارا نہیں لیا بلکہ کلیاتِ میر کے ابتدائی "ایک ہزار" اشعار کا تفصیلی مطالعہ پیش کرکے خواجہ احمد فاروقی کے دعوے کی قلعی کھول دی۔ مقصد نہ میر کی عظمت سے انکار تھا نہ خواجہ احمد فاروقی کی تذلیل، بلکہ یہ کہ جو بات جیسی ہو اُسے ویسے ہی سمجھا جائے۔ یا جس بات کے لئے کافی و شافی ثبوت نہ مہیا کر سکتا ہو اسے لکھے ہی نہیں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنے تحقیقی مقالے "بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء" میں تپاں کے مراثی کا تذکرہ کیا۔ قاضی صاحب نے اپنے طویل مضمون میں نورالحق تپاں کی بیاضِ مراثی کا تفصیلی مطالعہ چودہ صفحات پر پیش کیا۔

ڈاکٹر مسعود حسن رضوی نے دیوانِ فائز کو ایڈٹ کیا اور اس کے مقدمے میں دتاسی کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اس نے اپنے تذکرے میں فائز کا ذکر کیا ہے۔ اور فائز کی نظم "بھنگیرن" کا فرنچ ترجمہ بھی کیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے گارساں دتاسی کے کئے ہوئے فرنچ ترجمے کو دیکھ لینے ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس کے فرنچ ترجمے سے مطبوعہ دیوان میں شائع شدہ نظم مذکورہ کا شعر در شعر موازنہ کیا اور بالآخر مقطع کا شعر ترجمے میں فاضل نکلا۔

یہ خورد بینیت ہر جگہ موجود ہے۔ مولوی عبدالحق نے خطباتِ گارساں دتاسی کا مقدمہ لکھتے وقت اس کی چند غلطیوں کی نشاندہی کی۔ قاضی صاحب نے مزید ۸۰ (اسی) غلطیوں کا پتہ لگایا اور ترجمے کی بھی ۱۸ (اٹھارہ) غلطیاں۔ غالب کے فرضی اُستاد پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے

۱۹ دلائل سے ثابت کیا کہ اس شخص عبدالصمد یا ہرمزد کا وجود فرضی ہے ۔ اور اسے سوائے غالب کے کوئی دوسرا شخص نہیں جانتا ۔ اس فرضی دعوے کا ابطال چند دلائل سے ہی ہو جاتا اور نتیجہ وہی نکلتا ۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب غیر ضروری مشقت ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں مگر یہی قاضی عبدالودود کا خورد بینی مزاج تھا اور صرف ان ہی کے بس کا تھا ۔

قاضی صاحب دوسروں کے لئے سخت ہوں اور خود سے نرمی برتیں ایسا بھی نہیں ۔ اس ضمن میں صرف " دیوانِ جوشش " کی مثال ہی کافی ہے ۔ اس وقت اس کا صرف ایک ہی نسخہ معلوم تھا بعد میں دو نسخے اور دستیاب ہوئے مگر ان کے ایڈٹ کئے ہوئے نسخے کی اہمیت آج بھی وہی ہے جو اس وقت تھی ۔ چہ جائیکہ بنیا راج کی لائبریری سے حاصل نسخے میں ۵۶ غزلیں زائد ہیں ۔ اس دیوان کو ایڈٹ کرنے میں جتنی محنت اور وقت صرف ہوا ہوگا اس کا اندازہ اس کو سرسری دیکھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے ۔

یہ کہا جاتا ہے کہ قاضی صاحب خواہ مخواہ اتنی محنت کرتے ہیں ۔ آخر کسی نسخے میں نون کا نقطہ ہے اور کسی میں نہیں تو اسے اتنی اہمیت کیوں دی جائے ۔ یہیں خورد بینی طریق تحقیق کی انفرادیت ابھر کر سامنے آتی ہے ۔ قاضی صاحب چھوٹی چھوٹی لغزشوں اور غلطیوں کے عمیق مشاہدے سے بڑے بڑے نتیجے نکالتے ہیں ۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی شخص کے جسم سے خون کا ایک حقیر سا قطرہ لے کر اس کا خورد بینی مشاہدہ کرنے پر یہ باسانی بتایا جاسکتا ہے کہ وہ کن امراض میں مبتلا ہے ۔ مثال کے طور پر کسی مصنف یا شاعر کی تخلیق کے خطی نسخے میں " ذال " اور " زے " کے استعمال میں کوئی تفریق نہیں یا وہ ہمزہ صحیح جگہ نہیں سمجھتا اور غلط جگہ لکھ دیتا ہے تو لازمی طور اس کی علمی صلاحیت پر ایک سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا ہے اور اس محقق کا پایۂ تحقیق بھی کمزور پڑ جاتا ہے جو اس مصنف یا شاعر کی علمیت کے متعلق اس سے قبل لکھ چکے ہوں ۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ان باریک باتوں کو بھی اپنی پکڑ سے نہیں نکلنے دیتے جن پر دوسرے کچھ سوچنے کی زحمت بھی نہ گوارا کریں ۔ اس کی لاتعداد مثالیں قاضی صاحب کے مضامین کے قاری کے ذہن میں موجود ہوں گی ۔ چند اپنے ذہن اور یادداشت سے پیش کرتا ہوں ۔

ڈاکٹر ممتاز احمد نے راسخ کی مثنویات پر اپنے تحقیقی مقالے میں اس دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھ دیا :

" اس زمانہ میں سوسائٹی کی حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ ہر شخص کا سینہ کینہ سے بھرا ہوا تھا "

قاضی صاحب نے ایک تحقیقی مقالے میں اس جملے کا وجود برداشت نہ کیا اور واضح لکھا کہ عظیم آباد

ن کوئی دَور ایسا نہیں گذرا جس پر یہ قول صادق آسکے ۔

"ذکرِ غالب" میں مالک رام نے لکھا،

"مرزا غالب ۸ رجب کو پیدا ہوئے"

قاضی صاحب نے تردید کی ۔ "۸ رجب کو عزت النساء بیگم کے بطن سے مرزا غالب نہیں ایک بچہ پیدا ہوا تھا جو تخلص اپنے ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آیا تھا"۔

ڈاکٹر سیدہ جسٹین نے مرزا محمد علی فدوی سے متعلق اپنے تحقیقی مقالے میں ایک جملہ لکھا: "خواجہ ہمدی خان کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہ تھی"۔ قاضی صاحب اس سرسری جملے کو برداشت نہ کر سکے' لکھا "نہ ہوگی' مگر کیا ثبوت ہے کہ نہ تھی"۔

اسی مقالے میں سیدہ جسٹین صاحب نے سراج الدولہ کے ساتھ "تخت نشین" کی ترکیب استعمال کی ۔ قاضی صاحب نے گرفت کی کہ سراج الدولہ کے ساتھ "مسند نشین" استعمال ہونا چاہیئے ۔

اسی طرح کتنے ہی مضامین میں لاتعداد جگہوں پر ایسی مثالیں افراط سے موجود ہیں اور ایک سمجھ دار شخص ان غلطیوں کو معمولی نہیں کہہ سکتا ۔ اور اگر کسی تحقیقی مقالے میں ایسی معمولی غلطیاں سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہوں تب تو اس مقالے کو تحقیقی کہنا تحقیق کے ساتھ مذاق ہی کرنا ہے ۔

قاضی صاحب نے تذکروں کو اپنا خاص موضوع بنایا ۔ اور جہاں کتنے گم نام تذکرے ان کی وجہ سے روشنی میں آئے وہیں تذکروں کے باہم موازنے سے کتنے ہی پوشیدہ حقائق بھی سامنے آئے ۔ کتنے ہی تذکرے جس ایک غلطی کو ایک طویل مدت سے نقل کرتے چلے آئے تھے ان کی نشاندہی اور حقیقت کا انکشاف اُردو کے تحقیقی ادب اور ادبی تاریخ کے اوپر ایک بڑا احسان ہے ۔ آزاد' غالب' شاد اور درجنوں دوسری شخصیتیں جن کے قدآور وجود کے زیر اثر ان کے ہم عصروں نے کچھ لکھنے کی جرأت نہ کی ۔ حالانکہ وہ حقائق سے زیادہ باخبر تھے ۔ اگر قاضی صاحب اسی رواداری کو روا رکھتے تو پچیس پچاس سال بعد بجا طور پر کہا جا سکتا تھا کہ اگر یہ باتیں بے بنیاد ہیں تو اس دور میں فلاں فلاں لوگ موجود تھے انھوں نے کیوں تردید نہ کی ۔ قاضی صاحب کی یہی خصوصیت قاضی صاحب کو ممتاز و ممیز کرتی ہے ۔

قاضی عبدالودود کی ان ہی خصوصیتوں کی وجہ سے بت شکن کہا گیا ۔ مگر اس بت شکن کی ایک اور خصوصیت بے مثل ہے' اس نے اپنا بت بھی بار ہا خود توڑا ہے ۔ اگر کبھی کوئی بات جتنی طور پر ثابت ہو گئی اور وہ اس بات کے خلاف ہے جو وہ پہلے کہہ چکے تھے تو بغیر کسی جھجک کے انھوں نے

اپنی پہلی تحریر کالعدم کردی ۔ اس کا مطلق خیال نہ کیا کہ جو شخص اس پہلی تحریر کو پڑھ چکا ہے اور اسی کو اس کے کالعدم ہونے کی خبر نہیں ، اس کا کیا ہوگا ۔ ایسا قاضی صاحب خدانے بار ہا کیا ۔ لوگ شاکی رہے مگر قاضی صاحب نے اس کی مطلق پروا نہ کی ۔ ان کا تحقیقی مزاج اس کو برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی نئی اور صحیح جانکاری دبا کر رکھی جائے صرف اس وجہ سے کہ اپنی کہی ہوئی بات پر حرف آتا ہے ۔

قاضی عبدالودود سے اردو میں تحقیق کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے ۔ ہرچند بہت سے محقق بھی اچھی تحقیق کے نمونے پیش کر رہے ہیں مگر مجموعی طور پر قاضی عبدالودود اپنی جگہ منفرد ہیں ۔ اور مجروح سلطان پوری کے اس شعر کے مصداق ہیں ۔

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

▬

سلسلہ صفحہ ۴۲ سے

کہوں گا کہ (گو کہ یہ میری فطرت کے خلاف ہے) راقم الحروف کے کئی طبع زاد مقالے اور تحقیقی تنقیدی و علمی مضامین ، تبصرے ، افسانے ، منی افسانے (برار میں پہلا منی افسانہ نگار ہے بطور بھی) مختلف موضوعات پر مضامین اور شعری تخلیقات بڑی تعداد میں اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں ساتھ ہی مصنف و مرتب ہونے کا شرف بھی حاصل ہے ۔ اس طرح اپنی ذات کا حوالہ دیتے ہوئے انا کو ٹھیس پہنچ رہی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ چارۂ دیگر نیست ؟

بہرحال ایک بار پھر خلوص دل سے کہوں گا کہ مجھے نہ تو محبوب راہی صاحب سے کوئی پرخاش یا بیر ہے نہ کسی قسم کی ذاتی رنجش اور نہ ہی محترمی انوار احمد صاحب نشتر سے کوئی ادبی یا ذاتی مخاصمت نہ بے بنائے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دونوں میرے لئے محترم و عزیز ہیں ۔ دونوں سے راہ و رسم ہے اچھے مراسم ہیں لیکن چونکہ معاملہ شعرائے برار کے صحیح مقام و مرتبہ ، ان کے کارناموں ، اُن کے ادبی جہاد مراتب و صحیح تعین کا تھا ، ادب میں ان کے مقام کی نشاندہی کا تھا ۔ اسی لئے یہ مختصر سا مضمون قلمبند کرنا پڑا ۔ اس کے علاوہ دوسرا اور کوئی مقصد نہیں ۔ مجھے امید ہے کہ جناب ڈاکٹر محبوب راہی اور جناب انوار احمد نشتر صاحب میرے اس تشنہ مضمون سے کسی غلط فہمی کو راہ نہ دیتے ہوئے ممنون کریں گے ۔

▬

بصرہ

محبوب راہی کی "بازیافت" پر ایک نظر

اکٹر محبوب راہی نے اُردو کے نوجوان شعراء میں اپنا ایک منفرد و ممتاز مقام بنالیا ہے۔ غزلیات کے دو مجموعے " ثبات" اور " تردید" اور بچوں کی نظموں کے دو مجموعے رنگ" اور "گل بوٹے" منظرِ عام پر آچکے ہیں [illegible] تیسرا مجموعہ "بازیافت" جو یں جناب پریم گوپال متل (ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج۔ نئی دہلی) کے زیرِ اہتمام ہوا ہے۔ صحیح معنوں میں شاعر کی "بازیافت" ہے اور ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ے مقام کو ممیز و ممتاز بنا تا ہے۔

محبوب راہی نے اپنے پہلے مجموعہ غزلیات " ثبات" میں لکھا ہے کہ :

شعر و ادب کے نخلستان میں میرا وجود ایک خود رو پودے کی طرح ہے۔ گرد و پیش تا حدِ نگاہ ریگ زار بے آب و گیاہ، خاندان، ماحول، سماجی و معاشی پس منظر، بظاہر کہیں ایسی فضاء و خفتہ تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے، ذہنی تربیت کرنے اور کسی تخلیق کار کو پروان چڑھانے و سازگار کہی جا سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر میری شاعری ایک اتفاقی حادثہ ہے"

لیکن "بازیافت" میں آپ اپنا "احتساب" کرتے ہوئے راہی لکھتے ہیں :

"میں نے گذشتہ بیس برسوں میں شاعری کی ہر مروجہ صنف پر جس کثرت سے لکھا ہے اور معیار اور مزاج کے حامل رسائل و جرائد میں جس تسلسل و تواتر کے ساتھ چھپتا رہا ہوں، قارئین ہیں۔ اس سے دوگنی غیر مطبوعہ شکل میں محفوظ ہیں۔ میری اس زود گوئی پر مختلف سمتوں سے و دشنام کے تیر برسائے گئے، لیکن میں اپنی دھن میں بے نیازانہ آگے بڑھتا رہا"

راہی کی زود گوئی کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے پانچ شعری مجموعے اب چھپ چکے ہیں۔ اور نظم و نثر کے سات مجموعے ابھی زیرِ طبع ہیں۔ جو شاعر اپنی (۴۵) سالہ یا (۲۰) سال سے شاعری کر رہا ہو اور اس دوران میں تقریباً ہر رسالہ میں چھپ کر تحسین پا چکا ہو اس کی شاعری ایک " اتفاقی حادثہ" نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ

اس نے کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ نہ کیا ہو۔ اور اقلیم سخن کے کسی شفیق و مہربان رہبر کمال کا شرف حاصل نہ کیا ہو۔ لیکن برار کے ایک مردم خیز قصبہ پیپل گاؤں راجہ سے اٹھنے والا یہ شاعر اپنی شاعری کو ایک " اتفاقی حادثہ " قرار نہیں دے سکتا ۔ شاعری جزویست از پیغمبری ۔ شاعر تلمیذ الرحمٰن ہے ۔ میرؔ غالبؔ و اقبالؔ نے کسی بڑے استاد سے اکتساب شعر نہیں کیا ۔ گو اپنے ذہنی سفر میں پرانی روایات کو شمع راہ بنایا اور نئے ڈھنگ و آہنگ کی بنیاد ڈالی اور اپنے اپنے رنگ کو تکمیل کے اونچے مقام تک پہنچایا ۔ یہ مضامین تو غیب ہی سے خیال میں آتے ہیں اور ادب عالیہ میں اپنا مقام پیدا کرتے ہیں ۔ راہیؔ بھی ایک وہبی شاعر ہے جو ایک ناسازگار ماحول سے اٹھا اور غیب سے اکتساب فیض کرتا ہوا بیس سال کے طویل سفر کے بعد اپنے تیکھے پن کی پہچان میں کامیاب ہوا ہے ۔

راہیؔ شعلۂ مستعجل نہیں ہے کہ یکایک ظاہر ہوا اور اپنی چمک دمک دکھا کر غائب ہو گیا ۔ راہیؔ ایک کہکشاں ہے جو اپنی روشنی کے سفر کو مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے ۔ نقادان فن نے راہیؔ کی اس کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے اور اس کا اعتراف کیا ہے ۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق " غالبؔ کا وہ انداز جس میں فکر کی آنچ جذبے کی وارفتگی میں ڈھل کر نمودار ہوتی ہے ' محبوب راہیؔ مرغوب ہے ۔ اگر محبوب راہی کے ہاں شعر کہنے کی لگن اسی طرح جوان رہی تو وہ غالبؔ کی شعری روایت کو زندہ رکھنے میں ضرور کامیاب ہوں گے ۔

جناب ظ ۔ انصاری کی رائے میں یگانہؔ کے بعد شاد عارفی اور پھر مظفر حنفی تک جو سلسلہ آیا ہے جس میں دھار کی تیزی کے ساتھ تلخی چھپتی جاتی ہے ۔ وہ سلسلہ محبوب راہیؔ تک پہنچتا ہے "۔

محمود سعیدی کے مطابق " محبوب راہیؔ کا کلام جہاں ایک طرف جدید شاعری کے قاری کے لئے اپنے اندر دلچسپی کا پورا سامان رکھتا ہے ۔ وہیں دوسری طرف ان لوگوں کو بھی مایوس نہیں کرتا جو شاعر سے ایک خاص قسم کے فنی رکھ رکھاؤ کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ ان کے شعری موضوعات میں رنگا رنگی نظر آتی ہے ۔ اپنے ہم عصر یا قدرے پیش رو شاعروں میں وہ مظفر حنفی سے بہت قریب ہیں ۔ لہجہ کا جو تیکھا پن اور فکر کی جو صلاحیت مظفر حنفی کی پہچان ہے اس کی جھلکیاں ان کے کلام میں جا بجا دیکھنے کو ملیں گی "۔

یہ حقیقت ہے کہ محبوب راہیؔ ڈاکٹر مظفر حنفی سے متاثر ہیں ۔ موصوف کی " حیات ، شخصیت اور کارنامے " پر انہوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی تکمیل کی ہے ۔ خود ڈاکٹر مظفر حنفی کا راہیؔ کے بارے میں خیال یہ ہے کہ :

" محبوب راہی جدید تر شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا اپنا لہجہ اور اپنی آواز ہے جو اپنی رمزیت، ایمائیت، اور اشاریت کے باوجود بامفہوم اور بلیغ ہے ــ ان کا دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ جدید تر نسل سے متعلق ہونے کے باوصف اپنی شعری روایت سے یکسر منحلق نہیں ہیں وہ نیا شعر کہنے پر قادر ہیں کہ انھیں معلوم ہے کہ پرانا کیا ہے۔ ان کی شخصیت یں کردار کی وہ پختگی، وہ گداز، وہ لچک، وہ خلوص اور بے لوثی موجود ہے جس کے بغیر اچھی زل کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا "۔

راہی نے اپنے اطراف کو شاعر کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ زندگی کے عملی پہلو پر غور کیا ہے اور صداقت کے ساتھ اس تجربہ کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے ان کو یہ احساس ہے کہ

انا، حق گوئی، بے باکی، خلوص، ایثار، بے غرضی
ہر اک الزام تیرے نام سے منسوب ہے راہی

ہر اک دشنام کے بدلے تبسم ایک ہلکا سا
ترا ردِ عمل بھی مرحبا کیا خوب ہے راہی

نجات اس کو نہ مل پائی مصائب کی صلیبوں سے
کئی صدیوں سے اس پر مستقل مصلوب ہے راہی

کبھی بدبخت باز آتا نہیں سچ بات کہنے سے
اسی اک بات پر تو ہر طرف مغضوب ہے راہی

ہے تلخ و تند لیکن حق تو یہ ہے حق پسندوں میں
ترا طرزِ سخن مقبول اور مرغوب ہے راہی

•

چمک دمک نہ کوئی آن بان کیا لکھوں
میں اپنا نام و نسب خاندان کیا لکھوں

تخیلات کی اونچی اڑان کیا لکھوں
زمین ہے سر پہ مرے آسمان کیا لکھوں

روایتوں نے مرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں
اے عصرِ نو میں تری داستان کیا لکھوں

ہر اک بلندی مرے آگے پست ہے راہی
تخیلات کی ایسی اڑان رکھتا ہوں

اور یہ بھی کہ

شخصیت میری انہیں سے ہے اجاگر راہی
میرا ہر شعر مری ذات سے وابستہ ہے

نیز

ہاتھ کٹ جاتے ہیں سر تن سے جدا ہو جاتے ہیں
کھیل بچوں کا نہیں حرفِ صداقت لکھنا

راہی کے مشاہدے میں زندگی و تہذیب کا کھوکھلاپن اس طرح آیا کہ

ہر سمت انا الحق کی صدا گونج رہی تھی
دیکھا تو کہیں جذبۂ منصور نہیں تھا

سچائی کا اک ورد تھا ہر ایک زباں پر
سچائی سے چہرہ کوئی پُر نور نہیں تھا

آپ اپنے سے تھا خود کو ہی لپٹائے ہوئے میں
بانہوں میں مری کوئی بھی محصور نہیں تھا

جستجو اس دور میں سچائی اور اخلاص کی — یعنی صحرا میں تلاشِ آبجو کرتے رہو

—

خود اپنے بھی ہونے کا یقین جس کو نہیں ہے — کس شان سے ہر بات پہ کہتا ہے یقیناً
پی جاتا ہے دریاؤں کو ندیوں کو شب و روز — وہ لاکھ سمندر سہی پیاسا ہے یقیناً

—

شہر کی مسموم تہذیبی ہوا کا سلسلہ — آگیا ہے گاؤں تک مکر و ریا کا سلسلہ
اب بھی شمرِ وقت ہیں ہر گام پر نیزہ بدست — اب بھی جاری ہے وہی کرب و بلا کا سلسلہ

عصرِ جدید کے بارے میں ان جذبات و تاثرات کے باوجود راہی نے اپنی غزلوں میں شعریت کو باقی رکھا ہے بلکہ

ترے لہجے کی رنگت پا کے راہی — غزل کا روپ تیکھا ہو گیا ہے

چند طرب انگیز اشعار ملاحظہ ہوں

ہماری جاگتی آنکھوں میں آ کے چپکے سے — کوئی بہلتا بہلا دلچسپ خواب رکھ دینا
اتنا نازک ہے کہ مثلِ گلِ تر لگتا ہے — دیکھتا ہوں اُسے چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے
چشم و لب ہی کیا سنورنا پا — اس کا تو پیکر ہنستا ہے
سمندر سے خلائے بے کراں تک — تمناؤں کی کوئی حد کہاں ہے
جب جب بات تمہاری نکلی — دل سے اک سسکاری نکلی
کھائی تھی جو ہنسی ہنسی میں — چوٹ وہ دل پر کاری نکلی
ڈھل کے جوانی کے سانچے میں — ہر مورت کیا پیاری نکلی

راہی کو بخوبی احساس ہے کہ

راہی اُترا نہ اُتر سے گا غزل کا جادو — کرتے ہیں روح کی تسخیر یہ اشعار ہنوز

اور غزل گوئی پر اتنا عبور حاصل کر لیا ہے کہ "بازیافت" میں اکثر اشعار سہلِ ممتنع کی حدوں کو چھوتے ہیں

کریں اغیار کا پھر گِلا کیا — ہمیں اپنوں ہی سے آخر مِلا کیا
سوا دار و رسن کے کچھ نہیں ہے — ہماری حق پرستی کا صلا کیا

—

موت آجائے گی مر جاؤں گا — یعنی بازار سے گھر جاؤں گا
جس طرف اور جدھر جاؤں گا — مثلِ بوئے گلِ تر جاؤں گا

آئینہ تو ہے مرا میں تجھ کو — سامنے رکھ کے سنور جاؤں گا

بنایا اک پرائے کو جو اپنا — ہر اک اپنا پرایا ہو گیا ہے
بلندی پر ہے پستی کا تسلط — جو ادنیٰ تھا وہ اعلیٰ ہو گیا ہے
سمٹ آئی ہے کچھ اتنی یہ دنیا — کہ بچوں کا گھروندہ ہو گیا ہے

لمحہ لمحہ جا بجا چلتا رہا، چلتا رہا — روز و شب کا سلسلہ چلتا رہا چلتا رہا
پیچھے پیچھے راہ رو تھکنے لگے رکنے لگے — آگے آگے راستہ چلتا رہا چلتا رہا
جب ہوا چلتی تھی راہی میری انگلی تھام کر — ہر طرف سکہ مرا چلتا رہا چلتا رہا

وقت نے کس کا ساتھ دیا ہے — وقت بڑا چلتا پرزہ ہے
باہر باہر ہے خاموشی — اندر اندر شور بپا ہے
مہر و وفا، اخلاص و محبت — ان باتوں میں کیا رکھا ہے
کوئی نہیں ہے سننے والا — جس کو دیکھو بول رہا ہے

کھا رہا ہے آپ اپنی ڈالیاں — عصرِ حاضر کے تمدن کا شجر
پھیر میں لاکھوں کی ہوں میں اس طرح — جیسے ریگستان میں تنہا شجر
چھاؤں ہے اب کس قدر اس کی گھنی — وہ جو تھا چاہت کا چھوٹا سا شجر
اپنے سائے دوسروں کو بانٹ کر — اب کھڑا ہے دھوپ میں ننگا شجر

راہی نے اپنے مقطعوں میں اکثر اپنے تخلص کی مناسبت سے بات کہی ہے اور اس طرح اپنے تخلص کو اپنے شعروں میں سمو دیا ہے ۔ چند مقطعے ملاحظہ ہوں ۔

تمام راہوں سے راہی گذرتا نہیں — راستہ آپ اپنا بناتا ہے وہ
جہاں ہر گام بدنامی کا ڈر ہے — انہی رستوں کا میں راہی رہا ہوں
اے راہی چل پڑے ہیں جب تو یہ سب سوچنا کیا ہے — مصائب کس قدر ہیں راستے مسدود کتنے ہیں
آپ اپنا راستہ بنا لیتا ہوں میں — کیا ضروری ہے کہ پھر رہنما کا سلسلہ

ہمراہی میں خود اپنا ہمراہی بھی ہوں رہبر بھی — اپنا رستہ آپ بنانا مجھ کو آتا ہے
راہیؔ اس اتفاق کو کیا کیجئے کہ میں — جس سمت جا رہا ہوں ہوا بھی ادھر کی ہے
راہیؔ کی داستان کہاں تک سنائیے — روداد اک طویل سفر در سفر کی ہے
قدم قدم پہ لئے جستجوئے نو راہیؔ — ہر ایک منزلِ عیب و ہنر سے گذریں گے
راہیؔ ہم کو راہبروں کی راہبری سے کیا لینا ہے — ہم من موجی جس رستے پر جی چاہے گا ہو لیں گے
راہیؔ رہِ طلب میں ملیں پھول عیش کے — یا سنگِ کرب و غم کی ہو برسات جو بھی ہو
رہ گذر آپ ہی خود اپنی تلاشی ہم نے — اور اس کے ہمیں راہیؔ ہمیں رہبر ٹھیرے

آخری مقطع حقیقت کی بڑی حد تک نشاندہی کرتا ہے۔ اپنے "احتساب" میں بھی راہیؔ نے صراحت کی ہے کہ وُہ گروہ بندی کی سیاست سے دُور، کسی مخصوص نظریاتی تحریک یا کسی نام نہاد ادبی گروپ یا کسی متعینہ رجحان سے منسلک نہیں۔ لہذا تخلیقی لمحوں میں میرے ذہن پر روایت یا ترقی پسندی یا جدیدیت کا پہلے ہی سے کوئی عکس نہیں ہوتا۔ کوئی پیشگی منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔ جو کچھ سمجھتا ہوں بے ارادہ اور آزادانہ لکھتا ہوں لہذا میری تقریباً ہر غزل میں تینوں رجحانات کے حامل اشعار آپ کو ملیں گے"

لیکن ان کے کلام میں طنز کا پہلو کچھ نمایاں ہی ہوتا ہے۔ صرف ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دھار کر ایک نیا روپ سخن فہمی کا — سارے غالبؔ کے طرفدار نکل آئے ہیں
شیر کو گھیر کے ماریں گے یہ منصوبہ ہے — لیجے پھر سارے چڑی مار نکل آئے ہیں
آپ کے منہ سے ابھی دودھ کی بُو آتی ہے — آپ بھی سونت کے تلوار نکل آئے ہیں
مجھ کو اخلاص و محبت کا سبق سکھلاتے — ساری دنیا کے ریاکار نکل آئے ہیں

"بازیافت" تقریباً (۱۰۰) صفحات کا ایک مختصر مجموعہ ہے جس میں محبوب راہیؔ کی ایسی غزلیات شریک ہیں جن سے ان کے فکر و فن کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا ایک ایسا رنگ متعین کر لیا ہے جو انہیں اپنے معاصرین میں ممتاز و ممیز کرتا ہے اور امکان یہ بتاتا ہے کہ جذبات کی یہ شدت و ندرت اور بیان کی یہ تازگی و شگفتگی کم نہیں ہوگی بلکہ اور بڑھے گی۔

"بازیافت" جناب پریم گوپال متل نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔ تشکیل افکار اکیڈمی کا سرورق ہمیشہ کی طرح دلکش اور خیال انگیز ہے۔ محبوب راہیؔ کا اسکیچ بھی شاہو کی تخلیق

بقیہ صفحہ ۱۲۸ پر

تبصرے

منتخب مضامین
سید علی اکبر

مرتبہ: محمد منظور احمد

پبلشر: ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

جناب منظور احمد صاحب نے جناب سید علی اکبر صاحب کے مضامین مرتب و شائع کرکے ایک نہایت اہم اور بروقت کام انجام دیا ہے۔ اہم اس لیے کہ انھوں نے آٹھ سوانحی مضامین اور (۸) تعلیمی موضوعات کے مضامین منتخب کئے ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ ضرورت تھی کہ انھیں یکجا کر دیا جاتا اور بروقت اس لیے کہ یہ سوانحی مضامین ایسی شخصیتوں کے بارے میں ہیں جن سے جناب سید علی اکبر بہت قریب تھے اور تعلیمی موضوعات کے مضامین ایسے ماہر تعلیم کے لکھے ہوئے ہیں جس نے اپنی تمام عمر تعلیمی خدمت میں گزار دی اور ان مضامین سے آج بھی بہ طریق احسن استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

جناب سید علی اکبر نہ صرف ایک ماہر تعلیم اور ممتاز ایڈمنسٹریٹر تھے بلکہ وہ کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انگلستان میں تکمیل تعلیم کے بعد پہلے نظام کالج میں تاریخ و معاشیات کے لیے متعین ہوئے پھر محکمہ تعلیمات میں مہتمم تعلیمات سے لے کر ناظم تعلیمات تک خدمات انجام دیں۔ وظیفہ کے بعد متعدد تعلیمی اداروں سے دلچسپی لیتے رہے خصوصاً انوار العلوم کالج کے استحکام و ترقی میں بڑے مدد و معاون رہے۔ نیز برسوں ادارہ ادبیات اردو کی صدارت میں فائز رہ کر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ موصوف نے چند سوانحی مضامین ایسی شخصیتوں کے

بارے میں لکھے ہیں جن سے وہ بہت قریب رہے ہیں، نیز ایک مضمون اپنی پڑھائی کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ تعلیمی موضوعات پر جو مضامین ہیں وہ ایسے مسائل پر مبنی ہیں جن کے حل کی آج بھی ضرورت ہے اور ان سے بہتر طریقہ پر نپٹنے کے لیے ان مضامین سے مدد لی جا سکتی ہے۔

سب سے پہلا مضمون سید علی بلگرامی سے متعلق ہے جو نابغۂ روزگار تھے۔ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ ۱۴ سال کی عمر میں اردو، فارسی، عربی کی تعلیم سے فارغ ہوئے۔ پندرھویں سال انگریزی کی تعلیم کے لیے مدرسہ میں شریک ہوئے۔ آٹھ سال کی قلیل مدت میں آپ نے بی اے بدرجہ اول، دوہرے اعزاز (ڈبل آنرز) کے ساتھ کامیاب کیا۔ اس امتحان میں آپ کی زبان دوم سنسکرت تھی۔ اس کے بعد آپ نے قانون ملکی کا مطالعہ کیا۔ پھر سول سروس کے امتحان میں کل صوبہ بہار میں اول رہے۔ بعد ازاں طامس اسکالرشپ پاکر انجنیئرنگ کی تعلیم کے لیے رڑکی کالج میں داخل ہوئے۔ نواب سالار جنگ اول نے جب آپ کی ذہانت و قابلیت کے بارے میں سنا تو بلاکر اپنا اسٹاف میں مامور کر لیا۔ انگلستان اپنے ساتھ لے گئے اور لندن کے مدرسہ معدنیات میں داخل کروایا۔ جلد ہی آپ نے امتحان کامیاب کر کے اعلیٰ درجہ کا تمغہ حاصل کیا۔ اس سے قبل لندن سے میٹرک بدرجہ اعلیٰ کامیاب کیا جس میں اختیاری زبانیں جرمنی و فرانسیسی تھیں۔ نیز لاطینی بھی سیکھی۔ اس کے بعد فرانس، جرمنی و اسپین کا سفر کیا اور اٹلی میں کچھ مدت قیام کر کے اطالوی زبان بھی سیکھی۔ یوروپ سے واپسی پر انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ہوم سکریٹری، و معتمد تعلیمات نیز تعمیرات، ریلوے و معدنیات پر بھی مامور رہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے بی ایل امتحان کی تیاری اس وقت شروع کی، جب امتحان کو چھ ماہ باقی تھے۔ یہ امتحان ۱۸۹۱ء میں بدرجہ اول کامیاب کیا اور طلائی تمغہ و اسکالرشپ حاصل کیا۔ ۱۸۹۳ء میں حکومت ہند نے آپ کو شمس العلماء

کو منتقل کر دیا۔ ۱۹۰۱ء میں وظیفہ کے بعد انگلستان میں مقیم ہو گئے۔ کیمبرج میں ریڈر کی حیثیت سے مامور ہوئے۔ نیز انڈیا آفس کے کتب خانہ میں عربی فارسی کے قلمی کتب کی فہرست تیار کی۔ جناب سید علی اکبر نے یہ معلومات اور اس کے علاوہ ایسی مستند معلومات سید علی بلگرامی کے بارے میں دی ہیں جسے پڑھ کر قاری کے دل میں ولولہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس ناقابل فراموش ہستی کو شمع ہدایت بنا کر اس راستہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔

سروجنی نائیڈو اور ان کے خاندان سے جناب سید علی اکبر کے بڑے قریبی اور گہرے روابط تھے۔ زمانہ تعلیم میں انگلستان میں دونوں کے روابط کی ابتدا ہوئی جو آخر وقت تک قائم رہے۔

سید راس مسعود، جسٹس سید محمود کے اکلوتے بیٹے اور سر سید احمد خاں کے پوتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۷ء میں بھوپال میں انتقال ہوا۔ ان کا نام "راس" جسٹس محمود نے اپنے ایک انگریز دوست کے نام پر رکھا تھا۔ دادا نے ان کی بسم اللہ اسٹریچی ہال علی گڑھ کالج میں بڑی دھوم دھام سے منائی۔ صغر سنی میں باپ اور دادا کے انتقال کے بعد علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھیوڈور ماریسن کی سرپرستی میں رہنے لگے۔ انگلستان میں تعلیم بھی انہی کے گھر رہ کر ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس ہو کر پٹنہ میں وکالت کی۔ ۱۹۱۳ء میں انڈین ایجوکیشنل سروس سے متعلق ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں حیدرآباد کی نظامت تعلیمات پر ان کی خدمات مستعار لی گئیں۔ ۱۹۲۸ء تک اس خدمت پر فائز رہے۔ ان کا دور سررشتہ تعلیمات حیدرآباد کی تاریخ میں ایک درخشاں دور تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اردو میڈیم مدارس قائم کئے جانے لگے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۸ء تک نہ صرف مدارس بلکہ طلبا کی تعداد میں تگنا اضافہ ہوا اور محکمہ تعلیمات کا موازنہ ر۲۱ لاکھ سے زائد از (۴۰) لاکھ ہو گیا۔ مسعود جنگ نے ۱۹۲۱ء میں پرائمری تعلیم کو مفت قرار دیا۔ ابتدائی تعلیم کو لازمی اور جبری قرار دینے کی کارروائی کی۔

تعلیم بالغان کا بھی آغاز کیا۔

۱۹۲۳ء میں سرکار کی جانب سے جاپان کے نظام تعلیم کا مطالعہ کرنے وہاں گئے۔ واپسی پر کتاب لکھی۔ ۱۹۲۵ء میں اپنے صرفہ سے پھر جاپان گئے۔ کوریا و چین کا سفر بھی کیا۔ ۱۹۲۶ء میں انجمن اساتذہ بلدہ کی پہلی کانفرنس میں جاپان پر معلومات افزا مضمون پڑھا۔ میجک لانٹرن کے ذریعہ جاپان کے مناظر اور رہن سہن کے طریقے دکھلائے۔

ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان گئے۔ صحت خراب ہونے کی بنا پر ۱۹۲۹ء میں واپس ہوئے۔ حضور نظام انھیں اپنا پولیٹکل سکریٹری بنانا چاہتے تھے۔ دوسری خدمت علی گڑھ یونی ورسٹی کی وائس چانسلری تھی انھوں نے پہلی معقول تنخواہ اور زیادہ آرام والی خدمت چھوڑ کر دوسری کو پسند کیا تاکہ اپنے دادا کے لگائے ہوئے پودے کو پروان چڑھائیں۔ حکومت ہند اور ریاست حیدرآباد دونوں جگہ سے امداد و گرانٹ حاصل کر کے یونی ورسٹی کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ وہاں سائنس کالج کا قیام تھا۔ جس کے لیے ایک شاندار عمارت اور سائنسی تحقیقات کے لیے عصری ساز و سامان مہیا کیا۔ وہ اساتذہ و طلبا دونوں میں برابر مقبول تھے۔

اردو سے انھیں بڑا شغف تھا گو اردو کے ادیب نہیں تھے، وہ اس زبان کے زبردست حامی تھے۔ نواب عماد الملک کے انتقال کے بعد وہ انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب ہوئے۔ انجمن کے لیے اپنے ذاتی اثر سے چندوں اور عطیوں میں ہزار ہا روپے جمع کئے۔ مرحوم کا خیال تھا کہ اردو کتابیں نہ صرف غلطیوں سے پاک ہوں بلکہ دیدہ زیب بھی ہوں۔ چناں چہ دیوانِ غالب، مراثی انیس، اور سرسید کے خطوط بڑی صحت اور نفاست سے نظامی پریس بدایوں سے طبع کرائے نیز اردو شعرا کے کلام کا انتخاب کر کے "انتخاب نذیر" کے نام سے شائع کرایا جو ان کے ذوق اور سخن فہمی کا شاہد ہے۔ جناب سید علی اکبر صاحب نے راس مسعود کی شخصیت، علمی قابلیت و کردار کا بڑی

ی تفصیل سے نقشہ کھینچا ہے جس سے وہ اپنے ذاتی تعلقات کی بناء پر
قف تھے۔

سجاد مرزا مرحوم ملک کے ایک عظیم ماہر تعلیم اور اردو کے بڑے
سرپرست تھے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ممتاز خاندان کے رکن تھے
ن کے والد مولوی عزیز مرزا معتمد امور عامہ عدالت و تعلیمات تھے۔ ان کے
ے بھائی احمد مرزا چیف انجینئر، منجھلے بھائی نواب سعید جنگ، چیف
سٹس اور تین چھوٹے بھائی ڈاکٹر بابر مرزا پروفیسر حیوانیات علی گڑھ،
مد مرزا، انکم ٹیکس کمشنر اور محمد مرزا جج ہائیکورٹ تھے۔ سجاد مرزا ۱۸۹۸ء
یں پیدا ہوئے اور ۱۹ جنوری ۷۴ء کو اچانک انتقال کر گئے۔ انھیں
نب سید علی اکبر صاحب بچپن سے جانتے تھے۔ محکمہ تعلیمات میں ایک ساتھ
م کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وظیفہ کے بعد وہ لیبیا میں یونیسکو کے تعلیمی مشن
کے سربراہ مقرر ہوئے اور چار سال تک کام کرنے کے بعد ۵۵ء میں
طن واپس ہوئے۔

مولوی عزیز مرزا نے تاریخ و ادب پر اپنے مضامین اور تصانیف
سے اردو کے علمی ذخیرہ میں قیمتی اضافہ کیا تھا۔ سجاد مرزا کو بھی اردو سے
بڑا شغف تھا۔ انھوں نے بچوں کا قاعدہ شائع کیا جو کئی سال تک نصاب
میں رہا۔ اس کی لکھائی چھپائی عمدہ اور تصویریں دیدہ زیب تھیں۔ انھوں
نے اردو کے نستعلیق ٹائپ کو فنی اعتبار سے بہتر بنانے کے سلسلے میں
قابل قدر کام کیا تھا۔ انھیں اردو مجلس اور انجمن ترقی اردو سے گہری دلچسپی
تھی۔ اردو ہال حیدر گوڑہ کی تعمیر کے لئے انھوں نے (۱۵) ہزار روپیہ کا پہلا
گراں قدر عطیہ دیا اور اپنے دوست اے۔ ایم خالد سے ایک ہزار پاؤنڈ عطیہ
دلوایا۔

نواب اعظم جنگ کے بارے میں جناب سید علی اکبر صاحب لکھتے
ہیں کہ اعظم جنگ کی جدائی ان کے لیے ایک شخصی سانحہ ثابت ہوئی کہ وہ ان
کے قدیم رفیق تھے اور تقریباً (۴۰) سال تک ان کا قریبی تعلق رہا۔ ان کے

مطابق اعظم جنگ ایک ایسے کلچر کے حامل تھے جس میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے بہترین اجزا شامل تھے۔ وہ نہایت روشن خیال، ترقی پسند اور سائنٹفک مائینڈڈ تھے۔ ساتھ ہی وہ اپنی مروت، رواداری، مہمان نوازی، ہمدردی، فیاضی اور دوست پروری کے لیے مشہور تھے۔

مس سرنالنی چٹوپادھیائے، سروجنی نائیڈو کی ہمشیرہ تھیں۔ سید علی اکبر صاحب کو مرحومہ کے قدیم ترین دوستوں میں ہونے کا فخر حاصل تھا۔

سوانحی نصاب میں آخری مضمون جب ہم پڑھتے تھے، میں جناب سید علی اکبر نے اپنی طالب علمانہ زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ ہمارے طلبا آج بھی اسے پڑھ کر اپنے لیے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

تعلیمی موضوعات پر مضامین میں سب سے پہلا مضمون "تعلیم اور فرقہ وارانہ میل ملاپ" پر ہے جسے پڑھ کر آج بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

"عہد عثمانی میں تعلیمی ترقی" دوسرا مضمون ہے جس میں ایک ماہر تعلیم نے جو خود اپنی پوری عمر تعلیمات سے وابستہ رہا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام نظام کالج، ثانوی تعلیم کی تنظیم جدید، تحتانوی تعلیم کا پنج سالہ منصوبہ، توسیع مابعد جنگ ترقی کا منصوبہ، صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم، تعلیم بالغان وغیرہ کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں۔

تیسرا مضمون "مدرس اور اس کے لمحات فرصت" مدرسین کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر مدرس خود اپنے لیے اور مدرسہ اور ملک کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

"معائنہ مدارس" کی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے جناب سید علی اکبر صاحب نے مناسب تفصیل سے طریقۂ معائنہ اس کے مقاصد اور معائنہ کنندہ کی صفات وغیرہ بیان کی ہیں۔

"مدارس کی چھٹیاں" طلبا کے مشاغل اور والدین کی ذمہ داریاں" میں لمحات فرصت کے صحیح استعمال پر بحث کی گئی ہے۔ بقیہ صفحہ ۳۸ پر

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

نعت خیر الانام

ے بھر میں نظر نہ آیا کہیں بھی والا مقام ایسا
ازل سے اب تک ملا نہیں ہے کوئی بھی ذی احترام ایسا
تاریخ نوعِ انساں اے اہلِ دانش کھنگال ڈالو
تمہیں نہ اس میں ملے گا ہرگز کوئی بھی خیر الانام ایسا
ایک گوشہ ہیں بزمِ ہستی کے جس کے دم سے ہوا اُجالا
کہیں نہ دیکھا کسی بھی صورت نمودِ فیضِ عام ایسا
ایک لحاظ سے نام اس کا درود و بانگِ اذاں میں شامل
کہاں ہے بعدِ خدا کسی کا بھی ذکر ہر صبح و شام ایسا
یقیناً ہر کسی کا سینہ اسی کی یادوں سے ہے منوّر
بتاؤ حاصل ہوا ہے کس کو دلوں کے اندر مقام ایسا
یا امیؐ نے چار جانب لٹا دیئے علم کے خزانے
جہاں کی قسمت بدل کے رکھ دی دیا ہے اس نے پیام ایسا
رب سے نکلا ہوا یہ چشمہ ابد کے دن تک رہے گا جاری
کوئی بتائے کسی بھی دریائے فیض کو ہے دوام ایسا
سی کا فیضِ کرم ہے منشاء نکھر گیا ہے سخن تمہارا
اسی کی مدحت سے کھل گیا ہے تمہارا رنگِ کلام ایسا

۱۱ ۔ اشار کی ٹاؤن ۔ ناگپور

اسد کھنڈوی

نعت شریف

کبھی ہم یہ پائیں مقام اللہ اللہ
مدینے سے آئے پیام اللہ اللہ
منوّر ہے عالم کا ہر ذرہ ذرہ
درخشاں ہے ماہِ تمام اللہ اللہ
کبھی جب ہو محفل میں ذکرِ محمدؐ
پڑھیں سب درود و سلام اللہ اللہ
مقامِ محمدؐ وہ معراج کی شب
خدا سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ
درخشاں رہے ہیں درخشاں رہیں گے
مدینے کے کوچے مدام اللہ اللہ
ہوئیں مشکلیں ساری آساں جب آیا
زباں پر محمدؐ کا نام اللہ اللہ
بہکنا کجا ہوش آئے گا پی کے
وہ ساقی وہ کوثر کے جام اللہ اللہ
اسدؔ نے بھی تھاما ہے دامن تمہارا
زباں پہ ہے کلمہ مدام اللہ اللہ

پردیسی پورہ ۔ کھنڈوہ ۔ ایم پی

محمد عبدالکریم ماہر

شاعرِ اعظم

شعر میں یوں تو کوئی جوکھم نہیں
یہ بھی لیکن دردِ سر سے کم نہیں

ساٹھ ہزار اشعار کی لکھیں جو نظم
شاعروں میں آج یہ دم خم نہیں

کون دیکھے گا کسی دیوان کو
یہ حسینوں کا کوئی البم نہیں

مانگتا ہوں لمبی نظموں سے پناہ
ان کو پڑھنے کا کسی میں دم نہیں

سات سات اشعار کی اک اک غزل
یہ بھی پیٹے زخم کا مرہم نہیں

چار مصرعے ہیں رباعی خوب ہے
تا قیامت بھی چھپے تو غم نہیں

باندھ رکھی ہے ثلاثی نے ہوا
لیکن اس سے تو کوئی خرم نہیں

لطف کیا آیا جو دو مصرعے ملے
یعنی دوہے سا کوئی سنگم نہیں

جس کے اک مصرع پہ دیواں وار دیں
کوئی ایسا شاعرِ اعظم نہیں

11-3-923 ملے پلی - حیدرآباد ۱

ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد

غزل

آتی نہیں ہے کوئی بھی صورت خیال میں
ساجد ستارہ آگیا اپنا زوال میں

تو نے تو سوئی ڈال کے چاہا تھا کوہِ زر
مچھلی کہاں سے آئے گی اب تیرے جال میں

شرمندگی کے بوجھ سے نہ مر جائے یہ انا
لاؤں سکت کہاں سے میں دستِ سوال میں

پریاں تو جانے کب کی ہوئیں محوِ نیم خواب
کرتا ہے کون رقص یہ جام سفال میں

جتنی کشش تھی خوشۂ گندم میں دوستو
اتنی کشش کہاں ہے کسی کے جمال میں

برسوں سے جل رہا تھا دیا انتظار کا
چاندی جھلک رہی ہے وہ سونے کے بال میں

نزد کچھی مسجد۔ کھام گاؤں 444303 (ایم ایس)

غزلیں

ثریا صولت حسین

چمن میں کوئی مسکرانے لگے
کلی پھول بن کھلکھلانے لگے

سجے بام و در آپ کی یاد سے
مرے روز و شب جگمگانے لگے

نہ آیا کوئی چاند مدھم ہوا
ستاروں کے جھنڈ ٹمٹمانے لگے

درخشاں سحر چہچہاتے پرند
بحمدِ خدا چہچہانے لگے

نظر میں چبھی اک طلائی کرن
بدن خواب کے کسمسانے لگے

طلسمی فضا میں پھڑکتی غزل
سبھی سازِ دل جھنجھنانے لگے

ثریا نہ ہو تجھ کو شادیٔ مرگ
وہ تیری غزل گنگنانے لگے

ننھا بائی کورٹ ۳۳ سول لائنس ناگپور ۴۴۰۰۰۱

سید نسرین نقاش

ہر حال میں جینے کی دعا دے کے گئے ہیں
کیوں لوگ ہمیں ایسی سزا دے کے گئے ہیں

اے وقت کے جھونکو نہ بجھاؤ کہ ابھی وہ
ہاتھوں میں مرے شمعِ وفا دے کے گئے ہیں

گلشن کو بہاروں کے مہکتے ہوئے جھونکے
نادیدہ خزاؤں کا پتہ دے کے گئے ہیں

دنیا کی صلیبوں پہ ہر اک دور میں ہم لوگ
تاریک سویروں کو ضیا دے کے گئے ہیں

یادوں میں اترتے ہوئے معصوم سے چہرے
ہر موڑ پہ اک زخم نیا دے کے گئے ہیں

ہنستے بھی ہیں تو آنکھوں میں آجاتے ہیں آنسو
وہ جانے ہمیں کیسی دعا دے کے گئے ہیں

بے وقت کی یادوں کے برستے ہوئے موسم
بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا دے کے گئے ہیں

جس باغ سے گذرے ہیں خوش آواز پرندے
کلیوں کو تکلم کی ادا دے کے گئے ہیں

نسرین نگاہوں میں ابھرتے ہوئے منظر
بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دے کے گئے ہیں

خندہ بھون۔ نوا کدل۔ سری نگر ۱۹۰۰۰۲ کشمیر

غزلیں

عرفان پربھنوی

ہمیں بجھا نہیں سکتا کوئی خدا کی قسم
بجھے بجھا نہ سکی آندھی وہ چراغ ہیں ہم
جسے بھی دیکھئے آراستہ ہے زخموں سے
مجھے تو لگتا ہے شاید ہے زخم کا موسم
ہمیں سے رنگ چمن ہے ہمیں سے نکہتِ گل
چمن کی اصل ہیں اے دوستو بہاریں ہم
وہ کیا سمجھے گا بھلا [illegible] دور کی تاریخ
نہ [illegible] جس کا [illegible] ہو قلم
ہمارے ہاتھ پر کی حادثوں نے بھی بیعت
ہمارے آگے کیا گردشوں نے بھی سر خم

اسی کے ہاتھ میں جلتی ہوئی ہے مشعل بھی
نہ جس کے ہاتھ میں عرفاں ہے امن کا پرچم

[illegible] - پربھنی 431401 (ایم ایس)

شاداں احسانی

حوالے کر دیئے صیاد کو جب بال و پر میں نے
عجب حسرت سے کی اپنے نشیمن پر نظر میں نے
قفس میں سینکڑوں پابندیاں عاید ہوئیں مجھ پر
ارادے سے ابھی پرواز کو تولے تھے پر میں نے
جدھر دیکھو نظر آتی ہیں تصویریں نشیمن کی
قفس میں کس سے سن دے رہائی کی خبر میں نے
یہ پچھلی رات کا عالم یہ سناٹا ارے توبہ
لرزتے کانپتے تاروں کو دیکھا رات بھر میں نے
کبھی منزل کبھی منزل سے آگے ان کو پاتا ہوں
ہجوم شوق میں جس سمت بھی ڈالی نظر میں نے
جدائی میں سکون قلب پانا غیر ممکن ہے
مسرت کو کسی پہلو نہ پایا معتبر میں نے
مرے حصے کے کیا آنسو بھی اب باقی نہیں یارب
سکوں کی بھیک میں مانگے نہ تھے لعل و گہر میں نے
ہر اک نقش قدم شاداں وہی جلوے نظر آئے
ہر اک منزل کو پایا ہے انہیں کی رہگذر میں تے

بیگم پارک رامیشور روڈ - پردیسی پورہ کھنڈوہ (ایم پی)

7 JUL 1986

ماہنامہ

حیدرآباد

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۳ شمارہ ۷ قیمت ۵ روپے جولائی ۱۹۸۶ء

ایڈیٹر محمد قمرالدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر محمد کلیم الدین احسن

مجلسِ مشاورت

یوسف ناظم

محمد منظور احمد منظور

ڈاکٹر محمد یوسف الدین

اے۔ جی۔ فاروقی

پروفیسر رضی الدین احمد

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا

منیر احمد صدیقی

پروفیسر میر تراب علی

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
: 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
ال 90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 〃
ت 1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 〃

یڑ، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے
نائب پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد میں چھپوا کر
سیٹھ بلڈر حیدرآباد سے شائع کیا

:- ترسیلِ زر کا پتہ :-
147-5-11 ریڈ ہلز
حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش

فہرست

حرفِ اوّل

ہمارا تعلیمی معیار ممکنہ پستی کی حد کو پہنچ چکا ہے۔ آج دہم کا طالب علم اپنی عمر کے قیمتی دس سال گذارنے کے بعد اس موقف میں نہیں ہے کہ اعتمادِ قلب کے ساتھ امتحان میں شریک ہو سکے۔ اپنی مادری زبان اور علاقائی و قومی و انگریزی زبانوں میں ان کی مہارت کا یہ عالم ہے کہ اپنا نام بھی صحیح نہیں سکھ سکتا۔ اپنی نصابی کتب صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتا۔ اگر پڑھ سکتا ہے تو عبارت کا کوئی مطلب اس کے ذہن نشین نہیں ہوتا۔ چونکہ ہفتم سے دہم تک ان طلباء نے اپنی عمر کے سات تا دس سال گنوا دئے ہیں اور ان کی تعلیم میں بنیادی کمزوری ہے انہیں اپنے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ ان کے لئے کچھ کیا جائے۔ اوقاتِ مدارس کی تعلیم ان کے لئے کافی نہیں ہے، ضروری ہے کہ اوقات مدارس کے بعد ان کے لئے کوچنگ کلاسیں قائم کی جائیں جن میں گرما کی تعطیلات میں انگریزی، تیلگو، اردو اور ریاضی کی مبادیات پڑھائی جائیں اور پورے تعلیمی سال کوچنگ دی جائے۔ ایک تعلیمی اور کلچرل سوسائٹی "محفلِ علم و فن" نے اس طرح کی کوچنگ کلاسیں گذشتہ چند سالوں سے قائم کی ہیں اور تعلیمی معیار پر ان کلاسوں کا کافی اچھا اثر ہو رہا ہے جہاں پرانے شہر کے چند اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں گذشتہ چند سالوں میں ایک بھی طالب علم کامیاب نہ ہوا تھا آج اس سوسائٹی کی کوچنگ کلاسوں کی وجہ سے طلباء درجۂ اول و دوم میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام تعلیمی ادارے ایسی کوچنگ کلاسیں قائم کریں تاکہ ہمارے سبھی طلباء ان سے استفادہ کریں۔

ایک اور اہم مسئلہ جس پر اردو والوں کو توجہ کرنی ہے، وہ سہ لسانی فارمولا ہے۔ ہماری حکومت نے جو سہ لسانی فارمولا منظور کیا ہے۔ وہ یہ ہے:

۱۔ مادری زبان یا علاقائی زبان، جماعت اول سے دہم تک
۲۔ انگریزی زبان ششم سے دہم تک
۳۔ ہندی زبان بطور زبانِ دوم ہشتم سے دہم تک

صدر نشین بہار ٹیچرز کمیشن نے اس فارمولا میں یہ ترمیم تجویز کی ہے،

۱۔ (۱) اردو بحیثیت مادری زبان جماعت اوّل تا سوم بطور ذریعہ تعلیم
(ب) تیلگو بحیثیت علاقائی زبان جماعت چہارم سے دہم تک بطور ذریعہ تعلیم۔
۲۔ اردو بحیثیت زبان اوّل جماعت چہارم سے دہم تک۔
۳۔ زبانِ دوم جو انگریزی یا ہندی میں سے چنی جائے گی جماعت ششم سے دہم تک

اس تجویز کے لحاظ سے اردو والے طالب علم کو ہندی اور انگریزی میں سے ایک زبان چنی ہندوستانی شہری کی حیثیت سے ہندی چھوڑنا نہیں چاہتا اور بین الاقوامی زبان انگریزی بھی ایک پسند شہری کی حیثیت سے اس کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی طرح نہ وہ اپنی مادری زبان کو چھوڑ سکتا اور نہ اپنے علاقہ کی زبان تیلگو سے کم توجہی برتنا چاہتا ہے۔ نتیجتاً اُسے چار زبانیں پڑھنی ہیں۔ اُردو مادری زبان والوں کے لئے یا ایسے طلباء کے لئے جن کی مادری زبان کوئی غیر علاقائی ہے اور وہ اُردو پڑھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے حکومتی فارمولا کی پہلی شق میں یہ ترمیم لازمی

۱۔ مادری زبان اردو جماعت اول سے دہم تک بطور ذریعہ تعلیم
اور علاقائی زبان تیلگو جماعت چہارم سے دہم تک بطور زبان اول
یا　علاقائی زبان تیلگو جماعت اول سے دہم تک بطور ذریعہ تعلیم
اور مادری زبان اُردو جماعت چہارم سے دہم تک بطور زبان اول

دوسری دو شقیں یعنی انگریزی ششم سے دہم تک اور ہندی ہفتم سے دہم تک بدستور قائم رہیں اس طرح اُردو والوں کو اول سے سوم تک صرف ایک زبان اُردو یا تیلگو۔ جماعت چہارم و پنجم میں دو زبانیں اُردو اور تیلگو۔ ششم اور ہفتم میں تین زبانیں اور ہشتم سے دہم تک چار پڑھنی سہ لسانی فارمولا کی تینوں زبانوں کے ساتھ اپنی مادری زبان کی تعلیم کے لئے انھیں یہ محنت برداشت کرنی ہوگی تبھی وہ اپنی ہندوستانی قوم کے ساتھ شانہ بہ شانہ چل کر قومی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکیں گے۔

ضروری گذارش　سالانہ زرِ اشتراک کی عدم وصولی کے باوجود "شاداب" آپ کے نام جاری ہے۔ فوراً بقایا زرِ سالانہ روانہ کرکے شاداب نوازی کا عملی ثبوت دیجئے۔ بصورتِ دیگر مطلع فرمائیے کہ آپ کے نام "شاداب" بھجوانا بند کر دیا جائے تاکہ مزید نقصان نہ ہو۔

قاضی جلیل احمد

سیاسی و مدنی حیاتِ طیبہ

(قاضی جلیل احمد اخبار "سیاست" میں مکتوب لندن کے کالم نگار ہیں اور اس حیثیت سے ان کی دلچسپیاں سیاسیات اور مدنیات سے وابستہ ہیں۔ اور اسی وجہ سے موصوف نے حضور اکرم صلعم کی سیاسی اور مدنی حیاتِ طیبہ کو اپنے اس مختصر مضمون کا موضوع قرار دیا ہے۔ یہ مضمون ینگ رائٹرس اسوسی ایشن کے ایک جلسہ میں اُردو گھر میں پڑھا گیا۔)

مدینہ طیبہ کو ہجرت کرنے کے بعد حضورؐ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے لیکن اس سے قبل بھی یعنی بعثتِ نبوی سے پہلے اور اس کے بعد مکہ کی زندگی میں آپ کے سیاسی تدبر کی عملی مثالیں ہماری نظروں کے سامنے آتی رہتی ہیں۔ جن میں سب سے مشہور تنصیب حجر اسود کا واقعہ ہے۔ اعلانِ نبوت سے پانچ سال پہلے جب کسی سبب سے خانہ کعبہ کی دیواریں ڈھ گئیں تو قبائل قریش نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کی تعمیر نو کا آغاز کیا۔ لیکن جب حجر اسود کو اپنی جگہ نصب کرنے کا مسئلہ درپیش آیا تو اُن میں سے ہر قبیلہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر خود اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے شمشیر بکف ہو گیا اور اس طرح مکہ میں ایک نئی خونریزی کی بنیاد پڑنے کا حقیقی اندیشہ پیدا ہو گیا۔ ایسے وقت میں اس گتھی کو سلجھانے کے لئے اہلِ قریش کی نگاہیں آپؐ کی طرف اٹھیں۔ اور انھوں نے آپؐ کو اپنا حکم تسلیم کرتے ہوئے آپؐ کے ہر حکم کی تعمیل کا اقرار کیا۔ اُس وقت اگر آپؐ چاہتے تو یہ اعزاز خود اپنے یا کسی اور قبیلے کے لئے مختص فرما سکتے تھے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا اور مجھے یقین ہے کہ اپنے پینتیس سالہ تجربے کے بعد خود اہلِ قریش کو بھی یقین تھا کہ آپؐ جو بھی فیصلہ فرمائیں گے وہ نہ صرف ذاتیات اور خود غرضی سے بالاتر ہوگا بلکہ وہ اس قضیہ نامرضیہ کے باصواب تصفیہ کا بہترین راستہ ہوگا۔ اور چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور آپؐ نے اس کی جو تدبیر کی اس کی وجہ سے قریش کا ہر قبیلہ تنصیب حجر اسود کے

اس اعزاز و اکرام میں برابر کا شریک بن گیا۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضورؐ کی زندگی کا سیاسی رنگ پوری طرح سے کھل کر ہجرت کے بعد مدینے ہی میں ظاہر ہوا۔ حضورؐ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ جو اس وقت یثرب کہلاتا تھا۔ قبایل اوس اور خزرج کی آپسی چپقلش اور ان کے درمیان یہودی آبادکاروں کی سازشی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ تھا۔ مدینہ میں تشریف آوری کے بعد حضورؐ کو جن فوری مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان میں سب سے اہم مسئلہ مہاجرین مکہ کی بازآبادکاری قبایل اوس اور خزرج کو یہودی سازشوں سے بچا کر دین کے راستے پر مستحکم کرنا، اور خود مدینہ میں ایسی فضا پیدا کرنا تھا کہ اپنے حلیف قبایل اوس اور خزرج کو حلقہ بگوش اسلام دیکھ کر یہودی لوگ قریش مکہ اور دیگر مخالفینِ اسلام سے ہاتھ ملانے کی سعی اور سازشیں نہ کرنے لگیں۔ چنانچہ مہاجرین کی بازآبادکاری کا مسئلہ آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات اور بھائی چارگی کا رشتہ پیدا کر کے حل فرما دیا۔ اور نہ صرف قبایل اوس اور خزرج کو قبایلی دشمنی اور عداوت سے دلائی بلکہ انھیں یہودی ریشہ دوانیوں کے شر سے محفوظ رکھنے میں بھی پوری پوری کامیابی حاصل فرمائی۔ نیز اس ادعا کی تائید اوایل ہجرت کے زمانے میں پیش آنے والے اس واقعہ سے ہو سکتی ہے۔ ایک بار ایک یہودی شش بن قیس نے دیکھا کہ اوس اور خزرج کے بعض لوگ ایک مقام پر بیٹھے طعن و تشنیع اور لاف و گزاف کے بجائے آپس میں لطف و محبت کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ ان قبایل کے درمیان یہ نئی دوستی اور مودت مستقبل میں یہودی قوم کے لئے خطرہ کا سبب نہ بن جائے۔ اس لئے اس نے اُن دو قبایل کے درمیان منافرت اور دشمنی کی قدیم آگ کو دہکانے کے لئے ایک اور یہودی نوجوان کو اشارہ کیا کہ وہ کسی تقریب سے محفل میں ایسے اشعار پڑھنا شروع کر دے جو ان قبایل کے شاعروں نے دورِ جاہلیت میں ایک دوسرے کے خلاف کہے تھے اور اپنے اپنے قبیلوں کی بڑائیاں کی تھیں۔ اس یہودی کی یہ کاوش بے نتیجہ نہیں رہی اور باوجود قبول اسلام کے اوس اور خزرج کے نوجوانوں کے ماتھے شکن آلودہ اور ہاتھ تلواروں کے قبضوں تک پہنچنے لگے تھے کہ رسول اللہ صلعم تشریف لے آئے اور اپنے ارشادات سے ان کے ایمان کی چنگاری کو فروزاں اور ان کے جذبہ دینی کو بیدار کر کے اس فتنہ کا سر کچل دیا۔

حضور اکرمؐ نے مدینہ میں قیام امن کی ہر ممکن کوشش فرمائی۔ یہودیوں کو اس بات کی مکمل طمانیت دی کہ ان کے کاروبار میں کوئی خلل اور کوئی رخنہ نہیں ڈالا جائے گا اور ان کی

سلامتی پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی ۔ لیکن یہودی کسی طرح ان کوششوں سے مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے دشمنانِ اسلام کے ساتھ اندرونی سازباز کا سلسلہ کبھی ترک نہیں کیا ۔ لیکن فی الحال یہودیوں سے زیادہ خطرہ مسلمانوں کو روسائے مکہ سے تھا جو مدینے کی سرزمین کو بھی مسلمانوں پر تنگ کرنے کے خواہاں تھے ۔ ان روسائے مکہ کے تعلقات نہ صرف مدینے کے یہودیوں سے تھے بلکہ مدینہ کے شمال میں اُن بدوی قبیلوں سے بھی تھے جن کی سرحدوں سے ہو کر مکہ کے تجارتی قافلے گزرا کرتے تھے ۔ ان بدوی قبایل اور یہودیوں سے مسلمانوں کو ابتدائے عہدِ ہجرت میں ہمیشہ یہ اندیشہ لاحق رہا کرتا تھا کہ اہلِ مکہ سے سازباز کر کے کسی وقت مدینہ پر چڑھائی نہ کر دیں ۔ لہٰذا اس علاقے میں امن و امان کے استحکام کے لئے یہ ضروری تھا کہ مسلمان پولس من آف ریجن کے فرائض بھی انجام دینے کیلئے تیار ہو جائیں ۔ یہی بنیاد ہے اُن سرایا کی جو جنگِ بدر سے پہلے پیش آئے اور جس میں حضور اکرمؐ نے مسلمانوں کی عسکری طاقت اور جنگی صلاحیت کا مظاہرہ کر کے پیش آنے والے خطرات کا سدِباب کرنے کی کوشش کی ۔ چنانچہ سوائے ایک کے باقی متعدد سرایا کی روانگی کے باوجود کہیں قتل اور خون ریزی نہیں ہوئی ۔ یہی نہیں بلکہ سریہ عبداللہ بن جحش میں عبداللہ کے ساتھیوں نے حضورؐ کے احکام کو پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے جب کفارِ قریش کے ایک چھوٹے سے قافلہ پر حملہ کر کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور دو کو قیدی بنا کر مالِ غنیمت سمیت مدینہ پہنچے تو حضورؐ نے ان کے اس عمل پر اپنی سخت ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ میں نے تم سے شہرِ حرام میں جنگ کرنے کے لئے تو نہیں کہا تھا ۔ ان کے لائے ہوئے مالِ غنیمت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان سرایا کا مقصد تحفظ امن و سلامتی کے لئے طاقت کا اظہار کرنا تھا ۔ لوٹ مار اور غارت گری نہ تھا ۔ ان سرایا کا دوسرا مقصد کفارِ مکہ کو مسلمانوں کی دشمنی سے باز رکھنا اور یہ بات ان کے ذہن نشین کرانا تھا کہ اگر وہ مسلمانوں کی دشمنی سے باز نہ آئے تو مسلمان ان کی تجارتی شہ رگ کو کاٹ کر انھیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں آ گئے ہیں ۔ لہٰذا ان کے لئے بہتری اسی میں ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی سے باز آ جائیں اور امن اور دوستی کے معاہدات کے ذریعہ خود بھی اپنے کاروبار امن و سلامتی کی فضا میں انجام دیں اور مسلمانوں کو بھی پھلنے اور پھولنے اور ترقی کرنے کا موقعہ دیں ۔ لیکن کفارِ قریش میں بعض سردار جن کا سرغنہ ابوجہل تھا کسی طور مسلمانوں سے ہاتھ ملانے کے لئے تیار نہیں تھے ۔ ان سردارانِ قریش کی اسی اسلام دشمنی کا نتیجہ جنگِ بدر کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ بعض لوگ جنگِ بدر کو ان سرایا کا راست نتیجہ قرار دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ابوجہل نے مکہ کے تجارتی

قافلے کے خطرے میں ہونے کی گھنٹی بجا کر قریش کو مسلمانوں سے جنگ پر آمادہ کیا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ تجارتی قافلہ جس کی حفاظت کے لئے اتنی بڑی فوجی طاقت اکٹھا کی گئی تھی بہ صحیح سلامت خطرے کے زون سے نکل آیا ہے۔ اس نے مدینہ پر اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور چاہا کہ ONCE AND FOR ALL مسلمانوں کی چھوٹی سی جمعیت کا خاتمہ کر دے۔ اس جنگ کے جو نتائج برآمد ہوئے اس سے تاریخ اسلام کا ہر طالب علم واقف ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ جنگ بھی بعد میں ہونے والی اور جنگوں کی طرح مسلمانوں پر مسلط کی گئی تھی اور جن کے لئے لڑائی کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

برادرانِ ملت! یہاں اتنا وقت نہیں کہ عہدِ رسالت کے اُن سالوں کا تجزیہ کروں جو مدینہ میں گذرے اور یہ بتاؤں کہ رحمت اللعالمین کا ہر قدم جب بھی اٹھتا امن اور صلح کے لئے ہی اٹھتا تھا۔ گو بار بار مخالفین کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے نوبت اکثر جنگ و جدل تک پہنچ جاتی تھی۔ اس لئے صرف صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کا ذکر کر کے اس بیان کو ختم کر دوں گا۔

صلح حدیبیہ کسی جنگ کے نتیجے میں معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ اس کا مقصد مسلمانوں کے حج اور عمرہ کے لئے طواف کعبہ کے حق کو تسلیم کروانا تھا۔ حضور اکرمؐ کی ہجرت تک سارے اہل عرب بشمول ان لوگوں کے جو ابھی وقت تک مسلمان ہو چکے تھے۔ حج اور عمرہ کے فرائض انجام دینے کے مجاز تھے اور محض اس وجہ سے کہ کوئی شخص مسلمان ہے اُسے طوافِ کعبہ سے روکا نہیں جاتا تھا۔ لیکن ہجرت کے بعد یہ صورتِ حال تبدیل ہو گئی۔ اب کوئی مسلمان حج اور عمرہ کے لئے مکہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یوں کئی سال گذر گئے تو حضورؐ نے چاہا کہ مسلمانوں کے اس حق کو کفار مکہ سے تسلیم کروائیں۔ اس لئے آپؐ نے چودہ سو ساتھیوں کے ساتھ عمرہ کے لئے مکہ کا سفر اختیار کیا۔ اور کفار مکہ کو اس امر کا اطمینان دلانے کے لئے کہ مسلمانوں کی آمد کا مقصد لڑائی بھڑائی نہیں بلکہ صرف عمرہ کر کے واپس لوٹنا ہے حضرت عثمان غنیؓ کو اپنا سفیر بنا کر مکہ روانہ کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی یہ سفارت بہت کامیاب رہی۔ اور رؤسائے قریش مسلمانوں کے ساتھ مصالحت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی طرف سے سہیل بن عمرو کو مصالحت کیلئے روانہ کیا۔ سہیل بن عمرو کا رویہ تحریر دستاویز صلح کے سارے عرصہ میں ایک ایسے فریق کا سا تھا جسے صلح سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور جو ہر ممکن اعتراض کو اٹھا کر اس عہدنامہ کی تحریر سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ تحریر دستاویز کے وقت اس نے قدم قدم پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی مثلاً اس نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر اعتراض کیا اور کہا کہ باسمک اللھم لکھو۔ جب آپؐ کے

کے ساتھ رسول اللہ لکھا جانے لگا تو اس نے اعتراض کیا کہ نہیں محمد بن عبداللہ لکھو۔
مان چاہتے تھے کہ معاہدہ کی رو سے اسی وقت انہیں عمرہ کا حق مل جائے۔ لیکن سہیل کسی
رت اس کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اور کہا کہ اب آئندہ سال آکر عمرہ ادا کریں۔ حضورؐ نے
ح شر کے لئے سہیل کی ان ساری حجتوں کو تسلیم کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے یہ نامنصفانہ
بھی منظور کر لی کہ اگر قریش سے کوئی شخص اپنے ولی اور سرپرست کی اجازت کے
محمد صلعم کے پاس آنکلا تو حضورؐ اُسے مکہ کو واپس فرما دیں گے۔ لیکن اگر محمدؐ کے ساتھیوں
سے کوئی شخص قریش کے پاس آنکلا تو اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس آخری شرط نے
مسلمانوں کو گہرا صدمہ پہنچایا۔ لیکن بہت جلد اس آیت کے نزول نے مسلمانوں کا رنج دور
یا اور ہادیٔ برحق پر ان کا ایمان دوبالا ہو گیا۔ وہ آیت یہ تھی:
" انا فتحنا لك فتحا مبینا۔ " وہ لوگ جو اس کو ذلت آمیز صلح قرار دے رہے
انہیں پتہ چل گیا کہ خدا کے نزدیک یہ مسلمانوں کی صریح اور صاف فتح تھی۔ اس صلح نے
انوں پر سارے جزیرۃ العرب کے دروازے کھول دئے۔ غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان
نفرت اور عداوت کی دیواریں ڈھ گئیں تو قبائل عرب جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے
اور دو سال کے اندر اندر فتح مکہ کے وقت مدینہ سے مکہ کی طرف خروج کرنے والوں کی
داد چودہ سو سے بڑھ کر دس ہزار تک پہنچ گئی اور مسلمانوں کے بجائے اب کفارِ مکہ
نوں سے قیام دوستی کے لئے پریشان ہونے لگے۔

فتح مکہ کے وقت تک مسلمانوں کی طاقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ اب انہیں کفارِ مکہ کا کوئی ڈر
خوف باقی نہیں رہا تھا۔ اور حضورؐ چاہتے تو گذشتہ بیس برس کی زیادتیوں کا کافروں سے
رواتی بدلہ چکا سکتے تھے۔ لیکن شروع سے آخر تک حضورؐ کی حکمت عملی امن اور صلح پر ہی مبنی
۔ بے شک اس دوران میں کئی خون ریز لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن وہ سب دفاعی جنگوں کی
یف میں آتی ہیں، جن کا مقصد اپنا بچاؤ کرنا تھا۔ لوٹ مار اور غارت گری نہ تھا۔ چنانچہ
مکہ کے دن جس انداز میں امن عام کی منادی کرائی گئی وہ تاریخ عالم میں ایک انوکھا
قعہ ہے۔ وہی شہر مکہ جس کے در و دیوار مسلمانوں پر تنگ کر دیے گئے تھے اور جہاں
لوگ ہر چیز پیچھے چھوڑ صرف اپنی جانوں کو لے کر نکلنے پر مجبور کئے گئے تھے، جب وہی
ب اسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے تو منادی کرنے والے نے ندا دی کہ جو شخص ابوسفیان
گھر میں داخل ہوگا اُسے امان ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو شخص اپنے گھر کی زنجیر چڑھا کر

اپنے گھر میں بیٹھے رہے گا اُسے بھی امان ہے ۔ اور جب سعد بن عبادہ کی زبان سے جو انصار کے فوجی دستے کے امیر تھے، فرطِ مسرت میں یہ کلمات نکلے کہ آج گھمسان کا دن ہے، آج اللہ نے قریش کو ذلیل کیا۔ تو حضورؐ نے ان کے اس رجز کو ناپسند فرمایا اور کہا آج رحم اور معافی کا دن ہے۔ آج اللہ تعالیٰ قریش کو عزت عطا فرمائے گا اور کعبہ کی عظمت بڑھائے گا۔

وحشت و بربریت، ظلم و جور اور جبر و استبداد کے مقابلے میں عدل و انصاف، نرمی اور ہمدردی، صلح اور آشتی یہی وہ رویہ تھا جس نے سارے جزیرہ نمائے عرب کو حلقہ بگوش اسلام کر دیا تھا ۔ اور جس سے متاثر ہو کر اہلِ ایمان آج بھی پکار اُٹھتے ہیں کہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

....سلسلہ صفحہ ۲۴ سے

ان کی نظمیں پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان سے انھیں بے پناہ محبت اور عقیدت تھی ۔ اقبالؔ کی نظم " ترانۂ ہندی " کو قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے ۔ قومی اجتماعات میں اسی حیثیت سے گایا جاتا ہے ۔ یہ نظم دراصل اقبالؔ کے جذبہ حب الوطنی کی معراج ہے ۔

اقبالؔ کے پہلے دور کی شاعری میں حب الوطنی کے ساتھ قدرتی مناظر کی عمدہ مثالیں اور تصویریں بھی ملتی ہیں ۔ جیسے پہاڑ اور گلہری، بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب، اور 'پرندے کی فریاد' وغیرہ ۔ بعض نظموں میں فکری لہجہ بھی ملتا ہے ۔ جیسے شمع پروانہ، عشق اور موت وغیرہ ۔ الغرض اقبالؔ کے نزدیک باہمی مفاہمت، اجتماعی بیداری، ملکی شعور اور رواداری ہی وطنیت اور حب الوطنی کا مظہر ہے ۔

علیم جہانگیر

کاغذی حکم اور دورِ حاضر

حکم کا عالم بالا سے تعلق جوڑنے پر وہ آدم سے بھی قدیم واقع ہوگا۔ عالم ماورا میں حکم ربانی ادلین نزول سے ہم اسے کاتب تقدیر مانتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کبھی گوناگوں مصلحتوں کے تحت رجہ کسی اشرف المخلوقات کو بھی دے دیا جاتا ہے۔ آپ کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوگی کہ سول نافرمانی ابتداء تو قدرت کے کارخانے میں بہت پہلے ہو چکی تھی خالق باری نے آدم کی تخلیق کے بعد تمام فرشتوں یہ حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ فرماں بردار فرشتوں نے جب سجدے سے سر اٹھایا تو اپنے ہی ادری کے ایک فرشتہ کو لعنت خداوندی میں پایا۔ آسمانوں پر بغاوت کا یہ پہلا مرحلہ تھا۔ بغاوت پرچم بردار وہ فرشتہ تھا جس نے عبادت کے زعم میں یہ کہا " میں اچھا ہوں "۔

عالم الغیب نے فلک ہفتم پر مزید حکم عدولی کے تحت آدم کو شجرِ ممنوعہ سے دور رہنے کی سخت لید فرمائی۔ لیکن آسمانوں پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ آدم طاغوتی سازشوں میں پھنس گئے۔ حوا بہکاوے میں آکر آدم نے حکم خداوندی کو یکسر فراموش کر دیا۔ ابلیس ملعون کی آسمانوں پر یہ پہلی میابی تھی۔ بہت ممکن ہے اس نے فتح کا جشن بھی منایا ہوگا۔ رب العزت نے آسمانوں پر بغاوت اس دوسرے مرحلے پر آدم اور حوا کو عتابِ الہٰی اور شیطان مردود کو لعنت کا طوق پہنا کر اس رکتی قافلے کو زمین کی بے کراں وسعتوں میں پھینک دیا۔

اس دنیائے بسیط میں حضرت آدمؑ اپنی غلطی پر سخت نادم ہوئے۔ شیطان اپنی غلطی پر اڑا رہا۔ نیائے آب و گل پہلی بار توبہ سے آشنا ہوئی۔ وہ توبہ آدم کی تھی۔ خدا کی رحمت جوش پر غالب ئی۔ مسبب الاسباب کے حکم کی بوچھاریں آدم اور بعد آدم فلاح و بہبود اور کامرانی کا سبب ں۔ الہامی حکم ذرائع ابلاغ اور اظہار ترسیل و تفہیم سے اس روئے زمین پر پھیلتے اور پھولتے رہے۔ لیفہ اول کے عہد میں منتشر آسمانی حکم کو اس ڈھرے سے کتابی حکم دے دیا گیا کہ جن مدبرانِ اسلام کے

آسرا۔ 88-1-2 قاضی واڑہ، اورنگ آباد 431001

قلب نورِ ایمانی سے منور تھے۔ کہیں ان کے ساتھ ہی یہ دنیا احکام الٰہی سے خالی نہ ہوجائے۔ خلیفہ اوّل کا یہ ایک عدیم المثال، غیرفانی اور مثبت قدم تھا جو دور رس نتائج کا حامل ہے۔

اس کل یگ میں انسان نے قدرت کے سربستہ رازوں کی وضاحت میں دیدہ و دانستہ اپنے اشرف ہونے اور عبادت کے زعم میں یہ کہنے لگا ہے "میں سب سے اچھا ہوں"۔ نئے مذہبوں کے اس نئے رجحان سے مذہب میں سہل انگاری کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ جس کی بنیاد مذہبی امور کی توضیح و تشریح میں مبالغہ آرائی اور خود نمائی پر رکھی گئی ہے۔ اس غیراسلامی رویہ سے ایک طرف عبادت کا خاص وصف انسانی برادری اور دلی یکسوئی ختم ہوگئی ہے۔ تو دوسری طرف مادیت کے رغبت میں خدا کا خوف اور ڈر دلوں سے غائب ہوگیا ہے۔ نتیجے میں انسانی اعصاب پر خوفناک ہتھیاروں اور خطرناک کیمیاوی اسلحہ کا ڈر اور خوف چھاگیا ہے۔ دراصل یہ مذہبی حقائق کی لاعلمی کا سبب ہے۔ ورنہ ہر کوئی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ طوفانِ نوح میں دنیا ڈوب گئی تھی۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس طوفان سے عوج بن عنق بچ نکلا تھا۔ جو نہ صرف حضرت موسیٰؑ کے عہد تک زندہ رہا بلکہ وہ بڑے فخر سے کہتا تھا" طوفانِ نوح میری کمر تک آیا تھا"۔

اگرچہ پہلے کی بہ نسبت اب عبادات اور علم کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن معیار وہ نہیں رہا جو ہمارے اسلاف کا تھا۔ پہلے مذہبی نقطہ عام الحال پر حاوی تھا۔ جب کسی مسئلے میں نظیر اور مثال کی ضرورت درپیش ہوتی تو قرآن اور احادیث کی روشنی میں اس کا حل ڈھونڈ لیا جاتا۔ جس سے اسلامی نظریات کی مکمل عکاسی ہوتی۔ ان کی عبادت میں خشوع و خضوع کی جھلک نظر آتی تھی۔ تسبیح و تہلیل، ذکرِ الٰہی، گریہ و بکا، محبت رسولؐ، استغفار اور خاکساری ان کے اوصاف حسنہ بن گئے تھے۔ گو کہ آج ایسی عبادت عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن وہ ریاکاری اور دنیاداری کے مقابلے میں راست کرداری، راست گفتاری اور صدق نیت سے خدا کی عبادت میں خدا کا جلوہ پاتے۔

اگلے وقتوں میں عبادت روح کی پاکیزگی کے لئے ہوتی تھی۔ اب کچھ لوگ مادی طور پر عبادت کو ایک سودا سمجھتے ہیں۔ وہ ہر وقت نفع اور گھاٹے کا حساب لگانے میں یہ بھول گئے ہیں کہ ایسی عبادت بندے کو خدا سے دور رکھتی ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ جنت اور دوزخ کو محض اسی لئے تہس نہس کرنے چلی تھیں کہ لوگ دوزخ سے ڈر کر یا جنت کی لالچ میں عبادت نہ کریں۔ اس دور میں مادی اعتبار سے ہر طرح، ہر طرف اور ہر لحاظ سے مالامال عبادتیں انسانی شیرازہ بندی میں حضرت غوث الاعظم دستگیرؒ کی گیارہ مجالس کی متقاضی نہ بن سکیں۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ عبادات میں عمل صالحہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس معروف ترین

یا ایمان کی پختگی میں علم حدیث، سرورِ کائناتؐ کی حیاتِ طیبہ میں اقوال و اعمال،
ت و ارشادات، قرآنِ حکیم کے رموز و نکات اور معنوی محاسن سے بے بہرہ اور کیفیات
سب کا رشتہ جوڑنے پر مذہب سے جذباتی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے ۔ اس دور میں ہمارے
ن شان و شوکت بڑھنے سے بے عملی اور مادیت کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے ۔
م کا آفاقی ضابطۂ حیات دنیا کی رہنمائی سے محروم ہو گیا ہے ۔ مذہب شخصی لوازمہ
ہ ہے ۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے مادی رسہ کشی، مغربی علوم کا زور اور سائنس کی نئی نئی
ع کے ہجوم میں دینی علوم کی عدم واقفیت سے " ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار " ماند پڑ گئی ہے
ں کی نئی نئی ایجادات اور مسلسل کامیابیوں میں ٹسٹ ٹیوب بے بی، چندا ماما کی تسخیر اور دل کی
شامل ہیں ۔ درحقیقت بیسویں صدی کی سائنسی ایجادات سے چودہ سو سالہ پرانے مذہبی دعووں
صدیق ہو رہی ہے ۔ سائنس کے نئے نئے انکشافات و تحقیقات کثرت میں وحدت کی برتری ۔ ابدی
برتری کے ٹھوس ثبوت مہیا کر رہی ہیں ۔ بلکہ قادر المطلق کے سامنے بے بسی اور بے چارگی کا اظہار
رہی ہیں ۔ قرآنِ حکیم کو محض ثواب اور ایصالِ ثواب کی مقدس کتاب سمجھنے میں قرآنِ کریم کے
و نکات اور محاسن ابھر سکے ۔ قرآن حکیم میں متعدد آیاتِ ربانی میں کائنات کی حقیقت
ف اشارہ کرتے ہوئے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے ۔

آئیے قرآنِ حکیم اور حیاتِ طیبہ کی روشنی میں مندرجہ بالا سائنسی انکشافات کا جائزہ لیتے ہوئے
مقام مقرر کریں ۔ کہنے کو سائنس دانوں نے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کو جنم دیا ہے لیکن کتنے افسوس کی
ہے کہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا خالق اپنی مخلوق کو جنت کا درجہ نہ دے سکا ۔ خالقِ ارض و سماں نے حضرت
ؑ کو ابن مریم سے مخاطب فرمایا ہے ۔ ساتویں دہائی میں امریکہ کا اپولو گیارہ زمین سے اڑان بھرتے
فاصلے تک عمودی سمت اور افقی سمت میں سفر کرتا ہوا چاند تک پہنچا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ
انام کی معراج میں اختیار کردہ سمت میں صدیوں بعد بھی ذرہ برابر فرق نہیں پڑا ۔ سائنس دانوں
چاند کو دو حصوں میں بٹا ہوا کہنے سے شق القمر کی تصدیق ہوتی ہے ۔

دل کی تبدیلی شرحِ صدر کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۔ ہادیِ اسلام کے لڑکپن میں فرشتوں نے آپؐ کے
سینہ مبارک کو چاک کرنے کے بعد تطہیرِ قلب کرکے آپؐ کے سینہ کے اندر رکھ دیا تھا ۔ جسے شرح صدر
ہیں ۔ آج کے ڈاکٹری کمالات میں دل کی تبدیلی کے بعد ڈاکٹر مریض کو مہینوں آرام کی سخت تاکید
ہتے [illegible] علیہ السلام شرحِ صدر کے فوری بعد مکان تشریف لے گئے ۔

اس کا کیا کریں ہمارے کند ذہن سلف دنیاوی رنگینیوں، ظاہری طمطراق، جذباتیت، مادیت، شخصیت پرستی اور مذہبی قصے کہانیوں میں ایسے الجھ گئے ہیں کہ انہیں نہ تو اپنے اعمال و افعال پر کامل بھروسہ ہے اور نہ اپنے کسی قول و فعل کے تضاد کو محسوس کر سکتے ہیں۔ کاش وہ علم کی حقیقت کو دل کی گہرائیوں تک اترنے دیں تو علم ان کا ہمدرد اور رفیق بن سکتا ہے۔

دنیاوی مذاہب میں اسلام کو یہ فضیلت اور اہمیت حاصل ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کو فطری دین کہا گیا ہے۔ فرق صرف اس کے پرکھنے اور برتنے کا رہے گا۔ وحی کے طریقۂ کار کو مولانا روم کی زبانی سنئے۔ ؎

مصطفیٰ ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے جبرئیل جبرئیلش ہم نہ گفتے تا نہ گفتے کردگار

ظاہر ہے جس مذہب کو خدا کی قبولیت کی سند حاصل ہو وہ مذہب دعوئ الٰہی کے مطابق [illegible] ہے۔ ایسے مذہب کی تبلیغ و ترویج میں ہمارے ظاہر پرست اسلاف عملاً اور اعتقاداً صوفیائے کرام کی تعلیمات کی پیروی کریں اور اسی طرح مذہب کو آگے بڑھائیں جس طرح انہوں نے سینہ بہ سینہ آگے بڑھایا۔ آج بھی ان کے اعمال، وظائف، ارشادات اور فرمودات نہ صرف روز اول کی طرح روشن ہیں بلکہ وقت کے سینے پر نقش ہیں۔ اس عہد کو ایسی ہی تعلیمات کی سخت ضرورت ہے۔

فلسفۂ توحید کو افہام و تفہیم، محبت اور رواداری کی راہ سے پیش کریں۔ جو ذہنی، فکری اور روحانی اتحاد کا پیش خیمہ ہو۔ جس کی بنیاد حسب نسب اور دولت کی افراط پر نہ ہو۔ انسانوں کی تفریق و تفریط، بھید بھاؤ اور اونچ نیچ نہ ہو۔ بزرگی اور سرداری میں پرہیزگاری، نیکی اور تقویٰ کو جگہ دیں۔ اعمال صالحہ، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی تبلیغ و ترویج میں خود نمائی کے بجائے سوجھ بوجھ، ایثار و محبت، عدل و مساوات، صداقت و امانت، عزم و صبر، خود اعتمادی، حوصلہ مندی، غیرت و خودداری میں خدا کا ڈر اور خوف پیدا کریں تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ارشاد گرامی کے مطابق

"جو شخص خدا سے ڈرتا ہے دنیا اس سے ڈرتی ہے۔ جو شخص خدا کا خوف کھاتا ہے دنیا کی ہر چیز اس سے خوف کھاتی ہے"۔

ورنہ بظاہر حق پر اور ایمان کی باتیں باطن میں ایمان پر اور حق کی نہ ہونے سے کار فضول گردانی جائیں گی۔ لازم ہے کہ ہم اپنی تمام قوتوں کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیں اور اس دین فطرت کو دنیا کے سامنے پھر سے پیش کریں کہ اسی میں انسانیت کے لئے کامیابی اور کامرانی ہے۔

عابد القادر

ماہر اساتذہ کے چند گُر

تعلیم خود بخود حاصل نہیں ہوتی۔ حاصل کی جاتی ہے۔ اچھی تعلیم کے حصول کے لئے طالبعلم استاد اور سرپرست (ماں باپ) کے تکون کا بھرپور اشتراک و عمل ضروری ہے۔ اس تکون کو ششش ماں باپ کیا حصہ ادا کر سکتے ہیں اور اپنے بچے کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ اس بارے ذیل میں ماہر اساتذہ کی چند ہدایتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سرپرست کا پہلا فرض یہ ہے کہ انجمن سرپرست و اساتذہ کے ہر جلسے میں شریک ہو۔ بچے کے استاد سے ملے گفتگو کرے۔ استاد کی اجازت سے جماعت میں شریک ہو اور عملی پڑھائی کا مشاہدہ کرے۔ یہ دیکھے کیا پڑھایا جارہا ہے۔ کونسی کتاب زیر استعمال ہیں۔ کتنا ہوم ورک دیا جارہا ہے اور طالب علم سے کس ردعمل کی توقع ہے تاکہ اپنے بچے کے تعلیمی مسائل سے واقف ہو سکے۔

اپنے بچے کو روز آنہ اسکول بھیجئے۔ ایسے سرپرست جو اپنے بچوں کو اسکول کے اوقات میں دوسرے کاموں میں مصروف کر دیتے ہیں یا کسی تفریحی پروگرام میں بھجوا دیتے ہیں استاد کے لئے بڑے مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک طرف بچے کی اسکولی تعلیم کا نقصان ہوتا ہے اور ساتھ ہی بچے کو اپنے سرپرست کے اس خیال کا احساس ہوتا ہے کہ اسکول اور تعلیم اتنی اہم نہیں ہے یہ تاثر بچے کی تعلیمی ترقی کے لئے نہایت نقصان دہ ہے۔

اپنے بچے کے ساتھ مثبت طرز عمل اختیار کیجئے۔ اس تلاش میں رہئے کہ بچے نے کوئی اچھا کام کیا ہے اور فوری اس عمل کی تعریف کیجئے۔ چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کام کیوں نہ ہو۔ اس اعتراف اور تعریف سے بچے کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے کہ اس نے اچھا کام کیا ہے اور اس کے سرپرست نے اسے محسوس کر کے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس سے بچے میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے

پر آگے پڑھنے اور کام کرنے کا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر بچے سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہے یا کوئی غلطی ہوئی ہے تو اسے اس پر شرمندہ کیجئے اور نہ اس کی تضحیک کیجئے بلکہ صحیح عمل کی نشاندہی کر کے اس کی ہمت افزائی کیجئے اس کی بہتر کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اصلاحِ عمل کی طرف مائل کیجئے۔

بچے کے کام میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیجئے۔ اس سے پوچھئے کہ اسکول میں آج کیا کام ہوا بچہ "کچھ نہیں" کہے تب بھی اس سے اسکول کے ایسے کام کے بارے میں سوال کیجئے جو پ کے علم کے مطابق اسکول میں ہوا ہو۔ ممکن ہے آپ کو مناسب جواب نہ ملے۔ مگر اس سے بچے کو یہ تو احساس ہو ہی جاتا ہے کہ سرپرست کو اس کے اسکول میں دلچسپی ہے۔ اس سے بچہ بھی اسکول اور اس کے کام میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔

بچے جس کی عزت کرتے ہیں اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور استفادہ کرتے ہیں اس لئے بچے کے دل میں استاد کی عزت اور مقام پیدا کیجئے۔ بچے کے سامنے استاد تنقیص نہ کیجئے۔ کبھی یہ نہ کہئے کہ استاد "بہت سخت" یا "بڑا بکواسی" ہے یا جو کہتا ہے اس کے بارے میں پورا علم نہیں رکھتا۔ اگر آپ کو یہ کہنا ہی ہے تو براست استاد سے کہئے۔ اگر اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو تو ہیڈ ماسٹر یا پرنسپال سے گفتگو کیجئے۔

امتحان میں حاصل کردہ نمبرات کے مقابلے میں عام تعلیمی ترقی پر اپنی دلچسپی کا زیادہ ظہار کیجئے۔ زیادہ نمبرات کے بارے میں ضرور پوچھئے مگر اس طرح کہ جس طالب علم نے یادہ نمبرات حاصل کئے ہیں کیا وہ زیادہ پڑھائی اور سخت محنت کا نتیجہ ہے یا امتحانی سوالات آسان تھے اور بلا خاص کوشش کے زیادہ نمبرات حاصل ہو گئے ہیں۔ نیز یہ بھی پوچھئے کہ زیادہ نمبرات حاصل کرنے کے لئے اسکول میں استاد اور گھر میں آپ اس کی کیا مدد کرسکتے ہیں؟ علیمی ترقی کو نصب العین بنائیں گے تو بچے کو رغبت ہوگی کہ زیادہ نمبرات حاصل کر کے اپنی علیمی ترقی کا اظہار کرے اور اس طرح وہ زیادہ محنت کرے گا۔

استاد کو ایسی معلومات بہم پہنچائیے جس سے اسے بچے کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ یا آپ کا بچہ اکیلے بہتر کام کرتا ہے یا ٹیم ورک میں اس کی صلاحیت ابھرتی ہے۔ یا گھر کے حالات و کیفیات کا اثر اسکول تک بھی پہنچتا ہے۔ گھر میں بیماری، والدین کا اختلاف یا سرپرست کے کاروبار میں تبدیلی بچے کے اسکول کے کام کو بھی متاثر کرسکتے ہیں۔ استاد کو گھریلو حالات سے واقف رکھئے تاکہ ان کی روشنی میں استاد بچے

مسائل کو نپٹاتے ۔

اگر آپ کے خیال میں کوئی مسئلہ پیدا ہوجائے تو فوری استاد سے ملیے۔ ہوشیار طلباء جب تعلیم میں عدم دلچسپی محسوس کرتے ہیں تو دوسری شکایت کرتے ہیں۔ غبی طلباء جب ہوم ورک نہیں کر پاتے تو جھوٹے بہانے تراشتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں استاد سے مل کر اصلاح حال کی کوشش ضروری ہے ۔

اپنے بچے کی صحیح تعلیمی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے تعلیمی رپورٹ کو غور سے دیکھئے۔ بچوں کے نفسیاتی امتحان اور رجحان کے ٹسٹ سے استفادہ کیجئے۔ استاد سے گفتگو کیجئے اور یہ طے کیجئے کہ آپ کہاں اور کیسے مدد کر سکتے ہیں۔ کیا آپ کے بچے میں کسی خاص صلاحیت کی کمی ہے ؟ کیا خصوصی اتالیق کا انتظام ضروری ہے ؟ کیا کوئی جسمانی نقص جیسے بینائی، سماعت یا اور کوئی معذوری لاحق ہے ؟ ان امور پر توجہ اور نقائص کا سد باب ضروری ہے ۔

اپنے بچے کو گھر کے کام کا عادی بنائیے۔ اپنی صفائی یا اپنے کمرے یا سامان کی صفائی اور سلیقے سے رکھنا، گھر کے چھوٹے موٹے کام میں ہاتھ بٹانا، اساتذہ کا کہنا ہے کہ وہ گھر میں کام کرنے والے بچوں کو فوری پہچان لیتے ہیں۔ ایسے بچے اسکول کا کام بھی بہتر طریقے پر سر انجام دیتے ہیں ۔

بچوں کا مقصد حیات تو بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس راستے میں بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے نشانے مقرر کیجئے ۔ ایسے نشانے جو آسانی سے حاصل کر لئے جا سکیں۔ بڑے مقصد کے مقابلے میں چھوٹا مقصد یا بڑے مقصد کا ایک حصہ آسانی سے پورا کر لیا جا سکتا ہے اور ایسا کرنے پر بچے کو تکمیل مقصد کی خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کچھ حاصل کر لیا ہے۔ کسی کام کی تکمیل کر لی ہے ۔ تکمیل کا یہ سرور دوسرے نشانے کی تکمیل کے لئے مزید قوت فراہم کرتا ہے۔ اس طرح بچہ درجہ بہ درجہ اور قدم بہ قدم کامیابی کا راستہ طے کرتا ہے ۔

مستعدی اور سرگرمی کی تائید کیجئے نہ کہ مجہولیت اور بے عملی کی۔ مثلاً موپیڈ کے مقابلے میں بائیسکل کو ترجیح دیجئے جس میں جسمانی حرکت زیادہ ہے ۔ ٹی۔ وی کے مقابلے میں کتاب پڑھنے کی ہمت افزائی کیجئے جس میں دیکھنے اور سننے کے ساتھ ساتھ زبان سے پڑھائی بھی ہوتی ہے اور دماغ زیادہ مستعدی اور یکسوئی سے

اس کام میں رجوع ہوتا ہے۔ تیار شدہ کھلونوں کے مقابلہ میں ایسے کھلونے جنھیں بچہ خود مختلف پرزے جوڑ کر بناتا اور تیار کرتا ہے۔ اس میں زیادہ ورزش جسمانی و دماغی ہوتی ہے۔ جو بچے کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔

سزا کے مقابلے میں انعام ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ کسی ناکامی پر سزا دیجئے بچہ سوچتا ہے ناکامی پر سزا بھگت لی۔ اس کمی کا بدلہ ہوگیا۔ سزا اسے کمی کو دور کرنے اور نئے سرے سے کوشش کرنے کے لئے نہیں اکساتی۔ برخلاف اس کے کسی کامیابی پر انعام دیجئے۔ بچے کو خوشی ہوتی ہے۔ یہ انعام اسے نئی کامیابی کی طرف گامزن ہونے اکساتا ہے اور وہ بہتر سے بہترین کا سفر اختیار کرلیتا ہے۔ کامیابی اپنا آپ انعام ہے لیکن خصوصی انعام مہمیز کا کام کرتا ہے۔ اگر آپ کھیل کود یا کسی اور مقابلہ میں اپنے بچے کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور اسے سیر و تفریح سے نوازتے ہیں تو تعلیمی امتیاز کے حصول پر آپ ایسا کیوں نہ کریں؟ آپ تعلیمی امتیاز پر اپنے بچے کو انعام دیں گے تو وہ نئے جوش اور ولولے کے ساتھ مزید تعلیمی امتیاز حاصل کرنے پر مائل ہوگا۔

ایسے مواقع کی تلاش میں رہئیے کہ آپ اپنے بچہ کو کچھ سکھا سکیں۔ دوکان میں خریدی کے بعد اسے حساب کرنے کہئیے کہ کتنی رقم ادا کرنی ہے اور کتنے پیسے دوکاندار سے واپس آئیں گے۔ اگر آپ کو کسی سفر پر جانا ہے۔ تو بچے سے کہئیے کہ جغرافی نقشہ یا ریلوے گائیڈ کی مدد سے سفر کا نقشہ بنائے۔ فاصلہ کیا ہوگا۔ کس کس سواری سے جانا ہوگا۔ کتنا وقت لگے گا۔ کتنا پیسہ صرف ہوگا۔ آپ کا یہ عمل بچہ کی تعلیم میں مدد کے مترادف ہوگا۔

بچے اپنے والدین کی زبانی ہدایتوں کا اتنا اثر نہیں لیتے۔ جتنا ان کے عمل کو دیکھ کر اثر قبول کرتے ہیں۔ بچے وہی کرتے ہیں جو ان کے والدین کرتے ہیں۔ والدین کو چاہئیے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے عملی نمونہ بنیں۔ وہ جو کام بھی کریں دلچسپی اور یکسوئی سے کریں، بچے بھی وہی طریقہ اختیار کریں گے اور انھیں کسی زبانی ہدایت کی ضرورت نہ ہوگی صرف عملی نمونہ کافی ہوگا۔

اپنے بچوں کو یکسوئی اور انہماک کی عادت ڈلئیے۔ انہماک حصول مقصد کی کنجی ہے۔ اور یہ ایسی خوبی ہے جسے کوشش اور توجہ کی مدد سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آپ بچے سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فٹ بال یا ٹینس کا کھلاڑی صرف انہماک اور یکسوئی سے کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ وہ گولے پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا ہے اس کے سوا کسی اور طرف توجہ نہیں کرتا تبھی وہ کھیل میں کامیاب ہوتا ہے۔ تعلیم میں تو یہ انہماک وارتکاز اور زیادہ ضروری ہے

جماعت میں بچہ پڑھائی پر اپنی توجہ مرکوز کر دے صرف استاد کی بات کو سننے اور کسی اور طرف کوئی توجہ نہ دے تو تعلیم میں کامیابی یقینی ہے۔

اپنے بچے کو بتائیے کہ وہ پڑھتے وقت مضمون کے بارے میں اپنے آپ سے سوالات بھی کرتا چلے۔ محقق کے کامیاب ہونے کی کیا وجہ ہے؟ کس نے اپنے ملک کے لئے جان کی بازی لگائی اور کیوں؟ قحط کی کیا وجہ تھی؟ اور ان سوالات کے جواب حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے۔ بجلی کی ایجاد کے بارے میں پڑھ رہا ہے تو یہ سوچے کہ بجلی نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس سے مضمون میں دلچسپی بڑھے گی اور وہ بہتر طریقے سے ذہن نشین ہوگا۔

ہوم ورک کے اصول و قواعد مقرر کیجئے۔ یہ اصول لچکدار ہو سکتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ بچہ اصول اور معمول پر عمل کر کے ہی آگے بڑھتا ہے۔ مثلاً آپ یہ اصول بنا سکتے ہیں کہ جب تک ہوم ورک پورا نہ ہو جائے بچہ گھر سے باہر نہ جائے اور کھیل کود میں حصہ نہ لے بچے کے لئے ایسے اصول ناپسندیدہ ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے دوستوں پر ایسی پابندی نہیں ہے۔ وہ شام میں دیر تک باہر کھیل سکتے ہیں یا ٹی۔ وی دیکھ سکتے ہیں یا ہوم ورک کے لئے کم وقت دے سکتے ہیں۔ اس کا یہ جواب کافی ہے کہ آپ ایسے بچوں کے سرپرست نہیں ہیں اس لئے وہ ایسے ناپسندیدہ کام کرنے کے موقف میں ہیں۔

بچے کی پڑھائی کے لئے ایسا گوشہ ضروری ہے جہاں وہ کسی گڑبڑ اور خلل کے بغیر اپنی پڑھائی میں مصروف رہ سکے۔ نہ ٹی۔ وی، اسٹیریو کی آواز ہو نہ ٹیلیفونی دخل در معقولات۔ یہاں روشنی اور ہوا کا مناسب انتظام ہونا چاہیئے اور مقررہ وقت تک بچہ کو اسی جگہ بٹھا کر پڑھائی کی نگرانی کرنا چاہیئے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بچہ ایک ساتھ اپنا ہوم ورک پورا کرے یا درمیانی وقفہ کے ساتھ اپنی پڑھائی کی تکمیل کرے۔

گھر کی پڑھائی میں آپ کی مدد ضروری ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ ہوم ورک بچہ کا ہے آپ کا نہیں اگر بچے کو کسی لفظ کے ہجے معلوم نہیں ہیں تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ خود بچے کو بتا دیں بلکہ مناسب طریقہ یہ ہے کہ اُسے ڈکشنری کی طرف رجوع کرائیں۔ آپ ہوم ورک دیکھ کر بچے کی غلطی کی نشاندہی کریں لیکن صحیح جواب خود نہ بتائیں بلکہ صحیح جواب حاصل کرنے کی طرف بچے کی رہنمائی کریں۔

اگر ہوم ورک میں کچھ ایسا حصہ ہے جسے بچہ سمجھ نہیں پا رہا ہے تو تفصیل سے سمجھانا شروع نہ کیجئے پہلے پوچھئے کہ بچہ اس بارے میں کیا سمجھتا ہے اور کس چیز کو مشکل سمجھ رہا ہے۔ غور سے سنئے کہ بچہ کا مسئلہ کیا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سوال کو دوبارہ اور آہستہ آہستہ پڑھنے سے

وہ بات سمجھ میں آجاتی ہے جو پہلے بچے کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی یا مشکل حصہ کو علاحدہ کرکے اسکے بارے میں مختصر بات کرنے سے مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ اس سے بچے کو خود بخود مسئلہ حل کرنے کی عادت ہوتی ہے اور اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی مشکل کو حل کرکے اس پر قابو پالیا ہے۔

کسی ریسرچ پیپر یا کسی بڑے پراجکٹ پر تیاری مقصود ہو تو بچے کو بتاتے کہ وہ اس کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کرے۔ اگر کوئی رپورٹ تیار کرنی ہے تو مختلف اوقات میں ایک سے زائد حصوں میں تیار کی جاسکتی ہے۔ کسی پراجکٹ کی پیشکش کے پہلے کی شب میں رات بھر تیاری کرنے کی بجائے اس کام کو دو یا تین راتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کام اطمئنان کے ساتھ اور بلا کسی زائد پریشانی و محنت کے بہتر طریقے پر سرانجام پاسکتا ہے۔

وسطانی تعلیم کے مدارج میں والدین کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ ذمہ دار بنانے کی کوشش کریں۔ ہوم ورک کی حد تک روزآنہ مدد کی بجائے صرف ایک نظر ڈال لیں اور یہ دیکھ لیں کہ ہوم ورک کرلیا گیا ہے اور بچہ اپنی تعلیمی ترقی کے سفر پر رواں ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ بچہ خود اپنی ذمہ داری محسوس کرے کہ ہوم ورک کی تکمیل اس کا اپنا کام ہے جسے اسے خود پورا کرنا ہے۔

بچے کے عام مطالعہ کی ہمت افزائی کیجئے۔ اگر وہ ایسا لٹریچر پڑھتا ہے جس سے آپ کے خیال میں نقصان پہنچ سکتا ہے تو پریشان نہ ہوں بلکہ اسے اچھی کتابیں مہیا کیجئے۔ اچھے برے لٹریچر پر بات کیجئے۔ نیز رسائل و اخبارات میں جن مسائل کا ذکر آتا ہے ان پر بھی اس سے بات کیجئے۔ اس سے اس کے مطالعہ کا ذاق بہتر بنے گا اور اسے اچھے مطالعہ کی عادت پڑجائے گی۔

اپنے بچوں کو مستقبل میں جھانکنے اور اسے بہتر بنانے میں مدد دیجئے۔ وہ اپنی زندگی بنانا چاہتے ہیں، کچھ کرنا چاہتے ہیں، اس راستے میں انھیں کچھ مسائل درپیش ہیں۔ اُن کے حل کرنے میں انھیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنا مقصد حیات متعین کرلیا ہے یا کچھ ایسے ہیں جو ابھی ایسا نہیں کرپائے ہیں۔ آپ انھیں اپنا نصب العین متعین کرنے میں یا اگر انھوں نے متعین کرلیا ہے تو اس کے حصول میں مدد دے سکتے ہیں۔ اس طرح والدین اپنے بچوں کی زندگی بنا سکتے ہیں اور انھیں کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کرسکتے ہیں۔

(ماخوذ)

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

مجھے گرنا ہے تو خود اپنے ہی قدموں پہ گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

سید نصرت مہدی

اقبال کی حب الوطنی

سیالکوٹ کے مشہور تاجر شیخ نور محمد کے گھر ۱۸۷۶ء میں اقبال پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں مکمل کی۔ ایف۔ اے اسکاچ کالج سیالکوٹ سے کیا جہاں سید میر حسین جیسے قابل استاد نے انھیں ربی و فارسی کے ذوق سے آشنا کیا۔ بی۔ اے لاہور سے کیا۔ یہاں پروفیسر آرنلڈ جیسے عالم کی صحبت نے اپنا رنگ دکھایا۔ ایم۔ اے تکمیل کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ اور فلسفہ کے پرار مقرر ہوئے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے مددگار پروفیسر مقرر ہوئے۔ نہیں ایام میں انہوں نے "علم الاقتصاد" نامی کتاب لکھی۔ پھر اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لئے کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ اور جرمن یونیورسٹی سے مقالہ "فلسفہ یران" لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند پائی اور لندن سے بیرسٹری کا امتحان بھی کامیاب کیا۔

اقبال طالب علمی کے دوران سیالکوٹ کے مشاعروں کے لئے غزلیں لکھا کرتے تھے۔۔ ان نوں نواب مرزا داغ دہلوی کا شہرہ تھا۔ اقبال نے اُن سے اصلاح لی جس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

نسیم و تشنہ ہی اقبالؔ کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغؔ سخنداں کا

اقبال انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں متواتر اپنی نظمیں سناتے رہے اور رسالہ مخزن کے لئے بھی وہ نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اپریل ۱۹۰۱ء کے پرچہ "مخزن" میں نظم "ہمالہ" شائع ہوئی۔ یہیں سے اقبال کی حب الوطنی اور وطن پروری کا جذبہ ابھر آیا۔ دراصل اقبال نے جب شعور سنبھالا تو ہندوستان بھر میں قومیت اور آزادی کے نعرے گونج رہے تھے۔ تلک اور گوکھلے ہوم رول کا مطالبہ کر رہے تھے تو انڈین نیشنل کانگریس قومیت کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ ایک طرف سرسید کی قیادت میں اُردو شعراء نے ہندو مسلم اتحاد اور با مقصد شاعری پر زور دیا۔ شاعری

ریسرچ اسکالر۔ حیدرآباد یونیورسٹی۔ گولڈن تھریشولڈ۔ حیدرآباد

کے موضوعات حب الوطنی، سماجی بہبود کوشی، جدوجہد و ہمدردی وغیرہ تھے تو دوسری طرف حالی "روح کو تڑپانے" اور "قلب کو گرمانے" کی سعی مسلسل کر رہے تھے۔ محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی نے وطنی جذبے سے بھرپور نظمیں لکھیں جس میں آزادی کی تڑپ تھی شبلی لکھتے ہیں:

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

حالی نے سماجی اصلاح پر زور دیا۔ حب الوطنی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

بیٹھے ہو بے فکر کیا ہو ہم وطنو اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
کتنے بھائی تمہارے ہیں ناداں زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
ملک میں اتفاق سے آزاد شہر میں اتفاق سے آزاد
علم کو کر دو کو بکو ارزاں ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں
کوئی دن میں وہ دور آئے گا بے خبر بھی کب تک نہ پائے گا

تذبذب اور انتشار کے اس دور میں اقبال نے چند نظمیں جیسے ہمالہ، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ وغیرہ لکھ کر اپنی حب الوطنی اور وطن پرستی کا ثبوت دیا جو اپنے وقت و دور کی بہترین ترجمان ہیں۔ نظم "ہمالہ" کا یہ پہلا بند ملاحظہ ہو:

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

حب الوطنی کو اقبال نے نظری اعتبار سے تقویت بخشی۔ "ہمالہ" کو کوہستاں ہے تو، پاسباں اپنا دیوارِ ہندوستاں، وغیرہ کہہ کر اپنی وطنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

درحقیقت اقبال کی شاعری تین ادوار میں منقسم ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء پر محیط ہے جو اقبال کی قومی شاعری کا دور ہے جس میں انہوں نے قومی درد سے لبریز بہت خوب نظمیں لکھی ہیں۔ تصویرِ درد، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت وغیرہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال میں جذبہ حب الوطنی کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اور وہ کس قدر تحریک آزادی ہند سے متاثر تھے قومی نقطۂ نگاہ سے ان کی شاعری کا ممتاز پہلو آزادئ وطن کے لئے جدوجہد کا اعلان ہے۔ جس کے

لئے وہ باہمی اتحاد کے درس کی تلقین کرتے ہیں۔ "نیا شوالہ" کا یہ انداز دیکھئے:

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

نظم کا یہ شعر کس قدر اتحاد و اتفاق کا مظہر ہے۔ دیکھئے:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے — دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

حب الوطنی کا تڑپ، جذبہ کی آنچ، صداقت کی آگ، ذہنی پر امید اور پیام عمل کی جستجو، ہندوستان

کا متحدہ ترقی پسند قومیت اور ایک ہندوستانی زبان کا تصور اس نظم میں ملتے ہیں۔

ہندوستانی وطنیت سے سرشار نظمیں اقبال کو قومی و ملی شاعر شاعر کی حیثیت سے ممتاز کرتی ہیں جن میں شاعرانہ عنصر سے زیادہ قومی عنصر غالب ہے۔ اقبال کے خیالات، احساسات اور جوش و جذبہ کا اظہار شاعرانہ حسن سے زیادہ حقائق پر مبنی ہے۔ "تصویرِ درد" کے اشعار پڑھنے سے اس کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ جس کے تعلق سے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کہا تھا،

'درحقیقت بے مثل اور سراپا درد ہے'۔

"تصویرِ درد" کے اشعار:

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے کچھ گل نے — چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے، عندلیبوں نے — چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانوں کی آنکھوں سے — سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اقبال کو ہندوستانیوں کے مابین اتحاد و اتفاق اور رواداری کی کمی کا شدید احساس تھا۔ "تصویرِ درد" کا ہر شعر عشق و طنز میں مخمور نظر آتا ہے جس میں انہوں نے ہندوستان کی نوحہ خوانی کی ہے اور پھر اہلِ وطن کو باہمی محبت اور جدوجہدِ آزادی کی یوں تلقین کی ہے:

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو — جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں — غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا۔

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے

الغرض " تصویرِ درد" اپنے وقت کا مرقع ہے۔ اس کے علاوہ نظم " صدائے درد" میں بھی ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں :

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی نے بھی حب الوطنی، قومیت، وطنیت، سیاسی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ اکبر نے اپنے لطیف انداز سے حب الوطنی کے جذبہ کو انقلابی بنا دیا۔ اس کے بعد اقبال کے علاوہ پنڈت برج نارائن چکبست اور محمد علی جوہر نے بھی اپنے اپنے انداز سے اس سعی کو جاری رکھا۔ اور اقبال نے نظم " نانک" میں یہ شعر لکھا ہے جو خود ان کے لئے بھی صادق آتا ہے۔

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اقبال ایک حساس دل رکھتے تھے اسی لئے انسانیت سے متعلق ہر تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے اہلِ ہند کو نئی توانائی بخشی اور غفلت سے بیدار کرتے ہوئے ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش شہرنے کے قابل بنانے کی سعی کی۔ وہ وطن کے نشے سے چور چور رہتے۔ ان کی وطنی شاعری کا انداز نظم " ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" سے ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :

چشتی نے جس زمیں پہ پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اقبال کی نظمیں ہندوستان کی قدیم تہذیب کی عکاسی ہونے کے ساتھ ساتھ ابتدا تا انتہا شاعر کی محبت و عقیدت کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔ قیامِ یورپ کے دوران بھی وطن دوستی کا راگ الاپتے رہے اور پُر اثر نظمیں لکھیں۔ نظم " ترانۂ ہندی" میں جذبات کا اظہار ملاحظہ ہو :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کسی بھی قوم کی سماجی زندگی میں ترقی کا انداز ان امور سے لگایا جاتا ہے کہ اس نے تنگ نظری کی حدود سے نکل کر انسان دوستی، ہمدردی اور رواداری کے دائرے کو کس حد تک وسیع کیا ہے اور ترقی حاصل کی۔

اقبال اگرچہ داغ کے شاگرد تھے لیکن انھوں نے غالب اور حالی کا زیادہ اثر قبول کیا ۔

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

مصنف : امین مالوف
مترجم : قاضی جلیل احمد

صلیب کے سائے میں

قسط ۴

سلطان کے اس آخری پیغام کا مطلب واضح تھا۔ شہر کو الیکسس کومی نس قیصر روم کے حوالے کیا جائے تاکہ شہر فرنگی دست برد سے محفوظ رہے۔ چنانچہ شہر والوں نے قیصر روم کے ساتھ گفت و شنید کا آغاز کردیا۔ اہلِ شہر پھر بھی کچھ دیر یوں ہی حیل و حوال سے کام لینا چاہتے تھے۔ لیکن کومی نس نے دھمکی دی کہ اگر اس عرصہ میں اہلِ فرنگ تسخیرِ شہر میں کامیاب ہوگئے تو کسی کی خیر نہیں ہوگی اور اس کے بنائے کچھ نہیں بنے گا۔ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اہلِ شہر نے اس کے آگے ہتھیار ڈالنا منظور کرلیا۔

۱۸ - ۱۹ جون کی رات بازنطینی فوج کے سپاہی جن میں کافی تعداد ترکوں کی بھی تھی جھیل اسکانیہ کو کشتیوں کے ذریعے عبور کرکے نکانیہ میں داخل ہوئے جہاں ان کے آگے سلطان کی فوج نے ہتھیار رکھ دیے۔ اور صبح ہوتے ہوتے نکانیہ پر بازنطینی پرچم لہرانے لگا۔ اہلِ فرنگ کو بھی جنگ بند کرنی پڑی۔ امراء اور عمائدِ شہر مع نوجوان سلطانہ اور نومولود ولی عہد کے شہرِ قسطنطنیہ کو پورے اعزاز کے ساتھ روانہ کردئے گئے۔

تلج ارسلان کی بیوی ایک سردار کی بیٹی تھی جس کا نام چاکا تھا۔ اس نے فرنگی حملے کے زمانے میں بہت کچھ نام اور شہرت حاصل کی تھی۔ ایک بار جب وہ کسی لڑائی میں بازنطینی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوکر قسطنطنیہ لایا گیا اس کی لیاقت سے بازنطینی اُمرا بہت متاثر ہوئے۔ خصوصاً اس نے جس تیزی سے یونانی زبان سیکھی اور اس پر عبور حاصل کیا۔ اس نے بہت لوگوں کو متاثر کیا۔ چنانچہ بہت جلد اس کا شمار شہنشاہِ روم کے درباریوں میں ہونے لگا۔ شہنشاہ نے اُسے ایک مناسب خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ لیکن یہ اعزازات اس کے عزائم کے مقابلے میں ہیچ تھے۔ وہ

بجائے اپنے لئے ایک سلطنت کا متمنی تھا ۔ بلکہ وہ خود شہنشاہ روم کی جگہ لینا چاہتا تھا ۔

اپنے اس عزم و ارادے کے حصول کے لئے اس نے ایک تدبیر سوچی ۔ پہلے تو اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر سمرنا میں رہائش اختیار کی اور وہاں یونانی جہاز سازوں کی مدد سے اس نے اپنے لئے جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کر لیا جس میں تقریباً ایک سو جہاز تھے جن کی مدد سے اس نے کئی جزیروں پر قبضہ کر لیا ۔ جیسے رہوڈز، کیادس، ساموس وغیرہ ۔ اور اس طرح بحیرہ ایجیئن کے پورے ساحلی علاقے پر اپنی عملداری قایم کر لی ۔ اس طرح ایک بحری طاقت بن جانے کے بعد اس نے اپنے کومنی لس ہونے کا اعلان کر کے اپنے بحری بیڑہ کی مدد سے قسطنطنیہ پر حملہ کر دیا ۔ ایلکسیس قیصر روم نے بڑی مشکل سے اس حملے کو رد کر کے اس کے بحری بیڑہ کے ایک حصے کو تباہ کر دیا ۔

اس ناکامی سے مایوس ہونے کے بجائے اس نے نئے سرے سے ایک اور بحری بیڑہ کی تیاری کا آغاز کیا ۔ اس وقت تک ۱۰۹۲ء قریب الختم تھا ۔ اور قلیج ارسلان ایران میں اپنی نظر بندی سے رہائی پا کر واپس آرہا تھا ۔ چاکا نے سوچا کہ سلیمان کا یہ نوجوان فرزند اس کے لئے ایک بہترین حلیف ثابت ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ اس نے قلیج ارسلان سے اپنی بیٹی بیاہ دی ۔ لیکن سسرے اور داماد کے عزائم میں بہت تفاوت تھا ۔ قلیج ارسلان قسطنطنیہ کی فتح کو ایک فضول سی کوشش سمجھتا تھا ۔ ویسے بھی ایشیائے کوچک میں وہ کسی بھی امیر کا اقتدار خواہ اس کا خسر ہی کیوں نہ ہو، گوارہ کرنے کے لئے تیار نہ تھا ۔ چنانچہ ایک دن اس نے امیر چاکا کی دعوت کر کے دھوکے سے اس کا کام تمام کر دیا ۔ چاکا کا جانشین اس کا ایک لڑکا ہوا جس میں نہ باپ کی اہلیت تھی نہ اولوالعزمی ۔ نتیجہ وہ اپنی چھوٹی سی ریاست پر قانع ہو کر بیٹھ رہا تھا کہ اچانک ایک دن ۱۰۹۷ء میں قیصر روم کا بحری بیڑہ سمرنا کے ساحل پر نمودار ہوا جس میں سلطان کی بہن یعنی قلیج ارسلان کی بیوی اور اس کے ... سوار تھے ۔

قلیج ارسلان کی بیوی کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے بھائی کو سمجھائے کہ نکانیہ پر قیصر روم کا قبضہ ہو چکا ہے ۔ قلیج ارسلان کو شکست ہو چکی ہے ۔ لہٰذا سلطان کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ شہر کو اکولی نس کے حوالے کر دے ورنہ اہل فرنگ کے حملہ کی صورت میں اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی ۔ بصورت دیگر وہ اپنی بہن کو لے کر اپنے بہنوی کے پاس جو اناطولیہ میں کسی جگہ مقیم ہے، جا ملتا ہے ۔ اس طرح بغیر لڑے بھڑے ایلکسیس کومنی نس نے سمرنا سے قسطنطنیہ تک سارا علاقہ بشمول جزائر حاصل کر لیا ۔

لیکن قلیج ارسلان نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے ۔ اور اس نے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے کی

ـشش پھر شروع کردی تھی ۔ دمشق کا وقائع نگار ابن قلانسی لکھتا ہے کہ ارسلان نے فرنگیوں کے ـاف جہاد کا نعرہ لگایا اور ترکوں کو شریک جہاد ہونے کی عام دعوت دی ۔ چنانچہ کئی ترک امراء نے ـ کا ساتھ دینا شروع کیا ۔ اب اس کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح دانش مند سے اپنا ـلق استوار کیے جس کے لئے محض عارضی صلح کافی نہ تھی ۔ اور ضروری تھا کہ ایشیائے کوچک میں ـی طاقتیں متحد ہوکر ایک گٹھ ہوجائیں ۔ اور ایک طرح کا متحدہ کمانڈ قایم ہوجائے ۔ ادھر دانش مند ـ نہ صرف ایک دین دار مسلمان تھا بلکہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ دشمن کا مقابلہ اپنی مملکت کے بجائے ـکے حدود میں کرنا ہر حال میں بہتر ہوتا ہے ۔ اس لئے اس نے بھی ارسلان کی دوستی کا ہاتھ تھام ـ اور ایک بڑی فوج کے ساتھ اُس سے آملا ۔

قلج ارسلان نے دشمن کے لئے ایک جال بچھایا ۔ مخبروں سے اُسے خبریں ملنی شروع ہوگئی تھیں کہ ـلی صرف نکانیہ پر قناعت کرنے والے نہیں بلکہ ان کی آنکھیں یروشلم پر لگی ہیں ۔ ان کا راستہ بھی ـرم ہو گیا تھا کہ وہ جنوب مشرقی سمت سے قونیہ کی طرف سفر شروع کریں گے جو سلطان کے قبضہ میں ـمد بڑا شہر رہ گیا تھا ۔ اس سفر کے دوران فرنگیوں پر بازوؤں سے حملہ کیا جاسکتا تھا ۔ گھات ـنے کے لئے صرف مناسب جگہ کا تعین کرنا تھا ۔ سلطان کے سرداروں کی رائے تھی کہ ڈوری لیم کو بطور ـن گاہ منتخب کیا جانا چاہیئے ۔ جو نکانیہ سے چار روز کی مسافت پر تھا ۔ اور جہاں سے راستہ ایک ـ گھاٹی میں سے ہوکر گزرتا تھا ۔

جون ۱۰۹۷ء کے آخری دنوں میں قلج ارسلان کو خبر ملی کہ اہلِ فرنگ رومیوں کی ایک چھوٹی سی ـرج کے ساتھ نکانیہ سے روانہ ہو چکے ہیں ۔ گھات کا پورا نقشہ تیار تھا ۔ فوجیں اپنی اپنی جگہ لے چکی ـیں ۔ صبح طلوعِ آفتاب فرنگی فوجیں دور افق پر نمودار ہوئیں ۔ نائٹس اور پیادے دشمن کی ـات سے بے خبر اطمینان سے بڑھے چلے جارہے تھے ۔ سلطان کو اندیشہ تھا کہ اس کی چال دشمن ـقبل از وقت افشا نہ ہوجائے ۔ لیکن بظاہر اس کا کوئی خطرہ موجود نہ تھا ۔ دوسری قابلِ اطمینان بات ـ دکھائی دیتی تھی کہ دشمن کی تعداد اسکی اپنی سپاہ کی تعداد سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی ۔ ـاہر اُن کا کچھ حصہ نکانیہ ہی میں رہ پڑا تھا ۔ لیکن قطعیت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا ۔ بظاہر تو ـداد سپاہ کے لحاظ سے اس کو برتری حاصل تھی اور پھر دشمن پر بلا اطلاع ٹوٹ پڑنے کا ـمکان ۔ فال بظاہر نیک ہی لگتی تھی ۔ تجربہ کار دانش مند کا بھی یہی خیال تھا ۔

سورج پہاڑیوں کے پیچھے افق پر بلند ہوچکا تھا ۔ جب قلج نے اپنی سپاہ کو حملے کا حکم دیا ۔ ترکی ـوج کی یہ کارروائی ایسی تھی کہ ترک سپاہ اس میں کافی منجھ گئے تھے ۔ گذشتہ نصف صدی سے اسی

طرزِ جنگ ہی کی بدولت سارے مشرقِ وسطیٰ میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اُن کی فوج تقریباً سب کی سب گھڑسواروں پر مشتمل ہوا کرتی تھی جو بہترین تیرانداز بھی تھے وہ دشمن کے قریب پہنچ کر پہلے تو اس پر تیروں کی بارش برساتے اور پھر واپس پلٹ جاتے اور ان کی جگہ سواروں کی دوسری صف لے لیتی۔ اور اس طرح چند صفوں کا تبادلہ ہی دشمن کو تہس نہس کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ اس کے بعد کہیں جاکر دست بدست جنگ کی نوبت آتی۔

لیکن اس روز ڈوری لیم کے معرکے میں ترکوں کا یہ آزمودہ طرزِ جنگ کسی طرح بھی موثر ثابت نہیں ہورہا تھا۔ مانا کہ فرنگی سواروں میں ویسی چستی اور پھرتی نہ تھی پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دفاعی جنگ کے ماہر ہیں۔ اور یہ دیکھ کر قلیج ارسلان اور دانش مند دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ فرنگی فوج کی اصلی طاقت اُن کے وہ نائٹ تھے جو سر سے پیر تک آہنی زرہ میں ملبوس تھے۔ بلکہ ان کے گھوڑوں پر بھی لوہے کے خول چڑھے ہوئے تھے جن پر ترک سواروں کے تیر چنداں اثر نہیں کررہے تھے۔ اس دن کئی گھنٹوں کی لڑائی کے بعد ترک تیراندازوں نے بہت سوں کو زخمی کردیا خصوصاً پیادہ سپاہیوں کو۔ لیکن فرنگی فوج کا معتدبہ حصہ صحیح سلامت رہا۔ کیا ان کے ساتھ دست بدست جنگ لڑی جائے؟ نتیجہ بالکل غیر یقینی تھا۔ تو پھر کیا اسی گھڑسوار لڑائی کو اور دیر تک جاری رکھا جائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہلی سراسیمگی کی کیفیت رفع ہونے کے بعد دشمن اب جم کر لڑنے لگا تھا۔

اب بعض امیروں نے بازگشت کی صلاح دینی شروع کی تھی کہ اتنے میں دور سے گرد اُڑتی نظر آئی۔ ایک تازہ دم فرنگی فوج جس کی تعداد تقریباً پہلی فوج ہی کے برابر تھی آپہنچی تھی۔ وہ لوگ جن سے ترک ساری صبح سے جنگ میں معروف تھے معلوم ہوا کہ صرف ہراول کا دستہ تھا۔ اب سلطان کے لئے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا بجز اس کے کہ بازگشت کا حکم دے۔ لیکن اس سے پہلے کہ بازگشت کا حکم جاری ہوتا ترکی سپاہ کے عقب سے گرد کا دوسرا مرغولا ابھرا۔ یہ فرنگیوں کی تیسری فوج تھی۔ ترکی فوج اب پوری طرح دشمن کے نرغے میں آگئی تھی۔

اس نوبت پر قلیج ارسلان نے ڈر کو دل میں جگہ دے دی۔ وہ کود کر اپنے مرکب پر سوار ہوا اور سرپٹ پہاڑیوں کا رُخ کیا۔ اس کا خزانہ جو سپاہیوں میں تقسیم کرنے کے لئے وہ ساتھ لایا تھا وہیں کا وہیں رہ گیا۔ دانش مند بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ اور ان دونوں کے پیچھے دوسرے ترک سردار اپنے سریع الرفتار سواریوں کا فائدہ اٹھا کر تعاقب کرنے والوں کے بیچ سے نکل بھاگے۔ لیکن بہت سے سپاہیوں کو اس کا موقعہ دل سکا وہ ہر طرف سے گھر گئے تھے۔ ابن قلانسی لکھتا ہے بہت

ومک قتل ہوئے ۔ بعض گرفتار ہوکر غلام بنا کر بازار میں بیچ دیئے گئے ۔ بہت مالِ غنیمت دشمن کے ہاتھ آیا۔

راستے میں قلیج ارسلان کو سواروں کا ایک دستہ ملا ۔ یہ لوگ ملک شام سے اس کی مدد کے لئے آرہے تھے لیکن اب مدد کا وقت گزر چکا تھا ۔ فرنگی تعداد اور طاقت دونوں میں برتر ثابت ہوئے ۔ فی الحال ان کے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا ۔ فرنگی طاقت کا اندازہ لگانے کے بعد نوجوان سلطان اناطولیہ کی سطح مرتفع میں کہیں غائب ہوگیا اور چار سال تک موقعہ کی تلاش کرتا رہا۔

اب یہاں سے یروشلم تک صرف قدرتی موانع ہی فرنگیوں کی راہ میں رکاوٹ ڈال سکتے تھے ۔ بے برگ وگیاہ تنگ پہاڑی راستے اور گرمیوں کی تپتی ہوئی دھوپ ، کہیں سایہ کا نام ونشان نہیں ۔ انہی سب نے مل کر فرنگیوں کی رفتار کو دھیما کر دیا ۔ ڈوری لیم کے معرکے کے بعد اناطولیہ کی سطح مرتفع کو عبور کرنے کے لئے انھیں ۱۰۰ دن لگے حالانکہ عام حالات میں اتنی مسافت طے کرنے کے لئے ایک مہینہ کافی ہوتا ۔ اس دوران ترکوں کی شکست فاش کی خبر سارے مشرق وسطیٰ میں پھیل گئی ۔ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ اسلام کے لئے اس شرمناک ذلت کی اطلاع نے ہر طرف ہراسانی اور سراسیمگی پیدا کردی ۔

ان ناقابلِ تسخیر نائٹوں کی آمد کی افواہیں ہر روز اڑتیں ۔ ماہ جولائی کے آخر میں افواہ گرم ہوئی کہ فرنگی فوجیں ملک شام کے اندر ال بلانا کے مقام تک پہنچ چکی ہیں ۔ ہزاروں سواروں کا رسالہ ان کے مقابلے کے لئے روانہ کیا گیا ۔ لیکن اطلاع غلط ثابت ہوئی ۔ جو لوگ ہر قسم کی خام خیالیوں میں مبتلا رہتے ہیں انہوں نے نجوم اور رمل کا سہارا لیا ۔ ابن قلانسی نجومیوں کی ایک ایسی ہی پیشن گوئی کا ذکر لکھتا ہے ۔ اس سال موسم گرما میں ایک دُمدار ستارہ افق پر نمودار ہوا جو بیس روز تک افق سے بلندی کی طرف بڑھتا رہا ۔ اور پھر ایسا غائب ہوا کہ اس کا نام ونشان باقی نہ رہا ۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس دُمدار ستارے کی طرح فرنگی بھی چند دن کی نیرنگی دکھا کر واپس پلٹ جائیں گے لیکن یہ خام خیالی زیادہ دیر باقی نہ رہ سکی کیوں کہ اب ان فرنگیوں کی آمد کی زیادہ تفصیلی اطلاعیں گردش کرنے لگیں اور ان کے قریہ بہ قریہ پیش قدمی کا احوال نشر ہونے لگا ۔ ۲۱ / اکتوبر ۱۰۹۷ء کو یہ فرنگی فوجیں انطاکیہ کی دیواروں کے قریب پہنچ گئیں ۔ گو ابھی فوج کا کافی بڑا حصہ دور تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں کافی عرصہ قیام کریں گے ۔ شہر کی فصیل کے پانچ دروازے بند کردیئے گئے ۔ بازاروں میں صبح کی ہماہمی اور چہل پہل مدھم پڑ گئی ۔ سارے شہر پر خوف کا سناٹا طاری ہوگیا ۔

(۔۔۔۔ جاری ہے ۔۔۔)

حامد بن شبیر

شکار اور شکاری

شیر اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے حسبِ ذیل طریقے اختیار کرتا ہے۔
۱۔ جانوروں کے روز آنے جانے کے راستہ پر یا پانی پینے کے مقامات پر چھپ کر بیٹھ کر۔
۲۔ جنگل کے نالوں یا دوسرے راستوں پر سے چل کر یہاں تک کہ اس کو کسی جانور یا مندے کے چرنے کی آواز سنائی دے اور پھر احتیاط سے اس کا تعاقب کرکے۔
۳۔ گاؤں کے جانوروں کے مندوں کا پیچھا کرکے جب کہ وہ جنگل سے گاؤں کو واپس جارہے ہوں۔
۴۔ دو دو مل کر ایک دوسرے کی طرف جانور کو ہنکال کر۔
۵۔ جانوروں کے تجسس کی عادت سے فائدہ اٹھاکر۔
۶۔ مختلف طریقوں سے دھاڑ کرتا کہ جانور خوف سے پکار کر اپنی موجودگی کا پتہ دے دیں۔

شیر عموماً گھاس یا جھاڑی سے دبکتا ہوا آکر ۵۔ ۶ گز کے فاصلے سے اپنے شکار پر جست نہیں کرتا بلکہ دوڑ کر جھپٹتا ہے اور جانور کے سامنے کے حصوں کو دونوں پنجوں سے اس طرح دباتا ہے کہ ایک پنجہ عموماً جانور کے شانہ کے اوپر اور دوسرا اس کی مقابل سمت میں رہتا ہے اور ساتھ ہی منہ کے نیچے سے گلا پکڑ لیتا ہے اور اس کو اوپر کی طرف پلٹاتا ہے اور ایسا کرنے میں بعض وقت جانور کے سامنے سے دوسری طرف کود جاتا ہے۔ اس عمل

سے جانور نیچے گر جاتا ہے اور گردن کی ہڈی بالعموم ٹوٹ جاتی ہے اکثر و بیشتر صورتوں میں دم گھٹ جانے اور گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے موت واقع ہوتی ہے جانور گرا کے مارنے کا کام اس قدر جلد ہو جاتا ہے کہ اگر شیر نے منڈے میں سے کوئی جانور مارا ہو تو جانور کی آواز پر چرواہے کے آنے تک شیر جانور کو ختم کر کے واپس ہو رہا ہوتا ہے۔

کیپٹن فورستھ لکھتے ہیں کہ شیر عموماً اوپر سے گردن پکڑتا ہے اور ساتھ ہی پنجوں سے بھی پکڑتا ہے اور گردن کو جھٹکا دیتا ہے جس سے گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ کیپٹن بالڈون بھی یہی کہتے ہیں کہ جھپٹ کر گردن پکڑ کر جانور کو نیچے گرا دیتا ہے اور گردن پلٹا کر توڑ دیتا ہے مگر سینڈرسن کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس میں شک نہیں شیر کبھی کبھی اوپر سے گردن پکڑتا ہے مگر یہ بہت بڑے جانور کو مارنے میں کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے وسیع تجربے میں صرف دو گارے ایسے دیکھے جن میں شیر نے اوپر سے گردن پکڑی تھی۔ ایک تو بہت بڑا سور تھا جو پیٹھ گر چلا گیا مگر بعد میں مر گیا اور دوسرا ایک بہت بڑا بیل تھا۔ موصوف کا خیال ہے کہ شیر عموماً نیچے سے گلا پکڑتا ہے۔

ایک مرتبہ گرا لینے کے بعد جب تک جانور مر نہ جائے یہ نہیں چھوڑتا گردن پکڑا رہتا ہے اور ایک پنجہ جسم پر دھرا رہتا ہے جب یقین ہو جائے کہ جانور مر گیا تو چھوڑ کر علاحدہ کھڑا رہتا ہے مگر جانور کو ٹکٹکی باندھ کر گھورتا رہتا ہے اگر ذرا سی بھی حرکت ہوئی تو پھر جا دباتا ہے۔ جب جانور بالکل بے حس و حرکت ہو جائے تو فوراً دم اور بعض اوقات دونوں کان کاٹ کر منہ سے دور پھینک دیتا ہے اور تھوڑی دیر دم لینے کے بعد دم کے نیچے سے پنجے کے نیچے سے چیر کر کھانا شروع کرتا ہے۔ پہلے لوگوں کا یہ خیال تھا شیر خون پی جاتا ہے مگر اب یہ امر مسلّمہ ہے کہ نہ تو خون نکلتا ہے ورنہ شیر پیتا ہے جب تک جانور کے جسم میں جان رہتی ہے شیر پکڑا رہتا ہے اور اسی طرح شیر کے دانت سوراخوں میں پیوست رہتے

ہیں اور جب جانور مرجاتا ہے اور خون کا دوران ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد شیر چھوڑتا ہے اس طرح خون زمین پر بھی نہیں گرتا۔

جنگلی بھینسا یا بائسن کو مارنے میں شیر اول بھینسے کے سامنے آ کر بھبکی دیتا ہے اور جب بھینسہ حملہ کرنے کے لیے بڑھے تو فوراً راستہ کاٹ کر لپک کر پچھلا پاؤں گھٹنے کے جوڑ کے پاس سے پکڑ لیتا ہے۔ ایک مرتبہ ناکامی ہو تو مکرر یہی عمل کرتا ہے اگر ایسا نہ کرے تو بڑے سے بڑا شیر بھی سامنے سے جنگلی بھینسہ یا بائسن کو نہیں مار سکتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شیرنی اور اس کے دو تقریباً جوان بچوں نے ایک مادہ بائسن پر حملہ کیا۔ ایک بچہ مارا گیا اور دوسرا بھی زخمی ہوا تب کہیں مادہ بائسن ان تینوں کی مشترکہ کوشش سے ماری گئی۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ شیر بھینسے کا پاؤں پکڑ کر چبانے کے بعد ہڈی توڑ کر بے کار کر دیتا ہے۔ جب بھینسہ تیز بھاگنے کے قابل نہ رہے تو گردن پر حملہ کر کے گرا لیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض گھنے جنگلوں میں بھی جہاں گردن پر حملہ کرنے کا اچھا موقعہ نہ ہو شیر چھوٹے جانوروں کو بھی اس طرح یعنی گھٹنے کے جوڑ کو کتر کر مارتا ہے۔

بعض اوقات بھاگتے ہوئے جانور کو پیٹھ پر جست کر کے اوپر سے گردن پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچتا ہے اور پنجے پیٹھ پر جما کر پسلیوں کو آگے کی طرف کھسکاتا ہے اس سے جانور گردن ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ یہ طریقہ بھی بھینسے وغیرہ کی قسم کے بڑے جانور کے لیے شیر استعمال کرتا ہے بڑے گینڈے تک کو بھی شیر مار لیتا اور کھا جاتا ہے۔ اونٹ کو پاؤں پکڑ کر گرانے کے بعد مار لیتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ برما میں برما میں شیر کم عمر ہاتھیوں کو پاؤں کی رگیں کاٹ کر گرا دیتے ہیں اور جان سے مارے بغیر ہی پیٹھ کی طرف سے گوشت کھانا شروع کر دیتے ہیں۔

شیرنی یا چھوٹا شیر عموماً نیچے سے گلا پکڑتا ہے اور جانور کا سر

زمین سے لگا دیتا ہے۔ اس دوران میں شیر کا منہ اور اگلے پاؤں پنجوں تک زمین پر ٹکے ہوئے ہوتے ہیں مگر پچھلا جسم زمین سے اٹھا رہتا ہے۔ شیر نے اوپر سے گردن پکڑی ہو تو دانتوں کے نشان نیچے گلا پر پڑتے ہیں اور اگر نیچے سے گلا پکڑا ہو تو اوپر گردن پر پڑتے ہیں۔

دم اور کان کترنے کی عادت کے متعلق شکاریوں کی مختلف رائیں ہیں۔ کان کا کترنا لازمی نہیں ہے مگر دم کترنا لازمی ہے۔ بعض شکاریوں کا یہ قول ہے کہ دُم سے نقصان کے اندیشہ سے شیر کتر کر پھینک دیتا ہے بعض نے یہ لکھا ہے کہ چونکہ شیر دم کی طرف سے کھاتا ہے اور دم حائل آتی ہے اس لیے کتر دیتا ہے یہ ایک حد تک قابلِ قبول ہے مگر کان کتر کر پھینکنے کی توجیہ اس سے نہیں ہوتی۔ دو تین تجربہ کار شکاریوں نے اس بارے میں مجھ سے بیان کیا میرے خیال میں وہ قابلِ قبول ہے۔ جب شیر کسی جانور کو گلا پکڑ کر دبائے ہوئے بیٹھتا ہے تو جانور کا اور کوئی حصۂ جسم تو حرکت نہیں کرتا مگر جان نکلنے تک غیر ارادی طور پر جانور کا دم اور کان ضرور ہلتے رہتے ہیں اور شیر کے لیے یہ ایک قسم کی ناراضگی کا باعث ہوتا ہے اور ان کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے کہ باوجود پورا جسم ساکت ہونے کے یہ آخری وقت تک متحرک رہتے ہیں۔ اس طرح جب شیر کو یقین ہو جاتا ہے کہ جانور مر گیا تو سب سے پہلے انہی چیزوں کو کتر کر پھینک دیتا ہے یہ توجیہ قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے قربانی کے بکرے جب ذبح کیے جاتے ہیں تو یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے اگر کوئی قصائی بکرے کو ہاتھ سے دبائے رکھے تو ذبح شدہ بکرے کی دم اور کان جان نکلنے تک ہلتے رہتے ہیں یہ امر یقیناً شیر کی ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہوگا کہ جانور کے کان عین شیر کے منہ اور اس کے کانوں پر جبکہ وہ گردن دبائے ہوئے ہیں اور دوسری طرف دم پھڑکتی رہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ شیر کے ہاتھ اور منہ مصروف ہوتے اور جانور کو دبائے ہوئے رہنے کی وجہ سے شیر کو دم اور کانوں کی اس حرکت

[illegible]کنے پر اختیار بھی نہیں رہتا ہے۔ شیر کے کان بہت حساس ہوتے ہیں اور کوئی مکھی مچھر ذرا بھی ان کو چھوئے تو شیر بار بار کان ہلاتا رہتا ہے۔ شیر کے مارے ہوئے جانوروں کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دم اور کان کتر کر کافی فاصلہ پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ ایک طرف (۷ - ۸) گز کے فاصلہ پر دم ملے گی تو ایک کان کسی جھاڑی پر اٹکا ہوا اور دوسرا کان کسی اور طرف الجھا ہوا ملے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیر ان کو کتر کر جھٹکے کے ساتھ دور پھینکتا ہے اس سے ناراضگی کی توجیہ درست معلوم ہوتی ہے۔

مولوی محمد حسین خاں صاحب مہتمم شکارگاہ پہاڑلہ ایک دیرینہ تجربہ کار شکاری ہیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ شیر کو گارا کرتے ہوئے کئی مرتبہ بچشم خود دیکھا ہے مگر کان کترتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ ہمیشہ دم کترتے ہوئے انھوں نے دیکھا اور بعض مرتبہ یہ دیکھا کہ جانور کو پورا مارنے سے قبل ہی دم کی حرکت سے ناراض ہو کر شیر نے گلا چھوڑ کر پہلے دم کتر کر پھینک دی۔ اس کے بعد پھر گلا دبا کر جانور کو ختم کیا۔ بعض دفعہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ شیر گارے کے کان یا دم نہیں کترتا ایک دفعہ گارلہ دوڈو ضلع ورنگل میں گارے بندھوائے جا رہے تھے۔ ہم لوگوں کے مقام شکار پر پہنچنے سے قبل ایک شیر کو مسلسل سات گارے کھلائے جا چکے تھے۔ گاؤں کی آبادی سے تقریباً کوئی ایک یا ڈیڑھ میل پر یہ گارے ہو رہے تھے۔ جب میں پہنچ کر دیکھا تو ایک کھلگا تقریباً ایک تہائی کھایا ہوا پڑا تھا۔ دم اور کان علیٰ حالہ موجود تھے رانوں کا اندرونی حصہ اور پیٹ سینہ تک کھایا جا چکا تھا۔ وہاں جنگل بھی گھنا نہ تھا۔ مجھے یہ خیال گزرا کہ یہ شیر کا گارا نہیں ہے کیوں کہ جو علامات شیر کے گارے کی بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی موجود نہ تھی مگر شکاریوں نے یقین دلایا کہ شیر کو انھوں خود مارتے ہوئے دیکھا ہے۔

(باقی آئندہ)

محمد مرتضیٰ علی خان ناغرؔ

سراغرسانی اور تفتیش

۲۹ رذوردی ۱۳۲۹ فصلی مطابق ۲۴ رفروری ۱۹۲۰ء کو والد صاحب قبلہ میر چوک کی کچہری پر منصرمانہ طور پر کارگذار تھے۔ سلطان شاہی میں نواب صاحب کلیانی کی دیوڑھی پر ایک شخص حاجی عبداللہ نامی جس کی عمر ساٹھ سال تھی اور زمرۂ جوانان صرفخاص میں ملازم تھا، متعین تھا اس دیوڑھی پر ضبطی آجاتی ہے اور دیوڑھی والوں کو شبہ ہوجاتا ہے کہ حاجی عبداللہ کی مخبری کی وجہ سے ضبطی آئی ہوگی۔ اس لیے وہ اس کا تبادلہ دوسری جگہ کردیتے ہیں۔ حیدرآباد میں اس زمانے میں طاعون (پلیگ) کا بہت زور تھا۔ اس اثنا، میں حاجی عبداللہ کی بیوی کا پلیگ سے انتقال ہوجاتا ہے اور اس کے ایک کم سن بچی رہ جاتی ہے۔ حاجی عبداللہ کا مکان حاجی عبدالقادر نامی املین صفائی کے مکان سے ملحق تھا۔ عبدالقادر حاجی عبداللہ سے اس کی بچی پرورش کے لیے مانگ لیتا ہے اور عبدالقادر کے مکان میں وہ بچی اتفاق سے آگ لگنے سے دوسرے ہی روز جل کر مرجاتی ہے۔ حاجی عبداللہ کو خیال ہوتا ہے کہ اس کی بچی کو اس دیوڑھی والوں نے عبدالقادر کے توسط سے حاصل کرکے جلاکر عمداً مار ڈالا ہے۔ انتقام کی آگ اس کے سینہ میں بھڑک اٹھتی ہے اور وہ بندوق، طمنچہ، تلوار اور جیہ بارود گولی جمع کرکے دو دن تک خود کو تیار کرلیتا ہے۔ بچی کے مرنے کے تیسرے دن عبدالقادر اس کے پاس یہ دریافت کرنے جاتا ہے کہ بچی کی زیارت (فاتحہ سیوم) کس مسجد میں کی

چلنے اور حاجی عبداللہ اس کو بھی طمنچہ سے زخمی کر دیتا ہے۔ اس کے پیٹ کے اندر سے انتڑیاں باہر آجاتی ہیں اور پھر وہ اسے تلوار سے ختم کر دیتا ہے۔

ایک دوسرا شخص عبدالعزیز بیچ بچاؤ کرتا ہے تو وہ بھی قتل کر دیا جاتا ہے دو اشخاص کو اس تلوار سے ختم کرنے کے بعد وہ سڑک پر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اس تصور میں کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور جو بھی سامنے ملا اس پر وار تلوار سے اور طمنچہ سے کرتا جاتا ہے۔ اس طرح کئی آدمیوں کو راستہ میں زخمی کرتا ہوا نکل جاتا ہے نہ پبلک اس کا تعاقب کرتی ہے اور نہ پولیس۔ البتہ اہلیان پولیس سیٹیاں خوب بجاتے رہتے ہیں اور ملزم سے بہت دور رہ کر اس کے بھاگنے کا منظر دیکھتے رہتے ہیں۔

ایک پولیس کا جوان بدحواسی میں والد صاحب قبلہ کو جو سو رہے تھے اٹھاتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ ایک عرب لوگوں کو مارتا ہوا سلطان شاہی کی طرف سے آکر گرد ناکی گلی میں مڑا ہے۔ اس وقت ان کے جسم میں ایک نیم آستین اور لنگی کے سوائے کچھ نہیں رہتا۔ وہ ننگے سر اسی حالت میں ملزم کا تعاقب شروع کرتے ہیں اور دور تک تنہا اس کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ ملزم تھوڑے سے فاصلے سے ایک آدھ سیکنڈ کے لیے رک کر طمنچہ ان کی طرف کرکے ان کو ڈراتا اور پھر بھاگنے لگتا ہے۔ بہت دور جانے کے بعد ایک مرہٹہ ان کے ساتھ ہو جاتا ہے اس طرح نہتے ملزم کا تعاقب کرتے ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حاجی عبداللہ نے ہر اس شخص پر وار کیا جو اس کے سامنے آیا یا جس نے اس کے سامنے گلی یا سڑک کو پار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک چھوٹے بچے کو جو بالکل اس کے سامنے گلی میں آکر کھڑا ہو گیا اور ہیبت سے منہ بنا بنا کر روتے لگا اسے صحیح سلامت چھوڑ دیا۔ ایک دودھ دہی بیچنے والی عورت نے اس کے سامنے گلی پار کرنے کی کوشش کی اسے اس نے روکا۔ عورت نے اس کے ہتھیار اس کے کپڑے خون آلودہ دیکھ کر کانپنا شروع کیا۔ اس کے دودھ دہی کا ٹوکرا ہاتھ سے

گیا اور حاجی عبداللہ نے اس پر بھی وار نہیں کیا اور اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا
در گلی ہوتے ہوئے وہ قدم رسول کے پاس کی سڑک پر نکل گیا۔ کچھ پولیس
ے آدمی اور پبلک دور سے یہ تماشا دیکھتے رہے اور وہ پھر ایک دوسری
ں میں گھس گیا۔ یہاں انھوں نے دو جوانان پولیس کے ہاتھ سے لٹھ چھینے
ے طیاری کو دیا اور دوسرا خود لے لیا اور پولیس والوں کو پکار کر کہا کہ آؤ
ؤ! اور خود اودھر۔ طیاری اس گلی میں ملزم کے پیچھے گھس گئے۔ کسی
ے شخص نے بھی ساتھ نہ دیا۔ گلی میں دور تک ملزم ان کو نظر آتا رہا اور
ہ اس کا تعاقب کرتے رہے۔ بالآخر ایک مقام اس گلی میں ایسا آگیا کہ وہ
ہ آگے بھی نکل رہی تھی اور ایک گلی بازو میں بھی جانے لگی۔ اب دونوں
یوں میں سے ملزم کون سی گلی میں گیا، جاننا مشکل تھا۔ انھوں نے
یاری سے کہا کہ آگے جانے سے پہلے اس بند گلی کا جائزہ لے لیں تاکہ اگر
زم اس میں ہے تو ہم پر پیچھے سے وار نہ کر سکے۔ خود گلی کے ایک رخ
ی سیدھے ہاتھ کے مکانات دیکھنے بڑھے۔ طیاری کو بائیں ہاتھ کے
کانات دیکھنے آنے کہے لیکن گلی میں کافی جانے کے بعد بھی کہیں کچھ پتہ
چلا، اکثر دروازے بند تھے۔ ایک آدھ دروازہ ہی کھلا تھا۔ بائیں
تھ کی طرف کے مکانوں میں ایک مکان کے دروازہ پر پردہ پڑا
وا تھا اور ایک دروازہ بند اور دوسرا نصف بند تھا۔ ان کو وہاں کھٹکا
ہوا کہ یہ دروازہ نصف بند کیوں ہے لیکن جلدی میں کچھ خیال انھوں نے
ہیں کیا۔ بس ایک ہی منٹ میں ایک بجلی سی کوندی اور ملزم نے اسی
دروازہ سے نکل کر طمنچہ سے فائر کیا۔ طیاری نے دونوں ہاتھ اوپر
ٹھائے تو اس کی ہتھیلی سے ایک چھرہ نکل گیا۔ ملزم دروازہ سے
باہر نکلا۔ طیاری نے جھک کر اس کی کمر یا پیر پکڑنے کا ارادہ کیا لتنے میں
انھوں نے لٹھ سے بھرپور وار اس کے سر پر کیا اور وہ پیچھے گر گیا۔ پیچھے گرنے
کے باوجود وہ چھیہ کمر سے نکالنے کی کوشش میں تھا۔ طیاری اس سے
لپٹا ہوا تھا۔ انھوں نے اس کے ہاتھ پہ پیر رکھ دیا اس نے چھیہ نکالنے کی

کوشش ترک کردی اور پیر پکڑ کران کو گرایا اور یہ تینوں گرم پیٹھی کرنے لگے بالآخر ملزم بے ہوش ہوگیا اور تینوں اس گلی میں چپ چپ بیٹھے رہے تھے ایک راہرو نے یہ قصہ دیکھ کر قدم رسول کے پاس والی سڑک پر کھڑی ہوئی پولیس کی جمیعت کو مطلع کیا۔ وہ مقام واقعہ پر حاجی عبداللہ کے زمین پر گرنے کے بہت دیر بعد پہنچی اور اس کو حراست میں لے لیا۔ بعد میں ملزم نے کہا کہ اس کا طمنچہ بھرا ہوا نہیں تھا اس لیے وہ راستہ میں دور تک سان پر فائر نہ کرسکا وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ طمنچہ بھرلے اور اس نے اس مکان کا نصف دروازہ کھول کر آڑ میں طمنچے کی دونوں نالیاں بھرلی تھیں اور ٹوپی چڑھاتے وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے آنے والے آگئے ہیں۔ اس نے ایک فائر کیا۔ دوسرا فائر کرنا ہی چاہتا تھا اس کے سر پر مار پڑی اور وہ چکرا کر گر گیا اس واقعہ میں پانچ بے گناہ اشخاص مارے گئے تھے اور چھ راہ شدید زخمی ہوئے تھے اگر فوری تعاقب کرکے ملزم کو گرفتار نہ کیا جاتا تو نہ معلوم اور کتنے بے گناہ اشخاص کی جانیں جاتیں۔

حاجی عبداللہ اور تین مقتولین عبدالقادر، عبدالرزاق اور بانو جن کی فوٹوز بھی مجھے پولیس بلدہ کے قدیم ریکارڈ میں بڑی تلاش و جستجو کے بعد ہمدست ہوسکیں۔ ان کی پشت پر موجود تحریر سے معلوم ہوا کہ عبدالقادر اور عبدالرزاق تو ۲۹ر فروری ۱۳۲۹ف کو ہی فوت ہوگئے تھے لیکن بانو جی ۲ ازمردی بہشت ۱۳۲۹ف م ۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو ہلاک ان کی فوٹوز میں مقتولین کے جسموں پر تلوار اور چھرے کے زخم واضح طور پر نظر آتے ہیں اور عبدالقادر کے پیٹ سے نکلی ہوئی انتڑیوں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اس واقعہ کی اطلاع حضور نظام کو ہوئی حضور نے گرفتار کنندگان کو شرف باریابی بخشا اور محکمہ سرکار سے ہر دو کو انعام ملا۔ جہاں تک علم ہے یہ پہلی مثال تھی جہاں ادائی فرائض منصبی کے سلسلہ میں ایک عہدہ دار پولیس کو طلب کرکے بادشاہ وقت نے شرف باریابی بخشا ہو۔ (باقی آئندہ)

گوتم کا پیغام

دو ہزار پانچ سو سال کی بات ہے کہ راجہ سدھودھنا اور مایا دیوی کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام سدھارتا رکھا گیا۔ راجہ نے برہمن رشی کو بچے کے درشن کرائے اس نورانی چہرے کو دیکھ کر رشی نے کہا یہ بچہ دنیا کو نجات کی راہ دکھلائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ گھر بار تاج و تخت سب چھوڑ کر تپسیا کے لیئے بیٹھ گئے۔

گیا میں ایک درخت کے نیچے گیان حاصل ہوگیا۔ یعنی خود کو پہچان گیا۔ گویا خدا کو جان لیا۔ سارناتھ سے روشنی پہنچانی شروع کی۔ آج ڈھائی ہزار سال بعد بھی گوتم بدھ کا پیغام زندہ ہے۔ جگر مرادآبادی کی زبان میں اس کا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ پنچ شیلا ۲½ ہزار سال پہلے کی زبان ہے۔

گوتم بدھ نے زندگی کے کچھ اصول مرتب کئے جو پانچ بنیادی اصول انھوں نے وضع کئے وہ یہ تھے۔

(۱) قتل نہ کرنا (۲) چوری نہ کرنا (۳) زنا نہ کرنا (۴) جھوٹ نہ بولنا (۵) شراب نہ پینا۔

سماج کی جس حالت نے گوتم بدھ کو یہ اصول وضع کرنے پر آمادہ کیا اسے بھی ذہن

آداب زندگی — کھانے سے پہلے ہاتھ دھو لیجئے اور نظافت کا تقاضہ ہے کہ کھانا میں پڑنے والے ہاتھوں کی طرف طبیعت مطمئن ہو۔ — بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر کھانا شروع کیجیے اور اگر بھول جائیں تو یاد آنے پر بسم اللہ اولہ و آخرہ کہہ لیجئے۔ یاد رکھیے جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا اس کو شیطان اپنے لئے جائز کر لیتا ہے — کھانے کے لئے ٹیک لگا کر نہ بیٹھیے۔ خاکساری کے ساتھ اکڑوں بیٹھیے یا ایک گھٹنا بچھا کر اور ایک کھڑا کرکے بیٹھیے۔ خدا کے رسول ؐ اسی طرح بیٹھتے تھے۔

میں رکھنا چاہیے۔

(۱) قتل نہ کرنا: مذہب کے نام پر قتل کا رواج بہت ہوگیا تھا نہ صرف مخالف عقائد والوں سے بلکہ انسانوں سے بھی بگینہ کیا جاتا تھا۔ گوتم بدھ نے دیکھا کہ انسان انسان سے اور قومیں قوموں سے لڑتی ہیں۔ لیکن یہ بھگوان کے نام پر جان لینا اور بھی برا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اشومیدھ اور نرمیدھ وغیرہ کی مخالفت کی سماج میں جو رسم و رواج رچ جاتے ہیں ان کے خلاف آواز اٹھانے والے کو بڑی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ گوتم بدھ کو بھی کڑی سختیاں اٹھانی پڑیں لیکن اہلِ دل کے دلوں میں ان کا پیغام سرایت کرنے لگا اور لوگ سوچنے لگے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ گوتم بدھ کی یہ بنیادی میانی تھی اور پھر قتل نہ کرنے کی ہدایت میں ایذار رسانی بھی شامل کر دی گئی۔

(۲) چوری نہ کرنا: اسے گوتم بدھ نے بہت وسیع معنی دیئے یعنی ضرورت سے زیادہ اپنے پاس رکھنا چوری ہے۔ اس اعتبار سے گوتم کی تعلیم تیاگ کی تعلیم ہے۔

(۳) بدچلنی کی ممانعت میں گوتم بدھ نے بری نظر سے کسی کو دیکھنا ہی بلکہ ذہن میں غور کرنا بھی شامل کر لیا۔

(۴) جھوٹ نہ بولنے میں صرف منہ سے جھوٹ نہ بولنا ہی نہیں بلکہ جھوٹا بیوپار بھی شامل تھا۔ اس لحاظ سے غلط ناپ تول غلط مال دینا یہ سب جھوٹ کے ضمن میں بھی ہے اور چوری کے بھی ضمن میں۔

(۵) شراب نہ پینے میں کسی بھی نشہ کا استعمال نہ کرنا شامل ہے۔ مہاتما بدھ نے اس بارے میں بہت زوردار لفظوں میں کہا کہ چاہے پہاڑ پر سے کودنا پڑے چاہے شیر کے منہ میں جانا پڑے۔ چاہے جلتی آگ میں کودنا پڑے لیکن شراب کی لت ڈالنا اس سب سے بدتر عذاب ہے۔

یہ پانچوں باتیں تو نفی کے طور پر کہی گئیں لیکن آٹھ باتیں مہاتما بدھ نے اثباتی طور پر بھی کہی ہیں یعنی (۱) صحیح سمجھ (۲) صحیح خیال (۳) صحیح بولنا (۴) صحیح عمل (۵) صحیح روزی (۶) صحیح کوشش (۷) صحیح دھیان (۸) صحیح سمادھی۔

(۱) صحیح سمجھ کا معاملہ بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ اتنا آسان ہے نہیں مہاتما بدھ کے نزدیک صحیح سمجھ بغیر سادھنا کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ (۲) کہ ...

ضروری ہے اور زندگی میں توازن رکھنا لازمی ہے۔

(۲) صحیح خیال: بلند خیالی کبھی ان لوگوں کے حصّہ میں نہیں آسکتی جو تنگ نظر ہوں۔ حتِ قلب اور وسعتِ جگر کا گہرا تعلق ہے۔ بقول اکبر ؎

تواضع اپنی قائم کر غیروں کی مگر تحقیر نہ کر ـــے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر

(۳) سچ بولنا۔ بولنے کی طاقت انسان کو ایک بڑی نعمت دی گئی ہے اس کا صحیح استعمال ا ہو سکتا ہے۔ اور غلط بھی بولنے کے غلط استعمال سے ہم دیکھتے ہیں۔ دنیا میں کتنے جھگڑے ر فساد پیدا ہو جاتے ہیں۔

شاعر نے سچ کہا ہے ؎

کہے ایک سن لے جب انسان دو ۔۔۔ کہ حق نے زبان ایک دی کان دو

فارسی شاعر نے بھی کہا ہے:

نہ مرد است بہ نزدیک خردمند ۔۔۔ کہ پیلِ دماں پیکار جوید

ولے مرد است آں از روئے تحقیق ۔۔۔ کہ چوں خشم آیدش باطل نہ گوید

یعنی عقلمندوں کے نزدیک بہادر وہ شخص نہیں جو مست ہاتھی سے ٹکر لے بلکہ وہ جو غصّہ ، غلط بات نہ کہے۔ آج کل کی دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بین الاقوامی معاملوں تک ، ایک جملہ یا ایک لفظ اگر غلط طور پر کسی سیاسی رہنما یا مدبّر کی زبان سے نکل جاتا ہے اس کا کتنا برا اثر ہوتا ہے اور ملکی معاملات میں تو ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ ایک فرقہ ست ... اپنی اشتعال انگیزی سے کتنے بے گناہوں کی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے

شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے ؎

زباں بریدہ بہ کنجے نشستہ صمٌ بکمٌ ۔۔۔ بہ از کسے کہ زبانش نہ باشد اندر حکم

یعنی۔ ایک ایسا شخص جس کی زبان اس کے قابو میں نہ ہو۔ اس سے ایک گونگا بہتر ہے

ہ۔ صحیح عمل چھوٹے سے چھوٹے کام کا بھی بعض اوقات بہت بڑا اثر ہوتا ہے کیونکہ قعات کا تمام سلسلہ ہماری نظر میں نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ہم چھوٹے چھوٹے کاموں کو اہم سمجھ کر ان میں بد احتیاطی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن یہ چھوٹے چھوٹے کام مجموعی طور پر زندگی پر بہت برا اثر رکھتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ غذا کھا لینا ایک معمولی سی بات ہے [illegible]

سے کوئی بھی حادثہ ہو سکتا ہے۔ غلط جگہ رکھی ہوئی چیز وقت پر نہ ملنے سے بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ یہ باتیں ہمارے روزمرہ کے مشاہدے کی ہیں۔ پھر بھی ہماری توجہ ان کی طرف نہیں جاتی۔ اور ہم نقصان اٹھاتے ہیں اور اپنی عاقبت بھی خراب کر لیتے ہیں۔

۵۔ صحیح معاش: انسان کی بنیادی ضرورتیں بہت تھوڑی ہیں لیکن ہوس کی وجہ سے وہ غلط کاری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے پیٹ پالنے کے نام سے بیجا بیجا کام کرتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جو ملاوٹ کرنے والے ہیں وہ اپنے منافع کے لئے کتنوں کی صحت بگاڑ دیتے ہیں۔ ایک رشوت لینے والا حلال اور حرام کی کوئی تمیز نہیں کرتا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ غلط ذریعہ آمدنی سے جو ہم کسب معاش کرتے ہیں اس سے ہمارے خیالات پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک غلط مثال قائم ہوتی ہے۔ کیونکہ جو بچے سیانے ہونے لگتے ہیں وہ حرکات دیکھ کر اپنے لئے بھی وہی راہ تجویز کرتے ہیں ایک پرانی کہاوت ہے

جیسا کھائے اَن ویسا ہوئے من

۶۔ صحیح کوشش: کوشش تو ہر شخص کرتا ہے کوئی ذاتی مفاد کے لئے کوئی ملکی یا ملّی مفاد کیلئے اور کوئی انسانیت کیلئے مگر وہ صحیح جانب ہونی چاہیے۔ اگر مفاد غلط ہے چاہے وہ ذاتی نہ ہوتے ہوئے ملکی یا ملّی ہی کیوں نہ ہو تو اس کیلئے کوشش بھی غلط ہو گی۔

۷۔ صحیح دھیان: یہ ریاضت کا ایک درجہ ہے۔ بہت سے لوگ اس معاملہ میں غلط راہ پر پڑ کر جادو، ٹونے، بھوت پریت جن ہمزاد وغیرہ کیلئے ریاضت کرنے لگتے ہیں۔ یہ دھیان کا غلط استعمال ہے۔

۸۔ صحیح سمادھی یا استغراق۔ یہ وہ منزل ہے جہاں کشف ہوتا ہے لیکن ہر شخص کے حصہ میں آنے والی چیز نہیں ہے۔

اس طرح پر مہا بدھ کے پانچ منفی اور آٹھ اثباتی نکات بیان کرنے کے بعد تین نقرے اور رہ جاتے ہیں۔

(۱) بدھم شرنم گچھامی　(۲) سنگھم شرنم گچھامی　(۳) دھم شرنم گچھامی

میں بدھ کی شرن آتا ہوں۔ میں سنگھ کی شرن آتا ہوں اور میں دھرم کی شرن میں آتا ہوں۔ بدھ کے معنی ہیں عقیل یعنی دانا اور سنگھ سے مراد ہے جمہوری نظام دھم زبان پالی میں دھرم کو کہتے ہیں۔ دھرم کی شرن میں آنا گویا انسانیت کا علم بردار ہونا ہے۔ کیونکہ لفظ دھرم محض مذہب تک محدود نہیں۔ بلکہ معنی فرض بھی ہیں یہ ہے مہاتما گوتم بدھ کے مشن کا خلاصہ۔

ڈاکٹر سیدہ وسیم دردانہ باسط

ودربھ کی تاریخ جھلکیوں میں اچلپور

ایلچپور جسے اب اچلپور کہا جاتا ہے ودربھ کا نہایت ہی قدیم شہر ہے۔ تاریخ امجدی کے مورخ لفخ ضیاء الدین محمد عرف سید امجد حسین خطیب و قاضی خان بہادر لکھتے ہیں کہ ایلچپور کا وجود قبل حضرت علیہ السلام سے پایا جاتا ہے۔ یہ اکثر بادشاہوں کا پایہ تخت رہا ہے۔ آئینہ اکبری اور تاریخ امجدی ودربھ کے متعلق بہت معلومات ملتی ہیں۔ آئینہ اکبری کے مورخ ابوالفضل کہتے ہیں کہ ودربھ کا وردھا تٹ تھا۔ تٹ ندی کے کنارے کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ وردھا ندی کے کنارے واقع ہے لئے اسے وردھا تٹ کہا جاتا ہے بعد میں یہ خطہ ودربھ کہلایا۔

قدیم ودربھ اور اچلپور کے بارے میں پرانوں اور کہانیوں سے اس کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے ۔ ت رشی جو پہلے آرین تھے وندکی پہاڑی پار کرکے ودربھ کے خطہ میں آئے۔ بعد میں بہت سے آرین آبسے۔ یہاں کے قدیم باشندوں نے جو راکشس کہلاتے تھے آرین کو بہت تکلیفیں پہنچائیں ۔ بہت سادہ لوح اور مہذب تھے۔ اگشت نے ودربھ کی راج کماری لوپ مدرا سے شادی کی ۔ ن میں اس کا مفصل ذکر ہے ۔

اپنیشد کے زمانہ میں ودربھ بہت مشہور رہا۔ رامائن، مہابھارت اور پرانوں میں ودربھ یوں کا بھی ذکر ہے۔

پانڈو جب بھیس بدل کر رہتے تھے ودربھ بھی آئے اور چکلدرہ میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ راجہ ئے چکلدرہ کا حاکم تھا۔ اس کے سپہ سالار کیچک نے دروپدی کے ساتھ ناشائستہ سلوک کرنا چاہا ی وجہ سے پانڈوؤں نے اُسے قتل کر دیا۔ آنجہانی مہامہو پادھیائے میراشی نے واکاٹک راجاؤں کے قابلِ اعتماد معلومات پیش کی ہیں۔

گپت خاندان کی راج کماری پربھاوتی گپتا کی شادی ودربھ رودرسینا بادشاہ سے ہوئی تھی۔

نزد کانگریس نگر۔ امراوتی 444606 (ایم ایس)

رودرسینا بادشاہ کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے اور سلطنت کی حفاظت کے لئے گپت سلطنت سے اچھے منتظمین، سپاہی اور اسکالرس وِدربھ بھیجے گئے جس میں سنسکرت کے مشہور زمانہ شاعر کالی داس بھی یہاں آئے اور ان کا مشہور میگھ دوت بھی یہیں مرتب ہوا۔

وِدربھ اشوک کی سلطنت کا بھی حصہ تھا۔ شینگ خاندان، راشٹر کوٹ، وکاٹک اور چالوکیہ کی سلطنتوں میں بھی وِدربھ شامل تھا۔ تیرھویں صدی میں یہ دیوگیری کے یادو کی سلطنت میں بھی شامل رہا۔ یادو کا صوبہ دار گاول گڑھ میں رہتا تھا۔ شری چکردھر مہاراج جو مان بھاؤ فرقے کے بانی تھے یادو کے صوبہ دار نام دیو درنا کے مہمان تھے۔ وِدربھ کی مشہور شہزادیوں کی شادیاں وِدربھ کے باہر کے شہزادوں سے ہوئیں۔ مثلاً رکمنی، شری کرشنا، دمینتی، نل، لوپ مدرا، اگست رشی — جیجا بائی (شیواجی مہاراج کی والدہ) شاہ جی بھونسلے۔

سلاطین دکن دہلی جاتے ہوئے اچلپور سے گزرتے۔ یہ زبانی قصہ مشہور ہے کہ دکن آنے سے قبل علاؤالدین خلجی جو کارا آلہ آباد کا صوبہ دار تھا، خواب دیکھا کہ ایک بزرگ کہہ رہے ہیں کہ تو دکن کی طرف جا، تجھے فتح حاصل ہوگی اور بہت مال و دولت ملے گا۔ جب تو فتح یاب لوٹے تو فلاں جگہ ہم راجہ ایل سے لڑتے ہوئے شہید و غازی مدفون ہیں ہماری قبور بنوا دینا — لہذا علاؤالدین خلجی فتح دولت آباد سے لوٹتے ہوئے اچلپور سے گزرے اور وہی مقام جو خواب میں دیکھا تھا بچھن ندی کے کنارے پایا۔ اچلپور کے باشندوں نے بتایا کہ ان کا نام شاہ عبدالرحمٰن ہے اور غزنی سے آکر انہوں نے ایل راجہ سے جو اس خاندان کا آخری راجہ تھا جنگ کی اور فتح حاصل کی۔ سلطان نے شہدا کی قبور اور شاہ عبدالرحمٰن غازی اور ان کی والدہ کی قبور پر گنبد اور اسی سے متصل مسجد تعمیر کروا دی۔

خلجی کے بعد بہمنی سلاطین نے لگ بھگ سو سال حکومت کی۔ اور اچلپور پایہ تخت رہا۔ بعد میں یہ مغلوں کے قبضہ میں آگیا۔ مغل بادشاہوں نے اچلپور کے بجائے بالاپور کو پایہ تخت بنایا اور برہان پور کی راہ اختیار کیا کیونکہ شمال سے جنوب کی طرف جانے کے لئے برہان پور کا راستہ انہیں آسان نظر آیا۔ بعد میں برار جو چار صوبوں پر مشتمل تھا نظام حیدرآباد کے قبضہ میں آگیا اور ان کے مقرر کردہ نواب مسندِ وزارت پر رونق افروز ہوتے رہے۔ ان نوابوں کی علم و ہنر پروری، اعلیٰ فوجی تنظیم نے اچلپور کی ترقی و رونق میں چار چاند لگا دیے۔ سلاطین دہلی کے عہد میں دکن کی آمد و رفت میں اچلپور ایک درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔ نوابانِ اچلپور سے لکھنؤ، دہلی و دکن سے رشتہ داریاں بھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ برار کی تہذیب و تمدن

بیان، رسم و رواج میں اب بھی دہلی و دکن کی جھلکیاں ہی نہیں بلکہ تہذیب ان رنگوں میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاہ عبدالرحمٰن غازی کے ہمراہ صوفیائے کرام یہاں تشریف لائے اور یہیں کے ہو رہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہاں کے لوگ صوفی منش، قناعت پسند اور یک جہتی کے حامل نظر آتے ہیں۔ کئی مذاہب اور مختلف رنگ و نسل کے لوگ سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا لٹریچر بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر شاہ غلام حسین کی نظم "یک رنگ نامہ" یا "ہندو مسلمان نامہ" کے چند اشعار پیش کر رہی ہوں:

جگت میں مسلمان ہندو کہلائے ۔۔۔ یہ دونوں جنے ایک جاگہ سے آئے
ہوا کوں ملا ہوا کوں پانڈے ۔۔۔ گھڑا ہے کمار ایک ماٹی کے بھانڈے

اس یک جہتی اور اتحاد میں نوابانِ ایلچپور کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ نواب اسماعیل خاں پنی مہدوی جو نوابانِ ایلچپور کے غالباً پہلے نواب تھے۔ عبدالرزاق مرحوم و مغفور نے سوانح عمری اسماعیل خاں پنی مہدوی لکھی، فرماتے ہیں "یہ کسی تاریخ کی کتاب سے پتہ نہیں چلتا کہ اس نامور نیک نہاد ناظم کا سلسلہ کس مشہور خاندان امارت سے ملتا ہے۔ لیکن یہ امر باعث فخر ہے کہ اسماعیل خاں پنی مہدوی ایک خاندانِ امارت کا بانی ہوا۔ ان کے جدامجد افغانستان سے آکر دہلی میں عرصۂ دراز تک سکونت پذیر تھے۔ اسماعیل خاں کے والد سلطان خاں نے ایلچپور میں بود و باش اختیار کی۔ اور اپنے نام پر ایک محلہ سلطان پورہ آباد کیا۔ سلطان خاں نے اپنے فرزند نواب اسماعیل خاں کو فن سپہ گری کی تعلیم دی۔ زمانہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ جنگ کی سیر کرائی۔ ان کی والدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، نیک، مذہبی امور کی پابند اور عالی نسب تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں بغیر وضو وہ دودھ نہیں پلاتی تھیں۔ ماں کی تربیت، باپ کی شجاعت اور خود طبیعت کی جودت پڑھنا لکھنا سیکھا۔ فن سپہ گری میں کمال حاصل کیا۔ جوانی کا عالم تھا، سپاہیانہ جوش دل میں بھرا تھا۔ شکل و شباہت سے شجاعت ٹپکتی تھی۔ زمانہ ہنر پسندی اور قدر دانی کا تھا۔ حصولِ شہرت کا اچھا موقع ملا۔ اور کئی جنگ میں بہادری اور جواں مردی کے وہ جوہر دکھائے کہ نام روشن ہو گیا۔ اور ایلچپور کی مسند وزارت اور جاگیریں عطا کی گئیں۔ شہر کی حفاظت کے لئے انہوں نے شہر کے اطراف پختہ فصیلیں تعمیر کروائیں جو اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہیں۔

توزک آصفیہ کا مصنف لکھتا ہے "نواب اسماعیل خاں پنی مہدوی بہت رحمدل، متقی اور منصف مزاج تھے۔ اسی زمانے میں دولت آباد کے صدر المہام نے کچھ ایسی بے اعتنائی

برقی کہ دو سال تک سپاہیوں کی تنخواہ نہ دی۔ سپاہ یورش پر آمادہ ہوگئے اور شہر کے لٹنے کا اندیشہ لاحق ہوگیا۔ نواب اسماعیل خاں مع لشکر وہاں پہنچ گئے اور سپاہیوں سے کہا کہ یورش کا خیال بھی نہ کرنا ورنہ میں مع لشکر یہاں آگیا ہوں۔ فوراً ہی سپاہیوں کی تنخواہیں باقی کردیں اور انہیں نہایت پرخلوص، نرم اور دل پسند الفاظ میں سمجھایا کہ "بحالِ دولت و اقبال عدل و سیاست پر موقوف ہے"

ان کے زمانے میں اربابِ علم و ہنر اچلپور کی طرف ٹوٹ پڑتے تھے۔ وہ جس قدر بہادر، دلیر اور شجاع تھے اتنے ہی نرم دل، انصاف پسند، غربا نواز اور مذہب کے پابند بھی تھے آخر اس مردِ شجاع نے کاٹ سورہ کی جنگ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ اس مصرعہ سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی ہے ؎

"مسافر شد سپاہی سوئے فردوس"

سر اور تن یکجا کرکے اچلپور کے قبرستان بے بہا باغ میں دفن کردیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند صلابت خاں رونق آرائے مسندِ وزارت ہوئے۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح رحم دل، قدر شناس غربا نواز، بلند ہمت اور بہادر تھے۔ تلاوتِ قرآن پاک کا بے حد شوق تھا۔ جب میانہ یا پالکی میں سوار ہوتے تو دو حافظ ان کے ساتھ ہوتے۔ عبدالرزاق صاحب لکھتے ہیں کہ دکن کے چھ صوبوں میں ساڑھے تین سوار مانے جاتے تھے جن میں ایک سوار صلابت خاں محبوب تھے۔ انہیں انتظام سلطنت کے علاوہ خوبصورت تعمیرات اور باغات لگوانے کا بہت شوق تھا۔ جنرل ویلیسلی صاحب نے جو ڈیوک آف ویلنگٹن کے نام سے مشہور تھے۔ نواب صلابت خاں کی جوانمردی اور کارگذاری کے از بس مداح تھے۔ جنرل ویلیسلی نے جو رپورٹ گورنر جنرل لارڈ ویلیسلی وزیرِ ہند کو بھیجی وہ یہ تھی۔

"میں حضورِ والا کو مطلع کرتا ہوں کہ مغلیہ سواروں نے جو صلابت خاں کے زیرِ حکم تھے امتیاز حاصل کیا ہے اور سندھیا کی فوج سے ایک نشان چھین لیا ہے"

جنرل ویلیسلی کو نواب کی بہادری بہت پسند آئی اور دونوں میں اس قدر ارتباط بڑھا کہ نواب صاحب نے اپنے لڑکے نامدار خاں کو جنرل ویلیسلی کے گود میں ڈالا اور ان کی تربیت میں رکھا۔ جنرل ویلیسلی نے قاعدہ کے مطابق انہیں اپنی طرف سے ٹوپی پہنایا اور جنرل ڈیوک کا خطاب عطا کیا۔ نواب نامدار خاں نے جنرل یا جرنیل اپنا تخلص قرار دیا۔ سات توپیں ان کی سلامی کے لئے رہوتی تھیں۔ نواب صاحب کو بھی خوبصورت تعمیرات اور باغات لگوانے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے سرمست پورے میں باغ کلاں مع حوض اور بارہ دری اور بے بہا باغ تعمیر کروایا۔ نوابوں کی فوجی تنظیم، خوبصورت تعمیرات، زراعت کی خوشحالی، علم و ہنر کی قدردانی اس قطعہ زمین کی تاریخ

پر مجبور کیا تھا۔ آج اس گلستان کی ملتی ہوئی تصویر اپنے قبور کے جھروکوں سے دیکھ رہے ہے۔ ان کے قلوب کی پاکیزگی اور نفاست اور ان کے کارہائے نمایاں سے ظاہر ہے۔

سلطنت غیر کا باقی نہیں ہوتی ہے کچھار

نواب صلابت خاں کے بعد نواب نامدار خاں اپنے جد امجد کے مسند وزارت پر رونق افروز ہے۔ یہ اس مسند وزارت کے آخری چشم و چراغ تھے۔ ان کا مزاج تعمیر پرست اور شکار دوست اور بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ انہیں اپنے آبا و اجداد کی وراثت، شجاعت، بہادری، عدل انصاف پر بہت فخر تھا۔

وہ خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ ان کا دربار ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ انہوں نے جہاں عید کا ذکر کیا ہے وہاں ہولی پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ ہر اعلیٰ و ادنیٰ قصے پر اشعار کہے ہیں۔ انہیں بھی باغات اور تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ تاریخ امجدی کے مورخ لکھتے ہیں کہ تعمیرات صلابت خاں کی ہوں خواہ نواب نامدارخاں کی، عمارتیں ایسی خوش قطع ہیں کہ زائرین منصف ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔

نواب نامدارخاں نے درگاہ شاہ عبدالرحمٰن کے دست چپ پر ایک باغ موسومہ بہ نامدار باغ بنایا۔ اس کا حصار پختہ، دروازہ رفیع، اسی پر ایک بنگلہ آئینہ بست اور دلنشین تعمیر کی۔ باغ کے وسط میں بارہ دری اور حوض بنایا جس میں کشتی رواں رہتی تھی۔ باغ میں ہر قسم کے پھول اور پھل کے درخت لگوائے۔ اس کے علاوہ ۱۲۳۰ھ آئینہ محل اور باغ صبا اور محل بنوایا۔ محلات کیا تھے جنت تھی۔ آئینہ محل کی تمام چھت آئینہ کی تھی جس کی سجاوٹ آنکھوں کو چکا چوند کئے دیتی تھی۔ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔

ہر دا انجم پہ مٹی کے ذرے مسکراتے ہیں
زبان حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں

یہ بقیہ شان دار جھروکے، ستون، دریچے، بڑی بڑی شان دار الماریاں، ان کے شان دار رکھاؤ کی آئینہ دار ہیں۔ محل کی چھت ستونوں کے نقش و نگار اس زمانے کی خوب صورت صناعی کے بہترین نمونے ہیں۔

دیکھو اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پر ہی کیا موقوف ہے پوری دیوڑھی (محل کے اطراف کی دکانیں) دلہن کی طرح سجی رہتی تھی۔ ۱۷ر فروری ۱۹۳۷ء کو محل میں نہایت شان دار آل انڈیا مشاعرہ زیر صدارت عالی جناب

مولانا علی خاں نشاط ایڈوکیٹ (آکولہ) کے زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس میں جو نظم قاضی سید الدین افسر نے کہی وہ نظم ایلچپور کی گزشتہ تاریخ کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ قاضی موصوف فرماتے ہیں:

اے نقیبانِ ادب اہلِ سخن خوش آمدید
کہہ رہی ہے انجمن کی انجمن خوش آمدید
آج دل میں سیکڑوں عشرت کدے آباد ہیں
ساکنانِ شہرِ ایلچپور کتنے شاد ہیں
شہرِ ایلچپور یعنی مرکزِ شعر و سخن
جس کی خاکِ پاک سے اٹھتے ہیں اہلِ علم و فن
یہ فصیلیں یہ محل یہ بام و در یہ ڈیوڑھیاں
کہہ رہی ہیں عہدِ رفتہ کی سنہری داستاں
کل انہیں گلیوں میں اک دنیا کا کاروبار تھا
آج ہیں خاموشیاں کل جشن تھا دربار تھا
اے نقیبانِ ادب اے شاعرانِ خوش بیاں
تم نے دیکھے شہرِ ایلچپور کے مٹتے نشاں
یوں تو دیکھی ہیں یہ شہر نے سیکڑوں بزمِ سخن
لیکن اس محفل کا کچھ اور ہی ہے بانکپن
یہ ہجومِ سامعینِ خوش مذاق و نکتہ داں
جن کے چہروں سے عیاں ہیں ذہن کی گہرائیاں
اک عقیدت ہے ادب کے پاسبانوں کے لئے
باادب بیٹھے ہوئے ہیں میہمانوں کے لئے
یہ ہجومِ باکمالاں، مجمعِ صاحب دلاں
شاعرانِ خوش گلو شیریں سخن جادو بیاں
اے نقیبانِ ادب اہلِ سخن پائندہ باد
زندہ باد اے پیروانِ میر و غالب زندہ باد

کچھ مراتب آج اس مسند کو بھی حاصل ہوئے — جب نشاط مسند نشیں زینت دہ محفل ہوئے

بلقیس شبیہ

زرد پتے

بازو والے منشی جی کے دروازے پر ڈاکیہ نے دستک دی .... شاید ان کے بیٹے سلمان کا خط ہوگا یا پھر منی آرڈر ۔

عنیزہ بیگم یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہڑک اٹھیں .. منشی جی کے دروازے کی دستک عنیزہ بیگم کی ٹوٹی پھوٹی امارت پر گویا ایک ٹھوکر تھی ۔ جھلاتی پاؤں پٹکتی کمرے کے باہر آئیں ... صاف ستھرے دالان میں نیم کے زرد پتے کو بکھرا دیکھ کر اک دم ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں ۔

" رفو ! " انتہائی برہمی سے انہوں نے کام والی لڑکی کو پکارا اور زرد پتوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتی ہوئی رفو کو گھور کر بولیں ۔ " دیکھ تو ... یا ! "

" ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو سب طرف کی صفائی کر چکی ہوں ۔ خالہ بی ... " لڑکی منمنائی

" چل ! اور جھاڑو لگا ۔ کام چوری کی باتیں نہ بنا میرے سامنے ! "

" یہ مُوا نیم کا جھاڑ ... " رفو کمر کے گرد اوڑھنی لپیٹتی ہوئی بڑبڑائی ... " دیکھنے کا نہ چکھنے کا " وہ جھک کر زمین سے جھاڑو اٹھاتی ہوئی بولی ۔ " دن بھر پتے سمیٹتے سمیٹتے ناک میں دم آ گیا ۔ دن بھر میں پچاسوں مرتبہ آنگن کی جھاڑو کرتی ہوں ۔ پھر بھی ... " وہ کچرا جھاڑو کی پلیٹ پر اٹھاتی ہوئی بولی ۔ " پتے ہوا سے اُڑ اُڑ کر آتے ہی رہتے ہیں " وہ کچرا پھینکنے کے لئے باہر گئی ۔ ابھی کچرا پھینک کر گلی کے دروازے سے پلٹی ہی تھی کہ پھر فضاؤں میں لہراتے چند زرد پتے دالان میں آ گرے ۔ رفو کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی ۔

" اُوئی اللہ .. " وہ تلملا کر بولی " بجلی گرپڑے اس منحوس جھاڑ پر ! ایسی آندھی چلے کہ جڑ سے اُکھڑ جائے مُوا .... ! خدا کرے کھڑا سوکھ جائے ! " رفو انگلیوں کے پور پور کڑکڑاتی ہرے بھرے جھاڑ کو کوسنے لگی ۔ اُس کی زبان سے نکلے یہ الفاظ عنیزہ بیگم کے بھی دل کی تسکین کر رہے تھے ۔ ورنہ اُس

معرفت ایم ۔ جی ۔ رحمن ایڈووکیٹ ۔ دھنڈہ بیس ۔ اکولہ 444002 مہاراشٹر

بدکلامی پر وہ رفو کو ضرور بد سپکار دیتیں ۔

پیڑ پودوں سے خود عنیزہ بیگم کو رغبت تھی ۔ مگر پڑوس کے آنگن کا یہ پیڑ .... اُس سے تو انہیں چڑسی ہوگئی تھی ۔ گرمیوں کے موسم میں جب پکی ہوئی نمکولیاں ٹپکتیں اور کبھی کبھار عنیزہ بیگم کے پیروں تلے آکر پٹ سے پھوٹ جاتیں تو پیلے پیلے ننھے سے چھلکوں کے باہر چھوٹی چھوٹی گٹھلیاں اور ان کا مواد دیکھ کر انھیں بڑی کراہیت آتی ۔ یہ نیم کا پیڑ عنیزہ بیگم کے پڑوسی منشی جی کے کچے مکان کے چھوٹے سے صحن میں کھڑا تھا ۔ اور ان کے لئے گویا اک ضد اک چڑ بن گیا تھا ۔ " جانے کیوں یہ چھوٹے لوگ اپنے ڈربے نما گھروں میں ایسے بڑے بڑے پیڑ اُگا نا پسند کرتے ہیں ؟ " وہ اکثر کہتیں ' پت جھڑ کے موسم میں دن بھر زرد پتے آآ کر ان کے وسیع و عریض صاف ستھرے دالان میں گرتے ۔ رفو کے ہاتھ سے جھاڑو نہ چھوٹتی ۔ ایک بھی پتہ آنگن میں پڑا نظر آجاتا تو عنیزہ بیگم رفو پر صلواتیں برسانا شروع کر دیتیں ۔

" موئی ! کلموئی ... آئے دن یہ پُوئی آلسی ہوتی جارہی ہے ۔ سمیٹ یہ پتے ... "

عنیزہ بیگم کے شوہر کو مرے ایک عرصہ گذر گیا تھا ۔ وہ ملٹری میں اچھی پوسٹ پر تھے ۔ معقول تنخواہ ... اُوپر سے سرکاری رعایتیں ... بہت سکھ بھوگا ۔ ہمیشہ اچھا کھایا اچھا پہنا .... کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو ۔ بچپن ہی سے روپے پیسے کی فراغت دیکھی تھی ۔ باپ بھی پولیس آفیسر تھا ۔ شہر شہر گھومیں ' خوب ٹھاٹ باٹ سے رہیں ۔ موج اڑائیں ۔ لیکن قسمت نے دُکھ کے دن بھی دکھائے ۔ صرف ایک بچی پر بیوہ ہوگئیں ۔ مگر بڑی حوصلہ مند عورت تھیں ۔ والدین کثیرالاولاد تھے ۔ چھوٹی بن بیاہی بہنیں ' بھائی بھابی ۔ اُن سب میں رہ کر وہ تعلقات کو اور کشیدہ کرنا نہیں چاہتی تھیں ۔ بڑی ہونے کی وجہ سے والدین کا زیادہ لاڈ پیار اور اعتماد ملا ۔ شوہر بھی ناز برداری کرنے والا تھا ۔ لہذا مزاج میں تکبر اور خودپسندی آجانا فطری بات تھی ۔ سُسرال میں سوائے دو نندوں کے اور کوئی نہ تھا ۔ وہ بھی اپنے اپنے گھروں کی ہوچکی تھیں ۔ بیوگی کے بعد اپنے آبائی شہر میں اپنے سسرال کی حویلی میں آکر بھی تو پوری جوانی اسی جگہ کاٹ دی ۔ سات آٹھ کمروں پر مشتمل پُرانے وقتوں کا خریدا ہوا پختہ اور آرام دہ مکان تھا ۔ عنیزہ بیگم نے مکان کا بڑا حصہ کرائے پر اٹھادیا اور اپنے رہنے کا پچھلا حصہ رکھ لیا ۔ دو کمرے ' ایک چھوٹا سا کچن ' لمبا سا برآمدہ ' اس کے سامنے کشادہ آنگن اور مکان سے ملحق ایک پائیں باغ و حوض ان کے تصرف میں تھا ۔

مکان کے کرائے اور شوہر کی پنشن پر گذر بسر ہورہا تھا ۔ اپنی آن بان کو قائم رکھے ہوئے تھیں ۔ لڑکی کو بھی شان سے کالج میں پڑھا رہی تھیں اور اپنی تنگی بندھی آمدنی میں اُسی طمطراق سے جی رہی تھیں ۔

شوہر کے وقت کا سارا جمع جتھا (زیورات اور روپے پیسے کی صورت میں) بیٹی کے جہیز کے لئے اٹھا رکھا تھا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے اٹھارہ اُنیس سال گذر گئے ۔ خوشنودہ جوان ہو کر قد و قامت میں ماں سے بھی آگے نکل گئی ۔ صحت مند، پرکشش شخصیت والی، سلونی رنگت پر نہین ناک بڑے خوبصورت اس پر سرو سا سراپا ۔ شلوار فراک کا درلیس پہنتی تو اور بھی قیامت بن جاتی ۔ یہ اس کے بی. اے کا آخری سال تھا ۔ اس کے بعد عنیزہ بیگم اُسے پڑھائی سے اُٹھا لینا چاہتی تھیں، اپنی نگرانی میں اُسے سلائی بُنائی اور اُمورِ خانہ داری کی تربیت دے کر جلدی سے اچھی جگہ بیاہ دینا چاہتی تھیں۔

وہ اب اپنے آپ کو عمر سے زیادہ تھکا تھکا محسوس کر رہی تھیں ۔ چالیس پینتالیس کے سن میں ہی ان کے بال سفید ہو گئے تھے ۔ دانت ہلنے لگے تھے اور جسم خمیدہ ہو رہا تھا ۔ ہر چند کہ زیادہ اولاد نہیں تھی ر ایک بچی ہی کی اعلیٰ تعلیم تربیت اور شادی کی فکر انہیں اندر سے کھوکھلا کرتی جا رہی تھی ۔ خود پسند اور خود دار تھیں ۔ ہمیشہ اپنوں اور بیگانوں سے کٹ کر رہیں ۔ پاس پڑوس والوں سے بھی برائے نام اسطہ رکھا تھا ۔ شوہر کی اچانک موت کے غم نے لو کے جھکڑ کی طرح ان کے شگفتہ جوان سراپے کو جھلسا لر رکھ دیا ۔ غم، ذمہ داری اور فکروں کا سارا بوجھ اکیلی جان پر آ گیا ۔

"رفو" مشین کے پائیدان پر پاؤں روک کر عنیزہ بیگم نے لڑکی کو پکارا ۔

"ہوں" چولہے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی ہوئی رفو نے وہیں سے ہنکارا بھرا ۔

"تیرے منھ میں خاک بھوبل" انہوں نے چڑ کر کہا "ہزار مرتبہ کہا آواز دینے پر "جی" کہا کر ز لدر ـــ اب تیرے منھ پر اک تھپیڑ لگاؤں گی"۔ اندر سے رفو کی کوئی آواز نہ آئی تو وہ پھر بولیں

"چولہے میں انڈے کا خول دیا ہے کیا ؟ بساندھ بُو آ رہی ہے"۔

"نہیں خالہ بی" رفو باورچی خانے کے دروازے میں آ کر بولی ۔ "شاید منشی جی کے یہاں جھینگے بھنے جا رہے ہیں ۔ توے پر اُلٹتانی چلانے کی کھڑ کھڑ آواز آ رہی ہے"۔ رفو ہنسنے لگی ۔

عنیزہ بیگم نے ناک پر کپڑا لگایا ۔ وہ مشین پر سے اُٹھ گئیں ۔

"کیڑے مکوڑے بھی بھون کر کھا جاتے ہیں خالہ بیگم یہ لوگ" رفو کھی کھی کر کے دانت نکالتی بولی ۔

"اری چُپ" عنیزہ بیگم کو زور کی اُبکائی آئی ۔ وہ باتھ روم کی طرف بھاگیں ۔ وہاں سے آنے کے بعد انہوں نے فوراً پاندان کا ڈھکن کھول کر لونگ اور چھالیہ منھ میں ڈالی اور باغ کی طرف ہو لیں ۔ جاتے جاتے رفو سے کہہ گئیں ۔

"آٹا گوندھ کر رکھ ۔ خوشنودہ کالج سے آتی ہی ہو گی ۔ اُسے تازہ پُھلکے سینک کر دینا"۔

وہ اپنے باغ کی دیکھ ریکھ بڑے چاؤ سے کرتیں ۔ پتہ پتہ اور کونپل کونپل پر دھیان دیتیں ۔ کھاد

پانی، روشوں کی صفائی، فاضل گھانس اکھاڑنا، سب کچھ بڑی محنت اور لگن سے کرتیں۔ نوکر چاکر تو تھے نہیں۔ اللہ آمین کی بس اک لڑکی۔ گئی گذری شان و شوکت کا سارا دارومدار بس اسی پر تھا۔ کھانے بھر کی سبزی ترکاری وہ اپنے اسی باغ سے اُگا لیتی تھیں۔ مگر باغ میں اب وہ پہلی سی رونق اور دل کشی نہ تھی۔ فوارے سوکھے پڑے تھے۔ اس کے آرزو اور ارمانوں کی طرح۔ حوض میں پانی ہی نہیں تھا۔ ماضی کی یادگار اک چمپے کا پیڑ، شہتوت، جامن اور امرود کے چند پیڑ تھے۔ جب ان پر پھل آتے تو طوطے، گلہریاں اور چڑیاں خوب چہکارتیں۔ جوہی، چنبیلی اور موتیا کے منڈوے تھے۔ گلاب ہر رنگ کے اور کچھ موسمی پھول۔

ہوا کے دوش پر اٹھلاتے چند زرد پتے عنیزہ بیگم کے سفید کالے کھچڑی بالوں میں آکر اٹک گئے۔ کسی زمانے میں باغ کے اس نکہت بار کنج میں بیٹھ کر عنیزہ بیگم کے شوہر نے ان کی حسین عنبریں زلفوں میں بیلا چنبیلی اور گلاب کے پھول لگائے تھے۔ لیکن اب . . . ! بدلتے زمانے کے ساتھ کڑوے کسیلے جھاڑ کے خزاں رسیدہ پتے اس کے خزاں زدہ بالوں میں آکر الجھ رہے تھے۔ وہ جھنجھلا اٹھی۔ پتوں کو نکالتے نکالتے اس کے بالوں کی ایک لٹ جھلاہٹ میں اس کی ہی چٹکی میں آکر کھنچ گئی۔ ہلکے سے درد کا احساس ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ احساس تو اس پیڑ کا وجود تھا جو ٹنڈ منڈ شاخوں کو لئے ٹھونٹھ کھڑا صبح شام اُسے پتوں کی سوغات دیتا رہتا تھا۔

"ایسے بے معرف پیڑ لگا کر دوسروں کو دکھ دینا کیسی جہالت ہے!" وہ بڑبڑاتی ہوئی پلٹیں کچھ سبزیاں توڑ رکھی تھیں، انہیں سمیٹا۔

دالان ابھی پاؤں دھرا ہی تھا کہ کمرے سے زور زور سے باتوں کی آواز آئی۔ سبزیوں کو باورچی خانے میں دھرا۔ جونہی کمرے میں داخل ہوئیں لق و دق ہو کر رہ گئیں۔ ان کے قیمتی نفیس قالین پر گاؤ تکئے کے سہارے منشی جی کی بیوی پاؤں پسارے بیٹھی تھیں اور رفو ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ خوشنود وہ بھی کالج سے آگئی تھی۔ اور وہ بھی منشی جی کی بیوی سے بڑی خوش خلقی سے پیش آرہی تھی۔ عنیزہ بیگم کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسی جلتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کہ رفو سٹپٹا گئی۔

"کچن کے کواڑ کھلے چھوڑ کر یہاں آن مری!" وہ رفو سے بولیں۔

رفو بھاگی۔ منشی جی کی بیگم نے بڑے احترام سے عنیزہ بیگم کو سلام کیا۔ انہوں نے آنکھ کے اشارے سے جواب دیا۔ دل میں تو نفرت کے کوندے لپک رہے تھے۔

"اچھا اب چلتی ہوں" عنیزہ بیگم کے انداز اور تیور دیکھ کر منشی جی کی بیوی کھڑی ہوگئیں۔

"ذرا سلمان کا خط پڑھوانے" خوشنود وہ بیٹی کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ عنیزہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

بیٹے کے نام کے ساتھ منشی جی کی عورت کے لب و رخسار پر خوشی کے گلاب کھل اٹھے ۔ عنیزہ بیگم کے ذہن
میں دوپہر کی گرم ہواؤں سے تیز جھکڑ سائیں سائیں کرنے لگے ۔ اس کے جانے کے بعد وہ رفو پر
بہت برہم ہوئیں ۔

" تو نے اس اجڈ گنوار عورت کو میرے نفیس قالین پر بٹھا دیا ! "

" تو کیا ہوا امی "۔ ماں کے اعتراض کے جواب میں خوشنودہ بولی ۔ انہیں بڑا اچرکہ لگا جل بھن کر بولیں ۔

" آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیوں کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے ۔ چھوٹا بڑا ، اونچ نیچ ، ذات پات
سی چیز کی تمیز نہ رہی ان میں ۔ میں نے زندگی بھر ایسے لوگوں سے یارانہ نہیں رکھا ۔ بھلا ان کا
ہمارا کیا میل ۔ خدائی مار ایسے لوگوں پر ... اُسے اتنی تمکنت سے اپنے کمرے میں بیٹھا دیکھ کر میرا تو
خون کھول اٹھا ۔ بیٹا عرب کیا چلا گیا ہے اپنے آپ کو نواب زادی سمجھنے لگی ہے .. ہونہہ .. بھلا
چار پیسے آجانے سے بھی کہیں انسان کی اوقات بدلتی ہے ؟ " وہ بڑبڑائی ۔

" اب کلھیا سا منھ لئے میرے سامنے کیا کھڑی ہے " وہ رفو پر دھاڑیں ۔ " بدبخت لونڈیا "

چاول کو سوپ میں پھٹکتے ہوئے رفو نے عنیزہ بیگم سے کہا

" خالہ بی ۔ چاول خراب ہو رہے ہیں ۔ اس کی کوٹھی میں نیم کے پتے ڈالنا پڑیں گے "

" اچھا ... ! مگر ... " ، عنیزہ بیگم سوچتے ہوئے بولیں ۔

" میں آج ہی منشی جی کے گھر سے پتے توڑ کر لاؤں گی " رفو بات کاٹ کر جلدی سے بولی

" نہیں ... ! " عنیزہ بیگم سختی سے بولیں ۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگیں " کیا ہم اس
حقیر پتے کے لئے ان کی دہلیز پر سوالی اور ضرورت مند بن کر جائیں گے ؟

" بلا سے سارے چاول خراب و ستیا ناس ہو جائیں ... " وہ رفو کو گھورتی ہوئی بولیں ۔

ایک دن خوشنودہ کو منشی جی کے گھر سے نکلتی دیکھ کر عنیزہ بیگم کی سانس گویا حلق میں اٹک
کر رہ گئی ۔ بچی جوان ہو گئی تھی ۔ اب وہ اس پر غیض و غضب کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں ۔ پھر بھی
ان کے لہجے سے برہمی عیاں تھی ۔

" کیوں ؟ " اس مختصر سوال کا مطلب منشی جی کے گھر جانے کی وجہ دریافت کرنا تھا ۔

" سلمان کا خط آیا ہے " ماں کے اس " کیوں " کا مفہوم سمجھ کر خوشنودہ نے صاف دلی سے کہا ۔

" تو ... ! " عنیزہ بیگم کی تیوریاں شکن آلود ہو گئیں ۔ " خط پڑھوانے کے لئے

اس نے تمہیں اپنے گھر بلوایا ؟"

"نہیں ممی ! دراصل .... میں ... یونہی چلی گئی تھی ...." ماں کی برہمی دیکھ کر خوشنودہ بوکھلا گئی ۔ "سلمان نے ہم سب کی خیریت پچھوائی ہے ممی " وہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے قدرے مسکرا کر بولی ۔ " ا۔ چھا ... ! " وہ سر کو ہلاتی ہوئی دانت پیس کر بولیں " اب وہ لونڈا اپنے آپ کو اس قابل سمجھنے لگا ہے کہ ہماری خیریت دریافت کرے "۔

سلمان ہر مہینہ تین چار ہزار روپے والدین کو بھیج رہا تھا ۔ روپے پیسے کی فراوانی نے ان میاں بیوی کو جیسے جوان کر دیا ۔ زمین و جائداد خریدی جا رہی تھی ۔ سامانِ عیش و عشرت بڑھایا جا رہا تھا ۔ گھر میں کام کاج کے لئے اک بڑھیا ، بازار سے سودا سلف لانے کے لئے اک لونڈا بھی رکھ لیا گیا تھا ۔ منشی جی کے خشک جھریوں دار چہرے پر دولت کی چمک نظر آنے لگی تھی ۔ اب ان کی بیگم بھی سفید براق سے ملبوسات پہنے شہر کے بڑے بڑے ذی حیثیت گھرانوں میں میل ملاپ بڑھا رہی تھیں ۔ یہ سب دیکھ کر عنیزہ بیگم کے کلیجے پر جیسے کوئی گھونسے مار تا تھا ۔ مکان کے کھنڈر کو حویلی میں تبدیل کرنے کے بھی منصوبے بن رہے تھے ۔ صرف اس بات سے عنیزہ بیگم نے اطمینان کا سانس لیا کہ مکان کی کچی دیواریں جب لمبی فصیل میں بدل جائیں گی تو وہ نیم کا پیڑ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا ۔

وہ زمین گوڑ رہی تھیں کا کوئی سخت سی چیز ان کی درانتی میں آکر اٹک گئی ۔ انہوں نے مٹی ہٹا کر دیکھا ۔ سفید موٹی سی جڑ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی زمین کے اندر ہی اندر منشی جی کے گھر کی حدود پار کر کے ان کے باغ میں چلی آئی تھی .... یہ وہی کڑوے کسیلے نیم کے درخت کی جڑیں تھیں ۔ عنیزہ بیگم نے اپنی پوری قوت لگا کر اُسے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی ۔ صبح سے دوپہر ہو گئی ۔ پورا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا ۔ جسم کی طاقت نے جواب دے دیا ۔ درانتی چلاتے چلاتے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے ۔ مگر پھر بھی وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکیں ۔

ایک دن ڈرتے ڈرتے منشی جی کی بیگم نے سلمان کے لئے خوشنودہ کا رشتہ مانگ ہی لیا ۔
" میرا سلمان خوشنودہ کو بہت پسند کرتا ہے "
عنیزہ بیگم کو یوں محسوس ہوا جیسے منشی جی کی بیگم نے ان پر کیچڑ اچھال دیا ہے ۔ یا ان کے بدن پر لپٹی شرافت اور وضع داری کی بوسیدہ پوشاک کو تار تار کر دیا ہے ۔ اور اپنی اس بے عزتی کا

بدلہ لینے کے لئے انہوں نے گویا منشی جی کی بیوی کا منہ نوچ لیا۔

" روپے پیسے کے زعم میں آ کر تم یہ بھول گئیں کہ تاج صرف شاہوں کے سروں کیلئے ہوتے ہیں "

اور بے چاری منشی جی کی سیدھی سادھی عورت عنیزہ بیگم کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

بی۔اے کرنے کے بعد خوشنودہ کا ایک اچھی جگہ رشتہ طے ہو گیا۔ منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مگر اس کے تیسرے چوتھے دن ہی حادثہ ہو گیا۔ کھانا بناتے بناتے اچانک ہی آگ نے خوشنودہ کی اوڑھنی کو چھو لیا۔ اور پھر.... وہ تو خیر گذری کہ وہ زندہ بچ گئی۔ لیکن آگ سے بڑی طرح جھلس گئی تھی۔ اس حادثے سے عنیزہ بیگم حواس باختہ ہو گئیں۔ نیند، چین، کھانا پینا سب ان کے لئے حرام ہو گیا۔ وہ اپنی بیٹی کے لئے پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔ اس موقعہ پر منشی جی اور ان کی بیوی نے پورا حق ہمسایہ ادا کیا۔ ماں کی لگاتار دعاؤں کے صلہ میں خوشنودہ کو نئی زندگی تو عطا ہوئی مگر اب اس کے حسن کا چاند داغ دار ہو گیا تھا۔ اسی لئے اس کی منگنی ٹوٹ گئی۔ اس صدمے نے عنیزہ بیگم کو جیسے ریزہ ریزہ کر دیا ۔۔۔ اور خوشنودہ! وہ بدنصیب لڑکی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔

" میرا چہرہ، میرا حلیہ دیکھ کر دنیا والے مجھ سے نفرت کر رہے ہیں۔ آپ نے مجھے کیوں بچایا۔ اتنی دعائیں کر کے.... کس لئے؟ مجھے مرجانے دیا ہوتا ۔۔۔ میں زندگی بھر اک بیوہ بے بس ماں پر بوجھ بن کر رہوں گی "

اسی وقت دروازے کا پردہ اٹھا۔ اور منشی جی اور سلمان میاں اندر داخل ہوئے۔

"چچی بیگم..." عنیزہ بیگم کو سلام کرنے کے بعد سلمان بولا " خوشنودہ کے جلنے کی خبر بمشکل چھٹی نکال کر آیا ہوں...." پھر وہ خوشنودہ کے بیڈ کی طرف بڑھا۔

منشی جی کی بیگم نے عنیزہ بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا،

"میں جانتی ہوں آپ کو خوشنودہ بٹیا کا رشتہ ٹوٹنے کا غم ہے۔ فکر مند کیوں ہوتی ہو...."

" اسی ڈائن کی نظر نے میری بچی کے رنگ روپ کو کھا لیا " عنیزہ بیگم دل ہی دل میں بولیں اور اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے سرکا کر خشونت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

" دلگیر کیوں ہوتی ہو بہن" منشی جی کی بیوی پھر بولیں " پسلی کے جوڑے تو اللہ تعالیٰ بناتا ہے۔ محض ہمارے اقرار یا انکار کرنے سے کیا ہوتا ہے "

" خوشنودہ" سلمان اس کے بازو بیٹھتا ہوا بولا " حوصلے سے کام لو۔ میں تمہارے جا

اچھی طرح سمجھتا ہوں ۔۔۔۔ سب کچھ بھول جاؤ اور اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو ۔ ایک تمہیں اک ضعیف ماں کا بوجھ بن کر نہیں بلکہ میری شریکِ حیات بن کر زندہ رہنا ہے ۔"

" سلمان ! کیا تم سچ کہہ رہے ہو ؟" خوشنودہ بے یقینی سے بولی ۔

" ہاں خوشنودہ ! محبت لازوال جذبہ ہے جو صرف روح سے تعلق رکھتا ہے ۔ جسم سے نہیں ۔ اور مجھے تم سے ایسی ہی لازوال محبت ہے ۔ سچ پوچھو تو اپنے آپ کو تمہارے قابل بنانے کے لئے ہی میں نے اتنی لمبی پرواز کی تھی ۔ میں نے تمہارے لئے اس مالکِ حقیقی کے آگے دامنِ اُمید پھیلایا تھا جس نے مجھے ثمر بار کیا ۔"

" سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو سلمان "

" فیصلہ تو صرف تقدیر کرتی ہے خوشنودہ ! جو ازل ہی سے ہو جاتا ہے ۔ یوں سمجھو کہ عمل کی گھڑی اب آئی ہے ۔۔۔ اٹھو چلو ۔۔۔"

گھر میں قدم رکھتے ہی عنیزہ بیگم نے رفو کو پکارا ۔

" سلمان میاں اور ان کی امی جان کے لئے لیموں کا برف ملا شربت تو بنا لا ۔"

" جی ۔۔۔" رفو جیسے چونک گئی ۔

پھر اس نے دیکھا خوشنودہ بی بی کو منشی جی کی بیگم اپنے بازوؤں کا سہارا دیئے گھر میں لا رہی ہیں اور سلمان میاں سامان لئے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ۔۔۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی ان لوگوں کو اور کبھی عنیزہ بیگم کو دیکھنے لگی ۔

" یوں کلہیا کا منہ بنائے کیا دیکھ رہی ہے ۔۔۔ جا جلدی شربت بنا لا ۔" پھر وہ وہیں دالان میں ستون کا ٹیک لگائے بیٹھ گئیں جیسے اپنی منزل پر پہنچ گئی ہوں ۔

پت جھڑ کے بعد نیم کے پیڑ پر ننھے ننھے سبزی مائل قرمزی پتے نکل آئے تھے ۔ ہوا سے پیڑ کی شاخیں جھول رہی تھیں ۔

اور عنیزہ بیگم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ان کے زخم پر پنکھا جھل رہا ہے ۔

عدو کی سرکشی موقوف ہو جاتی ہے احساں سے
یہ ہے وہ بوجھ بھاری جو جھکا دیتا ہے گردن کو

عابدہ رضانہ

خاموشیاں بھی بولتی ہیں

فردوس اپنی عم زاد بہن جمیلہ کی شادی پر اُن کے گھر آئی ہوئی تھی۔ آج شادی کے ہنگاموں کا اصل دن یعنی بارات کا دن تھا۔ تقریباً سارا خاندان جمیلہ کے گھر پر جمع ہو چکا تھا۔ ہر طرف ماحول پر خوشیاں محیط تھیں۔ لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے ہنسی مذاق گپ شپ کر رہے تھے۔ لڑکیاں بالیاں اپنے زرکار رنگین دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ سمن، یاسمین، کلثوم، مینا وغیرہ اپنی سہیلی جمیلہ کو گھیرے بیٹھی گپ شپ کر رہی تھیں۔ اور اس کو بات بات پر چھیڑ رہی تھیں۔ لیکن فردوس ان سب رونقوں سے دور ایک تاریک گوشے میں دیوار کی جالی کو مضبوطی سے تھامے خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ نجانے فردوس یوں ہی گم صم کب تک کھڑی رہی۔ لیکن یاسمین کے آجانے سے اس کے خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ یاسمین فردوس کو یوں تاریکی میں تنہا پاکر بے چین ہو اٹھی اور ہاتھ بڑھا کر لائٹ کا بٹن دبا دی۔ اچانک ورانڈہ روشن ہو گیا۔ فردوس سفید شرارے شرٹ اور سفید سلمی کناری سے جگ مگ کرتے دوپٹے اور جڑاؤ زیور میں اور بھی پُروقار معلوم ہو رہی تھی۔ یاسمین اس کے حسن سے کسی حد تک مرعوب ہو گئی اور دھیمی آواز میں کہنے لگی،

"فردوس تم اس طرح سب سے دور دور تنہا کیوں رہتی ہو؟ اور خاموشی تو گویا تمہاری شخصیت کا ایک اہم جز بن چکی ہے۔ تم ہمیشہ اس طرح الجھی الجھی سی خاموش کیوں رہتی ہو؟ کبھی تو کچھ بولا کرو۔"

فردوس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"کیا بولوں یاسمین، تم سب میری زبان سے کیا سننا چاہتے ہو؟ میں جو کہنا اور سمجھانا چاہتی ہوں وہ تم لوگ کبھی نہیں سمجھ پاؤ گے۔ یاسمین کبھی تم نے خاموشیوں کو بولتے ہوئے سنا ہے۔

ایم اے سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد۔ گولڈن تھریشولڈ۔ حیدرآباد۔

خاموشیوں کی بھی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ وہ بھی اکثر بولتی ہیں۔ ہاں ہاں میری بات کا یقین کرو، بولتی ہیں۔ لیکن ہر وقت نہیں بولا کرتیں۔ بلکہ خاموشیاں اس وقت بولنے لگتی ہیں جب انسان اپنے حالات اور تفکرات سے نڈھال ہو کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اُس پر ایک طرح کا سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ بولنا چاہتا ہے، سمجھانا چاہتا ہے۔ اپنی محرومیاں اور مجبوریاں بیان کر کے دوسروں کی محبت پانا چاہتا ہے۔ لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ ہونٹوں تک آتے آتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور وہ بالکل میری طرح خاموش ہو جاتا ہے"۔

یاسمین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ " افوہ، فردوس حد ہے بھئی۔ تم تو دن بہ دن فلسفی بنتی جارہی ہو۔ خیر، تم خاموشیوں کی زبان سمجھتی رہو، میں تو اب چلی۔ کچھ ہی دیر میں بارات آنے والی ہے"۔ اور وہ چلی گئی۔

فردوس حسرت بھری نگاہوں سے یاسمین کو جاتے ہوئے دیکھ کر سوچنے لگی۔ یہ بھی مجھ کو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ خیر جانے دو۔ اس کے رہنے یا نہ رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ رہی بھی تو میرے دل کی بات سمجھ نہیں پائے گی۔ ایک اُسی کا کیا ذکر۔ سچ دیکھا جائے تو میری اب تک کی پوری زندگی میں کسی نے مجھ کو سوائے پروفیسر رازداں کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ لوگوں نے مجھ کو کسی حد تک سمجھا بھی تو غلط۔ لیکن اس وقت یہ پروفیسر رازداں کہاں سے ٹپک پڑے۔ اُف، یاسمین تو چھیڑ کر چلی گئی، لیکن جاتے جاتے مجھ کو ماضی کے جان لیوا گرداب میں ڈھکیل کر چلی گئی۔ ماضی کا ایک ایک واقعہ پھر سے میرے ذہن کے پردے پر منعکس ہو رہا ہے۔ اُف خدایا! یہ یادیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ ہم ان سے لاکھ پیچھا چھڑانا چاہیں لیکن یہ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ فردوس اپنا سر جھٹکنے لگی۔ تاکہ وہ ماضی اور پروفیسر رازداں کو بھلا سکے لیکن اس کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے اطراف خاموشیاں پھر سے بولنے لگی ہوں۔ سوچنے لگی خاموشیوں کے ساتھ تو ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ صرف بولنا جانتی ہیں سمجھنا نہیں۔ اور مجھ کو سننے سے زیادہ کچھ سمجھانے کی خواہش ہے۔ میں اپنے دل کی بات کسی کو سمجھانا چاہتی ہوں۔ کھل کر کچھ بولنا چاہتی ہوں۔ رونا چاہتی ہوں۔ کہ میرے دل کا سارا غبار دھل جائے۔ پتہ نہیں یہ خواہش میرے دل میں کب اور کیسے پیدا ہوئی۔ ہاں مجھ کو اتنا یاد ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میری یہی ایک شدید خواہش رہی ہے کہ میں اپنے دل کی بات کسی کو سمجھا سکوں۔ اور جب میں باوجود کوشش کے سمجھا نہیں پاتی ہوں تو پھر سے میرے ہونٹوں پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ اور میں خاموش کھڑی گھنٹوں کائنات کے ذرّے ذرّے کو بولتا"

سننے لگتی ہوں اور قدرت کے اسرار آپ ہی آپ مجھ پر کھلنے لگتے ہیں ۔ شاید مجھ پر زندگی میں پہلی بار خاموشی کا دورہ اس وقت پڑا تھا جب کہ میری ماں اور باپ کے درمیان آنا و خودداری کا جھگڑا شروع ہوا تھا ۔ کچھ عرصہ بعد دونوں کے درمیان فیصلہ ہوگیا کہ وہ دونوں اپنی اپنی انا کی حفاظت کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ رہ کر زندگی بسر کریں گے ۔ اور دونوں نے ایسا فیصلہ کرتے وقت ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ اس فیصلہ کا بچوں کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا ـــ ؟ پندرہ دن بعد جب میری ماں اپنے ساتھ میرے علاوہ اور دونوں بڑے بھائیوں کو لے کر شہر آنے لگیں تو میرے والد نے مجھ کو بلا کر پوچھا تھا " بولو بیٹی تم کس کے ساتھ رہوگی ؟" میں کہنا چاہتی تھی کہ آپ دونوں ہی کے ساتھ ـــ مگر پتہ نہیں کیوں میں نہیں بول پائی ۔ زندگی میں پہلی بار الفاظ میری زبان کا ساتھ دینے سے انکار کر دئے ۔ اور میں ماں کے کھونٹے سے صرف اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھ کر ماں کے ساتھ شہر چلی آئی ۔ یہاں آنے کے بعد میری تعلیم کا سلسلہ ازسرنو شروع ہوگیا ۔ اور میں تعلیمی مدارج ایک کے بعد ایک طے کرتی رہی ۔ لیکن میں ہر دم ہر پل اپنے باپ کی کمی کو شدت سے محسوس کیا کرتی تھی ۔ جب سے میں اپنے باپ کو چھوڑ کر آئی تھی میری زندگی میں ایک خلاء پیدا ہوچکا تھا ۔ اور ہونٹوں پر خاموشی کے تالے پڑ چکے تھے ـــ لیکن وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے ۔ میں آہستہ آہستہ باپ کی کمی سے پیدا ہونے والے خلاء کو اپنے بھائی کی محبت سے پُر کرنے لگی ۔ ہم دونوں بیٹھ کر گھنٹوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہنستے کھلکھلاتے ـــ اور جب میرے والد کچھ عرصہ کے لیے شہر آجاتے تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا ۔ میری ماں اور باپ کے درمیان سماجی اور مذہبی بندھن علیحدگی کے باوجود بھی قائم تھا ـــ وہ دونوں صرف ایک دوسرے کو ذہنی طور پر قبول کرنے سے انکار کر چکے تھے ۔ میں چاہتی تھی کہ جب تک میرے والد میرے پاس رہیں اُن سے خوب دل کھول کر باتیں کروں ۔ لیکن میرے باپ کے آتے ہی گھر کی فضاء کچھ ایسی بوجھل ہوجاتی تھی کہ ہر طرف ایک تناؤ سا محسوس ہونے لگتا اور میں اس تناؤ کے بوجھ تلے دبتی چلی جاتی ۔ اور میری زبان پر پھر سے خاموشیوں کے تالے پڑ جاتے ۔ پھر اسی تناؤ کی کیفیت میں میرے والد اپنے مقام پر لوٹ جاتے اور میں تنہا رہ جاتی ۔ خیر جیسے تیسے زندگی کے دن گذر رہے تھے ۔ لیکن آہستہ آہستہ میرے والد آتے جاتے میرے چہیتے بھائی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے ہموار کرتے رہے ۔ اور آخرکار ایک دن وہ بھی میرے باپ کے ساتھ مجھ کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا ۔ شاید اس طرح میرے والد میری والدہ سے انتقام لینا چاہتے تھے ۔ لیکن انجانے میں وہ مجھ سے انتقام لے بیٹھے ۔

تب میں پھر ایک بار خاموش ہوگئی بالکل ساکت ۔ ماں نے میرے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا ۔ بولنے پر اکسایا ــــ لیکن میں کچھ بھی نہیں بول پائی ۔ مجھ کو اپنی ماں سے شدید نفرت ہوچکی تھی ۔ میری ماں ایک عجیب فطرت کی مالک تھیں ۔ وہ ہر حال میں خوش اور مطمئن رہ سکتی تھیں ۔ میرے بھائی کے چلے جانے کا ان پر تو کوئی خاص اثر نہیں ہوا ۔ لیکن میں بالکل ٹوٹ گئی ۔ پھر اس طرح خاموشیوں میں ڈوبے ہوئے دن گذرتے رہے ــــ اور میں یونیورسٹی کی سطح تک پہنچ گئی یہاں آکر بھی مجھ کو کوئی ہم مزاج نہ مل سکا اور میں بہل نہ سکی ۔ بدستور میرے ہونٹوں پر خاموشی کے تالے پڑے رہے ۔ اور دل کسی کو کچھ سمجھانے کے لئے بے چین ۔ اور جب بے چینی اپنی حدود کو پار کرجاتی تو میں کاغذوں کو سیاہ کرنا شروع کردیتی ۔ ابتدا میں میں ان سیاہ صفحات کو ڈائری کے اوراق پر محمول کرلیا کرتی تھی ۔ لیکن یہی سیاہ صفحات آہستہ آہستہ کہانیوں میں تبدیل ہونے لگے ۔ اور ایک دن میری ایک کہانی کسی لڑکی کے ہاتھ لگ گئی ۔ کہانی پڑھنے کے بعد اس نے کہا " تم تو بہت اچھی کہانیاں لکھتی ہو ۔ اسی فیلڈ کو کیوں نہیں اپنالیتیں " ۔ اور میں واقعی باضابطہ کہانیاں لکھنے لگی ۔ جب بھی میرے دل کا درد ہوک بن کر اٹھنے لگتا اور میرے اندر کا خلاء تکمیل کے تقاضے شروع کردیتا تو میں اپنے وجود کی ساری محرومیوں کو کاغذات پر بکھیر دیتی ــ تب ہی اچانک میرے اطراف کی خاموشیاں بولنے لگتیں اور سرگوشیوں میں نہ جانے کتنے ہی اسرار اور سماج کی گتھیوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش میں کہانی کا روپ دے دیتیں ــــ پھر میری کہانیاں آہستہ آہستہ ادبی حلقوں تک پہنچ گئیں ۔ اور ان پر نقادوں کی نظریں پڑنے لگیں ۔ مگر مجھے نہ تو کسی صلہ کی تمنا تھی اور نہ ستائش کی آرزو ــــ جو خود زخم خوردہ ہو اس کو ان باتوں کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے ۔ بس کچھ سمجھانے کا جذبہ تھا جس میں بہی چلی جارہی تھی ۔ وقتی طور پر ہی سہی لیکن میں اس طرح بہت حد تک بہل گئی ۔ لیکن ہونٹوں پر اب بھی بدستور خاموشیوں کے تالے پڑے رہتے تھے ۔

میں یونیورسٹی سے گھر جانے کے بعد اپنے آپ کو کمرے میں مقید کردیتی ۔ تاکہ مجھ کو اپنی ماں کی پرچھائیاں نظر نہ آئیں ۔ اور میں ان سے نفرت کا اظہار نہ کر بیٹھوں ۔ میں نے اپنی ماں کی آخری سانسیں ٹوٹنے تک بھی ان کا احترام کیا ، ان کی ہر خواہش میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی ۔ اور میں اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے ان کا احترام بھی کیا کرتی تھی ۔ لیکن پھر بھی میں آخر دم تک اپنی نفرت کو جو مجھ کو ان سے تھی نہ مٹا سکی ۔ میرے اور ان کے درمیان بہت طویل فاصلے پیدا ہوچکے تھے ۔ لیکن کبھی کبھی شدت سے جی چاہتا تھا کہ جاکر اپنی ماں کے سینے سے لپٹ جاؤں اور رو رو کر اپنے دل کی وہ ساری باتیں جو میں ایک عرصے سے کسی کو سمجھانا چاہتی ہوں ان کو سمجھادوں ۔ لیکن میرے

قدم اس خیال سے رک جاتے تھے کہ میری ماں ان سب باتوں کو سمجھ نہیں پائے گی جن کو میں سمجھانا چاہتی ہوں۔ وہ ایک نارمل عورت تھیں۔ اور اُن کا لگا بندھا معمول صبح اٹھتے ہی نماز، نماز کے بعد چولہے کا کام۔ پھر نماز وظائف اور شام میں تھوڑی سی کوئی تفریح اور رات کو پُرسکون نیند ـــــ بس یہی چکر برسوں سے چل رہا تھا۔ اور ان کے برخلاف میں ایک ایب نارمل لڑکی تھی۔ بچپن ہی سے میرے حالات نے مجھ کو نفسیاتی الجھنوں میں الجھا دیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کبھی اپنی ذات سے باہر نکل کر میرے دکھوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن وہ کبھی بھی ایسا نہیں کرسکیں۔ انھوں نے ایک دن بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ تم اس طرح خاموش کیوں رہتی ہو؟ کچھ بولو، کچھ بتاؤ ـــ نہیں۔ یہ جملہ وہ کبھی نہیں کہہ سکتیں۔ مگر یونیورسٹی میں پروفیسر رازداں میرے دل کی اس بات کو کسی حد تک سمجھ چکے تھے۔ رازداں ہم کو شیکسپیئر پڑھایا کرتے تھے۔ وہ ہر روز کلاس میں مجھ سے ایک ہی بات کہتے۔ تم کچھ بولا کرو۔ اس طرح خاموش کیوں رہتی ہو؟ تب میں چونک کر اُن کی طرف اس طرح دیکھنے لگتی جیسے میں ان کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کچھ ہی دنوں میں مجھ کو پروفیسر رازداں کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ وہ باتیں جن کو میں برسوں سے کسی کو سمجھانا چاہتی ہوں، اُن باتوں کو سمجھنے کی ان میں اہلیت ہے۔ کیوں کہ وہ خود بھی اسی طرح کی فلسفیانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی پڑھاتے پڑھاتے کہتے " آپ لوگوں نے محسوس کیا کہ کبھی کبھی ہم لوگوں کے بیچ بیٹھ کر بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ تمام لوگ جو ہمارے اطراف موجود ہیں یہ سب انسان نہیں تصویریں ہیں اور ظاہر ہے کہ تصویریں بولنا اور سمجھنا نہیں جانتیں"۔ اور میں ان ساری باتوں کو سن کر مسحور ہو جاتی کیوں کہ میں خود بھی برسوں سے یہی کہنا چاہتی تھی کہ میں بہت عرصے سے اس دنیا کی آرٹ گیلری میں تنہا گھوم رہی ہوں۔ کسی انسان کی تلاش میں تاکہ میں اس کو اپنے دل کا درد اور کسک دکھا سکوں۔ اور جب مجھ کو پروفیسر رازداں کی صورت میں ایک انسان نظر آیا تو پھر سے میری زبان کے تالے ٹوٹنے لگے۔ اور میں نے پروفیسر رازداں کی ذاتیات میں ان کی نیک نامی بدنامی پر غور کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ وہ ساری باتیں جن کو میں آج تک کسی کو نہیں سمجھا پائی وہ پروفیسر رازداں کو سمجھا دوں۔ اُن سے ایک انسان۔ ایک شاگرد کے ناطے گھنٹوں بیٹھ کر فن و ادب کی، درد و کسک کی باتیں کروں۔ لیکن میں تب بھی ایسا نہیں کرسکی کیوں کہ مجھ پر دوسروں سے زیادہ سماج کے پہرے اور نظریں لگی ہوئی تھیں۔ میں کس کس سمجھا پاتی کہ تم لوگ عورت مرد کے پیمانوں سے انسانوں کو ناپنا چھوڑ دو۔ پروفیسر رازداں

صرف ایک انسان ہیں اور میں بھی ایک انسان ہوں، صرف انسان۔ نہ عورت نہ مرد۔ میں وہ اپنے وجود کے خلاء کو پُر کرنے کے لئے اور اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کی بقاء کے لئے اُن سے کچھ سمجھنا چاہتی ہوں اُن کو کچھ سمجھانا چاہتی ہوں۔ مگر مصیبت تو یہی تھی کہ لوگ شروع ہی سے میری زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ نتیجتاً لوگوں کی مشکوک نگاہوں کے جواب میں میں پھر ایک بار خاموش ہوگئی بالکل ساکت۔ اور میرے خاموش ہوتے ہی خاموشیوں نے اپنا کام شروع کردیا۔ وہ بولتے رہے اور میں سمجھتی رہی۔ کئی بار میری زبان کے تالے کچھ دنغمہ کے لئے ٹوٹے اور میرے وجود کو بکھیر کر ایک اور بازی ہرا کر پھر سے میرے ہونٹوں پر پڑ گئے۔ اور اب یونیورسٹی کو چھوڑے ہوئے پورے چھ برس بیت چکے ہیں۔

تب سے اب تک میں خاموش ہوں اور صرف سمجھ رہی ہوں۔ بول نہیں سکتی۔ ہونٹوں پر حالات وسماج کے پہرے ہیں۔ میں ہوں میری تنہائی ہے۔ میں نجانے کب سے اس آرٹ گیلری میں کھڑی تصویروں کو دیکھ رہی ہوں۔ ان کو سمجھنے کی کوشش کررہی ہوں، ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کررہی ہوں۔ پتہ نہیں زندگی میں کبھی یہ سب کچھ ہو بھی پائے گا یا نہیں۔ اور ادھر سناٹے پھر سے بولنے لگے ہیں۔ خاموشیاں سرگوشیاں کررہی ہیں۔ اور میں ان کی آواز کو سُن کر سمجھ رہی ہوں۔ ہاں صرف میں سُن سکتی ہوں، سوچ سکتی ہوں، سمجھ سکتی ہوں ــ ہمیشہ سمجھتی رہوں گی۔ صرف اس امید پر کہ شاید زندگی کے کسی موڑ پر مجھ کو اس آرٹ گیلری میں کوئی انسان پھر مل جائے جو میری تخلیقات کو سمجھ سکے۔ اور وہ دن میری زندگی کا سب سے حسین ترین دن ہوگا۔ اُس دن میں اپنی ساری تخلیقات اس کے حوالے کرکے اس سے دستخط کرواؤں گی کہ وہ نہ تو عورت ہے نہ مرد۔ وہ صرف ایک صاحب فہم انسان ہے صرف انسان

فردوس سوچتے سوچتے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ پتہ نہیں کبھی مجھ کو کوئی انسان مل بھی پائے گا یا نہیں؟

پیچھے سے اس کی ملازمہ اس کا کندھا ہلانے لگی۔ "بی بی جی۔ کب تک یوں ہی کھڑی رہوگی۔ بارات چلی گئی۔ چلئے اب ہم بھی گھر چلیں"۔ اور فردوس اپنے آنسوؤں کو مسلتے ہوئے ملازمہ کے ساتھ چل پڑی۔

غزلیں

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشاؔ

ہمارے زخموں کی تنویر کچھ عجیب سی ہے
یہ چاندنی - یہ طباشیر کچھ عجیب سی ہے

مذاقِ غم ہے ہمارا بڑا تعجب خیز
ہماری درد کی جاگیر کچھ عجیب سی ہے

ہجومِ رنج کو ہم کہتے ہیں نشاطِ حیات
ہماری باتوں کی تفسیر کچھ عجیب سی ہے

نہیں ہے غنچہ و گل پہ ابھی خصوصی نکھار
ابھی بہار کی تصویر کچھ عجیب سی ہے

ہے جان و دل پہ عجب رنگِ یاس چھایا ہوا
مہکتے خوابوں کی تعبیر کچھ عجیب سی ہے

اک انقلاب کی آمد کا دے رہی ہے پتہ
جبینِ وقت پہ تحریر کچھ عجیب سی ہے

یہ قتل کر کے بھی رہتی ہے پاک اور معصوم
تمہاری آنکھ کی شمشیر کچھ عجیب سی ہے

ہزار فن ہیں زمانے میں اک سے اک اعلیٰ
غزل کی جادوئی تاثیر کچھ عجیب سی ہے

یہ بات سچ ہے نگاہِ ادب شناساں میں
جنابِ منشاؔ کی توقیر کچھ عجیب سی ہے

انصاری ٹاؤن . جنگل بانا مہ ناگپور 440001

محمد منظور احمد منظورؔ

جنوں ہے پھر طالبِ دیدار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے
تڑپ اُٹھی لبِ اظہار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

یہاں جب جنسِ نایاب محبت مل نہیں سکتی
تو پھر یہ رونقِ بازار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

جدا جب ان کی سمتیں ہیں، الگ جب اُن کی راہیں ہیں
جنون و عقل میں پیکار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

نظر ملتی ہے، دل ملتے ہیں اور تم ساتھ ہو پھر بھی
ہمارے درمیاں دیوار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

کوئی جب بات ہی سننے کو آمادہ نہ ہو منظورؔ
تمہارا اس قدر اصرار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

1/732-1=22 دارالشفاء حیدرآباد اے پی

غزلیں

پروفیسر کلیم ضیاء

قربان مجھ پہ گردشِ حالات ہوگئی
محروم حسرتوں سے مری بات ہوگئی

میں نے خدا تراشا جو اپنے لئے کبھی
احباب کی نظر میں بُری بات ہوگئی

وہ شہر جس سے امن و اماں کی اُمید تھی
نفرت سے اس شہر میں ملاقات ہوگئی

اس نے نگاہِ غیر سے دیکھا بس ایک بار
میرے لئے بہت بڑی سوغات ہوگئی

مجھ کو مرے نصیب نے جو دُکھ دیئے ضیاءؔ
ہر دُکھ نے سر جھکا کے کہا مات ہوگئی

○

پلاٹ نمبر 22 روم نمبر 5/9 شیواجی نگر۔ گوونڈی
بمبئی 400043

شجاع الدین شاہد

سُلگتی ریت کا صحرا ہے یہ سفر میرا
یہ پہلے جان لو دینا ہے ساتھ گر میرا

میں سوچتا ہوں محض اپنی ذات کی حد تک
غرور لے کے مجھے آگیا کدھر میرا

یہاں میں آیا تو جذبات مار کر آیا
گوارہ شہر کو ایسے ہوا گذر میرا

صدا بھی ڈوب گئی موج کے تھپیڑوں میں
بہا کے لے گیا سیلاب جب نگر میرا

اب ایسے دور میں جینا بھی بوجھ ہے شاہدؔ
مشینیں کھا گئیں اس دور کی ہنر میرا

○

نارتھ بامبے سارٹنگ آفس۔ اندھیری (ایسٹ)
بمبئی 400093

ماہنامہ

حیدرآباد

اگست ۸۶ء ... علمی وسماجی اقدار کا نمائندہ
ماہ نامہ
جلد ۳ ، شمارہ ۸

شاداب

ماہنامہ حیدرآباد

ایڈیٹر:
محمد قمرالدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر:
محمد کلیم الدین احسن

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دوسالہ 90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات 1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

ترسیل زر کا پتہ: 11-5-447 ، ریڈ ہلز ، حیدرآباد 500004 ، آندھراپردیش

قیمت فی شمارہ: 5 روپے

فہرست

حرفِ اوّل

تعلیم کی موجودہ صورتِ حال اور آئندہ تجاویز کے بارے میں حکومتِ ہند نے ایک دستاویز "تعلیم کی چنوتی" شائع کی اور ملک کے ماہرینِ تعلیم اور دانشوروں سے مشورے طلب کئے اور ان تمام مشوروں پر غور و فکر کرتے ہوئے آئندہ تعلیم کے لئے ایک اسکیم مرتب کرلی ہے، گو اس کی تفصیلات ابھی شائع نہیں کی گئی ہیں، وزیرِ اعظم نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ اڈمنسٹریشن (NIEPA) کے زیرِ اہتمام یونیسکو اور یونیسیف کی مدد سے ترتیب شدہ چار روزہ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ملک گیر مباحثہ کے بعد منظورہ نئی تعلیمی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ اس سے غریب عوام اور زیادہ خوش قسمت عوام دونوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ اس سمینار میں تقریباً (۷۰) ماہرینِ تعلیم حصہ لے رہے ہیں جن میں قومی ماہرین کے علاوہ یونیسکو، یونیسیف اور دوسرے ممالک امریکہ، فرانس، تنزانیہ، بوٹسوانا اور عوامی چین کے ماہرینِ تعلیم شامل ہیں۔ یہ سب قومی تعلیمی پالیسی کو روبہ عمل لانے کے اصول و ذرائع پر غور کریں گے۔ وزیرِ اعظم نے اس کا اعتراف کیا کہ موجودہ تعلیمی ڈھانچہ میں صرف امیر ہی اچھی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ غرباء کے لئے جو تعلیم ممکن تھی وہ کم تر، خراب اور بد انتظامی و بے توجہی کا شکار رہی۔ اب اچھی تعلیم کا حصول سب کی پہنچ کے اندر ہوگا۔ پورے ملک کے طول و عرض میں ہر ضلع میں ماڈل اسکول (نو ودیا ودیالیہ) کھولے جائیں گے۔ اور ایک حصہ ملک کے بچوں کو دوسری جگہ لے جاکر ایسے ماڈل اسکولوں میں تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ سماجی، علاقائی اور مالی رکاوٹوں سے بالاتر ہوکر تعلیم حاصل کر سکیں ساتھ ہی تعلیم بالغان کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ وزیرِ اعظم نے وعدہ کیا ہے کہ اس پالیسی کو بہت جلد روبہ عمل لایا جائے گا اور چند ماہ کے اندر ہی پروگریس رپورٹ ملک کے سامنے پیش کی جائے گی۔

نئی تعلیمی پالیسی کو روبہ عمل لانے کی تفصیلات ابھی وصول نہیں ہوئی ہیں البتہ مرکز کی منسٹر آف اسٹیٹ فار ایجوکیشن اینڈ کلچر مسز کرشنا ساہی نے راجیہ سبھا میں بیان کیا کہ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اس سال کے دوران (۱۴) ماڈل نو ودیا اسکول قائم کئے جائیں گے جو ہماچل پردیش، گجرات، اڑیسہ، کرناٹک، کیرالا، مہاراشٹرا، مدھیہ پردیش، راجستھان، اتر پردیش، بہار، میگھالیہ اور گوا

دادر اور نگر حویلی کی یونین ٹیریٹریز میں قائم ہوں گے۔ پورے ملک کے ہر ضلع میں ایسے اسکولوں کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اب پہلے سال میں صرف (۱۱) اسکول کا کھولا جانا مایوس کن ابتدا ہے نیز ایک "آپریشن بلیک بورڈ" اسکیم کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کے تحت ملک کے ہر اسکول کے لئے مناسب و موزوں آلات تعلیمی کی فراہمی کا انتظام کیا جائے گا۔ مسز کرشنا ساہی نے یہ بھی کہا کہ تحریک آزادئ ہند کی تاریخ کو حقیقت پسندانہ طریقہ پر لکھوایا جا کر اسکولوں میں پڑھایا جائے گا۔ اردو کی حد تک صرف ترقی اردو بیورو کی مطبوعہ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جو عام زیادہ اور تعلیمی کم ہیں اور نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اردو کتب کو بطورِ خاص تیار کروانا ہوگا۔ امید ہے کہ ترقی اردو بیورو اس بارے میں ضروری کارروائی کرے گا۔

رکن مجلسِ مشاورت "شاداب" پروفیسر رضی الدین احمد کو اسٹیٹ ایوارڈ

۴ ر جون ۸۶ء کو حکومتِ آندھرا پردیش کے وزیر تعلیم شری نائیڈو نے ریاست کے فاضل معلمین اور لائق مفکرین کو سالِ رواں کے سب سے بڑے علمی اعزاز اسٹیٹ ایوارڈ سے نوازا ہے۔ یہ حضرات علوم و فنون کے مختلف شعبوں سے وابستہ اور جامعاتِ آندھرا سے تعلق رکھتے ہیں۔

عالموں اور دانشوروں کو اعزاز و اکرام سے نوازنے کی تاریخی روایت بہت قدیم ہے۔ قدیم شخصی سلطنتوں کے دور میں اہلِ علم و دانش کو سونے چاندی میں تولا جاتا اور ان کے منہ کو لعل و گوہر سے بھرا جاتا تھا۔ اب جب کہ سلطانئ جمہور کا زمانہ ہے تو عوامی حکومت اصحابِ فکر و دانش کو علمی اعزازات سے نواز کر اپنی علم دوستی اور فن نوازی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ یہ اعزاز گو کہ مالی اور معاشی اعتبار سے قابلِ ذکر نہ ہو لیکن اعترافِ علم و فن کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ امسال جن معلمین و مفکرین کو حکومت آندھرا پردیش نے اپنے سرکاری اعزاز سے نوازا ہے۔ ان میں اردو کے محقق ایس وی یونیورسٹی کے بزرگ استاد اور "شاداب" کی مجلسِ مشاورت کے رکن پروفیسر رضی الدین احمد بھی شامل ہیں۔ پروفیسر رضی الدین احمد گذشتہ (۳۰) سال سے مسلسل اس علاقہ میں اردو تعلیم و تحقیق کی جو خاموش مخلصانہ خدمات انجام دے رہے ہیں، ہمارے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب موصوف سے زیادہ خود اس اعزاز کا یہ فخر ہے کہ اسے ایک گراں مایہ شخصیت نے نوازا ہے۔ مکان و مقام کی اہمیت سے کہیں زیادہ مکین و مقیم کی اہمیت ہوتی ہے۔ ادارہ شاداب محترم پروفیسر صاحب کو اس اعزاز پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے یہ مسرت بھی محسوس کرتا ہے کہ آپ کی گراں مایہ شخصیت نے اس اعزاز کو صحیح معنوں میں معزز بنا کر اسے مزید معنویت بخشی ہے۔ نیز ریاست کے وزیرِ اعلیٰ شری این ٹی راما راؤ اور وزیرِ تعلیم

شری نائیڈو کے اس اقدام پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے کہ حکومت آندھرا پردیش نے اُردو کے ایک عظیم استاد اور گراں قدر محقق کو ایوارڈ کے لیے منتخب کرکے اُردو کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

اقلیتوں کی جانب سے جو تعلیمی ادارے چلائے جارہے ہیں انہیں دستور کی دفعات ۲۹ و ۳۰ کے تحت تحفظات حاصل ہیں۔ عدالتوں نے ہمیشہ یہ طے کیا ہے کہ دستور کی دفعہ ۳۰ کا تحفظ ہر اس اقلیتی تعلیمی اداروں کو حاصل ہے چاہے وہ کنڈر گارٹن کی ابتدائی تعلیم ہو یا سائنسی و ٹیکنیکل پیشہ ورانہ اعلیٰ تعلیم۔ یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ جیسے ہی یہ ثابت ہوجائے کہ ادارہ کو چلانے والے مذہبی، ثقافتی یا لسانی اقلیت سے متعلق ہیں، انہیں اپنے ادارے چلانے کا پورا پورا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ انتظام میں بھی اور داخلوں وغیرہ سے متعلق بھی۔ چاہے وہ اپنے طبقہ یا مذہب کے زیادہ سے زیادہ امیدواروں کو داخلہ دیں یا کسی اور اقلیت اور مذہب کو اپنے ادارہ میں موقع دیں۔

ان اداروں کے لئے یہ بھی ضروری نہ تھا کہ ان کے قیام کے وقت یہ صراحت کی جائے کہ وہ اپنے مذہب، زبان یا تہذیب و کلچر کے تحفظ کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ اتنا کافی تھا کہ انہیں اقلیتی افراد اور جماعتوں کی طرف سے چلایا جارہا ہو۔

سپریم کورٹ کے نو رکنی اجلاس میں ۱۹۷۴ء کے فیصلہ کے ذریعہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے حقوق کی واضح صراحت کی گئی ہے اور اسی فیصلہ کی رہنمائی میں اقلیتی اداروں کو حکومت کی جانب سے جملہ حقوق و مراعات حاصل تھے۔

اب ۱۹ر فروری کو سپریم کورٹ کے تین رکنی بنچ بشمول چیف جسٹس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ امر سپریم کورٹ کے ۱۱ رکنی بنچ پر غور و تصفیہ کے لئے پیش کیا جائے کہ ایسا اقلیتی ادارہ جو خصوصی طور پر اپنی تہذیب و ثقافت، مذہب، زبان و رسم الخط کے تحفظ کی غرض سے تعلیم نہ دے رہا ہو بلکہ ایسی عام تعلیم دے رہا ہو جو دوسرے عام ادارے دیتے ہوں تو ایسی صورت میں آیا یہ ادارہ دستور کی دفعہ ۳۰ کے تحت تحفظ کا مستحق ہے؟ سپریم کورٹ نے یہ تصفیہ بطور خود SUO - MOTO کیا ہے۔ اور ۱۱ رکنی بنچ پر مسئلہ پیش کرنے کا تصفیہ اس لئے ہے کہ نو رکنی بنچ نے ۱۹۷۴ء میں یہ تصفیہ کردیا کہ اقلیتی افراد و جماعتوں کی طرف سے چلائے جانے والے تمام اداروں کو دستور کی دفعات ۲۹ و ۳۰ کے تحفظات حاصل ہیں چاہے وہ بالصراحت اپنی تہذیب و ثقافت، مذہب، زبان کے تحفظ کے لئے قائم نہ ہوئے ہوں اور دوسرے عام اداروں کی طرح عام تعلیم دے رہے ہوں۔

سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ تشویش ناک ہے۔ سپریم کورٹ کے شاہ بانو کیس کے خلاف تو صرف ایک اقلیت یعنی مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ تعلیمی معاملے میں اس تصفیہ کے خلاف ہمارے ملک

نواب سر نظامت جنگ

دنیا میں ہجوم در ہجوم انسان گلی کوچوں اور بستیوں میں پیدا ہوتے ہیں، اپنے مقصد حیات سے بے شعور ایک عیش پرست حیوان یا بار برداری کے جانور کی سی زندگی گذار کر چار آدمیوں کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنے آخری ٹھکانے قبر کے کنارے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کی کہانی چند لفظوں میں سمٹ جاتی ہے۔ پیدا ہوئے، پلے بڑھے۔ برا بھلا کمایا۔ کھو اور مر گئے۔ لیکن ایسے آدمی بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کی زندگی کتابو کی ضخیم جلدوں میں سمٹ نہیں سکتی۔ ان کی زندگی کا ہر دن کتاب کے ایک ورق کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی یہ کتاب بعد میں آنے والے دوسروں کے لیے یادگار بنے اور اگر اس سے وہ کچھ حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو حاصل کریں ـــ نواب سر نظامت جنگ مرحوم کی زندگی ایسی ہی زندگی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج میں تھوڑ بہت اس زندگی کی جھلک دکھانے کی کوشش کروں گا۔ جس طرح ایک معمولی فوٹو آدمی کی صحیح تصویر نہیں دکھاتا اس میں ہزار در ہزار خامیاں ہو ہیں۔ وہ آدمی کے اخلاق۔ زبان۔ عادات، چال چلن، طرز فکر، گفتگو، کسی چیز کو بھی تو نمایاں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ہر ذہن پھیلی ہوئی ایک با مقصد اور با شعور ہمہ تن تحریک اور ہمہ تن اضطراب زندگی کے بے تاب شب و روز کو ایک کتاب سمیٹنے سے قاصر ہوتی ہے۔

اس کی دھڑکتی ہوئی زندگی کا ہر راز کتاب کے بیسیوں صفحات سے زیادہ وزنی اور قیمتی ہوتا ہے لیکن ہمارے لیے اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے کہ زبان و قلم و کاغذ کی جس محدود دنیا میں ہم اپنے خیالات کا محدود اظہار کرسکتے ہیں اس کی مدد سے نواب صاحب مرحوم کے بارے میں ان معلومات اور ان کی زندگی کے بعض حصوں کو آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی جائے۔

سر نظامت جنگ مرحوم کی شخصیت ایک اہم جہتی شخصیت ہے او اس کا ہر پہلو نظر کو خیرہ اور فکر کو مسحور کرنے والا ہے۔ وہ تاریخ کی ان چند برگزیدہ شخصیتوں میں سے ہیں جن کی زندگیاں خوبیوں کی جامع تھیں بلاشبہ وہ ایک عظیم شاعر، بالغ نظر مفکر، بلند پایہ فلسفی، صاحب طرز ادیب ماہر قانون مدبر اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان تھے۔

۱۸۸۸ء میں سر نظامت جنگ کیمبرج پہنچے اور ۲۱ سال کی عمر میں کیمبرج سے بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور ستمبر ۱۸۹۱ء میں آپ ہندوستان واپس ہوئے۔ پھر ۱۸۹۲ء میں دوبارہ لندن واپس ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں بیرسٹری کی سند اور ۱۸۹۶ء میں کیمبرج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

ولایت سے آنے کے بعد بہ حیثیت صدر منصف ناظم عدالت ضلع پر بھنی کارگذار رہے اور پھر ترقی کرتے ہوئے مختلف عہدوں سے گذر ہوئے صدر المہام سیاسیات کے عہدہ پر آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ اور آپ کی اپنی خواہش پر ۱۳۴۹ ف میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اعلیٰ حضرت غفران مکان کے چہل سالہ جوبلی کے موقع پر آپ نظامت جنگ کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں آپ کو آرڈر آف دی برٹش ایمپائر م O.B.E کا تمغہ مرحمت فرمایا گیا اور ۱۹۲۳ء میں سی۔ آئی۔ ای کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ کو سر کا خطاب عطا ہوا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر اقبالؔ کے بارے میں رقمطراز ہیں :

"سب جانتے ہیں کہ اقبال نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ، یہی ادب، یہی اقتصادیات، یہی سیاسیات، یہی قانون اور یہی فلسفہ انھوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفہ تک کر چکے ہیں۔ مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے ۹۹٪ نوجوان دیکھتے ہیں۔ بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر اتر چکا تھا اور ان سب مرحلوں سے گذرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین و ایمان، اپنے اصول، تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا کیا حال تھا مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا اور جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شئے واحد تھے اور اس شئے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امام فلسفہ اور اس ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا سے لگا کھاتا ہو۔"

یہ پوری تحریر سر نظامت جنگ مرحوم کے حق میں پوری پوری صادق آتی ہے۔ آخری دور میں نواب مرحوم سوائے قرآن کے اور کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے۔ سالہا سال تک علوم و فنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچے تھے وہ یہ تھا کہ

علم قرآن ہے اور یہ جس کے ہاتھ میں آجائے وہ دنیا کی تمام کتابوں
ے بے نیاز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کے ساتھ ان کی
ہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے اور اپنی ساری زندگی اور
تمام عقلیت کو رسول عربی ؐ کے قدموں پر ایک متاعِ حقیر کی طرح نذر
لے رکھ دیا تھا۔

قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاص شغف تھا روزآنہ کئی گھنٹے
ن شریف کی آیات پر غور کرتے تھے اور اس کی روشنی میں اسلام
ریخ کا معائنہ کیا اور مسلمانوں کی قوم کو بنتے ہوئے دیکھا اور اس
نتیجہ یہ ہوا کہ آیات ایک زندہ قوم کا دستور العمل زندگانی بن کر
کے دل کو قوت پہنچانے کا ذریعہ بن گئیں اور یہ معلوم ہوگیا کہ یہ
س کتاب انسان کی زندگی کو اخلاق کی درستی سے بلند مرتبہ پر پہنچاتی
اور یہ عظمت اور قوت دے کر جہانبانی کے قابل بناتی ہے۔
یک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

"مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ذلت ان کو غیرت دلانے کے لیے
ایک تازیانہ ہے۔ اس کو میں مسلمانوں کی سزا سمجھتا ہوں۔ خدا کرے
ان کو اس کا احساس ہو اور اپنی اصلاح کی کوشش کریں اور اپنی
کتاب کو پھر اپنی اصلاح کا ذریعہ بنائیں تاکہ پھر اس درجہ پر پہنچ
سکیں جس پر سے وہ گرے ہیں۔ اس میں سب سے پہلی شرط
یہ ہے کہ کتاب کے مضمون سے واقف ہوں اور اس پر غور
کریں۔ دلوں پر قفل کس نے ڈالا! محض غفلت اور جہالت نے
یا اس غلط طریقہ نے جو صدیوں سے رائج ہے۔ جس کا نتیجہ
یہ ہے کہ صدیوں سے دل و دماغ پر پردہ پڑا ہوا ہے اور
دستور العمل زندگانی کو محض منتروں کا مجموعہ سمجھنے لگے ہیں۔
کتاب کی جلد کو تو سر آنکھوں سے لگاتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں
یہ سمجھتے کہ اس کے اندر کیا ہے کس قسم کی باتیں ہیں اور ان کا کیا

اثر عمل زندگی پر ہو سکتا ہے اور کیا ایمان، بغیر عمل صالح کے زندہ رہ سکتا ہے۔ ان امور پر غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قوم کی اصلاح کا کام قرآنی مضامین کی تفہیم سے شروع ہونا چاہیے اور یہ کام صرف عالموں سے لینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر فرد بشر کو خود اپنی کوشش سے کرنا چاہیے قرآنی مضامین آسان ہیں وہ ہدایات جو صراط مستقیم کی طرف لانے والی ہیں عام فہم ہیں۔ قرآنی ہدایات کی بنیاد اخلاق پر رکھی گئی ہے۔ ہر عمل میں اچھے اور برے کی پرکھ! خود غرضی اور بخل کو دور کرنے پر! ہر انسان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے پر! نیک ہدایت کرنے پر، اخوت اور اتحاد باہمی و شوری پر! تمام دنیا کے مسلمانوں کو بھائی سمجھنے پر! سب مسلمانوں کو برابر سمجھنے پر! اور ایک امّت کے ہونے کے تصور کو ہمیشہ دل میں رکھ کر، مسلمانوں کی مدد کو اپنا ذاتی کام سمجھنے پر! یہ چند باتیں میں نے مثالاً کہی ہیں۔ قرآن شریف سے ایک مکمل فہرست تیار کی جا سکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جب ہر نفس کی پاکی اور اصلاح کے ساتھ قومی بننے کا یہ سب سے اعلیٰ اور موثر طریقہ ہے اور اس طریقہ سے نفس کو درست کر کے صحابہ کرامؓ اس قابل ہوسے کہ ان میں سے بعض اعلیٰ درجہ کے حکمران ہوسے تو کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ قوم سازی اور حکمرانی کا بہترین طریقہ وہ نہیں ہے جو قرآن ہم کو سکھاتا ہے!

مسلمانوں کی علمی و معاشرتی ترقی اور اسلامی اصول کی اشاعت قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کی اور زیر اثر متعلقین سے عمل کروانے کی کوشش کے لیے آپ نے انجمن علم و عمل کو ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۶ میں قائم فرمایا۔ مدینہ منشن کے احاطہ میں ایک وسیع ہال اور اراضی معہ مسجد مع ضروری فرنیچر اس انجمن کو وقف کر دیا۔ اس عطا کا مقصد یہ تھا کہ

یہاں در دمند حضرات جمع ہوں۔ اصلاح قوم کے طریقوں پر تبادلۂ خیالات ہو تقاریر کا اہتمام کیا جائے دارالمطالعہ اور کتب خانہ قائم کیا جائے۔ میں یہ کہتے ہوئے مسرت اور فخر محسوس کر رہا ہوں کہ یہ کام اب جناب رکن الدین احمد صاحب انجام دے رہے ہیں۔ انجمن کا کام صرف اشاعت تک محدود نہیں تھا اس انجمن میں شریک ہونے کے لیے ایک میثاق مرتب ہوا وہ یہ ہے:

اللہ کے سامنے ایک مسلمان کی حیثیت سے جس کے ہادی حضرت محمدؐ رسول ہیں سچے دل سے یہ عہد کرتا ہوں کہ آج سے اپنے جملہ معاملات و کاروبار زندگی میں قرآنی ہدایات پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرتا رہوں گا اور قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی عادت کروں گا تاکہ عمل صالح پر قائم رہ سکوں اور صداقت اور راست بازی سے کبھی دور نہ رہوں۔ یہ بھی عہد کرتا ہوں کہ اپنے متعلقین کو اسی طرح عمل کرنے کی نہ صرف ہدایت کروں گا بلکہ ان کے اعمال پر حتی الامکان نظر رکھوں گا اور خود اپنے صحیح عمل سے ان کی رہنمائی کرتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے نیک توفیق دے اور اس کام میں میری مدد فرمائے۔ آمین۔

۱۔ قرآن مجید کو معہ ترجمہ شروع سے اخیر تک کم از کم ایک مرتبہ اس زبان میں پڑھوں گا، جس کو میں بخوبی سمجھتا ہوں اور اپنے متعلقین اور نیز ان کو جن پر میرا اثر ہے قرآن مجید سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

۲۔ فرائض اسلام خصوصاً نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کی تکمیل کی کوشش کروں گا۔

۳۔ حصول علم و درستیٔ اخلاق میں کوشاں رہوں گا۔

۴۔ رزائل اخلاق مثلاً جھوٹ، مکر و فریب، غیبت، بہتان، حسد، کینہ، غصہ، طمع، عجب و بخل، اسراف وغیرہ سے اجتناب کروں گا۔

۵۔ خود غرضی یا کسی بنا پر ناجائز طریقے سے کسی کو نقصان نہ پہنچاؤں گا۔

۶۔ قومی، اسلامی، اخلاقی و اصلاحی کاموں میں حتی الامکان حصہ لوں گا اور اپنی زندگی اس طرح بسر کروں گا کہ وہ اوروں کے لیے مفید اور موجب خوشنودی

پروردگار ہو۔

۷۔ رات کو سونے سے قبل یا کسی اور وقت اپنے تمام دن کے اعمال کا محاسبہ کروں گا اور اپنی برائیوں پر خصوصیت سے نظر رکھوں گا۔

اس میثاق پر ۱۸۰ نے دستخط کیے۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے بھی میثاق پر دستخط کیے وہ اس انجمن کے رکن تھے۔ مرحوم آخر وقت تک اس انجمن سے دلچسپی و ربط رکھے رہے۔ ان کی رحلت کے حادثۂ عظیم کے بعد نواب سر نظامت جنگ بہادر نے دارالسلام تشریف لے جاکر تعزیت فرمائی اور وہاں کے کاموں کا اس غرض سے معائنہ فرمایا کہ اصلاحی کاموں کی حد تک ان دونوں انجمنوں میں ربط ہو اور یہ ربط استحکام پائے۔

انجمن نے نواب سر نظامت جنگ بہادر کی صدارت میں خاموشی کے ساتھ ناداروں کی تعلیم اور تمدنی اور اخلاقی اصلاح کے کام کیے ہیں۔ قرآنی تعلیم اور اسلامی اصولوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے مختصر اور مفید مطبوعات وسیع پیمانے پر اشاعت پائے۔

انفرادی راحت اور اجتماعی خوشحالی کے حصول کے لیے آپ نے "قرآنی تعلیم اور قومی تعمیر"، "عملی تعلیم قرآن"، ندائے سحری، مشورہ، زیارت النبی، نعت میلاد النبی، کیا اللہ کسی کو گمراہ کرتا ہے!، عربستانِ مقدس (تاثرات سفر حج)، رہنمائے قرآن جیسی کتابیں طبع فرمائی ہیں۔

"AN APPROOCH TO STUDY OF QURAN" کا خطاب بنیادہ تر غیر مسلم افراد سے ہے اور خصوصاً انگریزوں سے جن کی نفسیات سے مصنف خوب واقف ہیں۔ وہ ان کی مشکلات کو جانتے ہیں وہ انھیں خدا کا کلام سناتے ہیں۔ اسلام کے حقائق و دلائل سے واقف کراتے ہیں۔ رشد و ہدایت کو علمی و مثال سے میز کر کے حکیمانہ اور فلسفانہ طریقے سے دل و دماغ دونوں سے اپیل کرتے ہیں۔

قرآنی عملی تعلیم کے لیے نواب صاحب مرحوم نے اپنے خرچ سے ایک حجرہ بنام قرآنی دنیا مسجد حسین ساگر میں تعمیر کروایا اور اس میں درس قرآن کا انتظام فرمایا گیا۔ جس میں مولوی ابو محمد مصلح صاحب اور حافظ سلامت علی صاحب

درس قرآن دیا کرتے تھے۔ اسلامی مضامین پر لیکچر دینے کے لیے آپ نے مولوی محمد امین صاحب بیرسٹرایٹ لا لاہور جو ایک معزز ہندو خاندان سے تھے سارے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دورہ کر کے لکچر دینے کے لیے روانہ فرمایا اور دورہ کی رپورٹ کافی عمدہ رہی۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں دینی شعور بیدار کرنے کے لیے اور ان کو حالات حاضرہ کا قرآنی تصور سے جائزہ لینے کے لیے انعامی مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی اور بذریعہ اشتہار مضامین طلب کیے گیے۔ ایک دفعہ اس عنوان پر "اسلام دین و دنیا کی ترقی کا صحیح راستہ بتاتا ہے" مضمون لکھنے پر تین سو روپے کا انعام جناب عبدالحفیظ خان صاحب کو دیا گیا۔ وقتاً فوقتاً اسلامی مضامین مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کے لیے انگریزی و اردو اخباروں، رسالوں اور ماہ ناموں میں طبع کراتے تھے۔ علمی اخلاقی ترغیب دینے کی غرض سے چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کراتے تھے اور اس کو اسکولوں، کالجوں میں مفت تقسیم کراتے تھے۔ ایمان اور عمل صالح کی آیتوں کو جمع کر کے ترجمہ کے ساتھ اردو اور انگریزی میں شائع فرمایا۔ اسلامی اصول کی خصوصیات پر جناب ترمل راؤ صاحب وکیل کا انگریزی مضمون طبع کرواکر شائع فرمایا۔ غرض قرآن مجید کیا ہے اور کیا سکھاتا ہے اور کس طریقے سے سکھاتا ہے۔ ان عنوانوں پر کئی مضامین آپ نے لکھے اور ہزاروں نسخے طبع فرماکر ملک اور بیرونی ممالک میں مفت تقسیم فرمائے۔

ایک کیمٹی اصلاح عمل کے لیے بنائی اور ایک کیمٹی مسلمانوں میں ابتدائی تعلیم پھیلانے کے لیے اور قرب و جوار کی مسجدوں میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ میلادالنبیؐ کے جلسے منعقد کرواتے اور اس میں شرکت فرماتے اس واسطے کہ آنحضرت صلعم کی یاد تازہ ہوتی رہے اور اسلامی کام جاری رہے یعنی قوم کو عمل کے راستہ پر لایا جائے۔ آپ فرماتے تھے کہ سچا مومن وہی ہو سکتا ہے جس کا ایمان اس کو عمل صالح کا پابند کرے اور جو اپنے ایمان کا ثبوت اپنے کام سے دیتا رہے۔

آپ کو سخت احساس تھا کہ میلاد شریف کے جلسے صرف رسمی طور پر ہوتے ہیں اور کوئی مستقل عملی کام نہیں ہوا اور بہت وقت مسلمانوں نے کھو دیا

جناب سر نظامت جنگ مرحوم کے خیالات کو آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اگر میں ان کی ایک تقریر جو انھوں نے میلاد شریف کے جلسے میں کی تھی اس کے چند اقتباسات آپ کے سامنے پیش کروں جو کتاب زندگی کے صحیح طریقہ انسان کو بتا کر اس کو بلندی پر پہنچانے کی غرض سے بھیجی گئی تھی اور جس کی ہدایت کو عمل میں لا کر قوم کی رہنمائی کرنے کے لیے ایک بہت بڑی ہستی ظہور میں آئی تھی اور جس کے عمل صالح کا قوی تر اسوہ حسنہ ہمارے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔

افسوس وہ کتاب اور وہ اسوہ حسنہ دونوں ہماری نظر سے اور ہمارے دل سے چھپے ہوئے ہیں۔

جو زندہ قوت عربوں کو اس کتاب نے پہنچائی تھی اور جس قوت سے دنیا کے وسیع میدان عمل میں عظیم الشان کام انجام دیے تھے وہ اب ہمارے لیے ایک افسانہ بن گئے ہیں کیوں کہ ہم اس بلندی سے گر کر پستی میں آ گئے ہیں دنیا کو بنانے والی کتاب اور قوم کو عمل صالح کے سانچے میں ڈھالنے والی کتاب ہمارے پاس ہے۔ اس کا لفظی احترام ہم دور سے کر لیتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس میں کیا ہے اور اس کی قوت دل میں آنے ہی نہیں دیتے۔

تلاوت قرآن، قرات قرآن اور ختم قرآن یہ سب رسمی اصطلاحات ہو گئی ہیں اور بے جان چلے ہیں۔ جو کچھ اس طرح پڑھا جاتا ہے اس کو سمجھنے والے کتنے ہیں اور اگر سمجھیں بھی تو دل میں محفوظ رکھتے ہوئے عمل میں لانے والے کتنے ہیں۔ یہ حالت نہایت افسوسناک ہے۔

قرآن کا پڑھنا، پڑھانا، مسلمانوں کے پاس محض ایک رسمی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ بچوں کو اوائل عمر میں طوطے کی طرح پڑھا دینا اور سمجھنے نہ دینا اس کو ہم باعث برکت سمجھتے ہیں اور جاہلوں کو حافظ بنا دینا تاکہ وہ خالی آوازیں نکالنے کے قابل بن جائیں اور بعض مواقع پر اس سے کچھ پیسہ پیدا کر لیں۔ کیا یہ ہمارا برتاؤ اس کتاب کے ساتھ جائز ہے جو ہم کو تاریکی سے نکال کر روشنی کے لانے کے لیے نازل ہوئی تھی اور جس کو سنانے اور سمجھانے کے لیے پیغمبر بھیجے گئے تھے۔ ہم اس کو سمجھیں اور اس پر غور کریں اور اس پر عمل کریں۔

مقدس بزرگوں کا لباس اختیار کرنا، ہمیشہ قرآن و حدیث کا تذکرہ

نا یہ محض بیکار ہے اگر عمل نہ ہو اور خصوصاً اگر اس کے ساتھ ہی کبھی مصلحت آمیز
وٹ بھی کہہ دوں، کبھی کسی کی غیبت بھی کر دوں اور اپنے بھائی کی شکایت کرکے
ملہ میں حصہ پانے سے اس کو محروم کرا دوں۔ عیش و نمائش کی خاطر فضول
جات کرتا رہوں اور قرض لیتا رہوں۔ غرض دوسروں کو وعظ سناؤں
خود اس کے خلاف عمل کروں تو کیا میں اس قرآنی ارشاد کا مصداق نہ
ں گا:

"عالم بے عمل کی مثال ایسی ہے کہ گویا بوجھ اٹھانے والا
گدھا ہے کہ اس پر بوجھ لادا گیا ہے۔"

انسان کو غلط راستوں سے بچا کر سیدھے راستے پر لانے کے لیے اور
سچائی اور نفس کی پاکی سکھانے کے لیے اور عقل پر روشنی ڈالنے کے لیے
دل کو قوی کرنے کے لیے یہ کتاب بھیجی گئی ہے اور وہ اپنا کام کرتی ہے،
رطیکہ دلوں پر قفل نہ ہو۔

یہ حالت دیکھ کر مجھے بارہا یہی خیال آتا ہے کہ کیوں ہمارے علما اور
رخ اور نیے تعلیم یافتہ حضرات سب ایک ہو کر موجودہ خرابی کو رفع کرنے
نکر نہیں کرتے۔ کیا وہ بھول گئے کہ ہمارے پیشوا کا روزانہ کام کیا تھا؟ کیا
رسمی وعظ اور سالانہ تقاریب ہی کو باعث برکت سمجھتے تھے یا روزانہ
ت کو مقدم سمجھتے تھے جو قوم کو نیکی اور پاکی کی شاہراہ پر لاتی تھی۔
نوں کو فخر کرنا چاہیئے کہ قدرت نے ان کو ایسا ہادی اور پیشوا عطا کیا
نے دین کی قوت سے دنیا کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا طریقہ پہلی
مہ انسان کو سکھایا وہ طریقہ اب یوروپ کو سبق دینے کے لیے موجود
ہے اور یوروپ کی نظر اس طرف جارہی ہے۔ ہر مسلمان اپنے آپ کو
غور سے دیکھے۔ ہاتھ میں قرآن مجید ہے اور آنکھوں میں اسوہ حسنہ ہے
ستہ سیدھا اور صاف اس کے سامنے ہے۔ پس وہ کیا قرآن کو ایک
ف ڈال کر اسوہ حسنہ سے آنکھ پھیر کر سڑک کے یا ز دیکھی ادھر کبھی ادھر
یے میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈھونڈتا رہے تاکہ ان سے اپنی ذلیل خواہشات کا
حاصل کرے یا وہ کام کرے جو قرآن مجید نے اور اس کے اعلیٰ عامل نے

سکھایا ہے۔

یہ یاد رکھو کہ اسلامی اصول اور اسلامی طریقے پر قائم رہ کر اپنے اسلامی جذبات کو بڑھاتے ہوئے ہم دنیا کے سب علوم و فنون کو سیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کے سب کام کر سکتے ہیں اور پھر دنیا کے سامنے اسی عظمت و شان سے آسکتے ہیں جو پہلے دنیا دیکھ چکی ہے۔

ہر مسلمان اپنے دل میں اور اپنے متعلقین کے دلوں میں سچے اسلامی خیالات و جذبات کو محفوظ کرتا جائے اور ان طریقوں سے اجتناب کرے جو آج کل تہذیب و ترقی کو بدنام کر رہے ہیں۔ تو پھر ہمارے دل و دماغ میں یہ آواز گونجنے لگی۔ انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ جس آواز نے ایک زمانہ میں دنیا کو ہلا دیا تھا۔

اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ ہم اپنی عورتوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کرکے ان کو ان خطروں سے بچائیں جو آج کل پیدا ہو رہے ہیں۔ قوم کی اصلی تربیت عورت کے اختیار میں ہے۔ فطرت نے ماں کو بچہ کی پرورش، حفاظت اور ابتدائی تربیت کا ذمہ دار بنایا ہے۔ ماں کی طبیعت اور عادت کا اثر بچہ کی طبیعت پر ضرور آتا ہے۔ جیسی مائیں ہوں گی ویسی قوم ہوگی۔ جس زمانہ میں ہماری عورتیں عام طور سے جاہل ہونے پر مذہبی احساس زیادہ رکھتی تھیں اور اچھے برے کا تعلق ان کے دل میں مذہب ہی سے تھا اور اللہ و رسول کی باتیں ہمیشہ ان کی زبان پر رہتی تھیں اس کا جو اثر بچوں کے دلوں پر ہوا کرتا تھا وہ مجھے یاد ہے لیکن اب ویسا اثر بچوں کے دلوں پر نہیں ہے اس سے قوم کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔

اب جو عورتیں اپنے آپ کو تعلیم یافتہ سمجھتی ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اسلامی معلومات کو بڑھائیں۔ اپنی کتاب کی عظمت کو دل میں رکھیں اس کی روشنی سے اپنا راستہ معلوم کریں اور علم و عمل سے قوم کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرتی رہیں تب وہ تعلیم یافتہ سمجھی جا سکتی ہیں نہ کہ یورپین لباس کے اختیار کرنے سے، بال کٹوا دینے سے یا ہونٹوں پر مصنوعی سرخی کے اضافے سے، ان کو حقیقی ترقی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کاغذی حکم اور دورِ حاضر

(دوسری اور آخری قسط)

انسانی تاریخ میں ظلم و تشدد کے واقعات بہت پرانے ہیں لیکن اس دور میں امن و امان، انسانیت اور خیر و فلاح کے مدعی، مبلغ اور نقیبوں کی بھاگیداری سے جگہ جگہ دن رات توڑ جوڑ، انسانی استحصال، معاشی تضاد، سماجی ناانصافی، سازشش اور نصف نفاق کو جتنا فروغ ہوا ہے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ خوشامد اور ناجائز کوششوں میں پچھلی صدی کی انسانی خصوصیتیں اور اخلاقی قدریں اس صدی میں مٹ گئی ہیں۔ ابھی اس صدی کے ختم میں لگ بھگ دس اوپر تین سال کا انترگت ہے۔ اکیسویں صدی کے خوش آیند تصور اور پُر زور استقبال میں یہ دھرتی کہیں چمبل کی وادی نہ بن جائے۔

سماجی تبدیلیاں اور انقلاب تاریخی ضرورت کی پیداوار ہیں۔ آج کے سطحی دور کو انسانی جبریت قرار دیا جا سکتا ہے۔ انقلاب کے ڈر سے حالات میں پیچ پڑ گیا ہے۔ واقعات سمجھ سے بالاتر ہو گئے ہیں۔ سماجی تبدیلیوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے نتائج سے عدم واقفیت اور غیر یقینی حالات میں بے یقینی اور تشکیک اُبھر گئی ہے۔ بے یقینی کی وجہ سے لوگوں کا عقل پر اعتماد نہ رہا۔ وہ لوگ جو علم کی بنیاد پر اخلاق کے ضابطے مقرر کرتے ہیں اور سزا دینے کے مجاز بھی ہیں۔ دوہری پالیسی سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ افراد اور معاشرہ کے سینے علم، یقین اور عقیدہ، عمل و بصیرت کی گرمی سے تابناک نہ ہونے سے وہ تعصب اور تنگ نظری نہ پیدا ہو سکی جو عقیدے کی سختی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسانی منافقت اور ریاکاری سے ایسی تنگ نظری

اور تعصب پیدا ہو گیا ہے جس سے انسان کو انسان سے گزند پہنچ رہا ہے۔ مستقبل آنکھوں سے اوجھل، ماضی کا بہت بڑا حصہ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہو گیا ہے۔

معاشرہ، یا سماج ایک تہذیبی روایت کا وارث ہوتا ہے۔ معاشرہ کا ہر فرد اسی تہذیبی وراثت کا نمایندہ ہوتا ہے۔ خاندانی تہذیبی اکائی میں سربرست مطلق العنان ہوتا ہے لیکن اس عہد میں بزرگوں نے اعمال کی خوبی اور خرابی، اخلاق سیاست، تجارت اور معیشت میں مذہبی عکاسی نہ کرنے سے حرص و ہوس، مفاد پرستی مصلحت پرستی اور زر پرستی سے خاندانی زندگی میں زبردست زلزلے آئے ہیں۔ حالاں کہ دنیا میں اب اتنی غریبی اور مفلسی نہیں رہی کہ ہر شخص کو اس کا حصّہ بقدر جثہ نہ مل سکے۔

جیسا کہ آپ کو بتایا جا چکا ہے مستقبل کا تصوّر تاریک ہو گیا ہے۔ اس سے یہ نقصان ہو رہا ہے کہ ہر کوئی وقت سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں زمانے کا پامال پرزہ بن گیا ہے وقت کی صحیح رفتار کا اندازہ نہ ہونے سے اکثر و بیشتر جوابی طور پر وقت ایسا جھٹکا مارتا ہے سب کے چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔

عالمی طاقتوں کی رقابت سے تیسری دنیا کو جارحیت پسندی اور گوریلا لڑائیوں سے پالا پڑ رہا ہے۔ اسلحہ کے پھیلاؤ اور انسداد میں ویٹو کے استعمال سے اقوام متحدہ کے قوانین و ضوابط کاغذی حکم کی حیثیت اختیار کر گیے ہیں۔ انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کی کشمکش سے قانون جس کی لاٹھی اس کی بھینس بن گیا ہے۔ سیاسی طور پر جیو اور جینے دو کے بجائے میں نے جیتا سیکھ لیا میں انتک واد، اوگر واد، اتی واد، بندوق دھاری، علاقائی جھگڑے، نسلی مسئلے، فرقہ واریت اور مخالفت سے اکھنڈتا میں بھنگ پڑ گیا ہے۔

ابھی ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ بچپن سے تعلیمی اور مذہبی ماحول نہ ہونے سے ہر گھر اور افراد موسیقی کے آلات، ٹی وی، طرح طرح کی نعمتیں اور نادر اشیاء کے محکم بن گئے ہیں۔ یہی بات سائنسی ترقیات کے تعلق سے بھی کہی جا سکتی ہے حالاں کہ سائنس کو انسانی مسرّت میں اضافے کا سرچشمہ ہونا چاہیئے تھا۔ افسوس کہ سائنس مرگ و ہلاکت کا سبب بن گئی ہے۔ ٹی وی کی مقبولیت اور ہمہ وقتی مصروفیات میں تربیت اطفال، کامیاب خانہ داری،

عبادات، معاملات، معاشرت اور آداب زندگی میں غفلت، لاپرواہی اور غیر ذمہ دارانہ احساس سے تعطل پیدا ہوگیا ہے۔ فلموں کی پسندیدگی، اداکاروں کی جان کاری اور انواع واقسام کے دلچسپ مشغلوں میں نئی نسل محسنین قوم وادب کے عظیم کارنامے ایثار و قربانیوں کو بھول گئی ہے۔ بلکہ ان کے اسم شریف بھی یاد نہیں۔

اس متضاد دور میں سیاسی انتشار اور اخلاقی پستی میں عیش و نشاط کی پرچھائیوں کے تعاقب میں محفلیں، مجلسیں، تقاریب، تہوارات، میلے ٹھیلے، اجتماعات، اعراس اور خانقاہیں غم غلط کرنے اور عارضی خوشیوں کے مرکز بن گئے ہیں جہاں فلمی نغمے، ظاہرہ رسم ورواج مذہب سے زیادہ اہم اور مقدم ہوتے ہیں۔ بزرگوں نے ان برائیوں سے چشم پوشی ہی نہیں کی ہے بلکہ اسے تہذیب کا نشانہ سمجھا۔ لازمی طور پر تماشہ بینی اور عیش وعشرت کے شوق نمایاں ہوگئے ہیں۔ کرب ونشاط کے اس دور سے پیدا اسمگلنگ، رشوت ستانی، پٹرول ڈالر اور باعزت دھندوں میں معاشرہ کے اقدار اور تصورات میں ان کے فکر وفلسفہ، ادب، جمالیات، اخلاق وآداب اور رسم ورواج کے مقررہ ضابطے زمانے کی چیرہ دستی کی نذر ہوگئے ہیں۔ دولت مندوں کی مصاحبت وقت کی اہم ترین ضرورت بن گئی ہے۔ راویان معتبر نے ان کی امارات کے تذکروں اور ذکر خیر سے دکانوں، مکانوں، گلی کوچوں، بازاروں اور عبادت گاہوں کو آباد کر دیا ہے اس طرز عمل نے اور طریق تعلیم نے اونچ کو خارج کر دیا ہے۔ راویان مذہب نے مذہب اور قانون کے محافظوں نے قانون کے نوک و پلک سنوارنے کے بجائے نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ نفسیاتی طور پر مذہب بے گھر ہوگیا ہے۔ میدان عمل میں اعمال کی جگہ بے عملی اور ثواب کی باتوں نے لے لی ہے۔ لاقانونیت اور افراتفری میں عوام دشمن سماج دشمن اور جمہوریت دشمن عناصر کو قانونی گرفت میں رکھنے، قانون کے ہاتھوں ایسا مضبوط ڈنڈا نہیں ہے جس سے لوگ خوف بھی کھاتے اور احترام بھی کرتے۔ جمہوری اقدار یا آزادی کے اقدار سے بہرہ مندی میں حب الوطنی کے نغمے بھی گاتے۔

حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے۔ دنیا میں کاغذی حکم کی چند ایسی بھی صورتیں موجود ہیں، جن کی ایمانداری اظہر من الشمس ہے گوکہ ان کاغذی حکم کو

مذہبی اور قانونی کوئی شکل نہیں ہے لیکن سماج کی مکمل تائید اور بھرپور حمایت حاصل ہے وہ کاغذی حکم یہ ہیں۔

۱۔ تاش کے پتے

۲۔ سٹہ کی پرچی

تاش کے باون پتے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جتنے پتوں کی تعداد ہوتی ہے، کھیلوں کے بھی اتنے ہی اقسام پائے جاتے ہیں۔ ہر کھیل میں کالی پان کا ایکہ کا حکم سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے، کھیل کے دوران یہ پتہ جس کسی کھلاڑی کے طرف چلا جائے وہ بازی میں داؤ پر لگی ہوئی کسی کی بیوی کو جیتنے کا حق رکھتا ہے۔

اسی قبیل کا دوسرا حکم سٹہ کی وہ پرچی ہوتی ہے جس پر نہ تو دکان دار کا نام اور نہ ہی دکان کا اتہ پتہ درج ہوتا ہے پھر بھی اس سادہ سی پرچی پر تحریر شدہ نمبر مٹکہ کے اعلان شدہ نمبر سے میل کھا جانے پر دو رائیں نہیں ہو سکتی۔ ایسی ہی بات لاٹری کے ٹکٹ کے متعلق کہی نہیں جا سکتی۔

یہاں معاشرہ کے ایک اور پہلو پر غور کرنا نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ اگر دنیا میں قوت آزمائی کے یونہی سلسلے جاری و ساری رہے تو ہماری دانست میں وہ دن دور نہیں کہ جب معاشرہ میں خوشامد پسندی، چاپلوسی اور بے حسی کا جذام پھوٹ جائے گا۔ ایسی حالت میں دنیاوی احکامات اور دنیاوی قوانین محض کاغذی سانپ بن جائیں گے۔ جس طرح کسی جذامی کے ہاتھوں سچے بچے کا زہریلا ناگ مرجانا تو پسند کرتا ہے، لیکن ملتا نہیں۔ یا پھر نسلِ انسانی کے تباہ شدہ ملبہ سے بالغ النظر اور باشعور نسل ابھر آئی تو وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی قصہ مختصر آنے والے وقت میں گھاٹا ہمارا ہی ہوگا۔ ——

تو مسکرائے گی؟ اگر تو مسکرائی تو میں تجھے دس کا نوٹ دوں گا نا۔

وہ لڑکی اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ بھلا وہ کسی بھی زبان کے ان تلخ الفاظ کا مطلب کیا سمجھ سکتی تھی۔ لیکن میں اس جملے کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ مگر سمجھ جانے کے باوجود بھی اب مجھ میں اتنی سکت باقی نہ رہ گئی تھی کہ میں اس عامیانہ جملے کا تلگو میں ترجمہ کر کے اس لڑکی کو مطلب سمجھا سکتی۔ البتہ میرے شوہر کی زبان سے اس جملے کو سن کر میری روح کانپ اٹھی۔ اور میں سوچنے لگی۔ اُف خدایا! ان لاوارث بچوں اور خصوصاً ان لڑکیوں کا مستقبل کیا ہوگا؟

باقی صفحہ ... پر

ایم-اے خلیل اکمل

سائنسی ایجادات اور ارتقائے تہذیب

بارھویں اور آخری قسط - ٹرانسسٹر

سائنسی ایجادات نے ہمارے معاشرے کی ترقی میں ایک بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے ۔ انیسویں صدی میں سائنسدانوں کی یہ کوشش رہی کہ انسان کو ایک ایسے مشینی دور میں داخل کریں تاکہ اس پر کام کا بوجھ ہلکا ہو جائے ۔ چنانچہ اسی جذبہ کے نتیجے میں نئے نئے ایجادات وجود میں آئے جس سے ہمارے معاشرے کی پستی کو دور کرنے میں بہت مدد ملی ۔ ایسے ایجادات پر سلسلہ وار گیارہ قسطوں میں روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ان ایجادات میں بحری جہاز ، فصل کاٹنے کی مشین ، سلائی مشین ، ٹیلی گراف ، ٹیلی فون ، ٹائپ کی مشین ، گراموفون ، خود کار کمپوزنگ مشین ، بجلی گھر ، ہوائی جہاز اور ریڈیو والو شامل ہیں ۔ لیکن بارھویں ایجاد ٹرانسسٹر نے ہمارے معاشرے کی ترقی میں انقلاب برپا کر دیا ہے ۔ اس ایجاد سے الکٹرانک کے میدان میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا ۔ اس آخری قسط میں اس ایجاد کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا ۔

ریڈیو ٹیوب کی ایجاد سے الکٹرانکس کی ترقی کی ابتدا ہوئی لیکن ٹرانسسٹر کی ایجاد نے اس کو پس پردہ ڈال دیا ۔ ٹرانسسٹر کی ایجاد کو وقت کا تقاضہ سمجھا گیا کیوں کہ الکٹرانک آلات آئے دن بہت ہی پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان آلات کی تیاری میں کئی درجن اور بعض میں تو کئی سو ریڈیو والو استعمال ہو رہے تھے جس سے ان کی جسامت میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا تھا ۔ ان آلات میں ریڈیو ، ٹیلی ویژن ، ٹیلی فون خودکار کمپوزنگ مشین اور امپلی فائر وغیرہ شامل ہیں ۔ اگرچہ کہ ریڈیو والو کی جسامت کو کافی حد تک گھٹا دیا گیا تھا لیکن اس میں چند بنیادی خامیاں موجود تھیں ۔ جن میں (۱) حرارت کا اخراج (۲) استعمال میں زیادہ برقی قوت کا صرفہ (۳) نازک لمحات میں

فیل ہو جانے کا خدشہ (۴) صرف ۱۰ ہزار گھنٹے کی محدود کارکردگی کی صلاحیت وغیرہ

ٹرانسسٹر کو ایک غیر متوقع سائنسی تجسس کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ جسامت میں ایک مٹر کے دانے کے برابر ہے۔ لیکن اس کی اہمیت ایک سونے کے ڈلے سے کم نہیں۔ اس نایاب ایجاد کے تین خالق ہیں جن کے نام ولیم شاکلے (WILLIAM SHOCKLEY) اور بارڈین (BARDEEN) اور والٹیر برائین (BRATTAIN) ہیں۔ یہ سائنسداں امریکہ کی مشہور تجربہ گاہ بیل ٹیلیفون لیبارٹری (BELL TELEPHONE LABORATORY) میں نیم مواصلیت (SEMI CONDUCTING) اشیاء کے خصوصیات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ دراصل جرمیانیم (GERMANIUM) دھات میں برقی رو کے بہاؤ کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ اگر آواز کے اشاروں کا پتہ چلانے والی قلموں (CRYSTAL DETECTOR) پر قریب قریب بلی کے مونچھ جیسے دو تار لگا دیے جائیں تو اس سے آواز کو بڑا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس اختراع کا عملی مظاہرہ ۲۳/جون ۱۹۴۸ء کو کیا گیا۔ ٹرانسسٹر نے اپنے حیرت انگیز خصوصیات سے ساری دنیا کی توجہ مبذول کروائی۔ ان تینوں سائنسدانوں کی ۸ سالہ محنت اور تجربات کے نتیجے میں ایک ایسی چیز وجود میں آئی جس سے الکٹران (ELECTRON) کو کنٹرول کرنا ممکن ہو گیا۔ یہ وہ دریافت ہے جو اپنے اندر سینکڑوں اطلاق چھپائے ہوے ہے۔ جس سے الکٹرانک سائنس میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ٹرانسسٹر کے خصوصیات یہ ہیں:۔ (۱) اس سے بنائے ہوے آلات میں برقی قوت کی بچت (۲) حرارت کا عدم اخراج (۳) کارکردگی میں اضافہ (۴) سو فیصد قابل اعتماد کارکردگی (۵) آلات کے خدوخال میں کمی وغیرہ۔

۵۰ سال قبل کیمیائی مرکب لیڈ سلفائیڈ (LEAD SULPHIDE) کو ریڈیو لہروں کو پہچاننے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ جیسا کہ ریڈیو والو ڈیوڈ (DIODE) سے کام لیا جاتا ہے۔ لیڈ سلفائیڈ کی قلم (CRYSTAL) اگرچہ کہ ریڈیو اشاروں کو پہچان سکتی ہے لیکن ان کو بڑا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ ان تینوں سائنسدانوں نے دراصل نیم مواصلت والی شئے جرمانیم سے سہ رو الیکٹرا "ٹرایوڈ" " TRIDE " والو تیار کیا جو قدیم اختراع CRYSTAL

DETECTOR کا نعم البدل تھا۔ ٹرانسسٹر ریڈیو اشاروں کو ایک لاکھ گنا بڑا (MAGNIFY) کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگرچہ کہ یہ دیکھنے میں بہت معمولی نظر آتا ہے۔ لیکن بناوٹ کے اعتبار سے بہت ہی پیچیدہ ہے۔ چونکہ جرمانیم دھات تھوڑی سی حرارت سے بھی متاثر ہوکر اپنے طبعی خواص کھو سکتی ہے اس لئے اس کی جگہ پر سلیکان SILICON استعمال کیا جانے لگا ہے۔

آج ٹرانسسٹر کو لاکھوں کی تعداد میں تجارتی سطح پر تیار کیا جانے لگا ہے۔ یہ ریڈیو، ٹیلی ویژن۔ سٹیلائیٹ۔ کمپیوٹر۔ ٹیلی فون اور کئی دوسرے عصری آلات میں استعمال کیا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ طبی میدان میں انسانی دل کی دھڑکن کو تیز کرنے کے لئے بھی ٹرانسسٹر سے بنے آلات سے استفادہ کیا جانے لگا ہے امریکہ کے پہلے سٹیلائیٹ EXPLORER میں ٹرانسسٹروں سے بنا ہوا ایک چھوٹا ٹرانسمیٹر نصب کیا گیا تھا۔

ٹرانسسٹر کو تمام ریڈیو والو کا نعم البدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ایک اندازے کے مطابق کوئی ۷۰ فیصد والو کے کام انجام دے سکتا ہے۔ اس ایجاد کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ان تینوں سائنس دانوں نے اس کی منفعت کے علاوہ ٹھوس مادہ کی ساخت اور بعض عناصر کے سطحی جوہروں میں برقی طرز عمل کے راز کا پردہ چاک کیا ہے۔ ان تینوں سائنس دانوں کو سنہ ۱۹۵۶ء میں اُن کی اس دریافت پر نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

سلسلہ صفحہ ۳ سے

آگہی کا ہر ایک نقش قدم　　　فکر کی روشنی سے ملتا ہے

کبھی کسی نے نہ پوچھا کہ اشکبار ہو کیوں　　　زمانہ پوچھتا ہے لب پہ یہ ہنسی کیوں ہے
جنونِ شوق کی وارفتگی ہی دی ہوتی　　　بلائے جاں خدایا، یہ آگہی کیوں ہے

مجموعی طور پر مجھے یقین ہے کہ حضرت بی پی سعید کا یہ مجموعہ کلام "گلگشت"

باقی صفحہ ۴۰ پر

یوسف ناظم

ایک آزاد مطالعہ

ادب میں یوں تو آزاد خیال، آزاد منش اور آزاد رَو لوگوں کی کمی نہیں بلکہ اب تو ایک لحاظ سے آزادی ہی آزادی ہے، کیونکہ اُردو ادب میں جتنی آزادی شاعروں اور ادیبوں کو حاصل ہے یوں کہیے کہ شاعروں نے حاصل کر لی ہے (جسے ہتھیانا بھی کہا جاتا ہے) اتنی آزادی کی مثال دوسری زبانوں میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ لیکن اس وقت میرا موضوعِ سخن 'ادب میں آزادی' نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اُردو ادب میں، صحیح معنوں میں، تین ہی آزاد ہیں۔ سب سے پہلے محمد حسین آزاد، جنھیں آزاد رہنے کے لئے غدر کے بعد بھیس بدل کر اِدھر اُدھر گھومنا پڑا۔ (اُردو کے ادیبوں پر اگر اُفتاد نہ پڑے تو نظامِ قدرت متاثر ہو جاتا ہے) ۔۔ دوسرے ابوالکلام آزاد۔ یہ ایسے آزاد تھے کہ برسوں اسیر کی حیثیت سے جیل میں رہے اور وہ بھی اس طرح کہ اپنی رفیقۂ حیات کے آخری دیدار سے بھی محروم رہے[1] اور تیسرے یہ جگن ناتھ آزاد۔

---

[1] اپنی اہلیہ کے انتقال کے وقت مولانا احمد نگر جیل میں تھے۔ "ہماری آزادی" مترجمہ محمد مجیب کے صفحہ ۱۹۰ پر لکھا ہے " اپریل میں ایک دن دوپہر کے وقت چیتا خاں میرے پاس آئے۔ یہ بہت غیر معمولی بات تھی۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر مجھے ایک تار دیا۔ یہ محض تحریر میں تھا مگر انگریزی میں اس کی نقل ساتھ تھی۔ تار کلکتہ سے بھیجا گیا تھا۔ اور اس میں لکھا تھا کہ میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے۔" صفحہ ۲۰۷ پر لکھا ہے" جس وقت کار ریل (ہاوڑہ پل) پر سے گذر رہی تھی مجھے گذرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں۔ اب میں تین سال بعد واپس آ رہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں۔ اور میرا گھر خالی تھا۔ مجھے ورڈزورتھ کا وہ شعر یاد آیا:

مگر وہ اب اپنی قبر میں ہے اور ہائے : میری دنیا کیسی بدل گئی ہے

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لئے کہا کیوں کہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پہ جانا چاہتا تھا۔ میری کار ہار پھولوں سے لدی ہوئی تھی میں نے اُن میں سے ایک ہار لے کر قبر پر چڑھایا اور خاموشی سے فاتحہ پڑھا۔"

---

۱۹ - الہلال - اندرہ ریکلمیشن - بمبئی ۵۰

محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات"۔ ابوالکلام آزاد کی "ہماری آزادی"۔ اور جگن ناتھ آزاد کی "آنکھیں ترستیاں ہیں"۔ ان تینوں کتابوں کا موضوع ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن ان میں ایک عجیب قسم کی مماثلت ہے اور وہ ہے مشترک جذبہ یعنی بے اختیار محبت اور عقیدت۔ "آبِ حیات" اپنی زبان اور اپنے استادِ محترم سے محبت کی آئینہ دار ہے۔ "ہماری آزادی" وطن سے محبت کا بے بہا خزانہ ہے اور "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں بزرگوں اور دوستوں سے بے پناہ عقیدت، ارادت اور محبت کے وہ ٹھاٹھیں دریا موجزن ہیں جن سے مصنف کو نسبتِ ارضی رہی ہے۔ (جگن ناتھ آزاد عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کی پیداوار ہیں۔ بعد میں پاکستانی ہوئے اور پھر از سرِ نو ہندوستانی)

میں نے جگن ناتھ آزاد کا نام ابوالکلام کے ساتھ لیا۔ آپ کو شاید ناگوار گذرا۔ لیکن ذرا یہ بھی دیکھئے کہ خود جگن ناتھ آزاد کیا محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے بہاریہ اور حالیہ آزاد صاحب جب اپنا مجموعۂ کلام لے کر ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ــــ لیکن یہ منظر میں خود جگن آزاد کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کردوں۔

"ایک سادہ سے کمرے میں جس کا ایک دروازہ پائیں باغ میں کھلتا تھا، مولانا ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ مولانا کی پر وقار شخصیت سارے ماحول پر اثر انداز تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی کم مائگی کا احساس ہوا۔ میری کیفیت اس وقت وہی تھی جو علامہ اقبال نے اپنے شعر میں بیان کی ہے:

من حضورِ آں شہِ والا گہر ۔ بے ہنر بر دربارِ عُمر

میرے آداب عرض کے جواب میں مولانا نے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور اپنی اس خواہش کو دل میں دبائے کہ مولانا کے حضور مجھے ان کے قدموں میں فرش پر بیٹھنا چاہئے، میں کرسی پر بیٹھ گیا ــــ

یہی حفظِ مراتب، مشرقی تہذیب، لحاظ اور تمیز جگن ناتھ آزاد کی زندگی ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کو اپنا مرشد مانا اور عقیدت و ارادت میں اتنی گرم جوشی اور استواری دکھائی کہ اقبال اگر کچھ دن اور زندہ رہتے تو جاوید نامہ کے بعد ایک آزاد نامہ ضرور لکھتے۔ اگر میں یہ کہوں کہ جگن ناتھ آزاد کی اقبال مندی میں اُن کی اقبال پرستی کو بڑا دخل ہے تو غالباً یہ پہلا سچ ہوگا جو میں بولوں گا ــــ پاکستان میں اقبال کے وارث اگر جاوید اقبال ہیں تو ہندوستان میں جگن ناتھ آزاد۔ اقبال صدی کے دوران پروفیسر کلیم الدین احمد (مرحوم) نے "اقبال اور عالمی ادب" کے عنوان پر ایک مقالہ لکھا اور اس میں وہی لکھا جس کی اُن سے توقع کی جاسکتی تھی۔ اُس وقت بھی اس مقالے کے جواب میں اگر کوئی سینہ سپر ہوا تو وہ یہی جگن ناتھ آزاد تھے۔ لیکن اس بحث کا یہاں کیا ذکر ہے۔ میں تو اُن کی

کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" کا ذکر کر رہا تھا جس میں انھوں نے ہر طرف محبت کے پھول بکھیرے ہیں اور کہیں کہیں تو وہ خود بچھ گئے ہیں ۔ یہ کتاب اصل میں مجھ جیسے بے حس لوگوں کے پڑھنے کے لئے ہے بھی نہیں جس میں جگہ جگہ بے غرض، بے لوث بلکہ بے سبب دوستوں اور بزرگوں کے واقعات لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر عبدالمجید سالک کے تذکرہ میں جو ایک خط کی شکل میں ہے لکھا ہے

"خوشتر صاحب! میں اس خط میں اتنا کچھ کیوں لکھ گیا یہ مجھے خود نہیں معلوم۔ کل صبح اور پھر دوپہر آپ ٹیلی فون پر جس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے ہیں اس میں مجھے اس دور کے خلوص و محبت کی ایک تابناک تصویر نظر آتی ہے جو اس وقت بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے"

اسی خط میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں :

"انھوں نے (سالک صاحب) مجھے اقبال کے وہ نادر اور غیر مطبوعہ اشعار سنائے جو اقبال کی تصانیف میں موجود نہیں ہیں۔ میں ان نوادرِ اقبال کو جو قبلہ سالک صاحب کے ذریعے مجھ تک پہنچے ہیں آج بھی اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہوں ۔ جہاں میں اس بات پر نازاں ہوں کہ آج میری بیاضیں اقبال کی ان نظموں اور غزلوں سے مملو ہیں جو اقبال کی مطبوعہ کتابوں میں نہیں ہیں وہاں اس بات پر میری حیرانی اپنی جگہ بدستور ہے کہ سالک صاحب کو اقبال کا کتنا کلام زبانی یاد تھا"

عبدالمجید سالک صاحب سے اپنی بے شمار ملاقاتوں کے بارے میں مصنف کے ان الفاظ پر بھی غور کیجئے :

"وہ فکر و معانی کے، علم و ادب کے، فنِ گفتگو کے ایک بھرپور بے کنار تھے۔ ان کے ساتھ تو جتنی ملاقاتیں ہوئیں کم تھیں اور گذشتہ بیس برس میں یہ ملاقاتیں تھوڑے ہی تھیں ۔ یہ تو ایک جلوۂ بے پایاں کی محض ہلکی سی جھلک تھی جسے ملاقاتوں کا نام دے کر شاید میں اپنے ہی جذبۂ انا کی تسکین کر رہا ہوں ۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم

میں جگن ناتھ آزاد کو حافظِ اقبال سمجھتا ہوں ۔ اور اس لئے سمجھتا ہوں کہ وہ حافظِ اقبال ہیں ۔ انھوں نے اقبال کے کلام کا صرف مطالعہ نہیں کیا ہے (بعض لوگوں نے جس میں راقم الحروف بھی شامل ہے اسے صرف ملاحظہ کیا ہے) بلکہ باضابطہ اس کی صبح و شام تلاوت کی ہے ۔ (شب بیداری بھی کی ہوگی) انھیں اقبال کے اردو اور فارسی اشعار اس طرح حفظ ہیں جیسے وہ اقبال کے نہیں خود ان کے اپنے شعر ہوں اور یوں دیکھا جائے تو شاعر اپنے اشعار اتنی محنت اور توجہ سے یاد نہیں کرتا ۔ اگر جگن ناتھ آزاد نے اس معاملے میں مولانا عبدالمجید سالک کا لوہا مانا ہے تو کہنا چاہیئے کہ جگن ناتھ آزاد

اس دوڑ میں مولانا سالک سے تقریباً چار سو گز پیچھے رہ گئے لیکن اس میں ان کی سبکی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا کیوں کہ ان دونوں کے بیچ میں کوئی اور تھا ہی نہیں ۔ اور آئندہ بھی کوئی خطرہ نہیں ہے اس لئے کہ اب جو لوگ پیدا ہو رہے ہیں ان کے حافظے اور ہاضمے دونوں نسبتاً کمزور واقع ہوئے ہیں ۔

اپنے (   ) اُستاد مولانا تاجور نجیب آبادی اور فارسی کے اُستاد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ذکر میں بھی آزاد زانوئے تلمذ تہہ کئے بیٹھے ہیں ۔ ان خاکوں کو پڑھنے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس جہاندیدہ سالہ شخص کے اندر آج بھی ایک طالب علم زندہ سلامت موجود ہے ۔ وہ طالب علم نہیں جسے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے ایک ادبی شرارت کی بنا پر اپنی کلاس سے "گیٹ آؤٹ" کر دیا تھا ۔ کیوں کہ اس ادبی شرارت میں نظیری کے ساتھ بے ادبی کی جھلک آگئی تھی بلکہ وہ طالب علم جو نہایت ثقہ، مہذب اور مودب طالب علم کے سرٹیفکیٹ کا مستحق ہو یعنی بجا طور پر مستحق ہو نہ کہ بربنائے سفارش

جگن ناتھ آزاد نے اپنی اس کتاب کو اپنی یادوں کا مجموعہ کہا ہے اور کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر نے ان مضامین کو شخصیت نگاری کی صنف میں شمار کیا ہے ۔ میں کسی کے پیچھے چلنے کا خود کو اہل نہیں سمجھتا، ان مضامین کو خاکہ نما تذکرے یا تذکرہ نما خاکے کہنا پسند کروں گا ۔ میرا خیال ہے کہ شخصیت نگاری میں شخصیت نگار خود اسٹیج پر نمودار نہیں ہوتا جب کہ خاکہ نگاری میں صاحب مضمون یعنی ممدوح اور خاکہ نگار دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے منظر عام پر آتے ہیں ۔ "آنکھیں ترستیاں ہیں" کے مضامین میں یہ معانقہ آمیز بے تکلفی نہیں ہے اس لئے اگر انھیں تذکرہ نما خاکے کہا جائے تو ادب کا کوئی نقصان نہیں ہوگا ۔ بہرحال مجھے اپنی رائے پر اس لئے اصرار نہیں ہے کہ یہ پہلی ہی نظر میں ناقص نظر آتی ہے ۔

جگن ناتھ آزاد نے لحاظ اور مروّت کو اپنا لباس بنایا ہے ۔ وہ بھی بے شکن ۔ لکھتے ہیں :

> "جاں نثار اختر اور کرشن چندر میرے بے تکلف دوست ہی نہیں تھے بلکہ میری زندگی میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے ۔ آج نور کے یہ مینار بجھ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود میرے جادۂ حیات کو منوّر کر رہے ہیں ۔"

ان تذکرہ نما خاکوں میں جو تعداد میں دو کم دو بائیس ہیں (لیکن مقدار میں اس سے زیادہ) انشاء پردازی یا شعبدہ بازی کی مثالیں نہیں ملیں گی لیکن دوست داری، سلیقہ، محبت و مودت اور بے پناہ خلوص کے شجر سایہ دار ضرور ملیں گے ۔ یہ ہرے بھرے درخت اور ان کے ترو تازہ پتے اس بات کا ثبوت ہیں کہ جگن ناتھ آزاد تو بس برائے نام (بلکہ برائے تخلص) آزاد ہیں ورنہ محبتوں کے ریشمی بلکہ نقرئی اور طلائی تار انھیں ہر طرف سے باندھے ہوئے ہیں ۔

حفظِ مراتب اور اپنے اساتذہ سے ارادت کا سبق انھوں نے یقیناً محمد حسین آزاد سیکھا ہوگا (غالباً دا) محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ذوق کا حقِ شاگردی جس طرح ادا کیا یعنی کس طرح اد سب جانتے ہیں۔ تاہم احتشام صاحب کے الفاظ میں سن لیجئے کہ محمد حسین آزاد نے یہ حق کس طرح ادا کیا :

"آزاد نے ان کی (ذوق کی) صحبت میں کیا پایا کیا نہیں یہ بتانا تو مشکل ہے لیکن ان کی محبہ احسان مندی کا احساس انھیں اتنا تھا کہ جب غدر میں گھر کا مال اسباب چھوڑ کر اور باپ کو گولی لگتے دیکھ کر دہلی سے نکلنا پڑا تو انھوں نے استاد ذوق کا وہ کلام جو بکھری ہوئی شکل میں ان کے پا تھا اپنے ساتھ لے لیا اور اسے سینے سے لگائے پھرے اور جب آبِ حیات لکھنے بیٹھے تو انھیں ال خراجِ عقیدت پیش کیا ـــ کہ شاگردی کا حق ادا کر دیا۔"

مولانا تاجور نجیب آبادی کے بارے میں آزاد یعنی جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں :

"ظاہر ہے اس فہرست میں والدِ محترم کے بعد اگر کسی شخصیت کا زیادہ سے زیادہ اثر میری طبیعت اور میرے مزاج نے قبول کیا ہے تو وہ مولانا کی شخصیت ہے۔"

اس کتاب میں مصنف کے ہم عمر بلکہ ان سے کم عمر لوگوں کے بھی خاکے (یا تذکرے) شامل ہیں ا ان خاکوں میں بھی (صد ہوگئی) مصنف نے اپنے قلم کو بے باکی تو چھوڑیئے بے تکلفی کی بھی اجازت نہیں ہے۔ خاکوں میں اتنا سخت ڈسپلن۔ اقبال کے پرستار جگن ناتھ آزاد کی ہر تحریر پر "پاسبانِ عقل" تحدید شدید ہے۔ (اس رائے پر بھی مجھے اصرار نہیں ہے) جگن ناتھ آزاد شخصیت نگاری کے معاملے میں ا ہی شریف اور مہذب ہیں جتنے کہ اپنی کتابوں کے نام تجویز کرتے ہیں۔ "نشانِ منزل" (مصنف کے تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام) کے بارے میں لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال مرحوم نے اوّل اوّل 'ضربِ کلیم' کا نام 'نشانِ منزل' ہی تجویز کیا تھا۔ اب نام اگر علامہ اقبال کا پسندیدہ نام ہے تو ظاہر ہے مجھے اس سے زیادہ اور کیا نام پسند آسکتا ہے ؛ اگر ان کی کتاب کا متروک نام ہے تو بھی میرے لئے محبوب ہے۔ بقول جگر

ع تیری خاکِ پا جسے چھو گئی وہ بُرا ہو تو بُرا نہیں

ظریفانہ ادب میں کچھ خاکے شامل ہیں جیسے فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ یا عصمت چغتائی کا "دوزخی" وغیرہ وغیرہ لیکن شریفانہ ادب میں جو خاکے شامل ہیں ان میں آزاد کے کم سے کم دو خاکے تو شامل ہوں گے ہی۔ دس کی تعداد مقرر کرتے ہوئے میں نے اس شرط کو ملحوظ رکھا ہے کہ اس تعداد میں کمی نہیں ہوگی اضافہ البتہ قبول و منظور ہے۔

پروفیسر غوث ساجد

گلگشت

ایک جائزہ

حضرت جے پی سعید کا مجموعۂ کلام "گلگشت" میری نظروں کے روبرو ہے، لیکن خیالات ہیں، جو وقت کی گذری ہوئی ربع صدی کا محاصرہ کرنے میں مگن۔ قلم پہ یہ پس و پیش مسلط ہے کہ کن کن واقعات کا تذکرہ کیا جائے اور کن کن سے کنارہ کشی اور ایسا کیا بھی جائے تو کیوں۔ ہر واقعہ دلنشین، ہر بات فرحت بخش اور ہر ایک یاد برگ گل کی طرح متبسم ہے لیکن گنجائش صفحات کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے۔ بہرحال یہی سرسراتی ہوئی بیسویں صدی تھی، جو اپنے سفر کی نصف سے زیادہ منزل طے کر چکی تھی۔ بس، ان ہی دنوں پہلے پہل میرا حضرت سعید سے ربط قائم ہوا۔ موصوف اس وقت اورنگ آباد کے قلمکاروں کی ایک بزم "مطلع ادب" کے صدر تھے۔ اور بڑے ہی اشتیاق سے نشستیں منعقد کرواتے تھے۔ جتنے شرکا کی حاضری رہتی، ان میں سے بہت سے آج بہت آگے نکل چکے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مطلع ادب کے اجلاسوں میں پروفیسر ابراہیم رنگلا، محترم بشر نواز، عزت مآب قاضی سلیم، محترم عباس انجم، محترم مقتدر نجم وغیرہ بطور ماہرین جمع ہوتے تھے جو نئے تخلیق کاروں کی کاوشوں کو سنتے اور تبصرہ فرماتے۔ جہاں رہنمائی اور اصلاح کی ضرورت ہوتی۔ وہیں انھیں دلجوئی کے ساتھ رہنمائی ملتی اور ہمت افزائی کے ساتھ اپنی کوششیں جاری رکھنے کی شفیق تاکیدیں۔

اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے آج کے معروف مضمون اور

• صدر شعبۂ انگریزی، پرتشٹھان کالج، پیٹھن ضلع اورنگ آباد 431107

افسانہ نگاروں میں جناب رفعت نواز، الیاس فرحت، محمود شکیل، رشید الدین رشید انور، میں خود بھی اور بہت سے دوسرے بطور خاص تشریف لاتے اور اپنی اپنی تخلیق پیش کرتے۔ نشست کا پورا انتظام حضرت سعید کے تفویض رہتا تھا، جسے موصوف بڑی دلچسپی کے ساتھ انجام دیتے۔ یہ حوالہ صرف اس مقصد سے دیا گیا ہے کہ موصوف کی ادب دوستانہ روشنی زندگی پر روشنی پڑ سکے۔ ان ہی دنوں مطلع ادب کی معتمدی کے فرائض مجھے سونپے گئے تھے جو چند سالوں تک میں انجام دیتا رہا۔ بڑی باقاعدگی سے نشستیں ہوتیں، نئے پرانے شعرا حضرات، مضمون نگار، افسانہ نویس، سب ہی جمع ہوتے اور سیر حاصل تبصروں میں حصہ لیتے۔ "مطلعِ ادب" ان دنوں واقعی ایک ادبی ادارے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ بعد ازاں گردشِ ملازمت سے متاثر ہو کر میں کافی سالوں تک باہر رہا اور مطلعِ ادب کی باقاعدگی متاثر ہو کر رہ گئی بہر کیف اورنگ آباد کے آج کے معروف قلمکار مطلع ادب سے ہی رونما ہوئے جس کا انتظام اور سرپرستی حضرت سعید کی مرہونِ منت ہے۔

حضرت سعید سے میرا تعلق گوناگوں اور نہایت پُرخلوص رہا ہے۔ بہ حیثیت تخلیق کار مجھے ہمیشہ ان کی رہنمائی اور ہمت افزائی حاصل رہی، جس سے مجھ میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ بعد ازاں انھوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ترغیب دی اور دامے، درمے، سخنے میری رہبری بھی فرمائی۔ اس ضمن میں، میں انھیں استاد کے پُراحترام رشتہ سے یاد کرتا ہوں۔ ان ہی کی تدریس کی وجہ سے میں نے بی اے میں اردو مضمون اختیاری لے کر یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا آج میں جو کچھ بھی ہوں، اس میں استاد بے پی سعید کی پُرشفقت اور پرخلوص مشوروں اور ہدایتوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔ حضرت سعید کی رہنمائی، صرف میرے لیے ہی مختص و محدود نہیں تھی، بلکہ تقریباً عام تھی اور جس سے بیشتر افراد نے فائدہ بھی حاصل کیا۔ دراصل آغاز سے ہی ان کی علم دوستی، عزمِ صمیم کے ساتھ کارفرما رہی۔ ایک علم دوست کی ہر لمحہ یہی تمنا رہتی ہے کہ وہ اوروں کو علم دوستی کی طرف راغب کرے۔ حضرت سعید کا دم، اس لحاظ سے واقعی غنیمت اور بہت غنیمت ہے، جس کا ثبوت، ان کے بے شمار شاگرد، ذاتی م

علمی طور پر فراہم کر سکتے ہیں۔ بذاتِ خود جے پی سعید نے اردو اور فارسی میں علیحدہ علیحدہ ناگپور یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ بعد ازاں بی ایڈ کر کے انجمن اشاعت تعلیم اورنگ آباد کے قائم کردہ مولانا آزاد ہائی اسکول سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ اب صدر مدرس ہیں۔

ہر شاعر حساس طبیعت کا مالک ضرور ہوتا ہے لیکن ہر شاعر میں یہ خصوصیت ضروری نہیں کہ وہ شفیق بھی ہو اور ذہین بھی۔ جے پی سعید ان تمام خصوصیات کے مرکب ہیں۔ بات بات پر استاد شعرا کے صحیح اشعار کے حوالے دینا واقعی فطری ذوق اور ذاتی ذہانت کی شہادت ہے۔ ان کا یہ ذوق صنفِ شاعری کے علاوہ دیگر اصناف و اسلوبِ ادب پر بھی اتنا ہی گہرا ہے جس سے ان کے مطالعے کی وسعت اور دلیل حاصل ہو جاتی ہے۔ ذاتی طور پر حضرت جے پی سعید، ایک نہایت ہمدرد شخصیت کا نام ہے۔ جن کا حلقہ ادب و دوست حضرات تک محدود نہیں بلکہ اور دوسرے ان تمام سے ہے جو انسانیت نواز برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

آج سے پچیس سال پیشتر بھی جے پی سعید شاعر تھے اور آج بھی شاعر ہیں لیکن اور شاعروں کے مقابلے میں جے پی سعید اپنے کلام کی اشاعت اور حصولِ شہرت کے کبھی حریص نہیں رہے۔ عروسِ سخن سے ان کے دیرینہ روابط آج بھی جاری ہیں جو ان سے تخلیقات کرواتے ہیں لیکن یہ خواہش ان کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں کبھی متحرک نہیں رہی کہ وہ رسالوں میں شائع ہو کر، عروسِ سخن کے تئیں اپنی خدمات کا اعتراف کروائیں۔ شاعرانہ تخلیقات دراصل ان کے اپنے باطنی اطمینان اور ذہنی آسودگی کا ذریعہ ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جے پی سعید کا نام صوبہ اورنگ آباد کے جانے پہچانے شاعروں میں تو ضرور لیا جاتا ہے لیکن ملک کے اس مقام تک نہیں لیا جاتا جہاں اردو لکھی پڑھی جاتی ہے دراصل جے پی سعید ایک محتاط اور معتدل حقیقت پسند انسان ہیں جو بطور خاص نمائش سے احتراز کرتے ہیں۔ ربع صدی پیشتر جب میں اپنے افسانے "شاعر" اور "شاہراہ" کو بغرض اشاعت روانہ کرتا تو ان ہی کے ہمراہ اصرار کر کے حضرت سعید

کی کچھ غزلیں بھی روانہ کر دیتا، جو نہایت پسندیدگی کے ساتھ شائع ہو جاتیں
از خود انھوں نے اپنا کلام شاید ہی کسی رسالے کو روانہ کیا ہو لیکن تخلیق کے
کاروبار، بہرحال انھوں نے جاری رکھے، جس کا مجموعہ بعنوان "گل گشت"
آپ کی نگاہوں کو دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب بھی
حضرت جے پی سعید نے کم اور ان کے رفقاء نے زیادہ کی ہے۔ بہرحال
مشترکہ طور پر یہ تمام مرتبین، قابلِ تحسین ہیں۔

برسوں پہلے امریکن شاعر رابرٹ فراسٹ نے کہا تھا کہ شاعرانہ تخلیق کا
آغاز مسرت اور انبساط سے ہوتا ہے اور اختتام فہم و فراست پر۔
فراسٹ کا یہ نظریہ جے پی سعید کی شاعری بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فہم و فراست
کے جذبات کا اظہار بھی ہوتا ہے اور یہی اظہار شاعر کی حساس طبیعت کا
غماز ہوتا ہے۔ جس کی ترجمانی اس کے تراشیدہ اور نرم و نازک الفاظ کرتے
ہیں۔ جے پی سعید کا کلام جہاں اساتذہ کی روایتوں کی تابعداری کرتا ہے،
وہیں ذہنِ جدید کے احساس کی بھی نمایندگی سے دریغ نہیں کرتا۔ ایسی
ہی شاعری زیادہ پُراثر ثابت ہوتی ہے کیوں کہ اس میں قطع تعلق کی بات
نہیں ہوتی۔ بلکہ افزائش تعلق کو اہم گردانا جاتا ہے۔ ماضی سے حال تک کے
کلام میں ہم آہنگیت، پیدا کر دینا، کسی بھی شاعر کی ایک گراں قدر خدمت ہے
جو جے پی سعید نے اپنے مجموعہ کلام سے ادا کی ہے۔

جدیدیت کا زمانہ ہے اے سعید مگر!
ہے رنگ اوروں کا کچھ آپ کی صدا ہے الگ
کوئی جیئے تو اس عالم میں کس طرح سے جیئے
دماغ جسم سے جیسے کہ ہو گیا ہو الگ

یہ عصرِ جدید کے انسان کی کس قدر قابلِ رحم حالت کا اظہار ہے۔ جسم
ہمارے جدید ضرور ہیں لیکن ذہنی انتشار اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ جیسے
واقعی ہمارے ذہن ہماری زندگیوں سے لاتعلق ہو گئے ہیں۔ حالانکہ
ماضی قریب میں یہی انتشار زدہ انسان، یوں بھی دعویٰ کرتے تھے۔

ٹھہر نہ جائے جو بیتاب دل، میراذ مہ   ذرا حلاسے کے دو بول، بول کر دیکھو
تمہارا ایک تبسم ہی ہے متاع حیات   جو کر سکو تو میرے دل کا مول کر دیکھو

اپنے علاوہ کسی اور کو چاہنا، ہر انسان کا ایک فطری تقاضا ہے لیکن اہل دنیا چاہت کو ایک جرم ہی تصور کرتے آئے ہیں۔ ان ہی جذبات کو کتنے سلیس پیرائے میں جے پی سعید نے یوں سمو کر رکھ دیا ہے۔

ہے جرم اگر کوئی محبت   تسلیم کہ میں نے یہ خطا کی

اہل دل کیا کچھ برداشت نہیں کرتے۔ ان گنت مصائب و آلام جھیل کر بھی مطمئن رہتے ہیں اور دنیا والوں سے کوئی انتقام بھی نہیں لیتے۔ بلکہ ان کی دلچسپی کے لیے اپنی جانب سے تحفتاً کچھ نہ کچھ دے جاتے ہیں۔

نہائے خون میں ہم آنکھ سے لہو روئے   جہاں کو دی ہے مگر ایک داستاں رنگین

تصنع آج کی زندگی کا ایک خاص شعار ہو کر رہ گیا ہے جس سے انسانی جذبات کی اصلیت مفقود اور ریاکاری کا رواج عام سے ہو گیا ہے۔ جے پی سعید نے بڑی نفاست سے اس کا اظہار یوں کیا ہے۔

اعزاز میں ان کے ہے بیکار کھڑا ہونا   خود جن کے لیے دل میں تعظیم نہیں ہوتی

ایک اور جگہ ان ہی جذبات سے معمور فرماتے ہیں۔

کس قدر تصنع ہے اور خلوص کتنا ہے   آپ بھی سمجھتے ہیں اور ہم بھی سمجھتے ہیں

اسی غزل کے کچھ اور اشعار بھی بڑے ہی دل نشیں ہیں

قمقموں کی تنویریں دل کو خوش نہیں کرتیں   ہم تجلی دل کو روشنی سمجھتے ہیں
گلستاں کی رنگینی کس کے خون کا ثمر ہے   کوئی کچھ نہیں کہتا، پر سب ہی سمجھتے ہیں

جے پی سعید اپنے اشعار کی تراش سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے، جب تک کہ ان کے الفاظ ان کی اپنے احساسات کی صحیح ترجمانی نہیں کر پاتے۔ ذمہ دارانہ احساس، ہر عظیم مصنف اور شاعر کا خاصہ رہا ہے۔

دل پہ جو گذری قلم سے وہی نکلی ہے سعید   وہ مضامین نہ باندھے جو مدلل نہ ہوئے

خود کا تجزیہ کرنے کے بعد کون سے اثرات رونما ہو سکتے ہیں۔ صاف گوئی کی انتہا ہے جب یوں کہتے ہیں

اپنی تمنا کا تجزیہ   اپنا وقار اپنا نگاہوں میں گھٹ گیا

دیکھا جو رنگِ زیست تو محسوس یہ ہوا — اپنا وجود سینکڑوں خانوں میں بٹ گیا

انسانی زندگی میں خلوص کی بڑی اہمیت ہے جہاں یہ میسر آ جائے وہاں زندگی میں دلنشینی پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت جے۔ پی سعید کی جستجو ملاحظہ ہو:

ہر وہ جگہ جہاں دلِ انساں گداز ہو — ہے وہ مجھے عزیز 'حرم ہو کہ دیر ہو

اہلِ دل حصولِ محبت کے لیے کیا کچھ نثار نہیں کرتے۔ حضرت جے پی سعید بھی 'اس کی خاطر اپنی زندگی نذر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ عہدِ جدید کی ذمہ داریوں کے لزوم کا بھی انھیں احساس ہے۔ اس آمیزش سے 'میرے خیال میں ان کا یہ شعر حسین ترین اور نفیس ترین ہونا چاہیئے۔

زندگی میری امانت ہے بہت سوں کی مگر — وہ بھی میں نذر کروں' مجھ سے اگر تو مانگے

ان اشعار کے علاوہ بھی 'گلِ گشت' میں ایسے اور بیسیوں اشعار ملیں گے جو شاعرانہ مواد سے بھرپور' جے پی سعید کے منفرد اندازِ بیاں' لب و لہجہ اور طرزِ تخلیق کی شہادت دیتے ہیں اور ہماری نوعیتِ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں جن میں طنز بھی لبریز ہے اور تفسیر بھی عیاں۔

بدن کے داغ چھپاتی ہے زیرِ پیراہن — یہ زندگی جو بہت خوش لباس لگتی ہے

باکمالوں نے کیا فن کی نمائش سے گریز — عیب اِس دور کا چلتا ہوا سکہ ٹھہرا
دانش و جہل ہیں ہم رنگ زمانے میں سعید — جس پہ سونے کا ملمع تھا وہ سونا ٹھہرا

غمِ دنیا نے کبھی عیش کی فرصت ہی نہ دی — مئے عشرت سے تہی 'میرا سبو آج بھی ہے
اپنا نقصان کیا' غیر پہ احسان کیا — دل ہمارا جو تھا' پہلے بھی عدو آج بھی ہے

کتنی تیزی سے بدل جاتے ہیں حالات یہاں — آنکھ جھپکی بھی نہیں تھی کہ مناظر بدلے

تمہاری کون سی منزل ہے' تم ہی فیصلہ کر لو — اُدھر دنیا کی راحت ہے' اِدھر میری محبت ہے

وہ خدائی سے مل نہیں سکتا — لطف جو زندگی سے ملتا ہے

۱۵ ۲۲

عابد معز

لائبریری میں چند گھنٹے

کتب خانہ کا بورڈ کئی زبانوں میں لکھا ہوتا ہے۔ کتب خانے کو اُس زبان میں سب سے پہلے لکھا جاتا ہے جو پڑھی زیادہ اور بولی کم جاتی ہے۔ ہمارا اشارا انگریزی زبان کی طرف ہے۔ ہم انگریزی زبان کو پڑھتے زیادہ اور بولتے کم ہیں اسی لئے ہم نے اپنے اس مضمون کے عنوان میں کتب خانہ کے بجائے "لائبریری" استعمال کیا ہے۔ ایک اور بات جو کھٹکے کی وہ یہ کہ اردو زبان میں کتب خانہ کا اِملا غلط ہوگا یا پھر ترتیب الٹی ہوگی۔ "خانۂ کتب" اور "بیت الکتب" کی اصطلاحیں، لائبریری کے لئے ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔

لائبریری کی تعریف سے قاری واقف ہوں گے۔ اگر ہم سے پوچھا جائے تو ہم کہیں گے کہ لائبریری کتابوں کا گودام یا اسٹور روم ہے۔ لائبریری کو کتابوں کا یتیم خانہ بھی کہا جائے تو زیادتی نہ ہوگی۔ وہ اس لئے کہ لائبریری میں قارئین کتابوں سے بالکل یتیموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ بہت سی کتابیں جن کو خریدار نہیں ملتے وہ لائبریری کی زینت بنتی ہیں۔ جو بھی کتاب چھپتی ہے اس کا پہلا حق یہ ہے کہ اُسے لائبریری میں جگہ ملے چاہے اُس کی صرف دس جلدیں ہی فروخت ہوئی ہوں اور وہ بھی مصنف کے تنگ کرنے پر اُس کے دوستوں نے خریدی تھیں۔ بعض مصنف ایسے بھی ملیں گے جو صرف لائبریری کے لئے کتابیں لکھتے ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ پڑھی جانے والی کتابیں لائبریری میں عنقا ہوتی ہیں۔

ایک دن لائبریری میں ہمارے ساتھ پیش آئے تلخ تجربہ کی روداد سے آپ کو واقف کرواتے ہیں تاکہ آپ لائبریری جائیں تو احتیاط سے کام لیں۔

لائبریری کے اندر جانے کے لئے PERSONAL BELONGINGS کو باہر چھوڑ کر صرف PERSONAL ہو کر جانا پڑتا ہے۔ سامان کی حفاظت کے لئے لائبریری کے دروازے کے پاس ایک آدمی بیٹھا رہتا ہے جو سوتا ہوگا یا گپ بازی میں مصروف ملے گا۔ اگر وہ سو رہا ہے اور آپ نے اُسے جگایا تو وہ خفا ہوگا۔ کہے گا کچھ نہیں۔

آپ کا جبڑوں کو زور سے ان کی جگہ پٹک کر اپنے غصہ کا اظہار کرے گا۔ اگر وہ کتب بینی کر رہا ہو تو اس کا رویہ کتاب پر منحصر ہو گا۔ کتاب دلچسپ رہی تو وہ اشاروں میں بات چیت کرے گا ورنہ آپ کے وقت کو چند ایک فضول سوالوں میں ضائع کرے گا۔

لائبریری کے دروازے کے اندر ایک رجسٹر رکھا ہوتا ہے جس پر لائبریری میں آنے والوں کو اپنا نام اور پتہ لکھنا اور دستخط کرنی پڑتی ہے۔ نام اور پتہ کوئی نہیں لکھتا۔ آپ بھی مت لکھئے گا۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے۔ اکثر لوگ دستخط کرنا پسند کرتے ہیں جبکہ بعض دستخط کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ دستخط نہ کرنے والوں میں سے اکثر لوگ اندر کتابوں اور میز پر دستخط کرتے ہیں تو باقی حضرات دستخط کرنے کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ بعض اشخاص اس رجسٹر پر دستخط ایسے کرتے ہیں جیسے کسی کو آٹو گراف دے رہے ہیں۔ چند ایک اس رجسٹر پر دستخط کرنے کی مشق بھی کرتے ہیں۔ اگر آپ کو دستخط کے نمونے دیکھنا ہے تو لائبریری کے رجسٹر کا مطالعہ ضرور کریں۔ اکثر دستخطیں صرف چند ایک آڑی ترچھی لکیروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہم نے بھی دو سیدھی لکیریں اور ایک کھڑی لکیر کھینچی۔

لائبریری میں داخل ہو کر دستخط کرنے کے بعد ہماری نظر سامنے لگی ایک تختی پر پڑی جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "خاموشی سے مطالعہ کیجئے" اسی تختی کے نیچے ہیں لائبریری کے کرتا دھرتا گپ شپ کرتے نظر آئے۔ بات بے بات پر قہقہے دبانے کی کوشش میں عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ ان آوازوں پر پلٹ کر دیکھنے والے قارئین لائبریری کے لئے نئے ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان آوازوں سے بے نیاز ہوتے ہیں وہ روز آنے والے قارئین ہیں یا بہرہ جو سور ہے بھتے ہیں۔ لائبریری میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جن کے گھروں میں ڈرائنگ روم یا دلوان خانہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے لوگ کونوں میں سر جوڑے محو گفتگو ملیں گے جہاں سے کھسر پھسر کی آوازیں آتی ہیں۔ لائبریری میں ایسے حضرات کا بھی کمی نہیں ہوتی جو گھر کے ماحول سے گھبرا کر لائبریری کا سکوت برباد کرنے چلے آتے ہیں۔ بے مقصد اس کونے سے اس کونے کتابیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

کتابوں کو حسب روایت قدیم "کیٹ لاگ" (CATALOGUE) میں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ کیٹلاگ میں ڈھیر ساری کتابوں کے حوالے درج ہوتے ہیں لیکن تلاش کرنے پر

ایک کتاب بھی نہ ملے گی۔ ہمیں اس سلسلے میں اتنا فرق نظر آتا ہے جتنا کہ اصول اور عمل میں ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دس کتابوں کے حوالے لکھ لیتے ہیں تاکہ ایک مطلوبہ کتاب نہ ملنے پر مایوسی سے بچے رہیں اور یہ کتاب نہ سہی اور سہی گنگناتے ہوئے مال غنیمت پر اکتفا کر لیں۔ حوالے لکھتے وقت بہتر ہوگا کہ آپ فل اسکیپ کاغذ ساتھ رکھیں۔ خیالی محبوبہ کی زلف کی طرح کتابوں کے حوالے طویل ہوتے ہیں۔ بعض کتابوں کے حوالوں میں سارے حروف تہجی کے ساتھ نمبر لاکھوں میں ہوتا ہے۔ حوالے رٹ کرنے کے بعد کتابیں حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ لائبریری میں ویسے ہی روشنی کم ہوتی ہے اور جب بجلی بند ہو جائے تو پھر صبر کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔

کتابیں الماریوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ الماریوں پر پہلی اور آخری کتاب کے حوالے لکھے ہوتے ہیں۔ ان حوالوں کو پڑھنے کے لئے موٹے عدسوں کی ضرورت پیش آتی ہے کسی ہمدرد شناسا کے پاس سے چشمہ مانگ کر ہم نے اپنی مطلوبہ الماری تلاش کر لی اور اسے کھولا۔ پہلے تو چند کتابیں ہمارے اوپر گریں اور پھر ہم نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے الماری میں سے پھڑپھڑاتی ہوئی ان کتابوں کو بھی سنبھالا جو باہر آنے کی زور دار کوشش کر رہی تھیں۔ کتابیں گرنے کی آواز کے ساتھ لائبریری کا ایک آدھا پاس یا اور ہمیں کتابیں اٹھاتے ہوئے دیکھ کر لطف اندوز ہونے لگا۔ ہم نے "سوری" کہہ کر اسے اپنا طرفدار بنا لیا ورنہ ہوسکتا تھا کہ وہ کتابیں گرنے پر تبادلۂ خیال کرتا۔ کتابیں اٹھانے کے بعد ہم میں کتابیں ڈھونڈنے کا جوش اور ولولہ سرد پڑ گیا۔ جو کتاب ہاتھ لگی اسے لے کر آگے بڑھ گئے۔ کیا بھروسہ الماری جو چار کے بجائے صرف تین پایوں پر ٹھیری ہوئی تھی ہمارے ہی اوپر نہ گر پڑے۔ اس تیزی میں ہم نے میز اور کرسی کے پایوں سے ٹھوکر کھائی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ حضرت انسان سے ٹکر نہ ہوئی ورنہ ہمیں اندھے خطاب ملتا۔ ہم اتنے بدحواس تھے کہ جہاں بھی جگہ ملی بیٹھ گئے۔ پیشانی پر چمکتے ہوئے پسینہ کے قطروں کو دستی میں جذب کیا۔ ذرا سا سکون پایا تو محسوس ہوا جس کرسی پر ہم براجمان ہیں وہ بیٹھنے کے قابل نہیں تھی۔ اس کے بیچ میں سوراخ تھا۔ نواڑ گردھی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ سے معذور بھی تھی۔ چاروں طرف سے کھٹملوں نے حملہ کر دیا۔ بہت دن بعد انھیں غذا ملی تھی۔ چوہے اور دیمک اپنے اپنے سوراخوں سے جھانکنے لگے کہ کتابوں کے بجائے کتاب پڑھنے والا کہاں سے

آگیا۔ اٹھنا چاہتے تھے لیکن ڈر لگا کہ ہماری یہ حرکت آس پاس کے لوگوں کو گراں گزرے۔ یوں بھی ہم سب کا مرکزِ نظر بن چکے تھے۔ ٹھیک سے بیٹھنا چاہا تو کرسی رقت انگیز لہجے میں ہمارے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے لگی۔

ان حالات سے گزرنے کے بعد ایک قاری کو کتب بینی سے دلچسپی باقی نہیں رہتی اور اسے کئی ضروری اور غیر ضروری کام یاد آنے لگتے ہیں۔ ہم نے اپنا دھیان ان چیزوں سے ہٹا کر کتاب میں لگانا چاہا اور کتاب کھولی۔ جب مصیبتیں آتی ہیں تو آتی ہی چلی جاتی ہیں۔ جو کتاب ہم نے لی تھی وہ ایسی زبان میں تھی جو ہمیں نہیں آتی۔ ہمیں اس زبان کا نام اور اتا پتا بھی معلوم نہ تھا۔ لہٰذا تصویریں دیکھنے لگے۔ تصویریں دیکھنا ختم ہوا تو سوچا کہ آس پاس کے لوگوں کا جائزہ لیا جائے۔ جائزہ شروع ہوا۔ ایک صاحب کے ہونٹ پڑھتے وقت تیزی سے ہل رہے تھے۔ محسوس ہوتا تھا وہ دماغ کے بجائے ہونٹوں سے پڑھ رہے ہیں۔ سی ..... سی ..... سی ..... کی آوازیں آرہی تھیں جس پر آس پاس کے لوگوں کو گمان گزرتا کہ وہ اسٹیم چلا رہے ہیں۔ ایک اور صاحب پڑھتے وقت طرح طرح سے منہ بنا رہے تھے۔ کبھی زبان دکھا کر ڈاکٹر کی یاد دلاتے تو کبھی بتیسی بتلا کر ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بنتے۔ کبھی آنکھیں باہر نکال دیتے تو کبھی منہ کو سیٹی بجانے کے انداز میں سکوڑ لیتے۔ کبھی مسکرا پڑتے تو کبھی آنکھوں میں پانی بھر لاتے۔ ایسا منظر سامنے تھا جیسے ہم خاموش فلم دیکھ رہے ہوں۔ ایک اور صاحب ورق الٹتے وقت انگوٹھے کو تھوک لگا کر اس زور سے ورق پر مارتے کہ ایک زوردار "تھا" اور "پٹ" کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ ایک نحیف و ناتواں صاحب اپنے سے زائد وزن کی کتاب گود میں کھولے سو رہے تھے۔ جب کبھی نیند سے بیدار ہوتے وہ ایک صفحہ پلٹاتے تھے۔ پتہ نہیں یہ ان صاحب کے سونے کی عادت تھی یا پھر وہ اس ہنر سے واقف تھے کہ آنکھیں بند کر کے کتابوں کو کیسے پڑھا جا سکتا ہے۔

ایک صاحب کرکٹ کی کامنٹری کی طرح کتب بینی کے ساتھ اپنے تاثرات بھی ظاہر کرتے جا رہے تھے۔ ہم نے انھیں کہتے سنا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولے "یہ بالکل ایسے ہی ہو سکتا تھا۔ میں بے وقوف ہوں جو غلط سمجھا"۔ ہمارے دل نے بے ساختہ ان سے کہنا چاہا "آپ نے خود کو دیر سے سہی لیکن پہچانا خوب ہے۔ کوئی صاحب پڑھتے وقت اپنا

ٹانگیں زور زور سے ہلا رہے تھے جیسے پڑھنے کی مشین چلا رہے ہوں۔ ایک اور صاحب بار بار میز پر تھپتھپا رہے تھے کبھی آہستہ تو کبھی زور سے۔ جب وہ زور سے ہاتھ مارتے تو آس پاس کی کتابیں تڑپ کر رہ جاتیں اور میز میں ارتعاش پیدا ہوتا۔ اس حرکت پر دوسرے لوگ انہیں گھور کر دیکھتے اور جناب ان سب سے بے نیاز پڑھنے اور ہاتھ مارنے میں مصروف تھے۔ ایک صاحب پاس بیٹھے ہوئے شخص سے بار بار الفاظ کے معنی پوچھ رہے تھے۔ تنگ آکر اس بھلے شخص نے انہیں لغت لاکر دی اور اپنا پیچھا چھڑایا۔

ہم لوگوں کے پڑھنے کا انداز دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہمارے ذہن نے لوگوں کے بیٹھنے کے مختلف طریقے دیکھنے کا مشورہ دیا۔ ویسے چند اشخاص کھڑے ہو کر ہی پڑھائی کی ضرورت پوری کر رہے تھے۔ لیکن لائبریری میں کرسیوں پر براجمان لوگوں کی اکثریت تھی۔ ایک صاحب کرسی پر پیر رکھے اور پیروں کے بیچ ہاتھوں کو لئے ایسے بیٹھے تھے کہ ہمیں اسکول کی سزا یاد آگئی۔ جب ہم ہوم ورک نہیں کرتے تو مرغا بنا دئے جاتے تھے۔ ایک صاحب بیٹھے ایسے تھے کہ صرف ان کی گردن ہی کرسی پر ٹکی اور جسم کے باقی حصے ہوا میں معلق لٹک رہے تھے۔ ہم مضمون شروع کرنے سے پہلے اس طرح بیٹھنے کی کوشش میں چار مرتبہ گر چکے ہیں۔ ایک اور صاحب کرسی کی ایک ہی طرف بیٹھے تھے جس کی وجہ سے دوسری طرف کے پائے زمین سے اٹھ چکے تھے پھر بھی کرسی کا توازن برقرار رہا۔ ایک صاحب کے دونوں پیر میز پر اس انداز سے رکھے ہوئے تھے کہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ یوگا کی مشق کر رہے ہیں۔ ایک صاحب کرسی پر جھول رہے تھے۔ ہمیں ڈر ہوا کہ کہیں وہ گر نہ جائیں مگر واہ رے حیرت کرسی الٹ کر رہ گئی اور اچھل کر باز و کھڑے ہو گئے۔

اس کرتب بازی پر آتی ہوئی ہنسی کو ضبط کرنے کے لئے ہم میز پر پڑی کتابوں کو اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ایک کتاب دلچسپ معلوم ہوئی۔ پڑھنے لگے۔ ہمارا تجسس بڑھتا گیا۔ ایک جگہ ہمارا تجسس محرومی میں بدل گیا۔ کتاب کے چند اہم صفحے غائب تھے۔ محرومیوں کی تلافی کے لئے ہم نے دوسری کتاب اٹھائی۔ کتاب اٹھائی شاید کہنا غلط ہے۔ بکھرے ہوئے ورقوں کو سمیٹا۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا "میں کتاب پڑھ کر الو بنا ہوں"۔ اس جملۂ معترضہ کے نیچے "الو" کے دستخط ثبت تھے۔ ہم نے الو بننا گوارا نہ کیا اور دوسری کتاب کو بیچ میں سے دیکھنے لگے۔ ایک صفحہ پر جنسی امراض، ان کی پیچیدگیوں اور علاج کے بارے میں اشتہار نظر آیا۔ ہمیں اس وقت اس اشتہار سے کچھ مطلب نہ تھا۔ لہٰذا اس کتاب کو رکھ کر ایک

رکھکتاب اٹھائی ۔ ایک صفحہ کے حاشیہ پر اہم نوٹ لکھا ہوا تھا "آپ تھک چکے ۔ باہر جائیے ۔ لائبریری کی کینٹین میں گرم گرم چائے اور سگریٹ پی کر آئیے " ۔ یہ حقیقت تھی کہ ہم تھک چکے تھے ۔ باہر جانے کے بجائے ہم نے ایک اور کتاب اٹھائی ۔ ایک جگہ فون نمبر کے ساتھ یہ جملہ لکھا ہوا تھا "یقیناً آپ مجھ سے مل کر خوش ہوں گے " ۔ کتابوں کے ساتھ اس قسم کا حسن سلوک ہماری برداشت سے باہر تھا کہ ہماری نظر میز پر پڑی جس پر کئی نام مع تاریخ کے کندہ تھے ۔ میز پر سے نظریں ہٹا کر ہم نے ایک کتاب اٹھائی ۔ اس کتاب میں محبوب اور محبوبہ کی تحریری گفتگو اس طرح تھی ۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں ..... مشکل کو جیتنی ہے .... اس دن فلم جنگل میں منگل دیکھنے چلیں گے ..... ٹھیک گیارہ بجے ....."

برداشت کی حد ہو چکی تھی ۔ ہم شکایت کرنے کے ارادے سے اٹھے اور COMPLAINT BOOK طلب کی ۔ متعلقہ آدمی نے اوپر سے نیچے تک ہمارا جائزہ لیا ، آنکھیں باہر نکالیں اور تھوک اڑاتے ہوئے کہنے لگا "کتابیں گراتے ہو ، ٹھوکریں مار کر فرنیچر کو نقصان پہنچاتے ہو اور شکایت بھی کرنا چاہتے ہو ! چوری اور سینہ زوری ! کیا زمانہ آگیا ہے " ۔ ابھی نہ جانے وہ اور کیا کہتا ، ہمیں ڈر ہونے لگا کہیں COMPLAINT BOOK طلب کرنے کی پاداش میں پگڑی نہ اتر جائے ۔ اس لئے لائبریری سے اپنی عزت بچا کر بھاگ آئے ۔

□□

...بقیہ صفحہ ۲۳

اردو ادب میں یقیناً ایک معیاری اضافہ ہوگا اور اہل ادب حضرات سے داد تحسین حاصل کرے گا ۔ بطور خاص ان قارئین سے جو ادب نواز ہوتے ہوئے وفاشناس بھی ہوں ، تو یقیناً جے پی سعید کا نام مثل نگین ہو جائے گا ۔

تقدیس تھی وفا کی جو دل میں تو ہم سعید
چشم وفا شناس میں مثل نگین ہے

خدا کرے کہ حضرت جے پی سعید کی توقعات بر آئیں ۔ وہ مصروف گلگشت رہیں اور محظوظ ہوں اور ہم انھیں اس حالت میں دیکھ کر ان سے اصرار کریں ۔

ہونٹوں پہ تبسم ہے ، باتوں میں ترنم ہے
یہ رات غزل خواں ہے ، کچھ دیر ٹھہر جاؤ

عابدہ رخسانہ

دس کا نوٹ

کل میرا لڑکا مجھ سے دو ہفتے دور رہنے کے بعد ملا۔ اور میں اس کو دیکھتے ہی پھر وہی بات سوچنے لگ گئی۔ جو میں پچھلے چھ برسوں سے اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے ہر وقت سوچتی رہتی ہوں کہ اندرا پارک کے لاوارث بچوں کا کیا ہوگا؟ کیا اُن کا مستقبل کبھی روشن ہو بھی سکے گا یا ہمیشہ یوں ہی تاریکیوں میں ڈوبا رہے گا؟ خیر کچھ بھی ہو مجھے کیا۔ میں نے کل سر جھٹک کر ان خیالات سے چھٹکارا پانا چاہا تھا۔ اور اپنے دل سے سوال بھی کر بیٹھی تھی ان بچوں کے بارے میں مسلسل میں کیوں سوچتی رہتی ہوں؟ کیا میں کوئی سوشیل ورکر ہوں۔ دل نے فوری کہا "تم سوشیل ورکر نہ ہو تو کیا ہوا، ایک انسان تو ہو، انسانیت کے بھی تو کچھ تقاضے ہوتے ہیں"! میں ان باتوں کو بھول کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر اس کے سفر کی روداد پوچھنا چاہتی تھی کہ بتاؤ بیٹا تمہارا سفر اور سمینار کیسا رہا؟ کیوں میرا بیٹا پندرہ دن پہلے نیویارک ایک سمینار اٹینڈ کرنے کے لئے گیا تھا۔ اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس نے اپنے مقالہ کے ذریعہ وہاں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے ہوں گے، تہلکہ مچا دیا ہوگا۔ مگر میں چاہتے ہوئے بھی اس سے یہ سب کچھ نہیں پوچھ سکی۔ کیونکہ کل اس کو دیکھنے کے بعد پھر سے میرے ذہن میں وہی پرانی بات گونجنے لگی کہ ہم اونچے طبقہ کے لوگوں کے بچے تو ترقی کی منازل کسی نہ کسی طرح طے کر لیتے ہیں مگر اندرا پارک کے ان لاوارث بچوں کا کیا ہوگا؟

یہ سوال آج سے چھ برس پہلے اس وقت میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا جب میں اپنے شوہر کے ساتھ اندرا پارک گئی تھی۔ ہم دونوں پارک میں داخل ہوئے تو بہت سارے بچوں نے ہم کو آکر گھیر لیا۔ انھیں میں سے کوئی کہہ رہا تھا "پیسل ای اماں" (پیسے دو اماں) تو کوئی کہہ رہی تھی "آکلی ہوئی تا دی اماں" (بھوک لگ رہی ہے اماں) اور میں اُن کو تعجب سے دیکھ کر

سوچنے لگی تھی

ایم۔ اے۔ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

کر سوچ رہی تھی کہ یہ بچے جو اس ماحول میں پروان چڑھ رہے ہیں کل ان کا مستقبل کیا ہوگا مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہ گئی اور میں نے فوری اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر چند سکے نکال اور ان کی ہتھیلیوں پر رکھ دئے۔ لیکن میں ابھی پیسے دے کر سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ بچوں کی ایک اور پارٹی نے مجھ کو آگھیر لیا۔ اور آگے بڑھنا ہمارے لئے دشوار ہوگیا۔ میں اُن بچوں کو بھی چند سکے دینا چاہتی تھی۔ مگر میرے شوہر نے مجھ کو روک دیا، کہنے لگے،

"مت دو جی پیسے۔ کیا تم بیوقوف ہو۔ یہ تو ان کا روز کا دھندا ہے۔ تم اُن کو کہاں تک دوگی؟ تم اِن کو دوگی تو یہ چند اور بچوں کو بلا لائیں گے"۔

اور میں جواب میں پلٹ کر اپنے شوہر سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ان بچوں کو اس مقام تک کس نے پہنچایا ہے؟ مگر میں ہنس کر ٹال گئی کیونکہ میں ماحول میں تلخی پیدا کرکے اپنے شوہر کا موڈ نہیں بگاڑنا چاہتی تھی۔۔ پھر ہم دونوں ایک پیڑ کے نیچے جاکر بیٹھ گئے۔ تب دو اور بچے بھاگتے ہوئے آکر ہمارے پیر پکڑ کر کہنے لگے،

"پیسل ای اماں پیسل" (پیسے دو اماں پیسے) "پاپا کو آکل آئی تنا دی"۔ (بچے کو بھوک لگ رہی ہے) — اسی وقت میرے شوہر کو پیاس محسوس ہوئی اور انھوں نے بچوں سے پوچھا کہ، کیا وہ ہم کو دو THUMS-UP کے شیشے (باٹل) لاکر دیں گے۔ وہ بچے بات نہ سمجھتے ہوئے بھی پیسوں کی خوشی میں سر ہلا ہلا کر اثبات میں جواب دینے لگے۔ اور میں اپنے پرس سے دس کا نوٹ نکال کر ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھما کر اپنی تشفی کے لئے تلگو میں بولی،

"سوڈو بابو، رینڈو THUMS.UP باٹلس تیسکورا" (دیکھو بابو، دو باٹلس تھمس اپ لے کر آؤ) جواب میں اس کے چہرے پر ایسی مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ جس کو میں ساری زندگی نہیں بھلا پاؤں گی۔ ویسی مسرت کی لہر تو میرے بیٹے کے چہرے پر سمینار کی دعوت کو پاکر بھی نہ دوڑی تھی۔ خیر وہ لڑکا نوٹ پاکر ایسا خوش ہورہا تھا جیسے اس کو ساری دنیا کی نعمتیں مل گئی ہوں۔ پھر وہ وہاں ایک منٹ بھی نہ رُک سکا۔ وہ نوٹ مٹھی میں دبائے بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔ اس کے دوڑنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں رُکا تو اُس سے اس کی مسرت ہمیشہ کے لئے چھین جائے گی — اور میں اس کے دوڑنے کی رفتار کو دیکھ کر بھانپ گئی تھی کہ اب واپس آنے کا نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے واقف ہوجانے کے بعد بھی مجھ کو کوئی دُکھ نہیں ہوا۔ کیونکہ میری نظروں میں دس کے نوٹ سے زیادہ اس لڑکے کے چہرے پر دوڑنے والی مسرت کی لہر کی اہمیت تھی۔ ایسے حسین نظارے انسان کو ہر وقت کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہزاروں روپے

ے کر بھی ہم ایسی سچی مسرت نہیں پا سکتے جتنی اس روز مجھ کو اس دس کے نوٹ کو دینے کے بدلے مل رہی تھی ۔ مگر جب دولڑکا پانچ دس منٹ گذر جانے کے بعد بھی واپس نہ آیا تو میرے شوہر بے چین و بے قرار ہونے لگے کہ وہ لڑکا ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا ۔ اسی دوران ہمارے پاس کھڑی ہوئی وہ لڑکی جو لڑکے کے ساتھ ہی آئی تھی، میرے پیر پکڑ کر کہنے لگی،

" ناکو پدی روپال ای اماں "(مجھ کو بھی دس روپے دو اماں) اس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے شوہر اس سے پوچھنے لگے، اے لڑکی! وہ لڑکا کہاں گیا ؟" مگر لڑکی کیا خاک سمجھتی ۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر اُن کی طرف دیکھنے لگی ۔ پھر میں نے وضاحت کے لئے تلگو میں اس لڑکی سے پوچھی، " آینا ایکڑا پوئی ناکود " (وہ کہاں گیا) یہ سن کر وہ ہنستے ہوئے بولی، ' انی ڈکی، انی ڈکی پوئی انڈو ' (گھر کو، گھر کو گیا) " ناکو پدی روپال ای اماں، تینو لوڑا انی ڈکی پوتا " (مجھ کو دس روپے دو اماں ۔ میں بھی گھر کو جاتی ہوں) یہ سن کر میرے شوہر جو تھوڑی بہت تلگو سمجھ لیتے تھے غصہ سے جھنجلا کر بولے " بدمعاش کہیں کے "۔ ان کے غصے کو سرد کرنے کے لئے میں سمجھانے لگی " آپ اس قدر ملال کیوں کر رہے ہیں ۔ صرف دس روپے ہی کا تو نقصان ہوا ہے ۔ لیکن کیا آپ نے غور کیا کہ اُس دس روپے کے بدلے میں لڑکے کے چہرے پر کیسی مسرت کی لہر دوڑ رہی تھی ۔

" چلیے جانے دیجیے ۔ شاید ہم پر کوئی بلا آنے والی تھی جو اس طرح ٹل گئی "۔ میرے اس طرح سمجھانے اور دھیان بٹانے پر میرے شوہر کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا اور وہ کچھ پر سکون ہو گئے ۔ مگر ان کا پرسکون ہونا غضب ڈھا گیا ۔ اُن کے پرسکون اور شگفتہ ہوتے ہی اُن کے اندر کی اصل فطرت جاگ اُٹھی اور وہ لڑکی کو گھورنے لگے ۔ میں اپنے شوہر کو اس انداز سے ایک اجنبی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پاکر بے چین ہو گئی ۔ اور مجھ کو اپنے شوہر کا اس طرح لڑکی کو گھورنا کچھ اچھا نہ لگا ۔

میں نے جھنجلا کر لڑکی سے کہا " پو بلا پو " (جا لڑکی جا) " یہاں مردوں میں کیوں کھڑی ہے ؟" مگر وہ بدستور اسی طرح جمی رہی ۔ پھر میں نے اس کو ٹلانے کی خاطر دو چار بچی ہوئی گٹھلیاں اس کے ہاتھ میں تھما دیں ۔ مگر وہ کافی ڈھیٹ تھی ۔ یا تو اس کے حالات نے اس کو ڈھیٹ اور بے غیرت بنا دیا تھا ۔ وہ وہاں سے نہ گئی ۔ وہ مسلسل ایک ہی بات کہہ رہی تھی،

" ناکو کوڑا پدی روپال ای اماں " (مجھے بھی دس روپے دو اماں) ۔

تب میرے شوہر نے مسکراتے ہوئے مگر بظاہر غصہ کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا " اے لڑکی !

... باقی صفحہ ۲۰ پر ...

سی. ایچ. سدانندم

نگہبان

لوگوں میں عجیب سا خوف اور دہشت دیکھ رہا ہوں۔ ہر انسان کے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی اور عجیب سی ہراسانی نظر آتی ہے اور وہ اس طرح ایک سوچ میں ڈوبا رہتا ہے کہ جس طرح ایک نشہ باز اپنے نشہ میں ڈوب کر اپنے تمام غموں کو بھی اسی نشہ میں ڈبو دیا ہو۔ آج کل انسان اس طرح بھاگ دوڑ کر رہا ہے جس طرح کہ اچانک ایک طوفان آنے سے وہ بھاگ دوڑ کرتا ہو۔ اور بھاگتے بھاگتے کسی محفوظ مقام کی تلاش کرتا ہو۔ اور تلاش کرتے کسی پیڑ یا چھت کے نیچے ٹھہر جاتا ہے۔ وہ پیڑ اور چھت اسی وقت تک بارش میں بھیگے ہوئے مسافر کو سہارا دے سکتے ہیں جب تک وہ طوفانی بارش سے مقابلہ کرنے کی قوت برقرار رکھ سکیں۔ جب طوفانی بارش تیز اور تیز تر ہو جاتی ہے تو وہ پیڑ اور چھت بھی کمزور ہو جاتے ہیں اور اچانک اس بارش میں بھیگے مسافر پر گر جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے دوسرے کو اس وقت تک سہارا دے سکتی ہے جب تک اس شے میں خود سنبھلتے ہوئے دوسر کو سہارا دینے کی قوت موجود ہوتی ہے۔

میں آپ کو مزید کھلے الفاظ میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ ایک ملاح اپنی کشتی میں چند مسافروں کو سوار کروا کر انھیں دریا کے اس پار لے جانے کے لئے اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور اگر اس سفر میں اچانک طوفان آجائے پھر بھی اللہ کے سہارے کشتی چلاتا ہے۔ طوفان کی وجہ سے دریا کا پانی خطرناک موجیں بن کر اونچا اٹھنے لگے تب بھی ملاح اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ان مسافروں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور جب ملاح کی قوت ان موجوں سے ٹکراتے ہوئے کمزور پڑ جاتی ہے تو وہ خود بھی ڈوب جاتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کشتی میں سفر کرنے والے مسافر بھی ڈوب جاتے ہیں۔

آج ریاست آندھرا پردیش میں فرقہ پرستی کی ناؤ بہت تیزی سے چل رہی ہے۔ یہاں کی

مکان نمبر 54-1-16 سعید آباد — حیدرآباد

جلی تہذیب بھی اس ناؤ کے ساتھ چل رہی ہے۔ صبح اٹھتے ہی ہر روز اخبار میں یہ خبر پڑھتے ہیں
یہاں خون ہو گیا وہاں خون ہو گیا۔ ایک جگہ آتشزنی کے واقعات پیش آتے ہیں تو دوسری
امات پر لوٹ کھسوٹ اور قتل کی وارداتیں پیش آتی ہیں۔ فرقہ پرستی کا ایک بہانہ ہے
، بہانے کے پیچھے کئی بے شمار المناک واقعات ہو رہے ہیں۔ کئی بے گناہ موت کے منہ
، جا رہے ہیں۔ اور کئی افراد خاندان خون کے آنسو رو رہے ہیں اور طرح طرح کے مظالم
شکار ہو رہے ہیں۔

فرقہ پرستی کے پیچھے لوگ اپنی پرانی عداوتوں کی پیاس کو بجھا رہے ہیں۔ سرکار قانون
جتنا سر کچلنا چاہتی ہے یہ اتنے ہی شر پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں
اپنے ملک کی تہذیب اور تمدن سے پیار و محبت نہیں رہا۔ جنھیں اپنی آبرو پیاری ہوتی ہے
میں اپنے ملک کی تہذیب پیاری ہوتی ہے وہ ایسی حرکات نہیں کرتے۔ لوگوں میں دن بدن
انگیزی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اور ساتھ ساتھ خوفِ خدا بھی اٹھتا جا رہا ہے۔ خدا کی ہستی
بھول کر انسان اپنی ہستی سے کام لے رہا ہے۔ انھیں یہ بستیاں اجاڑنے کے لئے ایک
منٹ بھی نہیں لگتا۔ انھیں بسانے کے لئے کئی سال درکار ہوتے ہیں۔ ان اجڑی ہوئی بستیوں
اگر دوبارہ بسایا بھی جائے تو رونق پھر دوبارہ لوٹ کر واپس نہیں آتی — وہ محبت
ٹ کر آتی ہے اور نہ وہ بہاریں پھر واپس آتی ہیں۔

ان حالات میں انسان کی حفاظت کوئی نہیں کر سکتا۔ اللہ ہی ایک ایسی واحد طاقت
ہے جو انسان کو ہر آفت سے نجات دلا سکتی ہے جو لوگ اب مٹ رہے ہیں اور برباد ہو رہے ہیں
، یہ خدا کو یاد کریں تو شاید خدا ان پر مہربان ہو کر اپنی رحمت برسا سکتا ہے۔ جب تک انسان اللہ
، راستے پر نہ جائے گا تب تک وہ یوں ہی بھٹکتا رہے گا۔ وہ یوں ہی آئے گا اور یوں ہی چلا جائے گا۔
سان اگر یہ جان لے کہ انسان کا وجود کیا ہے، خدا انسان کو دنیا میں کیوں بھیجا ہے۔ انسان کے
فرائض ہیں، انسان کو دنیا میں آکر کیا کرنا ہے، وہ کیا لے کر آیا ہے اور کیا لے کر جائے گا؟
لہٰذ کے راستے پر جب تک ہم نہیں چلیں گے تب تک ہمیں اپنی منزل نہیں ملے گی۔ اور ہمارا مقصد
را نہیں ہوگا۔ میں نے اپنے یہ ناچیز الفاظ میں صاف صاف واضح کر دیا کہ کوئی شے انسان کو
س وقت تک سہارا دے سکتی ہے جب تک اس شے میں اپنے آپ سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو۔ وہ
نسے انسان کو کیا سہارا دے سکتی ہے جو شے خود کمزور ہو۔ میں نے آپ کو اللہ کا واسطہ دیا تھا
للہ لازوال ہے، دنیا کی ہر چیز میں خدا کی قدرت بسی ہوئی ہے۔ اللہ ہر بندے کی آفت میں کام آیا

ہے اور کام آتا رہے گا۔ لیکن کوئی بندہ اسے نہیں پکار رہا ہے۔ لوگ دولت کے نشہ میں حکومت قانون اور سماج کو اپنی مٹھی میں باندھ رکھے ہیں۔

ہر چیز کے نشے کی ایک مدت ہوتی ہے۔ انسان پر اگر کوئی چیز کا نشہ بالکل طاری ہے تو انسان کو بعض اوقات جان کے لالے پڑجاتے ہیں اور اس نشہ کو اتارنے کے لئے کچھ نہ کچھ طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

خدا ایک روز ضرور انسان پر سے دولت کا نشہ اتارے گا۔ چونکہ دولت خطرناک آگ کی طرح پھیل رہی ہے۔ یہ آگ بستی بستی، جنگل جنگل، شہر شہر پھیل رہی ہے اس آگ بجھانے کے لئے پانی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

خدا ایک روز ایسی بارش برسائے گا کہ جو آگ پھیل رہی ہے وہ اپنے آپ ٹھنڈی ہو جائے شاید آگ لگانے والوں کو یہ نہیں معلوم جو آگ اوروں کو جلانے کے لئے لگاتا ہے وہ بھی ایک روز آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ آج انسان تعلیم، دولت اور کاری گری میں بہت آگے نکل ہے اور اپنے آپ کو کسی سے چھوٹا محسوس نہیں کر رہا ہے۔ وہ کسی کا فرماں بردار اور اطاعت گذ بھی بننا پسند نہیں کر رہا ہے اور نہ وہ کسی کو اپنا آقا اور محسن تصور کر رہا ہے اگر وہ اپنی قوت میں کمی محسوس کر رہا ہے تو دولت کے بل بوتے پر وہ دوسرے کو خرید کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر ہے۔ اور اپنی ریاست چلا رہا ہے۔ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ کاریگر اور ایک دانشور اور بھی جو اپنی سیاست میں کسی کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ چپ چاپ تماشے دیکھ رہا ہے۔ انسان کی سیاست کیا ہے جو اللہ کی سیاست اور اس کی طاقت سے محروم ہے۔ ایک روز مالک دنیا سب سے بڑا حکمراں بن کر اپنی ریاست چلائے گا۔ مالک کی سیاست انوکھی اور نرالی ہے اس کی سیاست کے آگے کسی کی سیاست نہیں چلے گی۔ اگر صحیح معنوں میں جانچا جائے تو ہم کو خدا کی سیاست میں حصہ لینا چاہیئے۔ چونکہ خدا کی سیاست بے غرض ہے پاک ہے۔ دنیا کے سیاست داں اپنی سیاست سے انسان کو اپنی سیاست میں شامل کرتے ہیں۔ انسان کی سیاست تباہ کن اور ناجائز ہے اگر اللہ کی سیاست میں شامل ہو جائے تو انسان کو کوئی خوف نہیں رہے گا۔ اور اسے اپنا حق برابر ملے گا اور اسے صحیح زندگی بھی ملے گی اور ساتھ ساتھ صحیح خوشی بھی ملے گی۔

میں خدا کی سیاست میں شامل ہو کر خدا کا فرماں بردار اور اطاعت گذار بننا چاہ رہا ہوں۔ اگر کوئی میرے ساتھ آنا چاہے تو آسکتا ہے۔ اب بھی وقت ہے سمجھنے کے لئے اور سنبھلنے کے لئے۔ خدا کی سیاست میں وہی شامل ہو سکتا ہے جو اللہ کے احکام کی پابندی کرتا ہے۔ دنیا کے سیاست داں

اپنی سیاست چھوڑ کر اگر اوپر والے کی سیاست میں حصہ لیں تو وہ دنیا کا سب سے بڑا کامیاب سیاست داں بن کر نظر آئے گا۔ چونکہ اللہ کی سیاست ایک کامیاب سیاست ہے اس کی سیاست میں جھوٹ اور فریب نہیں ہے۔

اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی جماعت میں کسی کو شامل ہونے کے لئے خوشامد کرتا ہے اور نہ کسی کو لالچ دیتا ہے اور ساتھ ساتھ نہ وہ کسی کے ساتھ وعدہ کرکے ٹال مٹول کرتا ہے اس کی سیاست اٹل اور مستقل ہے لیکن یاد رکھو کہ اس کی سیاست میں شامل ہونے کے بعد کسی کی سیاست نہیں چل سکتی۔ اللہ کی نظر میں وہی کامیاب سیاست داں ہے جو اس کے احکام کی پابندی کرتا ہے وہ اس کے احکام کی پابندی کرکے اس کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے مالامال ہو جاتا ہے۔ اللہ کی ریاست بہت بڑی ہے وہ کسی کی اکثریت کے بغیر ہی اپنی حکومت چلا سکتا ہے اس کی جتنی ساری حکومت ہے وہ ہماری ہی ہے۔ وہ اپنی ملکیت کو برابر حصوں میں بانٹ دیتا ہے ہم سب مل کر اللہ کی ملکیت کو برابر حصوں میں بانٹ لینا چاہیئے۔ اللہ اپنے بندوں سے اس وقت خوش ہوتا ہے جب کہ بندے آپس میں ایک دوسرے کو غیر نہ سمجھیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ سکھ دکھ میں برابر کے شریک ہوں۔ ہم سب اللہ کے بندے ہیں یہ سمجھ کر اگر ہم ہمیشہ چلتے رہیں تو اللہ ہم کو ہر آفت سے بچاتا رہے گا۔ ہم اللہ کو خوش رکھیں تو وہ بھی ہم کو خوش رکھے گا۔ جو بندہ اللہ کے تابع ہو جاتا ہے اللہ اس بندے پر مہربان ہو جاتا ہے۔ جب ہم اس کے تابع ہو جاتے ہیں تو خدا نگہبان بن کر ہماری ہر طرح سے نگرانی کرتا ہے۔ جب وہ نگہبان بن کر ہماری نگرانی کرتا ہے تو کسی کی کیا مجال کہ کوئی بھی کسی کو پامال کر سکے۔ ▭▭

سلسلہ صفحہ ۲۰ سے

اور تب سے آج تک میں مسلسل یہی سوچ رہی ہوں کہ اندرا پارک اور نہ جانے کن کن پارکوں میں گھومنے اور بھیک مانگنے والی، بھونروں کے بیچ ہر وقت گھری رہنے والی ان کومل کلیوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ کاش کوئی اُس دس کے نوٹ میں جو میرے شوہر نے ایک مسکراہٹ کے عوض اس لڑکی کو دینا چاہا تھا اور اس دس کے نوٹ میں جو میں نے اُس لڑکے کو دیا تھا، ان دونوں کے فرق کو سمجھ سکے اور ان کے درمیان کے فاصلے کو چمن کی کومل کلیوں کی بقاء کے لئے پاٹ سکے۔

اوہ خدایا! میں تو پھر سے انہی باتوں میں اُلجھ گئی کہ اُن کا کیا ہوگا؟ — اور میرا بیٹا کل دو ہفتے مجھ سے دور رہنے کے بعد میرے پاس آیا ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ میرے پاس بیٹھنا چاہتا ہے۔ میں نے کل سے آج تک اس پہ بہت ظلم کیا ہے — نہیں اب مجھ کو تھوڑی دیر کے لئے ان ساری باتوں کو بھول کر اس کے پاس اس کے کمرے میں اس کی خوشی کے لئے جانا چاہئے۔

محمد مرتضیٰ علی خاں ناظر

سُراغ رسانی اور تفتیش

کالو عرف کلّن خاں عرف کلوا، نیپال اور پیلی بھیت (یوپی) کا مشہور ڈ

ملزم کلن خاں علاقہ نیپال اور صوبہ یوپی کا ایک مشہور اشتہاری ملزم تھا جو کم از کم چالیس مقدمات قتل میں مطلوب تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے حالات اور اس نے جو جرائم کئے تھے ان کی تفصیل اور اس کی گرفتاری کے حالات اگر تفصیل سے لکھے جائیں تو وہ خود ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ اس کے حالات اس عنوان کے تحت جس قدر ضروری ہیں اس حد تک اختصار سے بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور کچھ اس کے وہ حالات بھی لکھ دیئے جاتے ہیں جن سے اس کے کردار کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

بتاریخ ۲۲ فروری ۱۳۵۱ فصلی مطابق ۲۳ فروری ۱۹۴۲ء کو دو شخص جو چپل بازار میں فرضی ناموں کے ساتھ رہتے تھے، سکہ بنانے کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ایک نیپال کی رہنے والی عورت بھی پائی گئی جس کو انہوں نے سکینہ کا نام دے رکھا تھا۔ ان کی جامہ تلاشی میں دو ریوالور بھی نکلے۔ والد صاحب قبلہ نے جب ان سے حالات دریافت کئے تو اس کا انکشاف ہوا کہ ان میں سے ایک کا نام کالو عرف کلن خاں عرف کلوا ہے دوسرے کا نام گیسو رائی ہے۔ یہ دونوں صوبہ یوپی پیلی بھیت کے رہنے والے ہیں۔ کلن خاں کی گرفتاری کے لئے (۱۵۰۰) روپے کا انعام اور گیسو رائی کی گرفتاری کے لئے (۱۰۰) روپے کا انعام تو یوپی حکومت نے مشتہر کیا تھا اور نیپال کی حکومت نے بھی متعدد انعامات ان گرفتاریوں کے لئے مقرر کئے تھے۔

کلن خاں نے خود کی جو ہسٹری دی وہ مختصراً یہ تھی کہ وہ بچپن سے جرائم کا عادی ہے۔ کئی بار جیل گیا۔ مقدمات چلے لیکن کبھی سزایاب نہ ہو سکا۔ جس سے اس کی ہمت بڑھی اور یہاں تک کہ پیلی بھیت میں قتل اور ڈاکہ کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ جب اس کی تلاش شروع ہوئی تو وہ متصلہ نیپال کے علاقہ میں چلا گیا۔ جہاں اس نے ڈاکوں کے کاروں لوٹ کے سلسلہ میں جا لگے۔

انسانی جان کی اس کے پاس کوئی قیمت نہ تھی۔ اس نے نیپال کے ایک پہاڑی علاقہ پر قبضہ کر کے نیپال کے مستقر پر اطلاع ہونے اور فوج پولیس آنے تک اس نے حکومت کی۔ اسے معلوم ہو جاتا کہ کوئی اس کی مخالفت کرنے والا ہے تو وہ اس کو درخت سے الٹا لٹکا دیتا اور نیچے آگ لگا کر زندہ جلا دیتا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے تلوار سے، کلہاڑیوں سے، آگ سے، پانی میں ڈبو کر اتنے آدمی ہلاک [illegible] کہ اب اس کو ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ کم از کم ۵۰ آدمی تو اس [illegible] قتل کئے ہوں گے۔ پندرہ بیس گاؤں تو اس نے ضرور جلائے ہوں گے۔ اب زیادہ کی تو وہ حد مقرر نہیں کر سکتا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ قصہ کہانیوں کے ڈاکوؤں کی طرح مال دار آدمیوں کے پاس پیام روانہ کرتا یا چٹھی روانہ کرتا کہ اتنی رقم فلاں جگہ کلوا کے لئے رکھ دو۔ ورنہ جان سے ہاتھ دھو لو۔ سینکڑوں آدمیوں نے رقم رکھی اور وہ کام میں لایا۔ اور درجنوں آدمیوں نے رقم نہیں رکھی تو اس نے ان کو مار ڈالا۔ پیلی بھیت کی پولیس، فوج اور نیپال کی پولیس نے کئی مرتبہ اس کو اپنے گھیرے میں لیا۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ نام رستم بہ از رستم کے مصداق جب وہ ایک بار کلوا کہہ کر للکارتا تو پھر پوری فوج اور پولیس کے ہتھیار اس کی ہیبت سے گر جاتے یا وہ اپنا منہ اس کے راستہ سے پلٹا کر کھڑے ہو جاتے اور وہ ان کے درمیان سے بھاگ جاتا۔ اس نے چھ ماہ تک ایک نیپال کے علاقہ کی جاگیر پر قبضہ کیا، جاگیردار اور گاؤں کے تمام لوگ بھاگ گئے اور جو باقی بچے اس نے جلا دیئے اور جاگیردار کی بیوی رام کماری کو اور اس کی ماں کو ساتھ لیا اور اپنے ساتھی گیسوؤں کے ساتھ چند روز قیام کے بعد وہاں سے نکل پڑا۔ اس لئے کہ اب ہر طرف سے اسے گھیرے میں لینے کی نیپال اور یوپی کی پولیس اور فوج نے مشترکہ کارروائی شروع کر دی تھی۔ اور دوسری وجہ اس بھگنے کی یہ بتائی کہ ہر ضلع میں لوگوں نے ٹولیاں بنا کر اس کے نام کلوا سے استفادہ شروع کر دیا۔ اس میں سے چند پکڑے گئے اور جھوٹے کلوے ثابت ہوئے۔ اس لئے اب اس نے دیکھا کہ کلوا نام کا جادو پہلے کے اتنا موثر نہیں رہا اس لئے پہاڑوں میں ان عورتوں کی وجہ سے چھپنا چھپانا مشکل پایا تو رام کماری کو نہر پر پانی نہانے کے بہانہ سے روانہ کر کے اس کی ماں کے گلے پر انگوٹھا رکھ کر مار ڈالا۔ رام کماری آئی۔ اس نے ماں کی نعش دیکھی اور سمجھ بھی گئی۔ لیکن کچھ کر نہ سکی۔ وہ چھپتے چھپاتے نیپال کے اس علاقہ پہنچ گیا جہاں فوج اور پولیس کا انتظام نہ تھا۔ اور نیا گورکھپور یوپی کے دوسرے ضلع میں داخل ہوا اور وہاں سے بمبئی آ گیا۔ بمبئی میں سکونت اختیار کرلی۔ اس نے رام کماری کا نام سکینہ رکھ کر اس سے عقد کیا۔ سرمایہ جو ساتھ تھا وہ ختم ہوتے [illegible] بمبئی سے یوپی کے چار ساہوکاروں کو رقم فلاں مقام پر رکھ دو ورنہ جان سے

تہ دھولپور۔ کلوا کے نام سے خط لکھے۔ خود یوپی گیا۔ دو مقامات پر تو اس کو رقم ملی اور جن دو مقامات پر رقم نہ ملی بلکہ پولیس نظر آئی تو اس نے موقع پاکر دوسرے اور تیسرے دن ان دو آدمیوں کو قتل کیا اور پھر بمبئی آگیا۔ بمبئی میں اس نے محسوس کیا کہ اس کا شاید پیچھا کیا جارہا ہے (حالانکہ ایسا نہ تھا) تو وہ حیدرآباد ریاست کو مسلم ریاست جائے پناہ ہونا خیال کرکے آیا۔ چپل بازار میں غلّہ کی دکان فرضی نام سے لگائی۔ لیکن وہ چل نہ سکی۔ تو جعلی چونی بنانا شروع کیا۔ رام کمار کی (بلیک میلنگ) اس کی سختی ویسی ہی جاری تھی۔ اس لئے اس نے شاید اسے گرفتار کرادیا۔ یہ اس کا خیال تھا اور ایک حد تک صحیح بھی تھا۔ یہ تھی اس کی کہانی اسی کی زبانی جس سے اس بے رحم اور ظالم کے کردار کا کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔

والد صاحب قبلہ نے یوپی کی پولیس کو مطلع کیا کہ گواہان کو لاکر وہ کلوا کی شناخت کریں۔ اور اس کے پیر میں بیڑیاں ڈال کر دفتر میں اس سے صفائی کا کام عام مجرمین کی طرح لینے لگے تاکہ اسے احساس برتری خود کی نسبت تھا وہ نہ رہے۔ اور وہ اس پر اعتراض کرتا اور کہتا کہ جہاں دنیا اس کے نام سے کانپ اٹھتی ہے اور فوج اور پولیس ہتھیار تک اس کی آواز کے سننے کے بعد نہیں اٹھا سکتی، اس کے ہاتھ میں جھاڑو دے دی گئی۔ یہ سب وہ کہتا قسمت کے کھیل ہیں۔ پولیس یوپی ٹال مٹول کرتی رہی کہ وہ کلوا نہ ہوگا۔ کوئی اور کلوا ہوگا۔ کیونکہ کے نیپال سے نکلنے کی کوئی اطلاع وہاں نہ تھی۔ بڑی مشکل سے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس دو گواہوں کو لے کر آئے۔ والد صاحب کے کمرے میں بیٹھے۔ والد صاحب قبلہ نے کہا کہ "بلاؤ کلوا کو" تو میں نے دیکھا کہ وہ آدمی کانپنے لگا تھے۔ اور انہوں نے کہا کہ انہیں مت بلائیے۔ انہوں نے کہا "تو جانے دیجئے۔ نہ بلاؤں گا۔ اس کو حوالات میں بند رکھا ہوں۔ وہاں گواہوں کو لے چل کر دیکھ لیجئے"۔ اس پر بھی نہ تو پولیس عہدہ دار ہی تیار ہوا، نہ گواہ۔ ان کے ذہن میں نہ معلوم کس طرح یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کلوا کے پاس کوئی تعویذ یا جادوئی طاقت ہے۔ وہ گواہوں کو دیکھتے ہی ان کی جان لے لے گا۔ ان کے اس طرز عمل سے خفیہ پولیس بلدہ والوں کو بھی کلوا یا کلن خاں کی اہمیت معلوم ہوئی۔ والد صاحب قبلہ سمجھ گئے کہ نفسیاتی طور پر وہ لوگ اتنے متاثر ہیں کہ ملزم کا سامنا کرنے سے معذور رہے ہیں تو انہوں نے ان تینوں کو باتوں میں لگا لیا۔ اور خود کے کمرے کی چلمن کھلوادی۔ اس کمرہ کی چلمن پر پڑے ہوئے دروازے سے صدر محکمہ کا میدان نظر آتا تھا۔ ان لوگوں سے کچھ نہ کہہ کر شیخ احمد جمعدار سے کہہ دیا کہ وہ کلن خاں کو اس میدان میں دور تک لے جائے۔ اور پھر اس سے باتیں کرتے ہوئے واپس خفیہ کے دفتر کی طرف آہستہ آہستہ لائے اور کچھ دیر دروازے کے سامنے کھڑا ہو جائے۔

ں نے اسی طرح عمل کیا۔ تب انہوں نے گواہوں سے کہا کہ اس چلمن کی طرف دیکھو، تو وہ دونوں دیکھ
والد صاحب کی طرف کھسکنے لگے۔ پولیس عہدہ دار نے بھی دیکھا۔ جب شیخ احمد ملزم کو اندر لے جا چکا
ان لوگوں نے ذرا سنبھل کر کہا کہ یہی کلوا ہے۔ واپس جانے کی اجازت چاہنے لگے۔ والد صاحب
نے اس طرح گھیسو رائی کو بھی بتالیا اور یقین تو خیر پہلے بھی تھا کہ وہ وہی ظالم لوگ ہیں۔ لیکن
مد تصدیق ہوگئی۔ ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ تحویلی کارروائی اپنی عدالت میں شروع کر دیں۔ حیدرآباد
بلا لائسنس ریوالور رکھنے کے الزام میں پہلے مقدمہ چلایا جائے گا۔ بعد ملزمین کو تحویل
دیا جائے گا۔

والد صاحب قبلہ نے ان دونوں کو بہ علت تلبیس سکہ چالان عدالت کیا اور ناظم دوم عدالت
بداری بلدہ کے اجلاس پر مقدمات کی سماعت شروع ہوئی۔ اور مفتش مقدمہ مولوی مرزا دلاور
بیگ صاحب صدر امین مشیرآباد کا بیان قلمبند ہونے لگا۔ یہ واقعہ ۹ر اردی بہشت سنہ ۱۳۵۱ فصلی
یعنی ۱۳ر مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کا ہے۔

گواہ کے کٹہرے میں مرزا دلاور علی بیگ صاحب کھڑے بیان دے رہے تھے۔ دونوں ملزمین، ملزمین
کٹہرے میں تھے۔ ملزم کلن خاں عرف کلوا نے عدالت سے کہا کہ اس کی سماعت میں فرق ہے، وہ کٹہرے
سے گواہ کا بیان نہیں سن سک رہا ہے۔ اب وہ جرح کیا کرے گا اور اگر اس ریاست کا یہی قانون
ہے کہ ملزمین کو جرح کا حق نہیں دیا جاتا تو جو سزا چاہیں وہ دیں۔ لیکن انصاف تو یہ ہے کہ اسے گواہ
بیان سننے اور جرح کرنے کا موقع دیا جائے۔

ملزم کا الزام قانونی اور بالکل صحیح تھا۔ حاکم عدالت نے اجازت دے دی کہ ملزم کو کٹہرے سے
اس کے قریب لایا جائے۔ کلوا وہاں کھڑا ہو کر جرح کرنے لگا۔ اور دلاور علی بیگ صاحب پر اشتعال
انگیز قسم کے سوالات کرنے لگا۔ کہ انہوں نے اس کی بیوی کی خوبصورتی دیکھی، اس کو پسند کیا وہ
تھے کہ وہ اس پر عاشق ہوگئے۔ اس پر دلاور علی بیگ صاحب کو فطری طور پر جوش آیا۔ اور وہ
رب کی طرف سے ملزم کی طرف رخ کرکے اس کے جوابات دینے لگے۔ ملزم مشرق کی طرف اور قریب
ہ آگیا۔ والد صاحب قبلہ نے خطرہ محسوس کیا۔ اور وہ ان کے درمیان آکر کھڑے ہوگئے اور دلاور علی
صاحب سے کہا" وہ عدالت کو جوابات جنوب کی طرف رخ کرکے دیں اور ملزم کی طرف نہ دیکھیں"۔
ں طرح ان پر جرح ختم ہوئی۔ والد صاحب نے دلاور علی بیگ صاحب کو فوراً اجلاس سے باہر کر دیا۔
ب چیمبر کے دروازہ میں سکینہ (رام کماری) بیٹھی ہوئی ملزم کے خلاف شہادت دے رہی تھی۔ اور
زم اس پر جرح کر رہا تھا۔ والد صاحب ان کے درمیان اجلاس کے اوپر کھڑے رہے۔ ملزم کلن خاں

نے جرح ختم کرلی : حاکم عدالت کچھ کہنے ہی والے تھے کہ پھر اس نے قانونی عذر اٹھایا کہ " یہ کیا انصاف ہے کہ الزامات ہم دونوں ملزمین پر ہیں۔ گیسورانی کو تو جرح کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا !" گیسورانی بھی کٹھرے کے قریب بہ اجازت عدالت آیا اور اس نے سوال کیا ۔ " کیا بھائی میرے پاس بھی ریوالور تھا کیا ؟"

بس یہ سوال تو سُنا گیا اس کے بعد کیا ہوا کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ کلن خاں نے چھلانگ لگائی حالانکہ اس کے پیر میں بیڑیاں تھیں ۔ اور کٹھرا پار کرکے چیمبر کے دروازہ میں سکینہ کا برقعہ پکڑ چکا تھا ۔ قریب تھا کہ وہ اس کی گردن مروڑ دے' والد صاحب جو درمیان میں تھے اس (کلن خاں) کو لپٹ گئے ۔ والد صاحب نے ایک پیر سے سکینہ کو چیمبر میں ڈھکیلا اور اس کا برقع سلک کا تھا وہ پھسل گیا ۔ کلن خاں کے ہاتھ میں برقعہ رہ گیا۔ اور سکینہ کی جان بچ گئی ۔ اب والد صاحب اور کلن خاں میں کشتم کشتی شروع ہو چکی تھی ۔ کلن خاں نے والد صاحب کا پیر توڑ دیا۔ ان کے کولہے کی ہڈی (Neck of Femur) ٹوٹ چکی تھی ۔ گارڈ کے پولیس والے باہر سیٹیاں بجاتے بھاگ گئے ۔ والد صاحب کے ہی ایک ماتحت شیخ احمد جمعدار نے ان کی مدد کی اور کلن خاں پر قابو پا لیا گیا ۔ وہ بھی ایک بار جوش میں اٹھ گئے ۔ لیکن پیر کے درد سے چیخنے لگے " مرا مرا " ۔ اس طرح وقت پر فوراً عمل کرکے ایک جان کو بچانے میں انہوں نے کامیابی حاصل کی ۔ ان کو دواخانہ عثمانیہ میں (۹) ماہ تک زیر علاج رہنا پڑا ۔ محکمہ سرکار کی منظوری سے علاج کے اخراجات سرکار نے برداشت کئے اور اس (۹) ماہ کے عرصہ کو ڈیوٹی پر شمار کیا گیا۔ اس مقدمہ میں بعد کی پیشیوں پر ملزمین جیل سے عدالت نہ لائے جا سکے۔ اور حاکم عدالت نے جیل جا کر ان کو فرد جرم سنائی اور مقدمہ سپرد سیشن کر دیا۔

کلن خاں نے جیل سے والد صاحب قبلہ کے پاس معذرت نامہ روانہ کیا کہ اس کا ارادہ ان پر حملہ کا قطعی نہ تھا لیکن وہ اس کے نشانہ کو ہمیشہ اُڑاتے رہے ۔ وہ ارادہ کرکے آیا تھا کہ سکینہ نے اس کو دلاور بیگ صاحب کے ہاتھوں پکڑوا دیا ہے ۔ انعام کی خاطر ۔ تو دلاور علی بیگ صاحب کی تو وہ ناک کتر لینا چاہ رہا تھا ۔ اس لئے اس نے ان کو اشتعال دلایا اور وہ مغرب کی طرف دیکھنے لگے اب ان کے ذرا جھکتے ہی وہ اچک کر ان کی گردن پکڑ کر ناک کھا جانا چاہتا تھا ۔ وہ درمیان میں آگئے ۔ اور اسے اس کے مقصد میں ناکامی ہوئی ۔ پھر سکینہ کی وہ جان لے لینا چاہتا تھا ۔ اس کی جرح کے دوران انہوں نے اسے موقع نہ ملنے دیا تو اس نے گیسورانی کی جرح کا عذر کرکے موقعہ لیا۔ گیسورانی کو جب لایا گیا تو اس نے اجلاس پر کودنے کا موقع لے ہی لیا۔ سکینہ کو بھی انہوں نے بچالیا۔ اور دھکا مکی میں ان کا پیر ٹوٹ گیا ۔ حالانکہ اس نے ان کی نسبت کوئی ارادہ نہیں کیا

تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ خفیہ پولیس کی حوالات میں بہترین سلوک کیا گیا تھا۔ اس نے جو کھانا اُسے ملتا رہا تھا۔

اب کلن خاں اور گیسو والے کا جو انجام ہوا وہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ تلبیسِ سکّہ کے مقدمہ میں سپردِ سیشن ہو گیا تھا جس کی سماعت تو ملتوی ہو چکی تھی۔ شاید یو۔پی کی تحویلی کارروائی کے سلسلہ میں یا والد صاحب قبلہ کے حملہ کے سلسلہ کے مقدمہ میں ناظم صاحب اول، عدالتِ فوجداری بلدہ کے اجلاس پر پیشی تھی۔ ملزمین جیل سے عدالت میں نہیں لائے گئے اور نہ کوئی وجہ ظاہر کی گئی۔ ناظم صاحب نے جیل سے دریافت کروایا تو معلوم ہوا کہ ملزمین کی نسبت عہدہ داران جیل کو بھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ملزمین کو حکومت کے احکام کی بناء پر خان سردار فضل احمد خاں صاحب، نائب ناظم کوتوالی اضلاع (D.I.G.) کے سپرد کیا گیا تھا۔ نہ معلوم وہ کہاں لے گئے؟ کیوں لے گئے؟ کب ملزمین آئیں گے؟ کچھ نہیں معلوم۔ چند روز کے بعد علم ہوا کہ ملزمین یو۔پی روانہ کر دیئے گئے ہیں۔ اور برٹش انڈیا سے بتوسط رزیڈنٹ حیدرآباد ملزمین کی منتقلی کے سلسلہ میں یہ ہدایات آئی تھیں کہ:

۱۔ ملزمین کی حیدرآباد سے یو۔پی کی روانگی کو راز میں رکھا جائے اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار حتیٰ کہ عدالت کو بھی مطلع نہ کیا جائے۔

۲۔ دو ملزمین کی حفاظت کے لئے کم از کم تیس مسلح آدمیوں پر مشتمل گارڈز کا انتظام کیا جائے۔

۳۔ گارڈ کا انچارج D.I.G. (ڈی آئی جی) سے کم عہدہ کا کوئی عہدہ دار نہ ہو۔

۴۔ ملزمین کو حیدرآباد اسٹیشن سے ریل میں سوار نہ کرایا جائے۔

۵۔ ملزمین کو شہر سے دور کم از کم (۵۰) میل کے فاصلہ پر کسی غیر معروف اسٹیشن سے سوار کرایا جائے۔

۶۔ ریل کی ایک پوری بوگی ان کے لئے مختص رکھی جائے۔

۷۔ بوگی کے دروازے کھڑکیاں بند رکھے جائیں۔

۸۔ ملزمین کے منہ پر نقاب ڈال کر لایا جائے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ملزمین کو قاضی پیٹ سے ادھر کسی اسٹیشن پر پہلے سے تیار رکھی ہوئی بوگی پر سوار کرایا گیا۔ جو گرانڈ ٹرنک ایکسپریس میں لگائی گئی۔ اور جھانسی پر یہ بوگی کاٹ کر دوسری ٹرین میں لگائی جانے والی تھی۔ لیکن جب گاڑی جھانسی جنکشن پر پہنچی تو وہاں آرمڈ پولیس کا ایک مضبوط دستہ موجود تھا۔ اور معلوم ہوا کہ ملزمین کی بوگی کو جھانسی سے کان پور ...

پیسنی بھیسن صرف جو لے جایا جانے والا تھا اس کو حکومت نے منسوخ کر دیا ہے ۔ پیگی وہاں گرفتاری کے وقت سے ہتھکڑی کاٹی گئی اور ملزمین کو دہلی لے جایا گیا وہاں سے ان کو بریلی لے جایا جاکر بریلی جیل میں رکھا گیا ۔ بریلی جیل کے اندر بھی حیدرآباد اسٹیٹ کی جو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ملزمین کے پیر اور ہاتھ میں تھیں ۔ وہ حسب قاعدہ نکال کر واپس ہمارے اسٹیٹ کے گارڈ کو نہیں دی گئیں اور کہا گیا کہ یہ ملزمین خطرناک ۔ انکی ہتھکڑیاں ، بیڑیاں نہیں بدلی جاسکتیں اب بعد میں روانہ کر دی جائیں گی ۔ ان واقعات کی وجہ سے یہ باور کرنا مشکل نہیں کہ ملزم کلن خاں نے جو بیان دیا تھا کہ وہ کم از کم چالیس قتل کا ذمہ دار ضرور ہے ۔ اب خدا کی وہ حد نہیں بتا سکتا ۔ ۶۰ ، ۷۰ اور شاید بلکہ اس سے زائد بھی ہو سکتے ہیں ۔ درست ہی ہوگا ۔ صرف حکومت یو پی نے ملزمین کی گرفتاری کی مشتہرہ انعام میں سے کچھ رقم روانہ کی جس میں سے والد صاحب کو اور ان کے ماتحتین کو انعام عطا ہوا ۔

ملزم کلن خاں بریلی جیل میں ہی پیچش سے مر گیا اور شاید گھیورا بھی جیل ہی میں بعد میں مرا ۔ حکومت حیدرآباد نے ملزمین کے یو پی روانہ کر دینے کے بعد ریاست کے تمام مقدمات سے دستبرداری کر لی تھی ۔

▭▭

سلسلہ حرف اول "صفحہ ۲" سے

کی جملہ اقلیتیں احتجاج کر رہی ہیں بلکہ اکثریتی فرقہ کے چند طبقے بھی اقلیتوں کے ساتھ ہیں ۔ جیسے حال ہی میں رام کرشنا مشن والوں نے کلکتہ ہائی کورٹ سے حال ہی میں یہ تصفیہ کرایا ہے کہ وہ " غیر ہندو اقلیتی مذہب " کے پیرو ہیں ۔ اس طرح انھوں نے اقلیتی اداروں کو حاصل شدہ دستوری حقوق کے تحت اپنے اداروں کا انتظام شروع کیا اور اپنے اساتذہ وغیرہ کے مسائل سے اپنے آپ نپٹنے کا حق حاصل کیا ۔ اسی طرح مہاراشٹرا میں وہ ہندو جو گجراتی ، سندھی ، کنڑی اور ملیالی زبان بولتے ہیں ، اپنے تعلیمی اداروں کے لئے اقلیتی تعلیمی اداروں کے حقوق حاصل کر لئے ہیں ۔ نیز جین ، سکھ اور بدھی کو دفعہ ۲۵ کے تحت " ہندو " میں شامل ہیں ، دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتی مذہبی گروپ سمجھے جاتے ہیں اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے حقوق سے استفادہ کرتے ہیں ۔

یہی نہیں بلکہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے ان حقوق سے عام ہندو اکثریت بھی فائدہ اٹھاتی ہے چنانچہ پنجاب (سکھ اکثریت) کشمیر (مسلم اکثریت) اور میزورام (عیسائی اکثریت) میں ہندو " اقلیتی طبقہ " قرار دئے جاکر ان حقوق سے استفادہ کرتے ہیں ۔

ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ تمام اقلیتیں متحد ہوں ، ہندو اکثریت کی بھی تائید حاصل کی جائے اور سپریم کورٹ کے بطور خود شروع کردہ اس مسئلہ کو ختم کر دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ سپریم کورٹ کا سابقہ فیصلہ ۱۹۷۴ء حسب حال بحال رہتا ہے ۔

شکار اور شکاری - شیر

شیر کی آدم خوری

شیر جب بوجہ ضعف پیری یا جسمانی کمزوری کے بڑے مویشی مارنے کے بھی قابل نہیں رہتا تو بکریوں پر ہاتھ صاف کرتا ہے اور اس کے بعد آدمی مارنے لگتا ہے۔ آدم خوری کا سبب محض شیر کا بڑھاپا ہی نہیں ہے بلکہ کوئی وجہ جس سے شیر کو قدرتی غذا میسر نہ آسکے۔ مثلاً بیماری، زخم یا جنگل میں قدرتی شکار کی کمی شیر کو آدم خور بنا دیتی ہے۔

مسٹر ڈیشکپیئر لکھتے ہیں کہ آدم خوری کا سبب کمزوری بڑھاپا، لڑائی میں یا بندوق کا زخم پہنچ جانا اس قدر نہیں ہے جتنا کہ گاؤں کے بھوکے ڈھیڑ اس کی علت ہیں۔ جہاں شیر نے کوئی مویشی مارا، یہ دن ہو یا رات ڈھیڑے بجاتے مشعلیں لئے چیخ و پکار کرتے پہنچے اور جانور کو گھسیٹ لائے۔ کبھی شیر کو اس کا مارا ہوا جانور کھانے نہیں دیتے۔ شیر بھوکا رہتے رہتے تنگ آکر آدمی کا ناشروع کر دیتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ آدم خور بہ نسبت نر شیر کے شیرنیاں زیادہ سننے میں آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بچوں کے لئے غذا کی فراہمی میں دقت کی وجہ سے شیرنی آدمی مارنے لگتی ہے اور پھر اس کو عادت پڑ جاتی ہے۔

میجر کاربٹ جنھوں نے متعدد آدم خور شیر مارے ہیں اپنی کتاب MAN EATORS OF KUMAON میں لکھتے ہیں کہ شیر کی آدم خواری کی وجہ ۹۰ فی صدی زخموں کی وجہ اس کی کمزوری اور ۱۰ فی صدی صورتوں میں اس کا بڑھاپا ہوا کرتی ہے۔ یہ زخم زیادہ تر کسی کے ناقص فائر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ اگر شیر سارسل کو مارتے وقت غصہ سے بے قابو ہو جائے تو سارسل کے کانٹوں کا بھی کاری زخم شیر کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک آدم خور شیرنی کے متعلق موصوف لکھتے ہیں کہ اس کی ایک آنکھ سارسل کے کانٹے سے پھوٹی ہوئی تھی۔ اور سیدھے پنجے میں تقریباً (۵۰) سارسل کے کانٹے چبھے ہوئے تھے جن میں سے بعض ہڈی کو لگ کر مڑ کر دوہرے ہو گئے تھے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ یہ تصور کہ آدم خوار کے بال جھڑے ہوئے ہوتے ہیں صحیح نہیں ہے۔

ئے آدم خوار شیر انہوں نے مارے ہیں سب کی کھال نہایت عمدہ اور چمک دار تھی۔ یہاں کی یہ
رائے ہے کہ آدم خوار شیرنی کے بچے لازماً آدم خوار نکلنے کا تصور غلط ہے۔ موصوف نے جو
قعات آدم خوار شیروں کو مقابلہ سے شکار کرنے کے لکھے ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ انہوں نے
ہیں کئی کئی مہینے اور اس طرح مسلسل کئی کئی سال صرف ایک ایک آدم خوار کا پیچھا کر کے
خر اس کو ہلاک کیا۔ انہوں نے جنگل اور پہاڑیوں کا چپہ چپہ پیدل چھان کر مکمل نقشے
کر لئے تھے کہ شیر نے کس تاریخ کس مقام پر آدمی کو مارا۔ اس کے ٹھیرنے کے مقامات کون سے
۔ مارنے کے بعد وہ عموماً کہاں جاتا ہے۔ ندی نالے جنگل کے راستے کدھر کدھر سے گذرتے ہیں
ہو۔ ایک مرتبہ موصوف نے دنوں اور راتوں کسی گنڈ، درخت یا زمین پر بیٹھ کر گذارنے کے
وسم، وقت، ہوا کی سمت، جنگل کی نوعیت شیر کے پناہ لینے کے مقامات، اور پھر جنگل کے دیگر
روں کی آواز کے اشاروں سے نتیجہ نکال کر یہ اندازہ قائم کیا کہ شیر یقیناً اس وقت فلاں
ٹلے گھرے ہوئے درخت کے پیچھے سایہ میں بیٹھا ہوا ہوگا۔ چنانچہ پیدل ربر سول کا جوتا پہنے
ے دبے پاؤں وہ اُس کھوکھلے درخت کے تنے کے پاس پہنچے اور بندوق تیار رکھے ہوئے
کر دیکھا تو اپنے آپ کو شیر سے ایک فٹ کے فاصلہ پر پایا۔ اور اس حالت میں فائر کر کے
شکار کیا۔ موصوف نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مغرب کے وقت شیرنی اُن کی آواز پر کئی سو گز
اصلہ سے بجلی کی طرح اُن کے قریب آگئی اور شیر کے تجسس میں بے تحاشہ دہاڑتی ہوئی اُن
س قدر قریب ہوگئی کہ موصوف لکھتے ہیں کہ اگر اُن کے سر پر ہیٹ ہوتی تو اس کی آواز سے
سے سر پر سے دور جا پڑتی۔ وہ ایک گنڈ کی آڑ میں ایک چھوٹے سے پتھر پر کھڑے ہوئے
۔ اور ۴۰۰/۴۵۰ کا فائر کیا۔ بندوق کے دھماکے سے اُن کا جھوک نکلا اور جب وہ گر
تھے اور پیر ہوا میں تھے تو اسی حالت میں صحیح نشانہ لے کر دوسرا فائر کیا۔ بہرحال یہ
ت پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خاص امر جو موصوف اپنے متعلق درج کرتے ہیں
ن کو رات میں بھی اسی طرح نظر آتا ہے جیسے دن میں۔ اور یہ کہ ان کو ایک چھٹی حس
(SIXTH SEN-) ہے جو ہمیشہ خطرہ کے موقع پر ان کو خبردار کر دیتی ہے۔ اس میں شبہ
ہ موصوف ایک غیر معمولی آدمی ہیں۔

آدم خوار بعض دفعہ گارے کو عجیب طریقہ سے کھاتا ہے۔ امرآباد کے جنگل میں ایک شیر
دم خور ہو گیا تھا۔ بندھے ہوئے گارے کو بہت کم مارتا تھا۔ اس شیر کے لئے ایک شکاری صاحب
[illegible] روز مسلسل کوشش کر چکے تھے۔ مگر پندرہ دن میں اس نے ایک مرتبہ بھی [illegible]

کو نہ مارا۔ مچان پر آکر میں اور میرے ساتھ مصطفےٰ علی خاں سلمہٗ فرزند ڈاکٹر دوست علی خاں صاحب بیٹھے۔ یہ بچہ بہت مستعدی اور خاموشی سے رات بھر مچان میں بیٹھا رہا۔ مچان کے پیچھے کی جانب پہاڑ اور اصل جنگل تھا۔ بیان کیا گیا تھا کہ شیر اس میں رہتا ہے۔ سر مغرب مچان کے پیچھے کچھ فاصلے سے شیر کی غف غف کی آواز آئی اور ایک جنگلی سور بھاگتا ہوا اسی سمت سے آیا۔ اور مچان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ سور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ بالآخر بھاگ کر سامنے نکل گیا۔ رات بھر کے انتظار کے بعد بھی شیر نہ آیا۔ ہانکہ بھی کرایا گیا مگر بے سود رہا — صرف شیر کے دو بچے ہانکہ میں آ نکلے۔ مگر شیرنی ہانکہ میں نہ نکلی۔

متذکرہ صدر شکار کچھ عجیب ترکیب سے کھایا گیا تھا۔ رانوں پیٹ اور سینہ کا حصہ بالکل صحیح سالم تھا۔ صرف گردن پر سے پیٹھ پٹھے اور دُم تک پوری کھال اور گوشت نوچا اور کھرچا ہوا تھا۔ جیسا کہ کسی نے بڑھئی کے رندے سے چھیلا ہو۔ یہ مشکل سے یقین آتا تھا کہ شیر نے اس طرح کھایا ہے۔ مگر وہاں کے چینچوؤں نے جو اسی جنگل کے رہنے والے تھے یقین سے بیان کیا کہ یہ بلاشبہ آدم خوار شیر ہے۔ جب کبھی یہ کوئی آدمی یا جانور مارے اسی طرح کھرچ کر کھاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید اس کے دانتوں کی خرابی اور کمزوری ہو۔

آدم خوار آدمی کو گردن یا کمر پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ شیر کے پکڑتے ہی آدمی پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ آواز نہیں نکلتی۔ اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے گھسٹتے ہوئے جاتے ہیں۔ کھوپڑی، ہتھیلیاں اور تلوے چھوڑ کر باقی سب کھا جاتا ہے۔ آدم خوار آدمیوں کی عادات و اطوار سے واقف ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے بازار کے دن راستہ پر چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور جہاں کوئی عورت یا مرد اوروں سے علیحدہ نظر آیا اُٹھا لے جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر عورتوں کو اور وہ بھی جوان اور صحت مند کو تاک کر پکڑتا ہے۔ ایک دفعہ آدمی لے جانے کے بعد ہفتوں اس مقام کو نہیں آتا۔ اگر کچھ حصہ کھانے سے بچ رہا ہو تو اُسے کھانے پھر نہیں آتا — ایک مقام سے ۲۵، ۳۰ میل اطراف دھاوے لگاتا رہتا ہے۔ آدم خوار ہونے کے بعد کسی بندھے ہوئے جانور کو نہیں مارتا۔ ان ہی مکاریوں کی بدولت بعض آدم خوار کئی کئی سو آدمی کھا گئے۔ مگر باوجود انتہائی کوششوں کے شکار نہیں کئے جا سکے۔ جنرل ناسکیل کے متعلق جو بلارم میں بھی رہ چکے ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدم خوار کے شکار کے لئے انھوں نے چھ سات اعلیٰ درجے کے شکاریوں کی پارٹی تیار کی اور اس نواح کے تقریباً ڈیڑھ دو سو مربع میل جنگل کو گھیر کر باضابطہ طور پر وہاں کے پورے شیروں کو ہلاک کر ڈالا۔ ڈیڑھ دو مہینہ کی کوشش میں

دس بارہ شیر شکار ہوئے۔ اس مہم کے ختم کے روز جب وہ شام کو بیٹھ کر اطمینان کا سانس لیا چاہ رہے تھے اطلاع آئی کہ کیمپ سے دو میل پر آدم خوار نے آدمی مارا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل صاحب نے اپنی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور کیمپ برخواست کر دیا۔

جس جنگل میں آدم خوار شیر ہو وہاں سے گذرتے وقت دونالی بندوق بھری ہوئی اور بالکل تیار اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہیئے۔ اگر حملہ سے پہلے نظر آگیا (جس کی توقع کم ہوتی ہے) تو فبہا مگر آدم خوار دبتا ہوا آکر ہمیشہ پیچھے سے حملہ کرتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی خالی آواز کرنے سے بھی اس کا قوی امکان ہے کہ شیر چھوڑ کر علیحدہ ہو جائے۔ اس کے بعد دوسری نالی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ آدم خوار میں اتنی سمجھ پیدا ہو جاتی ہے کہ اندازہ لگا لیتا ہے کہ کون شکار ہے جو اس کا دشمن ہے اور کون بے ضرر گاؤں والا ہے جو اس کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کی چالاکیوں اور بعض جرأت اور عقل کے غیر معمولی کاموں کی وجہ سے جہلا انھیں بھوت پریت یا آسیب سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی داستانیں اکثر بیان کی جاتی ہیں۔ بعض اس قسم کی کہانیاں اخبارات میں بھی کسی قدر وثوق کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ ایک انگریزی اخبار میں شائع شدہ اس قسم کے ایک واقعہ کا خلاصہ یہ ہے:

جنگلات میں ایک یوروپین عہدہ دار کو یہ حکم ملا کہ فلاں جنگل میں آدم خوار شیر کی بہت شکایتیں آرہی ہیں، پہنچ کر صحیح واقعات کی رپورٹ کیجئے اور اس کی ہلاکت کا انتظام کیجئے۔ عہدہ دار مذکور مع اپنی نئی دلہن کے دور دراز فاصلہ طے کرتے ہوئے اس جنگل سے متصلہ گاؤں پہنچے۔ لوگوں نے کہا کہ یہاں کا شیر صرف عورتوں کو کھاتا ہے۔ اور اس کی عیاری کے عجیب عجیب قصے بیان کئے اور کہا کہ آپ کی میم صاحبہ کے لئے بہت خطرہ ہے۔ عہدہ دار موصوف گاؤں کے سب سے محفوظ مکان جو پختہ چھت اور سلاخ دار کھڑکیوں کا تھا بیوی کو لے کر ٹھیرے۔ رات کو بنگلے کے اطراف آگ روشن کروائی اور متعدد چوکی داروں اور آدمیوں کو سلوایا۔ بارش کا موسم تھا۔ رات کو خوب بارش ہوئی۔ صبح میں اٹھنے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ بنگلہ کے اطراف ایک زبردست شیر کے پنجوں کے نشان موجود تھے۔ اس سے واقعی فکر پیدا ہوئی۔ اور خیال کیا کہ ان ہی پیر کے نشانات پر تعاقب کر کے شیر کا خاتمہ کر دیا جائے۔ بیوی کو یہ ہدایت کی کہ کھڑکیاں اور دروازے اندر سے مقفل رکھیں اور کسی صورت میں باہر نہ نکلیں۔ عہدہ دار صاحب چند شکاریوں کو لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ فاصلہ کے بعد پتھریلی زمین میں پیر کے نشانات غائب ہو گئے۔ جنگل میں بہت کچھ تلاش کی کچھ پتہ نہ چلا۔ واپس ہو رہے تھے کہ بنگلہ سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر میدان

میں کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی بیوی بے حس و حرکت کھڑی ہیں۔ اور شیر ان کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا گھور رہا ہے۔ اس واقعہ کو دیکھ کر ان کے حواس جاتے رہے۔ بڑی مشکل سے سنبھلے اور قریب جا کر بندوق چلانے کا ارادہ کیا۔ شیر نے اُن پر جو نظر ڈالی تو ایک ہیبت ناک جادو کی سی لہر ان کے جسم میں دوڑ گئی۔ اور ہاتھ پاؤں بے کار ہو گئے۔ بڑی مشکل سے پھر سنبھلے اور بندوق اٹھا کر یکایک فائر کر دیا۔ ساتھ ہی شیر گرا۔ یہ قریب پہنچے تو بیوی بے ہوش تھیں۔ ان کو سنبھالا ادھر پلٹ کر جو دیکھا شیر ابھی زندہ تھا۔ سانس برابر لے رہا تھا۔ دل سے کچھ ہٹ کر گولی لگی تھی اس کی آنکھوں کی طرف جو نظر پڑی تو پھر وہی مسمریزم کا اثر ہوا۔ یہ انسانی آنکھ تھی جس میں جذبات نفرت و حقارت پوری طرح نمایاں تھے۔ مزید برآں یہ کہ شیر ہونٹ ہلا رہا تھا۔ جیسے کوئی آدمی بات کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ انھوں نے پھر ہمت کی اور بندوق اٹھا کر چند فیٹ کے فاصلہ سے سر پر گولی ماری۔ شیر ختم ہو گیا مگر اس کی آنکھیں آخری وقت تک اُن کے دل پر قبضہ جمائے رہیں۔ ہونٹ برابر ہلتے رہے۔ یہ لوٹے بیوی کو لے کر بنگلہ پہنچے۔ جب ہوش برابر ہوئے تو میم صاحبہ نے یہ واقعہ بیان کیا کہ جوں ہی عہدہ دار صاحب ادھر روانہ ہوئے بنگلہ کے باہر سے ایک بچہ کے رونے کی قابلِ رحم آواز سنائی دی۔ بچہ بہت دیر تک روتا رہا۔ میم صاحبہ کو خیال ہوا کوئی غریب عورت بچہ کو چھوڑ کر کام کرنے چلی گئی ہوگی۔ بچہ کا رونا کسی طرح کم نہ ہوا۔ یہ اس کو دیکھنے باہر نکلیں۔ قریب میں بچہ نظر نہیں آیا۔ مگر کچھ فاصلے سے ہٹ کر وہی رونے کی آواز آئی۔ یہ ادھر گئیں اور دور سے آواز آئی یہ اس کے پیچھے گئیں۔ آواز دور ہوتی گئی۔ ایک خاص ناقابلِ بیان کیفیت اُن پر طاری ہو گئی اور یہ اُسی حالت کئی گھنٹے جھاڑی میں تلاش کرتی رہیں۔ اس کے بعد وہ میدانی حصہ آیا۔ اب کیا دیکھتی ہیں کہ ایک شیر سامنے کھڑا ہے اور آنکھیں ہلا کر گھور رہا ہے۔ یہ انسانی آنکھیں تھیں جو جادو کا اثر رکھتی تھیں۔ شیر اُن کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا کہ عہدہ دار صاحب ادھر سے پہنچ گئے اور شیر کو مارا۔ عہدہ دار صاحب کے دل میں یہ خیال جا رہا کہ شیر میں یہ انسانی کیفیت کہاں سے آئی۔ بہت کچھ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں ایک یورپین سادھو رہتے تھے۔ وہ اس چیز کا تجربہ کر رہے تھے کہ جانوروں کے سر میں اگر آدمی کا دماغ رکھ دیا جائے تو کیا نتیجہ ہوگا۔ چنانچہ وہ ایک ڈاکو کا سر کہیں سے لائے تھے جو صرف عورتوں کو لوٹا کرتا تھا۔ اس کا دماغ نکال کر ایک شیر کے بچہ کے سر میں داخل کر دیا۔ جب وہ یہاں سے گئے تو سب جانور چھوڑ کر گئے۔ یہ وہی شیر کا بچہ تھا جو بڑا ہو چکا تھا۔۔۔ ماخوذ۔۔۔ (جاری ہے)

مولانا محمد خلیل الرحمٰن برہان پوری

بلغ العلیٰ بکمالہ

شہِ مرسلاں تو بفرہی، سرِ خسرواں بہ زمیں نہی
بہ تو جملہ سروری و مہی، زِ تو خلق راست رہ بہی
بسری اگر قدمی نہی، بہ رسائیش بسرِ فہی
چو زِ سبِ کشور بنا گہی، زِ مقام تو شود آگہی

بلغ العلیٰ بکمالہ، کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ، صلوا علیہ وآلہ

تو حبیبِ خالقِ اکبری، زِ تو زیبِ کاخِ پیمبری
نکند زِ نورِ تو ہمسری، مہ و مہر و زہرہ و مشتری
شہ ہفت طارمِ اخضری، سرِ اوجِ عرش زبرتری
بہ بہشتِ ہشت تو سروری، ز ہمہ تو افضل و بہتری

بلغ العلیٰ بکمالہ، کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ، صلوا علیہ وآلہ

چہ علائی بدرِ کمالِ ما، شبِ کفر یافت از و ضیا
نہ شبِ زمیں کہ شبِ ترا، ملک و فلک قمر و ذکا
تن ما فیش ہمہ پُر ضیا، ز عقول و وہم و گمان ما
چو باوجِ عرش برآمدہ، بنمودہ عرش ہمیں صدا

بلغ العلیٰ بکمالہ، کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ، صلوا علیہ وآلہ

ملک الملوک و شہ شہاں، چو نمودہ سیدِ مرسلاں
شدہ اشتیاق تو ہر زماں، بہ پیمبراں و بہ سابقاں
بخدائی مالکِ دو جہاں، کہ محمد است شفیع شاں
قدمی بہ پستی جسم و جاں، قدمے بہ طارمِ لامکاں
بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

توئی شمعِ محفلِ قدسیاں، توئی ماہِ منظرِ عرشیاں
توئی شاہِ عالمِ جسم و جاں، توئی مہرِ درہمہ مرسلاں
توئی جانِ جملہ جہانیاں، توئی روحِ خالقِ انس و جاں
توئی مقصدِ ہمہ کن فکاں، چو نسیم در ہمہ بوستاں
بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

صلواتِ خالقِ عالمین و ملائک و رُسلِ گزیں،
بروانِ خاتمِ مرسلین و بروحِ آلِ الطیبین،
و بر اہلِ بیتِ الطاہریں و چہار یار قویم دیں
بصحابہ و ہمہ تابعیں، بطفیلِ شاں ہمہ مومنیں
بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

کہ خلیلِ بندۂ مذنبم، بخدا کنی نظرِ کرم
بہ رہاں ز آلِ بد ستم، تو بجو انیم بدر حرم
بقیامتم بہ رہاں ز غم، بطلب مرا بسوئے علم
بخدائی عالم و عالمم، کہ بجز تو نیست وسیلہ ام
بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

غزلیں

شوق ماہری

رگ رگ میں چمک دوڑ گئی برق و شرر کی
کیا بات ہے ظالم تری دزدیدہ نظر کی

تا حدِ نظر صبح کے آثار نہیں ہیں
کانوں میں چلی آتی ہے آواز گجر کی

تنہائی کا عالم، شبِ فرقت کی درازی
کچھ ہم ہی سمجھتے ہیں کہ کس طرح سحر کی

آنکھوں میں حیا آ گئی، ہونٹوں پہ تبسم
کس حسن سے اس نے مری تائیدِ نظر کی

کیا کیا مجھے اس عشق نے عالم نہ دکھائے
پھولوں پہ بسر کی کبھی کانٹوں پہ بسر کی

برسوں سے یہی ایک تمنائے جنوں ہے
آنکھوں میں رہے دھول تری راہ گذر کی

ہر اہلِ نظر شوقؔ یہ تسلیم کرے گا
خوشبو ہے مرے شعر میں ماہرؔ کے ہنر کی

استاد مرحوم مولانا ماہر القادری مرحوم

ہیگمنٹ روڈ ۔ کھنڈوہ 450001 (ایم پی)

صفدر امام غوری

دھوپ کے جسم کو طاقت لکھنا
اس ہری گھاس کو راحت لکھنا

اب تو ویرانہ بھی گھر لگتا ہے
رات کے درد کو عادت لکھنا

آخرِ شب کوئی آتا ہوگا
"انتظار اور" کو ساعت لکھنا

جس کو لکھ دینے سے انساں روئے
اس کو اے یار، کبھی مت لکھنا

پیڑ کی شاخ پہ ویرانی ہے
کیسی ہے پھول کی حالت، لکھنا

کرب، کہرام، ٹپکتی آنکھیں
چپ کے ماحول میں چاہت لکھنا

زندہ رہنے کی جسارت توبہ!
شام کے بعد کی حسرت لکھنا

قادری منزل ۔ بیتیا 845438 (بہار)

جگن ناتھ آزاد

غزل

آشیانے سے خلائے بے کراں تک آگیا
دل یقیں سے چل کے پھر وہم و گماں تک آگیا

اے چمن والو! چمن والو! کوئی سوچو علاج
کارواں گل کا بہاروں سے خزاں تک آگیا

کیا خبر کیا جستجو بے تاب رکھتی ہے مجھے
یوں تو میں ساحل سے موجِ بے اماں تک آگیا

پھر متاعِ درد کا بازارِ جاں میں شور ہے
گوہرِ ہر سود پھر جیبِ زیاں تک آگیا

کیا خبر چلنا زمیں پر اس کو آیا یا نہیں
آدمی یوں تو زمیں سے آسماں تک آگیا

دیکھیے اب کون سی منزل ہو اس کے روبرو
دل کہ تھا محوِ فغاں ضبطِ فغاں تک آگیا

کارواں تک اب پہنچنے ہی کو ہے آزاد تو
تو کہ آوازِ رحیلِ کارواں تک آگیا

A 25 گورنمنٹ کوارٹر گاندھی نگر - جموں توی 180004

سلیم انصاری

فضا میں چھائے ہوئے ہیں اداس سناٹے
ہوں جیسے ظلمتِ شب کا لباس سناٹے
بشر کی شان میں ہیں ان دنوں قصیدہ طراز
اُفق کے پار بشر ناشناس سناٹے
یہ اہلِ ظرف کی ہمت کو آزماتے ہیں
ہر ایک دل کو نہیں آتے راس سناٹے
ترے خیال کی آہٹ نے سرد کر ڈالا
سُلگ رہے تھے ابھی آس پاس سناٹے
سلیم رات کی تاریکیاں بڑھاتے ہیں
یہی درخت پہ لٹکے اداس سناٹے

B/R No.2 GE (P) Fy, نزد آرڈیننس فیکٹری
ڈیرہ دون 248008

حمیداللہ خاں

بات اس کی کوئی معتبر ہی نہیں
حق نمائی کا اس میں ہنر ہی نہیں
پھول بھی ہیں وہاں گلستاں بھی وہی
ہاں مگر کوئی اہلِ نظر ہی نہیں
کیوں نہ ہو زندگانی سے مایوس وہ
جس کے حصّہ میں کوئی سحر ہی نہیں
پھونک دے گی تمہیں بھی کدورت کی آگ
کہ اب شہر میں کوئی گھر ہی نہیں
سدا ہی کھلا ہے در اس کا مگر
کسی کا وہاں اب گذر ہی نہیں

لیکچرار ڈی ایس ایم کالج۔ پربھنی

غزلیں

شجاع الدین شاہد

ہم ہیں خود دار بہت، حد سے گذر جائیں گے
غیر ممکن ہے سمٹنا جو، بکھر جائیں گے
ہم نے یہ سوچ کے چھوڑے تھے نشاں راہوں میں
دیکھ کر نقش قدم، لوگ گذر جائیں گے
شہر کی بھول بھلیوں میں بہت بھٹکے ہو
ہو گئی دیر بہت لوٹ کے گھر جائیں گے
ہم نے مانا کہ سرِ راہ کے پتھر ہیں ہم
تم تراشو تو سبھی اور سنور جائیں گے
امتحاں لینا ہے مقصود، تو آؤ لوگو!
آگ کا دریا بھی آئے تو اتر جائیں گے
اٹھو شاہد کہ اب سمتوں کا تعین کر لیں
تجربہ دے کے تمہیں اہلِ نظر جائیں گے

تارنتھا میپ ساؤنڈنگ آفس۔ سورن روڈ۔ اندھیری (E) بمبئی 400093

ماہنامہ

حیدرآباد

ادبی، دینی و سماجی اقدار کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد ۳ شمارہ ۹ | قیمت ۵ روپے | ستمبر ۱۹۸۶ء

ایڈیٹر محمد قمرالدین صابری — مینیجنگ ایڈیٹر محمد کلیم الدین احسن

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
ششماہی 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
سالانہ 90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 〃
تاحیات 1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 〃

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے
[illegible] پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد میں چھپواکر
[illegible] حیدرآباد سے شائع کیا۔

:- ترسیلِ زر کا پتہ :-
11-5-147 ریڈ ہلز
حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش

فہرست

حرفِ اوّل

قومی تعلیمی پالیسی

ہمارے پُرعزم اور فعّال وزیرِ اعظم نے قوم سے وعدہ کیا ہے کہ ملک جب اکیسویں صدی میں قدم رکھے گا، وہ دنیا کے چوٹی کے ترقی یافتہ ممالک میں سے ایک ہوگا۔ اس کے لئے بجا طور پر تعلیمی اصلاح و ترقی کی جانب توجہ کی جارہی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تعین سے قبل دستاویز "تعلیم کی چنوتی" ملک کے تعلیمی ماہرین اور دانش وروں کے غور و فکر کے لئے پیش کی گئی اور سبھی کے مشوروں کے بعد ایک جامع نئی تعلیمی اسکیم مرتب کی گئی ہے۔ ۸ راگسٹ ۸۶ء کو اس اسکیم کا لائحہ عمل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ جس میں بچہ کی دیکھ بھال سے لے کر پیشہ ورانہ تعلیم، اوپن یونیورسٹی، ڈگریوں کو ملازمت سے الگ کرنا اور مین پاور پلاننگ شامل ہیں۔ "ایکشن پروگرام" میں ایسے اصول متعین کئے گئے ہیں جن پر مبنی تفصیلی اسکیم تیار کی جاسکے جس میں اساتذہ اور عوام کا بھرپور تعاون حاصل ہو۔ اس "ایکشن پروگرام" کو ساتویں اور آٹھویں پلان کے دوران مکمل کیا جائے گا۔

سرکاری مدارس کے معیارِ تعلیم کو اتنا بلند کیا جائے گا کہ وہ خانگی اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مصارف والے مدارس کی برابری کرسکیں گے۔ اور غریب عوام کے دل میں یہ خواہش باقی نہ رہے گی کہ سرکاری مدارس کی بجائے زیادہ مصارف والے پبلک اسکولوں میں اپنے بچوں کو شریک کرانے کی کوشش کریں۔

"آپریشن بلیک بورڈ" شروع کیا جاچکا ہے اور اس کا اصل مقصد دیہی نیز شہری علاقوں کے پرائمری اسکولوں کی حالت بہتر بنانا اور انہیں تعلیمی ساز و سامان سے مکمل طور پر آراستہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے "ڈسٹرکٹ بورڈ آف ایجوکیشن" "ڈسٹرکٹ انسٹی ٹیوٹس آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ" اور "ولیج ایجوکیشن کمیٹیاں" بنائی جائیں گی۔ مقصد یہ ہے کہ جہاں پرائمری اسکول نہیں ہیں وہاں قائم کئے جائیں اور جہاں اسکول قائم ہیں وہاں اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے۔ آج دیہی علاقوں کے تقریباً ایک ثلث اسکولوں میں صرف ایک ایک استاد ہی موجود ہے۔ کوشش یہ ہوگی کہ ۱۴ سال تک کی عمر کے تمام بچے اسکولوں

میں تعلیم حاصل کریں اور تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو۔
تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں اور درج فہرست طبقات و قبائل خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا جائے گا تاکہ عورتوں کی برابری و مساوات کا مقصد حاصل ہوسکے۔
قومی یک جہتی کے حصول کے لئے خصوصی نصاب تعلیم تیار اور رائج کیا جائے گا تاکہ ہمارے مشترک کلچر کی حفاظت ہو اور سائنسی و اخلاقی اقدار کو عام کیا جاسکے۔
" نان فارمل ایجوکیشن" اُن تمام " ڈراپ آوٹس" کو دی جائے گی جو ۱۴ سال سے کم عمر کے ہیں اور اتنے ادارے قائم کئے جائیں گے کہ ۱۹۹۵ء تک ۱۴ سال سے کم عمر کے تمام بچوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم مہیا ہوجائے۔
قومی تعلیمی پالیسی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ساتویں پلان کے ختم تک " پلس ٹو اسٹیج " کے کم از کم ۱۰ فی صد طلباء پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف رجوع ہوجائیں۔ اس کے لئے مرکز میں ایک "جائنٹ کونسل فار اوکیشنل ایجوکیشن" قائم کی جائے گی۔ نیز "این سی ای آر ٹی" کے تحت ایک "بیورو آف اوکیشنل ایجوکیشن" بھی ہوگا جو پیشہ ورانہ تعلیم کی پالیسی بنائیں گے اور اُسے ملک بھر میں نافذ کریں گے۔ ہر اسٹیٹ میں بھی ایسے ادارے قائم کئے جائیں گے اور ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹس کی تنظیم جدید کی جائے گی تاکہ وہ پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے استاد فراہم کرسکیں۔
مسلمان تعلیمی میدان میں برادرانِ وطن سے بہت پیچھے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو قومی ترقی میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے اور اکیسویں صدی میں ایک ترقی یافتہ ملک کی حیثیت سے قدم رکھنے میں اپنے وزیر اعظم کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مدد دینا ہے تو انہیں بہت محنت کرنی ہوگی اور نئی تعلیمی پالیسی سے بھرپور فائدہ اٹھا کر تعلیم کے میدان میں اپنے آپ کو آگے بڑھانا ہوگا۔

کیپ پراجکٹ

بنیادی تعلیم کو عام کرنے اور اسکولی تعلیم کی عمر والے تمام طلباء کو پرائمری تعلیم کی فراہمی کے لئے حکومتِ ہند اور یونیسیف کی مالی امداد کے ساتھ اسٹیٹ گورنمنٹ نے ۱۹۷۵ء میں کامپرہنسیو ایکسس ٹو پرائمری ایجوکیشن (کیپ) کے زیرِ عنوان ایک پراجکٹ کا آغاز کیا۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے تعلیمی سال کے لئے کیپ پراجکٹ کے نصاب موڈیولس ۸ راگست ۱۹۸۶ء کو جاری کرتے ہوئے وزیر تعلیم مدو کرشنا نائیڈو نے کہا کہ حصولِ آزادی کے ۴۰ سال بعد بھی ملک میں لاتعداد بچے تعلیمی سہولتوں سے محروم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیپ پراجکٹ کا مقصد نہ صرف خواندگی کو عام کرنا ہے بلکہ دیہی علاقوں کے افراد خصوصاً طبقات کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا بھی ہے۔ یہ نصاب محض اطلاعات و معلومات بہم پہنچانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ

بلکہ اس کے ذریعہ کم سن طلباء کو مختلف قسم کی ٹریننگ کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ جن میں زراعت کی کاشت، ترکاریوں کی پیداوار، اچار کی تیاری، ملیریا، آنکھوں کے امراض وغیرہ سے بچنے کی تدابیر، کھلونوں کی تیاری، شہد کی صنعت، بھیڑوں کی افزائش، فرنیچر کی تیاری وغیرہ وغیرہ شعبوں میں تربیت دی جائے گی۔

ہمیں چاہیئے کہ حکومت کی ان سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی صورت پیدا کریں۔

مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی

ممتاز ماہر تعلیم و سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جناب پروفیسر سید حامد نے مدینہ جونیئر کالج و مدینہ پبلک اسکول کے زیر اہتمام لطیف الدین ہال میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان تعلیمی پس ماندگی کے معاملہ میں آج جس نازک اور بدترین دور سے گذر رہے ہیں اس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ غدر کے بعد مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے وہ قیامت صغریٰ کے برابر تھے۔ مگر آج کا دور اس سے بھی بدترین ہے۔ غدر کے بعد مسلمانوں کو یہ احساس تھا کہ وہ تباہ ہوگئے ہیں لیکن آج ہم پر بے حسی طاری ہے۔ ہمارے دل سے احساس زیاں بھی جاتا رہا ہے۔ اگر ہمیں ملک کی تیز رفتار ترقی کا ساتھ دینا ہے تو اس بے حسی کی دیوار کو توڑنا ہوگا اور بہرصورت تعلیم حاصل کرنا ہوگا۔ موصوف نے کہا اسلام وہ مذہب ہے جس نے تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ جب اسلام علم حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو وہ صرف دینی علم نہیں بلکہ عصری علم بھی ہے۔ ابتدائے اسلام میں کبھی علم کو دینی علم تک محدود نہیں کیا گیا۔ بلکہ عصری علم بھی مسلمانوں نے نہ صرف حاصل کیا بلکہ چار سو سال تک پوری دنیا کی تعلیمی میدان میں قیادت کی۔ یہ ہمارا بیان نہیں بلکہ مغربی دنیا کے علماء کی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے آٹھویں صدی عیسوی سے گیارھویں صدی عیسوی تک ساری دنیا کی علمی میدان میں قیادت کی۔ اس کے بعد (۴۰۰) سال ہمارا معیار گھٹتا رہا اور بعد کے (۴۰۰) سال میں تو ہم گرد کارواں بن گئے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں ہی نے تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ دینی تعلیم اور عصری تعلیم کے درمیان ایک ناحق دیوار کھڑی کر دی۔ ہمارے علماء نے بھی اس جانب کوئی توجہ نہ دی۔ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ علم حاصل کرے اور علم میں دینی و عصری دونوں علم شامل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ علم کو روزگار کا ذریعہ نہ سمجھے، علم کو علم سمجھ کر حاصل کرے، یہ اور بات ہے کہ اور فوائد کے ساتھ علم سے روزگار حاصل کرنے میں بھی آسانی ہو جائے۔

پروفیسر موصوف نے کہا مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ملک گیر لائحۂ عمل اس وقت ممکن نہیں ہے۔ سرسید مرحوم کے انتقال کو (۸۰) سال ہو رہے ہیں۔ آج تک ان کے بعد کوئی ایسا قائد مسلمانوں کو نہ ملا جو تعلیمی میدان میں ان کی رہنمائی کرتا۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ کسی ملک گیر لیڈر کا انتظار نہ کریں۔ وقت کی ضرورت ہے کہ ہر کوئی اپنے اپنے علاقہ میں تعلیمی ترقی کی کوشش کرے۔ جب ہر جگہ کوشش ہوگی تو ملک گیر نتائج اچھے حاصل ہوں گے۔ آج کل معیاری مدارس کا بھی یہ حال ہے کہ جب تک سرپرست طالب علم کو گھر پر مدد نہ دیں، صرف اسکول کی تعلیم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں میں بے حسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم سے بالکل ہی لاپرواہ ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ایسے تعلیمی ادارے قائم کریں جو سرپرستوں کا قائم مقام بن سکیں۔ اور اسکولی اوقات کے بعد ان کے لئے اصلاحی تعلیمی انتظام کریں۔

جب تک اس طرح کی اصلاحی کوچنگ کا انتظام نہ ہوگا ہمارا تعلیمی معیار درست اور اعلیٰ نہ ہو سکے گا۔ پروفیسر موصوف نے دوسرا اہم مشورہ یہ دیا ہے کہ لڑکیوں کے لئے مدارس و کالج معہ ہاسٹل قائم کئے جائیں۔ لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنا کر ہی ہم آئندہ نسلوں کے مستقبل سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ موصوف نے کہا کہ مغلوں کے دورِ حکومت میں غیر مسلموں نے فارسی سیکھی اور اس میں اہلِ زبان کی سی مہارت حاصل کی۔ ان کی عورتوں نے اپنی زبان، اپنے کلچر کو اپنے سینے سے لگائے رکھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان و کلچر محفوظ و برقرار رہے۔ اگر مسلمان بھی اپنی زبان، کلچر و تہذیب کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی لڑکیوں کو اس کی تعلیم دینی ہوگی۔ لڑکی کو تعلیم دینا ایک خاندان کو تعلیم دینے کے برابر ہے۔

پروفیسر موصوف نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی حق تلفیوں کے شکوہ و شکایات کو چھوڑ دیں، حکومت پر تکیہ کرنا بھی ترک کر دیں۔ اور اپنی تعلیم کا آپ خود انتظام کریں۔ مسلمانوں کی حالت ایسی گئی گذری نہیں ہے کہ وہ ایسا انتظام نہ کر سکیں۔ جب مسلمان اپنے تعلیمی معیار کو اعلیٰ سے اعلیٰ بنا لیں گے، امتحانات میں زیادہ سے زیادہ نمبرات حاصل کریں گے تو مسابقتی امتحانات میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عصری تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ ملک کی ملازمتوں وغیرہ میں اپنا حصہ حاصل کر سکیں گے اور انہیں کسی معاملہ میں اپنی حق تلفی کی شکایت باقی نہیں رہے گی۔

پروفیسر موصوف نے یہ بات یونہی نہیں کہہ دی ہے بلکہ بقول ان کے برسوں تعلیمی میدان میں کام کیا ہے پورے ملک کا دورہ کیا ہے، تعلیمی ماہرین سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کیا ہے ان مسائل پر غور کیا ہے نیز یہ بات موصوف کے دل سے نکلی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کے دل پر اثر کرے گی وہ ان مشوروں سے کما حقہ استفادہ کریں گے اور اپنی حالت کو درست کرنے کی طرف توجہ دیں گے۔ ■■

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

علمائے سلف

کسبِ معاش

(مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی وہی عالم ہیں جن کے نام مولانا ابوالکلام آزاد نے احمد نگر جیل سے خطوط لکھے جو "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع اور مقبول ہوئے۔ مولانائے موصوف نے بے شمار نایاب کتب اپنے کتب خانے میں جمع کئے جو اب علی گڑھ یونیورسٹی میں استفادہ خاص کے لئے محفوظ ہیں۔ مولانا موصوف نے "علمائے سلف" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ شوال ۱۳۱۱ھ میں ندوۃ العلماء کے اول اجلاس شہر کانپور میں دیار ہند کے اکثر مشاہیر علماء شریک ہوئے۔ متاخرین کا مجمع دیکھ کر متقدمین کا تصور بندھا اور ان کے مطالعہ کا شوق دل میں پیدا ہوا — ندوۃ العلماء کے چوتھے سالانہ جلسہ ۱۳۱۴ھ بمقام میرٹھ میں پڑھے جانے کے لئے ناظم جلسہ نے جو عنوانات دیئے ان میں ایک عنوان "علمائے سلف" بھی تھا۔ مولانا کے دل میں اس عنوان پر لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اس کی تیاری کے لئے حسبِ ذیل کتابیں لفظ بہ لفظ پڑھیں اور ان میں سے حالات منتخب کئے۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ از امام شمس الدین ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ (۲) وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان از قاضی القضاۃ ابی العباس احمد بن خلکان المتوفی ۶۸۱ھ (۳) نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء از امام ابی البرکات عبدالرحمٰن ابن محمد انباری المتوفی ۵۷۷ھ۔
(۴) عیون الانباء فی طبقات الاطباء از طبیب عالم موفق الدین ابوالعباس احمد ابن قاسم المعروف بابن ابی اصیبعہ المتوفی ۶۶۸ھ (۵) الشقائق النعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ از مولا طاشکبری زادہ رومی المتوفی ۹۶۸ھ (۶) العقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم۔
(۷) مقدمہ فتح الباری للامام ابن الحجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ (۸) الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ النعمان للمفتی احمد ابن الحجر المکی المتوفی ۹۷۳ھ۔
(۹) الرحمۃ الغیثیہ بالترجمہ اللیثیہ لحافظ ابن حجر العسقلانی (۱۰) رحلۃ ابوعبداللہ محمد

ابن عبداللہ المعروف بابن بطوطہ (سیاحت ۷۲۵ھ تا ۷۵۶ھ) (۱۱) کامل از علامہ ابن اثیر جزری المتوفی ۶۳۰ھ (۱۲) الملل والنحل از عبدالکریم شہرستانی (۱۳) بستان المحدثین از شاہ عبدالعزیز وغیرہ وغیرہ۔

مولانا نے سب سے پہلے " طلب علم " کے عنوان کے تحت علمائے سلف کی طلب، ارادے اور صبر آزما حالات میں ان کے عزم واستقلال کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ان کی حق پسندی و راست گوئی، ان کا باہم اختلاف رائے اور مخالف عقیدہ کے علماء سے برتاؤ اور آخر میں کسب معاش تجارت، ملازمت اور تمول وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ہم سب سے پہلے " شاداب " میں کسب معاش کے باب کا اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارے اور ہمارے علماء کے لیے مشعل راہ بنے۔)

دنیا اور اس کے معاملات اگر لغو ہوتے تو پانچوں وقت کی نماز میں دین کی بھلائی سے پہلے دنیا کی بھلائی کی دعا نہ مانگی جاتی اور فقہ کی کتابوں میں صرف عبادات کے ابواب ہوتے۔ معاملات کے پیچیدہ مسائل کا ذکر نہ ہوتا۔ علماء جب دنیا میں رہے اور دنیا کے تعلقات انھوں نے پیدا کئے، کسی انسان کے محکوم بنے کسی کے حاکم۔ مختلف مشرب وخیال کے آدمیوں سے مل جل کر اس عالم میں رہے تو فطرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے ان تعلقات کو کیسا نباہا۔ آیا سلیقے اور خوبی سے سب کے حقوق ادا کئے، یا ان کو تسامح اور بے پروائی کے نذر کرکے اس کا دل خوش کن نام استغنا رکھا۔ آئمہ مجتہدین نے جو موشگافیاں مسائل معاملات میں کی ہیں اور جو آسان راہیں کاروبار کے متعلق نکالی ہیں وہ اس امر کی زبردست شہادت ہیں کہ وہ اعلیٰ درجے کے معاملہ فہم اور معاملات دنیا پر غور فرمانے والے تھے۔ اس عنوان میں ہم یہ دیکھیں گے کہ علمائے سلف نے اپنی معاش کن ذرائع سے پیدا کی۔

تجارت

تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ سارے مسلمانوں میں افضل صحابۂ کرام تھے۔ اور صحابہ میں مہاجرین کو فضیلت تھی۔ اور مہاجرین میں قریش کا مرتبہ بڑھا ہوا تھا۔ قریش کا خاص پیشہ تجارت تھا۔ جس کا ذکر کلام پاک میں جابجا موجود ہے۔ علمائے سلف میں جن بزرگوں نے معاشی قوت بازو سے حاصل کی ان کا رجحان خاطر اکثر تجارت کی طرف رہا ہے۔ چنانچہ ہم ایک جدول کے ذریعہ سے اُن علماء کے نام نامی مع اس مال کے جس کی وہ تجارت فرماتے تھے عرض کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے بڑے علمائے اُمت نے تجارت کے وسیلے سے کسب معاش فرمایا تھا۔

نمبر	اسمائے علما	مال تجارت	کیفیت
۱	حضرت سالم بن عبداللہ	-	بازار میں لین دین کیا کرتے تھے۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ص ۷۷
۲	ابو صالح سمان	روغن زیتون، روغن زرد	〃 ج ۱۔ ص ۷۸
۳	امام یونس ابن عبید	ریشمی پارچہ	〃 ج ۱۔ ص ۱۳۰
۴	داؤد ابن ابی ہند	ریشمی پارچہ	〃 ج ۱۔ ص ۱۳۱
۵	امام ابو حنیفہ	ریشمی پارچہ	امام ممدوح کی صدہا دکان کوفے میں تھی اور ان کے ایجنٹ جابجا ملک میں پھیلے ہوئے تھے جو مال خرید کر صدر کو بھیجتے تھے۔ 〃 ج ۱۔ ص ۱۵۱
۶	حضرت عبداللہ ابن مبارک	-	امام ذہبی ان کا ذکر یوں شروع کرتے ہیں، الامام التاجر السفار۔ دوسرے موقع پر فرماتے ہیں، افنیٰ عمرہ حاجا وتاجرا 〃 ج ۱۔ ص ۲۵۰
۷	وثیمہ	پارچہ ریشمی	ابن خلکان ج ۲۔ ص ۱۶۰
۸	حافظ الحدیث غندر بصری	چادر، سوتی پارچہ	تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ص ۲۴۵
۹	عبدالرزاق حمیری	-	امام ذہبی فرماتے ہیں: رحل تجارۃ الی الشام ۔ 〃 ج ۱۔ ص ۳۳۲

نمبر	اسمائے علما	مال تجارت	کیفیت
۱۰	امام القراء حمزہ زیات	زیتون، پنیر اور اخروٹ	کوفے سے روغنِ زیتون حلوان کو لے جاتے وہاں سے پنیر اور اخروٹ لاکر کوفے میں بیچتے۔ ابن خلکان جلد ا ص ۱۶۷
۱۱	حافظ الحدیث نحل کوفی	-	تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۱
۱۲	حسن بن ربیع کوفی استاد امام بخاری	بوریے	اسی تجارت کی وجہ سے ان کا لقب بواری ہے ۔ ر ج ۲ ص ۱۸
۱۳	امام ابوالحسن نیشاپوری	-	ر ج ۳ ۔ ص ۱۰
۱۴	ہشام دستوائی	پارچہ	دستوا اہواز (عراق عرب) کا ایک پرگنہ تھا ۔ وہاں سے کپڑا لاکر فروخت فرماتے تھے اسی وجہ سے دستوائی لقب پڑگیا۔ ر ج ا ص ۱۹۱
۱۵	احمد ابن خالد قرطبی	جبہ فروش	ر ج ۳ ۔ ص ۳۶
۱۶	امام ابن جوزی	تانبا	ان کے گھرانے میں تانبے کی تجارت ہوتی تھی ۔ آپ کبھی کبھی اپنے نام کے آگے صفار (ٹھٹیرا) تحریر دیتے۔ ر ج ۴ ۔ ص ۱۳۰
۱۷	حافظ الحدیث ابن رومیہ	ادویہ	اسی تجارت کے سبب سے اُن کا لقب عشاب ہوگیا تھا ۔ علم نباتات میں اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ ر ج ۴ ص ۲۱۶

نمبر	اسمائے علما	مال تجارت	کیفیت
۱۸	ابو یعقوب لغوی	چربی لٹھا	ابن خلکان ج ۱۔ ص ۳۱۵
۱۹	محمد ابن سلیمان	گھوڑے	تذکرۃ الحفاظ ج ۳۔ ص ۱۳

حرفت

جن علمائے سلف نے اپنی معاش حرفت کے ذریعے سے حاصل کی اور ان کے نام ہم کو معلوم ہوسکے۔ ان کے نام اور کام نیچے کے نقشے میں درج کئے جاتے ہیں:

نمبر	اسمائے علماء	نام حرفت	کیفیت
۱۔	ابوالفضل مہندس دمشقی طبیب مشہور	نجاری	اس فن میں وہ بہت ماہر تھے اور کثرت سے کام ان کے پاس آتا۔ بیمارستان کبیر شاہی شفا خانہ کے اکثر دروازے اُن کے ہاتھ کے بنے تھے جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں (ساعات) انھوں نے درست کی تھیں۔ اور ان کی نگرانی کے متعلق ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۴۔ ص ۲
۲	ابن طاہر	کتابت	صحیحین اور ابو داؤد سات سات بار اور سنن ابن ماجہ دس بار اُجرت پر لکھی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۳۔ ص ۳۷
۳	امام ابوالولید باجی	تار دبکنا	تذکرۃ الحفاظ ج ۳۔ ص ۳۱۱

نمبر	اسمائے علما	نام حرفت	کیفیت
۴	ابوسعید نحوی	کتابت	دس ورق روزانہ لکھتے تھے۔ یہ کام کرکے علاوہ قضا میں اجلاس کرتے۔ انھیں اوراق کی اجرت پر بسر اوقات تھی۔ نزہۃ الالباء۔ ص ۳۸
۵	ابن الہیثم طبیب نامور	کتابت	تین کتابیں سال بھر میں لکھتے۔ مجسطی متوسطات اور اقلیدس، ان کی قیمت ڈیڑھ سو اشرفی لیتے اور انھیں روپیوں پر بسر کرتے۔ عیون الانباء ج ۲، ص ۹۱
۶	امام ابن الخاضبہ	کتابت	تذکرۃ الحفاظ ج ۴۔ ص ۲۴

ملازمت

ملازمت اس لحاظ سے کہ وہ انسانی آزادگی پر ایک ٹکس اور بھاری ٹکس لگانے والی ہے ان مزاجوں کو راس نہیں جو سارے عالم کے بکھیڑوں سے ایک علم کی خاطر آزاد اور بے تعلق رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ابتداءً ہم کو اس سے مایوسی تھی کہ ہم اس حصہ عنوان ہذا کو معمور کر سکیں گے۔ مگر واقعات نے ہماری مایوسی کو بدگمانی ثابت کیا اور حالات نے بتلایا کہ علمائے سلف نے علمی شان کو قائم رکھ کر اعلیٰ سے اعلیٰ دنیاوی عہدے حاصل کئے۔ اور ان کے فرائض قابلِ ستایش طریقے سے انجام دیئے ہیں۔ ہم ذیل میں چند اُن علما کے اسم گرامی درج کرتے ہیں جو عہدۂ جلیلہ وزارت تک ترقی کرکے پہنچے۔ اس سے قیاس ہوسکتا ہے کہ اس سے کم درجے کے عہدے بھی ان کی ذات سے ممتاز رہے ہوں گے۔

نمبر	اسمائے علماء	کس بادشاہ کے وزیر رہے۔	کیفیت
۱	امام ابوالفضل ابن خزابۂ بغدادی	ملک کافور والیٔ مصر	امام دارقطنی نے ان سے روایت کی ہے اور حافظ شارح ان کی نسبت فرماتے ہیں کان من الحفاظ الثقاۃ ویروی فی حالۃ الوزارۃ تذکرۃ الحفاظ ج ۳، ص ۲۰۳

نمبر	اسمائے علما	کس بادشاہ کے وزیر رہے۔	کیفیت
۲۔	قاضی علامہ ابن نظیر	-	تذکرۃ الحفاظ ج ۳۔ ص ۲۶۳
۳	امام ابن حزم	خلیفہ مستظہر باللہ	" ج ۳۔ ص ۳۲۲
۴	امام لغت و نحو افلیلی	مکتفی باللہ خلیفہ اندلس	ابن خلکان ج ۱۔ ص ۱۲
۵	کمال الدین فقیہ شافعی	نورالدین زنگی والیٔ شام و مصر	قاضی ابن خلکان ان کی نسبت لکھتے ہیں کان عظیم الریاسۃ خبیرا بتدبیر الملک " ج ۱ ص ۴۲۴
۶	مولانا تاج الدین ابراہیم پاشا رئیس الوزراء	سلطان بایزید یلدرم	شقائق نعمانیہ ج ۱ - ص ۲۳

اش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مگر نمونے کے لئے اسی قدر شاید کافی ہوں گی۔ کم درجے کی
ازمتیں اختیار کرنے سے بھی علما کو احتراز نہیں رہا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ قبیصہ خلیفہ عبدالملک
مُہردار تھے (تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۵۲) امام اسمٰعیل جو امام اوزاعی کے استاد ہیں۔ خلیفہ منصور
ا توشہ خانہ (خزانۃ الثیاب) کے داروغہ (تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱، ص ۲۳) اسی سلسلے میں ہم کچھ
بریاں ان علما کی پیش کرنا چاہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ایک دربار کی جانب سے دوسرے دربار کو بطور
فیر تشریف لے گئے۔ سب سے زیادہ قابلِ غور امام شعبی اور شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین
ہروردی کی مثالیں ہیں۔ اول الذکر میں یہ امر لائقِ لحاظ ہے کہ جس دربار کو سفارت لے گئے وہ
رِسلم دربار تھا۔ اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ متفرد طریقہ کا منصب ہے جو سرگروہ سلسلۂ سہروردیہ
دنیاوی تعلقات اور علائق سے بچتی۔

یہ مثالیں ہیں ثبوت اس امر کا ہیں کہ علمائے کرام کو ہر حال میں مسلمانوں کے مصالحِ دینی کے
ئقہ دنیاوی مصلحتوں پر نظر رہی ہے۔ اور دونوں کو انھوں نے قابلِ توجہ خیال فرمایا ہے۔

نمبر	اسمائے علماء	کس دربار کی جانب سے سفیر ہوئے	کس کے دربار میں گئے	کیفیت
۱	امام شعبی	خلیفہ الملک اُموی	قیصر روم	قیصر کے دل پر اُن کی دانش مندی کا بہت اثر ہوا اور اس نے خلیفہ کو لکھا کہ مجھے تعجب ہے کہ ایسے شخص کے ہوتے مسلمانوں نے کیوں دوسرے شخص کو خلیفہ بنایا۔ جب واپس آنے پر خلیفہ نے یہ فقرہ امام شعبی کو سنایا تو آپ نے کہا اور کیا خوب کہا کہ قیصر نے مجھ کو تو دیکھا مگر آپ کو نہیں دیکھا۔ آپ کو دیکھ لیتا تو ایسا نہ لکھتا۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ص
۲	شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی	دیوان عزیز یعنی دربار بغداد	دربار اربل	ابن خلکان۔ ج ۱۔ ص ۱۵۴
۳	حافظ ابن ماکولا	دیوان عزیز	طمغاج خان والی سمرقند	تذکرۃ الحفاظ ج ۴۔ ص ۵
۴	امام ابوالمحاسن قرشی	دیوان عزیز	نورالدین زنگی	اس وقت ان کی عمر تیس برس کی تھی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ص ۱۹۵
۵	امام ابو یعقوب شیرازی	دیوان عزیز	متعدد دربار	تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۱۵
۶	محمد ابن سلامہ قضاعی	دربار مصر	دربار روم	حمیدی نے ان سے روایت کی ہے۔ ابن خلکان ج ۱ ص ۶۱۲
۷	کمال الدین فقیہ شافعی	خلیفہ مقتفی باللہ	قلیج ارسلان والی روم	ابن خلکان ج ۱۔ ص ۶۰۲
۸	علامہ قوشجی شارح تجرید	مرزا الغ بیگ والی سمرقند	سلطان محمد خاں فاتح	ان دونوں سلطنتوں میں نزاع تھا اسی لئے یہ بھیجے گئے تھے۔ اُن کی حسن سعی سے صلح ہوگئی۔ شقائق نعمانیہ۔ ج ۱۔ ص ۱۲۲

مفتی مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

اصلاحِ نفس و حال

الحمد للہ۔ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان سیدنا وسندنا ونبینا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یاایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم ناراً وقودھا الناس والحجارۃ علیھا ملائکۃ غلاظ شداد لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم ونحن علیٰ ذالک من الشاھدین والشاکرین والحمد للہ رب العٰلمین۔

بزرگان محترم و برادران عزیز!

یہ آیت قرآن کریم کے اٹھائیسویں پارہ کی ہے اور سورہ تحریم کا ایک حصہ ہے۔ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک عظیم الشان ہدایت عطا فرمائی۔ اس ہدایت کی تھوڑی سی تشریح آپ کے سامنے پیش ہے۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو صحیح طور پر بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے بلکہ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اس روئے زمین پر کسی انسان کے اندر کوئی کمال نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق اگر انسان کے شامل حال نہ ہو تو علم و فضل کے کتنے اونچے مقام تک پہنچ جائے، مہارت اور کمال کا کتنا اونچا درجہ حاصل کر لے، سارا علم و فضل دھرا رہ جاتا ہے۔ ساری صلاحیتیں اکارت ہو جاتی ہیں۔ اس کا مشاہدہ عام طور پر لوگ تو ہر مسلمان کرتا ہے لیکن مجھ ناکارہ کو اس کا مشاہدہ بار بار ہوتا رہتا ہے کہ بسا اوقات وہ مضامین جو انتہائی وضاحت کے ساتھ اور انتہائی تشریح کے ساتھ ذہن میں موجود ہے کسی وقت میں کہنا چاہتا ہوں لیکن الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کا

کو تحریر پسند آجاتی ہے اور موثر بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن میں آپ سے قسم کھاکر کہتا ہوں کہ بعض اوقات ایک بالکل سامنے کی سیدھی بات کو لکھنے کے لئے بیٹھ جاتا ہوں تو دو دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔ تو انسان کس علم پر اپنے ناز کرے، کس صلاحیت پر اپنی فخر کرے اور کس بات پر اترائے۔ جو کچھ ہے وہ اللہ جل جلالہٗ کی عطا ہے۔ وہ اگر چاہے تو ایک ذرۂ بے مقدار سے پہاڑ کا کام لے لے اور وہ اگر نہ چاہے تو بڑے بڑے ہمالیہ پہاڑ بھی بے حقیقت اور گرد ہوکر رہ جائیں۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ دعا فرمائیے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کو صحیح طور پر اپنی رضا اور خوشنودی کے مطابق عرض کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر تفصیل کرنے پر آئیں تو ایک ہی بات کی اتنی تفصیل فرماتے ہیں کہ پوری سورت ایک بیان کے اندر صرف ہو جائے اور اگر اجمال و اختصار سے بیان فرمانا چاہیں تو ایک جملہ میں وہ بات ارشاد فرمادیتے ہیں جس میں سارے معانی کی کائنات سمٹ آئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ نے قرآن کریم میں پڑھا ہوگا کتنی جگہ آیا۔ کتنے مختلف عنوانات سے آیا۔ ایک پوری سورت قصص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے لئے وقف ہے۔ لیکن وہی واقعہ بعض جگہ چند لفظوں میں، ایک آیت، ایک جملہ کے اندر باری تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں۔

یوں تو پورا کلام اللہ الحمد سے لے کر والناس تک ہمارے آپ کے لئے پیغام ہدایت ہے لیکن بعض اوقات ہر آیت کو اپنی جگہ پر دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر صرف یہی آیت ہمارے لئے نازل ہوئی ہوتی اور ہم صرف اسی آیت پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں۔ ہماری ساری مشکلات دور ہو جائیں۔

انہی آیتوں میں سے ایک آیت یہ بھی ہے جو ہے مختصر لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی بن جائے ارشاد ہے "یا ایھا الذین اٰمنوا" اے ایمان والو! "قوا انفسکم" بچاؤ اپنے آپ کو "واھلیکم" اور اپنے گھر والوں کو "ناراً" ایک زبردست آگ سے۔ وہ آگ کیسی ہے اس کی تفصیل آگے بیان فرمائی کہ "وقودھا الناس والحجارۃ" وہ آگ ایسی ہے کہ اس کا ایندھن لکڑی، کوئلہ، گیس اور مٹی کا تیل نہیں بلکہ اس کا ایندھن الناس والحجارۃ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اس آگ سے بچاؤ۔

اس آگ کی تھوڑی سی تفصیل اور آگے بیان فرمائی کہ یہ نہ سمجھنا جیسا دنیا کے اندر اگر کوئی شخص آگ میں جل رہا ہو تو وہ بچاؤ، بچاؤ کا پکار کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے تو لوگ آکر اس کو آگ سے نکال لیتے ہیں اور وہ بچ جاتا ہے۔ فرمایا وہ آگ ایسی نہیں ہے جس سے کوئی متنفس انسان کو بچا پائے کیونکہ "علیھا ملائکۃ غلاظ شداد" اس آگ کے نگراں ایسے فرشتے ہیں جو بڑے

غلاظ ہیں اور شدید ہیں، تندخو ہیں، سخت گیر ہیں۔ "لا یعصون اللہ ما امرہم" اور وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتے۔ "و یفعلون ما یؤمرون" اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ جب وہ فرشتے اس پر مقرر ہیں تو یہ نہ سمجھا جائے کہ کوئی شخص بچاؤ کر کے فریب کر یا رشوت دے کر یا ان کو بہلا پھسلا کر اس آگ سے نکل سکے گا۔ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس سے بچاؤ اپنے آپ کو بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ یہ ہے اس آیت کا ترجمہ۔ اور جیسا میں نے عرض کیا اگر اس کو ذرا دھیان سے پڑھا جائے اور اس کے اوپر غور کیا جائے تو ہماری آپ کی دنیا اور آخرت کی نجات کا تمام سامان اس کے اندر پوشیدہ ہے۔

اب میں ذرا اس کی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو جو لفظ استعمال فرمایا اللہ تعالیٰ نے "یایہا الذین آمنوا" اے ایمان والو! یہ جو انداز خطاب ہے باری تعالیٰ کا جگہ جگہ اس کی تکرار ہے۔ "یایہا الذین آمنوا" "یایہا الذین آمنوا"۔ یہ عجیب و غریب بڑا پیارا انداز خطاب ہے بہت بھرا، شفقت بھرا خطاب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو ان الفاظ سے خطاب فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ باری تعالیٰ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "اے لوگو!" "اے انسانو!"۔ لیکن لفظ یہ استعمال فرمایا "اے وہ لوگو! جو مجھ پر ایمان لائے ہو"۔ "اے ایمان والو" یہ محبت والا خطاب ہے۔ اس واسطے کہ دنیا کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کو اگر خطاب کرنا ہو تو اس کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ کہ اس کا نام لے کر اس سے خطاب کریں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نام لینے کی بجائے اس رشتے کے حوالے سے آپ خطاب کریں جو آپ کا اس شخص کے ساتھ ہے۔ ایک باپ ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو بلاتے تو اس کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نام لے کر اس کو بلائے۔ مثلاً اس کا نام فرض کیجئے کہ حمید ہے تو کہے کہ "حمید فلاں کام کر دو"۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نام لینے کے بجائے یہ کہے کہ "بیٹا یہ کام کر دو"۔ تو "بیٹا یہ کام کر دو" میں جو مزہ ہے، اس میں جو لطف ہے، اس میں جو پیار ہے، اس میں جو شفقت ہے وہ "حمید یہ کام کر دو" کے اندر نہیں۔ نام لے کر بات کرنے میں وہ لطف نہیں آئے گا ایک سعادت مند بیٹے کو جتنا بیٹا کہہ کر پکارنے میں لطف آئیگا۔ ہمارا آپ کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے ایمان کا رشتہ ہے۔ ہم اور آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کی ذات پر، اس کی وحدانیت پر، اس کی قدرت کاملہ پر، اس کی صفات عظیمہ پر ایمان لائے کر ہیں تو باری تعالیٰ اس کا حوالہ دے کر خطاب فرما رہے ہیں کہ "یایہا الذین آمنوا" اے وہ لوگو جن کا میرے ساتھ ایمان کا رشتہ ہے۔ یہ کہہ کر خطاب فرما رہے ہیں۔ تو اس میں جو پیار ہے

اور شک ہے وہ کسی اور خطاب میں نہیں ہے۔ اور یہ بات جہاں پر کہ باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یاایھاالذین آمنوا تو درحقیقت اشارہ اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ جو بات آگے کہی جا رہی ہے اس کا منشا تمہارے ساتھ محبت ہے، تمہارے اوپر شفقت ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ ہم تمہاری خیرخواہی چاہتے ہیں۔ ہم تمہیں غلط راستے سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ خطاب استعمال کیا جاتا ہے۔ اس انداز خطاب کے ساتھ جب کوئی بات کہی جائے تو اس کو ذرا زیادہ توجہ، زیادہ اہتمام سے سننے کی ضرورت ہے۔ اس انداز خطاب کے بعد فرمایا کہ بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس نار جہنم سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "اپنے آپ کو بچاؤ، اپنے گھر والوں کو بچاؤ" ان دو جملوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے پورے معاشرے اور پوری امت کو ایک جامع پروگرام دے دیا۔

آج ہماری حالت یہ ہے کہ امت کی اصلاح کے لئے نہ جانے کتنی کوششیں، کتنی کاوشیں دنیا کے مختلف حصوں میں ہو رہی ہیں۔ کتنی انجمنیں قائم ہیں، کتنی جماعتیں ہیں، کتنے ادارے ہیں جو مسلسل اس کام پر لگے ہوئے ہیں کہ امت کی اصلاح ہو جائے۔ لیکن چونکہ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقہ کار سے ذرا ہٹا ہوا ہے اسلئے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ تمام کاوشیں، وہ تمام کوششیں بالکل ہوا میں اڑتی جا رہی ہیں۔

آپ تھوڑا سا جائزہ لیجئے۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے تیور یکساں ہی سے ہیں اور دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ اس لئے دونوں کے مسائل بھی ایک جیسے ہیں۔ پاکستان میں نظر آتا ہے کہ شہر شہر، گاؤں گاؤں، گلی گلی جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، وعظ ہو رہے ہیں، جماعتیں قائم ہیں، انجمنیں قائم ہیں، ادارے قائم ہیں۔ پوچھا جائے کہ یہ انجمن کونسی ہے؟ جواب ملے گا۔ یہ صاحب اصلاح المسلمین ہے۔ یہ کونسی ہے؟ یہ اصلاح معاشرہ۔ یہ کس کام کے لئے ہے؟ یہ صاحب اصلاح امت کے لئے ہے۔ ہزار قسم کی انجمنیں، ہزار ادارے، ہزار واعظین، ہزار مبلغین اور نہ جانے کتنے مقررین کی تقریریں ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود اگر دیکھا جائے کہ ان تمام تقریروں کا، ان تمام مواعظ کا، ان تمام جلسوں کا حاصل کیا ہے؟ اس سے کیا کسی ایک انسان کی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی؟ کیا کسی انسان کے حالات میں کوئی تغیر آیا؟ کیا وہ دین سے پہلے دور تھا اب قریب ہو گیا؟ کوئی بری عادت پڑی تھی وہ چھوٹ گئی؟ اگر اس نقطہ پر اس کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیں تو وسائل ایسے بے پناہ صرف ہو رہے ہیں، پیسے لگ رہے ہیں، اوقات خرچ ہو رہے ہیں۔ لیکن کسی بھی چیز کا آخری پیداوار (Output) ہے وہ کتنی نصیب ہوئی۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔ جتنی کوششیں ہو رہی ہیں ان کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں۔

اگر ہمارے سلف صالحین کے حالات کو ہم ذرا دیکھیں تو علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ جو مشہور عالم گزرے ہیں اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ اُن کے ایک ایک وعظ میں نو نو سو انسانوں نے توبہ کی ہے ان کے ہاتھ پر۔ اور یہ تو خیر دور کی بات ہے ذرا قریب کی بات لے لیجئے تو حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ابھی حال میں گزرے ہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے ایک وعظ میں بیسیوں انسان اسی وعظ کے اندر تائب ہوتے تھے اور برائیوں اور غلطیوں سے توبہ کرتے تھے۔

تو یہ کیا بات ہے کہ کوششوں کا اگر حجم دیکھا جائے کوششوں کی مقدار دیکھی جائے تو وہ بظاہر پہلے سے زیادہ ہے لیکن نتائج صفر۔ نتائج کے اعتبار سے ہمیں کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ درحقیقت جہاں تک مجھ ناکارہ نے اس مسئلہ پر سوچا تو نظر آتا ہے کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ ہم نے فراموش کر دیا۔ مقولہ یہ ہے کہ لَنْ یَّصْلُحَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا کہ امت کے آخری دور کی اصلاح نہیں ہو سکتی مگر اسی طریقے پر جس طرح پہلے دور کی اصلاح ہوئی تھی۔ پہلے دور کی اصلاح جس طریقے سے ہوئی تھی جب تک اس راستے کو اختیار نہیں کیا جائے گا اس امت کے آخری دور کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس طریقے کو فراموش کر کے ہم نے کچھ نئے راستے اصلاح کے ایجاد کئے جو ان طریقوں سے مختلف ہیں۔ اس واسطے نتائج خاطر خواہ حاصل نہیں ہوتے۔

قرآن کریم خود دعوت دے رہا ہے اور اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کر کے دکھا دیا کہ ہر اصلاح کا آغاز کہاں سے کیا جانا چاہئے۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔ پہلا آغاز اپنے آپ سے ہے اور دوسرے نمبر پر وَاَهْلِيْكُمْ اپنے گھر والوں کو بچاؤ آگ سے، اپنے گھر والوں کی اصلاح کرو۔ یہاں سے چلو دعوت لے کر۔ پہلے دعوت دو خود اپنے نفس کو۔ اپنے نفس کی اصلاح کی فکر کرو اور پھر اپنے گھر والوں کی اصلاح کی فکر کرو۔ یہ طریقہ اگر اختیار کرو گے تو رفتہ رفتہ کرتے ہوئے پوری امت کی اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن ہم نے طریقہ اس کے الٹا اختیار کیا کہ ہم دعوت شروع کرتے ہیں اپنے سامنے والے آدمی سے، اپنے آپ کو دیکھے بغیر، اپنے گھر والوں کو دیکھے بغیر۔ دوسرے لوگوں کی اصلاح کی فکر میں سب سے پہلے بڑھ جاتے ہیں اور اپنی طرف ہمیں دھیان نہیں رہتا۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا جو طریقہ کار تھا وہ یہی تھا جو قرآن کریم نے اس آیت کے اندر بتا دیا۔ اور آپ حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جانتے ہیں۔ جب آپ کو دعوت و تبلیغ کا حکم ہوا ہے تو سب سے پہلے جو حکم آیا ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کہ ڈراؤ اور دعوت دو اپنے قریب ترین خاندان کے لوگوں کو۔ اُن سے آغاز کرو دعوت کا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک دم سے باہر نکل کر اہلِ مکہ کو دعوت دینی شروع نہیں کردی۔ باہر نکل کر تمام لوگوں کو بلانا شروع نہیں کر دیا۔ بلکہ روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت پر اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اور دوسرے اہلِ خاندان کو جمع کیا اور ان سے خطاب فرمایا کہ دیکھو میرے اوپر یہ حکم نازل ہوا ہے اور تم اپنی اصلاح کی تدبیر کرو۔

انبیاء علیہم السلام اپنی طاقت کا آغاز کرتے ہیں اپنے اور اپنے گھر والوں سے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم بیان فرماتا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو موت کا وقت قریب آیا تو اس وقت اپنے سارے بیٹوں کو جمع فرمایا اور ان سے پوچھا کہ بتاؤ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ آغاز کیا جا رہا ہے دعوت کا اور سب سے پہلے اس بات کی فکر ہے کہ میرے بیٹے کہیں گمراہ نہ ہو جائیں، میرے بیٹے کہیں غلط راستے پر نہ پڑ جائیں۔

دعوت کا آغاز ہوتا ہے سب سے پہلے اپنے نفس سے اور اس کے بعد اپنے گھر والوں سے تو پھر نکلتا ہے انسان۔ تب اس کی دعوت موثر ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ میں بھی اثر ہوتا ہے، اس کے قول و فعل میں بھی اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ایک ایک ادا سے تبلیغ بن جاتا ہے، ایک ایک ادا سے دعوت بن جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اسلام پھیلتا ہے، اسلام کی تعلیمات پھیلتی ہیں، اصلاح ہوتی ہے لیکن ہم نے انجمنیں، جماعتیں اور ادارے قائم کر لئے ہیں۔ ہم سب اس میں مبتلا ہیں کہ ہم دعوت کا آغاز کرتے ہیں دوسروں سے کہ دوسرے ٹھیک ہو جائیں۔ دوسروں کی برائی فوراً نظر آ جائے گی اس پر تنقید کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے لیکن کبھی چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایسا لمحہ نہیں آتا جس میں ہم اپنا زندگی کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہماری زندگی میں کیا غلطیاں ہیں۔ کیا خرابیاں ہیں۔ کونسی باتیں قابل اصلاح ہیں۔ کتنی اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ کتنے فرائض کو بجا لاتے ہیں اور کتنے واجبات کو بجا لاتے ہیں۔ اگر کوتاہی ہے تو اس کی اصلاح کا راستہ کیا ہے۔ اس کے لئے کوئی وقت ہم نہیں نکالتے۔ ہاں دوسرے کے اندر خرابی نظر آئے گی تو اس کے اوپر تنقید کرنے کے لئے تیار، دوسرے کی خرابی بیان کرنے کے لئے تیار۔

آپ کو معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دو حصے ہیں۔ ایک مکی زندگی دوسری مدنی زندگی۔ مکی زندگی ۱۳ سال کی ہے اس میں نہ جہاد ہے، نہ حکومت ہے، نہ ریاست ہے نہ سیاست ہے۔ اور جتنے کام زندگی کے اندر بڑے ہیں وہ اس میں کچھ نظر نہیں آتے۔ تیرہ سال اس طرح گزرے ہیں صحابہ رضؓ پر کہ حکم آتا ہے کہ صبر کرو کہ اگر مشرکین تمہیں تکلیفیں پہنچا رہے ہیں، تمہارے سینے کے اوپر پتھر کی سلیں رکھ رہے ہیں، تمہیں تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جا رہا ہے

تو حکم ہے کہ فاصبر وما صبرک الا باللہ صبر کرو تمہارا صبر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مکی زندگی میں جہاد کا حکم اس لئے نہیں آیا تھا کہ مسلمان کمزور تھے۔ یہ بات صحیح نہیں کیونکہ کیا اللہ تعالیٰ اپنی مدد مکہ مکرمہ میں نہیں بھیج سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت مکہ میں بھی آسکتی تھی لیکن درحقیقت بات یہ تھی کہ بجائے سیاست، ریاست، حکومت کی چکروں میں ڈالنے کے تیرہ سال کی مدت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اخلاق کو سنوارنا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک بھٹی سے گزارنا تھا۔ مجاہدات کی بھٹی سے گزارنا تھا کہ مصیبتیں آئیں اور اف نہ کریں، ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں اور کلمۂ بے صبری زبان سے نہ نکلے۔ اُن پر طرح طرح کی مصیبتیں توڑی جاتیں لیکن اس کے باوجود وہ خاموش رہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا پر وہ راضی رہیں۔ یہ دراصل سکھایا جا رہا تھا تیرہ سال کی مدت میں اس مکی زندگی کے اندر۔ اس وقت نہ جہاد کا، نہ ریاست کا نہ کوئی قانون تھا نہ کوئی حکم تھا۔ وہاں صرف یہ حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، راتوں کو بیدار رہو، راتوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کرو، یا ایہا المزمل قم اللیل الا قلیلا رات کو کھڑے ہو جاؤ اور جتنا ہو سکے اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔ قرآن کریم کی تلاوت کرو، ذکر کرو، تسبیح کرو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ لو لگاؤ۔ یہ احکام تھے مکی زندگی کے اندر تاکہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ جڑ جائے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کی محبت، اس کے دین کی عظمت کا احساس رگ وپے میں پیوست ہو جائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق کی اصلاح ہو جائے۔ تیرہ سال میں جب یہ جماعت تیار ہو گئی، اخلاق کی بھٹی کے اندر تپا کر بہترین بنا دیا گیا۔ ایسے اخلاق کہ روئے زمین کے اوپر کسی نے نہیں دیکھے کسی اور قوم کے اندر نظر نہیں آتے۔ تب مدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے کہ ہاں اب تم اس لائق ہو چکے ہو کہ تمہیں ریاست دی جائے۔ اب تم اس لائق ہو چکے ہو کہ تمہیں حکومت دی جائے۔ اب تم حکومت کرو گے، ریاست کو چلاؤ گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلاؤ گے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے چلاؤ گے، اپنی ذاتی انا کی خاطر نہیں، ذاتی شہرت اور منصب کے شوق میں نہیں، حبِ جاہ میں نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت ومحبت، اللہ تعالیٰ کے کلمے کو سربلند کرنے کے لئے چلاؤ گے۔ اس کے بعد جو ریاست قائم ہوئی مدینہ کے اندر اس کی نظیر آسمانوں اور زمین کی نگاہوں نے نہیں دیکھی۔ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔ اس کے بعد قانون بھی مؤثر ہوا اور حکومت بھی بہترین بنی۔ یہ سب کچھ اخلاق کی اصلاح کرنے کے بعد ہوا۔

میں پاکستان میں اپنے ساتھیوں سے عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم الٹے چلتے ہیں اس طرح کہ مکی زندگی کے تیرہ سال کو بھول جاتے ہیں اور تیرہ سال کی چھلانگ لگا کر مدینہ طیبہ سے اپنی تحریکوں کا،

اپنی کوششوں کا، اپنی جد و جہد کا آغاز کرتے ہیں کہ آج سے ریاست قائم ہو جائے۔ اخلاق کا حال تو یہ ہے کہ دل میں دنیا کی محبت بھری ہوئی ہے، دل میں شہرت حاصل کرنے کے بت سمائے ہوئے ہیں، دل کے اندر صنم بنے ہوئے ہیں، بت خانے بنے ہوئے ہیں اپنے ذاتی مفادات کے اور اس حالت میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں حکومت اور ریاست حاصل ہو تو اس کے بعد ہم اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلائیں۔ کیسے چلائیں گے جب دل کی حالت درست نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق نہیں چل سکتا تو ہر معاملے میں الٹے چلتے ہیں۔

اصلاح و دعوت کا کام لے کر چلتے ہیں تو دوسروں سے آغاز کرتے ہیں، اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ اور جب اسلامی ریاست، اسلامی نظام کے قائم کرنے کی باتیں ہوتی ہیں تو تیرہ سال کی زندگی کو چھلانگ لگا کر مدنی زندگی سے اس کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ کہ ساری کوششیں اکارت جا رہی ہیں۔ ساری کوششیں بیکار نظر آتی ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ کو دیکھو، اپنا جائزہ لو، اپنے سر سے لے کر پاؤں تک اپنے سراپا کو دیکھو، اپنے شب و روز کو دیکھو، اپنی مصروفیات کو دیکھو، اپنی نشست و برخواست کو دیکھو کہ اس کے اندر کون سی بات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے اور کون سی بات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ جو نہیں ہے اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔

میں پاکستان میں اپنے دوستوں سے عرض کیا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں یہ پانچ فٹ کی سلطنت دے رکھی ہے۔ (ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک سلطنت دے رکھی ہے اس کے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک) یہ اس کی سلطنت ہے۔ اس کے اوپر کسی اور کا تسلط نہیں۔ کتنا ہی کوئی شخص مجبور ہو مقہور ہو، اقلیت میں ہو کہ اکثریت میں ہو، کسی حالت میں ہو لیکن یہ سلطنت اس کی ہے اس میں کوئی دوسرا دست اندازی نہیں کر سکتا۔ اسی پر فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ **کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَاعِیَتِہٖ** تم میں سے ہر شخص حاکم ہے اپنے دائرے میں۔ کم از کم اتنا دائرہ تو ہر ایک فقیر، ہر ایک گداگر، ہر ایک ننگے بھوکے کو بھی حاصل ہے کہ سر سے لے کر پاؤں تک اس کی اپنی سلطنت ہے۔ اس کے اندر کوئی دوسرا دست اندازی کرنے والا نہیں۔ تو پتہ یہ بتاؤ تم نے اپنی اس سلطنت کے اوپر کتنا اسلام نافذ کیا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے مطابق اس ٥ فٹ، ٦ فٹ کی سلطنت کو کتنا بنایا؟ دعوت تو لے کر چلے ہیں پورے ملک کو اور پوری دنیا کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی لیکن یہ پانچ فٹ کی سلطنت تو ہم سے سنبھلتی نہیں اور اس کی طرف تو ہمارا دھیان ہی نہیں۔ فضول ملک کی اور عالم کی باتیں کیا کریں گے۔ تو سب

پی۔ وی۔ نرسمہاراؤ

نئی تعلیمی پالیسی کیوں؟

پارلیمنٹ نے تعلیم کے بارے میں قومی پالیسی کو حال ہی میں منظوری دے دی ہے۔ منظوری سے قبل نئی تعلیمی پالیسی کی ضرورت پر تفصیلی تبادلۂ خیالات ہو چکے ہیں۔ جس میں اساتذہ، طلباء، والدین، ماہرین تعلیم، تعلیمی نظم ونسق کے ماہرین اور ہزاروں دیگر حضرات نے حصہ لیا۔ نئی تعلیمی پالیسی پارلیمنٹ میں پیش کرنے سے قبل تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ اور قومی ترقیاتی کونسل میں پالیسی کے مسودے پر تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ ان جلسوں میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ، وزرائے تعلیم نیز مرکزی ماہرین تعلیم اور مرکزی سرکار کی مختلف وزارتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔

بہت سے لوگوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی کی کیا ضرورت تھی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ پروفیسر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری کی صدارت میں ایک تعلیمی کمیشن 1964ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر تعلیم کے بارے میں ایک قومی پالیسی 1968ء میں پہلی بار مرتب کی گئی۔ یہ پالیسی ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ اس میں تعلیم کو قومی ترقی سے منسلک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس پالیسی کا مقصد تھا سب کے لئے ابتدائی تعلیم کا اہتمام کرنا اور بین الاقوامی معیار کے اعلیٰ و تکنیکی تعلیم کے ادارے قائم کرنا۔ بعد کے آنے والے برسوں میں ملک میں تعلیم کی حیران کن توسیع ہوئی۔ چنانچہ آج ملک کے 83 فی صد لوگوں کے لئے ابتدائی تعلیم کا اہتمام ہے۔ 60 ہزار ہائر سیکنڈری اور ہائی اسکول ہیں۔ پانچ ہزار کالج اور 150 یونیورسٹیاں ہیں۔

اس زبردست ظاہری توسیع کے باوجود 1968ء کی تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد ناممکن رہا۔ نہ تو پالیسی پر عمل درآمد کے لئے کوئی تفصیلی منصوبہ تیار کیا گیا اور نہ ہی اس مقصد کے لئے کوئی رقوم مہیا کی گئیں۔ چنانچہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ نئے انسان کی تعمیر، ملک میں تمام شہریوں کے لئے ایک جیسی تعلیمی سہولیات کے مواقع پیدا کرنے نیز تعلیم

مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل

کے ذریعہ اتحاد اور قومی ایک جہتی کا جذبہ پیدا کرنے کے نصب العین پوری طرح حاصل نہیں ہو سکے۔ دوسری جانب آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور نتیجتاً ناخواندہ افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیمی معیارات تیزی سے زوال پذیر ہو رہے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں کو مستقبل کی نئی ٹیکنالوجیوں کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی تربیت دی جائے۔ ملک کو ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہے جس میں تعلیمی نظام میں ایک انقلابی تبدیلی لانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ تبدیلی وہی ہونی چاہئے جس سے طلباء، اساتذہ اور والدین میں اعتماد، ایک نیا احساس پیدا ہو اور ایک نظام قائم ہو جو ملک کے ایک روشن مستقبل کے لئے راہ ہموار کرے۔

چنانچہ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی میں منجملہ دیگر پہلوؤں کے درج ذیل پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔

الف۔ تعلیم کے ایک قومی نظام کی تشکیل اور

ب۔ تعلیم کے شعبہ میں عدم مساوات و عدم توازن کو دور کرنا۔

تعلیم کا قومی نظام قومی نصاب تعلیم کے خاکے پر مبنی ہوگا جس میں ایسے دیگر اجزاء کے ساتھ ایک مشترکہ کلیدی جزو شامل ہے جن میں حسب ضرورت رد و بدل کیا جا سکے گا۔ مشترکہ کلیدی جزو میں بھارت کی جدوجہد آزادی کی تاریخ، آئینی ذمہ داریاں اور قومی شناخت کی تعمیر کے لئے ضروری دیگر اجزاء شامل ہوں گے۔ یہ عناصر ہر مضمون میں شامل رہیں گے۔ اور ان کا مقصد یہ ہوگا کہ بھارت کے مشترکہ ثقافتی ورثہ، جمہوریت اور سیکولرازم، جنس کی مساوات، ماحولیات کے تحفظ، سماجی بندشوں کو دور کرنے چھوٹے کنبے کے اصول کو اپنانے اور سائنسی مزاج بنانے جیسی قدروں کو فروغ دیا جائے۔ تمام تعلیمی پروگراموں کو سیکولر قدروں کی سخت پابندی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

نئی تعلیمی پالیسی میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ پوری قوم تعلیمی تعمیر نو، ابتدائی تعلیم کی ہمہ گیر رسائی، خواندگی کے فروغ، سائنسی و ٹیکنالوجیکل تحقیق کے فروغ اور ہر قسم کے تعلیمی عدم توازن کو دور کرنے کی پابند اور ذمہ دار ہوگی۔

تعلیم کو مشترکہ فہرست میں شامل کرنے کے لئے 1976ء میں آئینی ترمیم

کی گئی تھی۔ نئی تعلیمی پالیسی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مرکزی سرکار قومی اتحاد کو یقینی بنانے، تعلیم کے معیاری پہلوؤں میں اضافہ کرنے، افرادی قوت کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر تعلیمی پروگراموں کی منصوبہ بندی کرنے نیز تحقیق و اعلیٰ مطالعات پر زیادہ زور دینے کے لئے خود زیادہ ذمہ داری نبھائے گی۔ تعلیم ایک ایسا کام ہے جسے مرکز، ریاستوں اور عوام کو ایک مشترکہ چیلنج کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔ نئی تعلیمی پالیسی میں یہ بات صاف طور پر کہی گئی ہے کہ ہر بچہ کو بلا لحاظ نسل، ذات اور جنس کے ایک خاص سطح تک تعلیم مہیا کی جائے گی۔ لیکن محض یہی اک چیز از خود ملک میں تعلیمی مساوات یقینی طور سے لانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو سب کو کامیابی کے ایک جیسے مواقع مہیا کرے۔

نئی پالیسی میں اس سلسلے میں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے طلباء کو وظائف دینے اور خصوصی تعلیم دینے کے لئے سہولیات کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔ اسی طرح سماجی انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ان اقلیتی گروپوں کی تعلیم کے لئے خصوصی اہتمام کیا جائے۔ جو تعلیمی لحاظ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں جسمانی اور ذہنی طور پر معذور افراد کی بڑی تعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں تعلیم مہیا کرنے کے لئے مناسب اقدامات کا اہتمام کیا گیا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیمی لحاظ سے خواتین کی مساوات پر خاص زور دیا گیا ہے۔ یلم کو خواتین کے مرتبہ میں بنیادی تبدیلی لانے کے ایک ایجنٹ کے طور پر استعمال کیا جائے ۔ ماضی میں تمام کوششوں کے باوجود بھی مردوں اور عورتوں کی تعلیم میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے یہ فرق صدیوں کی پیداوار ہے اور اسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ نانچہ تعلیمی پالیسی میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ تعلیم کے آلۂ کار کے ذریعہ ایک ایسے معاشرے کے ارتقاء کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی جس میں جنس کی مساوات کی قدر کی جائے۔ نانچہ پالیسی میں ہر شعبے میں مساوی تعلیمی مواقع، نصابی کتابوں میں خواتین کے خلاف جنسی تعصب کو دور کرنے اور لڑکیوں کے لئے ابتدائی تعلیم کو عالمگیر کر دینے کو اولین ترجیح دی گئی ہے۔

جب یکسانیت یا مساوات کا ذکر آتا ہے تو قدرتی طور پر توجہ سماج کے ان طبقوں کی طرف جاتی ہے جو صدیوں سے ناخواندہ رہے ہیں۔ ناخواندگی کے سبب عوام کا ایک بہت بڑا حصہ بھی ترقی کے عمل میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ناخواندہ لوگ اطلاعات اور مواصلات کے ذرائع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح وہ اپنی قابلیتوں میں اضافہ کئے بغیر اچھی ملازمتیں حاصل

پیچھے کر سکے ۔ لہٰذا نئی تعلیمی پالیسی میں یہ طے کیا گیا ہے کہ 15 سے 35 برس کے عمر کے گروپ میں ناخواندگی کے خاتمہ کے لئے پوری قوم ذمہ دار ہوگی ۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ سرکار، رضاکارادارے، تعلیمی ادارے، طلبا، اساتذہ اور سماج کے دیگر طبقے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے اپنی اپنی کوشش کریں ۔

ناخواندگی کے خاتمہ کے علاوہ عملی ہنروں کی تعلیم دینا اور سماجی بیداری پیدا کرنا تعلیم بالغان کے لازمی اجزا ہیں ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم بالغان کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھنے کا ایک جامع پروگرام شروع کیا جائے ۔ اس کام کے لئے متعدد تجاویز ہیں جن میں تعلیم جاری رکھنے کے مراکز، لائبریریاں، مطالعہ گاہیں قائم کرنے، نیز ریڈیو اور ٹیلی ویژن مہیا کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے ۔

اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم کو اولین ترجیح دی جائے ۔ نئی تعلیمی پالیسی میں قبل از پرائمری تعلیم پر بھی زور دیا گیا ہے ۔ اس مقصد کے لئے پرائمری اسکولوں میں ضروری سہولیات کا اہتمام کیا جائے گا ۔ ہر اسکول میں دو بڑے کمرے ہوں گے جو پورے سال استعمال ہو سکیں گے اور وہاں کھلونے، بلیک بورڈ، چارٹ، نقشے اور سیکھنے کا دوسرا سامان مہیا کیا جائے گا ۔ ہر اسکول میں کم از کم دو اساتذہ ہوں گے جن میں سے ایک خاتون ہوگی ۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے گا اس تعداد میں ایک جماعت کے لئے ایک معلم کی رفتار سے اضافہ کیا جائے گا ۔ ملک بھر میں پرائمری اسکولوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے "بلیک بورڈ آپریشن" ایک مرحلہ وار مہم شروع کی جائے گی حکومت، بلدیاتی اداروں، رضاکار اداروں اور افراد کو اس مہم میں پوری طرح شریک کیا جائے گا ۔ اسکول چھوڑ جانے والے بچوں کے لئے، ایسی آبادیوں کے بچوں کے لئے جہاں کوئی اسکول نہیں ہے کام کرنے والے ان بچوں اور ان لڑکیوں کے لئے جو پورے دن اسکول نہیں جا سکتیں غیر رسمی تعلیم کا ایک بڑا اور منظم پروگرام شروع کیا جائے گا ۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ غیر رسمی تعلیم ایک دوسرے درجے کی تعلیم ہے اور یہ سماج کے محروم طبقوں کے لئے ہے ۔ حکومت کی کوشش ہے کہ غیر رسمی تعلیم کسی طرح بھی رسمی تعلیم سے کم تر درجے کی نہ ہو ۔ حکومت 1990ء تک ملک کے سب بچوں کو پرائمری تعلیم مہیا کرنے، نیز 14 برس تک کی عمر کے تمام بچوں کو 95ء تک مفت اور لازمی تعلیم دینے کی آئینی ذمہ داریاں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے

نئی تعلیمی پالیسی کا ایک حصہ نوودیا ودیالیہ ہیں جنہیں پہلے "ماڈل اسکول" کہا جاتا تھا ۔

ان اسکولوں کے بارے میں غلط فہمی پیدا کر دی گئی ہے کہ یہ اسکول سماج کے مالدار شہری طبقوں کے بچوں کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ حالانکہ سچائی اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ اسکول دیہی علاقوں کے پرائمری اسکولوں میں تعلیم پانے والے ہوشیار بچوں کے لئے ہیں جنہیں غریبی کی وجہ سے عام طور پر اچھی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ نودیا ودیالیہ میں تعلیم مفت ہوگی اور متعلقہ ضلع میں درج فہرست ذاتوں میں اور درج فہرست قبیلوں کی آبادی کے تناسب کے مطابق اسکولوں میں ان کے بچوں کے لئے جگہیں مخصوص ہوں گی۔ یہ تناسب کسی طرح بھی ملک کی کل آبادی میں ان کے تناسب سے کم نہیں ہوگا۔ ان اسکولوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان اسکولوں میں سے ہر ایک اسکول کے 20 فیصد بچے ملک کے دوسرے حصوں کے نودیا ودیالیہ سے آئیں گے جس سے قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔ اور بچوں کو ایک ساتھ رہنے اور سیکھنے کا موقع ملے گا۔ سہ لسانی فارمولہ کے مطابق ان اسکولوں میں تین زبانوں کی تعلیم دی جائے گی۔ آہستہ آہستہ یہ اسکول ملک میں تعلیم کی تعمیر نو میں ایک اہم کردار ادا کریں گے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیم کو پیشہ ورانہ بنیادوں پر استوار کرنے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ملازمتوں کو تعلیم سے منسلک کرنے کے بارے میں متواتر غور و خوض کیا جا رہا ہے لیکن منصوبہ بند کوششوں کی عدم موجودگی میں اس سمت کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی اس کام کے لئے کافی رقوم مہیا کی گئی ہیں۔ اب بھی کوئی بڑا پروگرام اس مقصد کے لئے نہیں بنایا جا رہا ہے۔

یہ تجویز کیا گیا ہے کہ 1990ء تک ہائر سیکنڈری کے دس فیصد طلباء کو اور 1995ء تک 25 فیصد طلباء کو پیشہ ورانہ نصاب کی تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لئے بھی اقدامات کئے جائیں گے کہ ان نصابات کی تعلیم سے فارغ ہونے والے طلباء کی کافی بڑی تعداد ملازم ہو جائے یا اپنا کام دھندہ خود شروع کرلے۔ نصابات پر متواتر نظر کی جاتی رہے گی۔ حکومت ثانوی سطح پر مختلف نصابات اختیار کرنے کی حوصلہ افزائی کے لئے ملازمین کی بھرتی کی اپنی پالیسی پر بھی نظر ثانی کرے گی۔

اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کے شعبوں میں بھی اہم تبدیلیاں کرنے کی تجویز ہے۔ ان میں سے ایک تبدیلی ڈگریوں کو ملازمتوں سے الگ کرنے کے بارے میں ہے۔ الگ کرنے کا یہ عمل ان ملازمتوں کے لئے ہوگا جن میں یونیورسٹی کی ڈگری بطور ضروری قابلیت کے مطلوب نہیں ہے۔ امتحان کے نظام میں بھی ضروری اصلاح کی جائے گی تاکہ

امتحانات وقت پر ہوں اور ان کی معتبریت بہتر ہو۔ جن کالجوں میں معیار اونچا ہے انہیں خود مختاری دے دی جائے گی۔

یہ بات واضح ہے کہ ان تمام پروگراموں کے لئے بہت زیادہ اضافی رقوم اور عوامی تعاون کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ روشن خیال اور متمول لوگ نیز صنعتی ادارے ملک میں تعلیمی ترقی کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔ حکومت نئی تعلیمی پالیسی میں تجویز کی گئی دوررس تبدیلیاں لانے کے لئے ضروری رقوم مہیا کرنے کی ہرممکن کوشش کرے گا۔

نئی تعلیمی پالیسی میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ آئندہ تین چار برسوں میں تعلیم پر اخراجات قومی آمدنی کے چھ فیصد سے زائد ہوں گے۔ لیکن اس پالیسی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ذاتی نظم وضبط پر پوری توجہ دی جائے جس کے ذریعہ ہم خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ تدریس اور تحصیل علم کے عمل میں یکسوئی، لگن اور نیک نیتی کا ماحول پیدا کرسکتے ہیں۔ اس کے بغیر تعلیم کو فروغ نہیں ملے گا۔ جو فرد بھی تعلیمی عمل میں معروف ہے اسے اپنے اداروں، سماج اور ملک کے تئیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ہوگا۔ یہ یقینی بات ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام ملک کا مستقبل بنانے میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کرے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم وقت کے تقاضوں پر پورے اترنے کے لئے مسلسل کوشش کریں۔

▬▬

ضلع میں ان کی آبادی کے تناسب سے ہوگی۔ ان اسکولوں میں انسانیات، سائنس، کامرس اور پیشہ ورانہ نصابات کی تعلیم دی جائے گی۔ ان کے علاوہ وہاں جسمانی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیاں کاموں کے پراجیکٹ اور دورے بھی شامل ہوں گے۔

اساتذہ کی بھرتی کل ہند بنیاد پر کی جائے گی اور انہیں علاقائی کالجوں میں جن کا انتظام تعلیم و تحقیق کی کونسل کے سپرد ہے دوران ملازمت تربیت دی جائے گی۔ ان اسکولوں کو چلانے کے لئے نوودیا ودیالیہ سمیتی کے نام سے ایک خودمختار تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا جائے گا۔

ان اسکولوں میں کام کے جائزے اور معائنے بلکہ مثالی تجربوں اور ماڈل اسکول سسٹم میں بہتری لانے کا بھی انتظام ہوگا۔ زیادہ تر نوودیا سکول 87-1986 میں قائم کئے جائیں گے۔

یونیورسٹی کی سطح پر اپنا انتظام خود چلانے والے کالجوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ یونیورسٹیوں سے الحاق کے موجودہ طریقہ کار کی بجائے یونیورسٹی سے زیادہ آزادانہ اور تخلیقی رابطہ قائم کریں۔ تحقیق کی سہولیات اور حکمت عملی میں حصہ داری میں زیادہ استقامت اور تال میل سے ایک ہمہ گیر طریقہ عمل وجود میں آئے گا جو عمومی طبی تیکنیکی قانونی اور دوسرے شعبوں پر حاوی ہوگا۔ کھلی یونیورسٹی یا داخلے کے نظم [illegible]

ایس۔ ایس۔ پلّے

مستقبل کے بھارتیوں کی تعلیم

جب سے تعلیم کے بارے میں نئی پالیسی پر بحث شروع ہوئی ہے غیر تعلیمی شعبے کے عام لوگوں کی طرف سے دو بڑے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں کہ پالیسی میں نئی بات کیا ہے اور تعلیم کے بارے میں نئی پالیسی کیوں بنائی جا رہی ہے۔

۱۹۶۸ میں بھی جب حکومت اور پارلیمنٹ نے تعلیم کے بارے میں ایک قومی پالیسی منظور کی تھی یہ محسوس کیا گیا تھا کہ تعلیم کو مشترکہ شہریت کا احساس اور مشترکہ ثقافتی رشتہ پیدا کرتا ہے۔ اخلاقی قدریں قائم کرنی ہیں اور اس پورے عمل کا لوگوں کی زندگی سے تعلق پیدا کرنا ہے۔ تعلیم کو صرف مال لے جانے کی پٹڑی کا کام نہیں کرنا ہے جو لوگوں کو ملازمتوں کے پلیٹ فارم پر لائے۔

لگ بھگ بیس برس کے عرصے میں تعلیمی سہولیات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ملک کے ۹۰ فیصد سے زاید دیہات میں ایک کیلومیٹر کے نصف قطر میں سکول ہیں۔ اعلیٰ اور تکنیکی سطح پر بھی سہولیات کی مقدار میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ پھر بھی ترقی کے عمل کی رفتار اور مقدار آبادی میں بھاری اضافے سے پیدا ہونے والی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکی۔ ملازمت کے لئے تعلیمی ڈگری آج بھی طلباء اور والدین کے مقدر اور تمناؤں پر چھائی ہوئی ہے اور یہی چیز پرائمری تعلیم کے مرحلے سے تعلیم کے بارے میں صحیح نظریہ اپنانے کی راہ میں حائل ہوئی ہے۔

نصابات اور امتحانی نظام سے محدود ایک تکلیف دہ اور پیچیدہ تعلیمی دور بوجھ بنا ہوا ہے اور ایک طالب علم کی تمناؤں کو جس کا تعلیم کے تئیں نظریہ قدرے غیر روایتی ہوتا ہے۔ ابھرنے نہیں دیتا۔ جب وہ ایک گھسی پٹی راہ میں سے [illegible] تو اس کے لئے تعلیم [illegible] سے ربط پیدا کرنے اور اپنی قابلیت اور شہری احساس کو ایسے موضوعات اور پراجیکٹوں سے بہتر بنانے کے لئے جن کا ملازمت کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہو، سوچنا اور منصوبہ بندی کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ علیحدگی کیا ہے؟ روزگار کے جو نئے مواقع نکل رہے ہیں ان کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ تعلیمی کامیابیوں اور روزگار کی ضروریات میں میل جول نہیں ہے۔ سرکاری اور نجی دائرۂ کار میں ملازم رکھنے والے بہت سے بڑے بڑے ادارے اپنے ہی مقابلے کے امتحان منعقد کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال سے ڈگریوں کو ملازمتوں سے الگ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب کبھی بھی یہ نہیں رہا کہ کہیں ناکافی قابلیت کے لوگ دستیاب ملازمتیں نہ لے جائیں۔ بلکہ اس کے عقب میں صرف یہ خیال کام کر رہا ہے کہ بھرتی کے میدان میں زیادہ لچک یا گنجائش پیدا کی جائے اور اس کے ساتھ ہی ہنروں اور کام کی ضروریات میں زیادہ موثر تال میل پیدا کیا جائے۔

یہ وہ بدلے ہوئے حالات ہیں جن میں تعلیم کے بارے میں پالیسی پر پھر سے غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ وزیراعظم نے عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے تشریہ میں قوم کے سامنے جو کام رکھے تھے تعلیمی پالیسی ان کے ترجیحی کاموں میں سے ایک تھا۔ چنانچہ بڑا اکام یہ ہے کہ تحصیل علم اور تعلیم کے تیئں نظریہ پر مبنی تدریس کے فلسفے اور ملک میں ملازمتوں کے منظر کا پھر سے جائزہ لے کر اسے ضروریات کے مطابق بنایا جائے۔

اس کام کے لئے اگرچہ طور طریقوں میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں گی لیکن ان تبدیلیوں سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ ان سے اسی رفتار سے نتائج برآمد ہونے لگیں گے جیسے ایک جادوگر اپنی ٹوپی کے اندر سے تیزی سے خرگوش نکالتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر امتحان لینے کا نظام اور نمبر دن کے ذریعہ ہر پرچے کی قدر و قیمت آنکنے کا طریقہ اتنے برسوں میں نہایت جامد اور کرخت بن گیا ہے۔

مشترکہ نصاب نئی تعلیمی پالیسی کی ایک خصوصیت ایک مشترکہ تعلیمی نصاب ہوگا۔ اس میں جدوجہد آزادی کی تاریخ، آئینی حقوق اور ذمہ داریاں اور دوسرے ایسے ہی مضامین شامل ہوں گے جو ایک قومی تشخص کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔ جمہوریت اور سیکولرازم، ماحول کا تحفظ اور سائنسی فروغ کی تشکیل اس تعلیمی نصاب میں شامل ہوں گے۔

تعلیم کے ذریعہ مساوات پیدا کرنے پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ مثلاً عورتوں کو ایسی نئی قسم کی تعلیم دی جائے گی جس سے انھیں پھر سے وضع کردہ طریقوں کے ذریعہ برابر کے مواقع اور اختیارات دیئے جائیں گے۔ تعلیمی ادارے خود ہی ایک سماجی دایہ کا کردار اپنا لیں گے۔ بعد ازاں اس کا مطلب بچوں کی دیکھ بھال کرنے والے مرکزوں کا قیام بن جائے گا اور دیہات میں کم از کم گھریلو سہولیات کی ضرورت رہ جائے گی۔

اسی طرح اسکولوں میں باقاعدگی سے حاضری دینے کی ترغیبات، وظائف، غیر رسمی تعلیم، ہوسٹل کی سہولیات اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے افراد کی تدریسی پیشہ اختیار کرنے کے لئے حوصلہ افزائی جیسے اقدامات سے کم از کم وقت میں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کی تعلیمی ترقی کو برابر کی سطح پر لانے کا نشانہ حاصل کیا جائے گا۔

اس وقت معذور افراد کے لئے جو خاص اسکول ہیں ان کی جگہ جہاں بھی ممکن ہوگا انہیں عام طلباء کے ساتھ تعلیم دی جائے گی۔ تعلیمی نظم و نسق کے بعض ایسے پہلو ہیں جن سے آخر کار تعلیم کا معیار بہتر بنے گا اور ملک کے مختلف خطوں اور مختلف سطحوں کے مابین باہم اثر پذیری میں اصلاح ہوگی۔

اسکول کامپلکس

اس سلسلے میں دو نئے خیالات اسکول کامپلکس اور انڈین ایجوکیشن سروس کے ہیں۔ اسکولوں کے سربراہوں کو خاص طور پر چنا جائے گا اور تربیت دی جائے گی۔ ایک اچھے ڈھنگ سے منصوبہ بند اسکول کامپلکس سے جہاں کے اساتذہ کے لئے پیشہ ورانہ ترقی کے مواقع کامپلکس کے اندر ہی موجود ہوں اور جہاں وہ تجربات اور سہولیات میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہو سکیں۔ اسکولوں کی جانچ پڑتال اور معائنہ کرنے کی بہت سے موجودہ فرائض کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اسکول کامپلکس مقامی آبادی کو خاص طور پر تعلیم کے غیر رسمی شعبوں میں اپنی کارروائیوں میں شریک کرے گا۔

انڈین ایجوکیشن سروس کے نام سے ایک کل ہند خدمت بن جانے سے تعلیمی انتظام میں پیشہ وروں کا زیادہ اشتراک عمل، زیادہ تال میل اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں آنا جانا یقینی ہو جائے گا۔

معلموں کی بھرتی کے طریقۂ کار کو اس طرح پھر سے منظم کیا جائے گا جن سے ہنرمند افراد کو اس پیشے کی جانب راغب کیا جا سکے اور قابلیت اور حقیقی ضروریات کا حصول یقینی ہو جائے۔ معلموں کے معیار کی گریڈوں میں ترقی سے منسلک جانچ کی ایک اسکیم شروع کی جائے گی۔ حکومت کی کوشش ہوگی کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن سے معلموں کی طلبا کی فلاح کے بارے میں اپنے کردار کی تحریک اور ترغیب ملے اور ذاتی و مجموعی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ اساتذہ کی تربیت کے دوران بچوں کے بارے میں علم حاصل کرنے کے کام میں اشتراک، تعلیمی جذبے کی پیداوار سیکولرازم اور قومی اتحاد پر زور دیا جائے گا۔

بچپن کے ابتدائی دیکھ بھال اور تعلیم کو اعلیٰ ترجیح دی جائے گی۔ تین سے چھ سال کی عمر کے بچوں کو صحت اور غذا کی ایک یا ایک سے زیادہ خدمتیں مہیا کی جائیں گی۔ ابتدائی مرحلے

پر ایک دوسرے سے ربط رکھنے والے دو پہلوؤں پر زور دیا جائے گا وہ ہیں یکساں داخلہ اور تعلیمی معیار میں تسلی بخش بہتری۔ پرائمری اسکولوں میں سیاہ تختوں، نقشوں، چارٹوں، کھلونوں جیسی ضروری سہولیات مہیا کی جائیں گی۔ ملک بھر میں بلدیاتی اداروں اور رضاکار تنظیموں کے اشتراک عمل سے پرائمری اسکولوں کے معیار بہتر بنانے کے لئے جلد ہی ایک پروگرام "آپریشن بلیک بورڈ" کے نام سے شروع کیا جائے گا۔

ثانوی تعلیم حاصل کرنے کی سہولیات بڑھائی جائیں گی۔ لہٰذا اس سطح پر اور زیادہ اسکول کھولے جائیں گے اور وہاں پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولیات دی جائیں گی۔ یہ ایک خاص قسم کا تعلیمی معیار ہوگا جس میں طلبا جانے پہچانے پیشہ ورانہ کاموں کے لئے تیار کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے ہائر سیکنڈری اسکولوں اور خاص طور پر قائم کئے گئے تعلیمی اداروں میں نصابات شروع کئے جائیں گے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے اور اس کے بعد جاری رہنے والے منصوبوں میں دیہات کے بے زمین افراد کو روزگار کی ضمانت کے پروگراموں کو اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے ترجیح دینے کی تجویز ہے۔

نو ودیا اسکول

غریبوں اور امیروں کے کنبوں کو تعلیمی سہولیات کے یکساں مواقع اور معیار مہیا کرنے کی غرض سے نو ودیا ودیالیہ کے نام سے مثالی رہائشی اسکولوں کی ایک نئی اسکیم عمل میں آئے گی۔ لائق بچے خواہ ان کے والدین کے مالی وسیلے کم ہوں یا زیادہ نو ودیا اسکولوں میں داخل ہو سکیں گے۔ وہاں تعلیم میں قدروں کی تاکید، ماحول کے بارے میں بیداری، ہم جوئی کے جذبے کے فروغ اور جسمانی سرگرمیوں پر خاص زور دیا جائے گا۔

ان اسکولوں کے کم سے کم ۲۵ فی صد بچے مختلف لسانی خطوں کے رہنے والے ہوں گے۔ اس سے طلبا میں ایک دوسرے کی زبانیں، روایات، آداب اور خطوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی اور ہندی ہوگا اور سہ زبانی فارمولا کے مطابق ایک اور جدید ہندوستانی زبان تیسری زبان کے طور پر پڑھائی جائے گی۔ ان اسکولوں کا مرکزی نصاب ایک جیسا ہوگا جو ریاستی سرکار کے صلاح و مشورے سے تیار کیا جائے گا۔ ان اسکولوں میں داخلہ چھٹے درجے میں ہوگا۔ اور داخلہ کے لئے امتحان کا نمونہ تعلیم تحقیق و تربیت کی قومی کونسل ہندی اردو یا علاقائی زبان میں تیار کرے گی۔

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے لئے ان اسکولوں میں نشستوں کی تخصیص۔

باقی صفحہ ۲۸ پر

غفران احمد

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمانؒ

سرکردہ مجاہد آزادی — (جنوری ۱۹۰۰ء۔ ۲ اگست ۱۹۶۲ء)

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی۔ ہندوستان کی تاریخ میں برطانوی سامراج کے خلاف شدید مزاحمتی تحریکوں کے لیے یاد رکھی جائے گی جب کہ ملکی بساط پر ایسی عظیم شخصیتیں نمودار ہوئیں۔ جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں پر گہرے نقوش چھوڑے۔

مولانا محمد حفظ الرحمن ان ہی چند شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے جنوری سنہ ۱۹۰۰ء میں ضلع بجنور (یو۔پی) کے قصبہ سیوہارہ کے ایک زمیندار علمی خاندان میں جنم لیا۔ آپ کے والد گرامی مولوی حاجی شمس الدین صدیقی تھے۔ جنھوں نے اپنے اس ہونہار فرزند کا نام معز الدین رکھا تھا لیکن والدہ نے حفظ الرحمن رکھا جو اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام پردۂ خفا میں چلا گیا۔ والدین کے فیصلے کے مطابق فرزند کو اسلامیات کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا گیا۔ چناں چہ درسیات نظامی و عربی کورس کی ابتدائی کتابیں آپ نے مراد آباد کے مشہور عربی مدرسہ شاہی میں پڑھیں۔ اس کے بعد آپ کو قصبہ کے ایک مدرسہ فیض عام میں داخل کر دیا گیا۔ نصاب کا بڑا حصہ اسی مدرسہ میں مکمل کیا۔ اس کے بعد اسلامیات کی اعلیٰ سند کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ جہاں اس وقت علامہ انور شاہ صدر مدرس تھے اور مولانا حفظ الرحمن ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔

دارالعلوم دیوبند 1868ء میں اپنے قیام ہی سے تحریک آزادی کا مرکز رہا ہے۔ اس درس گاہ کے صدر مدرس مولانا محمود حسن اور ان کے خاص

شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی نے تحریک آزادی میں ناقابلِ فراموش کردار انجام دیا تھا۔ مولانا محمود حسن کو برطانیہ نے چار برس تک مالٹا میں نظر بند رکھا تھا اور مولانا عبید اللہ سندھی نے کابل میں ہندوستان کی پہلی جلا وطن حکومت قائم کی تھی۔ ان شاندار روایات نے مولانا حفظ الرحمٰن کے سیاسی افکار کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ زمانۂ تعلیم ہی سے ان کا جھکاؤ تحریک آزادی کی طرف تھا۔

اسی دوران میں ایک اہم واقعہ نے مستقبل کے لیے ان کی سیاسی سمت کو متعین کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں ان کے استاد و محترم علامہ انور شاہ ڈابھیل (گجرات) کے عربی مدرسہ میں چلے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے دو شاگرد مولانا حفظ الرحمان اور مفتی عتیق الرحمان عثمانی بھی اسی مدرسہ میں بطور مدرس مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں مہاتما گاندھی نمک ستیاگرہ کے سلسلے میں ڈانڈی مارچ کی تیاری کر رہے تھے۔ مولانا حفظ الرحمان اور مفتی صاحب جاکر گاندھی جی سے ملے اور اس تحریک کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ گاندھی جی ان کی پیش کش سے بہت متاثر ہوئے اور کہا:

"میں نے سنا ہے حضرت پیغمبر اسلام نے ایسی ہدایت کی ہے کہ نمک، پانی اور گھاس رفاہِ عام کی چیزیں ہیں اس لیے اسلام میں بھی ان کو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔"

مولانا حفظ الرحمان اور مفتی صاحب نے اس کی تصدیق کی اور ساتھ ہی حدیث شریف کا اردو ترجمہ لکھ کر گاندھی جی کو دیا۔ جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ڈانڈی مارچ اور نمک ستیہ گرہ میں حصہ لینے پر مولانا حفظ الرحمٰن پہلی بار جیل گئے۔

فطری ذہانت اور طباعی سے مالا مال مولانا حفظ الرحمٰن نے تقریباً ۴۵ سال تک قوم و ملک کی سیاسی۔ سماجی اور علمی خدمات انجام دیں۔ ان کی سحر انگیز شخصیت، قائدانہ صلاحیت اور بے لوث جذبۂ خدمت نے انھیں روشنی کا ایک مینار بنا دیا تھا۔ جو تاریکیوں میں مایوس لوگوں کو راہ دکھاتا ہے۔ مولانا مرحوم کی سرگرمیوں کا دائرہ جمعیت علما ہند اور کل ہند کانگریس سے لے کر پارلیمنٹ اور ندوۃ المصنفین جیسے علمی ادارہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی

شخصیت کی اسی ہمہ گیری نے انھیں عوام و خواص میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ :
دوست، احباب، ضرورت مند اور بے سہارا لوگوں کی مدد کے لیے وہ ہمہ وقت مستعد اور چوکس رہتے تھے۔ شب و روز قوم کی خدمت انھوں نے اپنی زندگی کا آئین قرار دے دیا تھا۔

تحریک آزادی کے کارواں میں وہ مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مفتی کفایت اللہ اور جناب رفیع احمد قدوائی کے ہمسفر رہے۔ وہ متحدہ قومیت، ہندو مسلم اتحاد اور جمہوری نظام کے علم بردار تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے نظریات پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

مولانا حفظ الرحمان نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس اور جمعیت العلماء سے وابستگی سے کیا تھا۔ 1930ء میں جمعیت العلماء ہند کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مرادآباد (یو۔ پی) میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس اس پہلو سے اہم تھا کہ اس میں جمعیت العلماء نے تحریک آزادی میں انڈین نیشنل کانگریس کے شانہ بہ شانہ حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس اجلاس میں مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری شریک تھے۔ تجویز کی تائید میں مولانا حفظ الرحمان نے اس کی پُر زور وکالت کی کہ جمعیت علما کو تحریک آزادی میں انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ غیر مشروط تعاون کرنا چاہیے۔ آنے والے برسوں میں جمعیت علما نے سرگرمی کے ساتھ، تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ اس کے لیڈر اور کارکن بڑی تعداد میں جیلوں میں گئے اور برسہا برس تک قید و بند کی زندگی گزاری۔ مولانا حفظ الرحمان بھی کئی بار جیل گئے۔ مجموعی طور پر وہ چھ برس نظر بند رہے۔ آخری بار "ہندوستان چھوڑ دو (QUIT INDIA) تحریک میں 1942ء میں گرفتار ہوئے اور دو برس بریلی سنٹرل جیل میں نظر بند رہنے کے بعد 1944ء میں رہا ہوئے۔

1947ء میں آزادی کے بعد مولانا حفظ الرحمان نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے انتخابی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ وہ امروہہ، خورجہ سیٹ پر

بلامقابلہ یو۔ پی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ پھر دستور ساز اسمبلی کے ممبر اور بعد ازاں ہند۔ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ جنوری 1952ء میں حلقہ بلاری انتظام آباد سے پارلیمنٹ کے لیے چنے گئے۔ اس کے بعد 1957ء اور 1962ء میں بھی مسلسل حلقہ امروہہ سے پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔

مولانا میں خطابت کا جوہر قدرتی تھا۔ ایک طرف پارلیمنٹ کے ایوانوں میں ان کی خطیبانہ گونج سامعین کو مسحور کر دیتی تھی تو دوسری طرف عوامی جلسوں میں بھی ان کی سحر انگیز خطابت اپنا اثر دکھاتی تھی۔ ان کے ہم عصر انھیں ایک بہترین پارلیمنٹری سمجھتے تھے۔ حق گوئی اور صاف گوئی ان کا شیوہ تھا۔ ان کی رائے سے اختلاف ہو سکتا تھا لیکن ان کے خلوص اور اندازِ شائستگی کے مخالفین بھی قائل تھے۔

1942ء میں جمعیت علمائے ہند کے تیرھویں اجلاس منعقدہ لاہور میں انھیں جمعیت علمائے ہند کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔ تاحیات وہ اس عہدہ کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ آزادیٔ وطن کے بعد انھوں نے جو نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں لکھنؤ کانفرنس کا انعقاد اور مسلم جمہوری کنونشن کا انعقاد قابلِ ذکر ہے۔

ماہ دسمبر 1947ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایما پر لکھنؤ میں ایک کانفرنس بلائی گئی تھی۔ یہ کانفرنس اس لیے اہم تھی کہ اس میں 1947ء سے پہلے کی زہریلی فرقہ وارانہ سیاست کا مداوا سوچا گیا۔ اور مسلمانانِ ہند نے اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ملک کے نئے سیکولر نظام کے لیے خود کو تیار کریں گے اور فرقہ وارانہ جماعتی سیاست سے الگ رہیں گے۔ اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے کہا تھا:

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فرقہ وارانہ سیاسی پلیٹ فارم غلط ہے۔ اس غلطی کو ختم کرو اور مشترک پلیٹ فارم پر ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر ملک کی ترقی پذیر جماعت کی طرف ہاتھ بڑھاؤ۔ ہمت بلند رکھو۔ خدمتِ وطن کے سچے جذبے کے ساتھ آگے بڑھو۔ تمہیں انصاف اور حق و صداقت کا سر بلند کرنا ہے اگر تم نیک مقاصد کے لیے ڈٹ جاؤ گے تو

خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔"

جون ۱۹۶۱ء کو دلی میں منعقدہ انڈین مسلم کونشن میں صدر استقبالیہ کی حیثیت سے مولانا مرحوم نے کہا تھا۔

"آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اپنے موقف کا صحیح احساس اور شعور پیدا ہو۔ اس پیارے دیش کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم برابر کے شریک و سہیم اور اس دعوتِ حق کے علم بردار رہے ہیں جو پورے عالم انسانیت کے لیے امن و صحت کا پیغام اور ہمدردی و خیر سگالی کا سرچشمہ ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس ملک میں ہماری زندگی کسی اجنبی اور تماشائی کی زندگی نہیں ہوسکتی۔ اس کے بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے ملی و وطنی زندگی میں اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے وطنی فرائض سے بھی کوئی غفلت ہمارے لیے جائز نہیں ہوسکتی۔"

ایک اور موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے کہا تھا:

"یہ دیش ہمارا دیش ہے۔ یہ ملک ہمارا ملک ہے۔ اس کے ذرّہ ذرّہ سے ہم کو محبت ہے۔ اس وجہ سے محبت ہے کہ وطن کی محبت ہمارا مذہبی فریضہ ہے میرا مذہب مجھے بتاتا ہے کہ وطن کی محبت ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما رہے تھے تو شہر مکہ کی طرف بار بار دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے مکہ! تو مجھے اتنا عزیز ہے کہ اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں ہرگز نہ چھوڑتا۔ اس سے معلوم ہوا ــــ وطن سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے۔"

مولانا حفظ الرحمان اور جمعیت علما ہند نے ہندوستان اور عرب ممالک کے درمیان سیاسی و ثقافتی روابط کو فروغ دینے میں اہم کردار انجام دیا ہے ــــ جمعیت علما ہند اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے الجزائر اور تیونس کی آزادی اور فلسطینیوں کے حقوق کی حمایت میں آواز بلند ہوتی رہی۔ 1947ء کے بعد عرب ممالک سے آنے والے سربراہوں اور اہم شخصیتوں کے خیر مقدم میں مولانا حفظ الرحمان آگے آگے رہے۔

مولانا حفظ الرحمان ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں سے تھے جو اس وقت بھی

اسلامیات اور مشرقی علوم خصوصاً تاریخ و ادب میں اعلیٰ پایہ کا ایک علمی ادارہ ہے۔ ابتدائی دور میں مولانا کی کئی تصنیفات اس ادارہ کے ذریعہ منظر عام پر آئیں بعد میں سیاسی مشاغل نے انھیں اس ادارہ کی طرف توجہ کی فرصت نہیں دی۔

مولانا کی تالیفات کی فہرست مختصر ہے لیکن اس سے ان کی علمی اور تحقیقی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلامیات پر انھیں عبور تھا لیکن وہ ساتھ ہی وہ اردو کے اعلیٰ پایہ کے صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ اپنی کتاب قصص القرآن کے چار حصوں میں انھوں نے ان ملکوں اور قوموں کے احوال جمع کر دیے ہیں، جن کا تذکرہ قرآن کریم میں آتا ہے اردو میں اس موضوع پر یہ کتاب منفرد ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام، اخلاق و فلسفۂ اخلاق ان کی دوسری تالیفات ہیں۔ "رسول کریم" ایک مختصر کتاب ہے جس میں آسان آسان زبان میں پیغمبر اسلام کی سیرت بیان کی گئی ہے۔

مولانا ایک صاحب طرز محقق بھی تھے اور ان کا اپنا حقیقی اسلوب بھی تھا۔ ان کی تالیفات میں ہم کو ان کا یہ منفرد اسلوب تحقیق نمایاں نظر آتا ہے۔

موقع و محل کے لحاظ سے ان کا قلم اسلوب اختیار کرتا ہے۔ وہ تحقیق کے مواقع پر انشا پردازی یا لفاظی سے کام نہیں لیتے تھے۔ ایک طرف ان کی علمی تالیفات میں عالمانہ اور مقالاتی زبان کی متانت ہے تو دوسری جانب عام اردو داں طبقہ کے لیے لکھی گئی کتابوں میں وہ عام فہم اور سہل زبان اختیار کرتے ہیں۔

کینسر کے مہلک مرض نے مولانا کو گھیر رکھا تھا۔ اگرچہ علاج کے لیے آپ امریکہ بھی تشریف لے گئے لیکن موت کے سامنے کوئی تدبیر کارگر نہ ہوی۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں مرض نے شدت اختیار کر لی اور 2 اگست ۱۹۶۲ کو دلی ہی میں جو آپ کی سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا، آپ نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔

آپ کی وفات پر پنڈت جواہرلال نہرو نے ان الفاظ میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا:

"میں ان سے بہت ملتا تھا۔ اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی بہت محبت تھی۔ وہ بہادر سپاہی تھے۔ بہادر نیتا تھے۔ جو کہتے تھے، اس میں وزن ہوتا تھا۔ ان کی بات غور طلب ہوتی تھی..."

باقی ص ۵۵ پر

یوسف ناظم

آکاشوانی اور ہم

دھرتی سے آکاش کی طرف جانے کے لئے خلا بازوں کو بڑی سہولتیں حاصل ہیں اور انھیں بڑے اہتمام بلکہ تزک و احتشام کے ساتھ آسمان پر لے جایا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ خلابازی کا کام نہیں کر سکتے اور صرف ادب یا موسیقی جیسے مضرت رساں مشاغل میں حصہ لیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ آکاش وانی کی طرف پرواز کر سکتے ہیں۔ وہ بھی پا پیادہ۔ اسے خلا بازی نہیں قلابازی کہتے ہیں۔

آکاش وانی کے سفر میں آدمی کو زمین سے اوپر نہیں اٹھنا پڑتا اور یہ سفر ایک مدت تک یعنی حال حال تک بڑا فرحت گوار اور مسرت بخش رہا۔ جو شخص بھی آکاشوانی کے احاطے میں داخل ہوتا تھا بارے میں یہ محسوس کرتا کہ وہ کوئی معمولی شاعر یا ادبی فن کار نہیں بلکہ شیر افگن ہے۔
شیر افگن سے ہماری مراد وہ شیر افگن ہیں جو جہانگیر کے ہم عصر اور ان کے عہد میں چند دنوں بقید حیات تھے۔ اُن کا نام ہمارے ذہن میں یوں آیا کہ تخت و تاج کی جو اہمیت ہے وہ تو اپنی جگہ ہے لیکن اگر تخت شاہی کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیا جائے۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے تو جہانگیر کے مقابلے میں شیر افگن زیادہ خوش قسمت معلوم ہوتے ہیں۔ نورجہاں کی شہرت اور عدل جہانگیری کے خوف کی وجہ سے اگر آپ کو یہ مثال پسند نہیں آتی ہے تو ہم اسے واپس لیتے ہیں۔ اپنے کہے ہوئے الفاظ یا اپنا دیا ہوا بیان واپس لینا آج کے سماج میں بے حد ضروری چیز ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے لازمی مضمون ہے اور اس طرح کی حرکتیں کرنے اور کرتے رہنے سے لوگوں کو یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ یہ شخص کھلے دماغ کا ہے۔ عدل جہانگیری

کے خوف کی بات ہم نے اس لئے کہی کہ اس انصاف میں قصوروار اور خطا کار شخص کی بجائے اس کے کسی قریبی رشتہ دار کو سزا کا مستحق سمجھا جاتا تھا ـــــ اب تو یہ بھی نہیں ہوتا۔ ہم یہ دو مثالیں فی الحال واپس لیتے ہیں اور صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ آکاش و. کے احاطے میں قدم رکھ کر لوگ ایسا محسوس کرتے تھے کہ اُن کے قدموں کے نیچے سُرخ بانات بچھی ہوئی ہے۔ وہ اصل میں نیچے دیکھتے ہی نہیں تھے حالانکہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان میں لوگ پان بہت کھاتے ہیں اور خاص طور پر آکاش وانی کی عمارت کے اندر تو صرف پان ہی کھائے جاتے ہیں۔ بہرحال سُرخ بانات کا خیال اُن کے دماغ سے نکل نہیں پاتا تھا۔ اس لئے وہ عمداً سر اُٹھا کر اور وقتاً فوقتاً سینہ پُھلا کر چلتے تھے۔ لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہوائیں موافق چلا کرتی تھیں۔ اب اس ہوا محل کے حالات بدل گئے ہیں اور اس لئے بدل گئے ہیں کہ اِن دنوں سوائے غریبوں کے کس کے حالات نہیں بدلے ہیں۔ آدمی تو خیر آدمی ہیں اور یہ کیفیت آدمی ابھی کچھ اور دنوں تک برقرار رہیں گے۔ لیکن اب تو معمولی ترکاریوں تک کے حالات بدل گئے ہیں اور ان کے دام بھی لوگوں کے دماغ کی طرح آسمان پر ہیں۔ آکاش وانی کی عمارت جس میں ہم پہلے اس طرح داخل ہوتے تھے جیسے یہ ہماری سسرال ہو اب ہم سے بآواز بلند کہتی ہے

مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

تفصیل اس بیان کی یہ ہے کہ آکاش وانی کے صدر دروازے پر ایک دو دربان پہلے بھی رہا کرتے تھے لیکن سابق میں ان کا رویّہ نہایت ہی نفیس قسم کا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ یا خیر سگالی کے سلسلے میں کھڑے ہوئے ہیں اور گو وہ ایر انڈیا کے مہاراجہ کی طرح جھک کر کسی کا استقبال نہیں کرتے تھے لیکن انہیں دیکھ کر ناراض بھی نہیں ہوتے تھے۔ (گدا سمجھ کر چپ رہتے تھے) لیکن اب اُن کے چہروں پر یکایک خشونت آگئی ہے۔ ان کی بندوقیں تو خیر بھری رہتی ہی ہیں لیکن یہ خود بھی کچھ کم بھرے نہیں رہتے۔ ان کی مونچھوں میں بھی سختی نمودار ہو گئی ہے آکاش وانی کے حالیہ حفاظتی انتظامات کا سب سے زیادہ اثر انہی مونچھوں پر ہوا ہے۔ ایک اور تبدیلی عمل میں آئی ہے کہ اب صدر دروازے پر ایک میز اور دو کرسیاں بھی نظر آنے لگی ہیں پر ایک رجسٹر بھی رکھ دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ایک بال پن بھی۔ بال پن چونکہ بہت ہے اور یہ دو دربان اس کی حفاظت کے لئے کافی نہیں ہیں اس لئے اسے ایک ڈوری کی مدد مذکورہ میز کے پائے سے باندھ دیا گیا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے بکری کو کھونٹے سے باندھا جاتا ہے۔ آکاش وانی میں جہاں آنے والے لوگوں کو پہلے محبت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا

شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہ شکایت نہیں ہے کیونکہ ان دنوں رواج ہی کچھ ایسا چل پڑا ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے کو دیکھے تو شبہ کی نظر سے دیکھے۔ بہرحال اس رجسٹر کی وجہ سے ہر شخص کو اندازہ ہو گیا ہے کہ آکاش وانی میں اب صرف مشتبہ لوگ ہی آنے جانے لگے ہیں۔ آکاش وانی نہیں ہوئی بمبئی کی سبربن ریلوے ہو گئی جس میں سفر کرنے والوں کو اب ریلوے پاس کے ساتھ اپنی تصویر بھی دکھانی پڑتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد مسافروں کی انگلیوں کے نشانات بھی طلب کئے جانے لگیں گے۔

اس رجسٹر میں جیسے نو مولود رجسٹر کہنا چاہئے کافی تفصیلات درج کرنی پڑتی ہیں۔ اس دوران کرسی پر بیٹھا ہوا شخص آپ کو برابر گھورتا رہتا ہے۔ آپ کی سیکس کیا ہے اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر آنے والا شخص خالی ہاتھ آیا ہے تو سمجھئے سستا نہیں مفت چھوٹ گیا ورنہ اس کے تھیلے کی تلاشی برحق ہے۔ اگر اس کے تھیلے میں سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی اور چند تصویر بتاں کے سوا اور کچھ نہیں ملا تو مفتشوں کو بڑی کوفت ہوتی ہے کہ ان کی ساری محنت اکارت گئی۔ ملاقاتی اس مرحلے سے گزرنے کے بعد جب اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اسے جانا ہوتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ جس کے لئے اس نے اتنے ستم سہے وہ تو ہیں ہی نہیں۔ ملاقاتی کو بیٹھنے کے لئے کرسی بھی نہیں ملتی کیونکہ دو ڈھائی کرسیاں تو ہمدرد دوانے پر بھیج دی گئی ہیں ——— مزید کرسیاں اب نئے بجٹ کے بعد ہی آئیں گی۔

آکاش وانی کا تین چوتھائی سے زیادہ کاروبار ٹیپ پر منحصر ہے۔ غنیمت ہے کہ یہ ٹیپ ریڈ ٹیپ نہیں ہے۔ لیکن آکاش وانی کے ٹیپ میں دقت یہ ہے کہ یہ وقت پر ملتا نہیں ہے جبکہ ریڈ ٹیپ کی کہیں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ تو آنا ملتا ہے کہ آپ کو اپنی کوتاہئ داماں پر غصہ آنے لگے۔ ہمارے یہاں سب سے زیادہ مقبول اور مستعمل چیز بھی ریڈ ٹیپ ہے۔ یہ ہم خود بناتے ہیں۔ کہیں سے امپورٹ نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ریڈ ٹیپ کی وجہ سے آدمی کا خون سرخ رہتا ہے ورنہ کاغذ کی سفیدی خون میں سرایت کر جاتی ہے۔

آکاش وانی کے علاقے میں جس ٹیپ پر فن کار کی آواز کو پرانی اور تقریباً از کار رفتہ مشینوں کی مدد سے منتقل کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ٹیپ اتفاق سے وقت پر ہاتھ لگ جائے تو فوراً اسٹوڈیو کی تلاش شروع ہو جاتی ہے اور اس تلاش میں افسر متعلقہ اپنی بغل میں ٹیپ کا ڈبہ دبائے اور فن کار کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو اور ایک فلور سے دوسرے فلور پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے جیسے وہ اسٹوڈیو نہ ڈھونڈ رہا ہو

جبکہ اس شہر میں اپنے لئے مکان ڈھونڈ رہا ہو جو اُسے اس کے اگلے تبادلے تک بھی مل جاتا ہے۔
اسٹوڈیو اس مرحلے یا مستقبل کرے کو کہتے ہیں جس میں فن کار کو دنیا کی محفلوں سے الگ کرکے کچھ دیر کے لئے نظر بند کر دیا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ سامنے کی گھڑی پر نظر رکھے۔ ساتھ ہی ساتھ کاغذ پر بھی نظر رکھے اور جب افسر متعلقہ شیشے کی دوسری طرف پہنچے تو مقرر اس کے ہاتھ پر بھی نظر رکھے۔ اب بیچارا مقرر یہ تیسری نظر کہاں سے لائے۔ لیکن ہدایت بھی دی جاتی ہے کہ جوں ہی یہ ہاتھ ریلوے گارڈ کی جھنڈی کی طرح ہلے مقرر تقریر پڑھنا شروع کر دے۔ اس مہدابندی سے پہلے فن کار کی آواز کے زیر و بم کا امتحان بھی لیا جاتا ہے اور اس بات کی جانچ کی جاتی ہے کہ آکاش وانی کے مشینیں فن کار کی آواز سے اور زیادہ بگڑ تو نہیں جائیں گی۔ یہ عمل بار بار دہرایا جاتا ہے اور مقرر کی علمی قابلیت، اناؤنسر کی فنی قابلیت کے مقابلے میں صفر ہو کر رہ جاتی ہے ــــ مقرر جب اٹک اٹک کر اپنی تقریر وقت مقررہ سے ایک منٹ زیادہ یا دو منٹ کم میں ختم کر لیتا ہے تو اسے مشین روم میں لے جا کر اس کی آواز بھی سنائی جاتی ہے کہ دیکھو اپنا کارنامہ ــــ ہمیں کہنا تو نہیں چاہیے لیکن مقرر اگر اپنی آواز نہ سنے تو بہتر ہے۔ اس میں سبھی آوازیں ہوتی ہیں۔ کاغذ کے مائکروفون سے ٹکرانے کی آواز، مقرر کی سانس تیز تر چلنے کی آواز، کہیں کہیں اس کے کھنکھارنے کی دبی دبی اور گھٹی گھٹی آواز جیسے کوئی تیر نیم کش ہو جو خلش بن کر دل میں رہ گیا ہو۔ مقرر کی نظر چونکہ سامنے کی گھڑی پر تھی اس لئے اس نے اگر صفحہ ۳ کے فوراً بعد صفحہ نمبر ۵ پڑھ دیا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ آکاش وانی میں خوش قسمتی سے اس بات کی اجازت ہے کہ صفحہ نمبر ۵ کے بعد مقرر کا جی چاہے تو وہ صفحہ نمبر ۴ بھی پڑھ لے۔ یہ کوئی معمولی رعایت نہیں اور غالباً اسی رعایت کی وجہ سے آکاش وانی میں مقرروں کے معاوضے کی رقم پر نظر ثانی نہیں کی جاتی ــــ نظر ثانی کا جہاں تک تعلق ہے یہ صرف اس وقت کی جاتی ہے جب یہ شبہ ہو کہ ہم نے غلطی سے کوئی صحیح بات تو نہیں لکھ دی۔
اب آخری منزل آتی ہے اور فن کار کو اس جگہ پیش کیا جاتا ہے جہاں اُسے ایک رسیدی ٹکٹ یا اس کی رقم داخل کرنی ہوتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بڑا دردناک منظر ہوتا ہے۔ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ آکاش وانی نے اب تک اپنے کوپن جاری نہیں کئے ہیں اور نہ یہاں بی ای ایس ٹی کے کوپن قبول کئے جاتے ہیں حالانکہ اب شہر میں ریزرو بنک کی کرنسی اتنی نظر نہیں آتی جتنے کہ یہ کوپن نظر آتے ہیں۔ مائیں بھی اپنے بچوں کو

مصنف: امین مالوف
مترجم: قاضی جلیل احمد

صَلیب کے سائے میں

قسط ۵

ایک بدبخت زرہ ساز

جب انطاکیہ کے حاکم یاغی سنیان کو فرنگیوں کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے شہر کی عیسائی رعایا کو قلعہ سے باہر نکالنے کی تدبیر سوچنا شروع کردی۔ اُسے ڈر تھا کہ یہ عیسائی لوگ اپنے ہم مذہب فرنگیوں سے سازباز کریں گے۔ اس واقعہ کے ایک سو سال بعد مشہور مورخ ابن الاثیر اس کے متعلق یوں رقم طراز ہے:

"پہلے دن یاغی سنیان نے مسلمانوں کو قلعہ سے باہر روانہ کرکے انھیں خندقوں کی صفائی کا حکم دیا۔ دوسرے دن اس نے اس کام کے لئے صرف عیسائیوں کو روانہ کیا عیسائی لوگ شہر کے باہر سارا دن کام کرتے رہے۔ شام ڈھلے جب انھوں نے شہر کا رخ کیا تو اس نے انھیں قلعہ کے باہر ہی روک دیا اور یوں اُن سے مخاطب ہوا: انطاکیہ پر بے شک تمہارا بھی حق ہے لیکن فی الحال اسے میرے ہی ہاتھ میں رہنے دو تاآنکہ میں فرنگیوں سے نپٹ لوں۔ انھوں نے عذر کیا۔ ہماری عورتوں اور بچوں کی کون حفاظت کرے گا۔ میں اُن کی حفاظت کروں گا یاغی سنیان نے جواب دیا۔ اور واقعی اس نے اُن عورتوں اور بچوں کی حفاظت کی جن کے مرد شہر بدر کر دئے گئے تھے۔"

یاغی سنیان کو جو گذشتہ چالیس برس سے اس شہر پر حاکم تھا یقین تھا کہ شہر کی شہر پناہ اتنی مضبوط اور مستحکم ہے کہ فرنگی فوجیں کسی صورت اندر داخل نہیں ہوسکتیں سوائے اس کے کہ اندرون شہر سے کوئی غداری کر کے اُن کے لئے راہ کھول دے۔ اس قلعہ کو نہ تو حملہ کر کے فتح کیا جاسکتا تھا اور نہ بھوکا مار کر۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی فوج پانچ چھ ہزار سے زیادہ نہ تھی جب کہ فرنگیوں کی تعداد تیس پینتیس ہزار سے بھی کچھ اوپر تھی لیکن انطاکیہ کا قلعہ ناقابل تسخیر تھا۔ قلعہ کی دیواریں دو فرسخ (تقریباً ۱۲ ہزار میٹر) لمبی تھیں جن میں ۳۶۰ برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ دیواریں

یا تو سنگی تھیں یا خالص اینٹ اور گچ کی بنی ہوئی۔ شہر پناہ کے ایک جانب ایک دریا بہتا تھا جس کا نام العاصی (باغی دریا) تھا۔ عیسائیوں کو اس کا بہاؤ الٹا نظر آتا تھا یعنی سمندر سے دامن کوہ کی طرف یہ دریا جہاں حملہ آور کے لئے بڑی رکاوٹ تھا اہل شہر کے لئے بیرونی دنیا سے ربط رکھنے کا بہترین ذریعہ۔ جہاں سے اندرون قلعہ بہ آسانی رسد پہنچائی جا سکتی تھی۔

شہر میں اشیائے خوردنی کی بہتات تھی۔ قلعہ کے اندر نہ صرف مکانات بلکہ کئی سر وشاداب مزرعے تھے۔ عربوں کی فتح سے پہلے انطاکیہ ملک شام میں رومیوں (بازنطینیوں) کا مستقر تھا۔ اس کی آبادی دو لاکھ تھی۔ لیکن سنہ ۱۰۹۷ء تک یہ آبادی گھٹ کر صرف چالیس ہزار ر گئی تھی۔ اور سابق کی کئی بستیاں اب کھیتوں اور مزرعوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اگرچہ اس کی سابقہ عظمت اب باقی نہ رہی تھی اس کے باوجود یہ اب بھی ایک شاندار شہر تھا۔ سارے مسا اور وہ بھی جو بغداد اور قسطنطنیہ کی رفعت کو دیکھ چکے تھے اس شہر کے نظارے سے متا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ حد نظر تک مسجدوں اور کلیساؤں کے منارے، مسقف با اور عالی شان محلات۔

لہٰذا یاغی سیان کو اپنے شہر کی مضبوطی کی طرف سے کوئی تردد نہ تھا۔ لیکن اُسے ڈر تھا کہ کسی غداری کی وجہ سے یہ ساری مضبوطی دھری کی دھری نہ رہ جائے۔ سابق میں بھی ایسا ہو چکا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس نے ایک ترکیب سے اپنی عیسائی رعایا کو شہر کے با کر دیا۔ ان فرنگیوں کی آمد سے ملک کی عیسائی آبادی پر دوہری مصیبت نازل ہو گئی تھی یہ عیسائی لوگ جن میں یونانی، آرمینی، میرونائیٹ، جیکو بائیٹ وغیرہ فرقے شامل تھے۔ ایک طرف تو ان فرنگی اہل مذہب کے تعصب کے شکار تھے جو سب کیتھولک تھے اور دوسر عیسائیوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اُن کی وفاداریاں اب بھی عربوں سے وابستہ ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کو یقین تھا کہ وہ لوگ فرنگیوں کے ہمدرد ہیں۔ اور ان کی وفاداریاں مشتبہ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس زمانے میں مذہبی اور قومی وابستگیوں کے بیچ کوئی حد فاصل تھا۔ بازنطینی اور شامی دونوں عیسائی لوگ رومی کہلاتے تھے۔ اسی طرح آرمینی کا لفظ ایک مذہب اور ایک قطعہ ملک دونوں سے وابستہ تھا۔ اور جب مسلمان لوگ قومیت کا ذکر کرتے تو الامۃ کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کے معنی تھے جماعت المسلمین۔

لہٰذا یاغی سیان نے جب اپنی عیسائی رعایا کو ملک بدر کیا تو عیسائی سمجھ کر نہیں بلکہ بازنطینی یا رومی تصور کر کے۔

سنہ ۱۰۸۴ء میں انطاکیہ ہنوز قسطنطنیہ کے زیرِ نگیں تھا۔ یعنی مسلمانوں کے زیرِ تسلط آنے والے شہروں میں گویا وہ سب سے آخری شہر تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس علاقے کے لوگوں کی ہمدردیاں ہنوز قیصر روم کے ساتھ تھیں اور جب فرنگیوں نے اس شہر کا محاصرہ کیا تو یاغی سیناں یہی سمجھا کہ فرنگیوں کی یہ کارروائی انطاکیہ پر بازنطینی قبضہ بحال کرنے کی غرض سے ہے لہٰذا اسے اپنی اس کارروائی پر کسی قسم کا افسوس بھی نہیں ہوا۔ نصرانیوں کو ملک بدر کرنے کے بعد اس نے رسدات کے تحفظ اور تقسیم کی طرف توجہ کی۔ اس کے خیال میں یہ رسد اس وقت تک کیلئے کافی تھی تاآنکہ باہر سے مدد آ پہنچے۔ یہ مدد کب آئے گی۔ یہ سوال انطاکیہ میں ہر ایک کی زبان پر تھا لیکن اس کا جواب کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس وقت جب کہ اہلِ فرنگ ابھی دور تھے یاغی سیناں نے اپنے بیٹے کی سرکردگی میں ایک سفارت شام کے اکثر شہروں کو روانہ کی تھی تاکہ انہیں آنے والے خطرے سے خبردار کر کے مدد کے لئے آمادہ کر سکے۔ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ دمشق میں یاغی سیناں کے لڑکے نے جہاد کے لئے للکارا۔ لیکن گیارھویں صدی میں جہاد کا لفظ ایک بے معنی نعرہ بن کر رہ گیا تھا جو سلاطین اور امرا اپنے آڑے وقتوں میں لوگوں کو ابھارنے کے لئے استعمال کیا کرتے تھے اس لئے کوئی امیر دوسرے کی مدد کے لئے اس وقت تک حرکت نہیں کرتا تھا جب تک کہ اس میں خود اس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔

سنہ ۱۰۹۷ء کے موسم خزاں میں اگر فرنگ کی آمد کسی کے لئے راست خطرہ کا باعث ہو سکتی تھی تو وہ صرف انطاکیہ کا حکمران یاغی سیناں ہی تھا۔ اگر قیصر روم کے کرائے کے لڑنے والے انطاکیہ کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے تو اہلِ شام کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ کیوں کہ یہ ہمیشہ ہی سے بازنطینی شہر رہا تھا۔ اور اسی وجہ سے سمجھا جاتا تھا کہ اس کی بازیافت پر روم قانع ہو جائے گا اور شام کے علاقے میں آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کریگا اب اگر اس میں یاغی سیناں پر آنچ آتی تھی تو اس کے ہمسایوں کو اس کی پروا نہ تھی۔ کیوں کہ گذشتہ دس سال سے اس نے بھی تو تفرقہ پردازی، بغض و عناد اور آپسی اختلاف کی چنگاریاں بکھیرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ یہ امرا آپسی عداوتوں کو بھول کر سب اکٹھے ہو جائیں اور اس کی مدد کو دوڑیں تو یہ اس کی بھول تھی اور اسے ان کی بے عملی پر حیران ہونے یا افسوس کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔

یاغی سیناں کو خود بھی ان تمام باتوں کا احساس تھا لیکن یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ خود اس کے ہم قوم پیدا اس کے دست و پا باندھ کر اسے قیصر روم کے

حوالے کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اس کا گناہ اس کے سوا اور کیا تھا کہ بہر طور کہ اس جھتے میں اپنی سلامتی کی راہ نکالتا۔ جس ماحول میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں اس ماحول کی ریت اور رواج بھی خون ریز مسابقت تھی۔ سلجوق ترک ہوں یا حاملانِ اتابکیہ یا دیگر امیرانِ شام، کسی کے لئے اور کوئی رستہ نہ تھا بجز اس کے کہ اپنی سلامتی کی فکر کرتا اور اپنی سلامتی کے لئے ہر قسم کا اقدام کرنے پر آمادہ ہوتا۔ اس تنازعہ للبقاء کی کیفیت میں ہار کے معنی تھے۔ موت یا پھر کم از کم ایک طویل عرصے کے لئے ذلت اور رسوائی۔ جیت کی صورت میں کچھ مال و دولت حرم سرا کی زیب و زینت کے کچھ حسین لونڈیاں اور خادم، چند روز کا کیف و نشاط اور اس کے بعد دوبارہ ختم ہونے والی سیاست اور جد و جہد۔ اور ہر مرتبہ نتیجہ غیر یقینی۔ بستر مرگ پر جینا کا آخری سانس لینے کا موقع کم ہی امیروں کو نصیب ہوتا تھا۔

فرنگیوں کی آمد کے زمانے میں مشرق وسطی کی سیاسی فضا دو بھائیوں کی آپسی خانہ جنگی اور عداوت کی وجہ سے بے انتہا مسموم ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک کا نام رضوان تھا جو حلب کا بادشاہ تھا اور دوسرے کا نام دقاق تھا جو دمشق کا بادشاہ تھا۔ ان کی آپسی عداوت اور دشمنی اتنی گہری تھی کہ کسی تیسرے فریق کی آمد بھی انھیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ ۱۰۹۷ء میں رضوان کی عمر بمشکل ۲۰ سال تھی۔ لیکن اس کی شخصیت پردۂ اسرار میں چھپی ہوئی تھی اور اس کے متعلق بے شمار دل ہلا دینے والے قصے مشہور تھے۔ سخی، پستہ قد اور بے حد بدہیئت سا انسان، جو کہتے ہیں ایک باطنی طبیب اور رمّال کے زیر اثر آگیا تھا۔ یہ باطنی فرقہ جو یورپ میں (Assasin) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا اسی زمانے میں قیام عمل میں آیا تھا اور اس کی خون آشامیاں ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ حلب انہی باطنیوں سے اپنے مخالفین کو راستے سے ہٹانے کا کام لیا کرتا تھا۔ ۱۰۹۵ء میں جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر مروا دیا تیسرا جو سب سے چھوٹا تھا کسی طرح اس کی چنگل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا نام دقاق تھا۔ اپنے فرار کے بعد دقاق نے دمشق میں پناہ لی اور وہیں اپنی حکومت قائم کر لی دقاق رضوان کو اپنا جانی دشمن سمجھتا تھا۔ اس کے مزاج میں تلون تھا اور صحت بھی کچھ اتنی اچھی نہیں رہا کرتی تھی اور ہمیشہ اسے یہی خوف دامن گیر رہتا کہ کسی دن رضوان اسے ہلاک کر دے گا۔ ان دو پاگل بھائیوں کے درمیان گھرے ہوئے یا ان کی سنیاں کے لئے کوئی سبیل

اس فرنگی گرفت سے چھٹکارا پانے کی نہ تھی۔ فرنگیوں کی آمد سے دو سال قبل باطنی سنیان نے اپنی ایک لڑکی بھی رضوان کے عقد میں دے دی تھی۔ لیکن اسے بہت جلد احساس ہو گیا کہ اس کا داماد اس کی لڑکی سے زیادہ اس کی ریاست کا متمنی ہے اور تب سے اسے بھی اپنی زندگی کا فکر لاحق ہو گئی۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ ان باطنیوں کی طرف سے تھا جو رضوان کے دوست تھے۔ ان حالات میں باطنی سفیان نے رضوان کے بھائی دقاک سے فرنگیوں کے خلاف امداد طلب کی۔

دقاک پس و پیش میں پڑ گیا۔ یہ نہیں کہ وہ فرنگیوں سے ڈر گیا تھا لیکن وہ اپنا فوج کو علی پو کی سرحدوں میں سے گزارنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ دقاک کو اس مہم پر آمادہ کرنے کے لئے باطنی سنیان نے اپنے لڑکے شمس الدولہ کو دقاک کے دربار میں روانہ کیا جہاں اس نے کبھی نرمی اور کبھی گرمی سے بادشاہ اور اہل دربار کو اس مہم کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن اسی جیص بیص میں فرنگی فوجوں نے انطاکیہ کا محاصرہ کر لیا اور دقاک کوئی قدم اٹھانے کی بابت سوچتا ہی رہا اور جب اس نے اپنی فوجوں کو انطاکیہ کی طرف کوچ کا حکم دیا بھی تو نہایت بے دلی کے ساتھ۔ چنانچہ جب دمشق کی فوج دو تہائی راستہ طے کر چکی تھی کہ اس کی مڈبھیڑ فرنگیوں کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی سے ہو گئی اور گو شامی فوج نے اس چھوٹی سی فرنگی فوج کو پوری طرح گھیر لیا تھا پھر بھی دقاک نے حملہ کا حکم جاری نہیں کیا جس کا فائدہ اٹھا کر فرنگی اس کا گھیرہ توڑ کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس معرکے کے آخر میں گو نہ کسی کی ہار ہوئی اور نہ جیت۔ پھر بھی فرنگیوں کی بہ نسبت شامی زیادہ ہلاک ہوئے یہ دیکھ کر دقاک کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور اس نے اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دیا اور بے چارہ شمس الدولہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

دقاک کے فرار سے انطاکیہ والوں کا حوصلہ پست ہو گیا پھر بھی باطنی سنیان نے ہمت نہیں ہاری اور فرنگیوں سے مقابلہ جاری رکھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ دفاع کرنے والوں سے زیادہ محاصرہ کرنے والوں میں خلفشار اور انتشار کی حالت پائی جاتی تھی۔ باطنی سنیان کے بعض جاسوس غنیم کی فوجوں کے اندر بار پانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض قیصر روم کی عداوت کی وجہ باطنی سنیان کا ساتھ دے رہے تھے اور بعض وہ لوگ تھے جن کے بال بچے ابھی انطاکیہ میں نظر بند تھے جس کی وجہ وہ باطنی سنیان کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔

یہ لوگ جو خبریں روانہ کر رہے تھے وہ مدافعین کے لئے بہت کار آمد اور حوصلہ افزا

تھیں۔ مثلاً یہ کہ فرنگیوں کے لئے رسدات کی فراہمی مشکل ہوگئی تھی اور انہیں اپنی سواریاں کو ذبح کرکے کام چلانا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ دکاک کو راستے میں جو لوٹ ملتی وہ ذرائع رسدات حاصل کرنے والی جماعت تھی۔ مینہ مسلسل برس رہا تھا اور ساری زمین جہاں حملہ آور ٹھیرے تھے دلدل میں تبدیل ہوگئی تھی۔ زمین میں زلزلے پر زلزلے آرہے تھے مقامی باشندوں کے لئے تو یہ معمول کی بات تھی لیکن فرنگی ان سے بہت خوف زدہ تھے۔ اور ان کی دعاؤں کی صدائیں قلعہ انطاکیہ میں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ فرنگی ان بلاؤں کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ساری رنڈیاں اور بیسواؤں کو اپنی فوج سے نکال باہر کیا تھا۔ شراب خانے اور جوے خانے بند کرادئے تھے۔ بہت سے سپاہی فوج سے فرار بھی ہونے لگے تھے بلکہ سردار بھی۔

اس قسم کی خبریں مدافعین کے لئے بڑی ہمت افزا ہوا کرتی تھیں اور وہ فرنگیوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ابن الاثیر لکھتا ہے:

"یاغی سنیان نے بڑے عزم، ہمت اور ارادے کا ثبوت دیا۔ بہت سارے فرنگی مارے گئے کیوں کہ اگر وہ اسی تعداد میں زندہ رہتے جس تعداد میں وہاں پہنچے تھے تو سارا عالم اسلام فرنگیوں سے بھر جاتا۔"

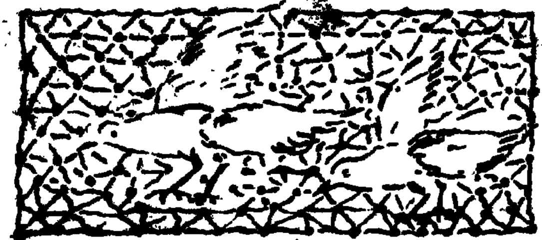
اس میں شک نہیں کہ ابن الاثیر نے مبالغے کی حد کردی ہے لیکن اس کا مقصد صرف اہلیان انطاکیہ کے عزم اور بہادری کو خراج تحسین پیش کرنا ہے۔ فرنگی فوج کے اعداد شمار بتانا نہیں۔

جس مدد کی اہل انطاکیہ کو امید تھی وہ بہر حال نہیں آئی۔ سنہ ۱۰۹۸ء جنوری میں دکاک کی بزدلی سے مایوس ہوکر یاغی سنیان نے رضوان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور سفارت کی ذمہ داری ایکبار پھر شمس الملوک پر عائد ہوئی۔ جسے نہ صرف رضوان کے بجائے اولاً دکاک سے امداد کی درخواست کی توجیہ کرنی پڑی بلکہ رضوان کے طعن و تشنیع کے چبھتے ہوئے تیروں کو برداشت کرتے ہوئے اسلام اور قرابت کا واسطہ دے کر نہایت عاجزی سے امداد کی بھیک مانگنی پڑی۔ لیکن بالآخر شمس اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے اہل حلب کی آمد کی تاریخ سے اپنے والد کو مطلع کرتے ہوئے دشمن پر دوطرفہ حملہ کی استدعا کی۔

انطاکیہ میں رضوان کی رضامندی حیرت اور اچنبھے کا موجب تھی۔ کیا اب اس لڑائی کے خاتمے کا وقت آگیا ہے جو گذشتہ سو دنوں سے جاری تھی۔ ۹ فروری سنہ ۱۰۹۸ء کو حلبیوں کی فوجیں قریب پہنچنے کی اطلاعیں ملنے لگیں۔ یہاں تک کہ حملہ کا مقررہ دن آپہنچا۔ انطاکیہ

باقی صفحہ ۵۵ پر

بلقیس شبیہ



دانہ و دام

پرندے اپنے پاؤں کے باعث دام میں پھنستے ہیں لیکن آدمی اپنی زبان کے باعث!



بل پے کرنے کے بعد وہ ایک سگریٹ سلگانے کے لئے رُکا۔ اک نازک سا ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔ جو کانپ رہا تھا۔ جلا ہوا سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر ایول نے دیکھا ـــــ اور چونک گیا۔ جویا سیلز گرل کے روپ میں ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ وہاں ٹھہر نہ سکا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل آیا تھا کہ اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ وہی تھی۔

"کیوں....؟" وہ ایک دم اس سے پوچھ بیٹھا۔

"یہ.....آ.....پ.....کا Change چینج ہے"۔ وہ ریزگاری والا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"گھر لوٹتے وقت میری طرف سے کسی فقیر کو دے دینا"۔ ایول لاپرواہی سے مڑتا ہوا بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ پیسے مجھے بھی بھیک دئے ہیں"۔ جویا نے تلخی سے کہا۔ ایول نے ایک چبھتی ہوئی نظر جویا پر ڈالی۔ اس کے ہاتھ سے پیسے چھینے اور سڑک پر پھینک دیئے۔ اس کے دل کی ساری حقارت اس کے اس رویہ سے نمایاں ہو گئی۔ مارکول کی چکنی سپاٹ سڑک پر دور تک وہ سکے جھنجھناتے ہوئے لڑھکتے چلے گئے۔

ـــــ اور وہ آگے بڑھ گیا۔

اس کے غصے کو دیکھ کر جویا کچھ دیر سہمی کھڑی رہی پھر کچھ سوچ کر اس کے پیچھے

ہولی ۔ ایلول کو احساس ہو گیا کوئی اس کے پیچھے آرہا ہے ۔ انگلیوں میں دبی ادھ جلی سگریٹ پھینکی ۔ دوسری سگریٹ نکالی ۔ لائٹر سلگانے کے لئے ایک لحظہ رکا ۔ پیچھے آتی ہوئی چاپ بھی تھم گئی ۔

ماضی کی یادوں کو سگریٹ کے مرغولوں کے ساتھ پھینکتا وہ اپنے فلیٹ کی طرف ہولیا ۔

ایک بہت بڑے ہوٹل کے تیسرے فلور پر دو عالی شان کمروں کا اس کا فلیٹ تھا ۔ بیچ وہ پیچ زینوں پر اپنے قدموں کی چاپ میں سہمے سہمے قدموں کی ڈری سہمی آہٹیں بھی مدغم تھیں اس نے فلیٹ کا دروازہ کھولا ۔ اپنے پیچھے جان بوجھ کر دروازہ کھلا چھوڑ کر بغل والے کرے میں چلا گیا ۔ اور اک قدِ آدم آئینہ کے سامنے جا رکا ۔ آئینے میں اسے جویا کی پرچھائیں نظر آئی ۔ جو دروازے کے عین مقابل آکر کھڑی تھی ۔ آئینے میں اسے برابر دیکھ کر وہ فوراً شیشے کے پاس سے ہٹ گیا ۔

"تم ...... ! اب کیا لوٹانے آئی ہو ۔ ؟"

"نقدِ محبت !" جویا بڑا حوصلہ کر کے بولی ۔

"ہونہہ .... !" ایلول ہلکے تبسم کے ساتھ بولا ۔

"غالباً تم مجھے پہچان گئے ہو ایلول ۔" جویا قدرے بے تکلفی سے بولی ۔

"تمہیں ...... !" ایلول نے سر سے پیر تک اسے دیکھا ۔ ہلکا سا مسکرایا ۔ پھر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا ہوا دریچے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ۔

"ایلول ...... ! کیا تم اپنی جویا کو بھلا چکے ہو ؟"

"جو ...... یا !" ایلول بے اعتباری سے بولا ۔

"میں نے تو سنا ہے وہ مر چکی ہے ۔" ایلول بولا ۔

"کسی نے تم سے غلط کہا ہے ۔ دیکھو میں زندہ سلامت تمہارے سامنے موجود ہوں ۔" جویا نے اپنے ہی سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ۔

"لیکن وہ جویا جس سے میں محبت کرتا تھا میرے لئے مر چکی ہے ۔" وہ انتہا تیکھے پن سے بولا ۔

"نہیں ۔" جویا چیخ اٹھی ۔ "میں ابھی تک تمہاری یاد کے سہارے زندہ ہوں ۔"

"میں نے پچھلی تمام باتوں کو بھلا دیا ہے ۔" ایلول ٹھہرتے ہوئے لہجے میں بولا "اب اُن یادوں کے زنگ آلود دروازے کھول کر کچھ حاصل نہیں ۔"

جویا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ایول نے اُس کی جانب پیٹھ کر دی اور دریچے کے قریب مونڈھے پر بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ جویا ابھی تک وہیں کھڑی کھڑی گہری نظروں سے اس کے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُسے اپنی طرف پلٹتا دیکھ کر بولی۔

"اس شہر میں کب آئے؟"

"بہت روز ہوئے" ایول نے ایک طویل سانس کھینچ کر جواب دیا۔

"کیا کرتے ہو؟" جویا نے پھر سوال کیا۔

ایول اسے دیکھ کر صرف مسکرایا۔ "کیا کروگی یہ سب پوچھ کر" ایول بجھے دل سے بولا۔ مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ میں بھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا"۔

"تم کتنے بدل گئے ہو ایول۔" وہ پژمردگی سے بولی۔

"تمہارے لئے اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں" ایول بے رُخی سے بولا۔ بہت دور چل کر آئی ہو اس لئے کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔"

جویا خاموشی سے ایک کوچ پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں اسٹول پر رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ ایول نے اٹھ کر ریسیور اٹھایا۔

"ہلو.....! جی۔ ہاں۔ (ہنستے ہوئے) آپ نے آواز ہی سے مجھے پہچان لیا...... جی..... اچھا..... شکریہ..... جی نہیں۔ بوبی ابھی اسکول سے نہیں لوٹی...... ضرور ضرور۔ وہ سن کر بہت خوش ہوگی.........
ارے صاحب! کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔ بھلا میں کس شمار قطار میں.......
نہیں نہیں۔ آپ تو ذرے کو آفتاب بنا رہی ہیں..... اچھا..... ارے.....
تھینکس فار دی ایڈوائز۔ جی ہاں۔ جی ہاں...... (قہقہہ)...... جی ہاں...
اسے ہی کہتے ہیں۔ پنی وائز.... پاؤنڈ فولش...... پھر قہقہہ۔ آپ کی جانب سے بوبی کو کس میں کرلوں گا"۔

ریسیور کریڈل پر لٹکا کر وہ اپنی جگہ آبیٹھا تو جویا نے پوچھا۔

"یہ بوبی کون ہے؟"

"ایک لڑکی......" ایول کھوتے ہوئے انداز میں بولا "بے حد حسین...."
اُس نے کرسی کی پشت پر اپنا گردن ٹیک دیا۔ "اس نے میری بکھری زندگی کو

سمیٹا ہے۔" ایلول نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ "تم تو مجھے زندہ در گور کر گئی تھیں۔" بوبا جویا سے یہ سب کچھ نہ سنا گیا۔ وہ اپنے دانتوں سے اپنے ہونٹ کچکپانے لگی۔ بہت دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ معاً باہر قدموں کی آہٹ ہوئی اور ایک چودہ پندرہ سال کی نازک اندام لڑکی کتابیں بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اک اجنبی عورت کو وہاں پاکر اک لحظہ کے لئے ٹھٹکی مگر پھر فوراً کتابیں ٹیبل پر پھینکتی، اچھلتی ہوئی ایلول کی طرف بڑھی۔

"ہلو انکل"......... وہ اس کے بازو کو رخ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

ایلول نے اس کے بکھرے بال ہٹا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ "آشا آنٹی کی طرف سے۔" لڑکی معصوم بچے کی طرح کھل اٹھی۔ جویا بھری بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ایلول کے پاس جاکر رکتے ہوئے بولی۔

"یہ کون............ ہے؟"

"تم خود پوچھ لو۔" ایلول اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

بوبا اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار تھے۔

"عورت کا سب سے عظیم رشتہ ہوتا ہے "ماں"۔" بوبا جویا سے مخاطب ہوئی۔ "لیکن کچھ ایسی مائیں بھی ہوتی ہیں جو معصوم بچوں کو اپنی روح کا میل سمجھ کر پھینک دیتی ہیں۔ اور سمجھتی ہیں ان کی تمام آلودگی ختم ہوگئی ہے۔" بوبا کا چہرہ غصہ سے تمتمانے لگا۔ "ایسی ہی کسی گناہ گار ماں کی عیاشیوں کا ثمرہ ہوں جس نے مجھے اپنے گناہ کا بوجھ سمجھ کر پھینک دیا تھا جہاں سے انہوں نے" بوبا نے کمرے میں آتے ہوئے ایلول کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اک پھول سمجھ کر اٹھا لیا اور آج تک مجھے اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔"

"دیکھ لو جویا!" ایلول اُسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "کس طرح گناہوں کے داغ ایک دن برق کی تلوار بن کر ملبوس کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔"

ایلول مسکرایا۔ سگریٹ کی راکھ انگلی سے جھاڑتا ہوا بوبا کی طرف دیکھنے لگا۔

"کون ہیں انکل یہ؟"

ایلول چھت کی طرف منہ اٹھائے اطمینان سے دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا۔ کوئی جواب نہ دیا۔

"میں اُن کی محبوبہ، اُن کے ایک بچے کی ماں ہوں۔" جویا نے کہا
"پھر کہاں ہے وہ بچی؟" ایول اچانک سگریٹ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "جواب کیوں نہیں دیتیں؟ کیا بتا دوں اسے کہ یہی ہے وہ قابلِ نفرت ہستی جو عورت کی پارسائی اور معصومیت پر ایک داغ ہے۔ ایک گالی ہے......!" ایول کی آواز تیز ہوگئی۔ غصہ سے اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔
"تم لالچی تھیں۔ مکار تھیں۔ بے وفا تھیں۔ انساء کی محبت کے دھوکے میں آکر تم نے میرے ساتھ بے وفائی کی۔ اور جب اس محبت کرنے والے نے جو کہ تمہیں مجھ سے زیادہ پسند آگیا تھا۔ اپنی لمبی لمبی موٹروں کے پہیوں تلے تمہاری نسوانیت کو، تمہارے حسن و جوانی کو کچل دیا تو آج میرے پاس آئی ہو، میری محبوبہ بن کر......!"
"میں تمہارے دروازے پر محبت کی بھیک مانگنے نہیں آئی ہوں۔" جویا تنک کر بولی۔
"میں تم سے اپنی امانت مانگنے آئی ہوں۔"
"کیا تم نے ایسی کوئی چیز میرے پاس چھوڑی تھی جسے واپس مانگنے کا حق تمہیں پہنچتا ہے؟
"لغوی معنوں میں اسے ہی امانت کہتے ہیں۔"
"ایول......!" جویا قدرے نرمی سے بولی۔ "خدا کے لئے میرے عورت پن پر رحم کھاؤ۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اُس بچی کی تم پرورش کر رہے ہو۔ کیا یہی ہے میری بچی؟"
"ماں کی آنکھ سے دیکھو۔" ایول طنز سے بولا۔ "اپنا خون خود بخود بول اٹھتا ہے"۔
"ہاں۔" وہ روبی کی طرف خوشی خوشی بڑھتی ہوئی بولی۔ "یہی میری بچی ہے"۔
"کیا تم واقعی میری ماں ہو۔" روبی دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "تو میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔" اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی دوسرے کمرے میں چلی گئی ——— !

آؤ اے اہلِ جنوں! اہلِ خرد سے پوچھیں
زندگی دانہ کہاں، دام کہاں ہوتی ہے

ایک شعر:
خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو
بن پڑے تو جھپٹ کے بھیک مانگ

رام نواس مانو

سانپ

تڑاتڑ تین لاٹھیاں پڑیں ۔ سانپ تڑپ کر وہیں ڈھیر ہوگیا ۔
" ایک بولا " میں نے ایسی جما کر لاٹھی ماری تھی کہ ٹکتے ہی سانپ کے پران نکل گئے "۔
" تمہاری لاٹھی ٹھیک جگہ نہیں لگی تھی ۔ سانپ مرا تو میری لاٹھی سے " ۔ دوسرا بولا
" تم دونوں جھوٹ بول رہے ہو " ۔ تیسرے نے کہا ۔ " اگر میری لاٹھی نہ لگتی تو سانپ مرتا ہی نہیں ۔ تمہاری لاٹھیاں کھا کر تو سانپ اُلٹا کاٹنے لپکا تھا " ۔
" جھوٹ " ! ایک ساتھ پہلے دونوں کے منہ سے نکلا ۔ پھر ایک بولا " سانپ کو ہم مارا اور بھلائی تم لینا چاہتے ہو " ؟
" یہ بالکل نہ ہوگا " ! دوسرا بولا
تیسرا بولا " نہ ہوگا تو نہ سہی — سانپ تو میں نے مارا ہے " ۔
بات بڑھی ۔ بات بگڑی — تھوڑی دیر پہلے جو لاٹھیاں سانپ پر چلی تھیں وہ اب ایک دوسرے پر چل رہی تھیں ۔
ایک کا سر پھوٹا ۔
دوسرے کا بازو ٹوٹا —
تیسرے کو بہت چوٹیں آئیں ۔
تینوں پڑے تڑپ رہے تھے ۔
مرے ہوئے سانپ نے تینوں کو ڈس لیا تھا ۔

لیکچرر سی۔ آر۔ ایم جاٹ کالج حصار (ہریانہ)

تبصرہ

لمعاتِ نور حکیم سیوہاروی

" لمعاتِ نور" حکیم سید علی مظفر حکیم سیوہاروی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جسے ان کے پوتے طبیب سید علی سرور نے شائع کیا ہے۔ اس مختصر مجموعہ میں حکیم مرحوم کے لائق فرزند و مشہور ادیب کوثر چاند پوری کا تعارف، ابو المجاہد زاہد کا نوٹ، قمر مراد آبادی کا مقدمہ اور خود مرتب کی پیش گفتار شامل ہیں جن سے حکیم مرحوم کی شخصیت اور کلام پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم مرحوم سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک قدیم خاندان کے لائق فرد تھے۔ یہ خاندان اپنے فنی اور مذہبی علوم کی وجہ سے مشہور تھا۔ حکیم مرحوم نے بھی اپنے آبائی پیشہ طبابت میں نام کمایا۔ تشخیص و تجویز میں مہارت تھی۔ ہر خاص و عام کی خوب خدمت کی۔ اس مصروفیت کے باوجود شعر و سخن سے شغف رہا۔ اور حمد و نعت تو وظیفہ حیات رہا۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں حکیم مرحوم کا انتقال ہوا۔ مئی ۱۹۸۲ء میں قمر مراد آبادی نے مقدمہ لکھا۔ جون ۱۹۸۵ء میں یہ مجموعہ شائع کیا گیا۔ گو حکیم مرحوم کے انتقال کے ۳۵ سال بعد سہی، سید علی سرور نے اپنے جدِ امجد کے نعتیہ کلام کو شائع کر کے نہ صرف اپنے لئے سامانِ سعادت پیدا کیا بلکہ قارئین کے لئے بھی روحانی مسرت اور وجدانی کیفیت کا سامان فراہم کیا۔

نعت گوئی بڑا نازک معاملہ ہے۔ حکیم مرحوم کو اس کا احساس تھا۔ کہتے ہیں ؎

قدم عشقِ احمد میں رکھنا سنبھل کر کڑی ہے یہ منزل تماشا نہیں ہے

اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے آدابِ نعت گوئی کو نبھا کر حزم و احتیاط کا حق ادا کر دیا۔ انہیں زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ کسی قسم کی مبالغہ آرائی کے بغیر رسالت کی عظمت و جلالت کا اظہار کیا ہے اور اپنی والہانہ شیفتگی، جذباتی وابستگی و سپردگی، عشق و محبت، اطاعت و پیروی کو معنی آفرینی اور فکر آرائی کے ساتھ کمالِ فن اور معیاری انداز سے پیش کیا ہے۔ برجستگی اور روانی، زبان کی شیرینی اور خیال کی لطافت ہر جگہ جلوہ افروز ہیں۔ کلام میں عشقِ رسول کی تڑپ اور بے پناہ محبت کے سوز و گداز کا جا بجا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی کامل ادب و احترام کا بھی ثبوت ملتا ہے جو " با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کا تقاضا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے۔ معراج کے بارے میں لکھتے ہیں:

حاصل ہوا مدعا دعا کا　　مہماں ہوا عرش پہ خدا کا
محبوبِ خدا تھا یا خدا تھا　　ہمراز نہ کوئی ماسوا تھا
یا جلوۂ ذاتِ کبریائی　　یا شانِ جمالِ مصطفائی
مقرون بہ ذاتِ ربِ کونین　　ممتاز بہ شانِ قاب قوسین
احمد پہ احد کا جوشِ رحمت　　کثرت میں ظہورِ نورِ وحدت
از راہِ وفورِ لطفِ باری　　تھا عرش پہ جوشِ وجد طاری
تھی صلِ علیٰ کی دھوم ہر سو　　برکات کا تھا ہجوم ہر سو
اے جودتِ طبع میری بس کر　　اے خاطرِ جمع میری بس کر
اب دیکھ کے نکلے کچھ نہ لب سے　　بڑھ جائے نہ منزلِ ادب سے

ہوں تیرِ قضا کا جب نشانہ　　ہو لب پہ یہ اس گھڑی ترانہ
الوارِ رہِ علم محمدؐ　　برمن نظرِ کرم محمدؐ

قلزمِ وحدانیت کا بے بہا درِّ یتیم　　باعثِ تخلیقِ عالم، خضرِ راہِ مستقیم
افتخارِ انبیاء، محبوبِ رحمٰن الرحیم　　ساقیِ تسنیم و کوثر، صاحبِ خلقِ عظیم
والیِ شام و عرب، فرماں روا آفاق کا
فخرِ موسیٰ کا، خلیل اللہ کا، اسحاق کا

تاجدارِ سورۂ طٰہٰ، حبیبِ کبریا　　والضحیٰ تفسیرِ اجمالِ جمالِ مصطفےٰ
مصحفِ رخسار کا والشمس نادر ترجمہ　　معنیِ واللیل جعدِ سنبلیں زلفِ دوتا
رخ پہ نورِ کبریا، مہرِ نبوت پشت پر
از ہمہ بالاتریں بعد از خدا المختصر

السلام اے آفتابِ رفعتِ اوجِ سما　　السلام اے بر سرِ فرشِ زمیں جلوہ نما
السلام اے از ہمہ بالاتریں بعد از خدا　　سر پہ ہے تیرے مرصع تاجِ لولاک لما

ذکر تیری عظمت و عزت کا ہے زیبِ قرآں
یعنی سبحان الذی اسریٰ کا ہے تو رازداں

—

گر نہ ہوتا پشتِ آدم میں درخشندہ وہ نور تا ابد ممکن نہ تھی ہرگز معافی قصور
زینتِ پشتِ خلیل اللہ نہ ہوتے گر حضور نارِ گلزارِ جناں ہوتی نہ تا یوم النشور
بالیقیں تو رحمت العالمیں ہے بے دلیل
تو ورِیکتا ہے تیری نعت ہے بحرِ طویل

—

وہ قفلِ درِ رموزِ رحمت وہ کاشفِ بابِ رازِ وحدت
وہ بینشِ دیدہ حقیقت وہ رازِ تجلیِ طریقت
وہ مشعلِ محفلِ شریعت وہ گوہرِ قلزمِ مشیت
شاہنشہِ دوسرا محمدؐ
تاجِ سرِ انبیاء محمدؐ

اوپر کے اشعار "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں ورنہ اس مختصر مجموعہ میں جہاں نظر ڈالی جائے عقیدت کا ایک دریا رواں دواں نظر آتا ہے۔ جہاں سے پڑھیئے قادر الکلامی ایک مسلسل پیش کرتی ہے۔ اور جس شعر کو دیکھیے وہی منتخب نظر آتا ہے۔ غرض

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

سید علی سرور "لمعاتِ نور" کی اشاعت کا اہتمام نہ کرتے تو ہم ایک دل آویز اور اثر انگیز اج عقیدت کے پڑھنے سے محروم رہتے۔ "لمعاتِ نور" بلاشبہ نعتیہ ادب میں ایک گراں قدر ہے۔ اور بارگاہِ رسالت میں سندِ قبولیت کا حامل۔

لمعاتِ نور" میں نعتیہ نظمیں اور غزلیں ہیں۔ حضرت علی کی منقبت بھی ہے۔ نیز شروع میں یا محمد ہے جو حکیم مرحوم کی قدرتِ کلام کا بے مثل مظہر ہے۔

لمعاتِ نور" کی قیمت دس روپے ہے جو ناشر سے بتوسط محمد میاں، مرزا چپ شاہ رام پور 244901 (یو پی) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ نیز مکتبہ "شاداب" دستیاب ہے۔

سلسلہ ص۳۸ سے

.. وہ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے۔ ان کی وفات سے مجھے کافی دھکا لگا ہے"۔

مولانا حفظ الرحمان کی خدمات اور قومی زندگی میں ان کا حصہ ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب رہے گا۔ قوم نے انھیں صحیح معنی میں مجاہدِ ملت کا خطاب دیا تھا۔

■■

جیب خرچ کے لئے بھی کوپن دیتی ہیں۔ یہ ہوتے بھی بہت شکیک ہیں۔ چھوٹو تو معلوم ہوتا ہے کوئی تتلی ہاتھ آگئی ہے لیکن ایسی تتلی جس کے رنگ اڑ گئے ہوں اور آج کل کون ہے جس کا رنگ اڑا ہوا نہیں ہے۔

آکاش وانی کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ایک علاقہ کا فن کار دوسرے علاقے میں پہنچ کر وہاں کی آکاش وانی میں اپنے جوہر نہیں دکھا سکتا تاوقتیکہ اس کے اپنے علاقے کی آکاش وانی سے یہ اطلاع نہیں پہنچ جاتی کہ شخص مذکور کا ریکارڈ اچھا ہے اور چال چلن اطمینان بخش ہے۔ فن کاروں کو ایک بڑی سہولت یہ حاصل ہے کہ جب وہ آکاش وانی کی عمارت سے باہر آنا چاہتے ہیں اس وقت صدر دروازے پر اُن سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی حالانکہ اس دوران اُن کا چال چلن بدل چکا ہوتا ہے۔

لیکن ایک بات ماننی پڑے گی کہ آکاش وانی کی طرف سے جب بھی کوئی کھلا پروگرام آندھرا پردیش کی عوام کے آڈیٹوریم میں ترتیب دیا جاتا ہے تو اس وقت اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی ادارہ جو شہر کی گرمی کو ادبی اور تہذیبی سرگرمی میں بدل دے۔ مانا کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن ہمارے لئے یہ داغ داغ اجالا بھی بہت ہے۔

■

کے سپاہی وقت مقررہ پر قلعے سے نکل کر جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے لیکن رضوان نے بجائے آگے بڑھنے کے وہیں پڑاؤ ڈال دیے اور وقت مقررہ پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اچانک اس پر فرنگیوں کی ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ گو تعداد میں آپ کی فوج دشمن سے کہیں زیادہ تھی پھر بھی جنگ کرنے کے بجائے اس نے اپنی فوج کو ایک تنگ سے مقام میں لا اتارا تھا کہ آسانی دفاعی جنگ لڑی جا سکے۔ لیکن یہ جگہ اُن کے لئے قبر بن گیا۔ اُن کے سوار اپنی روایتی جنگ لڑنے سے معذور رہے اور جلد ہی دست بدست جنگ کی نوبت آگئی جس میں بکتر بند فرنگی اُن پر بھاری پڑنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔

(...... جاری ہے ......)

اسلام کی تبلیغ تلوار سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اچھے کردار سے

خدا بخش لائبریری میں، مشہور تاریخ داں، عہد وسطیٰ کی تاریخ کے نامور محقق ڈاکٹر اشتیاق حسین صدیقی نے "عہد مغلیہ کے نادر دستاویزات" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہندوستان میں اسلام کے پھیلنے کے متعدد اسباب ہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے کہ یہاں اسلام حکمراں طبقہ کے دباؤ یا صرف صوفیاء (۱) کی تبلیغ کے نتیجہ میں اس قدر بڑے پیمانے پر پھیلا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگوں کے دلوں میں صوفیہ کرام، ان کے مزارات اور خانقاہوں سے عقیدت رہی ہے لیکن اسلام کے پھیلنے اور جوق در جوق لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب مسلمانوں کا غیر مسلم عوام سے مختلف صنعتوں میں بہتر سماجی ربط رہا ہے۔ انھوں نے تاریخ کے حوالے سے اس حقیقت پر روشنی ڈالی کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں کا وہ طبقہ جو سماجی طور پر کچلا اور دبا ہوا تھا اور جسے اچھوت اور نیچی ذات قرار دے دیا گیا تھا، مسلمانوں کے بہتر سماجی تعلقات اور برتاؤ کے نتیجے میں اسلام سے متاثر ہوا اور ایسے لوگ جو مختلف صنعتوں میں مسلمانوں کے ساتھ کام کر رہے تھے، مسلمانوں کے بہتر کردار اور حسن سلوک کی وجہ سے اثر پذیر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے زمانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں ایک نو مسلم اپنے بھائی کے ساتھ آیا۔ حضرت نے پوچھا کہ کیا تمہارے بھائی اسلام کی طرف مائل ہیں۔ اس آدمی نے جواب دیا کہ میں نے بہت تبلیغ کی لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا اب آپ اس پر ایک نظر ڈالئے کہ اس کا دل بدل جائے۔ حضرت نظام الدین نے فرمایا کہ اس طرح کوئی مسلمان نہیں ہوا کرتا، تمہارے کردار میں ایسی تبدیلی اور تغیر ہونا چاہئے کہ لوگ خود بخود اسلام سے متاثر ہوں۔

---

(۱) صوفیاء کی تبلیغ بھی غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور اپنے ذاتی کردار کا عملی نمونہ ان کے ساتھ پیش کرنا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کو زبانی دعوت سے راغب نہیں کیا بلکہ خواہش مندوں سے اکثر یہ کہا کہ وہ مزید مشاہدہ کریں کہ بعد مسلمان ہوں۔ گویا صوفیاء کی تبلیغ بھی اپنے کردار سے متاثر کرنا تھا۔

— (ادارہ) —

کلمات الصادقین

پروفیسر ضمیر الدین صدیقی استاد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں محفوظ صوفیائے دہلی کے نادر تذکرے "کلمات الصادقین" کا تعارف کراتے ہوئے لائبریری مذکور میں اپنے لکچر میں فرمایا کہ تصوف اسلامی نے گرانی ادوار میں عظیم تر خدمات انجام دیئے اور اسلام کے تمام مکتبہ افکار اور دیگر مذہبی عقائد کے ساتھ کا احترام کیا۔

انھوں نے بتایا کہ زیر بحث مخطوطہ "کلمات الصادقین" ۱۲۵ ایسے صوفیاء کا تذکرہ ہے جو دہلی میں مدفون ہیں۔ یہ کتاب ۱۶۱۴ء/۱۰۲۳ھ میں تصنیف کی گئی اور اس کا مصنف صادق ہمدانی۔ یہ صادق، طبقات شاہجہانی، کے مصنف صادق کشمیری سے مختلف آدمی ہے۔ یہ صادق "اخبار الاخیار" کے مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ہم عصر اور ان کا حاشیہ نشین تھا، چنانچہ وہ انھیں "حضرت مخدومی" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ صادق ہمدانی نے اپنا مأخذ 'سیر الاولیا' 'سیر العارفین' 'سیر الاقطاب' اور اخبار الاخیار کو بتایا ہے۔

پروفیسر صدیقی نے شرح و بسط کے ساتھ اس تذکرے پر بحث فرمائی اور مذہبی، سیاسی سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر خاص روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ ان مشائخ کی موجودگی میں دہلی اسلامی تہذیب کی عظیم علامت بن گئی تھی اور اسے بجا طور پر ہمسر دمشق اور غیرت قسطنطنیہ قرار دیا جاسکتا تھا۔ اس تذکرے کے حوالے سے انھوں نے دہلی کی مساجد، مقابر، شاہی محلات اور دارس کا بھی ذکر فرمایا جہاں سے اسلامی تہذیب کے سوتے پھوٹتے تھے۔ موصوف نے بتایا کہ مصنف مغل بادشاہوں کا بڑا مداح ہے اور خاص کر جہانگیر کا جس کے سلسلے میں اس کا خیال ہے کہ اس کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد ہندوستان میں اسلام نے خاصی ترقی کی۔ مصنف جہانگیر کی مذہبی، سیاسی اور سماجی پالسیوں کے ساتھ ساتھ اس کی عدل گستری کا بھی بہت مداح نظر آتا ہے۔ واضح ہو کہ مصنف جہانگیر کا ہم عصر تھا اور اس کا ارادہ جہانگیر کے عہد کی تاریخ لکھنے کا بھی تھا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ مختلف تذکروں کے حوالے سے انھوں نے ہندوستان میں تاریخ تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ تذکروں سے تصوف اور صوفیاء

باقی صد ۶۲ پر

ڈاکٹر محمد منشاءالرحمن خاں منشا

تضمین بر کلام سراج اورنگ آبادی

نہ وہ ہجر کی رہیں کلفتیں نہ ملن کی دردِ سری رہی
نہ نگاہِ شوق کی بے کلی نہ بلا سے در بدری رہی
نہ رہیں وہ درد کی یورشیں نہ وہ فکرِ چارہ گری رہی
خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

یہ ابھی ابھی کی تو بات ہے مرا باغِ جاں تھا ہرا بھرا
کسی حال میں کسی شکل میں اسے کوئی خوفِ خزاں نہ تھا
یہی سوچتا ہوں میں رات دن یہ عجیب حادثہ کیا ہوا
چلی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

یہ دلِ حزیں کی شکستگی یہ تپیدہ روح کی شعلگی
اسے خوشا مری تہی دامنی اسے زہے یہ شانِ قلندری
میں بتاؤں کیا ہے مجھے کیسی کیسی متاعِ بیش بہا ملی
شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے وہ لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

ستمِ جہاں سے شروع کروں کہ غمِ نہاں سے بیاں کروں
میں کروں بیاں بھی تو داستانِ الم کہاں سے بیاں کروں
بلبِ خموش سناؤں یا لبِ خونچکاں سے بیاں کروں
نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی

---

۱۱ [illegible] ٹاؤن ـ ناگپور

جو کتابِ دل میں تھا رازِ غم وہ بیاضِ رُخ سے عیاں ہوا
تھا جو صبر و ضبط کا سلسلہ وہی نذرِ شورشِ جاں ہوا
جو زباں رکھتا تھا دہن ترے وہ بریدہ زباں ہوا
تیرے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی"

مرے دل کو چسکا لگا ہوا تھا بہت ہی جذبۂ عشق کا
اسی واسطے نہ اثر ہوا کسی طرح صدمۂ عشق کا
گو ازل کے روز سے آشنا میں رہا ہوں نکتۂ عشق کا
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

نہ سمجھ سکا کوئی آج تک دلِ خوش ادائے سراج کو
کھلے دل سے کون خراج دے دلِ بے بہائے سراج کو
یہ اے منشا کس کی نظر لگی دلِ باصفائے سراج کو
کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا جو رہی سو بے خبری رہی"

سلسلہ ص ۶۱

کو سمجھنے میں براہ راست مدد ملتی ہے۔ انھوں نے خصوصاً طور پر "ثمرات الصادقین" کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا جس کے دو قلمی نسخے ہندوستان میں دستیاب ہیں۔ ایک خدا بخش لائبریری میں اور دوسرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایسے دوسرے تذکروں مثلاً "اخبار الاخیار" اور "سیر الاولیاء" وغیرہ سے ممتاز قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کے مصنف (محمد صادق ہمدانی) نے عقیدت محض سے ہٹ کر معروضی نقطۂ نگاہ سے اس دور کا جائزہ لیا ہے۔ چنانچہ اس نے بادشاہوں پر تنقیدیں بھی کی ہیں اور ان کی خامیوں کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ تذکرہ دہلی کو ایک روحانی مرکز قرار دیتا ہے اور اختصار کے ساتھ ان صوفیاء کا ذکر کرتا ہے جو دہلی میں مدفون ہیں۔ [illegible] تذکرے سے [illegible] ۲۱ [illegible] اوقات اور احوالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مومن خاں شوقؔ

کچھ لوگوں کو یہ دور جو قسمت سے ملا ہے
...ں لگتا ہے حالات کی کیا خوب سزا ہے
...س راز کا ابلاغ ذرا کم ہی ہوا ہے
جامی کا سخن آج نیا شعر بنا ہے
اس شخص کا اک نام ہوا کرتا تھا پہلے
جو اپنے ہی حالات کے صحرا میں کھڑا ہے
بے نام جزیروں میں ظفر موج بنے ہیں
کیا لوگ ہیں اُمت پہ یہ کیا وقت پڑا ہے
آئینۂ ایام پہ وہ گرد جمی ہے
چہرہ پہ ہر اک شخص کے اک چہرہ لگا ہے
...ں شوقؔ سے اپنی بھی ملاقات ہوئی تھی
نظموں میں نئی فکر ہے لہجہ بھی جدا ہے

...ولا ۲۲۳-۳-۱۱ ملے پلی حیدرآباد ۱

ڈاکٹر شمع پروین

جو ہواؤں کے رُخ پہ چلتے ہیں
چل کے کچھ دور ہاتھ ملتے ہیں
فصلِ گل سب کو راس آئی کہاں
کچھ شجر چاندنی میں جلتے ہیں
ہم نے دیکھا ہے جھلملاتے انہیں
جو دیئے شام ہی سے جلتے ہیں
ہر خوشی دو غموں کا وقفہ ہے
اشک ہنسنے پہ بھی نکلتے ہیں
غم کے [illegible] غم کی بات کرو
غم کے مارے خوشی سے جلتے ہیں
شمعؔ دل تیری آرزو کے لئے
کتنے پروانے روز جلتے ہیں

۸/15/3-5-926 حمایت نگر حیدرآباد ۲۹

غزل

معیّت اعظمی

...ے پاس اب لفظوں کی کچھ کمی نہیں — باتوں میں میری کس لئے پہلی سی دل کشی نہیں
...یا پھر خطر ہی ہنر [illegible] کے پاسباں — ان سے گذرنا دوستو مشکل ہے، دل لگی نہیں
...یا [illegible] یاں اب تک سمجھ سکا نہ میں — صبر و سکون لُٹ گیا لب پہ مرے ہنسی نہیں
...قدم پہ کھل گئے ہر سمت میکدے بھی اب — رندوں میں نام ہو مگر پہلی سی میکشی نہیں

بے سود ساری کوششیں ہو کر معیتؔ رہ گئیں
بگڑی ہوئی تھی بات جو وہ آج تک بنی نہیں

... انگلو اردو ہائی اسکول۔ دھولیہ۔ مہاراشٹرا

غزلیں

علی بن ایاز ایاز

جلوہ نمائیوں پہ تو مائل نگار تھا
میری نظر میں رنگِ تعین کا خار تھا

مجھ پہ کریں گے وہ ستم ناروا غلط
ان پہ نظر اٹھائی سزا وارِ دار تھا

کل محتسب کے ہاتھ میں دامن تھا رند کا
لیکن چمن میں خار پہ گل سایہ دار تھا

ناسازگار آج اگر ہے تو کیا ہوا
کل تک زمانہ ہم سے بہت سازگار تھا

سیلاب رنگ نے بھرنے رکھا محو عمر بھر
جوشِ بہارِ حسن کا خود پردہ دار تھا

پابوسِ رہروانِ چمن خاک ہے میری
جان دادۂ ہوائے گل و مرغزار تھا

شاعر ایاز کو جو بھی سمجھے غلط غلط
کچھ لوگ کہتے ہیں وہ جریدہ نگار تھا

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

تدریسِ انقلاب نصابوں میں دیکھئے
بدلے ہوئے سوال کتابوں میں دیکھئے

ہنگامۂ بہار کا عالم عجیب ہے
کانٹوں کا بانکپن ہے گلابوں میں دیکھئے

اک تیر ہی چبھا تھا ابھی انقلاب کا
دریا تڑپ رہا ہے سرابوں میں دیکھئے

دعوت کا اہتمام بہت شاندار ہے
لیکن سجا ہے زہر بھی قابوں میں دیکھئے

یہ کہہ کے عصرِ نو نے تھپک کر سلا دیا
گزری ہوئی حیات کو خوابوں میں دیکھئے

اپنی انا کی پیاس بجھانے کے واسطے
دریا بھٹک رہا ہے سرابوں میں دیکھئے

اوراق کی رگڑ سے بھڑکنے لگی ہے آگ
سمجھا ہے شعلگی کی کتابوں میں دیکھئے

نظارۂ جمال پہ اکسا رہا ہے دل
لیکن ذرا سنبھل کے نقابوں میں دیکھئے

تعلیم حاضرہ پہ نئے تجربات ہیں
اس دور کی جدید کتابوں میں دیکھئے

جس دن سے راز موم کے پتلے لئے ہیں
شعلے بھڑک رہے ہیں شرابوں میں دیکھئے

ایس۔ این کالج ۔ کٹرہ پھول خاں
اٹاوہ [illegible] یوپی

ماہنامہ

حیدرآباد



جلد ۳ - شمارہ ۱۰ * قیمت ۵ روپے * اکتوبر سنہ ۱۹۸۸ *

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر: محمد کلیم الدین احسن

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر محمد قمر الدین صابری نے [illegible] پرنٹنگ پریس [illegible] میں چھپوا کر دفتر شاداب [illegible] حیدرآباد سے شائع کیا۔

پاکستان	انگلستان	امریکہ	خلیجی ممالک	ہندوستان
25 پاکستانی روپے	20 پونڈ	35 ڈالر	150 روپے	سالانہ 50 روپے
225 "	36 "	65 "	270 "	دو سالہ 90 "
2000 "	300 "	450 "	2500 "	تاحیات 1000 "

ترسیل زر کا پتہ: 147-5-11 ریڈ ہلز، حیدرآباد - ۴ - آندھرا پردیش

فہرست

حرفِ اوّل

تعلیمی اداروں میں سیاست سے پرہیز

کلکتہ کے لامارٹی نیرز (LA MARTINIERE'S) اسکول کے ۱۵۱ ویں یوم بانیان سے ۱۳ ستمبر کو مخاطبت کرتے ہوئے ہمارے صدر جمہوریہ جناب ذیل سنگھ نے اسکول کے بانی اکلاڈ مارٹن کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ ہم اپنے تعلیمی اداروں کو جماعتی سیاست سے پاک وصاف نہیں رکھیں گے تو ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ ہماری نوجوان نسل اعلیٰ کردار کی حامل ہوگی اور مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرسکے گی۔ ہمارے نوجوان باصلاحیت ہیں اور کسی ملک کے نوجوانوں سے پیچھے نہیں ہیں لیکن ہڑتال، بائیکاٹ اور رکاوٹوں سے علم میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ صلاحتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ پابند ڈسپلن افراد ہی کچھ کر دکھا سکتے ہیں۔ طالب علمانہ زندگی میں انھیں صرف تعلیم حاصل کرنا چاہیئے۔ ۱۹۸۱ء کے اعداد وشمار کے مطابق ہماری خواندگی کی شرح صرف ۳۶ فیصد ہے۔ اس آزادی کے تقریباً ۴۰ سال گذرنے پر بھی ہماری ۶۴ فیصد آبادی ایسی ہے جسے تحتانی تعلیم کی ضرورت ہے۔ صدر جمہوریہ کا انتباہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اگر ہمارے رہنما طلباء کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہیں گے جیساکہ رجحان بڑھتا جارہا ہے تو ہم اکیسویں صدی میں عصری سائنسی اور ٹکنالوجی کی تعلیم سے لیس قوم کی حیثیت سے قدم نہ رکھ سکیں گے۔ اگر ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی کی خواہش کے مطابق ایک ترقی پذیر قوم کی طرح ہم اکیسویں صدی کا خیر مقدم کرنا چاہتے ہیں تو صدر جمہوریہ کے کہنے کے مطابق اپنے تعلیمی اداروں سے سیاست کو دور رکھنا ہوگا۔

قومی تعلیمی پالیسی کا عملی نفاذ

ہماری مرکزی حکومت نے نئی قومی تعلیمی پالیسی کا نہ صرف اعلان کیا ہے بلکہ اسے نافذ کرنے کے لئے عملی اقدام بھی کر رہی ہے۔ اس بارے

مزید غور کرنے کے لیے ملک کے تمام وزرائے تعلیم کو حیدرآباد مدعو کیا گیا تھا۔ آندھرا پردیش کے علاوہ تین غیر کانگریسی ریاستوں مغربی بنگال، ٹاملناڈو اور کرناٹک اور سکم اور جزائر انڈمان و نکوبار کے وزرائے تعلیم نے کانفرنس میں حصہ لیا۔ ایک قرارداد میں تعلیمی بجٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ جملہ ضرورت کا چوتھائی بھی نہیں ہے۔ مطالبہ کیا گیا کہ گروس نیشنل پراڈکٹ (G.N.P) کا کم از کم ۶ فیصد یونین اور اسٹیٹ بجٹوں کا ۱۰ فیصد اور ساتویں پلان کا ۱۰ فیصد تعلیم کے لئے مختص کیا جانا چاہیئے نیز (R.B.I) اور بنکوں کو پابند کیا جانا چاہیئے کہ وہ تعلیمی اداروں کو زیادہ سے زیادہ تعلیمی قرضے مہیا کریں تاکہ تعلیمی آلات تعمیری منصوبوں کی تکمیل کر سکیں۔

دوسری قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ تعلیم کو مشترکہ فہرست سے نکالا صرف ریاست کی فہرست میں شریک رکھا جائے۔ ایک قرارداد میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو غیر مرکوز کرنے اور اس کے لئے ملک کے مختلف علاقوں میں یو جی سی کی شاخیں کھولنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک قرارداد میں ابتدائی تعلیم کو پورے ملک میں یکساں بنانے پر زور دیا گیا۔ نیز ایک قرارداد میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ کیا گیا تاکہ طلبا کو مزید زبانیں سیکھنے کے بجائے سائنس اور ٹکنالوجی میں عصری تعلیم سے آراستہ کیا جاسکے۔

ان تمام قراردادوں پر عمل آوری ہماری تعلیمی پالیسی کو تکمیل کے راستے پر لے جائے گی لیکن ہمیں امید ہے کہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کے مطالبہ پر عمل کیا جائے گا اور مادری زبان کو علاقائی زبان میں بدل کر اردو والوں کو محروم نہیں کیا جائیگا تاکہ اردو والے بھی اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرسکیں۔

اردو میڈیم ریذیڈنشیل اسکول

گزشتہ چند برسوں سے اردو والوں کا مطالبہ تھا کہ آندھرا تلنگانہ اور رائلسیما تینوں علاقوں میں ایک ایک اردو میڈیم اقامتی اسکول قائم کیا جائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ حکومت نے ایک اقامتی اسکول حیدرآباد کے پرانے شہر میں قائم کرنے کی منظوری دی ہے۔ تعلیمی سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے لیے پانچویں اور آٹھویں جماعت

بچے اس اسکول میں داخلے دیئے جائیں گے۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر حیدرآباد انٹرنس امتحان ۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو منعقد کریں گے جس میں حیدرآباد و سکندرآباد میں واقع اردو میڈیم کے کسی مسلمہ اسکول کے طلبا شریک ہو سکیں گے۔ جن کے سرپرست کی آمدنی ‎2000/-‎ سالانہ سے زیادہ نہ ہو۔ اردو میڈیم والے طلبا سے ہماری خواہش ہے کہ وہ اس موقعہ سے استفادہ کریں اور انٹرنس امتحان میں شریک ہو کر داخلہ حاصل کریں۔ نیز حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے ہمارا یہ مطالبہ بھی ہے کہ آندھرا اور راگلسیما علاقوں میں بھی ایک ایک اردو میڈیم اقامتی اسکول قائم کرے تاکہ ان علاقوں کے طلباء بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔

پروفیسر شروانی مرحوم کی یاد تو ایک ایسا سلسلہ لامتناہی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا، اُن کی ں کی خدمات بے پناہ اور اس کے ایسے عظیم اثرات ہیں جو کبھی دھندلے نہ ہو سکیں گے۔ لیکن نہ تو ں گڑھ نے اب تک اپنے اس قابل فخر فرزند کی قیام یادگار کی جانب توجہ دی اور نہ ہی حیدرآباد نے ا وہ تناسب سے شیب تک تقریباً ساٹھ سال اپنی گراں مایہ تاریخی، لسانی، علمی، ادبی و سماجی ات کے باعث ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے نیز وہ جو نقوش چھوڑ گئے ہیں کبھی ماند نہ ہوں گے۔ حیدرآباد کو وطن ثانی بنا کر وہ نہ صرف اپنے کثیر التعداد خانوادہ سے بچھڑ کر ہیں کے ہو رہے اسی خاک دکن میں ابدی نیند سو رہے ہیں، ان کی عظیم خدمات کا تقاضا ہے کہ بلدیہ و حکومت ں نے ان کی تاریخ دانی و علمی تبحر سے بھرپور استفادہ کیا اور ہمیشہ اس کا اعتراف کیا ہے اب ے کسی عملی اقدام سے ان کے شایان شان کسی دائمی یادگار کے قیام سے اپنی معارف پروری کا ثبوت دے۔ پروفیسر شروانی مرحوم پر بہت کچھ لکھا گیا اور آئندہ بھی لکھا جائے گا، اس مختصر سرسری جائزہ تحریر کا منشاء محض ان کی یاد تازہ کرنا اور خانوادہ شروانی مرحوم کو جو بحمد اللہ ذی علم و ذی ثروت راد پر مشتمل ہے توجہ دلانا ہے کہ وہ کم از کم "ہارون شروانی اکاڈمی" کے قیام ــــ کے ذریعہ م کی اہم تصانیف کے جدید ایڈیشن اور ان کی یاد میں سالانہ انگریزی و اردو میں سوونیر شائع کریں۔ اردو سے مرحوم کو انتہائی شغف و دلچسپی تھی اس کی ترویج و فروغ میں بیش از بیش حصہ لے کر ں کی روح پر فتوح کو خوش اور ان کے مستقل ایصال ثواب کے اہتمام سے ماجور ہوں۔ باری تعالیٰ وم کی بال بال مغفرت فرمائے۔

گزارش: خاتمۂ کلام پر پروفیسر شروانی مرحوم کی "وصیت" اور ان کے والد مرحوم ں "گزارش احوال واقعی" کے زیراکس کے لئے میں صاحبزادہ مسعود احمد شروانی سلمہٗ

محمد کلیم الدین احسن

اولاد کی پرورش

اولاد کو خدا کا انعام سمجھیے، ان کی پیدائش پر خوشی منائیے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیجیے۔ خیر و برکت کی دعاؤں کے ساتھ استقبال کیجیے اور خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو اپنے ایک بندے کی پرورش کی توفیق بخشی اور یہ موقع فراہم فرمایا کہ آپ اپنے پیچھے اپنے دین و دنیا کا جانشین چھوڑ جائیں۔

ولادت کے بعد نہلا دھلا کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہیے۔ جب حضرت حسینؓ کی ولادت ہوئی تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے کان میں اذان و اقامت فرمائی۔

جب بچہ بولنے لگے تو سب سے پہلے اس کو کلمہ لا الہ الا اللہ سکھائیے۔
نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔
جب تمہاری اولاد بولنے لگے تو اس کو" لا الہ الا اللہ" سکھا دو، پھر مت پرواہ کرو کہ کب مرے اور جب دودھ کے دانت گر جائیں تو نماز کا حکم دو۔

بچے کو اپنا دودھ پلائیے، ماں پر بچے کا حق ہے۔ قرآن نے اولاد کو ماں کا یہی احسان یاد دلا کر ماں کے ساتھ غیر معمولی حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ ماں کا فرض یہ ہے کہ وہ بچے کو اپنے دودھ کے ایک ایک قطرے کے ساتھ توحید کا درس رسول کا عشق اور دین کی محبت بھی پلائے اور اس محبت کو اس کے قلب و روح میں بسانے کی کوشش کرے۔

بچوں کو ڈرانے سے پرہیز کیجیے۔ ابتدائی عمر کا یہ ڈر ساری عمر ذہن و دماغ پر چھایا رہتا ہے اور ایسے بچے بالعموم زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے

کھلا ڈلا نہیں رہتے۔

اولاد کو بات بات پر ڈانٹنے ' جھڑکنے اور بُرا بھلا کہنے سے سختی کے ساتھ پرہیز کیجئے اور ان کی کوتاہیوں پر بیزار ہونے اور نفرت کا اظہار کرنے کے بجائے حکمت و سوز کے ساتھ ان کی تربیت کرنے کی محبت آمیز کوشش کیجئے اور اپنے طرزِ عمل سے بچوں کے ذہن پر یہ خوف بہر حال غالب رکھیے کہ ان کی کوئی خلافِ شرع بات آپ ہرگز برداشت نہ کریں گے۔

اولاد کے ساتھ ہمیشہ شفقت ' محبت ' نرمی کا برتاؤ کیجئے اور حسبِ ضرورت وحیثیت ان کی ضروریات پوری کر کے ان کو خوش رکھیے اور اطاعت و فرماں برداری کے جذبات اُبھاریئے۔

چھوٹے بچوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیریئے۔ بچوں کو گود میں لیجئے پیار کیجئے اور ان کے ساتھ خوش طبعی کا سلوک کیجئے۔ ہر وقت تند خُو اور سخت گیر حاکم نہ بنے رہیئے ' اس طرزِ عمل سے بچوں کے دل میں والدین کے لیے والہانہ جذبۂ محبت بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے اندر خود اعتمادی بھی نہیں پیدا ہوتی اور ان کی فطری نشو و نما پر بھی خوشگوار اثر نہیں پڑتا۔

بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز سکھایئے ' نماز پڑھنے کی تلقین کیجئے اور اپنے ساتھ مسجد لیجا کر شوق پیدا کیجئے اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور نماز میں کوتاہی کریں تو انھیں مناسب سزا بھی دیجئے اور اپنے قول و عمل سے ان پر واضح کر دیجئے کہ نماز کی کوتاہی کو آپ برداشت نہ کریں گے۔

بچوں کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھیئے ' ان کی طہارت ' نظافت اور غسل وغیرہ کا خیال رکھیئے ' کپڑے بھی پاک صاف رکھیئے البتہ زیادہ بناؤ سنگار اور نمود و نمائش سے پرہیز کیجئے۔ لڑکی کے کپڑے بھی نہایت سادہ رکھیئے اور زرق برق لباس پہنا کر بچوں کے مزاج خراب نہ کیجئے۔

دوسروں کے سامنے بچوں کے عیب نہ بیان کیجئے اور کسی کے سامنے ان کو شرمندہ کرنے اور ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس لگانے سے بھی سختی کے ساتھ پرہیز کیجئے۔

بچوں کے سامنے کبھی بچوں کی اصلاح سے مایوسی کا اظہار نہ کیجیے بلکہ ان کی ہمت بڑھانے کے لیے ان کی معمولی اچھائیوں کی بھی دل کھول کر تعریف کیجیے۔ ہمیشہ ان کا دل بڑھانے اور ان میں خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کیجیے تاکہ یہ کارگاہِ حیات میں دلچسپی سے اونچا مقام حاصل کر سکیں۔

بچوں کو نبیوں کے قصے، صالحین کی کہانیاں اور صحابۂ کرام کے مجاہدانہ کارنامے ضرور سناتے رہیں۔ تربیت و تہذیب، کردار سازی اور دین سے شغف کے لیے اس کو انتہائی ضروری سمجھیے اور ہزار مصروفیتوں کے باوجود اس کے لیے وقت نکالیے۔ اکثر و بیشتر ان کو قرآن پاک بھی خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر سنائیے اور موقع موقع سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی پُراثر باتیں بھی بتائیے اور ابتدائی عمر ہی سے ان کے دلوں میں عشقِ رسول کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔

کبھی کبھی بچوں کے ہاتھ سے غریبوں کو کچھ کھانا یا پیسے وغیرہ بھی دلوائیے تاکہ ان میں غریبوں کے ساتھ سلوک، خیرات و سخاوت کا جذبہ پیدا ہو اور کبھی کبھی یہ موقع بھی فراہم کیجیے کہ کھانے پینے کی چیزیں بہن بھائیوں میں خود ہی تقسیم کریں تاکہ ایک دوسرے کے حقوق کا احساس اور انصاف کی عادت پیدا ہو۔

بچوں کی ہر جا و بے جا ضد پوری نہ کیجیے بلکہ حکمت کے ساتھ ان کی یہ عادت چھڑانے کی کوشش کیجیے۔ کبھی کبھی مناسب سختی بھی کیجیے، بے جا لاڈ پیار سے ان کو ضدی و خودسر نہ بنائیے۔

کرخت آواز سے بولنے اور گلا پھاڑ کر چیخنے چلانے سے خود بھی پرہیز کیجیے اور ان کو بھی تاکید کیجیے کہ درمیانی آواز میں نرمی کے ساتھ گفتگو کریں اور آپس میں بھی ایک دوسرے پر چیخنے چلانے سے سختی سے پرہیز کریں۔

بچوں میں عادت ڈالیے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کریں۔ ہر کام میں نوکروں کا سہارا نہ لیں۔ اس سے بچے کاہل سست اور اپاہج بن جاتے ہیں۔ بچوں کو جفاکش، محنتی اور سخت کوش بنائیے۔

بچوں میں باہم لڑائی ہو جائے تو اپنے بچے کی بے جا حمایت نہ کیجیے۔ یہ خیال رکھیے کہ اپنے بچے کے لیے آپ کے سینے میں جو جذبات ہیں وہی

ہات جو ممروں کے سینے میں اپنے بچوں کے لیے ہیں۔ آپ ہمیشہ اپنے بچے
ے قصوروں پر نگاہ رکھیے اور ہر پیش آنے والے ناخوشگوار واقعہ میں اپنے
بچے کی کوتاہی اور غلطی کی کھوج لگا کر حکمت اور مسلسل توجہ سے اس کو
ر کرنے کی پُرسوز کوشش کیجیے۔

اولاد کے ساتھ ہمیشہ برابری کا سلوک کیجیے اور اس معاملے میں
اعتدالی سے بچنے کی پوری پوری کوشش کیجیے اگر طبعاً کسی ایک بچے کی طرف
دہ میلان ہو تو معذوری ہے لیکن سلوک و برتاؤ اور لین دین میں ہمیشہ
ماف اور مساوات کا لحاظ رکھیے اور کبھی بھی کسی ایک کے ساتھ ایسا امتیازی
ک نہ کیجیے جس کو دوسرے بچے محسوس کریں۔ اس سے دوسرے بچوں
احساسِ کمتری، نفرت، مایوسی اور آخرکار بغاوت پیدا ہوگی اور یہ بڑے
بات فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے میں زبردست رکاوٹ اور اخلاق
روحانی ترقی کے لیے سم قاتل ہیں۔

بچوں کے سامنے ہمیشہ اچھا عملی نمونہ پیش کیجیے۔ آپ کی زندگی بچوں
لیے ایک ہمہ وقتی خاموش معلم ہے جس سے بچے ہر وقت پڑھتے اور
ھتے رہتے ہیں۔ بچوں کے سامنے کبھی مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولیے۔

حضرت عبداللہ بن عامر اپنا ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک حضور صلے اللہ
وسلم ہمارے گھر تشریف رکھتے تھے۔ میری والدہ نے مجھے بلایا اور کہا۔

"یہاں آ، میں تجھے چیز دوں گی۔"

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا پوچھا:

"تم بچے کو کیا دینا چاہتی ہو؟"

وہ بولیں: "میں اس کو کھجور دینا چاہتی ہوں۔"

آپؐ نے والدہ سے فرمایا: "اگر تم دینے کا بہانہ کرکے بلاتیں اور بچے
انے پر کچھ نہ دیتیں تو تمہارے اعمال نامے میں یہ جھوٹ لکھ دیا جاتا۔"

(ابوداؤد)

لڑکی کی پیدائش پر بھی اسی طرح خوشی منائیے جس طرح لڑکے کی پیدائش
ملتے ہیں۔ لڑکی ہو یا لڑکا دونوں ہی خدا کا عطیہ ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا

ہے کہ آپ کے حق میں لڑکی بہتر ہے یا لڑکا۔ لڑکی کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھانا اور دل شکستہ ہونا اطاعت شعار مومن کے لیے کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ یہ ناشکری بھی ہے اور خدائے علیم و کریم کی توہین بھی۔

لڑکیوں کی تربیت و پرورش انتہائی خوش دلی، روحانی مسرت اور دینی احساس کے ساتھ کیجئے اور اس کے صلے میں خدا سے بہشت بریں کی آرزو کیجئے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس شخص نے تین لڑکیوں یا تین بہنوں کی سرپرستی کی، انھیں تعلیم و تہذیب سکھائی اور ان کے ساتھ رحم کا سلوک کیا یہاں تک کہ خدا ان کو بے نیاز کر دے تو ایسے شخص کے لیے خدا نے جنت واجب فرمادی۔ اس پر ایک آدمی بولا۔ اگر دو ہی ہوں تو۔ نبیؐ نے فرمایا دو لڑکیوں کی پرورش کا بھی یہی صلہ ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اگر لوگ ایک کے بارے میں پوچھتے تو آپؐ ایک کی پرورش پر بھی یہی بشارت دیتے۔

لڑکی کو حقیر نہ جانئے نہ لڑکے کو اس پر کسی معاملہ میں ترجیح دیجئے، دونوں کے ساتھ یکساں محبت کا اظہار کیجئے اور یکساں سلوک کیجئے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اس نے جاہلیت کے طریقہ پر اسے زندہ دفن نہیں کیا اور نہ اس کو حقیر جانا اور نہ لڑکے کو اس کے مقابلے میں ترجیح دی اور زیادہ سمجھا تو ایسے آدمی کو خدا جنت میں داخل کرے گا۔" (ابوداؤد)

جائیداد میں لڑکی کا مقرر حصہ پوری خوش دلی اور اہتمام کے ساتھ دیجئے۔ یہ خدا کا فرض کردہ حصہ ہے اس میں کمی بیشی کرنے کا کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ لڑکی کا حصہ دینے میں حیلے کرنا یا اپنی صوابدید کے مطابق کچھ دے دلا کر مطمئن ہو جانا اطاعت شعار مومن کا کام نہیں ہے ایسا کرنا خیانت بھی ہے اور خدا کے دین کی توہین بھی۔

ان تمام عملی تدبیروں کے ساتھ ساتھ نہایت سوز اور دل کی لگن کے ساتھ اولاد کے حق میں دعا بھی کرتے رہیئے۔ خدا سے رحمٰن و رحیم سے توقع ہے کہ وہ والدین کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی پُرسوز دعائیں ضائع نہ فرمائے گا۔ (ماخوذ)

(قسط دوم) مفتی مولانا محمد تقی عثمانی صاحب (مسلسل)
ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

[illegible]

تو سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسی غیر معمولی سلطنت عطا فرمائی ہے کہ انسان ذرا غور کرے تو یہ قدرت کاملہ کا عجیب وغریب وعظیم الشان شاہکار ہے کہ اس کی کوئی حد و حساب نہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم کبھی کبھی اپنے نفس پر غور کیا کرو تو تمھیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا احساس ہو۔ یہ آنکھیں مفت مل گئیں، کوئی پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑا کوئی محنت نہیں اٹھانی پڑی اس لئے کوئی قدر وقیمت نہیں۔ خدا نہ کرے ایک آنکھ کی بینائی کسی وقت میں پڑ جائے اس وقت اس کی قدر وقیمت معلوم ہوگی۔ ساری کائنات لٹا کر بھی اور ساری دولت صرف کر کے بھی کوئی یہ چاہے گا کہ کس طرح میری بینائی واپس آجائے تو ممکن نہیں۔ اتنی قدر وقیمت کی چیز ہے لیکن مفت ملی ہوئی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس لئے اس کی کوئی قدر نہیں۔

یہ جو آپ کا دل (قلب) ہے اس کے بارے میں اب طب کی یہ تحقیق ہے کہ انسان کے جسم کے اندر کتنی رگیں ہیں چھوٹی بڑی اگر ان تمام رگوں کو ملا کر ایک خط مستقیم میں پھیلا یا جائے تو یہ خط مستقیم دنیا کے گرد تین چکر کاٹ سکتا ہے اور دنیا کا محیط ۲۴,۸۰۰ میل ہے اس کو تین سے ضرب دیجئے تقریباً پچھتر ہزار میل لمبی رگیں ایک انسان کے جسم کے اندر ہیں اور وہ ساری رگیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی بغیر مقصد کے پیدا کی ہیں۔ کوئی نہ کوئی فائدہ ان کو پہنچا رہا ہے۔

ایک مرتبہ جب آپ کا دل دھڑکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک دھڑکن کے اندر دل کام کرتا ہے ایک فاسد خون کو تمام رگوں سے کھینچنا اور Refine کر کے صالح خون کو دوبارہ ان تمام رگوں میں پہنچانا۔ ایک منٹ کے اندر ایک صحت مند انسان کا دل ۷۲ مرتبہ دھڑکتا ہے یعنی ۷۲ مرتبہ جسم کی تمام رگوں سے تقریباً ۷۵ ہزار میل خون کھینچتا ہے اور دوبارہ تمام رگوں میں ۷۵ ہزار میل خون کو چھوڑتا ہے اور یہ عمل ایک منٹ میں ۷۲ مرتبہ کرتا ہے۔

مہتمم دارالعلوم کراچی پاکستان

اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ خودکار مشین ہمیں دے رکھی ہے جو پیدا ہونے کے بعد سے مرتے دم تک دھڑکتی رہتی ہے۔ سارے اعضاء کو آرام مل جاتا ہے لیکن قلب کو آرام کسی بھی حالت میں نہیں ملتا۔ وہ اپنا فرض انجام دے رہا ہے۔ اس عظیم الشان ترقی کے دور میں آج سائنس کوئی ایسی مشین لا کر دکھا دے جو ایک منٹ میں ۷۲ مرتبہ [illegible] کرنے کے بعد خون کو صاف کر کے پیروں کو ڈالتی ہو [illegible] ۲۴ گھنٹے [illegible] ایک منٹ [illegible]۔

آج سائنس [illegible] نے آپ کو ایک ایک چیز کے تمام اجزا اور ان کی مقدار کا حساب معلوم کرا دیا۔ خون کا ایک قطرہ لے کر کسی لیبارٹری میں آپ جانچ تو ٹسٹ کرنے کے بعد آپ کو بتا دیا جائے گا اس میں کس چیز کا کتنا عنصر ہے۔ اس ایک قطرۂ خون کے سارے اجزا معلوم ہو جائیں گے۔ لیکن کہا جائے کہ ان سارے معلوم شدہ اجزا اور ان کے معلوم تناسب کو جمع کر کے ایک قطرۂ خون بنا کر دکھائیں تو وہ ایک قطرۂ خون نہیں بنتا۔ اگر کسی انسان کے جسم میں خون داخل کرنا ہوگا تو کسی دوسرے انسان سے لیا جائے گا۔ سائنس کے قبضہ میں یہ بات نہیں ہے کہ ایک تولہ خون کی تیار کر کے اس کے جسم میں داخل کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ خون دے رکھا ہے اور پھر یہ خون کیسے بن رہا ہے۔ ہم کھانا کھاتے ہیں۔ کھا کر فارغ ہو گئے۔ اپنی بھوک مٹائی اور ختم ہو گئی۔ ہمارا کام تو ختم ہو گیا۔ اب اندر جا کر کھانا ہمارے جسم میں کیا خدمت انجام دے رہا ہے۔ کتنے مراحل سے گزر رہا ہے۔ معدہ میں پہنچتا ہے تو معدہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کر رہا ہے۔ پھر جگر میں جا رہا ہے تو جگر اس کے ساتھ کیا معاملہ کر رہا ہے۔ اس ایک خوراک سے جو ہم نے کھائی ہے اس سے جگر خون بنا رہا ہے۔ خون مل رہا ہے اسی سے بالوں کی بالوں کی افزائش ہو رہی ہے ناخن بڑھ رہے ہیں، کھال کے اندر ترقی ہو رہی ہے، کسی جگہ نطفہ بن رہا ہے۔ غذا ایک ہی ہے اور اس کے سب اجزا بھی سائنس جانتی ہے۔ اب سائنس سے کہیں بنا دو تو بنانے کی قدرت نہیں یہاں آ کر ساری سائنس، ساری مہارت، سارا کمال گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ کوئی انسان بنانے کی قدرت نہیں رکھتا حالانکہ آج سائنس نے اتنی زبردست ترقی کی اور دعوے ہیں کہ ہم نے چاند پر جھنڈے گاڑ دئیے ہیں، مریخ پر راکٹ پھینک دئیے۔

دنیا میں اتنی زبردست سائنس کی معلومات پھیل گئی ہیں کہ جس کا کوئی حد و حساب نہیں۔

ایک مرتبہ میرے ایک دوست کے دماغ میں کچھ تکلیف تھی۔ وہ ایک ہسپتال میں زیرِ علاج تھے جہاں ایک ایسی نئی مشین آئی تھی جس کے ذریعہ دماغ کے اندرونی حصوں کی تصویر آ جاتی تھی۔ انسان کے دماغ کو قاشوں کی طرح کاٹ کر وہ مشین دکھاتی ہے کہ اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔

کہاں گزر رہا ہے، کہاں نہیں۔ اتفاق سے میں بھی اسکرین کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس کو دیکھ رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک خاص آلہ جس میں ایک عظیم الشان جہان ہے جس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے۔ یہ جو چھوٹا سا دماغ ہمارے سر میں رکھا ہوا ہے جو بمشکل آدھا سیر کا بھی نہیں اس میں اتنی زبردست کائنات ہے کہ جس کا کوئی حد و حساب نہیں۔ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب ذرا یہ بتلائیے کہ یہ جتنا کچھ دماغ آپ کو نظر آ رہا ہے تو کیا آپ کو اس کا [illegible] معلوم ہے کہ یہ کیا عمل کرتا ہے اور کیا کام لیا جا رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اب تک تو سائنس دماغ کے جتنے حصہ کا عمل دریافت کر سکی ہے وہ پورے دماغ کا صرف چوتھائی حصہ ہے۔ تین چوتھائی کے بارے میں نہیں معلوم کہ اس کا عمل کیا ہے، کیا اس کو فائدہ ہوتا ہے اور کیا نقصان پہنچتا ہے۔ میرے دوست کا ابھی حال میں انتقال ہوا۔ اس تین چوتھائی حصے میں ان کو تکلیف ہو گئی تو ڈاکٹروں نے کہا کہ ہم اس کو Touch نہیں کر سکتے کیونکہ نہ جانے کون سے حصہ کو ہم Touch کریں گے تو کون سی انسان کی صلاحیت ناکارہ ہو جائے گی، فالج آ جائے گا، لقوہ ہو جائے گا، کیا تکلیف ہو جائے گی ہم نہیں جانتے۔ ان تمام ترقیات اور ہزارہا سال کی محنت کے بعد سائنس اس آدھا سیر دماغ کے تین چوتھائی حصہ کے بارے میں دریافت نہیں کر سکی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے سر سے لے کر پاؤں تک یہ سلطنت ہمیں کیا یوں ہی بیکار دے رکھی ہے؟ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں یہ نعمتیں دے رکھی ہیں جس کا ہم سے کوئی پیسہ لیا اور نہ محنت طلب کی۔ کیا اس سلطنت کی عطا کے لئے ہم سے کوئی مطالبہ نہیں؟ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اس پانچ فٹ کی سلطنت پر اسلام کو نافذ کریں۔ اسلام کو نافذ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ذرا جائزہ لے کر دیکھیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ آنکھ اللہ تعالیٰ نے دی ہے کہ اس سے نفع اٹھائیں لیکن اس کو غلط جگہ استعمال کریں اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے نہ دیکھنے سے منع فرمایا ہے اس جگہ اس کو استعمال کریں تو اس آنکھ کا حق ادا نہ ہوگا، اس نعمت کی قدر نہ ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس چیز سے بچنے کا کہا ہے ہم رک جائیں۔ یہ کان اللہ تبارک و تعالیٰ نے دئیے ہیں کہ اس سے جائز چیز سنیں۔ اس کی قدر و قیمت ان لوگوں سے پوچھیں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب یہ نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کو اس کام میں استعمال کریں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہو۔ اس کو غلط کام میں استعمال نہ کریں۔ اس کو غیبتیں سننے میں، گانے بجانے سننے میں، دوسروں کی برائیاں سننے میں استعمال نہ کریں۔ زبان اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے چلتی ہوئی مشین ہے۔ جب سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس وقت سے مرتے دم تک

پہ مشین چل رہا ہے اور کسی وقت نہیں رکتی۔ جو چاہیں اس سے کام لیتے ہیں۔ اس کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کریں۔ وہ بات منہ سے نکالیں جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے۔ ان چیزوں سے اس کو بچائیں جو اس کی مرضی کے خلاف ہو جیسے جھوٹ، غیبت، دوسرے لوگوں کی برائیاں، دھوکہ فریب وغیرہ۔ غرض یہ کہ اس لفظ نظر سے رات کو بیٹھ کر پانچ منٹ اس کا جائزہ لیا کریں کہ ہم اس پانچ، چھ فٹ کی سلطنت کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں پھر دیکھئے کہ کتنی خرابیاں خود اپنے اندر نظر آئیں گی اور اپنی اصلاح کی طرف فکر ہوگی۔ ہوتا یہ ہے کہ اپنی برائی جب انسان نہیں دیکھتا تو دوسروں کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جب اپنی برائیاں نظر آتی ہیں تو دوسروں سے آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم نے کہا ہے

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر   رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر   تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا۔

آپ حضرات جانتے ہیں کہ اس صدی میں کسی شخص کو اگر مثالی مسلمان کہا جا سکتا ہے تو وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ذات ہے۔ وہ فرماتے ہیں میں ہر مسلمان کو فی الحال اپنے سے افضل سمجھتا ہوں اور ہر کافر کو فی المآل اس کے افضل ہونے کا احتمال سمجھتا ہوں۔ اس وقت چاہے کفر میں مبتلا ہے لیکن کیا پتہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے توبہ کی توفیق دیدی، ایمان لے آئے تو مجھ سے بھی آگے بڑھ جائے۔ وہ کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت تھانوی محض تواضع میں، انکساری میں یا مروت میں اس قسم کی بات کہنے والے نہیں تھے۔ وہ جو بات فرماتے ہیں سچے دل سے فرماتے ہیں کہ سب لوگوں کو میں اپنے آپ سے افضل سمجھتا ہوں۔

درحقیقت جو اس آیت نے ہمیں سبق دیا "قوا انفسکم" اپنے آپ کو بچاؤ آگ سے۔ رات کو بیٹھ کر دیکھو کہ کتنے کام آج ہم نے دن بھر میں آگ والے، جہنم کی طرف لے جانے والے کئے۔ اگر ہماری نگاہ غلط استعمال ہوئی تو جہنم کا راستہ ہم نے اختیار کیا، اگر کان غلط استعمال ہوا جہنم کا راستہ اختیار کیا، زبان غلط استعمال ہوئی جہنم کا راستہ اختیار کیا، ہاتھ پاؤں غلط استعمال ہوئے جہنم کا راستہ اختیار کیا۔ اس طرح رات کو بیٹھ کر جائزہ لے کر سوچے اور پھر ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اس پر استغفار وتوبہ کرے۔ آئندہ کے لئے عزم کرے کہ پھر میں ان کو غلط استعمال نہیں کروں گا۔ روزانہ یہ کام کر کے انسان دیکھے تو پھر ان کے اندر تبدیلی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انشاء اللہ پیدا ہوگی۔ پہلی بات تو یہ ہوئی۔ دوسرا لفظ آگے یہ فرمایا کہ "واھلیکم" اپنے گھر والوں کو بچاؤ۔ یعنی صرف اپنے آپ کو بچاکر بیٹھ جانا کافی نہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ ہم تو نماز روزہ کرتے ہیں، ہم تو

بازیں کو تے ہیں، ہم نے اپنی زندگی ٹھیک گزار لی تو صرف اتنی بات کافی نہیں بلکہ تمہارے فرائض
ں یہ بات داخل ہے کہ اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ۔ اس سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے
اچھے خاصے وہ لوگ جو پنج وقتہ نمازوں کے لئے مسجدوں میں حاضر ہوتے ہیں، وظائف و اوراد کے
بند ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے دیگر عبادتوں کی بھی توفیق عطا فرمائی لیکن ان سب کے باوجود اپنی اولاد
فرزند سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے غافل ہیں۔ ان کی اصلاح کی فکر نہیں۔ خود اپنے لئے تو
نت کا راستہ اختیار کرنے کی فکر کر لی لیکن اولاد اگر جہنم کی طرف جا رہی ہے، گھر والے غلط
استے پر پڑے ہوئے ہیں اس کی طرف کوئی دھیان نہیں، کوئی فکر نہیں۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا
کہ صاحب! ہم نے تو اپنی طرف سے بیوی بچوں کو سمجھانے اور انہیں راہ راست پر لانے کی بڑی
شش کی لیکن صاحب! زمانہ اتنا خراب اور ماحول اتنا بگڑا ہوا ہے کہ یہ لوگ زمانے کی ہواؤں
ے متاثر ہو جاتے ہیں، ہماری بات نہیں مانتے، ہم کیا کریں؟ اکثر و بیشتر یہی عذر پیش کیا جاتا ہے۔
ں میں عرض کرتا ہوں کہ یہ ایک ایسا عذر لنگ ہے کہ اس کے برابر کوئی احمقانہ عذر نہیں ہو سکتا۔
ں کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک ماں باپ اپنے بیٹے کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ کنویں میں چھلانگ لگا رہا
ہ۔ کیا ماں باپ اس بات پر اکتفا کرتے ہیں اور ایک دو مرتبہ یہ کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں کہ بیٹا!
۔ کنویں کے اندر چھلانگ نہیں لگاتے، یہ بری بات ہوتی ہے، اس سے آدمی ہلاک و برباد ہو جاتا ہے
بس۔ کیا کوئی عقلمند آدمی ان کا یہ عذر سننے گا کہ صاحب ہم نے دو مرتبہ کہہ دیا تھا اپنے بیٹے کو
نویں میں چھلانگ مت لگانا مگر اس نے لگا دی۔ دنیا میں کوئی ماں باپ جن کے اندر شفقت کا ایک
بھی موجود ہے وہ کبھی یہ کام نہیں کر سکتے۔ ان کو چین نہیں آئے گا، آرام نہیں آئے گا، ان کی زندگی
برن ہو جائے گی جب تک کہ وہ بچہ کا ہاتھ پکڑ کر کنویں سے نہ کھینچ لیں اور اس کو ہلاکت سے نہ بچالیں۔
بیاں فرمایا جا رہا ہے کہ "آگ سے بچاؤ"۔ اسی دنیا کی آگ کی مثال لیجئے۔ کوئی بچہ آگ میں جلنے
ہا ہے تو کیا ماں باپ زبانی جمع خرچ کر کے، حجت کر کے فارغ ہو جائیں گے۔ ہرگز نہیں۔ جب تک اس کو
ے سے نکال نہیں لیں گے چین نہیں لیں گے۔ لیکن دین کا معاملہ یہ ہے، آخرت کی آگ کا معاملہ یہ ہے کہ
یہ کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں کہ صاحب ہم نے دو مرتبہ سمجھایا، تین مرتبہ سمجھایا، دس مرتبہ سمجھایا لیکن نہیں مانتے
وہ جا رہے ہیں جہنم کی طرف تو جانے دو۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے نماز روزہ، دین کے مطابق
ں کر لیا تو وہ کافی ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ تمہاری ذمہ داری ہے اپنے
الوں کو بچانا۔ اگر نہیں بچایا تو صرف انہیں کی پکڑ نہیں ہوگی بلکہ تمہاری بھی گردن پکڑی جائے گی۔
ریم سرور دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ ایک طرف یہ تعلیم دی

کہ تم میں سے بہترین فرد وہ ہیں جو اپنے گھر والوں کے لئے اچھے ہوں اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب سے بہتر برتاؤ کرتا ہوں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی رعایت کا یہ عالم کہ ایک مرتبہ رات کے وقت حضرت جبرئیل امین دروازے پر تشریف لائے تو باہر سے کوئی دستک دینے کا طریقہ اختیار کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے کا کہ رات کا وقت خلوت کا وقت ہوتا ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر جبرئیل امین کے پاس جارہے ہیں کہ شاید وحی کا پیغام لے کر آئے ہوں اور کوئی اہم کام ہو۔ آپ بستر سے اٹھے تو دھیرے سے کھڑے ہوئے آہستگی کے ساتھ دروازہ کھولا تاکہ حضرت عائشہ رضی کی آنکھ نہ کھل جائے، ان کی نیند میں خلل نہ آجائے۔ کون اتنی رعایت کرتا ہے لوگ تو بیوی کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ اگر کسی کام کے لئے جارہے ہیں تو دماغ میں یہ ہوتا ہے کہ ان کا تو فرض ہوتا ہے کہ یہ جاگ کھڑی ہوں، ہمارے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ لوگ رات کو بیدار ہوتے ہیں تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے تو چاہتے ہیں کہ سب بیدار ہوجائیں آپ کے ساتھ۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کسی کی نیند میں خلل نہ آئے۔ رعایت کی حالت یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کمسن ہیں اس لئے احساس ہے کہ ان کے دل میں کچھ شوق بھی پیدا ہوتے ہوں گے تو ان شوقوں کی رعایت کرنے کا بھی معمول ہے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رض کے ساتھ کسی میدان میں سے تشریف لے جارہے ہیں جہاں اور کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ حضرت عائشہ رض سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا تم دوڑ لگاؤ گی؟" حضرت عائشہ رض نے جواب دیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور لگاؤں گی"۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ دوڑ لگائی۔

یہ سب ان کی دلداری کے لئے تاکہ ان کو خوشی حاصل ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ عورتیں گھر کے اندر مقید رہتی ہیں اس واسطے مردوں کا فرض ہے کہ ان کی دلداری کریں۔ اس کا نمونہ پیش کر دکھایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہوتے، کیسے ہی پریشان کن اور دشوار حالات ہوتے گھر میں داخل ہوتے وقت مسکراتے ہوئے داخل ہوتے۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد باہر کے افکار و پریشانیاں سنا کر ان کو پریشان نہیں کرتے۔ ایک طرف تو رعایت کا یہ عالم تھا تو دوسری طرف وہی عائشہ صدیقہ رض سے اللہ تعالیٰ کے احکام میں کوئی ادنیٰ کمی ہو جائے تو نظر انداز یا رعایت نہیں فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں اس کا واقعہ درج ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رض فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میرے دل میں یہ آیا کہ اپنے گھر میں پردہ لٹکا دوں۔ عورتوں کی خواہش ہوا کرتی ہے گھر کے زیب و زینت و گھر کو سجانے کی۔ تو گھر کو سجانے کی خاطر ایک طاقچہ پر پردہ لٹکا دیا جس پر بعض روایات کے مطابق ایک گھوڑے کی تصویر تھی جس کے پر تھے

آج کل کی طرح اس پر عریاں تصویریں نہ تھیں ۔ اور اس وقت تک معلوم بھی نہ تھا کہ تصویریں ناجائز ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ باہر ہی سے چہرۂ انور پر تغیر آیا اور فرمایا کہ "عائشہؓ! جب تک یہ پردہ یہاں سے تم نہیں ہٹاؤ گی اس وقت تک میں گھر میں داخل نہیں ہوں گا کیونکہ اس کے اوپر تصویریں بنی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے گھروں میں تصویریں لٹکانے سے منع فرمایا ہے ۔ اب وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اتنی دلداری فرماتے ہیں جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کی کوئی بات آتی ہے تو وہیں اتنا ٹوک دیتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فوراً اس کپڑے کو اتار کر پھاڑ دیتی ہیں اور اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے ہیں۔

تو اصول یہ نہیں کہ گھر والے جو بھی کر رہے ہیں انہیں کرنے دو بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی اور احکام کے خلاف کوئی کام ہو رہا ہے چاہے وہ گھر والے کر رہے ہوں یا اولاد کر رہی ہو یا کوئی کر رہا ہو۔ اس سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش انسان کے ذمے فرض ہے ۔ ہاں کوئی شخص جب انتہائی کوشش کرلے اور واقعتاً انتہائی کوشش کرنے کے باوجود راہ راست پر نہ آئے پھر بے شک وہ مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا مسلمان نہیں ہوا ۔ لوگوں کی زبان پر یہ مثال اکثر رہتی ہے کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا مسلمان نہیں ہوا۔ لیکن یہ اس وقت جب کہ سال ہا سال محنت کرلی۔ لیکن ہدایت تو اس کے مقدر میں نہیں تھی ۔ بے شک اس کا عذاب تو حضرت نوحؑ پر نہیں ہوا۔ لیکن اولاد کی طرف سے بے توجہی اور بے اعتنائی کے مسئلہ سے ہم جس طرح گزرتے ہیں ان سے خدا کے لئے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور دوسروں کو بھی بچائیں اور اپنے گھر والوں کو دین کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔

غرض میں اس کی عملی تدبیر پیش کرتا ہوں اور اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ انشاء اللہ اس آیت پر عمل کرنے کا راستہ نکل آئے گا اور وہ کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہمارے فرائض میں داخل ہے کہ اپنے آپ کو، اپنی اولاد کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچائیں ۔ اس وقت اس آگ کا احساس نہیں ہوتا ۔ لیکن نہ جانے کب آنکھ بند ہو جائے ۔ پہلے آنکھ بند ہونے کے لئے لوگ سوچا کرتے تھے کہ بیماری آئے گی تبھی آنکھ بند ہوگی۔ اب تو بیٹھے بیٹھے رخصت ہو جاتے ہیں ۔ اچھے اچھے ہنستے کھیلتے اس دنیا سے گزر جاتے ہیں ۔ کچھ معلوم نہیں ۔ موت تو پہلے ہی غیر یقینی تھی لیکن اس نئی زندگی نے بھی موت کو اتنا غیر یقینی بنا دیا کہ چاروں طرف موت منڈلا رہی ہے ۔ نہیں معلوم کس وقت سڑک پر نکلیں اور حادثہ کا شکار ہو جائیں ۔ نہیں معلوم کس وقت بجلی کے تار کو چھیڑیں اور موت آ جائے اور نہیں معلوم کس وقت کون سی رگ آ لپیٹے اور اسی میں موت واقع ہو جائے ۔ تو جانا تو وہاں ہے ۔ اور یہ بھی طے شدہ

ت ہے کہ اگر ایمان ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، اگر ایمان ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے جانا بھی ہوتا ہے، اگر ایمان ہے تو یہ جنت و جہنم کوئی حقیقت رکھتی ہے تو پھر یہ بھی پتہ ہے کہ ان بُرے اعمال کا ایک بُرا نتیجہ آخرت میں وہاں دیکھنا ہوگا۔ اس سے بچانے کی فکر اپنے آپ کو چاہئے تو اس کے لئے کم از کم اتنا تو کریں کہ چوبیس گھنٹے میں سے کچھ وقت، ۱۰ منٹ، ۱۵ منٹ، آدھا گھنٹہ نکال لیں اس آیت پر عمل کرنے کے لئے۔ صبح سے شام تک ساری دنیا کے ہزاروں دھندوں میں آپ مشغول رہتے ہیں لیکن ۱۰ منٹ، ۱۵ منٹ، آدھا گھنٹہ رات کو سونے سے پہلے اس کام کے لئے نکال لیں کہ اپنے آپ کو، اپنی اولاد کو، اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کا راستہ اختیار کریں اور اس میں جمع ہو کر کوئی دین کی کتاب پڑھیں۔ اولاد کو، بیوی بچوں کو پڑھ کر سنائیں اور پھر اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم نے صبح سے شام تک کیا اعمال کئے ہیں، کیا افعال کئے ہیں اور کون سا کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق تھا، کون سا خلاف تھا، کون سا جنت کی طرف لے جانے والا تھا، کون سا جہنم کی طرف لے جانے والا تھا۔ جو کام ایسے ہوئے ہیں جو جہنم کی طرف لے جانے والے ہیں اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا راستہ کھولا ہوا ہے۔ جب تک نزع کی حالت طاری نہیں ہو جاتی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت عام ہے جب چاہو توبہ کر لو، جب چاہو واپس آ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا آسان بنایا ہے زندگی کو سنوارنا کہ خواہ ۷۰ برس کا کوئی کافر ہو، مشرک ہو، فاسق ہو، فاجر ہو، ساری عمر انسان نے برائیوں میں گزاری ہو، ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور بیٹھ کر سچے دل سے یہ کہہ دے أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّي مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْكَ اے اللہ تعالیٰ میں استغفار کرتا ہوں، میں تائب ہوتا ہوں، میں توبہ کرتا ہوں۔ ستر برس کے سارے فسق و فجور، سارے کفر و شرک ایک لمحہ میں ختم ہو جائیں۔ فرمایا کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ فَلَا ذَنْبَ لَهٗ۔ جو توبہ کر لے وہ ایسا ہے کہ اس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا۔ اتنا آسان راستہ بنا دیا۔ روزانہ بیٹھ کر اپنا جائزہ لیں، توبہ کر لیں اور ساتھ میں دعا کر لیں کہ یا اللہ تعالیٰ میں آپ کے حکم پر عمل کرنا چاہتا ہوں، خود بھی جہنم کی آگ سے بچنا چاہتا ہوں اور اپنے گھر والوں کو بھی اس جہنم کی آگ سے بچانا چاہتا ہوں۔ یا اللہ تعالیٰ مجھے اس کی توفیق عطا فرمائیے۔

موجودہ زمانے میں بہت خیال ہوتا ہے کہ صاحب آگ سے کیسے بچیں؟ چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی ہے، باہر نکلو تو آگ ہے، کسی انسان سے بات کرو تو آگ ہے، گھر کے اندر داخل ہو تو آگ ہے۔ آج کل تو اس آگ کے اتنے ذرائع پھیلے ہوئے ہیں کہ ہر طرف فسق و فجور کا بازار گرم ہے، گھر گھر کے اندر فسق و فجور ہے۔ پہلے فسق و فجور صرف بازاروں میں ہوا کرتے تھے

نصیب ہوا کرتے تھے۔ لیکن ٹیلی ویژن کی برکت سے گھر کی خوابگاہوں تک اندر داخل ہو گئے۔ حالات ہمارے کس طرح بدلے، کیسے بتائیں؟ اس آگ سے اپنے آپ کو کس طرح بچائیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ اگر یہ احساس بیدار ہو جائے کہ یہ آگ ہے تو اس سے بچنے کا طریقہ خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اب تک یہ آگ ہونے کا احساس نہیں۔ جیسے ایک نادان بچے کے سامنے آگ کے انگارے ہوں تو وہ سمجھتا ہے کہ بڑا خوشنما کھلونا ہے اور اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ یہی ہمارا حال ہو گیا ہے۔ مولانا رومیؒ کے خیال کے مطابق جتنی مخلوق ہے سب بچے ہیں، نادان ہیں جزو مرد خدا جس کی لو اللہ سے لگی ہوئی ہے۔ تو حاصل کلام یہ کہ آگ ہونے کا احساس ختم ہو رہا ہے۔ یہ احساس پھر اس طرح پیدا ہوگا کہ رات کو بیٹھ کر آپ دین کی کتابیں پڑھیں گے تو اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سامنے آئیں گے۔ جب آگ ہونے کا پتہ چلے گا تو اس سے بچنے کی ہمت بھی پیدا ہوگی۔ اگر ہمت پیدا نہ ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ یا اللہ! ہمت دینے والے بھی آپ ہی ہیں، توفیق دینے والے بھی آپ ہی ہیں، دلوں کو بدلنے والے بھی آپ ہی ہیں، سب کچھ آپ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ یا اللہ! میں اس راستے پر چلنا اور اپنے آپ کو اس آگ سے بچانا چاہتا ہوں لیکن میں اپنے نفس کے ہاتھوں، شیطان کے ہاتھوں، ماحول کے ہاتھوں اور معاشرے کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہوں۔ یا اللہ آپ ان سب چیزوں پر غالب ہیں اور آپ ابراہیم خلیل اللہ کے لئے اس آگ کو گلزار بنا سکتے ہیں۔ میں بھی آپ کا ایک بندہ ہوں میں بھی اس آگ سے بچنا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے فضل وکرم سے مجھے اس آگ سے بچا لیجئے اور میرے اندر ہمت عطا فرمائیے، مجھے توفیق دیجئے، مجھے طاقت عطا فرمائیے کہ میں اپنی زندگی کو آپ کی مرضی کے مطابق ڈھال سکوں۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ دعا کر لیا کرے کہ یا اللہ مجھ سے نہیں ہوتا میری ہمت جواب دے جاتی ہے، میری طاقت جواب دے جاتی ہے۔ آپ ہمت دینے والے ہیں مجھے ہمت دے دیجئے۔ فرماتے ہیں کہ میں ضمانت لیتا ہوں کہ ان شاء اللہ اس کے حالات میں تغیر پیدا ہوگا آپ بھی روزانہ رات کو چالیس دن تک یہ دعا مانگ کر تو دیکھئے کہ پھر کیا انقلاب برپا ہوتا ہے لیکن ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگ لیں۔

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ ذرا آپ تصور کریں کہ ہم میدان حشر میں کھڑے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی ہو رہی ہے۔ باری تعالیٰ پوچھ رہے ہیں کہ تم نے فلاں، فلاں

گناہ کا ارتکاب کیا، کیوں نہیں بچے؟ آپ جواب میں وہی عذر پیش کرتے ہیں کہ یا اللہ کیا کرتے۔ معاشرہ ہی خراب تھا، ماحول ہی بگڑا ہوا تھا، قدم قدم پر گناہ کی دعوتیں تھیں، ماحول، گھر، بازار سب کچھ بگڑا ہوا تھا۔ ایسے میں ہم اپنے آپ کو کیسے سنبھالتے، ہم تو مغلوب ہو گئے تو باری تعالیٰ اگر جواب میں یہ فرما دیں، اچھا چلو یہ تمھاری بات تو ہم نے سن لی کہ معاشرہ خراب تھا، ماحول خراب تھا تو تم نے ہم سے مدد کیوں نہیں مانگی؟ ہم سے کیوں نہیں کہا کہ یا اللہ! میں تیری راہ پر چلنا چاہتا ہوں لیکن یہ بگڑا ہوا ماحول میری ٹانگ کھینچ لیتا ہے۔ کیا تم نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا تھا کہ ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؟ کیا ہماری قدرت میں یہ بات نہیں تھی کہ تمھیں اس معاشرے کی سختی سے بچا لیتے؟ لیکن تم نے ہمیں پکارا تک نہیں، تم نے ہم سے مانگا تک نہیں، تمھیں زبان دی تھی، تمھیں دعا کرنے کی دعوت بھی دی تھی۔ قرآن کریم میں جا بجا ارشاد کیا تھا کہ مجھے پکارو میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ تمھارے سامنے واقعات بیان کئے تھے انبیاء علیہم السلام کے جن کے ساتھ وہ معاملات ہوئے جن کو عقل قبول نہیں کرتی۔ کیسے کیسے معجزات دکھائے گئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کو دیکھتے ہوئے الاؤ کے اندر پھینک دیا جا رہا ہے لیکن ہم نے آگ کو حکم دیا تھا کہ یا نار کونی بردا وسلاما علیٰ ابراھیم۔ اے آگ ٹھنڈی ہو جا حضرت ابراہیمؑ پر اور گلزار بن جا۔ یاد رکھو تم مدد کو پکارتے، مدد مانگتے پھر ہم مدد نہ کرتے تو تم کہتے کہ یا اللہ آپ نے مدد نہیں فرمائی لیکن تم نے پکارا ہی نہیں۔ تو رات میں روزآنہ بیٹھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرنے کا معمول بنا لیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی دشمنی ہے کہ ہمیں زبردستی جہنم میں ڈھکیل دے گا۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ اے بندو ہم تمھیں عذاب دے کر کیا کریں گے۔ ہم تو تمھیں راہ راست پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جتنا تمھارے بس میں ہے اتنا عمل کرو پھر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ پھر دیکھو اللہ تبارک وتعالیٰ کیسا انقلاب برپا کرتے ہیں، زندگیاں بدل جائیں، انقلاب آجائیگا۔

ایک گزارش آپ حضرات کی خدمت میں کرنی تھی کہ ہم جب جلسوں، مجلسوں سے اٹھیں تو دامن جھاڑ کر نہ اٹھیں بلکہ یہ عزم و ارادہ کر لیں کہ جو باتیں آپ سے دلسوزی کے ساتھ عرض کی گئی ہیں اس کی پابندی کریں اور روزآنہ رات کو پندرہ منٹ تک اپنے دن بھر کے افعال و اعمال کا جائزہ لیں اور جو بھی کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں ان کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے استغفار و توبہ کریں اور پابندی کے ساتھ رات میں سب گھر والے بیٹھ کر کم از کم پندرہ منٹ تک کوئی دین کی کتاب پڑھیں

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

بخشے تو رحمت، نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

مولانا ہادی نقشبندی

پروفیسر شروانی کی کچھ یادیں کچھ باتیں

چھ سال ہوئے ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ کی ۴/ اور ۱۵/ ستمبر ۱۹۸۰ء کی تاریخ اور پیر کا دن تھا کہ جو سیارہ مدینۃ العلوم علی گڑھ سے طلوع ہوا تھا وہ افق دکن میں ٹوٹ کر گورستان بشیر باغ حیدرآباد میں غروب ہوکر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

یہ تھے برصغیر کے ممتاز مورخ، محقق، ادیب اور بین الاقوامی شہرت کے حامل پدما بھوشن پروفیسر ڈاکٹر ہارون خاں شروانی مرحوم و مغفور جو اپنے والد ماجد حضرت حاجی موسیٰ خاں شروانی نور اللہ مرقدہ کی ریاست دتا وَلی ضلع علی گڑھ میں ۳۱/ مارچ ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔

حاجی موسیٰ خاں شروانی رؤسائے علی گڑھ میں ممتاز، سرسید علیہ الرحمۃ کے شریک کار ایم۔اے۔او کالج کے ٹرسٹی اور قیام مسلم یونیورسٹی کے بعد آخر وقت تک اس کی کورٹ (سنیٹ) کے رکن رہے، مرحوم نے اپنی تصنیف "اسلامی خلافت کا کارنامہ" "فتح مبین" میں "گزارشِ احوال واقعی" کے تحت اپنے لائق و فائق فرزند سے متعلق جو کچھ لکھا اور وصیت کی اس اہم دستاویز کا مختصر اقتباس پیش ہے جو پروفیسر شروانی مرحوم کی علمی و تعلیمی زندگی پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

"....... میری عمر کا اکسٹھواں [۶۱] سال ہے، قویٰ میں اضمحلال شروع ہوگیا ہے۔ بینائی نگاہ میں فرق آگیا ہے........ اس کتاب میں ابھی کام باقی ہے........ میں اس کی تکمیل کرسکوں گا یا نہیں........ میرا بڑا لڑکا حاجی محمد ہارون خاں شروانی اللہ کا شکر ہے کہ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نامور طبقہ میں شمار کیا جاتا ہے، وہ انگلستان کی مشہور یونیورسٹی آکسفورڈ

کا عالم ہے ۔ ایک طرف فرنچ ، لاطینی اور انگریزی زبانیں جانتا ہے اور سیاست و تاریخ کا طالب علم ہے ۔ اور انگلستان کی فن تاریخ کی شاہی جماعت کا رفیق ہے اور دوسری طرف عربی، فارسی اور اردو زبانیں بھی جانتا ہے اور قرآن مجید اور اسلامیات کا طالب علم ہے غرض اللہ کے فضل سے وہ پوری اہلیت رکھتا ہے کہ میری اس کتاب کا جو حصہ باقی رہ جائے وہ اس کو پورا کرے گا ۔ آج کل وہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں .... فن تاریخ کے صدر شعبہ کی خدمات انجام دے رہا ہے .... انشاء اللہ میری اس علمی شرط و وصیت کو ہارون شروانی ضرور پورا کرے گا .... موسیٰ شروانی ساکن دتاؤلی (دہلی ۲/شوال ۱۳۷۵ ہجری)

اس موقع پر شاید یہ اضافہ بے جا نہ ہوگا کہ شروانی مرحوم کس قدر مراہٹی سے واقف تھے اور تیلگو نہیں جانتے تھے ۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں صوبائی لسانی تقسیم کے بعد، جن دنوں میں اُن کے پاس ٹھیرا ہوا تھا ، دیکھا کہ ایک تیلگو استاد انھیں باقاعدہ آکر پڑھا رہا ہے ، میں نے عرض کیا کہ اس ضعیف العمری میں اس کی کیا ضرورت ہے ، فرمایا " صوبائی زبان سے واقفیت ضروری ہے تاکہ سرکاری اطلاعات و مراسلات کے علاوہ جب میں کہیں ملنے جاؤں تو صاحب خانہ کے نام کی تختی پڑھ سکوں" ۔ ان کی یہ حوصلہ مندی اور علو ہمتی نوجوانوں کے لئے لائق رشک و قابل عمل ہے ۔

شروانی مرحوم کی تعلیم و تربیت دینی و مشرقی ماحول میں ہوئی تھی ، علی گڑھ کے بعد یورپ میں برسہا برس قیام اور حصول اعلیٰ تعلیم و اسفار کے باوصف وہ اپنی ہندوستانی تہذیب ، مشرقی آداب و شائستگی اور اسلامی تمدن و معاشرت کے دلدادہ اور اس کے اعلیٰ اقدار کے ہمیشہ پابند رہے ، اپنے گوناگوں اوصاف حمیدہ و شمائل جمیلہ وہ شرافت و محامد کے بیکراں قدیم ارفع افراد میں تھے جو اسلامی و انسانی کردار کے حامل ، چھوٹوں پر محبت و شفقت اور بزرگوں کا اکرام و احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے

شروانی مرحوم احکامات شرعی و شعائر اسلامی کے سختی سے پابند تھے ۔ اواخر عمر میں فالج کے اثر سے ارکان نماز کی کامل ادائی کے قابل نہ رہے تھے ، اس کے باوجود آخری بے ہوشی تک انتہائی پاکی و طہارت کے اہتمام سے ہر نماز پابندی سے اشاروں میں ادا کی ، حتیٰ کہ تمام حقوق العباد کی ادائی کے ساتھ ۔ تحفہ عید الفطر سنہ ۱۳۹۰ ہجری میں خلف الرشید مسعود احمد شروانی کے ذریعہ اپنے بچوں کے لئے حسب ذیل تحریری وصیت چھوڑی ۔

" میں نے قرآن مجید کے حسب ذیل احکام کو اپنا حرز جان بنانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے الحمد للہ مجھے اطمینان قلبی حاصل ہوا ہے اور اپنی بساط کے بموجب تھوڑا بہت کام کرسکا ہوں "

۲ــــ ان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ (اگر وہ صلح و سلامتی کی طرف جھکیں تو تم بھی ان کی طرف جھکو اور خدا پر بھروسہ رکھو)۔

۳ــــ اصلحوا بین اخویکم (اپنے بھائیوں کے درمیان صلح رکھو)

۴ــــ الفتنة اکبر من القتل (فتنہ (جھگڑا) قتل سے بھی بڑا ہے)

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

پروفیسر شروانی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جنھیں اپنے اصول بہت عزیز ہوتے ہیں اور وہ کسی قیمت پر بھی اس کا سودا کرنے تیار نہیں ہوتے، وہ گفتار ہی کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے، حق گوئی و بے باکی ان کے کردار کے نمایاں وصف ہیں۔ ان کے انتہائی اصول پسند ہونے کے باعث اکثر لوگ ان سے خفا رہتے، ۱۹۶۵ء کے اواخر میں مسلم یونیورسٹی شدید بحران سے گزر رہی تھی اور علیگ برادری یونیورسٹی کے حصول اقلیتی کردار کی تحریک چلا رہی تھی، شروانی مرحوم کا اوڑھنا بچھونا علیگڈھ تھا وہ سر سید علیہ الرحمۃ کے انتہائی عقیدت مند اور مسلم یونیورسٹی کورٹ (سینیٹ) کے ممبر تھے۔ جب میں نے ان کی خدمت میں بہ حیثیت نائب صدر آل انڈیا مسلم یونیورسٹی کنونشن کا تونسل، اس کی رکنیت کی درخواست کی تو مجھ سے انتہائی تعلق خاطر کے باوجود اسے قبول نہ کیا کہ ان کے اصول کے منافی تھی۔

پروفیسر شروانی کی ہمہ جہت عبقری شخصیت مشرق و مغرب کو اپنے میں سموئے ہوئے تھی۔ وہ اپنی ذات سے ایک عہد و تاریخ تھے۔ وہ نہ صرف ادیب و انشا پرداز تھے بلکہ علم تاریخ و سیاست میں ممتاز بلند مقام کے ساتھ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہم سب کے لئے موجب فخر تھے۔ تاریخ ہند و عہد قدیم اور اسلامی کے علاوہ سیاسیات اور علم آثار قدیمہ و اشیاء عتیق پر ان کی گہری نظر و مطالعہ تھا۔ انھیں وضع اصطلاحات، اردو اور اس کے رسم الخط سے بھی خاص دلچسپی رہی ہے چنانچہ اس سلسلے کے ان کے مضامین و کتابچے بڑے خیال انگیز ہیں۔ انگریزی و اردو میں مقبول مقالات و کتابچے تقریباً پچاس کے لگ بھگ ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بعض مستند کتب و بیانات کی روشنی میں "بھاگ متی" اور "بھاگ نگر" کے عدم و وجود پر ایک بسیط کتابچہ شائع کیا جس کی وجہ مرحوم اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور میں قدرے بدمزگی آگئی تھی جس کے دفع کرنے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل ہے۔

۱۹۳۶ء کی ۲۴/ و ۲۵/ اکتوبر کو "سلطان جہاں منزل" علی گڑھ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی دعوت پر انجمن ترقی اردو کی پہلی اردو کانفرنس راجہ محمد امیر احمد خان محمود آباد کی صدارت میں ہو رہی تھی، کانفرنس سے قبل پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے پروفیسر شروانی سے مجھ

ملوایا، اس وقت سے دم واپسین تک مرحوم کی شفقت و محبت سے استفادہ کا بھرپور موقع ملا۔ جب کبھی میں ان سے ملنے گیا یا ان کے یہاں مقیم ہوا، ہر وقت انھیں کتب خانہ میں کسی نہ کسی مسئلہ کی تحقیق میں معروف پایا۔ نیز ان کا اسٹنٹو ٹاینیسٹ آخری علالت تک اپنے اوقات مقررہ میں موجود اور مستقل طور پر بجا آوری فرائض کرتا۔ باوجود کم آمیزی و کم گوئی وہ ہر ایک سے خلوص و محبت سے ملتے اور امکانی طور اعانت و رہنمائی فرماتے۔

ایک شام ہم سب "مسعود منزل" (آج کل اس مکان میں ڈاکٹر گورنر رہیں) کے ڈائننگ ہال میں شریک طعام تھے کہ شروانی مرحوم نے فرمایا "سنہ ۱۹۱۴ء و سنہ ۱۹ء کے درمیان میں لکھنو میں اور جواہر لال الہ آباد میں لیگل پریکٹس کرتے تھے میں اکثر جب کبھی الہ آباد ہائی کورٹ جاتا جواہر لال سے ضرور ملتا۔ ایک وقت جواہر لال کہیں باہر گئے ہوئے تھے، پنڈت موتی لال نہرو سے جو میرے والد کے ملنے والے تھے ملاقات ہوئی تو پنڈت جی نے فرمایا، بارون رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ میں وقت مقررہ پر "آنند بھون" پہنچا تو ڈائننگ ہال کو انگریزی انداز میں آراستہ، دبیز الیسو ٹیبل کلاتھ پر اعلیٰ قسم کی انگلش کراکری کھانوں کی بھرمار یانی، کباب، روغن جوش وغیرہ دیکھ کر میں نے عرض کیا پنڈت جی میں تو کچھ اور کھانے آیا تھا لیکن آپ تو وہی کچھ کھلوا رہے ہیں جو میں اکثر کھاتا رہتا ہوں۔ فرمایا بارون، میں اچھی چیزوں کا عاشق ہوں، انگریزوں کے کھانے کے طریقے سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے پکوانوں سے بہتر کسی اور قوم کے کھانے نہیں ہوتے۔ باورچی خانہ برہمنوں سے زیادہ صاف و ستھرا کسی کا نہیں ہوتا۔ لہذا میرا طریقہ طعام انگریزوں کا، کھانے مسلمانوں کے اور باورچی خانہ برہمنی ہے۔

سنہ و سال تو یاد نہیں رہا۔ مجھ سے پروفیسر شروانی مرحوم نے فرمایا تھا کہ وہ کسی بین الاقوامی کانفرنس میں جو مدراس میں ہو رہی تھی جامعہ عثمانیہ کی جانب سے شریک ہوئے جس میں تقریباً ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے نمائندے بھی موجود تھے، کانفرنس کی کسی نشست میں یہ سوال اٹھا کہ تمام دنیا کی اخلاقی کتب کی ایک فہرست تیار کی جائے چنانچہ تمام شرکا سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی منتخب کتب کی فہرست لکھیں، پروفیسر شروانی کے فوری طور پر فہرست پیش کر دینے پر سب متعجب ہوئے لیکن جب یہ فہرستیں پڑھی گئیں تو شروانی مرحوم کی فہرست میں صرف "کلام اللہ" کو دیکھ کر سب کو اعتراض ہوا کہ یہ اخلاقی نہیں ایک مذہبی کتاب ہے اور اس پر کافی ردوقدح ہوئی چنانچہ شروانی مرحوم نے رات میں جاگ کر اگلے روز کے لئے ایک مبسوط بیتالیس ۴۵ صفحہ کا مقالہ لکھا جس میں دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا کہ دنیا کی عام کتابوں میں "کلام اللہ" سب سے بہتر و افضل اخلاقی کتاب ہے۔ یہ تھی شروانی مرحوم کی غیرت دینی و حمیت اسلامی اور اظہار صداقت و حق گوئی۔

(باقی بر صفحہ ۵)

قاضی جلیل احمد

آتشِ چنار

(ایک تبصرہ)

شیر کشمیر شیخ عبداللہ کی یہ خود نوشت سوانح حیات جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور جس کو علی محمد اینڈ سنس نے سری نگر کشمیر سے شائع کیا ہے اس لحاظ سے دلچسپ اور پُرکشش ہے کہ مسئلہ کشمیر سے متعلق معلومات ہمیں ایک ایسے شخص کی زبانی حاصل ہوتی ہیں جو اس ڈرامے کا سب سے بڑا اور سب سے اہم کردار رہا ہے۔ ان اوراق میں شیخ صاحب نے اپنی پیدائش سے لے کر تادم واپسیں کشمیر کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی امور اور مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک پچھلی ہوئی اور پس ماندہ اکثریت کے ایک مفلوک الحال فرد کی حیثیت سے ان کی زندگی بڑی جدوجہد اور کشاکش اور بڑے ابتلا اور آلام کی منزلوں سے گذری ہے امتحان وابتلا کا یہ سلسلہ وقفہ وقفہ سے ساری عمر جاری رہا جس نے ان کے احساسات کو بہت ہی تلخ بنا دیا تھا۔ جذبات اور احساسات کی یہی تلخی ہماری کتاب میں جاری وساری ملتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین میں سے بجز ایک دو کے کوئی بھی ان کے نوکِ نشتر سے امان نہ پاسکا۔ اس گراں قیمت (۱۲۵ روپے) کتاب کو خریدنے کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے متعلق شیخ صاحب کے خیالات معلوم کئے جائیں۔ یعنی یہ کہ انھوں نے کیوں پاکستان پر ہندوستان کو ترجیح دی؟ وہ کیا حالات تھے جنھوں نے دہلی کے ارباب اقتدار کو ان کا مخالف بنایا؟ اور پھر کن حالات میں انہی پنڈت نہرو کی بیٹی اندرا

۹۔ کولسٹن روڈ، فاسٹ گیٹ۔ لندن ای/۷ (یوکے)

گاندھی نے دوبارہ انھیں کشمیر کی وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر لا بٹھایا؟ میرے خیال میں ان کی زندگی کے یہی دو بڑے واقعات ہیں یعنی وزارتِ عظمیٰ سے جیل کی کوٹھری اور قید و جلاوطنی کی ایک طویل مدت گذارنے کے بعد دوبارہ وہی کرسی اور وہی مرتبہ۔ ان ہی دو اہم واقعات کے تانے بانے ان کی ساری لائف اسٹوری پر محیط ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں ان کے تعلق سے جو کچھ ہوا اور ان کی نسبت جو کچھ کہا گیا ان کے وجوہ کی تلاش ۱۹۵۳ء سے پہلے کشمیر کے طبقہ واری مفادات میں تلاش کرنا ضروری ہے جس کے وہ زائیدہ اور پروردہ تھے۔ اسی طرح ۱۹۷۵ء میں وزارتِ عظمیٰ پر ان کی دوبارہ بحالی کو درمیانی واقعات سے صرفِ نظر کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

شیخ صاحب نے اپنے سیاسی کیریر کی ابتدا تو کشمیر مسلم کانفرنس سے کی تھی لیکن جلد ہی انھوں نے لفظ مسلم سے چھٹکارہ حاصل کر لیا اور نیشنل کانفرنس کے صدر بن گئے لیکن مسلم کانفرنس کے دور میں بھی وہ ہمیشہ غیر مسلموں کو عوامی حقوق کی جد و جہد میں مسلمانوں کے ساتھ شانہ بشانہ حصہ لینے پر اُبھارا کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء ہی سے کشمیر کی سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور گو ابتداً ان کی سیاست زیادہ تر کشمیر کے مسلمانوں ہی کے محور پر گھومتی تھی لیکن کشمیر میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی وجہ سے جو بھی تحریک ان کے نام اور ان کے حقوق کے لیے شروع کی جاتی وہ خواہی نخواہی عوامی تحریک بن جاتی تھی۔ کشمیر کی مسلم کانفرنس بھی اس لحاظ سے عوامی تحریک تھی کہ وہ صدیوں کے پسے ہوئے بے دست و پا عوام کے مفاد میں شروع کی گئی تھی لیکن اس عوامی تحریک کے ادارے پر مسلم کا لیبل لگا کر اس کے دروازے ان غیر مسلم عوام پر بند کرنا قرینِ مصلحت نہ تھا جو غریب مسلمانوں ہی کی طرح اس طبقہ واری سماج کی چکی میں پسے جا رہے تھے چنانچہ خود علامہ اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح نے شیخ صاحب کو اس جانب متوجہ کیا۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ کشمیریوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ایک متحدہ تنظیم میں شیرازہ بند ہو جائیں۔ اور مسلم کانفرنس کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھول دیں۔ اسی طرح قائدِ اعظم [...]ھوں کہ ریاست میں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں اس لیے [...]ن کا فرض بن جاتا ہے کہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیفِ قلوب [...] اقتصادی کارڈ کا انھیں لازم و ملزوم بیمہ سمجھ کر ان کا

بھرپور تعاون حاصل کریں۔

لیکن یہ مشورے ۱۹۳۸ء کے پہلے کے تھے جس کے بعد ایک طرف علامہ اقبال کا انتقال ہوگیا تو دوسری طرف آنے والے دس برسوں میں حالات ایسے ہوتے چلے گئے جنھوں نے شیر کشمیر اور قائداعظم کی راہیں جُدا کردیں۔ اُن دونوں کے بیچ اختلافات کی دیوار حائل ہوتی چلی گئی' جس کا اظہار شیخ عبداللہ اس طرح سے کرتے ہیں:

" ... بہرحال بات جناح صاحب کے دورہ کشمیر کی ہورہی تھی۔ وہ کشمیر سے چلے گئے اور تلخ اور کڑوے انسان کی طرح چلے گئے۔ اس کے بعد جو تقدیر ساز واقعات پیش آئے اُن میں جناح صاحب کے مزاج کی کڑواہٹ کا بڑا زبردست حصہ تھا۔ انھوں نے پھر کبھی مُڑ کے نہیں دیکھا اور نیشنل کانفرنس اور اس کے زعما کے خلاف دل میں رنجش برقرار رکھی۔ اس کے جو خطرناک اور المناک نتائج برآمد ہوئے ان کا علم تاریخ کے ہر طالب علم کو ہے۔ کشمیر کی گتھی کے بہت سے پیچ وخم جناح صاحب مرحوم کی بے لچک طبیعت اور ان کی غیر جمہوری افتاد طبع سے جڑے ہوئے ہیں۔"

.... اس کے برخلاف کانگریسی نیتاؤں اور خصوصاً پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کے روابط دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے چلے گئے۔ شیخ صاحب نے ان تمام امور پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جس سے یہ بات پوری طرح سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں کشمیری سیاست کا جھکاؤ کس طرف کو تھا اور کشمیری لیڈر عموماً اور شیخ عبداللہ خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں سے کس کی آواز پر لبیک کہہ سکتے تھے۔

۱۹۴۶ء کے کیبنٹ پلان کے بعد سے ہی شیخ عبداللہ نے کشمیر چھوڑ دو تحریک شروع کی انھوں نے کہا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد دیسی ریاستوں میں اقتدار اعلیٰ راجوں' مہاراجوں اور بادشاہوں پر نہیں بلکہ ریاستوں میں رہنے والے عوام پر عود کرنا چاہیئے۔ اس مہم میں پنڈت نہرو اور کانگریس نے ان کا بھرپور ساتھ دیا جب کہ مسلم لیگ میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ بلکہ مسٹر جناح نے تو شیخ عبداللہ کی کشمیر چھوڑ دو تحریک کو بیرونی عناصر کی شہ پر شروع کی گئی غنڈوں کی تحریک قرار دیا تھا۔ شیخ عبداللہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جہاں کانگریس اور اس کے لیڈروں نے ہمارا ساتھ دیا وہاں کانگریسی پریس نے مہاراجہ کی حمایت کا

اسی طرح جہاں مسلم لیگ کی لیڈر شپ نے ہماری مخالفت کی وہاں لاہور کے لیگی اور مسلم پریس نے ہماری حمایت کی اور مسلم لیگ کی پالیسی کے خلاف کھلم کھلا اداریئے لکھے شورش کاشمیری اور حفیظ جالندھری نے تحریک کے حق میں پُرجوش نظمیں کہیں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کی دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں اس وقت وہ کشمیر چھوڑ دو تحریک کی پاداش میں تین سال کی جیل کاٹ رہے تھے لیکن جب پاکستان کے اشارے پر قبائلیوں نے کشمیر پر چڑھائی کی تو مہاراجہ کشمیر نے شیخ عبداللہ کو رہا کرکے ان سے کشمیر کی دفاع کے سلسلے میں مدد کی درخواست کی۔ اس وقت بھی شیخ کا نعرہ تھا: الحاق سے پہلے آزادی" اُنھوں نے کہا الحاق کیلئے ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ملک کا انتخاب کرنے سے پہلے ڈوگرہ راج سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن حالات تیزی سے تبدیل ہورہے تھے۔ الحاق کے لیے پاکستان کی طرف سے مہاراجہ پر مسلسل زور ڈالا جارہا تھا اور جب مہاراجہ کی الحاق کے بارے میں لیت ولعل کی پالیسی بدستور جاری رہی تو پاکستان نے کشمیر کے خلاف معاشی ناکہ بندی بھی عاید کردی اور مہاراجہ سے مایوس ہوکر راست شیخ صاحب سے معاملت کرنے کے لیے پاکستان نے اپنے دو نمایندے محمد دین تاثیر اور شیخ صادق حسن کو سری نگر روانہ کیا لیکن شیخ عبداللہ الحاق سے پہلے آزادی کے اپنے اصول سے کسی طرح دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ بات جو بعد میں شیخ صاحب سے ہندوستان کے اختلاف کی وجہ بنی اسی بات پر ان کا پاکستان سے بھی اختلاف ہوا تھا یعنی کشمیر کا پاکستان میں مکمل طور پر انضمام۔ اس کے برخلاف اس وقت ہندوستان کے نیتا صرف دفاع اُمور خارجہ اور رسل ورسائل کی حوالگی پر ہی خوش تھے اور ریاست کے باشندوں کے محدود حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ تھے۔ ان سب پر مستزاد شیخ صاحب کے کانگریس سے قدیمی تعلقات اور گاندھی جی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے دوستی بھی ہندوستان کی طرف جھکاؤ کا سبب بنی۔ چناں چہ مولانا کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد دوسری شخصیت تھے جن کا وجود ہندوستان سے اپنی قسمت وابستہ کرنے کے سلسلے میں ایک بڑی کشش ثابت ہوا۔

مذکورہ بالا تحریر سے واضح ہوگیا ہوگا کہ وہ کون سے حالات تھے جن کی وجہ سے شیخ عبداللہ نے کراچی کے بجائے دہلی کی راہ اختیار کی تھی۔ اب ان ہی کے الفاظ ان وجوہات کو بیان کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے کشمیر میں اپنے اور پرائے نوں ان کے دشمن ہوگئے تھے اور جس کی پاداش میں انھیں ۲۲ برس کا بن باس تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔۔۔

" ایک اور امر جس نے ہندو فرقہ پرستوں کو مجھ سے بدگمان کر دیا تھا تھا کہ میں نے آزادی کے بعد کچھ ایسی اصلاحات نافذ کر دی تھیں جن سے سے اتفاق سے حکمران طبقے کے استحصالی عناصر پر زد پڑتی تھی اور ان کا زیادہ تر نہ محض اتفاق سے اکثریتی طبقے کو ملا۔ اسی طرح مرکز اور کشمیر کے درمیان بھی تاہدات کی عمل آوری کے سلسلے میں بے شمار ٹکراؤ اور رکاوٹیں پیش آئیں۔ ان کی یہ تھی کہ ہندوستان کے رہنما کئی ذہنی تحفظات کے شکار بن گئے تھے اور اپنے ساتھیوں کا سا اعتماد دینے کے بجائے حاکموں کی سی خو برتتے رہے اور ہمارے معاملات میں جائز اور ناجائز ہر طرح کی مداخلت کا موقع ونڈتے رہتے تھے۔"

شیخ عبداللہ کے مخالفین میں سرفہرست سردار پٹیل، یوراج کرن سنگھ، غلام محمد ڈی۔ پی۔ در اور جواہر لال کے عملے کے لوگ جیسے دوارکا ناتھ کاچرو، متھائی اور کاشی ناتھ بامزئی جیسے لوگ تھے۔ اسی طرح نہرو خاندان کے افراد بھی برگشتہ کیا گیا۔ ان تمام کارروائیوں کا مقصد کہ جواہر لال کو جو اعتماد شیخ عبداللہ ات پر تھا اسے ڈگمگا دیا جائے۔ کیوں کہ یہی ایک صورت شیخ کو اقتدار سے ہٹانے کی تھی۔ ہندوستان کے لیڈر چاہتے تھے کہ کشمیر بھی بھارت کی اور ی ریاستوں کی طرح مکمل طور پر انڈین یونین میں ضم ہو جائے لیکن شیخ اس کے خلاف تھے جس کی وجہ وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"...ہم آپس میں اس فیصلے پر پہنچے تھے کہ دستاویز الحاق کی رو سے کو جن امور کی ذمہ داری سونپی گئی ہے ہم ان سے تجاوز نہیں کریں گے کیوں کہ سے خاص حالات اور ہماری تحریک کے مقاصد ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اول تو کشمیر ہندوستان یونین میں شریک ہونے والی واحد ایسی

میں ریاست تھی جہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ہماری ریاست تین طرف سے پاکستان سے گھری ہوئی تھی۔ پاکستان اس پر اپنا دعوی جتا رہا تھا۔ ہندوستان نے رائے شماری کرنے کی حامی بھر لی تھی جس کے ذریعے ریاست کے مستقبل کا حتمی فیصلہ کرنا مقصود تھا۔ یہ سارا معاملہ اقوام متحدہ کے فورم میں زیر بحث اور سفارتی سرگرمیوں کا مرکز اور محور بن گیا تھا جہاں بار بار ہندوستانی نمایندے پلیٹ فارم سے یقین دلا رہے تھے کہ ہندوستان کو کشمیر کی سرزمین پر قابض رہنے کی نہ کبھی خواہش تھی اور نہ اب ہے۔ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ ریاست میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی رائے شماری کرائی جائے اور یہاں کے باشندوں کو حق دیا جائے کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں ریاست کا ہند یونین میں مکمل انضمام خارج از بحث تھا اور ان ہی تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دستور کی دفعہ ۳۷۰ تشکیل دی گئی تھی۔"

. . . خیالات کا یہی وہ تضاد تھا جس نے بالآخر شیخ عبداللہ کو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر کشمیر سے مایوس ہو کر ہندوستان کے ارباب بست و کشاد نے کشمیر کے مرد آہن بخشی غلام محمد سے آس لگائی تھی کہ کشمیر کے بجرے کو کھیتے ہوئے بالآخر ہند ساگر میں لے ہی آئیں گے۔ اور کشمیر بھی اور دیسی ریاستوں کی طرح انڈین یونین میں مکمل طور پر شامل ہو جائے گا۔ لیکن کروڑہا کروڑ کے مصارف کا بار برداشت کرنے کے باوجود جیسے یہ منزل کسی طرح قریب ہوتی دکھائی نہیں دی بلکہ بخشی حکومت کے خلاف کشمیر میں شدید بے چینی کے آثار نمایاں ہونے لگے تو پنڈت نہرو نے کامراج پلان کا سہارا لے کر بخشی غلام محمد کو بھی چلتا کر دیا لیکن موئے مبارک کی چوری کے نتیجے میں کشمیر میں جو خونریز ہنگامے ہوئے انھوں نے نہرو کو اپنی گذشتہ دس سال کی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور کر دیا لیکن قضا نے انھیں مہلت نہیں دی اور اس طرح لال بہادر شاستری کے قلیل المدتی دور کے بعد اندرا گاندھی کا وہ طوفانی دور شروع [illegible] کی تاریخ کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ایمرجنسی، کشمیر اکارڈ، جنتا دور، "آتش چنار" میں شیخ عبداللہ نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس [illegible] واقعہ کو قلمبند کیا اور ان پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

مصنف نے اپنی کتاب میں ہندوستان، پاکستان اور کشمیر کی اکثر شخصیتوں اور ان ملکوں میں پیش آنے والے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ سطور ذیل میں ان ہی میں سے چند اقتباسات مع حواشی کے پیش کئے جاتے ہیں۔

ساری کتاب میں شیخ عبداللہ جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر اور جس کے سب سے زیادہ عقیدت مند دکھائی دیتے ہیں وہ گاندھی جی کی ذات ہے ایک ہزار صفحات کی اس ضخیم کتاب میں گاندھی جی کی ذات یا ان کے کسی عمل کے خلاف ایک لفظ نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف قائد اعظم محمد علی جناح کی گو وہ بہت عزت کرتے ہیں لیکن ان سے اپنے اختلاف کو بھی ظاہر کرنے سے نہیں چوکتے۔ جناح کے متعلق ان کے بعض خیالات کو سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جناح کے کانگریس سے علیحدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ کانگریس میں اچھا سلوک نہیں ہوا تھا اور اُن کی حد سے بڑھی ہوئی اَنا اب کسی طرح بھی اپنا لوہا منوانا چاہتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جناح صاحب اپنے آپ کو گاندھی سے زیادہ تعلیمیافتہ اور باشعور سمجھتے تھے اور کسی نہ کسی طرح قومی سطح پر ایک اعلیٰ مقام حاصل کرنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی اور مسلم لیگ کی صدارت کی کرسی سنبھالی۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو کے متعلق وہ آخر تک یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ انھیں ہیرو قرار دیں یا ویلن۔ کتاب کے آغاز میں تو ہر موڑ پر ان کی طرف سے پنڈت جی کے ساتھ والہانہ الفت اور شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً لاہور ریلوے اسٹیشن پر پنڈت نہرو سے اپنی پہلی ملاقات کا وہ یوں ذکر کرتے ہیں۔

۔ ۔ ۔ ۔ پنڈت جی اپنی سُرخ و سپید رنگت اور چہرے بشرے سے کشمیری حسن و جمال کا دلکش پیکر لگ رہے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے اور ریل کے ڈبے ہی میں اس طرح محو گفتگو ہو گئے جیسے ہم برسوں کے دوست ہوں۔ ۔ ۔ ان کے انداز میں بچوں کی سی معصومیت تھی جس پر خواہ مخواہ پیار آتا تھا۔ ۔ ۔ ان کی ذات میں خوبیوں اور خامیوں کے کتنے ہی دھارے جمع ہو گئے تھے، ان کے بارے میں کوئی دو ٹوک فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جواہر لال ایک حد سے جذباتی قسم کے شخص تھے اور ان کا شخصی طلسم اور کشش ایسی تھی کہ ان کی

گرویدہ نہ ہونا محال تھا ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اُسی جواہر لال کے متعلق ان کے قلم سے یہ الفاظ بھی نکلے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی حیثیت اور مرتبہ کو بچانے کے لیے جواہر لال دوستوں کو قربان کرنے میں کافی فیاض واقع ہوئے تھے ۔ اگرچہ کرشنا مینن اور ان کے طریقۂ کار کو میں ہمیشہ ناپسند کرتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں وہ بھی جواہر لال کی ویلوڈھی پنڈ جواہر لال کی پالیسیوں پر عمل پیرا رہنے کے لئے قربانی کا بکرا بنادیئے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ جواہر لال کی شخصیت خود ان کے کہنے کے مطابق دوہری شخصیت (SPLIT PERSONALITY) تھی۔ نظریاتی طور پر وہ جمہوریت پسند اور روشن خیال تھے اور بائیں بازو کی طرف ان کا واضح رجحان تھا ۔ ان کی تربیت رئیسانہ ماحول میں ہوئی تھی اس لئے وہ خوشامد سے متاثر ہوجاتے تھے ۔ اُن کے مزاج میں آمریت کو بھی دخل تھا ۔ وہ اختلافِ رائے کو طبعاً پسند نہیں کرتے تھے ۔ اس لئے بہت کم اشخاص کو اُن کے منہ پر ان سے اختلاف کرنے کی ہمت پڑتی تھی ۔"

علامہ اقبال کے بعد شیخ صاحب کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر آتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد دوسری شخصیت تھے جن کا وجود ہندوستان سے اپنی قسمت وابستہ کرنے کے سلسلے میں ایک بڑی کشش ثابت ہوا ۔ مولانا کی علمی بصیرت ، ان کے مجاہدانہ کردار اور اسلام پر ان کی گہری نظر نے مجھے بہت متاثر کیا ۔ وہ ایک ذکی الحس بزرگ تھے اور ان کے مزاج میں ایک وضعدارانہ نفاست پسندی موجود تھی ۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے وہ اپنے IVORY TOWER میں مسند نشین اور پناہ گزین ہو گئے تھے ۔ ایک بار حوصلہ کرکے میں نے ان سے پوچھ لیا ، مولانا ہم تو اپنے مقدور کے مطابق خم ٹھونک کر سامنے آتے ہیں لیکن آپ بھلا مرکز میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں ۔ مولانا کے پُرجلال اور حساس چہرے پر کرب کی ایک پرچھائی لہرائی اور وہ کہنے لگے میرے بھائی میں تو اب ایک صدا بہ صحرا بن کر رہ گیا ہوں ۔ میری قوم نے میرا راستہ نہیں اپنایا اور اب میں یہاں ایک ایسی شخصیت کی حیثیت سے بیٹھا ہوں ، جس کی پشت پر قومی رائے کا وزن نہیں ہے ۔ اب اگر میں یہاں دھونی رمائے بیٹھا ہوں تو محض اس لئے کہ بعض اوقات آنکھوں کا لحاظ بھی کام کر جاتا ہے اور میں کوئی معقول بات منوانے میں کامیاب ہوجاتا ہوں لیکن مجھ سے بہت زیادہ کی توقع رکھنا عبث ہے ۔"

آتش چنار میں بیرون ہند کے بعض قائدین کے متعلق بھی شیخ عبداللہ کے اپنے تصورات ملتے ہیں۔ پاکستان کے صدر ایوب خاں سے وہ کافی متاثر معلوم ہوتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

" صدر ایوب خان ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ شکل وصورت کی جاذبیت اور قد وقامت کی وجاہت انسان کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ مردانہ وجاہت کا مجسم پیکر تھے۔ اُنھوں نے اپنی ساری عمر فوج میں گذاری تھی۔ اس لئے وہ بات کرنے میں وہ نفاست اور مصلحت پسندی نہیں رکھتے تھے جو ایک ڈپلومیٹ کا خاصہ ہوتی ہے جو کچھ ان کے ذہن میں ہوتا' لگی لپٹی کے بغیر زبان پر لاتے اور اس میں خلوص کی خوشبو آتی تھی۔ میرا ذاتی تاثر یہ تھا کہ بڑی پریشانیوں کے بعد پاکستان کو ایک مسیحا مل گیا۔ میرا خیال تھا کہ صدر ایوب کو اگر موقعہ مل جاتا تو پاکستان کو آہستہ آہستہ سیاسی اور اقتصادی ابتری کے بھنور سے نکال دیتے۔"

صدر پاکستان محمد ایوب خان جس نے ۱۹۶۵ء میں رن کچھ اور کشمیر میں فوجی کاروائی کی اور ناکام رہا' تاشقند سے اپنے سیاسی دیوالیہ پن کا ثبوت دے کر واپس آیا اور اپنی بنیادی جمہوریت کی افلاطونی سیاست کاری کے ذریعے بنگالیوں کو اس قدر ناراض کیا کہ انھوں نے پاکستان کی وحدت ہی کے ٹکڑے کر دیئے' اس کے متعلق شیخ صاحب کی خوش فہمی سیاست میں خود ان کی ناپختہ کاری کی دلیل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاسبانِ عقل کو کبھی کبھی نہیں بلکہ زیادہ تر اکیلا چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ شخصی وجاہت اور جاذبیت سے بھی کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتے دکھائی دیتے ہیں خواہ وہ وجاہت اور جاذبیت مولانا آزاد میں نظر آئے یا پنڈت نہرو میں یا صدر ایوب خان میں وہ ہر جگہ سپر انداز ہو جاتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

" وہ ایک ایسے باپ کے بیٹے تھے جس کی ساری عمر سیاسی شطرنج پر چالیں چلنے میں گذری تھی اس لیے بیٹے پر بھی اس چیز کا اثر تھا۔ انھوں نے خود بھی بڑی تیز اور طرار طبیعت اور ذہن رسا پایا تھا اور سیاسی میدان کی پانیگری سے بھی خوب واقف تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب کے ساتھ ہماری جو ملاقات ہوئی

اس وقت بھٹو صاحب موجود تھے لیکن وہ سعادت مندی کے انداز میں چپ سادھے رہے۔ ان کے ظاہر ان کے باطن سے کبھی کبھی کس قدر مختلف ہوتے ہیں اس وقت کیا اندازہ ہوسکتا تھا کہ یہ سعادت مندی ان کے عزائم کو چھپانے کا ایک پوز بلکہ نقاب ہے۔ بھٹو جیسے عوامی لیڈر کے مقابلے میں ایوب خاں جیسے فوجی ڈکٹیٹر کی مدح سرائی شیخ صاحب جیسے جمہوریت پسند کے قلم سے کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن شاید یہ تقصیر ایک ایسے شخص کے لئے لائق ستائش نہ سہی، قابلِ معافی ضرور تسلیم کی جائے گی جو ایک چوتھائی صدی تک سیاست گزیدہ رہ چکا تھا اور جس کے خلاف پرایوں ہی نے نہیں بلکہ خود اپنوں نے بھی ہر وہ گل روا رکھا جو نیکی اور شرافت کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ شیخ محمد عبداللہ ایک ایسے دور کی پیداوار تھے جب اصول اور آدرش واقعی کچھ معنی رکھتے تھے اور مقصد کے ساتھ ساتھ اسے حاصل کرنے کے ذرائع کے صحیح یا غلط ہونے کو بھی اہمیت دی جاتی تھی لیکن جب انھیں کچھ کر دکھانے کا موقع ملا تو دنیا اُصولوں اور آدرشوں کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہوچکی تھی اور حصول مقصد کے لیے ہر جائز اور ناجائز ذریعہ کا استعمال درست قرار پاچکا تھا۔ آتش چنار اسی ایک نکتہ کی تفسیر ہے۔

(سلسلہ ص۴۱)

رکھ دیتا ہے تو یہ ہی کہنا پڑتا ہے کہ:

ذرا "مرضِ رفتہ" کو آواز دینا ...

ہمارا نہ کوئی حال ہے۔ نہ کوئی مستقبل۔ صرف ماضی ہے وہ بھی ادھورا۔ یعنی ماضیٔ بعید ناگفتنی صرف ماضیٔ قریب قدرے تابناک رہا ہے وہ بھی چند ہفتے جو حاصلِ زندگی اور اثاثۂ حیات بن کر رہ گئے ہیں۔ انہی کی یاد کا نام تو اب زندگی ہے۔

یادِ ماضی "ثواب" ہے یارب
چھین "نہ" مجھ سے حافظہ میرا!

ڈاکٹر غلام کبریا خاں شبلی

تندرستی ہزار "لعنت" ہے

"بس تو پھر بات پکی؟"

"سو فیصدی۔" کاشف نے ہمارے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بھابی کو آج ہی تار کیے دیتا ہوں!"

"بھابی" سے کاشف کی مُراد ہماری 'کل' بہتر' تھیں جو شمع اپنے لختِ جگر، نور بصر اور قرۃ العین کے گرمیوں کی تعطیلات گزارنے میکے تشریف لے گئی تھیں۔

آپ بھی خانم کی طرح کاشف سے ناواقف ہوں گے۔ لہٰذا اس کے حدود اربعہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک 'حدود' کا تعلق ہے اس کی فنکارانہ صلاحیتیں حدود نا آشنا ہیں۔ اب رہا 'اربعہ' تو اتنا ہی بتانا کافی ہوگا کہ:

۱۔ ہمارا لنگوٹیا یار ہے۔

۲۔ ہم وطن ہے۔

۳۔ آج کل بمبئی کی کسی تھیٹریکل کمپنی میں 'میک اپ مین' ہے اور

۴۔ ایک بہت طویل عرصے کے بعد وطن آیا ہے۔ اسی لیے خانم بلکہ لختِ جگر، نورِ بصر اور قرۃ العین کیلئے بھی اجنبی ہے۔

"مگر یار دیکھو وہ حکیم ....."

"بے فکر رہو مری جان۔ کاشف 'میک اپ مین' ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ!"

انجمن جونیر کالج، کھام گاؤں، ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر

کاشف نے ہماری بات کاٹ کر اپنی خیالی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مولویانہ انداز میں کہا اور ہم بڑے ہی مطمئن انداز میں آنجہانی، جنت مکانی غالبِ مرحوم و مغفور کا یہ شعر گنگناتے ہوئے گھر لوٹے کہ:

تنگ دستی اگر نہ ہو غالبؔ تندرستی ہزار نعمت ہے

جملہ معترضہ کے طور پر عرض کر دیں کہ غالبؔ کا یہ شعر کبھی ہماری سمجھ میں جیسا آنا چاہیئے نہ آیا۔ ہماری رائے میں "تندرستی" کو "تنگ دستی اگر نہ ہو" کے پیوند سے مشروط کرنا حقیقت سے ناواقفیت کا ثبوت ہے — تنگ دستی کی حالت میں تو تندرستی کی نعمت ہزار گنا زیادہ محبوب و مطلوب ہوتی ہے۔ ورنہ علاج معالجہ کیوں کر ہو؟ کھائیں کیا؟؟ متعلقین کو کیسے پالیں؟؟؟ صرف یہ سوچ کر — اس قول کی صداقت پر خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے — صرف یہ سوچ کر حرفِ اعتراض زبان، قلم پر نہ لاسکے کہ غالبؔ کے زمانہ میں بھی اور ان کے بعد بھی کئی جغادری قسم کے نقاد اور فنِ شعر کے پارکھ نہ صرف یہ کہ گذر چکے ہیں بلکہ اب بھی محمود کو مردود اور مردود کو محمود بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں جہاں تک غالبؔ کا تعلق ہے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان ناقدانِ کج فہم نے سخن فہمی کو طلاقِ مغلظہ دیدی اور غالبؔ کی بیجا طرف داری میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے کیوں کہ ان میں سے کسی نے بھی اس شعر پر انگشتِ تنقید اٹھانا یا تیوری چڑھانا تو کجا چشم و ابرو سے بھی نقصِ شعر کی طرف اشارہ تک نہیں کیا تو شاید قصور ہمارے ہی تنقیدی شعور اور فہمِ شعر کا نہ ہو۔ کہیں:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

والی بات نہ ہو اور مفت میں انگشت نمائی اور جگ ہنسائی ہو۔ ورنہ ہمارے نزدیک غالبؔ مرحوم نے — جو تنگدستی کے عذابوں سے بھی واقف تھے اور تندرستی کی قدر و قیمت بھی جانتے تھے ورنہ مرنے کی آرزو میں جیتے اور عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ تنگدستی میں بسر کرنے کے باوجود دیائے عام ہوں مرنے سے انکار نہ کر دیتے۔ یوں فرمایا ہوگا کہ:

تندرستی اگر نہ ہو غالبؔ تنگدستی ہزار لعنت ہے

یا یوں کہ:

تنگدستی اگر جو ہو غالب　　تندرستی ہزار نعمت ہے

یا پھر یوں کہا ہوگا کہ :

تنگدستی اگر نہ ہو غالب　　تندرستی ہزار نعمت ہے

مگر دیوان کی کتابت کے وقت چُنیا بیگم کی پنک میں کاتب نے سہواً "تندرستی کی جگہ "تنگدستی" اور "لعنت" کی جگہ "نعمت" رکھ دیا یا پھر "جو" کو "نہ" سے بدل دیا۔ یا پھر تیسری صورت میں "لعنت" کو "نعمت" سمجھ بیٹھا۔ خیر ہم نہ شاعر نہ نقاد۔ ہمیں تو صرف گنگنانے سے کام" ہے فی الحال ہم اپنا یہی فرض بلا مداخلتِ غیرے بہ تمام حسن و خوبی انجام دیتے ہوئے گھر لوٹے۔

دوسرے دن تانگہ کی آواز سے ہماری آنکھ کھلی۔ سرہانے کی کھڑکی سے ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا کہ خانم، نورِ بصر میاں عمران کو سہارا دے کر تانگہ سے اتار رہی ہیں۔ پھر لختِ جگر سے فرمایا۔ "عرفان تم یہ اٹیچی اٹھالو"۔ قرۃ العین سے گویا ہوئیں۔ "عذرا تم ذرا یہ باسکٹ سنبھالو بیٹے"۔ ہم جلدی سے بستر پر دراز ہو گئے، کمبل تان لیا اور آنکھیں موند لیں۔ کنگنا کھنکا۔ حنائی ہاتھ کا مخملی لمس ہم نے اپنی پیشانی پر محسوس کیا۔ پھر "چشم نیساں" سے ٹپکے ہوئے دو موتی ہماری صدفِ جبیں میں جذب ہو گئے۔ ہم نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ خانم آنچل سے چشمِ اشک آلود صاف کر رہی تھیں۔ ہمارے دل پر چوٹ سی لگی۔ جی چاہا کہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوں۔ قہقہہ لگائیں اور کہیں "دیکھا کیسا بے وقوف بنایا؟" مگر عقل نے بروقت لگام کھینچ لی اور چپکے سے کہا۔ "صبر کرو۔ یہ جذباتی لمحات عارضی ہیں"۔ خانم نے ہمیں بیدار دیکھ کر سلام کیا اور سرہانے بیٹھ گئیں۔ ہم نے نحیف آواز میں جواب دیا اور صدقِ دل سے قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے قائل ہو گئے کہ جن آنکھوں میں کبھی کبھی غصہ کے چلتے بجھتے شرارہ کے علاوہ ہم نے کسی اور جذبہ کی ہلکی سی لہر بھی نہ دیکھی تھی۔ ان میں آج پیار کا دریا امڈ رہا تھا بلکہ کنارے توڑ کر ابل پڑنے کو بیتاب تھا۔ جی چاہا ساغرِ چشم سے چھلکنے والی صہبائے اشک غٹاغٹ پی جائیں مگر پھر عقل نے دامن پکڑ لیا۔

خانم تو خانم وہ تینوں سیماب فطرت اخوان الشیاطین یعنی ہمارے تینوں بچے بھی خلافِ توقع مجسم متانت اور تصویر سعادت بنے کھڑے تھے۔ ہم نے بڑی مریضانہ مسکراہٹ کے ساتھ کھلی کھلی نظروں سے تینوں کو دیکھا۔ تینوں نے خلافِ معمول بڑے ادب اور سنجیدگی سے ہمیں سلام کیا۔ ہم نے جواب دیا اور بڑی نقاہت سے انھیں پاس آنے کا اشارہ کیا۔ تینوں پھر خلافِ عادت بڑی متانت سے چلتے ہوئے آئے اور ہمارے قریب صوفے پر بیٹھ گئے۔ ہمیں یک گونہ مسرت ہوئی کہ ہمار خرابیٔ صحت بار آور ہو رہی ہے اور نعمتوں کا نزول شروع ہو چکا ہے۔

"ڈاکٹر کو دکھایا؟" خانم نے اپنے نین کٹوروں میں نیر کی تیرا کو سنبھالتے ہوئے، ہماری ہتھیلی سہلاتے ہوئے پوچھا۔ دکھ کی برف تلے پیار کی دھیمی دھیمی آنچ لیے خانم کے لہجہ کی گنگا جمنی کیفیت نے ہمارے دل کو دو نیم کر دیا۔ یہ انداز، یہ لہجہ حاصلِ زندگی تھا۔ اب اگر ہم اللہ کو پیارے بھی ہو جاتے تو خانم کے اس انداز کی لگاوٹ اور لہجہ کی حلاوت کے سہارے قبر سے حشر و نشر تک تمام آزمائشوں سے ہنستے کھیلتے گذر جاتے۔

"نہیں ۔۔" ہم نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔ "لکھنؤ سے ایک مشہور حکیم حاذق یہاں آئے ہوئے ہیں۔ حکیم نابینا کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ انہی سے علاج کروانا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

ہماری بات گویا الہامی تھی۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ عرفان جا کر خبر لایا کہ حکیم مسیح الزماں آئے ہیں۔ خانم عمران کا ہاتھ پکڑے عذرا کو ساتھ اندر چلی گئیں۔ عرفان حکیم صاحب کو ساتھ لے کر آیا۔ سر پر چوگوشہ ٹوپی، جسم پر لکھنوی اچکن، پیر میں سلیم شاہی۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ کی نازک سی چھڑی ۔ ناک کی پھننگ پر ٹکی ہوئی سنہرے فریم کی عینک جس کے اوپر سے جھانک کر دیکھنے کا مخصوص انداز، داڑھی مونچھ کے بے ترتیب بال کھچڑی۔ ہونٹوں پر پان کا ردا۔ غرض کہ سراپا نستعلیق۔ لیکن پان کھانے کا انداز بڑا گنوارو۔ باچھوں سے پان کی پیک ٹپکی پڑ رہی ہے۔

"آداب بجالاتا ہوں حضور۔" حکیم صاحب نے کچھ جگالی کر

ہوئے، کچھ پیک سنبھالتے ہوئے، قدرے جھک کر کہا۔ ہم نے جواباً ایک بیمار سی مسکراہٹ کے ساتھ آداب کہا اور اٹھنے لگے۔

"نہ... نہ... نہ... آپ اٹھنے کی زحمت نہ کریں"۔ حکیم صاحب نے ہمارے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہمیں لٹاتے ہوئے کہا اور پلنگ کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہماری کلائی تھامی اور آنکھیں موند کر نبض کا معائنہ کرنے لگے۔ اس سے فارغ ہوئے تو آنکھوں کے پپوٹوں کو چیر کر دیکھا۔ پھر حلق، زبان اور ناخنوں کا معائنہ فرمایا۔ پیٹ ٹٹولا۔ "ہوں" ایک گونج دار ہنکاری بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں موند لیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جوڑ لیں، گویا اپنے مشاہدات کی روشنی میں صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں مصروف ہوں۔

اندرونی دروازے کے پردے کے پیچھے حرکت ہوئی۔ خانم وہاں کھڑی تھیں۔ ہم نے عرفان کو اشارہ کر کے وہاں بھیج دیا۔ دونوں ماں بیٹوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ پھر عرفان نے دریافت کیا۔

"حکیم صاحب! امی پوچھ رہی ہیں کہ ہمارے ابو کو کیا ہو گیا ہے؟"

حکیم حاذق مسیح الزماں نے قدرے توقف سے آنکھیں کھولیں۔ تھوڑی دیر عرفان کو دیکھا پھر کہا۔

"میاں صاحبزادے! آپ کے والدِ محترم کے عروقِ شعریہ میں عرقِ انفصال کی مقدار معمول سے زیادہ ہو گئی ہے۔ جیسے انگریزی ڈاکٹر صاحبان "ہنالولو بومبیکس ملاباریکم" کہتے ہیں"۔

یہ کہتے کہتے حکیم صاحب ہماری طرف مڑے اور غضب خدا کا! جانتے ہیں آپ کہ اس نامعقول حکیم نے کیسی مبتذل حرکت کی؟ ظالم نے ہمیں آنکھ مار دی۔ وہ مارا۔ یہ سو فیصد کاشف "دی گریٹ میک اپ مین" تھا۔ کیا بہروپ بھرا تھا کم بخت نے۔ اس بیہودے نے ادب کی جو درگت بنائی تھی اور جغرافیہ اور حیاتیات کا جس بے ڈھنگے پن سے غیر شرعی نکاح پڑھایا تھا۔ اس پر ہمیں بہ جبر اپنے پھیپھڑے میں اٹھتے ہوئے قہقہوں کے طوفان کا گلا گھونٹنا پڑا۔ عروقِ شعریہ تک تو بات ٹھیک تھی مگر ظالم نے اقبالؒ کے "عرقِ انفعال" کو "عرقِ انفصال" بنا ڈالا اور جغرافیائی ہنالولو کے ڈانڈے حیاتیات کے

بومبیکس ملاباریکم (BOMBAX MALABARICUM) (ایک قسم کا بانس) سے ملا دیئے۔

"مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔ مرض ہنوز ابتدائی درجہ میں ہے۔ مکمل آرام پرہیز اور دوا سے چند ہی دن میں صحت ہو جائیگی، انشاءاللہ۔" حکیم صاحب نے اپنی مصنوعی داڑھی پر روایتی انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بات مکمل کی۔

"پرہیز کیا ہوگا؟" عرفان نے اپنی امی کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی انھیں شور اور تفکرات سے بچایا جائے تاکہ یہ پرسکون ماحول میں مکمل آرام کر سکیں۔ مطالعہ جتنا چاہیں کریں۔ اس سے ان کا ذہن یکسو رہے گا اور پریشان کن خیالات سے نجات ملے گی۔ رہا کھانے کا سوال تو تیل اور مرچ کا مکمل پرہیز" مرچ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس خبیث نے اپنی عینک کے اوپر سے جھانکتے ہوئے شریر مسکراتی آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ کم بخت ہماری پسند و ناپسند سے کما حقہ واقف تھا۔ مرچ کے بغیر تو زندگی روکھی، پھیکی اور بے رنگ ہو جائے گی۔ مطالعہ کی ہدایت پر تحسین و آفرین کے جو ڈونگرے ہم کاشف پر برسانے والے تھے۔ مرچ سے پرہیز کے تذکرہ پر برسانے کا ارادہ ملتوی کرکے برس پڑنے کو آمادہ ہو گئے۔ لعنت و نفریں کے نعرے لگانے کو جی چاہا اس کی مصنوعی داڑھی نوچ پھینکتے۔ مردہ باد کا نعرہ لگانے کی بجائے مردہ کرکے چھوڑتے۔ مگر کیا کریں، خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ خانم اور عرفان جو موجود تھے۔

"اصلی گھی میں بنی ہوئی مقوی غذائیں کھلایئے۔" ناہنجار حکیم کے بچے نے اپنی بات جاری رکھی۔ "صبح بادام کا حریرہ۔ دو انڈوں کی پڈنگ، مکھن لگے سلائس اور کافی یا چائے۔ دوپہر کے کھانے میں چوزہ کی یخنی ضرور ہو۔ سہ پہر کو شیریں پھلوں کا رس۔ رات کا کھانا بہت ہلکا اور زود ہضم، مثلاً مونگ کی دال کی کھچڑی وغیرہ۔ رہیں دوائیں تو صبح و شام خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا، نیم گرم دودھ کے ساتھ کھلائیں۔ ناشتہ اور رات کے کھانے کے بعد ایک خوراک ہضمینہ اور دن میں ایک مرتبہ شربت انار۔ رات میں سونے سے پہلے چند دانے منقیٰ معہ تھوڑے سے نمک کے ساتھ۔ میں دواؤں کے نام لکھ دیتا

ہوں۔ بازار سے منگوالیں۔"

کاشف دوائیں لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ ہم نے عرفان سے ناشتہ لانے کے لیے کہا۔ جب خانم اور عرفان چلے گئے تو ہم نے کاشف سے کہا۔

"کیوں رے سور! یہ مرچ کے پرہیز کی کیا بے تکی ہانک دی؟"

"تعزیرات کاشف' دفعہ ۴۲۰ کی رو سے معصوم بیوی کو دھوکہ دینے اور ستانے کی یہی سزا ہے" کاشف نے الفاظ چباتے ہوئے شرارت سے مسکرا کر کہا۔

"اچھا بیٹا سمجھ لوں گا تجھ سے" ہم نے گھونسہ دکھاتے ہوئے دھمکی دی۔

'فرزند! چونچ بند رکھو ورنہ شکر بھی بند" اس نے بھی جواباً دھمکی دی۔

"قہر درویش بہ جان درویش" ہم دانت پیس کر رہ گئے۔ کم بخت دو دھاری تلوار ثابت ہوا۔ اپنا وار کر ہی گیا۔ عرفان ناشتہ لے آیا۔

' اماں صاحبزادے اس تکلف کی بھلا کیا ضرورت تھی؟" کاشف نے عینک کے اوپر سے عرفان کو گھورتے ہوئے کہا۔

"امی کا اصرار ہے کہ آپ ہمارے ابو کے ساتھ ناشتہ ضرور کریں۔"

عرفان کی موجودگی کی وجہ سے ہم دونوں نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔ مگر ظالم عین ہماری آنکھوں کے سامنے طنز سے مسکراتا جاتا تھا اور چٹخارے لے لے کر ہری مرچ پڑے کباب اور قیمہ کے سموسے کھاتا جاتا تھا۔ بے غیرت کہیں کا۔ ناشتہ کے بعد وہ ہر تیسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ندیدہ ناشتہ یا کھانے کے وقت نازل ہوا کریگا۔

چند دن گذر گئے۔ جو عیش ہمیں میسر ہوا' بابر کے گمان میں بھی نہ ہوگا۔ گھر کا صرف ماحول ہی نہ بدلا' گھر والوں کے مزاج بھی بدل گئے۔ وہی گھر جہاں بچوں کی ہمہ وقت دھما چوکڑی کی وجہ سے دن کے وقت سکون سے قیلولہ کرنے کا خیال تک جنت الحمقا میں بسنے کے مترادف تھا۔ اب ایسا پرسکون ہوگیا کہ چڑیا تک کو چہچہانے سے پہلے اڑا دیا جاتا۔ بچوں اور خانم کی آئے دن کی فرمائشوں سے گلو خلاصی ہوگئی۔ گھریلو اخراجات تک کی فکریں خانم نے سمیٹ لیں۔ حالانکہ ہمیں احساس تھا کہ ہم اپنا ہی مال بڑی بیدردی سے

کھلتے ہیں مگر یہ بھی اطمینان تھا کہ "زرِ گمشدہ خودی خودم" جو ہماری جیب میں نقب لگا کر اڑا لیا گیا تھا۔ "حق بہ حقدار رسید" کے مصداق اب ہمارے "علاج و پرہیز" پر صرف ہو رہا تھا۔ خانم کی تو گویا قلب ماہیئت ہو گئی۔ نہ وہ جبینِ شکن آلودہ رہی، نہ وہ چشمِ شرر بار۔ نہ باتوں میں وہ نشتریت رہی نہ وہ اندازِ تغافل عارفانہ۔ جو ان کے وجود کا لازمہ تھے۔ خود کو خوش و مطمئن ظاہر کرنے کی اور ہمیں خوش رکھنے کی حتی الامکان ایماندارانہ کوشش کرتیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دن میں کم از کم دس مرتبہ یہ کثیلے جملے سننے کو ملتے کہ "اجی سنتے ہو۔ گھر میں فلاں چیز ختم ہو گئی ہے۔ آپ کو تو گھر بار، بیوی بچوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ بس آپ بھلے اور آپ کی کتابیں بھلی۔ نہ جانے کیا رکھا ہے ان موئی کتابوں میں۔ کتابیں نہ ہوئیں کلموہی میری سوکن ہو گئیں۔ اگر کتابوں سے ایسا ہی عشق تھا تو گھر گرہستی کا کھڑاگ پھیلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ آگ لگے ان نگوڑی ماری چھپڑیلوں کو۔" یا آج یہ وقت کہ ہمیں کچھ سوچتے دیکھا کہنے لگیں ۔۔ "یہ آپ ہر دم کیا سوچتے رہتے ہیں۔ سوچنے کا کام اب میرے ذمے۔ آپ کو تو پڑھنے پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ کوئی اچھی سی کتاب پڑھئے نا۔"

ایک رات اچانک ہماری آنکھ کھل گئی۔ گھڑیال نے چار بجے کا اعلان کیا۔ نائٹ بلب کی ملگجی روشنی میں کیا دیکھتے ہیں کہ خانم مصلے پر بیٹھی دامن پسارے حکیمِ حقیقی، شافیٔ مطلق سے ہماری صحت و سلامتی کی دعائیں رو رو کر مانگ رہی ہیں۔ کیا بتائیں خانم کی محبت کے اس نادیدہ روپ نے ان کے عشقِ عفیف کی اس انتہا گہرائی نے ہمیں جذبات کے کس بھونچال سے دوچار کر دیا۔ ملٹن کو اپنی فردوسِ گمشدہ کی بازیافت سے وہ خوشی نہ ہوئی ہوگی جو ہمیں پُر خلوص پیار کے اس لازوال خزانے کے انکشاف سے ہوئی۔ (یاد رہے کہ اس انکشاف کا سہرا بھی ہماری بیماری کے سر ہے) ندامت بھی ہوئی کہ تف ہے تجھ پر جو ایسی زوجۂ باصفا و منکوحۂ باوفا کو دھوکا دے رہا ہے۔ جی چاہا کہ قدموں پہ گر پڑوں۔ قصور معاف کرواؤں۔

اور خطِ غلامی لکھ دوں۔ مگر عقل عیار کی مکاریاں! ارے توبہ!! جذبات کی آگ کو آنسوؤں سے ٹھنڈا کر دیا۔ ہم کروٹ بدل کر چپکے چپکے روتے سو گئے۔

ہماری علالت کی خبر سنکر خوش دامن صاحبہ تشریف لے آئیں تاکہ گھر کی انتظامی فکروں کو اپنے دامنِ خوشش وسعت میں سمیٹ کر اپنی دخترِ نیک اختر کو ہماری تیمار داری کے لیے فارغ کر دیں تاکہ وہ یکسو ہو کر حقِ خدمت ادا کر سکیں۔

خسر صاحب دام اقبالکم و زاد عنایتکم بھی یہ محسوس کر کے کہ ہم محض داماد ہی نہیں جن سے وہ گاہے گاہے "خراجِ خسروی" وصول کیا کرتے تھے بلکہ ان کی اکلوتی نورِ چشم کے چہیتے شوہرِ نامدار بھی ہیں۔ "خراجِ عیادت" پیش کرنے آئے۔ ادھر برادرِ نسبتی نے رضاکارانہ طور پر ہمارے کاروبار کی نگرانی کا ذمہ لے کر نسبت برادرانہ کا ثبوت دیا۔

دل پر ہاتھ رکھ کر ایمان سے کہیئے کہ اگر غالبؔ کو بھی "عدم تندرستی" کے طفیل، عشرتوں، صحبتوں اور اپنائیتوں کے اس بحرِ ذخّار کی شناوری اور غوّاصی کا موقعہ نصیب ہوتا تو کیا پھر بھی وہ یہی کہتے کہ:

تنگدستی اگر نہ ہو غالبؔ　　تندرستی ہزار نعمت ہے

ہاتفِ ایمان صدا دیگا "نہیں ! ہرگز نہیں"۔ غالبؔ توبہ کرتے۔ سجدہ میں گر کر گڑگڑا کر اپنی غلط بیانی پر اظہارِ ندامت کرتے اور بطور کفارہ شاید شاعری ہی سے تائب ہو جاتے۔

کچھ دن بعد ہمارے منشی جی پریشان سے آئے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے رضاکار برادرِ نسبتی ہمارے کاروبار سے اپنا "حقِ نسبت" وصول کرنے میں بڑے فراخ دست ہوتے جا رہے ہیں۔ منشی جی کو دم دلاسہ دے کر رخصت کیا ہی تھا کہ کاشف آدھمکا۔ موقعہ پا کر ہم نے اس سے کہا۔

"اب ہماری صحت کا اعلان کر دے۔ کاروبار ٹھپ ہوا جا رہا ہے"

یوں بھی اب ہمارا چمرخ سا چہرہ، حریرہ بادام سے شگفتہ و شاداب، یخنیٔ مرغ سے تر و تازہ اور شربتِ انار سے گلنار ہوا جا رہا تھا۔ خمیرہ، ہمعصینہ اور معجون بھی اپنا اپنا رنگ دکھا رہے تھے۔ مکھن اور گھی نے گویا چہرہ

پھر رنگ سیدو روغن پھیر دیا تھا۔ آسودگی مستقلاً ہماری آنکھوں میں بسیرا کئے چکی تھی اتنے میں تینوں بچے آگئے۔ ہماری توجہ ذرا دیر کو ہٹ گئی۔ یکایک عذرا نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔ ہفتوں میں یہ پہلا قہقہہ تھا جو اس گھر میں گونجا۔ زندگی سے بھرپور۔ در و دیوار چمک اٹھے۔ گویا ہفتوں کے ابر آلود مطلع کو چیر کر سورج نکل آیا۔ پھر یہ قہقہہ متعدی مرض کی طرح پھیلتا گیا۔ عرفان بھی مارے ہنسی کے دہرا ہوا جا رہا تھا۔ عمران ہنستا بھی جا رہا تھا۔ اچھل بھی رہا تھا اور تالیاں بھی پیٹ رہا تھا۔ شور سن کر خانم بھی پردہ کے پیچھے آ موجود ہوئیں ہنسی کی وجہ اور معاملہ اور معاملہ کی نزاکت اور سنگینی کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب عمران نے کہا کہ "ارے حکیم صاحب کی آدھی مونچھ غائب ہو گئی"۔ اتنا سننا تھا کہ بوکھلاہٹ میں کاشف نے اپنی بقیہ آدھی مونچھ اور داڑھی ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔ اپنی چاندی کی موٹھ والی چھڑی ہاتھ میں اور پان کی پیک منہ میں سنبھالتے ہوئے جو بھاگا ہے تو یہ جا وہ جا۔ ادھر یہ عالم کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ ہماری عروقِ شعریہ سے کاشف کا تشخیص کردہ 'عرقِ انفصال' ہر بنِ مو سے اقبالؔ کا 'عرقِ انفعال' بن کر نکلا پڑ رہا تھا۔ خانم کمرہ میں آگئیں۔ وہی جبیں صد شکن آلود، وہی چشمِ شعلہ فشاں و شرر بار۔

"ہوں! تو یہ ناٹک رچایا گیا ہے"۔ لہجہ وہی نشتر کی تیز دھار، فولادی تلواروں کی جھنکار اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا ناگفتنی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ "شامتِ اعمالِ ما صورتِ خانم گرفت"۔ گذشت آنچہ گذشت۔ مگر ہاں بتقاضائے انصاف اتنا ضرور کہیں گے کہ:

وصول و صل اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

الوداع! اے عشرتِ مطالعہ، الوداع! اے لذتِ کام و دہن، و الفراق! اے عیش کوشی، الوداع والفراق! اے مسرتِ ایامِ علالت!

ادھر آ تجھے گلے لگا لوں اے لعنتِ تندرستی کہ تو لعنت سہی مگر اب اس بھرے پرے گھر میں تنہا تو ہی میری مونس ہے۔ میری غم گسار رہتے۔ جب کبھی ہمارے رابطہ روح کے تاروں پر خواہش اپنی مضراب

(باقی بر ص ۲۴)

رشید الدین

کچھ ترجمے کے بارے میں

ایک زبان کی تحریر کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔ جب یہی کام تقریر کی صورت میں ہوتا ہے تو وہ ترجمانی کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں میں ترجمہ کی بہت زیادہ اہمیت ہے کیونکہ تقریر کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی مفاہمتی اور کارا جرائی کے لئے ہوتی ہے۔ جب کہ تحریر کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی دیرپا اور مستقل ہوتی ہے اور اس کی حیثیت علمی اور ادبی ہو جاتی ہے اور یہ صرف اسی نسل کی حد تک محدود نہیں رہتی بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی ایک سرمایہ ہوتی ہے۔ دارالترجمہ حیدرآباد کے تراجم نہ صرف اسی دور کی نسل کے لئے چراغ راہ رہے ہیں بلکہ آج بھی طلباء اور عام لوگوں کو فیض پہنچا رہے ہیں اور آئندہ بھی پہنچاتے رہیں گے۔ جب کہ اس شہر میں بہت سے بیرونی مہمانوں اور عظیم شخصیتوں کی تقاریر کی ترجمانی کے فرائض بھی انجام دئیے گئے لیکن اسے کسی نے یاد نہیں رکھا اور وہ صرف رپورٹنگ کی شکل میں اس زمانے کے اخباروں کی فائلوں میں موجود ہیں۔

دنیا میں ترجمے کے کام کا آغاز کب سے ہوا اس کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس سلسلے میں قیاس لگانا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ زبانوں کے وجود میں آنے اور فن تحریر کے ایجاد ہونے کے بعد ہی اس زمانے کے انسانوں کو ترجمے کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ لیکن اس کا جتنا فائدہ آج کے زمانے میں حاصل کیا جا رہا ہے اتنا کسی اور زمانے میں حاصل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے سائنس کی ترقی اور بین الاقوامیت کا فروغ ہے۔ آج ملٹن، شکسپیر یا سقراط اور ارسطو سے ہم ترجمے کے ذریعہ ہی روشناس ہوئے ہیں ورنہ اتنے عظیم لوگوں کا وجود اور عدم وجود ہمارے لئے برابر ہی ہوتا۔ علمی اور ادبی تقاضوں کے علاوہ روزمرہ کی ضروریات کے لئے بھی

پتہ: سینیر مترجم ۔ محکمہ ترجمہ ۔ حمایت نگر ۔ حیدرآباد

آج ترجمہ ایک ضروری شئے بن چکی ہے۔ آج اخبارات ایک عام پڑھے لکھے آدمی کے لئے ایک ضرورت بن چکے ہیں۔ اور ہندوستانی زبان کے تمام اخبارات بغیر ترجمے کے اپنا تصور تک نہیں کر سکتے۔ کیونکہ مقامی زبانوں میں جتنی خبریں قارئین کو سربراہ کی جاتی ہیں ان میں سے نوے بلکہ ننانوے فیصد ترجمہ شدہ ہوتی ہیں کیونکہ بین الاقوامی و مقامی بڑے خبر رسال ادارے یہ خبریں پہلے انگریزی میں سربراہ کرتے ہیں۔

لیکن ترجمہ جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ یقیناً یہ ایک فنی کام ہے اور جس کے لئے ذوق سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں ویسے ہی پڑھے لکھے لوگوں کی کمی ہے پھر جو ہیں ان میں زبان و ادب کا ذوق محدود سے چند کو ہے۔ ان میں بھی ترجمے کی اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے بس آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو صحافت اچھے صحافیوں کے قحط سے دوچار ہے۔ کیونکہ بغیر ترجمہ کی اہلیت رکھے کسی صحافی یا جرنلسٹ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بھی زیادہ کمی ہمارے پاس علمی ادبی مضامین و کتابوں کا ترجمہ کرنے والوں کی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے لغت نویسی کو ایک کٹھن کام اور پتا ماری کا کام قرار دیا ہے لیکن میرے خیال میں ترجمہ (خصوصاً ادق اور علمی ادبی موضوعات کا) بھی آسانی سے اسی ذیل میں آسکتا ہے۔

ایک مترجم کو کیا عملی دشواریاں پیش آسکتی ہیں یا آتی ہوں اس کا پورا پورا احساس وہی کر سکتا ہے۔ اسے ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ سب سے پہلے تو یہ انتہائی محنت اور جانفشانی کا کام ہوتا ہے۔ پھر انتہائی دشوار اور صبر آزما بھی ہوتا ہے۔ مترجم کو دو زبانوں پر عبور رکھنا پڑتا ہے اور علمی و ادبی ذوق اور تحریری صلاحیت کا حامل ہونا پڑتا ہے۔ ایک طرف مترجم کو اصل موضوع کی روح کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے تو دوسری طرف جس زبان میں اسے منتقل کیا جارہا ہے اس کے مزاج اور تقاضوں کو بھی سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم تخلیقات کے تراجم ایسے ہوئے ہیں جن پر اصل کا دھوکہ ہو۔ اس سلسلے میں انگریزی شاعر تھامس گرے کی طویل نظم کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جسے نظم طباطبائی نے "گورِ غریباں" کے نام سے اردو کا قالب دیا ہے اور اسے اصل کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

یہ بات تو ادق اور علمی ادبی موضوعات کی تھی لیکن صحافتی ترجمے کی بھی کچھ کم مشکلات نہیں ہوتیں جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے بغیر ترجمے کے دیسی صحافت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک صحافی کو سب سے پہلا مسئلہ جو درپیش ہوتا ہے وہ تنگیٔ وقت کا ہوتا ہے۔ اسے

کم سے کم وقت میں ڈھیر ساری خبروں کا ترجمہ کرنا ہوتا ہے پھر اسے اچھی طرح سے ڈکشنری دیکھنے یا غور و فکر کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ پھر آج کل ایسے موضوعات پر خبریں آنے لگی ہیں جن کا پرانے صحافیوں کو کبھی سابقہ نہ پڑتا تھا۔ مثلاً خلائی سفر کی خبریں، سائنسی ایجادات کی خبریں اور نئی آپریشنوں کی خبریں، منصوبہ بندی کی خبریں اور پیچیدہ عدالتی مباحث اور فیصلوں کی خبریں خبر رساں اداروں کے پاس تو ان موضوعات کے ماہرین ہوتے اور وہ یہ خبریں مرتب کر کے بھجوا دیتے ہیں لیکن مقامی اخبارات کے پاس ایسے کوئی ماہرین نہیں ہوتے اور عام صحافیوں کو ہی یہ کام انجام دینا پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں پر سرما کے موسم میں بھی بے چارے صحافی پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ آنا سب کرنے کے بعد جب دوسرے دن اخبار چھپتا ہے تو بے چارے صحافیوں کو ایک طرف اخبار کے مالکین کا سامنا ہوتا ہے تو دوسری طرف اپنے قارئین کا۔ پہلے تو ترجمے میں کوئی ایسی ویسی بات ہو جانے پر اسے مالکین کی خفگی سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور اس کے بعد قارئین کے ٹیلیفون اور خطوط آنے شروع ہوتے ہیں لیکن بے چارہ صحافی کی مشکلات پر کوئی غور نہیں کرتا۔

لیکن ان مشکلات کے باوجود یہ موضوع ایسا نہیں ہے جس سے آسانی کے ساتھ روگردانی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھا یا بُرا، تیز یا آہستہ یہ کام اردو میں جاری ہے اور اسے آئندہ بھی جاری رہنا چاہئیے۔ اب جب کہ حکومت ہند نے بھی اردو کے مسائل کی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہے اور اس سلسلے میں کچھ ٹھوس کام بھی کئے جا رہے ہیں اردو والوں کو چاہئیے کہ اس کام میں جُٹ جائیں۔ جب تک اردو ترجموں سے مالا مال نہ ہو وہ ایک ترقی یافتہ اور عصری ضروریات سے آراستہ زبان نہیں کہلا سکتی۔ ترجمہ کی ملازمت سے مسلسل تیرہ سال تک وابستہ رہنے اور صحافت کا بھی کچھ تجربہ رکھنے کے بعد میں اردو والوں اور خصوصاً پڑھے لکھے اور ادبی ذوق رکھنے والے طبقہ سے یہی کہوں گا کہ اردو میں طبع زاد معمولی ادب پیدا کرنے سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ انگریزی اور دیگر زبانوں کے اعلیٰ درجہ کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ یہ نہ صرف زبان و ادب بلکہ خود ان کے لئے بھی بہتر ہوگا۔

ooo

جلوس دل کے چراغوں کا یوں نکالا ہے　　　مرا پیام اندھیرا نہیں، اُجالا ہے

دل دُکھانا چھوڑئیے، دلربا بن جائیے　　　آپ پتھر کیوں بنے ہیں آئینہ بن جائیے

بادشاہی چاہئیے، قرب الٰہی چاہئیے　　　دل میں رہئیے اور ہونٹوں کی دُعا بن جائیے

محمد تقی

خانہ بدوش

ہم نے جغرافیہ کے مطالعے کے دوران متعدد خانہ بدوشوں کے طرز زندگی کا حال پڑھا تھا اور پڑھنے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ خانہ بدوش وہ ذی روح ہوتے ہیں جو ان پڑھ اور گنوار ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار سے نابلد ہوتے ہیں۔ اُن کا مقصد حیات غذا اور پانی کی تلاش ہوتا ہے جس کے لئے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ گھن چکر کی طرح گردش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں نہ تو اپنے لباس کی سُدھ بُدھ رہتی ہے اور نہ ہی آسمانی و سلطانی آفات کی پرواہ۔ جہاں شام ہوئی پنڈال ڈال دیا اور اپنے بال بچوں کے ساتھ محوِ خواب ہو گئے یا درختوں کے نیچے ڈھیر ہو گئے۔ ایسی گہری اور میٹھی نیند سوتے ہیں کہ عالی شان محلوں کے نرم گرم صوفوں پر سونے والوں کو بھی ایسی نیند نصیب نہیں ہوتی۔ نہ روٹی کی فکر، نہ منزل کا تعین یہ خانہ بدوش ہر ملک اور ہر خطہ زمین پر مختلف صورتوں اور حالتوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن سب کا مقصد حیات ایک ہی ہوتا ہے۔ غذا اور پانی کا حصول۔ ہاں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ یہ زیادہ تر شہری آبادیوں سے دور جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ شائد انھیں شہروں میں پائی جانے والی خود غرضی اور ریاکاری کا بخوبی علم ہے۔

لیکن ہمیں آج کل شہروں میں بھی خانہ بدوشوں کی بڑی تعداد روزمرہ کے مسائل سے برسرپیکار نظر آنے لگی ہے۔ یہ خانہ بدوش عربستان کے بدوؤں، کالاہاری کے بش مینوں اور وتناگیری کے کانکریوں سے کافی مختلف صورت و حالت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کو نہ صرف اپنائے ہوئے ہیں بلکہ ان کے علمبردار اور مبلغ بھی ہیں۔ آئیے

لکچرر: ڈاکٹر ذاکر حسین جونیئر کالج آف ایجوکیشن، پربھنی 431401 مہاراشٹرا

کے جسم کسی مشہور ملکی یا غیر ملکی ٹکسٹائل مل کے تیار کردہ نفیس اور چمکیلے کپڑوں سے دمکتے رہتے ہیں۔ یہ اپنے اظہار خیال یا اظہار مافی الضمیر کے لئے ان زبانوں کو استعمال کرتے ہیں جنہیں حکومت قانونی طور پر تسلیم کرچکی ہے۔ اپنے اظہارات کے لئے وہ اپنے دونوں بنیادی حقوق یعنی تحریر و تقریر کو استعمال کرنے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ پھر بھی ہم انہیں خانہ بدوش کہنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ یہ مسئلہ رہائش سے مسلسل نبرد آزما ہیں۔ ایسے تعلیم یافتہ اور ٹی۔ وی کے پروردہ افراد جنہیں مسئلہ رہائش دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے ہم انہیں صرف خانہ بدوش کہیں ــــ؟ نہیں۔

ہمیں قوی اندیشہ ہے کہ اگر ہم انہیں صرف خانہ بدوش کہتے ہیں تو وہ ہم پر پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑیں گے، ویسے ماضی میں ہم پر کچھ نادان پہاڑ بن کر ٹوٹے ہیں لیکن ہم بھی بہت سخت جان ہیں۔ ہمارا بال بیکا نہیں ہوا۔ مگر یہاں ہمیں احتیاط کرنے کی اشد ضرورت اس لئے پیش آرہی ہے کہ ان دنوں ہم بھی مسئلہ رہائش کی ڈوریں سلجھانے میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے بے گھر افراد کو خانہ بدوش کہتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ہم خود کو بھی غلاظت میں لپٹی ہوئی ایک موٹی گالی دے رہے ہیں۔ اس لئے اس رعایت سے ہم نے خانہ بدوش کے پیچھے ایک دُم چھلّہ لفظ 'مہذب' لگا کر خود کو اور اپنی برادری کے لوگوں کو بدوؤں کی صف سے نہایت ہی چالاکی کے ساتھ علیحدہ کر دیا ہے جیسے مکھن میں سے بال کو نکال دیا جاتا ہے۔

اب ہم اپنی خانہ بدوشی بلکہ خانہ خرابی کی داستان کا آغاز کرتے ہیں۔ کان دھر کر سنیئے۔ شاید آپ کو بھی اس میں اپنی خانہ بدوشی کی سرگذشتوں کی جھلکیاں نظر آئیں۔

جب ہم نے تلاش روزگار کے سلسلے میں پہلی مرتبہ اپنے ٹھنڈے سیلے اور وسیع و عریض مکان کو چھوڑا تھا تو ہماری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ ہاتھ، پیر شل ہوگئے تھے اور زبان سوکھ کر کانٹا بن چکی تھی۔ ہم نے اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہہ کر ایک شہر کی ایک گندی اور ماندی کوٹھری میں بسیرا کیا تھا۔ یہ دور ہماری کسمپرسی کا ایسا دور تھا جیسے ہمیں کسی نے تیر کے مہینے میں عین دوپہر کے وقت ایرکنڈیشنڈ روم سے اٹھا کر ہماری کمر میں اتنی زور سے لات ماری ہو کہ ہم چشم زدن میں روم کے باہر سلگتی ہوئی سڑک پر دھڑام سے آگرے ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے ہم اس کال کوٹھری میں نہ رہتے تو کہاں جاتے۔ بے روزگاری کا زمانہ تھا۔ کبھی خود پر اور کبھی حالات پر آنسو بہاکر ہم نے خون جگر کیا اور جوں توں کر کے زندگی کے چند برس اسی کال کوٹھری میں کاٹے۔

اس کال کوٹھری سے نکل کر ہمیں ملازمت کے سلسلے میں دور دراز کے مقام پر جانا پڑا۔ وہاں رہائش کا مسئلہ ایک نئی ادا سے ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ یہاں رہائش گاہوں کی افراط تھی۔ لیکن اقامت کے ساتھ ایک شرط ہوا کرتی تھی۔ وہ یہ کہ صاحب مکان کے بچوں کو درس دینا پڑتا تھا اور اس کے عوض وہ کرایہ دار سے کرایہ کا مطالبہ بھول کر بھی نہیں کرتا تھا۔ اس شرط سے انحراف کرنا آسمانی چھت والے مکان کے اندر زندگی گزارنے پر اکتفا کرنے کے مترادف تھا۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ہم مہذب "خانہ بدوش" جو تھے۔ بہرحال ہم نے یہ شرط بغیر چوں و چرا کئے قبول کر لی۔ مگر کچھ ہی دنوں میں پتہ چل گیا کہ ہم نے اس شرط کو قبول کر کے اپنی گھریلو زندگی کی آزادیوں کو مالک مکان اور ان کی بیوی کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ اب ہمارا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، کھانا پینا، یہاں تک کہ سونا بھی ان دونوں کی مرضی اور منشاء پر منحصر تھا۔ ہم بہت جلد اس مشروط رہائش گاہ اور پراگندہ ماحول سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک گاؤں نما شہر میں وارد ہوئے۔ ملازمت اچھی خاصی مل گئی تھی۔ لیکن اس گاؤں نما شہر کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کے تمام مکانات سخت اور سیاہ پتھروں سے تعمیر کئے گئے تھے۔ فرش تا چھت پتھروں کا استعمال بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے کیا گیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں کی زمین بھی پتھریلی تھی۔ طبیعت انتہائی ہری ہو گئی تھی ان مضبوط، پتھریلے مکانات کو دیکھ کر۔

اس گاؤں نما شہر میں ہم نے ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا اور اپنے دو عدد بچوں اور ایک عدد بیوی کے ہمراہ اس میں زندگی سے برسرپیکار ہو گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد اس مکان کی ایک دیوار جو خالص چٹانی پتھروں سے تعمیر ہوئی تھی اچانک منہدم ہو گئی۔ خدا کا کرم ہوا۔ ہمارے بال بچوں کی بلا ہمارے چلنی اور کانچ کے برتنوں پر ٹلی۔ ہم نے یہ مکان خالی کر دیا۔ اور دوسرے قلعہ نما مکان میں سر چھپایا۔ بارش کا موسم اپنے شباب پر تھا۔ مکان کی چھت میں کہیں بھی ایسا سوراخ نہ تھا کہ جس سے سوئی گزارنے کی خواہش پوری کی جا سکے۔ لیکن ہوتا یہ کہ جب بھی بارش ہوتی ایسا لگتا ہمارے سروں پر چھلنی ہے اور اس سے چھن کر آنے والا صاف و شفاف پانی ہمیں خواہ مخواہ نہلا رہا ہے۔ بیوی نے کہا کہ یہ آسیب زدہ مکان معلوم ہوتا ہے اسے فوراً خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ ہم نے بیوی کی بات ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سنی اور دوسرے کان سے باہر پھینک دی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ البتہ بچوں کی صحت کا خیال آتے ہی ہمارے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بالآخر ہم نے اس

علی بن ایاز

کاتبوں کی ناز آفرینیاں اور نکتہ نوازیاں

چھاپے کی ایجاد سے پہلے کتابوں کی فراہمی کاتبوں کی کاوشوں کی رہین منت ہوتی تھی
نف ایک کتاب لکھتا اور خواہشمند اس کتاب کی نقول کروالیتے تھے۔ جس کے لئے زرِ خطیر
ہ علاوہ وقت بھی کافی صرف ہوتا تھا۔ اور مرور مدت کے ساتھ کتابیں بھی تلف ہوجاتی تھیں۔
ا وجہ ہے کہ ہم عصر اور بعد کے مصنفوں کی کتابوں میں ان کے حوالے ملتے ہیں حالانکہ کتابوں
اب کہیں وجود نہیں۔ ظاہر ہے کتابوں کے وجود کے لئے مصنف کے بعد کاتبوں کی
بالاہمیت ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کی قدر و منزلت بھی کی جاتی تھی۔

کتابت کا مرحلہ یوں دیکھنے کو بہت آسان ہے مگر انسانی فطرت کی پیچیدگیاں اس میں
ا ندگی کے اور مراحل کی طرح زلف در زلف ہیں۔ آپ نے غالباً کتابت کے سلسلے کا وہ مشہور
لطیفہ تو سنا ہوگا۔ ایک اہل غرض نے قرآن مجید کا نسخہ ایک کاتب صاحب کو کتابت کے لئے
اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ نقل کرنے میں صحت کا خیال رکھیں۔ کاتب صاحب نے کام
تم کرکے نسخہ دیتے ہوئے کہا کہ میں نے صحت کا ممکنہ اہتمام کیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں ابلیس
یطان کے نام آئے ہیں میں نے انھیں بایں خیال حذف کر دیا کہ خدا کی کتاب میں دشمن خدا
م کیوں ؟ اس لئے اس جگہ میں نے کہیں اپنا اور اپنے باپ دادا کے اور کہیں آپ کا اور آپ کے
، دادا کے نام لکھ دیے ہیں، حصول برکت کی خاطر۔

چھاپہ کی ایجاد کے بعد بھی بیچارے مصنفین کاتب حضرات کے چنگل سے باہر نہیں آسکے
۔ ان کی ساری کاوشیں اب بھی ان کے دست ہنر پرور کی گرفت سے باہر نہیں ہیں۔
یاد دیکھا جائے تو معاملہ سیدھا سادھا ہے۔ مصنف نے لکھ دیا اور کاتب نے نقل
یا۔ مگر جیسے ہم نے کہا زندگی کی اور باتوں کی طرح یہاں بھی الجھنیں آتی ہیں۔ کہیں سہو نظری

کی وجہ سے، کہیں دانستہ، سہو نظری اور شعوری ہر دو طرح سے جو عجوبے پیدا ہوتے ہیں، اُن کے منجملہ چند کا ہم ذکر کریں گے۔ ان کا تعلق کچھ کاتبوں کی علمی سطح کی پستی و بلندی سے ہوتا ہے، اور ساتھ ہی نفسانی شرافت و شرارت سے بھی۔ کہیں صورت حال مضحکہ خیز ہوتی ہے اور کہیں فساد پرور کہ شیطان بھی سوچتا رہ جائے کہ خود کو استاد کہے یا کاتب صاحب کے فہرست تلامذہ میں اپنا نام لکھائے۔

"واقعات انیس" تالیف میر مہدی حسن احسن لکھنوی ص ۲۴ پر میر حسن نے (مصنف مثنوی بے نظیر) کے سنہ وفات پر قطعہ لکھا ہے:

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں
رواز یں گلزار رنگ و بو شتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی
شاعر شیریں زباں تاریخ یافت

کاتب صاحب نے "نطقش" کے قاف کا ایک نقطہ اڑا دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

محمد علی شاد عظیم آبادی اور صفیر بلگرامی ہم عصر تھے۔ صفیر بلگرامی کے شاگرد کا تذکرہ شائع ہوا تو اپنا نام بھی شاگردوں میں شریک دیکھ کر شاد عظیم آبادی چیں بر جبیں ہوئے اور بہ شد و مد تردید کی۔ صفیر کے صاحبزادے وصی کو ایک نوشتہ ہاتھ لگا۔ جس میں خود شاد نے لکھا تھا کہ " استاد من بود"۔ شاد نے کہا ان کی تحریر میں تحریف ہوئی ہے۔ میں نے "استاد فن" لکھا تھا۔ "ف" کا نقطہ اڑا کر کاتب نے من کر دیا۔

پروفیسر عبدالمنان بیدل نے کئی حج کئے تھے۔ ساتویں حج کو روانہ ہوئے تو اخبار میں خبر شائع ہوئی:-

"الحاج پروفیسر عبدالمنان پیدل حج کو روانہ ہو گئے"

شاگرد اور اعزہ پریشان کہ ۷۲ سال کی عمر میں پیدل حج کو جانے کی کیا تک تھی: وہ بھی گرمی کے دنوں میں۔ اخبار کے دفتر سے دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کاتب صاحب کے قلم اعجاز رقم کی نقطہ نوازی کے طفیل بیدل صاحب پیدل ہو گئے۔

حکیم صاحب نے مریض کے نسخہ میں اور دواؤں کے علاوہ آلو بخارا بھی لکھا: عادت کے مطابق الف کے مد اور بخارا کے نقطے نہیں دئے۔ کاتب صاحب نے نقل کر "الو بچارا"۔

ایک اور نسخہ میں مفرحِ صندلی کو کاتب صاحب نے مفرحِ صندلی بنا دیا۔

؎ جو چاہے آپ کا کلک کرشمہ ساز کرے

یہ مضحکہ خیزی کی مثالیں ہیں۔ ایک اور مثال مفسدہ پردازی کی ایک روزنامہ میں نظر سے گزری۔

۱۰/محرم کے خصوصی نمبر میں مختار بن عبید ثقفی کے نام کے ساتھ ایک وصفی نقطہ آیا تھا۔ مگر کاتب صاحب کے دستِ اعجاز رقم کی ہلکی سی جنبش نے اس نقطہ کو تعریف کی بجائے تنقیص بلکہ توہین کے درجہ پر پہنچا دیا۔ مختار ثقفی کا درجہ ایک فرقہ میں اتنا بلند ہے کہ ان کے نام کے ساتھ علیہ السلام لکھا جاتا ہے۔ غنیمت کہ اس پر کسی کی نظر نہیں پڑی یا کسی نے توجہ نہیں دی۔

غلطیوں سے کسی کتاب کو مبرا نہیں کہا جا سکتا۔ مگر غلطیاں نادانستگی کا نتیجہ ہوں تو مضائقہ نہیں لیکن جو دانستہ طور پر کی جاتی ہیں؟

یہاں ہم دانستگی (جس میں فتنہ پروری شامل تھی) کی بھی ایک دو مثالیں دیں گے۔ بہت عرصہ گزرا۔ پولس ایکشن سے بھی پہلے کی بات ہے۔ ایک مصنف نے اپنے افسانوں کا مجموعہ چھپوایا۔ عبارت کے ایک جملہ میں راتوں کی بے چینی کا ذکر تھا۔ کاتب صاحب نے از راہِ کرم راتوں کے 'ت' کے ایک نقطہ کو حوالۂ نسیاں کر دیا۔ لطف کی بات یہ کہ مصنف ان بیا ہے تھے۔ "راتوں کی بے چینی" نے انھیں کافی مدت تک ہم چشموں میں بے چین رکھا۔ انھی کاتب صاحب نے روزنامے میں کتابت کے دوران تبادلے اور تقرر کے کالم میں ایک چیف انجنیئر کے تبادلہ کی خبر دی۔ چیف کے لفظ کو لکھا تو 'چ' کے نقطے غائب کر دئے۔ 'ف' کی کمر میں ذرا سا لوچ دے دیا اور 'ف' کے مد کی بجائے صفحہ کا خفیف نیم دائرہ بنا دیا۔ جس کی وجہ سے وہ حیض انجنیئر بن گئے۔ ایڈیٹر صاحب رات کے جاگے سو رہے تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نے بیدار کر دیا۔ چونگا کانوں سے لگا دیا تو تند اور تلخ الفاظ کانوں میں سنسنی پیدا کرنے لگے۔ بہ ہزار دشواری انھیں ٹھنڈا کیا۔

یہ باتیں شاذ نہیں کوئی اخبار، کوئی کتاب اٹھا لیجئے۔ مثالیں بے شمار مل جائیں گی۔ مگر اس کا مداوا؟ کچھ نظر نہیں آتا۔

ایسی ویسی باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا جا سکتا ہے مگر بعض نکتہ نوازوں کی جدت

تلووں سے تالو تک جا پہنچتی ہے۔ اگر لکھنے والا ایسے میں یہ کہے تو کیا بیجا ہے

کاتب سے جا کے کہہ دے شاداب پڑھنے والے
تیری عنایتوں سے پالا خدا نہ ڈالے

■ ■

سلسلہ —

مکان کو بھی خدا حافظ کہہ دیا۔

اب ہم نے ایک تیسرے مکان میں پناہ لی۔ ابتدا میں مالک مکان نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی اور ہماری ہر طرح سے مدد کی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے تیور بدلنے لگے اور اس کے چہرے پر طمطے کی آنکھ نمودار ہونے لگی۔

موسم باراں ختم ہو چکا تھا۔ پھر ایک دن ایسا لگا کہ اچانک موسم سنگسار شروع ہو گیا۔ چھوٹے بڑے متعدد پتھر دیواروں اور چھت کو چھیدتے ہوئے ہمارے آنگن اور کمرے میں گرنے لگے۔ خدا نے اس دفعہ بھی ہماری حفاظت کی ورنہ ہم سب اللہ میاں کو پیارے ہو گئے ہوتے۔ جونہی پتھروں کی بارش تھمی، در و دیوار سلگ اٹھے اور تمام گھر موم کی طرح پگھلنے لگا ہم اپنی اور بال بچوں کی جان بچا کر فوری باہر نکل آئے۔

اب ہم نے ایک ایسی بستی کا رُخ کیا کہ جس کے تعلق سے مشہور تھا کہ یہ شریف زادوں کی بستی ہے۔ لیکن چند ہی دنوں کے تلخ تجربات نے ثابت کر دیا کہ ہم غلط جگہ پہنچ گئے تھے۔

اب ہم اس گاؤں نما شہر کو بھی ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکے ہیں اور ایک نئے شہر کے ایک گھر میں قیام پذیر ہیں کہ جو بے در و دیوار ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں ہم یہ امید باندھے ہوئے ہیں کہ ایک دن ضرور اس کے در و دیوار پر ہرا سبزہ اُگے گا۔

▲ ▲

وہ جس کا ہتھیلی پہ کبھی سر نہیں ہوتا — اس قوم کا دنیا میں کوئی گھر نہیں ہوتا

مسافر ہیں ہم بھی مسافر ہو تم بھی — کسی موڑ پر پھر ملاقات ہو گی

اس جانِ تغزل نے جب بھی کہا، کچھ کہیے — میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

رضوان رضوی

جہیز کے لالچی

خدابخش لائبریری میں آمدہ رضوان رضوی صاحب کی ایک دستاویزی پیشکش کے بموجب جہیز کی دبا اور اس کے نتیجے میں رشتوں میں زہر گھولنے کے ذمہ دار خود نوجوان کم، والدین زیادہ ہیں۔ لڑکی لڑکے والوں کے مابین جو خطوط کا تبادلہ ہوا وہ شاید آج ہر تیسرے گھر کی کہانی ہے ــــــ رضوان رضوی صاحب نے اس کا مندرجہ ذیل متن دیا ہے:۔

"کریم بھائی! آپ کا خط ملا۔ آپ نے پہلے جہیز کی فرمائش کے بارے میں جانکاری چاہی ہے۔ یہ تو میں قبل ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں شادی بیاہ کے برے رسم و رواج کو پسند نہیں کرتا۔ تلک یا جہیز کی فرمائش کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے گناہ اور سماجی نقطۂ نگاہ سے لعنت سمجھتا ہوں۔ آپ میرے لڑکے یا اپنی لڑکی کو جو دینا چاہیں دیں یا نہ دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا آپ کا یہ کہنا سو فی صد درست ہے کہ تلک جہیز کی لعنت نے کتنے ہی خاندانوں کو تباہ و برباد کیا ہے۔ لیکن انشاء اللہ میرے یہاں رشتہ کرنے سے آپ اس لعنت سے محفوظ رہیں گے۔ بہرحال یہ رشتہ بہت اعلیٰ ہے۔ آپ کی لڑکی صورت، سیرت اور صحت کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہے ہی پر علم و عقل، تہذیب و شائستگی، سب ہی کچھ ہے۔ ماشاء اللہ۔ اور یہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے قرآن پاک کی قرات اور تفسیر بھی سکھا دی۔ ورنہ اس ماڈرن زمانہ کے مسلمان کہاں ان چیزوں کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اس ماڈرن زمانے میں بھی آپ کی بچی تمام خوبیوں کی ایک مجموعہ ہے۔ اور پھر آپ کا شاندار فیملی بیک گراونڈ۔ میری بیگم کو یہ رشتہ بہت پسند ہے انہوں نے برادری والوں کو بتانے کے لئے آپ سے دریافت کیا ہے کہ جہیز میں سونے کے کون کون

ہے زیورات آپ دے رہے ہیں ؟

آپ کے جواب کا منتظر ــــــ شاکر علی

غریب پرور شاکر صاحب ! نوازش نامہ ملا ۔ رشتہ کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ !
رہے والدین کی اولاد اتنی تعریف کی مستحق کہاں ۔ میں نے تو دین اور دنیا دونوں کو ملحوظ رکھ کر
بچی کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا ہے ۔ آج تو ایسے مسلمان اکثر ملتے ہیں جو ابھی تک
تعلیم کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں پائے ہیں اور جو سمجھ بھی پائے ہیں تو ان میں سے لیے ہیں جو عربی
سے بھی تو دور رہے ۔ اپنے بچے اور بچیوں کو بجائے اردو میڈیم کے صرف انگریزی میڈیم میں تعلیم دلوا رہے
ہیں ۔ اردو سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ ایسی حالت میں اردو کیسے زندہ رہے گی اور پھر
اردو کے بغیر تہذیب کہاں ؟ بہر حال ۔ آپ کی بیگم نے جہیز میں سونے کے زیورات کے سلسلے میں
دریافت کیا ہے ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں انتہائی غریب آدمی ہوں ۔ بس دو بھر
سونے کی بالیاں دے دوں گا ۔ اور وہ بھی اس کی مرحومہ ماں کی ــــــ کمترین ــــــ محمد کریم ۔

کریم بھائی ! خط ملا ۔ پڑھ کر مسرت حاصل ہوئی کہ آپ دو بھر سونے کی بالیاں دے رہے
ہیں ۔ یہ کم نہیں ہے ۔ اب کہاں پرانے زمانے کی چیزیں نصیب ہوتی ہیں جب کہ سونا خالص ہوتا تھا ۔
اب تو ہر چیز میں ملاوٹ ہے ۔ اور ہاں یہ تو میں آپ کو قبل ہی بتا چکا ہوں کہ میں فرمائش کو ایک گناہ
سمجھتا ہوں ۔ مگر کریم بھائی ! کانوں میں دو بھر سونے کی بالیاں اسی وقت رونق دیتی ہیں جب گلے میں
دو بھر کا ہار بھی ہو ۔ آپ کوشش کریں ، ہمت اور حوصلہ بڑی چیزیں ہیں ۔ دنیا میں سب کچھ کوششوں
ہی سے حاصل ہوتا ہے ۔ ہمت مرداں ، مدد خدا ۔ اور ہاں ، جب آپ ہار کے لئے کوشش
کریں گے تو دو بھر کنگنوں کے لئے بھی لگے ہاتھ کوشش کر لیجئے ۔ اس میں آپ ہی کی عزت ، شہرت
اور نیک نامی ہے ۔ مخلص ــــــ شاکر علی

غریب نواز شاکر صاحب ! نوازش نامہ ملا ، میں سونے چاندی کے زیورات سے زیادہ اہم
زیور تعلیم کو سمجھتا ہوں ۔ کیا میری بچی میں زیور علم کم ہے ؟ نیاز آگیں ــــــ محمد کریم

کریم بھائی ! آپ کا خط ملا ۔ میں آپ کے خیالات اور جذبات کی قدر کرتا ہوں ۔ لیکن یہ آپ
ذہن نشین کر لیں کہ آج کل سماج میں سونے چاندی کی اہمیت زیادہ ہے ۔ زیور علم کی قدر کرنے
والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں لیکن میں بذات خود زیور علم کی قدر کرتا ہوں ۔ پھر بھی آج کے
بدلتے ہوئے حالات میں اگر آپ اس ماڈرن سوسائٹی کو شکست دینا چاہتے ہیں تو زیور علم
سے ہٹ جائیے ۔ دو بھر کی بالیاں ، دو بھر کا ہار اور دو بھر کا کنگن بہت شاندار سٹ رہے گا ۔ اور

یہ آپ کی ہمت مردانہ کے آگے کوئی مشکل نہیں۔ اللہ پر بھروسہ کرکے آج ہی آرڈر دے دیجئے۔
رقم کا انتظام کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جائے گا۔ انشاء اللہ۔ اور ہاں فرنیچر میں آپ کیا دے رہے ہیں؟
جواب کا منتظر ـــــ شاکر علی

کرم فرما شاکر صاحب! آپ نے فرنیچر کے بارے میں دریافت کیا ہے تو عرض ہے کہ
سی بھی طرح سے ایک مسہری دے دوں گا بستر سمیت۔ آپ کی نوازشوں کا غلام ـــ محمد کریم

کریم بھائی! یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ بستر سمیت ایک مسہری دے رہے ہیں۔ تو
را لگے ہاتھ یہ بھی بتا دیں کہ ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ آپ کتنی کرسیاں دے رہے ہیں؟
نیک خواہشات کے ساتھ ـــ شاکر علی

غریب پرور شاکر صاحب! خلوصِ بیکراں! نوازش نامہ ملا۔ آپ نے ڈائننگ ٹیبل کا
کر کیا ہے جس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا اور نہ ابھی اس پر غور کرنے کے لئے میرے
س وقت ہے۔ میری حالت پر رحم کیجئے شاکر صاحب۔ عین نوازش ہوگی۔ خاکسار ـــ محمد کریم

کریم بھائی! خط ملا۔ آپ کے علم میں اضافہ کے لئے عرض ہے کہ آج کل بیڈروم اور ڈائننگ روم
نیچروں کے درجنوں ڈیزائن نکل آئے ہیں۔ کوئی بات نہیں اگر آپ نے اپنی مصروفیات
ں ابھی تک ڈیزائن کے انتخاب پر غور نہیں کیا ہے تو کسی دن وقت مقرر کرکے آپ میرے ساتھ
نہ چلیں۔ وہاں مختلف نمونے دیکھ کر ہم دونوں ایک رائے پر متفق ہو جائیں گے۔ اور ہاں یہ
ں آپ لڑکے کو کون سی گھڑی دے رہے ہیں۔ بہتر ہے ہم لوگ پٹنہ میں ہی لڑکے کے لئے سیکو فائیو
ڑی خرید لیں گے۔ کل ہی لڑکے نے میرے سامنے ٹی۔ وی کا ذکر کیا تھا لیکن میں نے آپ کی حالت
پیش نظر فوراً ہی اسے ڈانٹ پلائی۔ اس لئے کریم بھائی! آپ ٹی۔ وی کے لئے فکرمند نہ ہوں
ا پٹنہ ہی میں ہم لوگ بجائے ٹی۔ وی کے ایک عمدہ سا ٹیپ ریکارڈ خرید لیں گے۔ اسکوٹر کے
ے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک لونا کافی ہے۔ انشاء اللہ میں لڑکے کو مطمئن کرلوں
مخلص ـــ شاکر علی

میرے کرم فرما شاکر صاحب! سونے کے زیورات، فرنیچر، سیکو فائیو گھڑی، لونا اور
ا۔ وی کے مطالبات تو مجھے ٹی۔ بی میں مبتلا کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے اس مبارک مرض سے
بچائیے۔ شاکر صاحب، میری حالت پر رحم کیجئے۔ میں انتہائی غریب آدمی ہوں۔ احقر ـــ محمد کریم

کریم بھائی! یہ تو میں قبل ہی کئی بار آپ کو یقین دلا چکا ہوں کہ میں جہیز کا قائل نہیں۔ مجھے آپ کی
لیا مالی کا احساس ہے۔ لیکن جو جہیز آج کے سماج میں رائج ہے وہی تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔

اگر آپ انہیں مطالبہ سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی حماقت ہے۔ مطالبات پر لعنت بھیجئے کریم بھائی، لیکن ہاں آجکل غریبوں کے لئے فرنیچر، گھڑی، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ خریدنا بالکل آسان ہوگیا ہے۔ ان دوکان والوں سے میرے اچھے تعلقات بھی ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی مجبوری ہو تو میں قسط پربات کرادوں گا۔ آپ بروقت نصف قیمت ادا کر کے اسٹامپ کا کاغذ لکھ دیجئے گا اور بس اللہ اللہ خیر سلا۔ آپ کے مکان پر بینک کا قرض بھی مل سکتا ہے یا اگر آپ اپنی بچی کے نباہ کے لئے اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو بلا جھجک فرمائیں انشاء اللہ میں خریدار بھی مہیا کردوں گا۔ خیر جو آپ بہتر سمجھیں۔ میں آپ کا ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ لڑکے کی ماں نے دریافت کیا ہے کہ دولہا کے نکاحی جوڑے کے لئے آپ نے کتنی رقم رکھی ہے؟

مخلص ـــــ شاکر علی

میرے مہربان شاکر صاحب! نکاحی جوڑے کے لئے میں نے پانچ سو روپئے الگ کردئیے ہیں۔ اگر آپ کی بیگم فرمائیں گی تو پھر کسی طرح ساڑھے پانچ سو کردوں گا، اس سے زیادہ کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے۔

خاکسار ـــــ محمد کریم

کریم بھائی! خط ملا۔ نکاحی جوڑے کے لئے پانچ سو بہت ہی کم ہیں۔ آج کل درزی ہی ایک سوٹ کی سلائی ڈھائی تین سو روپئے لے رہے ہیں۔ آپ کو نقد رقم دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ کسی دن وقت مقرر کر کے خود لڑکے کو اپنے ساتھ مارکٹ لے جائیں۔ وہاں وہ اپنی پسند کے تمام ضروری سامان خرید لے گا۔ آپ بل ادا کر دیجئے گا۔ اس سے زیادہ سہولت میں آپ کو اور کیا دے سکتا ہوں۔

نیاز آگیں ـــــ شاکر علی

غریب پرور شاکر صاحب! آپ کی فہرست کافی موٹی ہوتی جارہی ہے اور میں دبلا ہوتا جارہا ہوں۔ ذرا آپ اپنی فہرست کی صحت اور اس غریب کی صحت میں موازنہ کیجئے تو یقیناً آپ کو مجھ پر ترس آئے گا۔ اس لئے میری حالت پر رحم کیجئے شاکر صاحب۔ میں ایک فقیر اور درویش آدمی ہوں اور آپ سے درویش نوازی کی امید رکھتا ہوں۔

کرم کا طالب ـــــ محمد کریم

کریم بھائی! ہمارے آباؤ اجداد بھی درویش تھے۔ مگر اب زمانے کے نئے نئے تقاضوں کے تحت درویشی بھی رنگ بدل رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ تو خود ہی عقلمند ہیں اور زمانے کی نبض کو پہچانتے ہیں۔ آمنا تو درویش سے درویش والدین بھی اپنی بیٹی کے لئے کیا کرتے ہیں۔ بہر حال لین دین کی تمام باتیں طے پاجانے کے بعد اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو بعد نماز مغرب رسم منگنی کے لئے پچاس عورتیں (علاوہ ان کے بچے) اور ایک سو مرد آپ کے یہاں

جائیں گے ۔ خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ رہے اس بات کا خاص خیال رکھیں گے ۔ کیونکہ تمام مضافات قوم کے بہی خواہ اور ہمدرد ہوں گے ۔ یعنی خادم قوم ۔ ان کی ہر طرح کی عزت افزائی ضروری ہے ۔ شادی کی تاریخ بعد میں طے کی جائے گی ۔ جس کے لئے صرف پچیس مرد جائیں گے ۔ اور اس بات کو بھی قبل از وقت ذہن نشین کرلیں کہ یم بھائی کہ باراتی تقریباً تین سو ہوں گے علاوہ نوے عورتیں ۔ ویسے ہمارے تعلقات کے ہزاروں آدمی ہیں ، لیکن چونکہ آپ غریب آدمی ہیں اس لئے آپ پر زیادہ بوجھ ڈالنا میں مناسب نہیں سمجھتا اور یہ مختصر تعداد قبل از وقت بتا دینا اس لئے ضروری سمجھا تا کہ آپ کو انتظام کرنے میں سہولت ہو ۔ اور ہاں لڑکے کی ماں نے دریافت کیا ہے کہ آپ لڑکے کو کتنی سلامی دے رہے ہیں ؟ آپ کے جواب کا سخت انتظار رہے گا

مخلص ——— شاکر علی

اپنی پریشان اور بدحال قوم کے ہمدرد شاکر صاحب ! سُن لیں ، میں علم و عقل اور شرافت کا رسیا ہوں اور اپنی قوم کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم و عقل اور شرافت کی روشنی سے منور دیکھنا چاہتا ہوں ۔ کہنے سے زیادہ عمل پر یقین رکھتا ہوں ۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر باپ اپنی بیٹی کو اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ ہی سامان دیتا ہے لیکن من مانا مطالبہ قوم اور سماج کے نام پر ایک کلنک ہے ، ایک ناسور ہے ۔ میں جہالت اور جہیز کی لعنت کو ختم کرنے ، دقیانوسی سماج کی دیواروں کو ڈھانے اور فرسودہ رسم و رواج کو توڑنے کا تہیہ کرچکا ہوں ۔ مجھے کہہ لینے دیجئے کہ لڑکے کے مفاد پرست اور خود غرض والدین جہیز کے لالچ میں خوشی کا بھی کوئی خیال نہیں کرتے لیکن جب خود ان کی لڑکی کی شادی کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے تو اس وقت وہ ان من مانا مطالبات ، دقیانوسی سماج اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف لمبی چوڑی تقریریں کرتے نہیں تھکتے ۔ اس سماج میں کچھ ایسے رنگروٹ بھی ہیں جو اوپر سے تو جہیز کی سخت مخالفت کرتے ہیں لیکن اندر سے لمبے چوڑے جہیز کے متمنی ہوتے ہیں ۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نوجوانوں سے کہیں زیادہ ان کے والدین جہیز کے لالچی ہوتے ہیں ۔ من مانے مطالبات نے کتنے ہی خاندانوں کو زکوٰۃ اور خیرات لینے پر مجبور کردیا ہے ۔

آپ کی بیگم نے سلامی کی بابت بھی دریافت کیا ہے ۔ تو میری ان تلخ حقیقتوں کی سلامی انھیں پیش کردیں ۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سن لیں کہ میں آپ جیسے قوم دشمن ، لالچی اور بھیک منگے کے یہاں رشتہ نہیں کرنا چاہتا ، آپ کوئی اور گھر دیکھ لیں ۔

فقط ——— محمد کریم "

سازینہ

نظم

ئے
بح سے ہی کوئی
یرا من کھٹکھٹاتا رہا، کھٹکھٹاتا رہا
یہ دستک پہچانتی تھی
جانتی تھی
کون ہے، کیوں آیا ہے
ب تھی
اکثر کی طرح مجھے بھی کوئی وچن دینا تھا
عریاں کی کوکھ سے نکلا
تمھاری عمر کا ایک اور جنم
ور میری اندھی ہتھیلیاں!!
کون سا وچن دوں گی؟

تمھاری زندگی کا ایک اور سال
آج مجھے پکار پکار کر جگاتا رہا
میں آنکھ میچے تھی
کہ تم مجھ سے پچھلی باتوں کا
حساب مانگو گے

اپنے حرفوں کا اعتماد
اپنے پیار کا دیپ
جو تم نے میری پیشانی پر جلا دیا ہے
اور تمھارے ہاتھ جو میری بندیا کو
رہ رہ کر چومتے رہے
تمھارے ہونٹ
جو ہر بار مجھے بلاتے رہے، بلاتے رہے
ان سب کا حساب کیا ہے میرے پاس؟
اس لئے۔
تمھاری عمر کے اس جنم کو پکار کو
ایک بار پھر میں نے جھٹلا دیا
اور
ایک بار پھر
اندھی ہونے کا شاپ
اوڑھ لیا ——

خوش رہنا!!!

معرفت پراروپ پرکاشن۔ قادری منزل۔ بٹیا ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خان منشاء

غزل

دیکھ کے رنگِ فصلِ بہاراں ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو
غنچہ و گل ہیں سر بہ گریباں ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

سہما ہوا ہے پتہ پتہ، ڈالی ڈالی لرزاں ہے.....!
اہلِ گلشن سب ہیں ہراساں، ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

مسکانوں کے خول میں کتنے درد کے جلتے شعلے ہیں
ہر کوئی ہے شعلہ بہ داماں، ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

بارِ غم سے سانس بھی لینا دوبھر ہوتا جاتا ہے
ٹوٹ رہے ہیں تارِ رگِ جاں، ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

جس کو دیکھو وہ الجھا ہے اپنی اپنی الجھن میں
ہر دل میں ہے کربِ طوفاں، ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

بزمِ طرب سے دار و رسن تک سناٹا ہی سناٹا ہے
وقت کے ہاتھوں سب ہیں پریشاں، ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

اجیالوں پر ہر جانب سے اندھیاروں کا دھاوا ہے
حق ہے نگوں سر، باطل خنداں، ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

وحشی درندوں سے بھی بڑھ کر خونخواری پہ اترے ہیں
انسانوں کے حق میں انساں، ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

آج کے اہلِ دانش منشاؔ، آج کے یہ اربابِ نظر
زندہ حقائق سے ہیں گریزاں، ہم بھی چپ ہیں، تم بھی چپ ہو

۱۱۔ اسٹار کی ٹاؤن۔ ناگپور

صولت حسین عمّا

رنگِ خوں ہے نامِ دوست
کردوں رنگیں شامِ دوست
وقفِ ظلمت میرا گھر
جگمگ جگمگ بامِ دوست
دل ہے شمعِ میخانہ
چشمِ روشن جامِ دوست
ایفاءِ وعدہ طلبِ عشق
وعدۂ فردا کامِ دوست
رہبر، رہرو، رہزن ُرک
منزل، منزل دامِ دوست
بغض و کینہ فعلِ غیر
پیار، مروت کامِ دوست
دیکھ ثریا کوچۂ دل
پنہاں ہوں گے گامِ دوست

ہائی کورٹ، ۳۳ سیول لائنس، ناگپور ۴۴۰۰۰۱

صفدر امام قادری

رات کی آنکھ میں کیسا پانی
روح کی دھوپ کا میلا پانی
رو نقیں عہد کی آکاش تلک
اپنی مٹی میں سہانا پانی
درمیاں دوری تھی کیسی حائل
ایک دھاگے سے بٹا تھا پانی
پانی پانی کا بیاں، ہائے کل
ریت کی یاد میں رویا پانی
پیاس دھرتی کی بجھانے کے لئے
اوس کی آنکھ سے ٹپکا پانی
اس کے جینے کا فسانہ پوچھیں
دردکی کوکھ سے اچھلا پانی
آپ کے ذوق کی باتیں صفدر
اس گلی میں ہے جو ٹھہرا پانی

قادری منزل، بتیا (بہار) ۸۴۵۴۳۸

غزل

مومن خاں شوق

پہلے پہلے جب دیکھا تھا ❀ وہ بالکل اپنا لگتا تھا
رستہ رستہ پھول کھلے تھے ❀ قدم قدم احساسِ وفا تھا
ساری دنیا گھر آنگن تھی ❀ اس سے مل کر یوں لگتا تھا
دریا دریا رحمت رحمت ❀ چہرہ چہرہ جیسے دعا تھا
وہ ساعت بھی کیا ساعت تھی ❀ قطرہ جب طوفان بنا تھا

شوق جنونِ عشق سلامت
صحرا میں بھی پھول کھلا تھا

اشرف ولا ۲۳/۷-۳-۱۱ اسٹے پل، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

علامہ خضر برنی

نام زد کس کو کروں، کون سا گھر ہے اپنا
ایسا ہوتا ہے گماں دیکھ رہا ہوں اک خواب
کر رہے ہیں مرے حالات ہی مجھ کو مسموم
شاخ سے ٹوٹ کے اک پھول ہوا ہے بے نور
کیسے گزرے گی یہی سوچ رہا ہوں دل میں
وہ بھی عالم تھا مسرت تھی پچھا در بھی
روشنی کیا، مرا سایہ بھی جدا ہے مجھ سے
شب کو محسوس ہوا کرتا ہے اکثر یہ خضر

ساری دنیا کی فضاؤں میں سفر ہے اپنا
واہمہ ساتھ میں اک شام و سحر ہے اپنا
جیسے ہر روز ہی بس رخت سفر ہے اپنا
جسم کے ساتھ میں جڑتا نہیں سر ہے اپنا
بوجھ بھاری ہے بہت لمبا سفر ہے اپنا
ساری رونق ہی گئی، درد مگر ہے اپنا
کیسے کہہ دوں گا کوئی نور نظر ہے اپنا
درد ہوتا ہے جہاں قلب و جگر ہے اپنا

مولانا محمد علی جوہر مارگ
جامعہ نگر ۔ نئی دہلی 110025

غزلیں

قاضی انصار

وہ مجھ پر بار ہو کر رہ گیا ہے
گلے کا ہار ہو کر رہ گیا ہے
زمانہ اس مشینی دور میں ہے
فقط اخبار ہو کر رہ گیا ہے
جہاں جائے گا تو محرومیاں ہیں
کہ تو فنکار ہو کر رہ گیا ہے
طلب کرنے کو اپنا حق کہیں پر
قلم تلوار ہو کر رہ گیا ہے
اسے کہتے ہیں اسم با مسمیٰ
کوئی انصار ہو کر رہ گیا ہے

قاضی پورہ، کھنڈوہ ۔ 450001 (ایم پی)

شادان احسانی

کون بیدار مست خواب ہوا
اک زمانے میں انقلاب ہوا
بڑھ گئیں بیقراریاں دل کی
اک قیامت ترا شباب ہوا
دیکھ کر پڑھتا ہوں بتوں کو درود
کفر بھی داخل ثواب ہوا
زندگی کا مآل دیکھ لیا
جب فنا پھوٹ کر حباب ہوا
سینکڑوں مٹ گئے محبت میں
کوئی اب تک نہ کامیاب ہوا
دو جہاں سے حجاب اٹھے شاداں
جب رخ یار بے نقاب ہوا

بیگم پارک، رامیشور روڈ، بڑا لعل باغ، کھنڈوہ، ایم پی

ڈاکٹر محبوب راہی

رباعیات

ملت اسلامیہ کے نام

ملت کے پرستارو ذرا غور کرو
اے قوم کے معمارو ذرا غور کرو
ملت کو عمل چاہئے تقریریں نہیں
شہرت کے طلب گارو ذرا غور کرو

شیرازۂ ملت نہ بکھر جائے کہیں
یہ عارضہ حد سے نہ گزر جائے کہیں
سوچو! اے مسیحاؤ کوئی اس کا علاج
ماقبل کہ بیمار نہ مر جائے کہیں

یہ فرق عقائد کے، یہ مسلک کے تضاد
ہیں کچھ یہی باتیں سبب بغض و عناد
سوچو کہ اک عالم ہے تمہارا دشمن
اور تم ہو کہ آپس ہی میں مائل بہ فساد

خوں ریز فسادات چلیں گے کب تک
ناگفتہ بہ حالات چلیں گے کب تک
اک دہشت پیہم کے ہیں سائے جن پر
سوچو کہ یہ دن رات چلیں گے کب تک

یوں ابتر و بدحال کہاں تھے پہلے
اس حد پہ بھی کنگال کہاں تھے پہلے
ہاں! پارسا پہلے بھی نہ تھے ہم لیکن
اتنے بھی بد اعمال کہاں تھے پہلے

اس دین پہ ایمان جو ہے سب کچھ ہے
اللہ کا فرمان جو ہے سب کچھ ہے
کہہ دو، چلے جس راہ پہ چاہے دنیا
ہم کو تو یہ قرآن جو ہے سب کچھ ہے

اللہ کا فرمان نہیں بدلے گا
یہ دین، یہ ایمان نہیں بدلے گا
کوشش جو کرے اس کو بدلنے کے لئے
کہہ دو کہ مسلمان نہیں بدلے گا

شوریدہ خیالات کا حاصل کیا ہے
بہکے ہوئے جذبات کا حاصل کیا ہے
جن کا کوئی مفہوم نہ ہو اُن سارے
لایعنی سوالات کا حاصل کیا ہے

اپنے کو مہربان بنالو پہلے
خود کی کوئی پہچان بنالو پہلے
شیطان کو شیطان ہی رہنے دو ابھی
انسان کو انسان بنالو پہلے

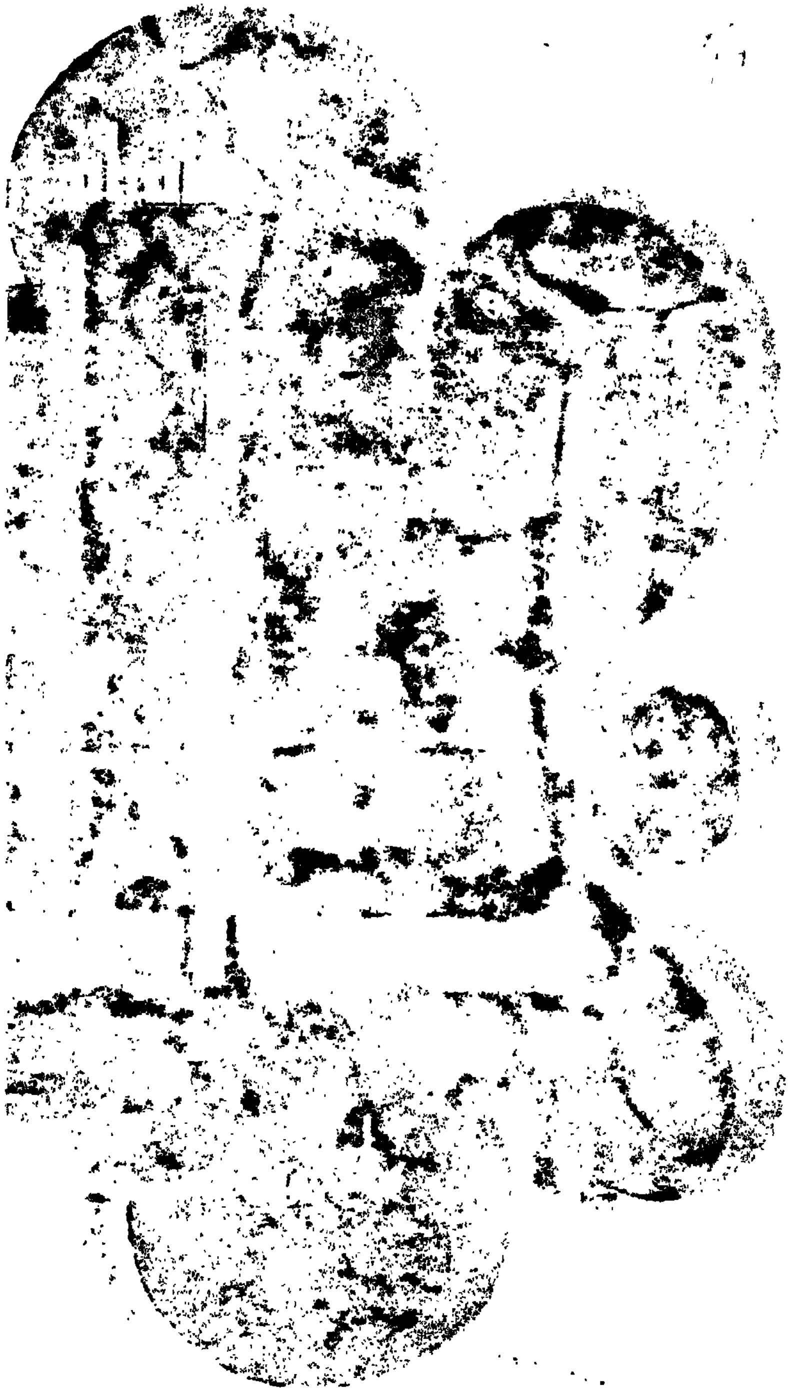
ایثار کے شعلوں سے گزرنا ہوگا
عزت سے جو جینا ہے تو مرنا ہوگا
رکھنا ہے اگر اپنے تشخص کا بھرم
اک قوت نو بن کے ابھرنا ہوگا

ادبار کے پنجوں سے نکل سکتے ہیں
ہر قوت باطل کو کچل سکتے ہیں
اسلام پہ گر متحد ہو جائیں تو
ہم آج بھی دنیا کو بدل سکتے ہیں

نزد گلزاری مسجد۔ بارسی ٹاکلی 444401 ۔ضلع اکولہ (مہاراشٹرا)

ماہنامہ

حیدرآباد



جلد ۲ ۔ شمارہ ۱۱ ۔ قیمت ‎5/-‎ روپے ۔ نومبر سنہ ۱۹۸۶ء

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا آئینہ

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری مینیجنگ ایڈیٹر: محمد کلیم الدین احسن

شرح تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
سالہ	90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
حیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ :

11-5-147 ، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004 (اے پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل پروسیس پرنٹرس، کان میں
چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد ۔ ۴ آندھرا پردیش سے شائع کیا۔

فہرست

اردو زبان اول

حکومت آندھرا پردیش نے اردو والوں کے مطالبہ پر جی - او نمبر ۴۹۲ مورخہ ۴ جولائی ۱۹۸۶ء کے ذریعہ احکام جاری کئے ہیں کہ اردو زبان اول کی حیثیت سے جماعت اول سے پڑھائی جائے گی ۔ اردو میڈیم اسکولوں میں تیلگو بحیثیت زبان دوم جماعت سوم سے رائج کی جائے گی اور سہ لسانی فارمولے کے تحت تیسری زبان کے طور پر انگریزی یا ہندی آٹھویں جماعت سے پڑھائی جائے گی ۔ متحدہ اردو مجلس عمل نے اردو ہال میں ایک پریس کانفرنس میں ان احکام پر حکومت کا شکریہ ادا کیا ۔ ساتھ ہی اپنے اس مطالبہ کو دہرایا کہ تیسری زبان انگریزی یا ہندی آٹھویں جماعت کے بجائے چھٹی جماعت سے رائج کی جائے ۔ ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ چھٹی جماعت ادنیٰ ثانوی مرحلہ کی آخری اور اعلیٰ ثانوی مرحلہ میں داخل ہونے کا پہلا زینہ ہے عام طور پر بچے تحتانی تعلیم کے بعد سلسلۂ تعلیم ترک کر دیتے ہیں ۔ جو بچے اعلیٰ ثانوی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے چھٹی جماعت سے انگریزی یا ہندی کی تعلیم کے باعث وہ دسویں جماعت میں پہنچنے تک اس زبان سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر سکتے ہیں ۔ شاداب اردو کے لئے حکومت کے احکام کا شکریہ ادا کرتا ہے ۔ نیز اس مطالبہ میں متحدہ اردو مجلس عمل کا شریک ہے کہ تیسری زبان انگریزی یا ہندی کی تعلیم آٹھویں کے بجائے چھٹی جماعت سے شروع کی جائے ۔

سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کی حد تک ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے مدارس میں اردو والوں کے لئے اردو بہ حیثیت زبان اول جماعت اول سے پڑھائی جائے اور تیلگو بہ حیثیت زبان دوم جماعت سوم سے ۔ تیلگو میڈیم اسکولوں میں تلگو زبان اول کے علاوہ اردو مادری زبان بہ حیثیت زبان دوم تیسری جماعت سے پڑھائی جائے اور تیسری زبان انگریزی چھٹی جماعت سے ۔ اردو میڈیم اسکولوں میں اردو مادری زبان بحیثیت زبان اول جماعت اول سے ، تیلگو بحیثیت زبان دوم تیسری جماعت سے اور تیسری زبان انگریزی یا ہندی چھٹی جماعت سے ۔

ہندی قومی زبان ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اردو والے ہندی سے نابلد اور قومی دھارے سے الگ رہیں۔ متحدہ اردو مجلس عمل نے تجویز پیش کی ہے کہ اردو مادری زبان والے طلباء اسکولوں میں اردو، تیلگو اور انگریزی تین زبانوں کی تعلیم حاصل کریں اور ہندی سے واقفیت کے لئے ہندی پرچار سبھا کا ہندی ڈپلوما کورس مکمل کریں۔ اس خصوصی کورس کی تکمیل کرنے والے طلباء ہندی پر کافی عبور حاصل کر سکتے ہیں اور حکومت بھی اس ڈپلوما کورس کو تسلیم کرتی ہے۔ نیز تینوں زبانیں پڑھنے کے بعد ان میں اتنی لسانی واقفیت پیدا ہو جائے گی کہ ہندی پر آسانی سے عبور حاصل کرنے کے قابل ہوں گے۔ اس حد تک ہماری تجویز یہ ہے کہ ہندی پڑھانے کا انتظام بھی مدارس میں ہونا چاہئے۔ آج بھی مدارس میں اردو کے ساتھ ہندی پڑھا کر ایک کمپوزٹ کورس کے ذریعہ دونوں زبانیں ایک ساتھ پڑھائی جا رہی ہیں۔ اردو مادری زبان والے طلباء کے لئے ہمارا مطالبہ ہے کہ اس کمپوزٹ کورس کو جاری رکھا جائے۔ اردو اور ہندی میں سوائے رسم الخط کے کوئی فرق نہیں ہے اور طلباء دونوں زبانیں ایک ساتھ بغیر کسی مشکل کے سیکھ سکتے ہیں۔

ترقی اردو بورڈ

اردو کتابیں شائع کر کے ترقی اردو بورڈ اردو کے لئے جو کام کر رہا ہے وہ غیر معمولی اور بے مثال ہے۔ اس کے لئے ہم سربراہان بورڈ اور مرکزی حکومت کے مشکور ہیں۔ آل انڈیا اردو کانفرنس کے مطالبہ پر سربراہان بورڈ نے یہ تیقن دیا کہ بہت جلد بورڈ کا ایک ریجنل دفتر حیدرآباد میں کھولا جائے گا تاکہ جنوب میں بورڈ کے کام میں سرعت پیدا کی جائے۔ بورڈ کی جانب سے کالج اور مدارس کے لئے اردو نصابی کتب کی تیاری میں تیزی پیدا کرنا بھی مقصود ہے۔ یقین ہے کہ حیدرآباد کا ریجنل دفتر اس کام کو بہ عجلت ممکنہ بحسن و خوبی انجام دے سکے گا۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ یہ دفتر جلد از جلد قائم کر دیا جائے تاکہ نصابی کتب کی تیاری میں اشاعت جلد ہو نیز شائع شدہ اردو کتب کی تقسیم اور فروخت بھی موثر طور پر ہو سکے

اردو میڈیم اقامتی اسکول

ایک عرصے سے اردو والوں کا مطالبہ تھا کہ ہماری ریاست کے تین علاقوں آندھرا، تلنگانہ اور رائل سیما میں ایک ایک اردو میڈیم ریزیڈنشیل اسکول قائم کیا جائے۔ حکومت نے فی الوقت ایک

ریزیڈنشیل اسکول کی منظوری دی ہے۔ جس کے لئے عمارت فراہم کرنے کی ذمہ داری
قطب شاہ ڈولپمنٹ اتھارٹی نے اپنے ذمہ لی ہے۔ اسکول پرانے شہر حیدرآباد
میں قائم کیا جائے گا۔ افسوس ہے کہ ابتدائی اعلان کے جواب میں کافی درخواستیں
خواہشمند طلباء کی جانب سے وصول نہیں ہوئیں۔ ہم حکومت اور ریزیڈنشیل اسکول
سوسائٹی کے شکر گزار ہیں کہ درخواستوں کی وصولی کی تاریخ اور سلیکشن لسٹ کی
تاریخوں میں توسیع کر کے اردو والوں کے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ وہ
اپنے بچوں کو اس اسکول میں داخل کروا سکیں۔ یہ اقامتی اسکول ایک مثالی اسکول
ثابت ہوئے ہیں اور ان میں زیر تعلیم طلباء کا معیار تعلیم نہایت اعلیٰ ہے۔
ہمیں امید ہے کہ اردو والے حکومت کے اس تصفیہ سے زیادہ سے زیادہ
استفادہ کریں گے۔ تاکہ حکومت ایسے اور زیادہ اسکول قائم کرنے پر
مائل ہو۔

(سلسلہ ص…)

بھی روشنی پڑتی ہے۔ خصوصاً جہاں مہادیو دلیسائی (= بھولا بھائی ڈیسائی) کے بارے
میں بحث ہے۔ محمد یونس صاحب نے کہا مزید روشنی جان مستانی کی کتاب سے بھی
پڑتی ہے۔ نقی احمد ارشاد صاحب نے کہا شبلی کی تصانیف پر جو اس عہد میں لکھی
گئیں جن کا احاطہ دسنوی صاحب نے کیا ہے ان تصانیف پر بھی ہلکی روشنی ڈال دی
جاتی تو بہتر تھا۔ عابد رضا بیدار صاحب نے کہا ذوقِ جمال منفی نہیں، مثبت قدر ہے
اور اس کی روشنی میں شبلی کی مثبت شخصیت کو منفی شخصیت میں ڈھالنا شبلی
کے ساتھ خیر خواہی ہے نہ انسانی نفسیات کے ساتھ انصاف۔ تاہم اس مضمون کی خوبی
یہ ہے کہ اس میں وحید قریشی، اکرام اور امین زبیری کے مقابلے پر ایک مضبوط قلعہ
دسنوی صاحب نے تعمیر کیا ہے اور بڑی حسن کاری کے ساتھ اس کے نقش و نگار
ابھارے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ تنقید کے ساتھ تحقیق کا حق بھی ادا کیا ہے ▲▲

(سلسلہ ص…)

زبانوں کے مصرعے ہیں لیکن ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ
طباطبائی نے بھی اس شعر کی تقطیع بنیادی اوزان سے ہٹ کر محض ثانوی وزن میں کی تھی۔

علامہ شبلی اور بمبئی

ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ (قائم کردہ قاضی عبدالودود) کے خبرنامہ سے ظاہر ہے کہ ادارہ مذکور کی ادبی محفل کا افتتاحی مقالہ جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب نے پیش کیا۔ دسنوی صاحب کے مقالہ کا عنوان تھا "علامہ شبلی اور بمبئی" جس میں انھوں نے بمبئی میں شبلی کی قیام گاہوں پر ریسرچ سے لے کر بمبئی کی عطیہ بیگم فیضی رحمین بدرالدین طیب جی اور بمبئی ہی میں ان کے ساتھ آکر مقیم مولانا ابوالکلام آزاد تک بہت سے نکتوں پر سیر حاصل بحث کی۔ اور یہ بتایا کہ شبلی نہ عطیہ سے نکاح ثالث چاہتے تھے نہ انھیں ابوالکلام آزاد سے شغف تھا۔ انھوں نے وحید قریشی کی شبلی کی حیات معاشقہ اکرام کی یادگار شبلی اور امین زبیری کی خطوط شبلی کا خاص طور سے تفصیلی جائزہ لیا اور بتایا کہ ان سب لوگوں نے شبلی کی کردار کشی کی کوشش کی ہے جب کہ شبلی وہ ہیں جنھوں نے سیرۃ النبی اور الفاروق جیسی پاکیزہ کتابیں لکھی ہیں۔ پروفیسر محسن نے جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے کہا کہ جس طرح ان لوگوں نے شبلی کا جائزہ لیا ہے اور عاشق ٹھیرایا ہے بہتر ہوگا خود ان لوگوں کی اپنی زندگی کا جائزہ لیا جائے اور ان کی نفسیات کا تجزیہ کر کے پتا چلایا جائے کہ اکرام اور وحید قریشی آخر شبلی کی جنسی زندگی اجاگر کرنے کے اتنے در پے کیوں تھے۔ کہیں خود ان کے اپنے یہاں تو یہ کمزوری نہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ شبلی کو حسن پرست کہنے کے بجائے حسن پسند کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر حسنین نے کہا کہ ان کے پاس شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے مولانا آزاد کے نام لکھے اور ان خطوں سے اکرام اور وحید قریشی کے موقف کی ایک حد تک تائید ہوتی ہے۔ یہ خطوط جلد ہی بہار اردو اکادمی سے چھپنے والے ہیں۔ جناب تقی رحیم نے کہا کہ مولانا آزاد کے سلسلے میں جو باتیں زیر بحث آئیں ان پر "کرزن سے نہرو تک" نامی انگریزی کتاب سے

(باقی پر ۵)

خبرنامہ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ

ماہنامہ شاداب حیدرآباد دسمبر ۱۹۸۶ء

پروفیسر عنوان چشتی



مقالات طباطبائی مرتبہ ڈاکٹر اشرف رفیع کا مقدمہ گیان چند جین نے بڑی محنت اور بصیرت سے لکھا ہے۔ انھوں نے نظم طباطبائی کے مقالے بہ عنوان "ایک وزن عروضی کی تحقیق" کے سلسلے میں تحریر کیا ہے۔

"ایک وزن عروضی کی تحقیق میں طباطبائی نے اس شعر کی عجیب تقطیع کی ہے۔

اگر بدانی کہ بے تو چونم
مرا دریں غم روا نہ داری

اس کی معروف تقطیع فعول فعولن فعول فعولن کو چھوڑ کر انھوں نے بحر منسرح سے ایک انوکھا وزن مستخرج کیا ہے۔ مفاعلن فاعلات فعلن اس کا قطعاً جواز نہیں ہے۔"[1]

اس سے پہلے کہ پروفیسر گیان چند جین کی رائے کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظم طباطبائی کے وہ الفاظ بھی پیش کر دیے جائیں جن سے جین صاحب نے اختلاف کیا ہے۔

"حقیر نے صحیح تقطیع اس وزن کی دریافت کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر بدا مفاعلن نی کہ بے ت فاعلات چونم فعلن اصل میں تین رکن کا مصرع ہے جس کو محقق نے دو رکن کا لکھا ہے۔"[2]

۱۔ مقالات طباطبائی مرتبہ ڈاکٹر اشرف رفیع ص۱۲

۲۔ مقالات طباطبائی مرتبہ ڈاکٹر اشرف رفیع ص۱۳

بی ۱۱۷ - جامعہ نگر - نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

پروفیسر گیان چند جین اور قدر بلگرامی کی آراء کا تجزیہ کرنے کے لئے ان سوالوں پر غور کرنا ہوگا :

(۱) کیا نظم طباطبائی نے بحر غلط تجویز کیا ہے ؟ (۲) کیا پروفیسر گیان چند جین کا تجویز کردہ وزن صحیح ہے ؟ (۳) کیا یہ شعر مزید ارکان میں از روئے عروض تقطیع کیا جا سکتا ہے ؟

نظم طباطبائی نے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ محقق طوسی نے معیار میں اس شعر کے ارکان چار بار مفاعلاتن لکھے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ رکن فاعلاتن غلط ہے۔ ہماری دانست میں محقق طوسی کی اس غلطی کی نشاندہی سب سے پہلے نظم طباطبائی نے کی ہے اور صحیح لکھا کہ از روئے عروض مفاعلاتن صحیح رکن نہیں ہے۔ عروضی نقادوں نے نظم کے اس اجتہاد کو خراج تحسین پیش نہیں کیا۔

جہاں تک نظم طباطبائی کے تجویز کئے ہوئے وزن کا سوال ہے میری رائے میں وہ اپنی جگہ صحیح ہے لیکن اتنی ترمیم کے ساتھ کہ نظم طباطبائی نے بحر کا نام غلط تجویز کیا ہے اس بحر کا نام منسرح نہیں بلکہ بحر مجتث ہے۔ بحر منسرح میں ارکان کا املا یہ نہیں ہوگا جو نظم نے لکھا ہے۔ فاعلات (مجموعی) کی جگہ فاع لات (مفروقی) ہوگا۔ یہاں اس نکتہ کی اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اس وزن کے ارکان کا صحیح املا حسب ذیل ہے :

مفاع لن فاعلاتُ فعلُن

یہ وزن حاصل کرنے کے لئے بنیادی ارکان کی طرف مراجعت کرنی ہوگی۔
بنیادی ارکان حسب ذیل ہیں :۔

مس تفع لن ، فاعلاتن ، فاعلاتن

اس وزن پر زحاف خبن ، کف ، اور خبن کف تسکین اوسط کا عمل کرنے سے مندرجہ ذیل وزن حاصل ہوتا ہے۔

فعلن	فاعلات	مفاع لن
مخبون محذوف مسکن	مکفوف	مخبون

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظم نے زیر نظر شعر کا وزن تو صحیح تجویز کیا ہے لیکن تعین بحر اور ارکان کے املا میں غلطی کی ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے جو وزن تجویز کیا ہے اس میں دوسرا رکن فعولن لکھا ہے غالباً یہ کاتب کی غلطی ہے۔ ورنہ وزن اس طرح ہونا چاہیئے۔

فعول فعلن فعول فعلن

اس وزن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جین صاحب نے یہ وزن بحر متقارب سے اخذ کیا ہے۔ (محترم جین صاحب نے بحر کا نام نہیں لکھا ہے) اگر ایسا ہے تو ان ارکان کے نام حسب ذیل ہونگے

فعلن	فعول	فعلن	فعول
اثلم	مقبوض	اثلم	مقبوض

یہ وزن اس بنیاد پر غلط ہے کہ زحاف ثلم صدر و ابتدا سے مخصوص ہے۔ یہ زحاف حشو میں وارد نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر گیان چند جین نے حشو میں زحاف ثلم کا استعمال کر کے فعلن حاصل کیا ہے۔ جو عروض کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی ہے۔ اس لئے جین صاحب کا تجویز کردہ وزن صحیح نہیں ہے۔

عروض ایک سائنٹیفک علم ہے اور اس کا اطلاق کر کے ایک شعر کے کئی کئی صحیح اوزان دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ میری رائے میں یہ شعر مندرجہ ذیل اوزان و بحور میں آسانی کے ساتھ عروض کے بنیادی اصولوں کا احترام کرتے ہوئے، تقطیع کیا جا سکتا ہے

بحر			
۱۔ بحر رجز	مفاعلن	فاعلن	فعولن
	مخبون	مرفوع	مخلع
۲۔ بحر منسرح	مفاعلن	فاع لات	فعلن
	مخبون	مطوی	مرفوع مخبون مسکن
۳۔ بحر بسیط	مفاعلن	فاعلن	فعولن
	مخبون	سالم	مخلع
۴۔ بحر مجتث	مفاع لن	فاعلات	فعلن
	مخبون	مکفوف	مخبون محذوف مسکن
۵۔ بحر سریع	مفاعلن	فاعلن	فعولن
	مخبون	مرفوع	مکشوف و مخبون
۶۔ بحر مقتضب	فعول	مس تف علن	فعولن
	مرفوع مخبون	سالم	مخلع

مندرجہ بالا تمام اوزان پر مذکورہ شعر تقطیع کیا جا سکتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں قابل ترجیح وزن کون سا ہے۔ چونکہ وزن نمبر ایک میں ارکان کی یکسانیت ہے اور دوسرے

(باقی پر صفحہ)

خلیل اکمل

کینسر

قسط اول - (اسباب)

کینسر کو اردو میں سرطان کہا جاتا ہے۔ یہ دوسرے ناموں جیسے راج پھوڑا گنڈمال وغیرہ سے بھی مشہور ہے۔ یہ مرض زمانہ قدیم ہی سے لاحق ہوتا رہا ہے۔ لیکن آج کل اس کی شرح میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ جسم کے مختلف اعضاء جیسے گردہ۔ مثانہ۔ حلق۔ شش۔ پستان اور معدہ میں پرورش پاتا ہے۔ بعض کینسر بہت تیزی سے بڑھتے ہیں لیکن بعض کے لئے کئی سال درکار ہوتے ہیں۔ ماہرین کینسر کا خیال ہے کہ یہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ مریض کی موت کے لئے صرف چھ تا بارہ ماہ باقی رہ جاتے ہیں اگر اس کی ابتدائی مرحلہ میں تشخیص ہو جائے تو اس کا علاج ممکن ہے ورنہ یہ لاعلاج ہو جاتا ہے۔

کینسر کے متعلق چند ابتدائی معلومات اور اس کے اسباب پر مختلف سوالات اور جوابات کی شکل میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

س۔ کینسر کیا ہے ؟

ج ۔ کینسر دراصل ہمارے جسمانی خلیوں کا غیر معمولی نشو و نما ہے۔ جس کو آسانی روکا یا دور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پھیلتا ہی جاتا ہے۔ آخر کار موت واقع ہوتی ہے۔

س۔ حسب معمول نشو و نما اور کینسری نشو و نما میں کیا فرق ہوتا ہے ؟

ج ۔ انسانی جسم میں کئی کروڑ خلیے (Cells) موجود ہوتے ہیں جو ایک مخصوص انداز میں نشو و نما پاتے ہیں۔ جب انسان کینسر کا شکار ہو جاتا ہے تو ان خلیوں میں بے ترتیب اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے جسم کے متاثرہ حصے میں ایک ابھار پیدا ہو جاتا

سائنٹسٹ - ریجنل ریسرچ لیب - حیدرآباد

ہے۔ جس کو ٹیومر (TUMOUR) کہا جاتا ہے۔

س۔ ٹیومر کے کتنے اقسام ہوتے ہیں۔

ج۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو مہلک نہیں ہوتا جو نہ ایک خاص مدت بڑھتا ہے اور نہ ہی جسم کے دوسرے حصوں میں منتقل ہوتا ہے۔ دوسرا ٹیومر وہ ہے جس کا مسلسل نشوونما عمل میں آتا ہے اور یہ جسم کے دوسرے حصوں میں منتقل ہوجاتا ہے۔ دراصل یہی کیانسر ہے۔

س۔ کیانسر کیا متعدی مرض ہے؟

ج۔ نہیں کیونکہ کیانسر جراثیم سے وجود میں نہیں آتا۔ اس لئے یہ ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل بھی نہیں ہوتا۔

س۔ کیانسر کیا خون کی بیماری ہے؟

ج۔ نہیں اگرچہ کہ کیانسر کے خلئے دوران خون سے جسم کے دوسرے حصوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن وہ جسم کے ان ریشوں میں پرورش نہیں پاتا جہاں خون کے خلئے بنتے ہیں

س۔ کیانسر کس طرح پھیلتا ہے؟

ج۔ اس کے تین اسباب ہیں۔ پہلا سبب وہ ہے جس میں کیانسر کے خلئے خون کی نالیوں میں نشوونما پاتے ہیں جو دوران خون سے جسم کے دوسرے حصوں میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ دوسرا وہ ہے جس میں یہ خلئے خون کے ایک خاص جز میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اور حلق کے غدود تک پہنچ جاتے ہیں۔ تیسرا وہ ہے جس میں وہ ایک ریشہ سے دوسرے ریشہ میں پرورش پاتے ہیں۔

س۔ کیا کیانسر تیزی سے پھیلتا ہے؟

ج۔ کیانسر بڑھنے کی شرح کا تعین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ بعض نوعیتوں کے کیانسر چند ہفتوں میں بڑھتے ہیں۔ لیکن بعض کے لئے کئی سال درکار ہوتے ہیں۔

س۔ کیا کیانسر ایک ہی بیماری کا نام ہے؟

ج۔ نہیں۔ "کیانسر" کی اصطلاح عموماً جان لیوا بیماری کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے کئی اشکال دریافت ہوچکے ہیں جو مختلف خصوصیات کے حامل ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو قابو میں کرنا ممکن نہیں۔ بعض کیانسر جسم کے مختلف حصوں میں پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ بعض خورد بین سے نظر آتے ہیں۔

ں بعض کا علاج ممکن ہے۔ بعض کا پھیلنے کا طریقہ دوسرے سے جداگانہ ہوتا ہے
س۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں مرض لاحق ہو گیا ہے ؟
ج۔ سب سے بڑا خلال تو اس بات کا ہے کہ کیانسر کے پہلے بہت سی علامات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں کیانسر لاحق ہونے کے باوجود محسوس نہیں ہو پاتا۔ اس کی تشخیص کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر سال پابندی سے اپنا طبی معائنہ کرایا جائے۔

س۔ ڈاکٹر یہ کیسے بتا سکتے ہیں کہ یہ کیانسر ہی ہے ؟
ج۔ بیاپسی (Biopsy) کی جانچ کے ذریعہ۔ یہ وہ طریقہ امتحان ہے جس میں متاثرہ مقام سے گوشت کے ریشے حاصل کر کے خوردبین سے جانچ کی جاتی ہے۔

س۔ کیا کیانسر اور جذام میں تعلق ہے ؟
ج۔ نہیں۔ جذام کا مرض جراثیم سے پھیلتا ہے۔ ان دونوں امراض کے علامات اور علاج بالکل الگ الگ ہیں۔

س۔ کیا نسر کیا ایک عصری مرض ہے ؟
ج۔ کیانسر کو ۳ ہزار سال قبل مسیح میں مصری مورخین اس کو " ٹیومر اور السر" کرتے تھے۔ مصری PYRAMIDS میں محفوظ کردہ نعشوں (MUMMIES) جانچ سے پتہ چلا ہے کہ ان کی موت ہڈیوں کے کیانسر سے واقع ہوئی تھی۔

س۔ کیا بعض لوگوں میں کیانسر سے رغبت زیادہ ہوتی ہے ؟
ج۔ ہمارا طریقۂ زندگی ہی کیانسر سے رغبت پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ امریکہ اور انگلینڈ میں معدہ، شش اور جلدی کیانسر عام ہے جبکہ ہندوستان میں گردن۔ حلق اور دماغ کا کیانسر مردوں کو لاحق ہوتا ہے اور عورتوں میں پستان اور رحم کا ہوتا ہے۔

س۔ ہندوستان میں کیانسر لاحق ہونے کے کیا مواقع ہیں ؟
ج۔ کیانسر کسی بھی عمر میں لاحق ہو سکتا ہے لیکن ۵۰ سال کی عمر کے بعد اس کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق ہندوستان میں ۱۲ لاکھ لوگ کیانسر میں مبتلا ہوں۔

س۔ کیانسر کا اصل سبب کیا ہے ؟

ج۔ یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن بعض اشیاء جن کو (CARCINOGENS) کہا جاتا ہے جسم میں ان اشیاء کی موجودگی کینسر کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ مثلاً جو لوگ تمباکو کھاتے ہیں اور سگرٹ نوشی کے عادی ہیں ان کو زبان اور شش کا کینسر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بیڑی پینا سگرٹ نوشی سے دوگنا خطرناک ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جسمانی ریشوں کا مسلسل کچلا جانا بھی کینسر کا سبب بنتا ہے۔

س۔ کیا کینسر جراثیم سے پھیلتا ہے؟

ج۔ نہیں۔ کینسر وائرس (VIRUS) سے پھیلتا ہے۔

س۔ کیا زخم ہونے سے کینسر ہو جاتا ہے؟

ج۔ ہڈیوں کا کینسر سخت زخم کے باعث ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی زخم جو جسم کے نرم ریشوں جیسے پستان پر ہونے سے کینسر نہیں ہو سکتا۔

س۔ غذا اور کینسر میں کیا تعلق ہے؟

ج۔ بعض اشخاص میں حیاتین۔ بی کی کمی سے زبان اور ہونٹوں کے ریشوں میں تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ جو رفتہ رفتہ کینسر میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لیکن موجودہ معلومات کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی غذا کینسر کا سبب نہیں بنتی۔

س۔ کیا کھانے پینے کی بے قاعدگی معدہ کا کینسر پیدا کرتی ہے؟

ج۔ اس امر کا کوئی سائنسی ثبوت موجود نہیں ہے کیونکہ باقاعدگی سے بھی غذا استعمال کرنے والے کینسر میں مبتلا ہوتے ہیں۔

س۔ کیا گرم غذا کینسر پیدا کرتی ہے؟

ج۔ نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے

س۔ کیا شراب کا استعمال کینسر کا سبب بن سکتا ہے؟

ج۔ نہیں۔ یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ بعض اشخاص کے معدے پر شراب خراب اثرات مرتب کرتی ہو۔

س۔ کیا کینسر ایک موروثی مرض ہے؟

ج۔ مختلف نوعیت کے کینسر لاحق ہونے کے اسباب میں موروثی رغبت بھی شامل ہے۔ اگر کسی کے والدین میں ایک یا دونوں کینسر کے مریض رہ چکے ہوں تو ایسے شخص کو چوکسی اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن خوف و ہراس میں مبتلا ہونے کی ضرورت

نہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت سے بعید ہے۔

س۔ کیا کینسر انسانوں کے باہمی بوسہ بازی سے منتقل ہوتا ہے؟

ج۔ نہیں۔ ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے کہ کینسر قربت یا بوسہ سے پھیلتا ہے چاہے وہ انسان یا جانور کے درمیان ہو یا انسان اور انسان کے درمیان ہو

س۔ کیا انگلیوں یا پاؤں کے گھٹے کینسر میں تبدیل ہوتے ہیں؟

ج۔ نہیں۔ کینسر صرف جسم کے ریشوں میں پھیلتا ہے۔

س۔ کیا جسم کے بھورے دھبے کینسر میں تبدیل ہو جاتے ہیں؟

ج۔ معمولی دھبے کینسر نہیں بنتے۔ لیکن چپٹے تل جو نیلے یا سیاہی مائل ہوا ہو گہرے سیاہ نظر آئیں کینسر بن سکتے ہیں۔ ان کا وقفہ وقفہ سے امتحان کروانا ضروری ہے۔

س۔ کیا بواسیری مسّے کینسر بن جاتے ہیں؟

ج۔ یہ مسّے عموماً جائے مخصوص پر اُگی ہوئی رگیں ہوتی ہیں۔ کینسر ان رگوں اور اوپری ریشوں میں ہوتا ہے۔ خون رستے مسّوں کو بڑی توجہ سے امتحان کروانا

س۔ کیا کسی کی دماغی حالت کینسر کا سبب بن سکتی ہے؟

ج۔ ابھی تک یہ بات دریافت نہیں ہوئی ہے۔ کینسر دراصل جسمانی خلیوں کی بیماری ہے۔ دماغی حالت کینسر کی طرف مائل نہیں کرتی۔ یہ جان لیوا بیمار بالکل طبعی ہے نہ کہ دماغی۔

س۔ کونسی شعاعیں کینسر کا سبب بن سکتی ہیں؟

ج۔ اکسرے (X - Ray) شعاعوں کا زیادہ استعمال کینسر کے مواقع فراہم کرتا ہے لیکن بالکلیہ اس کا کوئی عملی ثبوت موجود نہیں ہے۔

سلسلہ صہ ۲۲

ہے۔ لیکن اگر والدین اور اساتذہ خود ہی جھوٹے اور بے ایمان ہوں گے تو ایسی حالت پر بچوں کا سچا اور ایمان دار ہونا ناممکن ہے ہے۔

کلدیپ کار کھلر

ثقافت اور نئی تعلیمی پالیسی

تعلیم میں ثقافتی عنصر بہت کم ہے۔ جدید ٹیکنالوجی اور ہماری قدیم ثقافت میں کوئی باہمی تعلق نہیں۔ سماج میں مستقبل کے ثقافتی نصب العین کے بارے میں لازمی قدروں کے انحطاط، سنگی پن اور بیگانگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں اس رجحان کو الٹنے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا یہ پالیسی ہماری ثقافت کی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں ثقافتی عنصر کو تعلیم کے شعبے میں جتنی شکلوں میں بھی ممکن ہو سکتا ہے تقویت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بچوں میں خوبصورتی کا احساس، ہم آہنگی اور اعلیٰ مذاق پیدا کرنے میں مدد کی جائے گی۔ سماج کے ماہر افراد کو تعلیمی قابلیتوں کا لحاظ کیے بغیر تعلیم کو ثقافتی لحاظ سے متمول بنانے کے لیے اپنا تعاون دینے کی دعوت دی جائے گی جس کے لیے وہ تحریری اور زبانی ذرائع ترسیل کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ثقافتی روایت کو برقرار رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے بزرگ استادوں کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے گا۔ اور انھیں مدد دی جائے گی یہ استاد اپنے روایتی طریقوں سے بچوں کو تربیت دیا کرتے ہیں۔ ڈگریوں کی ملازمت سے الگ کرنے کے فیصلے سے ہمارے فنون کے تحفظ میں بہت مدد ملے گی۔ نئی پالیسی میں یہ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ملازمتوں کو ڈگریوں سے الگ کرنے کا طریقۂ کار ان ملازمتوں میں استعمال کیا جائے جہاں یونیورسٹیوں کی ڈگری ضروری قابلیت نہ ہو۔ اس فیصلے پر عملدرآمد سے خاص خاص کاموں کے لیے مخصوص نصابات کو پھر سے ترتیب

دیا جائے گا جس سے ان لوگوں کو مدد ملے گی جو کسی مخصوص کام کے اہل ہیں لیکن اسے حاصل نہیں کر سکتے کیوں کہ وہاں گریجویشن کو غیر ضروری طور پر ترجیح دی جاتی ہے۔

چناں چہ اب یونیورسٹی تعلیم کے نظام اور فنون آثار قدیمہ اور مشرقی علوم کے اداروں میں ایک رابطہ قائم کیا جائے گا۔ فنونِ لطیفہ، موسیقی کے علم، لوک کتھاؤں کی جانب مناسب توجہ دی جائے گی۔ ان موضوعات میں تدریس، تربیت اور تحقیق کو بڑھاوا دیا جائے گا تاکہ ان شعبوں میں افرادی قوت کی پوری کی جا سکے۔

پالیسی میں اس امر کا اعادہ کیا گیا ہے کہ ہمارے گوناگوں ثقافتی معاشرے میں تعلیم کو ہمارے عوام کے اتحاد و یک جہتی کے لیے معاون، عالمی اور لافانی قدروں کی پرورش کرنی چاہیے۔ قدروں پر مبنی اس تعلیم کو رجعت پسندی، فرقہ وارانہ تعصب، تشدد، توہم پرستی اور سلسلہ قضا و قدر کو ختم کرنا چاہیے۔ اس جارحانہ کردار کے علاوہ قدروں کی تعلیم اپنے ترکیبی اجزا کے لحاظ سے بھرپور ہے جو ہماری وراثت، قومی نصب العین اور ہمہ گیر نظریات پر مبنی ہے۔

سب سے پہلے تمام نصابی کتابوں کی جانچ کی جانی چاہیے تاکہ ان میں ثقافتی اجزا میں اضافہ کیا جا سکے۔ تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کونسل، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور تین قومی اکاڈمیوں یعنی ساہتیہ اکاڈمی، سنگیت ناٹک اکاڈمی اور للت کلا اکاڈمی کے درمیان لازمًا باہمی رابطہ قائم کیا جانا چاہیے۔

چوں کہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جہاں کئی ذیلی ثقافتیں ہیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہر ریاست میں ثقافت کے مرتبے کے بارے میں رپورٹیں تیار کی جائیں۔ ہر ریاست کے ثقافت کی تشکیل و ترقی کے جہت کی جانچ کے لیے پرتالیہ شعبے قائم کیے جائیں۔ یہ شعبے مرکز اور ریاستوں میں قائم کیے جائیں۔ تمام تعلیمی ذرائع اور فنون کی پہچان تحقیق کے مقصد کے لیے کی جائے۔ لوگوں اور تعلیمی اداروں کے درمیان رابطہ قائم کیا جائے۔ سرکردہ ماہرین کے ذریعے اساتذہ کی تربیت کے پروگرام

بچے طلبا یا لڑکی ابتدا کے ساتھ تہذیب کے لیے تیار کرائے جائیں۔ اسکولوں کی علاوہ ذہنی کی جانب سے علاوہ طلبا کو ان کے ثقافتی ورثے کے بارے میں ترغیب دیں اور موسیقی، مصوری اور کھلونا سازی جیسے تخلیقی فنون کے ذریعے ان کی تخلیقی صلاحیت کا پتہ لگائیں۔ سندھ وادی کی تہذیب کی مہروں کی نقلیں تیار کرنا اور کھلونے بنانا، اسکول کے نصاب کا حصہ ہوا کرتا تھا اور ایسے ہی ان قدیم تر باتوں میں ماڈل تیار کرنے کی اہمیت تھی۔ زبانی ثقافتی اور روایتی فنون کا تحفظ کیا جانا چاہیے اور بچوں کی حیرانی یا تجسس کے احساس کو برقرار رکھا جانا چاہیے۔

ثقافت سے مراد وہ چیز ہے جو کتابوں کے مطالعے سے حاصل کردہ علم کو بھول جانے کے بعد کسی شخص کے پاس رہ جاتی ہے۔ اس لیے ایک نظریہ یہ ہے کہ جس ثقافت کی تعلیم کتابوں کے ذریعے دی جاتی ہے وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔

ہماری زبانی ثقافت نے ہمارے مستقبل کو بنانے، ہمارے اخلاق کو ڈھالنے بلکہ ہماری تاریخ کی تحریریں جو کردار ادا کیا ہے، وہ آثارِ قدیمہ کی یادگاروں مثلاً کتبوں یا حروف کی ثقافت سے کہیں زیادہ ہے اور ہمارے بچوں کو اس کا علم ہونا چاہیے۔ تعلیم بنیادی طور پر ایک انسانی سرگرمی ہے جس میں ثقافت کو ایک بہت بڑا کردار ادا کرنا ہے۔

پرائمری سطح پر تعلیم بنیادی طور پر ثقافتی ورثے کی ترسیل ہے جس میں مادری زبان کی تعلیم بھی شامل ہے۔ ہندوستان میں تمام پرائمری تعلیم، مادری زبان میں ہے۔ پھر بھی بطور قوم ہمارا تخلیقی فنون کا اظہار زیادہ موثر نہیں ہے۔ چناں چہ نئی پالیسی میں تخلیقی قوتوں کے اظہار کو ترقی دینے اور بچوں کی تخلیقی قابلیت کو بہتر بنانے میں تعلیم کے کردار پر زور دیا گیا ہے۔

لنکن کا خط

لنکن نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے نام جہاں ان کا لڑکا زیرِ تعلیم تھا لکھا تھا:

میں جانتا ہوں کہ اسے سیکھنا ہوگا کہ تمام لوگ برحق نہیں ہوتے

تمام لوگ سچے نہیں ہوتے لیکن اسے یہ بھی بتاؤ کہ ہر جلکداو کے مقابلے میں ایک ہیرو بھی ہوتا ہے اور ہر خود غرض سیاستداں کے مقابلے میں کوئی ایمان دار رہنما بھی ہوتا ہے... اسے پڑھاؤ کہ جہاں دشمن ہے وہاں دوست بھی ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں اس میں وقت لگے گا لیکن اگر تم اسے سکھا سکتے ہو تو سکھاؤ کہ کمائے ہوئے ایک ڈالر کی قیمت پانچ پاؤنڈ شعل سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسے ہارنا اور فتح پہ خوش ہونا سکھاؤ — اگر تم کرسکتے ہو اسے حسد کرنے کے جذبے سے دور رکھو۔ اسے جلد ہی یہ پتہ لگنے دو کہ دھاکڑ لوگوں کو دھول چاٹنے پر مجبور کرنا سب سے آسان ہے اگر تم سے ہو سکے تو اسے کتابوں کے حیران کن صفات کی جانکاری دو لیکن اسے کے ساتھ ہی اسے آسمان میں پرندوں کے لافانی راز، دھوپ میں اڑتی شہد کی مکھیوں اور پہاڑی کے سرسبز پہلو پر پھولوں کے بارے میں سوچنے کا بھی کافی وقت دو۔

لنکن اپنے بیٹے کو جو کچھ پڑھانا چاہتا تھا وہ نصابی کتابوں کی تعلیم یا کاپیوں کی تعلیم یا چیپڑ اسیوں کی کتابوں کی تعلیم نہیں تھی بلکہ وہ تعلیم تھی جو انسانوں کو انسان دوست بناتی اور عام انسانوں کے درمیان بلند و بالا شخصیت عطا کرتی ہے۔ جہاں سر بلند ہوتا ہے اور قلب آزاد ہوتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں بھارتی بچوں میں ایک ثقافتی ہم آہنگی اور جداگانہ وجود کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی جس کی جڑیں قومی ثقافت میں ہوں۔

قومی اکاڈمیاں

تینوں قومی اکاڈمیوں کو ایک طرف یونیورسٹیوں اور دوسری طرف دیہات کے عوام کے ساتھ زیادہ حساس رابطہ رکھنا ہوگا۔ جہاں وہ جدید اور دیگروں کے فنون کی طرف توجہ دیں وہاں لوک فنون کے تحفظ کے لیے بھی کسی ادارے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ ثقافت محض مصوری، فن تعمیر یا موسیقی نہیں ہے۔ یہ تو محض ثقافت کے کچھ مظاہرات ہیں۔ ثقافت یہ ہے کہ ہم کیا ہیں، یہ تو ایک افتاد طبیع ہے یہ زندگی کا ایک اسلوب ہے۔ کوئی شخص ایک عظیم مصور یا ادیب

ہوتے ہوئے بھی ثقافت سے بے بہرہ ہو سکتا ہے۔ یہ وہ ثقافت ہے جو نئی تعلیمی پالیسی بچوں کو سکھانا چاہتی ہے یعنی حقیقی ہندوستانی ثقافت جو دنیا کی واحد ثقافت ہے جو کسی آرٹ گیلری یا عجائب گھر میں نہیں سیکھی جا سکتی جس پر آج بھی کروڑوں ہندوستانی عمل کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یونان، مصر اور ایران کی ثقافتیں ہیں جو کبھی پھل پھول رہی تھیں لیکن اب معدوم ہو چکی ہیں۔

بچوں کو ہنروں کی تعلیم دینے میں مقامی آبادی کو اسکولوں کے ساتھ تال میل رکھنا چاہیئے۔ معلم اور طالب علم کے باہمی تعلق کی روایت جو صدیوں کے عمل سے بہت کمزور پڑ گئی ہے اسے مضبوط کرنا ہوگا کیوں کہ باہمی مواصلات کی اس سے مضبوط بنیاد ابھی تک نہیں بن سکی۔ کسی ملک کی ثقافت کا پتہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی معاشرہ اپنے محروم طبقوں، پسماندہ جماعتوں، معذور افراد اور اقلیتوں کا کتنا احترام کرتا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں عدم مساوات کو دور کرنے اور ان لوگوں کی خصوصی ضروریات پر توجہ دیکر جنھیں مساوات سے محروم رکھا گیا ہے برابر کے مواقع پر زور دیا گیا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کو خواتین کے مرتبے میں بنیادی تبدیلی کے لیے استعمال کیا جائے گا تاکہ وہ تبدیلی کی محرک کے طور پر خود اپنا کردار ادا کر سکیں۔

پالیسی میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ بعض اقلیتی طبقے تعلیم کے لحاظ سے محروم یا پسماندہ ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دی جائے گی اس میں قدرتی طور پر آئینی تحفظات شامل ہوں گے جن میں انھیں اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کی ضمانت اور ان کی زبانوں اور ثقافت کے تحفظ کا اہتمام کرنے کی سہولت حاصل ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نصابی کتابوں کی تیاری اور اسکولوں کی تمام سرگرمیوں میں واقفیت پسندی کا اظہار ہوگا۔ اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے تمام ممکن اقدامات کئے جائیں گے۔ اس طرح ـــ ثقافتی پیمانے اور موقف کے لحاظ سے نئی تعلیمی پالیسی ملک و قوم کی راہ پر ایک سنگ میل ہے۔ ٭

رضوان رضوی

موجودہ طریقۂ تعلیم

خدا بخش لائبریری میں آمدہ ایک ماہر تعلیم رضوان رضوی صاحب کی تازہ رپورٹ کے موجب طلبا کا کردار اس لئے گر رہا ہے کہ اساتذہ اور والدین اس کی طرف سے بے پروا ہوگئے ہیں اور اس کی وجہ سے پورا سماج گر رہا ہے۔ اپنی تفصیلی رپورٹ میں رضوان رضوی نے لکھا ہے:

" موجودہ طریقۂ تعلیم ایک زبردست فراڈ ہے۔ ایسی جھوٹی سند لینے سے بہتر یہ بے سند رہنا بہتر ہے۔ ایسی بیکار اور جھوٹی سندیں ممکن ہے شادی بیاہ یا رشتے ناطے طے کرنے میں کارآمد ثابت ہوں لیکن شاندار مستقبل اور عملی زندگی کے لئے بالکل ہی بیکار اور بے مصرف ہیں۔ جس مکان کی بنیاد ہی کمزور ہوگی تو اس مکان کا گر جانا لازمی ہے۔ اور اس طرح اینٹ، بالو، مٹی، محنت، مزدوری اور وقت کی بربادی پر رونا پڑتا ہے۔

ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری تعلیم ہنوز تجرباتی دور سے دوچار ہے ملک کے نظام تعلیم میں پرانی خامیوں کو دور کرنے کے لئے جہاں تہاں صرف پیوند لگانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ موجودہ نظام تعلیم طلبا کو آدمی نہیں بنا سکتا۔ اسی طریقۂ تعلیم کی وجہ سے طلبا میں ڈسپلن ختم ہوگئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج زیادہ تر اعلیٰ تربیت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ آج کی تعلیم میں طلباء کے کردار سازی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ تربیت کو تعلیم پر فوقیت حاصل ہے [illegible]

کام ہے۔ تعلیم و تربیت کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ بچوں کی شخصیت کی مکمل نشو و نما ہو سکے۔ بچے اپنی انفرادی اور سماجی زندگی کو سدھار سکیں اور ان کے اندر علم کو اچھے ڈھنگ سے استعمال کرنے کی صلاحیت اور سلیقہ پیدا ہو جائے۔ عمدہ تعلیم و تربیت انہیں بدلتے ہوئے نظام معاشرت سے مطابقت پیدا کر کے آئندہ صورت حال کا رخ موڑنے کے قابل بنا دے۔ اس لئے تعلیم ایسی ہونی چاہئے جو بچوں کے لئے پرانی قدروں کے محفوظ کرنے کا صرف ذریعہ ہی نہ ہو بلکہ ان میں اس بات کی صلاحیت بھی پیدا کرے کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا اور بدلتی ہوئی معاشرتی قدروں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں۔ چنانچہ ملک اور قوم کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر نظام تعلیم میں تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی تعلیم کی بھی سخت ضرورت ہے۔ اور اخلاقی تعلیم بغیر دینی تعلیم کے ممکن نہیں۔ اخلاقی تعلیم تمام علوم پر مقدم ہے۔ تعلیم اور اخلاق سازی میں بڑا گہرا تعلق ہے لیکن انتہائی افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آج ہماری تعلیم گاہیں اخلاقی تعلیم سے کوسوں دور ہیں۔ اخلاقی تعلیم کی عدم موجودگی کی وجہ سے آج ہمارے مستقبل کے طلباء بھی ہر جگہ اخلاق سوز حرکتوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس طرح غیر عملی تعلیم سے قوم کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ آج حالات بتلا رہے ہیں کہ ہمیں اخلاق کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اخلاقی تعلیم نظام تعلیم کی اسکیم میں شامل ہونی چاہئے۔

آج ہمارے طلباء جو ہر جگہ اخلاق سوز حرکتوں میں مصروف نظر آتے ہیں اس کے ذمہ دار والدین اور اساتذہ کرام دونوں ہی ہیں۔ زیادہ تر والدین تو اپنے بچوں کے کردار اور تعلیم و تربیت کی طرف مطلق توجہ ہی نہیں دیتے اور نہ وہ اس کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ بعض گارجین تو ایسے بھی ہیں جو اپنے بچوں کی ماتحتی میں رہنا ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ ان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں باپ کون ہے اور بیٹا کون؟ اور کچھ والدین کی طرف سے بچوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی مل جاتی ہے جس کا وہ ناجائز استعمال کرتے ہیں جس سے ان کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچتے ہیں اور اس طرح بچوں میں بری عادتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں اور ان کا مستقبل بالکل ہی تاریک ہو جاتا ہے۔ والدین اور خاندان کی بدنامی ہوتی ہے۔

بچوں کو تعلیم دینے کا کام دنیا کا سب سے بڑا اور باعزت کام ہے۔ لیکن معلمی جتنا بڑا شرف ہے اتنی ہی بڑی آزمائش بھی ہے۔ ایک اچھے کردار کا باصلاحیت استاد اپنے شاگردوں کے اخلاق اور صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ان کو ملک، قوم اور خاندان کے لئے قابل فخر اور کارآمد

انسان بنا سکتا ہے۔

پرانے زمانے میں معلمی کا پیشہ ایک مقدس اور سنجیدہ پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ معلم عملی طور پر پیشہ ور نہیں ہوتے تھے بلکہ تعلیم برائے تعلیم ہوا کرتی تھی۔ معلم اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کمی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے وہ معاشرے کے بہترین ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ وہ صرف درسی کتابوں کی ہی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ اخلاق کے بھی معلم ہوتے تھے۔ لیکن آج وقت کے ساتھ سب کچھ بدل گیا ہے۔ چنانچہ معلمی بھی آج ایک پیشہ کی حیثیت سے نمودار ہوئی ہے۔ آج نہ تو استاد ہی پڑھائی میں دلچسپی لیتے ہیں اور نہ طالب علم۔ جس کی وجہ سے اب امتحانات کے مراکز بھی رشوت خوری، چوری، سینہ زوری اور غنڈہ گردی کے اکھاڑے بن کر رہ گئے ہیں۔ امتحانات کے تمام اصول اور طریقے اب صرف کاغذ پر رہ گئے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک کے تمام ذمہ داروں نے اب امتحانات کو بھی اپنی آمدنی کا بہترین ذریعہ بنا لیا ہے۔ اس موسم میں بعض چند کو چھوڑ کر بقیہ تمام لوگ اچھی کمائی کرنے لگے ہیں۔ اس لئے اب نہ تو پڑھنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے اور نہ پڑھانے کی۔ اور ایسا لئے موجودہ ہوا کو دیکھتے ہوئے لوگ اپنے ان بچے اور بچیوں کے بھی میٹرک کے رجسٹریشن فارم یا مدرسہ اگزامینیشن کے فارم بھروا رہے ہیں جنہیں اردو، ہندی، عربی، فارسی یا انگریزی کے حرف تہجی کی بھی واقفیت نہیں ہے۔ بس ایک ہوا ہے "جھوٹی سند" حاصل کرنے کی۔ اور یہی وجہ ہے آج تعلیمی اداروں میں علمی ماحول بالکل ہی ناپید ہو چکا ہے۔ کیونکہ آج پڑھنے پڑھانے اور امتحانات کا پرانا نقطۂ نظر ہی بالکل بدل گیا ہے۔ اساتذہ حضرات پڑھانا ہی نہیں چاہتے اور حد تو یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں کچھ ایسے اساتذہ کرام بھی داخل ہو گئے ہیں جو مطلق پڑھانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوئے بھی پڑھا رہے ہیں۔ بھلا سوچئے تو جنہیں ابھی خود کافی محنت سے پڑھنے کی ضرورت ہے وہ دوسروں کو کیا اور کیسے پڑھا سکتے ہیں؟ ایسے ہی چوری، رشوت اور سفارشوں کے ذریعہ سند یافتہ اساتذہ کرام کی وجہ سے آج دینی و دنیوی تعلیم کا جنازہ نکلتا جا رہا ہے۔ یہ کھلی حقیقت ہے کہ آج کے طلباء کل ملک و قوم کے نگہبان اور رہنما بنیں گے۔ ملک، قوم اور خاندان کی خوشحالی اور ترقی کا تمام بوجھ اور ذمہ داری انہی کے کاندھوں پر ہوگی۔ تو کیا ایسے نکمے اور جاہل اساتذہ سے تعلیم پانے والے طلباء کے ذریعہ ہمارے ملک اور قوم کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں محفوظ رہ سکے گا؟

بچوں میں چوری، بے ایمانی، چغلخوری، جھوٹ اور بدکلامی کی لعنت نہ پڑنے پائے اس کے لئے ہمیں ہر قدم پر بچوں کے اخلاق و کردار اور معاشرت کا جائزہ لیتے رہنے کی ضرورت

باقی ۱۴۳

محمد کلیم الدین احسن

کیا "ہندی" ہی "ہندوستانی" ہے

مندرجہ بالا عنوان کے تحت اسٹیٹسمن مورخہ ۱۱؍۱۰؍۸۶ء میں " ایڈیٹر کے نام خطوط"
با تین خطوط شائع کئے گئے ہیں۔ پہلا خط شملہ ہلز کے امرسٹرا کا تحریر کردہ
۔ لکھتے ہیں :

"ہندی بنیادی طور پر یو۔ پی کے ہندوؤں کی زبان ہے۔ دوسری اسٹیٹوں پر یہ تھوپی جا رہی
ہے وہ ناپسند کرتے ہیں۔ اگر کوئی زبان قومی زبان ہوتی ہے تو وہ سنسکرت ہے۔
ت اس وقت قابل عمل نہیں ہے تو انگریزی کو جاری رکھا جائے۔
اصل میں ہندی، اردو کی وہ صورت ہے جس میں سنسکرت کے الفاظ بڑھا دیے گئے
ج کی ہندی پچاس سال پہلے کی ہندی سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ ہندی
ما اردو کو نظر انداز کیوں کرتے ہیں۔ غالباً وہ دیوناگری رسم الخط ہی کو ہندی سمجھتے ہیں
لیے تو انہیں کھلے ہندوں اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔ بولی جانے والی ہندی "ہ
ستانی" ہے۔ زبان ترسیل کا ذریعہ ہے۔ جب میں ریلوے سفر کے لئے ٹکٹ خر
لفظ "ٹکٹ" کا ہندی ترجمہ کرنے میں وقت برباد نہیں کرتا ۔۔۔ میں چاہتا ہ
ت انگریزی کو سرکاری زبان اور اردو کو عدالتی زبان کی طور سے جاری رکھے۔
ہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اردو نے تمام زبانوں کے اچھے الفاظ کو اپنے میں سمو لیا ہے
دیوناگری، عربی، فارسی یا انگریزی رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے۔ میں یہ بھی
دوں کہ رابندرناتھ ٹیگور اور سی۔ راجگوپال چاری میں سے کسی نے بھی ہندی کی تا
یا۔"

کٹک کے ہری موہن پانیگری نے لکھا ہے کہ "ہندی والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آزادی کی لڑائی ہندی میں لڑی گئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ "انقلاب زندہ باد" "شہید" اور "قربانی" جیسے الفاظ ہندی میں لکھے بھی نہیں جا سکتے۔ آزادی سے پہلے ہندی کے حروف تہجی نامکمل تھے، گرامر نہیں تھا اور تقابل لحاظ اب بھی نہیں تھا۔ یہ صرف یو۔پی اور بہار کے دیہات کی زبان تھی۔ آزادی کے بعد سب پر لادی گئی مگر آج بھی یہ اقلیت کی زبان ہے۔ انگریزی آج بھی ہمارے ملک کے مختلف صوبوں میں رابطہ کی زبان ہے۔ حال ہی میں ہمارے وزیر اعظم اور مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ انگریزی ہی میں ہوئی۔ ہندی اور غیر ہندی علاقوں میں جب بھی رابطہ کی ضرورت ہوتی ہے یہی ہوتا ہے۔ انگریزی ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ جذباتیت سے دور رہتے ہوئے انگریزی کو مستقلاً رابطہ کی زبان قائم رکھا جائے تو اتفاق و اتحاد قائم رکھا جا سکتا ہے"

۲۴ پرگنے کے این۔ گوسوامی لکھتے ہیں کہ "دستور ساز اسمبلی میں صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے ہندی کو قومی زبان بنایا گیا۔ یہ ایک بڑی غلطی تھی۔ ہندی ایک علاقائی زبان ہے اس کے لئے پروپگنڈے پر کروڑوں روپئے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ یہ کوشش جاری رہی تو قومی یکجہتی کی بجائے آپسی اختلاف بڑھے گا اور ہماری قوم دو قسم کے شہریوں میں بٹ جائے گی۔ ایک حاکم، دوسرے محکوم۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ آسان ہندوستانی قومی زبان بنائی جائے جس میں تمام علاقائی زبانوں کے الفاظ ہوں، سبھاش چندر بوس چاہتے تھے کہ ہندوستانی رومن خط میں لکھی جائے۔ اور راجہ رام موہن رائے کا اصرار تھا کہ انگریزی پڑھائی جائے تاکہ ہمارا ملک ترقی کر سکے۔ بنکم چندر چٹو پادھیائے کے زمانے میں ہندی کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ آج ہندوستان کو یہ سوچنا پڑے گا کہ ہندوستان ہی کی کوئی زبان رابطہ کی زبان کے طور پر سب کے لئے قابل قبول ہو۔ سوائے سنسکرت کے کوئی اور زبان یہ مقام حاصل نہیں کر سکتی"۔

سبھی مراسلہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ ہندی ایک علاقائی زبان ہے اور سب ہندوستانیوں کے لئے رابطہ کی زبان نہیں بنائی جا سکتی۔ اسے قومی زبان تسلیم کئے تقریباً چالیس سال ہو چکے ہیں لیکن غیر ہندی علاقے آج بھی اسے قومی زبان ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

تینوں مراسلہ نگاروں نے اردو کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنا پر وہ رابطہ کی زبان بنائی جا سکتی ہے۔ کٹک کے ہری موہن پانیگرہی نے یہ رائے دی ہے کہ انگریزی کو مستقلاً رابطہ کی زبان بنایا جائے۔ شملہ ہلز کے امر شرما کہتے ہیں کہ سنسکرت کو یہ درجہ

(باقی بر صفحہ ۶۱)

کتاب خانہ دیوان آنند کمار کا نسخہ

سفینۃ الاولیاء

مصنف داراشکوہ کا خود نوشتہ

شاہزادہ داراشکوہ سنسکرت کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ علوم دین میں بالخصوص تصوف میں اچھی دستگاہ رکھتا تھا۔ ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر بھی ان کی اچھی نظر تھی۔ اولیائے کرام کے احوال میں داراشکوہ نے جو مشہور تذکرہ سفینۃ الاولیاء لکھا اس کا وہ نسخہ جو شاہزادہ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر دیوان آنند کمار کے کتاب خانے میں تھا۔ یہ نسخہ آج سے ساٹھ سال پہلے دیوان آنند کمار کے کتاب خانہ کا حصہ تھا۔ تقسیم کے بعد دیوان صاحب مشرقی پنجاب کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے پھر اپنے ساتھ لے گئے یا پاکستان ہی میں رہ گیا یہ معلوم نہ ہو سکا۔ بہرحال اس نسخے کے بارے میں جو تفصیلات اورینٹل کالج میگزین میں اس وقت چھپا کی تھیں وہ آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔ یہ تفصیلات ... بخش لائبریری میں محفوظ اورینٹل کالج میں دئے گئے اس نایاب نسخے کے تفصیلات سے ماخوذ ہیں۔

اولیائے کرام کا دائرۂ اثر دیوان صاحب کے اس نسخے میں ایک جگہ داراشکوہ نے ... ساتھ ہی ہندوستان قبل کے اسلامی ہندوستان پر جو اولیائے کرام کی متعین ... وقت تھی اس کا تجزیہ کیا ہے۔ دارا کے تجزیے کے بموجب طبقہ اثر ... حضرت اعظم کا مرید تھا اس سے چھوٹا طبقہ شاہ مدار کا حلقہ بگوش تھا۔ اور شاہ ... خواجہ اجمیری کا نمبر آتا تھا نقشبندیہ و غیرہم ان کے بعد تھے۔

داراشکوہ کی اصل حیات کا تعمیر خدوخال ہے

"اسلامیان ہندوستان کے طبقۂ اشراف میں چار حصوں میں دو پیر دستگیر غوث الثقلین شاہ محی الدین سید عبدالقادر جیلی (یہ جیلانی) رضؓ کے مرید ہیں اور ایک حصہ شاہ مدار کا ارادت مند ہے۔ لیکن شاہ مدار کے مریدوں میں اجلاف کی تعداد زیادہ ہے (یہ تین حصے نکل جانے کے بعد) بقیہ ایک حصے کا نصف خواجہ معین الدین چشتی کا مرید ہے۔ اور آخری نصف میں مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی وغیرہ قدس اللہ اور ا ھم شریک ہیں"۔

اس وقت کا آج کے ہند اسلامی سے مقابلہ کیا جائے تو صورت حال کچھ بدلی ہوئی لگتی ہے۔ کشمیر میں غوث اعظم چھائے ہوئے ہیں۔ یو۔پی، دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش وغیرہ میں خواجہ اجمیریؒ کے مرید زیادہ ہیں۔ بہار میں فردوسی سلسلہ زیادہ ہے۔ بنگال میں بھی مقامی اثرات ہیں۔ یہی صورت جنوبی ہند اور پاکستانی ہند اور بنگلہ دیش کی ہے۔ پھر بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے تو ایک حصہ غوث اعظمؒ اور خواجہ اجمیریؒ کے ارادتمندوں کا نکلے گا اور بقیہ نصف مختلف اولیاء کا۔

اس نسخہ میں ایک اہم اطلاع مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی کے بارے میں بھی ہے۔ دارا شکوہ کے استاد شیخ میرک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ دارا شکوہ نے مجدد صاحب کے احوال میں لکھا ہے کہ:

<u>مجدد الف ثانی کے بارے میں غلط فہمی</u> "یہ جو شیخ احمد سرہندی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے کو خلفائے راشدین سے برتر سمجھتے ہیں۔ یہ محض افترا پردازی ہے کیونکہ میرے استاد شیخ میرک شیخ سرہندی سے ملے اور ان سے جب پوچھا کہ کیا یہ بات صحیح ہے تو شیخ احمد سرہندی نے اس کی تردید کی"۔

اس بیان کی بڑی اہمیت ہے اس لحاظ سے بھی کہ شیخ سرہندی کی ایک واضح تردید سامنے آگئی اور اس لحاظ سے بھی کہ شیخ کے اپنے زمانے میں یہ روایتیں مشہور ہو چلی تھیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیخ کے مکتوبات میں خود ایسے متعدد اشارے جابجا ملتے ہیں جن سے ان کے مخالفین اس قسم کے معنی پیدا کر لیتے ہیں۔

داراشکوہ کی اس تصنیف کا طبع شدہ نسخہ بھی خدا بخش اورینٹل لائبریری میں محفوظ ہے۔

●●

حلقۂ افسانہ

بے نشان زخم

(افسانہ)

اُس دن میں یونی ورسٹی کی لابی میں کھڑی اختر بھائی اور علیم سے باتیں کر رہی تھی کہ مجھے یونی ورسٹی کی گیٹ سے ایک چھوٹا سا ننھا منا معصوم بچہ میلے کچیلے چیتھڑوں جیسے کپڑوں میں ملبوس اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں چائے کی کیتلی اور بائیں ہاتھ میں پیالیاں تھیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا لابی کی طرف ہی آرہا تھا۔ اس کے گلے میں ایک میلی سی تھیلی بھی لٹک رہی تھی۔ اس کے حلیئے کو دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ پرانے چائے والے کی جگہ پر یہ نیا لڑکا کام کرنے کے لئے آیا ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد میں پُرسکون نہ رہ سکی۔ ایک نامعلوم سا درد میرے رگ و پے میں سرایت کرتا گیا۔ میں اس نامعلوم درد کے نشان کو معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ مجھے پتہ تو چلے کہ آخر یہ درد کس زخم سے ابھر کر میرے جسم کے ریشے ریشے میں گردش کر رہا ہے مگر ڈھونڈنے پر بھی مجھے کوئی زخم اپنے جسم پر نہ مل سکا۔ البتہ یہ ضرور محسوس ہو رہا تھا کہ نشان نہ ہونے کے باوجود بھی میرے اندر کہیں کوئی زخم موجود ہے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو اُسے قریب سے دیکھنے کے بعد میرے اندر کا کرب اس قدر بڑھ گیا کہ میں اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکی۔ بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔ " اُف یہ دنیا کتنی ظالم ہے "

ایم فل سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

میری زبان سے ادا ہوئے [illegible] فقرے کو سن کر علیم کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نمایاں ہوئی جیسے وہ میری زبان سے ادا ہونے والے فقرے کا مطلب سمجھتے ہوں۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے پوچھنے لگے۔

"آپ کے [illegible] ہیں"

میں [illegible] سوال [illegible] جواب [illegible] نظریں اٹھا کر ایک ٹک آنے والے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو کوشش کرنے پر بھی ہم الفاظ میں نہیں ڈھال سکتے۔ ایسے وقت خاموشی زبان بن جاتی ہے۔ میری خاموشی کی زبان بھی علیم سمجھ گئے اور وہ بچے کو آواز دے کر اپنے قریب بلا کر اس کے گرد بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"چھوٹو! تم اپنے اس لوٹے اور بکھرے ہوئے وجود کے ٹکڑوں کو اس طرح چھپتے چھپتے میں بکھرنے سے بچانے کے لئے کسی ایک مکان میں مقید کر لو تو یہ تمہارے لئے ٹھیک رہے گا۔ تم یہ بی بی جی کے ساتھ ان کے مکان میں چلے جاؤ۔ وہاں یہ تمہارے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹنے میں تمہاری مدد کریں گی اور چند دنوں کی کوشش کے بعد تمہاری ٹوٹی ہوئی شخصیت پھر سے سالم ہو جائے گی۔"

علیم کی باتیں سن کر بچہ میری طرف براہ راست دیکھتے ہوئے کہنے لگا

"بی بی جی آپ کے مکان کا مالک کون ہے۔ جو مکان میں ہر فرد نہیں رہ سکتا۔ میں گھر میں اور مٹی کے مکان میں رہنے کا عادی تھا جو آپ مجھ سے چھین چکی ہے۔ میں آپ کے مکان کی بنیاد رکھے جانے بغیر آپ کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں"

میں بچہ کی بات سن کر حیران رہ گئی۔

"اُف! یہ چھوٹا سا بچہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی بڑی بڑی باتیں بھی سمجھ اور کہہ سکتا ہے۔ یقیناً یہ بھی میری طرح زخمی ہے اس کے اندر بھی کہیں کوئی ایسے نہ [illegible] زخم [illegible] ہے۔ جس کے درد کو یہ

محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی وہ بہت کچھ بتانا چاہتی ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہیں کیونکہ آپ نے جب سے دکھایا تو ایک شخص کا وجود بہت اونچا ہو جاتا ہے اور ان کے وجود کا سایہ دور تک پھیلا ہوتا ہے اور وہ گم ہو کر آہستہ آہستہ اس کو اپنا آپ سمجھنے لگتی ہیں کہ وہ مکان اپنا نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کبھی وہ بھی اپنا نہ رہے اور اسی کوشش میں ان کا دم گھٹتا ہے۔ بچہ مکان کی بناوٹ کے بارے میں بات کرنے کے بعد خاموش تھا۔

علیم اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے شفقت سے کہنے لگے۔

چھوٹی بی بی تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ تمہارے لئے مکان بہت ضروری ہے تم بنانے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو ابھی تمہاری جگہ مکان ہر بچے کے لئے مل جاتا ہے اسی میں پناہ لے لو پھر بڑے ہونے کے بعد تم اپنی مرضی سے ایک الگ مکان تعمیر کر لینا۔

بچہ اب کی بار کچھ بھی نہیں بولا اور بس خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی اداس نظریں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

بی بی جی تم بہت ہی حساس ہو۔ تم اپنے اندر کے نشان زخم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے دوسروں کے زخموں کے نشانوں میں الجھ جاتی ہو اور تم یہ بھی بھول جاتی ہو کہ کون سا زخم تمہارا ہے اور کون سا زخم دوسروں کا۔ بس تمہیں اتنا یاد رہتا ہے کہ زخم زخم ہوتا ہے خواہ وہ اپنا ہو یا دوسرے کا۔ پھر تم اپنے زخموں کے ساتھ دوسروں کے زخموں کے نشان بھی ڈھونڈنے لگتی ہو تاکہ ان نشانوں کو تلاش کرنے کے بعد ان پر اپنی ممتا اور اپنی محبت کا مرہم لگا کر اس نشان سے ابھرنے والے درد کو مٹا سکو۔ لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ کوئی اور کسی کے زخموں کا نشان نہیں ڈھونڈ سکتا۔ اگر کوئی ڈھونڈنے کی کوشش کرے بھی تو وہ نادانی ہے کیونکہ دوسروں کے زخموں کو کریدنا ان کو اور گہرا کر دیتا ہے۔ اسی لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے زخموں کے نشان خود ہی ڈھونڈنے کی کوشش کریں تب ہی اپنی تسکین ہو سکتی ہے۔ [illegible]

میں اپنے [illegible]

درد سے نڈھال کر دینے کے عالم میں میرے منہ سے ہلکی سی آواز نکل گئی۔ کرب میں ڈوبی ہوئی سسکاری سن کر علیم مجھے تکنے لگے۔

"آپ پاگل ہو رہی ہیں؟ کیا اپنی انگلیوں کو زخمی کرنے کا ارادہ ہے"

علیم کے ٹوکنے پر میں اپنے ان خیالات سے چونک پڑی۔ بچہ ابھی تک میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ تب ہی ایک دوسرے گھر سے ایک زوردار اور کرخت آواز ابھری۔

"اے لڑکے تو وہاں کیا کر رہا ہے۔ چل ادھر آ۔ جلدی سے آ"

اس بچے نے جاتے جاتے ایک لمحے کے لئے رک کر میری طرف متبسم نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کی متبسم نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کر کے میں بے چین ہو گئی۔ کیا وہ جاتے جاتے بھی اپنی نظروں سے یہ کہہ گیا ہے کہ اپنے زخموں کے نشان ہمیں خود تلاش کرنا چاہیئے۔ میں اس کو یہ نہیں سمجھا پائی کہ چھوٹو انسان کے اندر بہت سارے بے نشان زخم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے نشان تلاش کرنے کے لئے انسان دوسروں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

چھوٹو! ___ تو ابھی بہت چھوٹا ہے رے ___ تو ابھی بے نشان زخموں کے درد کی گہرائی کو نہیں سمجھ سکتا۔ جب تو بڑا ہو جائے گا اور تیرے وجود کے اندر کے بے نشان زخموں سے اٹھنے والا نامعلوم سا درد جب اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا تب تو بھی اپنے اپنے زخموں کے نشان ڈھونڈنے کے لئے دوسروں کے سہاروں کا محتاج ہو جائے گا۔ میں بچے کو گلی کے دوسرے سرے پر غائب ہونے تک دیکھتی اور اپنی سوچوں سے الجھتی رہی۔ اب اس واقعہ کو گزرے بیس پچیس دن بیت چکے ہیں لیکن آج بھی جب چھوٹو میرے سامنے چائے کی پیالی لاتا ہے۔ میرے اندر کی گہرائیوں میں کہیں سے ایک نامعلوم سا درد اٹھ کر میرے پورے وجود کو کرب آلود کر دیتا ہے۔ تب میں اپنے اس بے نشان زخم کو جس سے یہ نامعلوم درد اٹھتا ہے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں میں تلاش کرنے لگتی ہوں اور بے خیالی میں ___ میں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر کے بڑی بیدردی سے مروڑ دیتی ہوں۔ ☆☆

ڈاکٹر عابد معز

ڈاکٹر نامہ

انسان تکلیف میں خدا کو یاد کرنے کے بعد ڈاکٹر کو ڈھونڈتا ہے۔ اس سے مشورہ لیتا اور اس کی بات پر عمل کرتا ہے۔ عام طور پر علم طب کے ماہر شخص کو ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ لیکن ہماری نظر میں ڈاکٹر، سماج کے اس طبقہ کا نام ہے جو لوگوں کو مختلف بیماریوں میں مبتلا دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ آپ شاید ہم سے اختلاف کریں۔ ماضی میں ڈاکٹر کے تعلق سے ہمارا یہ نظریہ نہ تھا۔ ہمارے درمیان موجود کئی افراد ڈاکٹر کہلاتے ہیں جن کی بہتات اس خیال اور ڈاکٹر کی مختلف اقسام اس مضمون کا محرک بنی۔

سب سے پہلے ہم "اشتہاری ڈاکٹر" کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر کی پریکٹس کا دارومدار شہرت پر ہوتا ہے۔ مریضوں کو افاقہ ہونے کی صورت میں وہ ڈاکٹر کی تشہیر کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لیکن اشتہاری ڈاکٹر اخباروں اور رسالوں میں اشتہارات دے کر، جابجا پوسٹرس چسپاں کر کے اور عوام میں ورقیے تقسیم کر کے شہرت حاصل کرتے ہیں۔ اشتہارات میں بیماری اور ان کے خود ساختہ علاج کے بارے میں بلند بانگ دعوے ہوتے ہیں۔ "دنیا میں کسی کو بیمار نہ رہنے دوں گا"۔ اب آپ کو کیا بتلائیں دواخانے کی طرف کئی افراد مختلف بیماریوں میں مبتلا نظر آتے۔ آنکھوں کے ڈاکٹر کا دعویٰ ہے "میرے ہوتے ہوئے کوئی اندھا نہ کہلائے گا"۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے "دنیا میں کوئی مرض ایسا نہیں، جس کا علاج نہ ہو! پھر آپ! اتنے دنوں سے کیوں بیمار ہیں؟ ہم سے ملیے ہمارے پاس ہر مرض کا علاج اور ہر علاج کا نسخہ موجود ہے"۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب جن کو جنسیات سے دلچسپی ہے نعرہ لگاتے ہیں "آج اس کمر توڑ مہنگائی میں ہمارے یہاں سستے دام صحت خرید فرمایئے"۔

ایک قسم ڈاکٹر کی پوشیدہ ہوتی ہے۔ ہماری مراد مردانی اور زنانی پوشیدہ امراض

کے ماہر جانے جاتے ہیں۔ اس قسم کے ڈاکٹر پوشیدہ امراض کا صرف علاج پوشیدہ کرتے ہیں۔ جبکہ وہ خود بھی پوشیدہ امراض بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ اشتہارات، پوسٹرس اور وزٹنگ کارڈوں کے ذریعہ ایسے ڈاکٹر بہت مشہور ہوتے ہیں۔ اکثر اشتہار میں ڈاکٹر کی فوٹو بھی چھپی ہوتی ہے جس [illegible] ہے۔ [illegible] اخبارات میں فلمی اشتہارات کے [illegible] پبلک کا [illegible] ہوتے ہیں۔ اشتہاروں میں استعمال ہونے والے چند مشہور فقرے ہیں جو برسوں بلکہ صدیوں سے استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں "عزت بچانے کے لئے [illegible] خودکشی حرام ہے"، "شادی سے پہلے یا شادی کے بعد" "خوشیوں سے [illegible]" "خوش نصیب، شادی کیجئے" "خلوت اور جلوت میں شرمندگی کیسی!" "[illegible] کا علاج" "ہم ہر مرد کی شرمندگی دور کرتے ہیں" وغیرہ وغیرہ ہم نے ایک اشتہار کچھ اس طرح بھی دیکھا ہے "پچھلے دنوں اسی جگہ خبر چھپی تھی کہ ایک نوجوان نے شادی سے پہلے ہی خودکشی کر لی۔ کیا آپ کا ارادہ بھی یہی ہے؟" جواب کچھ بھی ہو، ہاں یا نہ شادی سے قبل آپ ہم سے ایک بار ضرور مل لیں۔" پوشیدہ ڈاکٹر کا رازداری سے علاج کا پیشہ ہوتا ہے۔ رازداری بعض ڈاکٹروں کا طرۂ امتیاز ہے تو بعض کا شیوہ ہے۔ بعض ڈاکٹر مکمل رازداری کی ضمانت دیتے ہیں۔ پوشیدہ ڈاکٹر کے دواخانوں کے نام عوام کی [illegible] توجہ کا [illegible] بنے ہوتے ہیں۔ پوشیدہ ڈاکٹر کے پاس مریض کے نام کے ساتھ ان کی دواؤں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ دواؤں کے نام فلمی ہیروئن، تاریخی عمارات، یا پھر شہنشاہوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ جیسے گولی واجد علی شاہ، معجون مغلِ اعظم، جوشاندہ قطب مینار۔ دواؤں کا پورا ایک کورس استعمال کرنا پڑتا ہے۔ دواؤں کے استعمال کی مدت کی بنیاد پر بھی لوکل، ایکسپریس، سوپر فاسٹ جیسے نام دئے جاتے ہیں۔

پوشیدہ ڈاکٹر جنس کے بھی ماہر ہوتے ہیں۔ وہ تبدیلی جنس پر بھی اختیار رکھتے ہیں۔ [illegible] آپ اپنی پسند کا کھا سکتے ہیں، پہن سکتے ہیں تو پھر اپنی پسند کی جنس کیوں نہیں اپنا سکتے؟ ہم حسب خواہش آپ کو مرد اور عورت میں تبدیل کر سکتے ہیں" [illegible] ڈاکٹر صاحب دوران حمل جنس مقرر کرنے میں ماہر تھے۔ ان کا اشتہار ایسے ہوتا۔ "جو چاہیں پائیے! ہماری دوا سے حسب منشا اولاد حاصل ہوگی۔ لڑکا چاہیے لڑکا ہوگا، لڑکی چاہیے لڑکی ہوگی۔" لڑکے کے لئے [illegible] والی دوا، لڑکی کے لئے دوا کی قیمت سے تین گنا زائد وصول کی جاتی ہے۔ پوشیدہ ڈاکٹر سے علاج کروانے والے مریض بہت رازداری

ے کام لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں ہونے پاتی جس سے
نا شہرت پر حرف آئے اور یہی پوشیدہ ڈاکٹر کی کامیابی کا راز ہے۔

کہنہ امراض جیسے دمہ، بواسیر، نواسیر، السر، ذیابیطس وغیرہ کا علاج کرنے
لے کئی ایک ڈاکٹر ہوتے ہیں جنہیں ہم "کہنہ ڈاکٹر" کہیں گے۔ ان میں اکثر خود کسی کہنہ مرض کا
ور رہتے ہیں۔ ہم ایک صاحب کو جانتے ہیں جنہیں دمہ کا مرض تھا۔ علاج، تعویذ، گنڈے سب
روا چکے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن خودکشی کے ارادے سے انھوں نے کچھ مرچیں یوں کھا لیں۔ ہوش
آئی لیکن مرض دمہ جاتا رہا۔ آج یہی صاحب ڈاکٹر بنے دمہ کا تیربہدف علاج کرتے ہیں۔ کہنہ
بغیر آپریشن صرف چند پڑیوں کے ذریعہ ان امراض کا علاج کرتے ہیں جن میں آپریشن ناگزیر
ہے۔ بورڈ پر لکھا ہوتا ہے۔ "بغیر آپریشن صرف پندرہ یوم میں علاج" فائدہ نہ ہونے کی
ت میں بیماری واپس ہوتی ہے۔ پیچیدگیاں بھی لاحق ہوتی ہیں جیسے تو خیر ایک وقت
ے بیسے باہر آنے کے بعد کبھی واپس نہیں پہنچتے۔ کہنہ ڈاکٹر لاثانی زندگی کی طمانیت اور شفا کا
ما دیتے ہیں۔ جبکہ خود اپنی زندگی کا بیمہ کروا رکھتے ہیں۔

ایک قسم عطائی ڈاکٹر ہوتی ہے۔ جو عطائی نسخوں سے علاج کرتے ہیں۔ یہ لوگ
عام طور پر بے ضرر ہوتے ہیں۔ عطائی ڈاکٹر علاج کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیتے' کہتے
پیسے لینے سے دوا اثر نہیں کرتی۔ ویسے تحفے تحائف قبول کرتے ہیں۔ ایسے ڈاکٹر ایک یا
ض کا علاج کرتے ہیں۔ یرقان ان کا محبوب مرض ہے۔ یہ لوگ اشتہار بازی ضرور لیکن
و پیمانہ پر کرتے ہیں۔ لکھا ہوتا ہے۔ "یرقان کا مفت علاج! ایک سو سال سے آزمایا ہوا
ہ کے یرقان کے لئے کامیاب نسخہ موجود ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے پردادا کو ایک صوفی'
جنگل میں طوفان بادوباراں کے دوران دوپہر بارہ بجے دے کر غائب ہو گئے تھے" عطائی
" کا طریقہ علاج عجیب وغریب ہوتا ہے۔ نرالا پرہیز بتلایا جاتا ہے۔ آپ کو ان کی دوائیں
بیٹ جامن، آم، انگور یا مچھلی کے پیٹ میں رکھ کر کھانی پڑتی ہیں یا پھر چار سالہ کالی گائے
دودھ میں ملا کر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ تمام دن بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ رات میں مرغ پکوا کر
سامنے دوسروں کو کھلانا اور خود باسی دال اور سوکھی روٹی پر گذارہ کرنا پڑتا ہے۔
کے بعد آپ کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ ہر جمعرات کو صوفی صاحب کی درگاہ پر حاضری دینا۔
شیرینی تقسیم کریں۔ ڈاکٹر صاحب دوا دینے کے لئے سال میں چند دن اور دن میں دوپہر یا
ج طلوع یا غروب ہونے کے بعد کا وقت مختص کر لیتے ہیں۔ دوا استعمال کرنے کے دوران

تھوڑی سی بھی بدمیتی فائدہ ہیں پھیلاتی اور جہاں فائدہ نہیں ہوتا وہاں بدمیتی ڈاکٹر کی ڈھال بنتی ہے۔

ایک قسم ڈاکٹر کی وہ ہوتی ہے جنہیں کوئی یونیورسٹی یا ہسپتال سے سند نہیں ملتی مگر انہیں ان کے مریض فیس کے ساتھ اسناد اور سرٹیفکیٹس دیتے ہیں اور ڈاکٹر کے فائدہ کے لئے مریض اخبارات میں اشتہار بنتے ہیں۔ اشتہارات دلچسپ ہوتے ہیں۔ "ہماری شادی ہوئے بندرہ سال کا طویل عرصہ بیت چکا تھا۔ ہم اولاد کی خوشی سے محروم تھے۔ دنیا بھر کا علاج معالجہ کروایا۔ جب کبھی سنتے فلاں ڈاکٹر اچھا ہے ہم امید لئے اس کے پاس پہنچ جاتے۔ ایسے ہی ہم ڈاکٹر صاحب سے رجوع ہوئے۔ ان کی وجہ سے ہماری سونی زندگی میں بہار آئی۔ ہمیں اولاد نرینہ ہوئی۔ پیارے بھائی اور بہنوں سے ہم گزارش کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی گود بھرلیں"۔ ایک اور اشتہار ملاحظ فرمائیے "مایوسی میں امید کی کرن! مجھے شہر کے ہسپتال میں بتلایا گیا کہ میں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوں اور میں موت کے انتظار میں ایک ایک پل کاٹنے لگا۔ کسی نے مجھے ڈاکٹر صاحب کا پتہ دیا۔ اب ڈاکٹر صاحب کے علاج سے میں بالکل ٹھیک ہوچکا ہوں۔ اب مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے موت کے منہ سے چھڑالایا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس ایسے ہی اور بھی لاعلاج امراض کے شرطیہ علاج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے شہر میں صرف چار یوم رہیں گے۔ میں اپنے جیسے مایوس لوگوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے مل کر نئی زندگی حاصل کرلیں"۔۔۔ اشتہارات میں مریض کا فوٹو، پتہ اور علاج سے پہلے اور بعد کی کیفیت کے بارے میں تفصیل درج ہوتی ہے۔ مریض سے ملنے کا وقت بھی دیا جاتا ہے۔ اشتہارات میں ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کی تعریف ہوتی ہے۔ مریض کوئی ایسا اشتہار نہیں چھپواتا کہ "میں بلند بانگ دعوے پڑھ کر ڈاکٹر صاحب سے رجوع ہوا۔ علاج کرواتا رہا۔ پیسہ جاتا اور مرض کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ میں اپنے جیسے بھائی اور بہنوں کو احتیاط برتنے کا مشورہ دیتا ہوں"۔

ایک قسم "ہرفن مولا ڈاکٹر" ہوتی ہے۔ انہیں حکمت میں دخل رہتا ہے۔ جڑی بوٹی گھر کی کھیتی ہے۔ ماڈرن میڈیسن قابلیت ہے۔ اپنے نام سے پہلے ڈاکٹر، حکیم، وید وغیرہ قسم کے الفاظ تحریر کرتے ہیں۔ ایک ہی مرض کا علاج کئی طریقوں سے کرتے ہیں۔ موقتی آرام کے لئے ماڈرن میڈیسن سے کام لیتے ہیں۔ جڑ بیڑ سے مرض کو ختم کرنے کے لئے حکمت کا سہارا لیتے ہیں جو آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ دوا کے مضر اثرات کو زائل کرنے

ے لئے جرثومی رول کا نام آتی ہے۔ علاج کے کئی طریقوں سے مرض کا عشر معلوم نہیں کیا ہوتا ہے
نا مریض کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہمیں ایک دوست کی یاد ستاتی ہے
ں کی بے وقت اور بے وجہ موت پر ہم نے خون کے آنسو بہائے تھے۔ وہ ایک ایسے ہی
نی مولا ڈاکٹر کے زیر علاج تھے۔ پیٹ کے درد کے لئے انجکشن لگواتے، جو شاندہ پیتے
ے چاٹتے اور کیپسول نگلتے تھے۔

اب ہم "روحانی ڈاکٹر" کے تعلق سے چند باتیں لکھیں گے۔ ڈاکٹر کی دیگر اقسام کا
یقہ علاج سمجھ میں نہیں آتا لیکن روحانی ڈاکٹر کا بیان کردہ مرض ہی سمجھ نہیں پڑتا۔ خدا
پناہ ایسے ایسے امراض بتلاتے ہیں کہ سنتے ہوئے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں۔ پسینہ آنے
تا ہے، حلق خشک ہو جاتا ہے۔ سانس آدھی اوپر اور آدھی نیچے رہ جاتی ہے۔ کہتے
"آپ سر شام نیم کے درخت کے نیچے سے گذر رہے تھے۔ آپ کے حسن یوسف سے
ثر ہو کر ایک چڑیل وارد ہو چکی ہے۔ چڑیل کا پریشان کرنا قدرتی عمل ہے لیکن چڑیل کا
بلا کنیت سے جذبۂ رقابت کے نتیجے میں جان دشمن ہو گیا ہے"۔ اس کے بعد بھیانک موت
نقشہ کھینچا جائے گا۔ چڑیل، شیطان، بھوت، جن وغیرہ ہم پر وارد ہونے کے علاوہ
۔ اور عام مرض روحانی ڈاکٹر بیان کرتے ہیں۔ "آپ پر کسی نے جادو ٹونا کروا دیا ہے۔
عورت ادھیڑ عمر، موٹی اور نہ دبلی، کالی اور نہ گوری، دوپہر کے کھانے میں دوا ملا کر
ائی تھی۔ روحانی ڈاکٹر کے فلسفہ پر یقین کرنے والے کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی
جسے اس فلسفہ پر یقین نہیں ہوتا اس کے ایمان کو کوئی بات بھی متزلزل نہیں کر سکتی۔ ہمارے
یہاں پہلے طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں جو روحانی ڈاکٹر سے علاج کرواتے ہیں
ہمیشہ روحانی ڈاکٹر فائدہ میں رہتا ہے۔

ایک قسم "خطابی ڈاکٹر" ہوتی ہے۔ اکثر خطابی ڈاکٹر علاج نہیں کرتے۔ انہیں
ن کے تعلق سے عام آدمی سے زائد معلومات بھی نہیں رہتے۔ صرف وہ ڈاکٹر کے نام
جانتے اور پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک خطابی ڈاکٹر ہمارے دفتر
ہوتے ہیں۔ انہیں بچپن سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ ڈاکٹر کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔
ٹ موٹ کا رس سے انجکشن لگاتے اور رنگین پانی کا دوا دیتے تھے۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے
نے کہا "بدقسمتی سے میں ڈاکٹر نہ بن سکا لیکن میرے شوق نے مجھے ڈاکٹر کا خطاب
یا ہے۔" آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ دواخانے میں کام کرنے والے کسی بھی شخص کو لوگ ڈاکٹر

کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایسے اشخاص کو بھی ہم نے غلطی سے ڈاکٹر کے زمرے میں شامل کیا ہے۔

ایک قسم "توڑ جوڑ ڈاکٹر" ہوتی ہے۔ ہماری مراد ان ڈاکٹروں سے جو ہڈیوں کے ٹوٹنے اور سرکنے پر انہیں ٹھیک کرتے ہیں۔ ایسے ڈاکٹر فلمی ستاروں سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ جیسے حجامت خانوں کے بورڈ پر فلمی ستاروں کو حجامت بناتے ہوے دکھایا جاتا ہے۔ ویسے ہی توڑ جوڑ کے بورڈ پر مختلف فلمی ستارے ہاتھ اور پیر بلکہ تمام جسم پر پٹیاں باندھے رومانس کرتے نظر آتے ہیں۔ اکثر دواخانوں میں فلمی گانے بھی بجائے جاتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹری خاندانی جاگیر اور پیشہ بھی ہے۔ پیڑھی در پیڑھی سے خاندان کے لوگ دواخانہ چلاتے آرہے ہیں۔ دادا، پردادا نے ایک مرض کے علاج کا نسخہ دریافت کیا تھا۔ بس خاندان کے لوگ اسی نسخے کی بدولت تجارت کرتے چلے آرہے ہیں۔ خاندانی ڈاکٹر کے مطب اور اشتہار میں ڈاکٹر کا شجرۂ نسب درج ہوتا ہے۔ آخر میں انکساری سے لکھا ہوتا ہے "یہ خاندان تین صدیوں سے عوام کی بے لوث خدمت میں لگا ہوا ہے۔ اس کے سلسلے میں کئی افراد لقمۂ اجل ہو چکے ہیں" دواؤں کا کاروبار کرنے والے بھی ڈاکٹری کرتے ہیں۔ آپ کسی بھی دوکان پر جائیے، بیماری کا حال سنائیے، سیٹھ صاحب پیسے وصول کرکے دوا دے کر پرہیز بتلاتے ہیں۔ ہم ایسے ڈاکٹر کو "دوکانی ڈاکٹر" کہیں گے۔

ہر شخص، چاہے گانا آئے نہ آئے گنگناتا اور باتھ روم سنگر کہلاتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان تھوڑی بہت ڈاکٹری ضرور کرتا ہے۔ کسی سے بھی اپنی تکالیف بیان کیجئے وہ ڈاکٹر کا پتہ دینے سے پہلے اپنی رائے ضرور دیتا ہے۔ کہیں گے "آپ کے مزاج میں سردی معلوم ہوتی ہے۔ گرم اشیاء سے سینہ اور پیٹ میں بلغم جمع ہو گیا ہے مجھے بھی ایک وقت ایسا ہی ہوا تھا تب میں نے فلاں گولی اور فلاں شربت استعمال کیا تھا۔ آپ بھی ایسا ہی کیجئے فائدہ ہوگا" ہمارے خیال میں ڈاکٹری ایک فطری عمل ہے۔ آخر، انسان کا اپنے جسم پر کچھ تو حق ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر کی اور بھی قسمیں ہیں۔ طوالت سے گھبرا کر ہم "حقیقی ڈاکٹر" کے تعلق سے ان الفاظ کے ساتھ اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ حقیقی ڈاکٹر، لغت میں دئے گئے ڈاکٹر کی تعریف پر اترتا ہے۔ حقیقی ڈاکٹر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ تحقیق اور دوائی۔ دونوں ہی عظیم ہوتے ہیں کئی سال محنت سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ آنکھوں پر موٹے عدسوں کی عینک چڑھا کر، وزن گھٹا کر اور بال گنوا کر صرف ڈاکٹر کہلاتے ہیں جب کہ دوسرے قسم کے ڈاکٹر بہت ہی آسانی سے یہ لقب اختیار کر جاتے ہیں۔ ہمیں حقیقی ڈاکٹر سے ہمدردی ہے۔

حسینی جاوید

بس نامہ

محترم یوسف ناظم سے معذرت کے ساتھ

ممتاز مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے امیر احمد خسرو کے سفرنامہ پاکستان سے متاثر ہو کر 'گزرنامہ' لکھا اور اس کے بارے میں یہ توضیح پیش کی کہ وہ بھی عنقریب باہر جانے والے ہیں۔ پیرس اور لندن سے ضرور گزریں گے، واپسی کا شائد انھیں موقع نہ ملے "اسی لیے گزرنامہ تحریر کرتے ہوئے انھوں نے اسے امیر خسرو کی نذر کر دیا، اب وہ جانیں یا اُن کا کام! یوسف ناظم نے تو بہرحال اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

اب ہم اپنا فرض یوں پورا کر رہے ہیں کہ چاہتے ہیں لوگ کچھ ہی کہہ لیں۔ ان نامہ جات میں ہم خود کو ضرور شامل کریں گے اور اس تسلسل کو مزید آگے بڑھائیں گے۔ 'قلم نامہ' قلم کی بادشاہت کی روئیداد، 'سفرنامہ' سفر کی تفصیل اور 'گزرنامہ' گزرگاہوں کی ت ن د ہی پر مبنی ہوا کرتا ہے لیکن جس گزرنامہ کا ذکر ہے وہ مجوزہ، متوقع یا امکانی کہلانے کا اس لیے بھی زیادہ مستحق ہے کہ خود اس کے خالق کے مطابق ابھی تک انھوں نے ان گزرگاہوں کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے "گویا خیالوں ہی خیالوں میں خانہ بدوشی کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

ہمیں کسی کے بارے میں بھی کچھ کہنا نہیں ہے۔ تاہم 'قلم نامہ'، 'سفرنامہ' یا 'گزرنامہ' کی تقلید کرنے سے خوشی ہوتی ہے کیونکہ یہی سیدھا سادا تسلسل

جاگیردار ہاؤس، ملنڈی، اسٹیشن روڈ، اورنگ آباد - (۴۳۱۰۰۱)

معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس طرح آسانی کے ساتھ دل کے پھپھولے پھوڑ سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ 'بسر' ایک ایسا لفظ ہے جو 'گزر' کے ساتھ ہو تو اپنی معنویت کو دو آتشہ و دوبالا کر دیتا ہے' یہ تنہا اس لیے بھی استعمال نہیں ہوتا کہ اسے برہمچاری بننے کا فی الحال کوئی شوق نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ 'فنا فی الزوج' کے مرتبہ کے حامل اس قدر عظیم الشان و قابل احترام لفظ کے ساتھ کافی بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اگر 'گزر بسر نامہ' ہی تحریر کیا ہوتا تو کیا بگڑتا؟ ہمیں کیوں اس زحمت سے دوچار ہونا پڑتا' بہر حال یہ مشیت تھی کہ ہم بھی اس تسلسل میں ہاتھ بٹائیں' سو حاضر ہے!!

بسر نامہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ آج کل ہم بسر و چشم یوں بسر کر رہے ہیں کہ 'بس' بسر ہونے کو ہے۔ اس بسر کے دوران دو ایک مرتبہ ہوائی جہاز کے سفر سے بھی گزرنا پڑا ہے کہ یہ بسری کی ہائی کلاس مانی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تین قسم کے لوگ ہم کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو ہمیں آگے کر کے ہماری معصومیت اور بھولپن کا فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم ان کے ساتھ رہیں تو ان کا ہر کام از خود بن جاتا ہے گویا ہم مقدس جنرل اسٹور ہو یا ٹکل ہوئے اور تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو محض نام پاس کی خاطر ہم کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور اس طرح ہمارے اوقات خراب کرتے ہیں۔ ان ہی کرم فرماؤں کے ساتھ ہم ہوائی جہاز کا سفر بھی اختیار کر چکے ہیں یا حیدرآباد سے بمبئی یا بمبئی سے اورنگ آباد۔ گرگٹ کی دوڑ باڑھ تک' لیکن کچھ بھی ہو' ہوائی جہاز میں بیٹھے ضرور ہیں۔

پہلی مرتبہ جب ہوائی جہاز میں بیٹھنے اور اڑان بھرنے کی خاطر ہوائی اڈہ پہنچے تو یہ دیکھ کر کافی حیران اور پریشان ہوئے کہ اس قدر وزنی جہاز اڑتا کس طرح ہوگا۔ ہوا کے دوش پر لہراتے لہراتے کہیں زمین بوسی کا شرف حاصل کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہمارے بچے قدم بوسی کی رسم انجام دے کر گھر جا چکے تھے۔ ان کا کیا ہوگا ہمارے فراق میں ہماری بیوی کا حال کیا رہے گا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب بیوی کو اپنے شوہر کی محبت میں گم اور اپنا منتظر

بلکہ سنتے ہیں اکو دوا کم ملتی ہے۔ ایسے ذریعۂ معاش اور سعودی ملازمت کی آخر کس بیوی کو تمنا نہ ہو۔ ہر بیوی یہی چاہتی ہو گی کہ اس کا شوہر ہوائی جہاز سے سفر کرے اور وہ ہوائی جہاز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

لیکن ہماری بیوی کی قسمت میں اعلیٰ درجہ کی "بسر" لکھاں لکھی تھی' ہم بخیر و عافیت جب سفر سے واپس گھر پہنچے تو ہمیں دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اس صورتِ حال کا لازمی اثر تو ہم پر نہیں پڑا تاہم بیوی سے ہمیں یہ دریافت ہی کرنا پڑا کہ یہ بے موقع آنسو کیوں؟ جواب ملاحظہ فرمائیے۔ بیوی اسی کو کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں!! اس کا جواب تھا۔ بیگم کی پیٹھ تھپتھپا کر ہم یوں گویا ہوئے ۔ معاف کرنا بیگم' اسے آنسو آف ایلائنز فار ایڈ بھی تو کہہ سکتے ہیں نا۔ بیگم کا ماتھا اچانک اور یکلخت ٹھنکا۔ آخرکار اسے کہنا پڑا۔ یہ کیا ہوتا ہے جی!! وہی جو تمہارے دل میں تھا' ہم نے فوری کہا۔ ہمارے دل میں خاک تھا۔ تیوری کے بل چڑھ گئے' بیوی کی ناراضگی دیکھ ہمارا دل بھی بلیوں اچھلنے لگا۔ اصل میں بیوی جب ناراض ہو جاتی ہے تو ہم پر ہائی بلڈ پریشر کی دختر نیک اختر بدحواسی پوری طرح حاوی ہو جاتی ہے' شاید اسی کیفیت کو دیکھ کر زن گزیدہ لوگ ہمیں زن مرید کہہ لیتے ہیں۔

شادی شدہ حضرات کا یہ المیہ ہے کہ ان کی بیچارگی اطاعت کی تابع ہوا کرتی ہے بعضوں کے بارے میں تو یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ اچھے خاصے شوہر بیوی دکھائی دینے لگتے ہیں اور وہ سارے کام سرانجام دیتے ہیں جو بیوی کا خاصہ ہوتے ہیں۔

جب سے مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا مطالبہ شروع ہوا ہے بیویوں کے تیور ہی بدل گئے ہیں' وہ گھریلو امور پر کم اور بیرونی مسائل میں زیادہ دلچسپی لینے لگی ہیں بلکہ گھر سے باہر ہی زیادہ وقت گزار رہی ہیں' اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں کہ دونوں گھر سے باہر ہی رہنے لگیں' گھر نہ آئیں' شوہر کام کاج سے فارغ ہو کر محض بیوی کی خاطر تو شام کو گھر آجایا کرتے تھے' اب کس کے لیے آئے گا بے چارہ۔ بیوی تو گھر میں موجود نہیں رہے گی' اس طرح

بہرحال، کسی طرح یونہی بسر ہو رہی ہے اور ایسے ویسے باقی بھی بسر ہو جائے گی لیکن ہماری خواہش یہ ہے کہ ہمارے جیتے جی وہ زمانہ نہ آئے ناحق کیوں پریشان ہوں۔ چند شریف لوگ آج بھی گھر کی مرغی اور بلی کو ڈھونڈتے ہوئے جا بہ جا نظر آ جاتے ہیں۔ کل کے روز اسی طرح کے شریف اور بے ضرر لوگ اپنی بیویوں کو ڈھونڈتے ہوئے نظر آئیں گے بلکہ ہر نکڑ پر آواز لگائیں گے کہ مکان نمبر بیالیس کی اہلِ خانہ اور تاچیز خاکسار کی اہلیہ محترمہ جہاں کہیں ہو فوری اپنے گھر آ جائے بچے رو رہے ہیں ـــــ اور بیوی صاحبہ کسی قریبی کافی ہاؤز سے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نکل رہی ہوگی

"ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا"

اللہ اللہ کیا زمانہ ہوگا وہ، کس مشکل میں شوہر کی بسر بلکہ گزر ہوگی، اس تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں جو مردم شماری اور اختر شماری کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اس وقت کے شوہر آج کے گھر دامادوں سے بھی بدتر ہوں گے۔

گھر دامادوں کے صحیح خدوخال سے ہم قطعی ناواقف ہیں، البتہ برسوں سے محض لفظی کشش کے سبب یہ خواہش ہمارے دل میں جگہ پائی ہوئی ہے کہ ہمیں بھی کوئی گھر داماد بنالے۔ آخر ہم میں کمی کیا ہے۔ مطلوبہ تمام خصوصیات مع عاجزی، درگزری اور فرماں برداری وغیرہ ہم میں موجود ہیں۔ خسر کے "کیوں" کہنے سے پہلے "جی ہاں" کہنے کی پراکٹس بھی ماشاءاللہ کرچکے ہیں۔ بلکہ اس میں طاق ہیں! اب رہی اہلیہ کے احکام پر عمل در آمد کی بات، سو وہ بھی رفتہ رفتہ ہو جائے گا۔ اہلیہ تو ہمیں ٹرینڈ کرنے کی اہل ہی ہوگی۔ وہ اہلیہ ہی کیا جو اس معمولی سے کام کی بھی اہل نہ ہو، بہرحال یہ ایک تکنیکی معاملہ ہے اور تکنیکی معاملات کا تعلق خالص گھریلو زندگی سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا افشا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

الغرض جو کچھ حال بیویوں کا تھا وہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اب آیئے بیرونِ دنیا کے خلعمین پر بھی کچھ روشنی ڈال دیں کہ روشنی کے مینار ہمارے پاس اور اس روشنی سے استفادہ کر [illegible]

بیرونی مخلصین کے پاس ہو جیسے بیرونی مخلصین سے ہماری مُراد ہمارے دوستوں سے ہے۔ آدمی جب بیوی سے جھٹکارا حاصل کر کے گھر سے باہر نکلتا ہے تو یہی وہ مخلصین [illegible] پر تپاک استقبال اور عظیم الشان خیر مقدم کا [illegible] ڈالنے کی فکر دستی کرتے ہیں۔ [illegible] یہ بات [illegible] پہنچ سکی ہے کہ [illegible] مخلصین کا [illegible] [illegible] ہماری بے وقوفی کا [illegible] ہوتا ہے۔ اب آپ [illegible] کہ ٹوپی پہنانے کے بعد وہ اُدھر فاتحانہ ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں تو اِدھر ہم یہ سوچ کر خاموش رہتے ہیں کہ بھلوں کو خوش کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

بہر حال اس دنیا میں ہر آدمی کو کئی طرح کے مسائل سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو ہوشیار اور شاطر سمجھنے پر اس لیے مجبور ہے کہ اس احساس کے بغیر فی زمانہ زندگی بسر کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ آپ حیرت کریں گے کہ آج کل بے وقوف اور نصف دانشور بھی اپنے آپ کو نہایت عقل مند سمجھ رہے ہیں، ان کے اس احساس کا مشاہدہ کافی دلچسپ ثابت ہوگا بشرطیکہ گہری نظر سے ان کا جائزہ لیں۔ احمقانہ اور بے وقوفانہ افعال کے بعد بھی ان کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑتی ہوگی۔ وہ بھی کیا دور تھا کہ انسان ذہنی تحفظات کے بغیر ہی آپسی تعلقات کو استوار کرنے میں مصروف رہا کرتا تھا اور آج یہ حال ہے کہ کسی کے بھی عزائم کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ خلوص، محبت اور نیک نیتی کی لوگ کامیاب اداکاری کرنے لگے ہیں۔ اس صورتِ حال میں "مستند مردم شناس" بھی اپنی ریاضت کے باوجود ناکام ہو جاتے ہیں۔

قدیم اطوار و تقاضوں کی تبدیلی کا ثبوت یہ ہے کہ معصوم و بے قصور افراد کو ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ [illegible] قانون احتساب تو قبول ہے [illegible] [illegible] لوگ [illegible] ہیں۔ طُرفہ تماشہ یہ کہ گلی گلی میں چور اچکوں کو چھوڑ کر اپنے گھر [illegible] اور شریف آدمی [illegible]

رام نواس مانو

منی افسانہ

عورت

وہ آدمی ہے یا زندہ جاوید پہیلی؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔
دوسروں کی بات تو اور ہے پانچ سال ساتھ رہنے کے بعد بھی خود اس کی بیوی اس کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی تھی۔
اس کی بیوی بھی کیا کرتی، اس کا مزاج بھی بڑا عجیب تھا۔
پانی مانگا..... لیکن بیوی کے پانی کا گلاس لے جانے تک پیاس ختم۔
کبھی سویرے ترکاری کی مانگ، تو کبھی سویرے ترکاری سے سخت نفرت۔
کبھی تین تین روٹیاں کھا کر بھی بھوک ختم نہیں ہوتی، اور کبھی صرف آدھی روٹی ہی کھا کر پیٹ بھر لیا۔
بیوی یہ سوچ کر بر بلد چکے سے مسکرا دیتی کہ شاید سب آدمی ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔
رات کو کھانے کے لئے بیٹھا تو کھاتا ہی جا رہا تھا۔
سبزی، سلاد، دال بیوی کے آنے تک سب ختم کر ڈالی۔
بیوی کھانے کے لئے بیٹھی تو سامنے صرف ایک چپاتی تھی۔
"اتنے سے کام چل جائے گا" وقت کے احساس کو مٹانے کے لئے ڈرتے ڈرتے پوچھا
"ہاں" ــــ "کیوں بھوک نہیں لگی ہے کیا؟" ــــ "لگی ہے......"
"پھر تو" ــــ "پھر کیا! آج کم ہے تو کیا ہوا۔ کل میں نے دو چپاتیاں زیادہ کھالی تھیں"
"لیکن کیا تمہاری بھوک مٹ جائے گی؟"
"عورت کی بھوک کا کیا ہے ــــ اگر زیادہ کھانا مل گیا ہے تو بھوک زیادہ ہے، اگر کم بچا ہے تو کم ہے......"

حامد بن شبیر

شکار اور شکاری

اسی طرح ایک لنگڑے شیر کا قصہ بھی مشہور ہے۔ کرنل گلیفرڈ نے لکھا ہے ان کے دوست ایک ڈاکٹر نے اپنا ذاتی واقعہ اس طرح بیان کیا:

"ڈاکٹر صاحب شکار کو گئے۔ اس نواح میں لنگڑا شیر بہت بدنام تھا جو ۳۰-۴۰ آدمی کھا چکا تھا۔ اس کی پیٹھ میں ایک بھرمار کی گولی لگی تھی اور ایک پاؤں سے لنگڑا تھا۔ بہت سے لوگ اس کو مارنے کی کوشش کر چکے تھے۔ مگر بہ حالت پریشانی واپس آ گئے تھے۔ اب ہر شخص اس سے خائف تھا۔ اور کوئی مارنے کا قصد نہ کرتا تھا۔ ان شکاری صاحب نے بڑی مشکل سے اس شیر کا کھوج لگایا۔ اور کارا باندھ کر بیٹھنے کا ارادہ کیا۔ لوگوں نے منع کیا جب چلنے لگے ایک بڈھے شکاری نے کہا جب تم نہیں مانتے ہو تو ایک نصیحت سنتے جاؤ۔ انہوں نے کہا وہ کیا؟ بڈھے نے کہا کہیں سونا مت۔ انہوں نے کہا اچھی بات ہے۔ احتیاط سے مچان بند ہوائی (۵) بجے سے مع قندیل اور دوسرے ضروری سامان کے مچان پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ کارا درخت کے سامنے بندھوایا۔ کچھ دور فاصلے پر ملازمین کو درخت پر بٹھلایا۔ ۱۰ بجے رات تک بڑی مستعدی سے بندوق جمائے بیٹھے رہے۔ اس کے بعد کچھ تکان محسوس ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بلانکٹ کھول کر پاؤں پر ڈال لیا۔ اتنے میں آنکھ لگ گئی۔ اور سچ مچ سو گئے۔ بارہ بجے رات کے قریب کسی نے ان کو ہلا کر اٹھایا اور ان کے بازو بیٹھ کر اشارہ سے بتایا وہ دیکھو شیر بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسی بو آئی کو آتی جیسے کسی سڑے ہوئے زخم سے آتی ہے۔ انہوں نے اس طرف خیال کئے بغیر بندوق اٹھائی اور شیر پر فائر کر دیا۔ جس نے ان کو جگایا تھا اظہار خوشنودی کے طور پر ان کی پیٹھ تھپکی۔ شیر لیٹتے ہیں الٹ کر گر گیا اور مر گیا۔ زخم کی بو اب بھی آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کو خیال ہوا مجھے مچان پر اٹھایا کس نے اور یہ بو کہاں سے آرہی ہے۔ انہوں نے سوچا شاید شیر کا پاؤں سڑا ہوا ہے۔ قندیل روشن کی اور ملازمین کو سیٹی دے کر پکارا مگر کوئی

جواب نہیں ملا۔ بڑی مشکل سے نیچے اُترے۔ درخت کے نیچے بجز ان کے کسی کے پیر کے نشان نہ تھے۔ شیر کے قریب جاکر دیکھے ایک پیر لنگڑا ضرور تھا۔ مگر زخم کا نام نہیں۔ سونگھ کر بھی دیکھا کسی قسم کی بو نہیں آئی۔ بہرحال اسی خیال میں تبدیلی اور بندوق لے جنگل کو طے کرکے کیمپ پر آئے۔ صبح میں بڈھا شکاری پھر آیا اور پوچھا "دیکھا"۔ انہوں نے کہا ہاں دیکھا۔ بڈھے نے کہا اور [illegible] کہا ہاں [illegible]۔ بڈھا ان کو جنگل کی طرف لے چلا۔ تھوڑی دور چلنے پر ایک پتھر کی تختی دکھلائی۔ اور کہا پڑھو۔ اس پر کیا لکھا ہے؟ انہوں نے دیکھا کہ یہ قبر کا کتبہ ہے جس پر لکھا ہے:

"یہ یادگار میرے بھائی کیپٹن فلاں کے جو یہاں شکار کھیلنے آئے تھے۔ لنگڑے شیر نے ان کو زخمی کیا جس کی وجہ سے بیمار ہوکر وفات پائی۔"

اصل بات یہ ہے کہ آدم خوار شیر کی شکاری اور عیاری کی وجہ سے گاؤں والے اکثر حد درجہ خائف ہوجاتے ہیں۔ اور چونکہ اس کی حرکتیں معمولی شیروں کی عقل سے بہت بالاتر ہوتی ہیں اسے بھوت پریت سے منسوب کردیتے ہیں۔ درحقیقت یہ سب وہم ہے۔ بلی کے متعلق بھی بیسیوں روایتیں ہیں کہ اس کے جسم میں جن ہوتا ہے اس کو کبھی نہیں مارنا چاہیئے۔ ایک دفعہ بلی پر فائر کرنے کا دلچسپ واقعہ ہوا۔ نظام آباد میں بلیاں بہت ستا رہی تھیں۔ خصوصاً ایک بلی سرتاپا بھورے رنگ بڑی شریر تھی۔ علاوہ مرغی کے بچوں کے ایک پالے ہوئے بلبل کو بھی کھا گئی۔ میں نے ارادہ کیا اس کو ضرور مارنا چاہیئے۔ ایک دن سرِمغرب جب کچھ اندھیرا ہوچکا تھا۔ یہ بلی آئی۔ اور صحن میں کھڑی ہوئی۔ میں فوراً بارہ بور اٹھا لایا۔ اور دونوں نالیوں میں (سوپر اکس) کے ایس۔ ایس۔ جی رکھ کر تقریباً چار گز سے فائر کیا۔ کارتوس نہیں چلا۔ حیرت ہوئی کہ (سوپر اکس) کا کارتوس جو زیادہ پرانا بھی نہیں ہے، کیسے نہیں چلا۔ بلی کھڑی رہی۔ دوسری نال چلائی۔ وہ بھی مس فائر ہوا۔ اس کے بعد بلی موری میں سے نکل کر پیچھے کی گلی میں سے چلی گئی۔ بیوی نے جو پہلے سے منع کر رہی تھی کہا دیکھا معلوم کیا بات ہے۔ اس بلی کو نہ ماریئے۔ اندر سے میں معمولی ایلی کے چار نمبر کے کارتوس نکال لیا۔ اس دوران میں بلی موری خانہ کے پیچھے کی گلی میں جا چکی تھی۔ جو ہمیشہ ویران رہتی تھی۔ دوسری طرف سے وہاں پہنچ کر فائر کیا۔ بلی ختم ہوگئی۔ اگر میں کارتوس بدل کر مارنے کی کوشش نہ کرتا یا فائر کا موقع ملنے سے قبل بلی چلی جاتی تو ممکن ہے یہ شبہ ہوتا کہ کیا بات ہے۔ اتفاق یہ کہ ایک مرتبہ کئی سال قبل ایک بلی پر جو کہ کونڈوں اور چھوٹے چھوٹے جالیوں کے پیچھے بیٹھی

چار پانچ گز کے فاصلے سے میں نے چار نمبر کے چھرے چلائے تھے مگر بلی بھاگ گئی تھی۔
کو نفت ہوئی تھی کہ ۱۲ نمبر کی بندوق سے چھرے چلائے جائیں اور اس قدر قریب
پر نہ لگیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جلدی میں نشانہ بھی جیسا لینا چاہیئے تھا نہ لیا گیا ہوگا
پھر چھروں کا پھیلنا بھی لازمی ہے۔ کونڈوں اور درختوں پر کچھ لگے ہوں گے۔ بلی
طرح نظر نہیں آرہی تھی۔ ممکن ہے چند بلی پر بھی لگے ہوں۔ مگر اس سے کچھ اثر نہ
بہرحال اگر اس واقعہ کو ملا کر (سوپر اکس) کے دو تقریباً نئے کارتوس مس فائر
کا واقعہ دیکھا جاتا اور دوسرے کارتوس سے مارنے کا موقع اسی وقت نہ ملا ہوتا تو
مخواہ شبہ ہو جانا ممکن تھا۔ نہ معلوم بلی تھی کیا بلا ہوتی ہے۔

اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات مل کر ایک خیال قائم کر دیتے ہیں۔ اور ایک سے
ے کے سامنے بیان کرتے میں مرچ مسالے لگتے ہوئے واقعہ کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ اس
پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سوپر اکس کے کارتوس جب تک نئے رہتے ہیں اچھے چلتے ہیں
را بھی پرانے ہو جائیں تو ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دو مرتبہ اور بھی میں نے
کہ دو ڈھائی سال قبل کے سوپر اکس نہیں چلے حالانکہ معمولی ایل جی یا ایس جی ۵-۶
پرانے بھی برابر چلے۔ ایک بھی مس فائر نہیں ہوا۔

آدم خور کی بہ نسبت اوہام پرستی کی ان داستانوں کے بعد اب ہم قدیم سلسلہ بیان
ر کرتے ہیں۔ مسٹر ڈرڈری نے لکھا ہے کہ ایک شیر دو سو سے زیادہ آدمی کھا چکا تھا جس
یادہ تر بوڑھے یا عورتیں تھیں۔ جو لکڑی یا گھانس لانے جنگل میں جاتی تھیں۔ اس
نے ایک مرتبہ ایک قوی ہیکل جوان آدمی کو مارا۔ کچھ حصہ کھانے سے رہ گیا تھا۔ اس
یب درخت پر مسٹر ڈرڈری بیٹھے۔ شیر آیا اور مارا گیا۔ اس واقعہ سے دو امور ظاہر
ہیں۔ ایک تو اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ بڈھا آدم خور جوان آدمی پر حملہ کرنے کی
ت نہیں کرتا۔ اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض دفعہ مارے ہوئے آدمی کے چارے پر
ہ بھی آجاتا ہے۔ حالانکہ یہ نہایت دیرینہ تجربہ کار شیر تھا۔ جو دو سو سے زیادہ آدمی مار چکا
۔ بندھے ہوئے جانور کو آدم خور نہیں مارتا۔ مگر بعض شکاریوں کا تجربہ ہے کہ اگر سور
باندھا جائے تو اس کو مارتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آدمی کو کھانے
ے شیر کے منہ کا مزا بدل جاتا ہے اور ہمیشہ کی طرح گائے بھینس کا گوشت اچھا نہیں
وم ہوتا۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ بڈھا آدم خور اچھی طرح سے موقع دیکھ کر ہی حملہ کرتا ہے۔

جس کو اس کا پہلو غالب ہو۔ اگر درختوں کی آڑ یا دیگر لوگوں کی موجودگی اور حفاظت ہو تو حملہ کے درمیان سے بھی لوٹ جاتا ہے۔

مسٹر اوُن میلٹ نے اپنی کتاب UNFORGIVING MINUTES میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ جنگل میں فارسٹ افسر مسٹر جارج شکار کے لئے گئے۔ ایک گونڈ کا لڑکا ویلادی ساما ان کے ساتھ تھا۔ ناگہاں ایک مقام پر آدم خوار شیر نے ان پر حملہ کر دیا۔ جس سے موصوف بری طرح زخمی ہو کر نیچے گرے اور بندوق ہاتھ سے چھوٹ دور جا پڑی۔ شیر ابھی پنجے مارنے اور اٹھا لے جانے کی کوشش میں تھا کہ گونڈ لڑکے نے بندوق اٹھا کر کندا اس کے سر پر مارا جس کی وجہ سے شیر مسٹر جارج کو چھوڑ کر ہٹ گیا۔ گونڈ اس کو دھمکا کر اور کندا دکھاتے ہوئے پھر آگے بڑھا۔ شیر اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد لڑکے نے مسٹر جارج کو کاندھے پر ڈال لیا۔ اور کچھ پتھر ہاتھ میں لئے بندوق بھی سنبھالے رہا۔ شیر پیچھے سے حملہ کرنا چاہتا تھا اور برابر غرا غرا کر دھمکی دیتا تھا۔ مگر لڑکا پتھر پھینکتا کبھی بندوق تانتا اور شکاری صاحب کو لئے گھر کی طرف چلتا گیا۔ تقریباً ایک میل شیر نے اسی طرح دھمکاتے ہوئے پیچھا کیا۔ اور جھپٹنے کا متلاشی رہا مگر گونڈ نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ اور صاحب کو گھر لا کر پہنچا دیا۔ اس بہادری کے صلہ میں گونڈ کو میڈل انعام اور زمینات اور بیل عطا ہوئے۔ اس واقعہ سے آدم خوار بڑے شیر کی پست ہمتی اور طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ دو ہی آدمی تھے اور ان میں ایک بالکل زخمی اور بے سہارا ہو چکا تھا۔ مگر باوجود اس کے شیر نے مکرر پکڑنے کی جرأت نہ کی۔

مسٹر ولماٹ لکھتے ہیں ایک آدم خوار شیرنی جو اس وقت تک (۷۰) آدمی کو کھا چکی تھی۔ ایک شخص پر کودی جب کہ وہ اور اس کی بیوی جنگل میں گھاس کاٹ رہے تھے۔ عورت شیرنی پر درانتی لے کر ٹوٹ پڑی۔ اور مار مار کر اس کو بھگا دیا۔ بعد میں یہ شیرنی ایک اور آدمی کو لے گئی اور ۸ فیٹ اونچی ایک عمودی چٹان پر لے کر چھلانگ گئی۔ کئی دن بعد ایک منظم کوشش سے ہلاک کی گئی۔ یہ جوان شیرنی تقریباً ۸ فیٹ لمبی تھی۔ اس کے سیدھے گھٹنے میں مار کا نشان تھا جس سے پیر کا ماکھ خاص قسم کا پڑتا تھا۔

بیمار اور ضعیف شیروں کے بعض غیر معمولی واقعات دیکھنے میں آئے ہیں۔ مسٹر ویمیش نے لکھا ہے کہ ۱۹ / جولائی ۱۹۲۸ء کو ضلع کرنول کے ایک ڈاک بنگلہ میں رات کو شیر آ کر کمرہ میں بیٹھ گیا۔ حالانکہ آدمی ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ اور کمرہ میں بھی آجا رہے تھے۔ ایک صاحب کچھ لکھنے کے لئے میز کے نیچے پاؤں رکھ کر کرسی پر بیٹھے تو ان کو محسوس ہوا کہ...

باقی صفحہ (۵۰) پر

مرتضیٰ علی خاں ناظر

سراغ رسانی اور تفتیش

کے

دیول گھڑیال کاروان دو پجاریوں کا قتل

کاروان میں محلہ بی پورہ میں ایک دیول گھڑیال کے نام سے مشہور ہے۔ دیول کے اطراف ایک احاطہ بنا ہوا ہے۔ اور اس میں ایک گیٹ دروازہ لگا ہوا ہے۔ پولیس مقامی کو ۸ رتیر ۱۳۴۳ف م ۱۳ رمئی ۱۹۳۴ء اطلاع دی جاتی ہے کہ احاطہ دیول کا دروازہ چند روز سے بند ہے۔ اور بدبو پھوٹ پڑی ہے۔ عہدہ داران پولیس دروازہ کھلوا کر احاطہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ دیول کے اندر ایک عورت کی نعش تخت پر پڑی ہے۔ وہ سڑ چکی ہے۔ ضربات جسم پر موجود ہیں۔ اس کا گلا کاٹ کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ دیول کے دالان میں ایک اور جس پر ضربات تھے پائی گئی۔ وہ بھی کٹی ہوئی ہے۔ عورت کی نعش تو سندرا بائی اس دیول کی پجارن کی نعش تھی۔ اور دوسری نعش اس کے بھائی دسو آنکی تھی۔ نواب رحمت یار جنگ بہادر کوتوال کو بھی اطلاع ہوتی ہے۔ محلہ میں بھی خبر پھیل جاتی ہے۔ عوام جمع ہوتے ہیں۔ نواب صاحب اور دیگر اعلیٰ عہدیداران مقام کا معائنہ کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ عام طور پر ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے! محلہ کے معززین یا لیڈروں میں سے چند اپنے کو پیش پیش رکھتے ہوئے پولیس کو معائنہ موقعہ میں مدد بھی دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کسی چور کا یہ کام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دیول کے پیچھے سے مرتکب جرم آئے ہوں گے۔ اور وہ بعض نشانات کی طرف اور علامات کی طرف پولیس والوں کی توجہ منعطف بھی کراتے ہیں کہ کوتوال صاحب بہادر کی طلبی پر والد صاحب قبلہ بھی مقام واقعہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ جو ان دنوں خفیہ پولیس بلدہ میں کارگزار تھے۔ وہ بھی معائنہ موقع میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور مقام پر موجود اشیاء و علامات کے معائنہ کے ساتھ ساتھ وہ نہ صرف اطراف و اکناف میں ہی نظر دوڑاتے ہیں بلکہ وہاں جو بھی حضرات موجود تھے اور وہ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے رائے دے رہے تھے ان کو بھی سنتے رہتے ہیں اور ان کی رائے کی وجوہ اور

دلائل کو بھی بغور سنتے ہیں۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اعلیٰ عہدیداران پولیس بھی عوام کی رائے سے متفق تھے۔ کوتوال صاحب کی دریافت پر والد صاحب نے کہا کہ وہ کسی قطعی رائے پر ابھی نہیں پہونچے ہیں۔ اور بعد دریافت کے کہہ سکیں گے۔ لیکن حالات جہاں کو نظر آئے ان کی بناء پر ان کا خیال ہے کہ اس قتل کے مرتکبین کوئی اجنبی تھے ایسے افراد تھے جو نہیں جو سندرا بائی یا وسوا ان واقف نہ تھے۔ وہ مقامی لوگوں کے اس خیال سے بھی متفق تھے کہ قاتل باہر سے پیچھے کی جانب سے رات میں پجاریوں کے سو جانے کے بعد داخل ہوئے ہوں گے۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ قاتل پجاریوں کے جان کار اور ان کی اجازت سے دیول میں سو گئے ہوں گے۔ رات میں قتل کرکے اندر سے کمپونڈ کا دروازہ بند کرکے وہ دیوار پھاند کر شاید باہر گئے ہوں گے۔ والد صاحب کوتوال صاحب سے گفتگو کر رہے تھے تو انہوں نے محسوس کیا کہ مقامی عوام میں سے پیش پیش جو تھے ان میں ایک اب کترانے لگا ہے اور مجمع میں گھل مل جانے کی ترکیبیں کر رہا ہے۔ والد صاحب اس پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے اور اپنے کسی ماتحت سے آہستہ سے کہہ بھی دیا کہ دیول کے کمپونڈ کا دروازہ بند کردے۔

وہ نواب صاحب کو دیول کے سامنے کے حصہ میں دیول سے چند قدم پر لے گئے جہاں ایک سایہ دار درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے باریک ریت میں تین چار فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا نشان تھا۔ وہ بوریہ یا شطرنجی کو زمین پر بچھانے کے بعد جب اس کو اٹھا لیا جائے تو جو نشان پڑ سکتا ہے اس سے مماثل تھا۔ والد صاحب قبلہ نے کہا کہ انہوں نے اس نشان کی بناء پر ایسا قیاس قائم کیا ہے۔ یہ نشان بستر بچھانے کا ہے۔ اگر ان پجاریوں کے سونے کے بعد کوئی دیول میں جرم کے ارتکاب کے لئے داخل ہوا تھا تو اسے بستر بچھانے اور سونے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو آتا اپنا کام یعنی جرم کرتا اور چلا جاتا۔ جب کوئی شخص یہاں سویا تو اس سے پجاری ضرور واقف تھے۔ اور پجاریوں سے کہہ کر یا ان سے اجازت لے کر ہی سویا ہوگا۔ اگر یہ قیاس کرلیا جائے کہ کوئی قتل ہو جانے کے بعد آکر سو گیا ہوگا۔ یہ تو فطرت انسانی کے خلاف ہے کہ کوئی شخص یہاں آئے اور دو لاشوں کو دیکھنے کے باوجود بھی یہاں سو جائے۔ اور کئی دن بعد بدبو کی وجہ سے تو وہاں کوئی سو ہی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے دیول کی پھاٹک کے بازو پر اُن دیوار کی اینٹوں پر پیر کے نشانات بھی بتائے اور کہا کہ شاید مرتکب دروازہ بند کرکے دیوار پھاند کر نکلا ہے۔ جب ہی تو یہ نشانات آئے۔ ورنہ ان نشانوں کے پڑنے کی کوئی اور وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ نشانوں کی توضیحوں کی بناء پر انہوں نے کہا کہ ویسے نشان چڑھا ئی

ے وقت پڑ سکتے ہیں، اُترتے وقت کے وہ نشان نہیں"۔

اسی اثنا میں انہوں نے مقامی لیڈر صاحب کے چہرہ بشرہ سے اندازہ کرلیا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ کوتوال صاحب سے انہوں نے یہ بھی عرض کردیا کہ انہوں نے مقام واقعہ پر بہت کچھ پالیا ہے۔ اور وہ اس مجمع کو باہر جانے دینے سے پہلے جانچ کرلینا ضروری خیال کررہے ہیں اور اس کے بعد ہی وہ مقامی عہدیداروں کو چند ہدایات دے کر ہیڈ کوارٹر واپس آئیں گے۔ چنانچہ ٹو گراف سرکاری جو وہاں موجود تھا اس کو فوٹو لینے کی اور نشاناتِ انگشت کے ماہر کو دیول ں مورتیوں پر موجود نشاناتِ وغیرہ محفوظ کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ دیول کی مورتیاں تتر بتر ی تھیں۔ ان کے اوپر جو کپڑے اور دیگر سامان وغیرہ تھے وہ بھی منتشر حالت میں تھے۔ ر ان کی ظاہری حالت سے عیاں تھا کہ کسی شخص نے ان کو خوب ٹٹول کر دیکھا ہے۔ کپڑے دی ایں پھاڑے گئے تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ سارق نے ان مورتیوں کی ظاہری چمک ں کو اور سائز کو دیکھ کر ان کو سونے چاندی کا ہونا تصور کرکے حصولِ مال کے لئے شاید قتل کئے ہوں اور بعد میں مورتی کے اندرونی حصوں کو دیکھنے پر کر وہ پیتل یا کسی اور دھات ہیں اسے مایوسی ہوئی ہو۔

عوام میں پیش پیش تین چار لیڈروں کو انہوں نے سوالات کرنے روک لیا۔ دورانِ معائنہ تو انہوں نے جو کچھ بھی کہا تھا والد صاحب ان کو سنتے رہے تھے۔ اور ان سے ان کی ئے کے وجوہ اس وقت دریافت نہیں کئے تھے۔ اب ایک ایک سے ان کے خیالات کی بنیاد ر وجہ دریافت کرنے لگے۔ ان میں سے تین نے تو اپنی رائے کے وجوہات ظاہر کئے۔ اور تھا شخص دھنوسنگھ لاجواب تھا۔ وہ کہتا رہا کہ اس نے چپ ہی کہہ دیا تھا۔ یہ وہی شخص ا جس کی کوشش یہ تھا کہ وہ پولیس کو باور کرائے کہ قاتل پیچھے کی جانب سے آکر قتل کے ملب ہوئے ہیں۔ دراصل یہ پولیس کو مغالطہ دینے کی کوشش کررہا تھا کہ والد صاحب نے ں کا اتا پتہ دریافت کیا تو اس نے چھپانے کی کوشش کی اور وہاں دیگر اشخاص جو موجود ' ان سے والد صاحب کو معلوم ہوگیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ گولکنڈہ انفنٹری میں زم ہے اور اس کا مکان دیول کے قریب ہی ہے۔ انہوں نے اسے روک لیا۔ اور اس سے شتبہ ہوگئے کہ اسے جھوٹ بولنے اور خود کے مکان تک کا غلط پتہ دینے کی کوئی وجہ ہی نہ ۔ اس کی جامہ تلاشی میں گداختہ (METTED) سونا نکلا جو اس کی حیثیت سے زائد تھا۔ یہ جب اس کے مکان کی تلاشی لی گئی تو اس کے مکان سے شسندرا بائی کا مسروقہ زیور جو دا

ہمیشہ جسم پر پہنے رہا کرتی تھی، برآمد ہوگیا۔ اب تو اس کو بھی اقبال کرنا ہی پڑا اور اس نے بتایا کہ اس نے خیال کر لیا تھا کہ مورتیاں سونے کی ہیں۔ اس نے مورتی سرقہ کرنے کی دل میں ٹھان لی۔ لیکن سندرا بائی اور اس کا بھائی دیول میں ہر وقت رہتے تھے تو اس نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا اور ایک رات وہ اس کا ساتھی رام پرشاد عرف پرکاش سنگھ دیول میں گئے اور سندرا بائی اور اس کے بھائی سے انہوں نے کہا کہ ان کے گھر میں کھٹمل (BUGS) بہت ہو گئے ہیں۔ رات بھر سونے نہیں دیتے۔ اگر وہ اجازت دیں تو وہ وہاں سو جاتے ہیں۔ جب انہوں نے اجازت دے دی تو وہ بازار سے سینڈھی لائے۔ خود بھی پیئے اور ان کو بھی پلائی۔ جب وہ مدہوش ہو کر سو گئے اور رات کافی چلی گئی تو پہلے موقعہ پا کر ان دونوں نے وسواس کا گلا کاٹ دیا۔ پھر سندرا بائی کو مجروح کر کے اس کا بھی گلا کاٹ دیا۔ اس کے بعد اس نے دیول کی مورتیوں کا سرقہ کرنا چاہا۔ لیکن انھیں پیتل کی پا کر وہیں چھوڑ دیا۔ اور سندرا بائی کے جسمی زیورات کا سرقہ کر لیا۔ اور پرکاش سنگھ (رام پرشاد) کے ذریعہ اس نے خود کے بستر گھر روانہ کر دیئے۔ خود دیول کی پھاٹک اندر سے بند کر کے دیوار پر سے باہر آیا۔ اور ایک آدھ دن بعد اس خیال سے کہ کسی کو شبہ نہ ہو اور قتل کا پتہ نہ چلے، اس نے دیول کے دروازہ کو باہر سے قفل بھی ڈال دیا — بعد تکمیل تفتیش ملزمین چالان کیے گئے۔ ہائی کورٹ کے اجلاس ابتدائی سے ان کے لئے قصاص کی سزا تجویز ہوئی۔ لیکن متفقہ اجلاس سے حبس دوام کی سزا ہوئی اور والد صاحب قبلہ کو انعام عطا کیا گیا۔

(ملاحظہ ہو مثل مقدمہ سرکار عالی ذریعہ صدراس بنام دھنو سنگھ و پرکاش سنگھ (رام پرشاد) جرائم کاروان نشان (۴۹) صدر محکمہ بابتہ سنہ ۱۳۴۲ ف بمطابق سنہ ۱۹۳۱ء)

... بقیہ شیر اور شکاری صفحہ (۴۶) سے

... کسی جانور سے ان کے پاؤں ٹکرائے۔ دیکھا تو شیر تھا۔ وہاں سے اٹھ کر یہ بھاگے اور لوگوں سے کہا کہ میز کے نیچے شیر بیٹھا ہے۔ کسی نے یقین نہیں کیا۔ مگر چونکہ بیان کرنے والے ایک معزز عہدہ دار تھے۔ احتراماً بندوق لے کر ادھر چلے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شیر اطمینان سے میز کے نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ مقابل سے مارنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ مگر ایک صاحب نے بڑی پھرتی سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ مارنے میں بڑی دقت لاحق ہوئی۔ دیوار میں سوراخ کیا گیا مگر نشانہ صحیح نہ مل سکا۔ پھر چھت میں سوراخ کیا گیا۔ اور ٹارچ ڈال کر بندوق چلائی گئی۔ دو تین فائر میں شیر مرا۔ یہ ۸ فیٹ ۲ انچ لمبی بیمار شیرنی تھی۔ جو بالکل دبلی ہو گئی تھی۔ پیٹ میں ایک گولی کا زخم بھی تھا۔ جس میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ ایک پاؤں کے پنجہ پر بھی زخم تھا ... (جاری ہے)

مصنف : ایبن بالوف
مترجم : قاضی جلیل احمد

صلیب کے سائے میں

قسط (۶)

دوسری طرف انطاکیہ کی دیواروں کے پیچھے جنگ نے دوسرا روپ اختیار کیا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ انطاکیہ والوں نے قلعے سے نکل دشمن پر شدید حملہ کرکے دشمن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ جنگ شدت سے جاری تھی اور یاغی سیان کے سپاہی بہترین مہارت اور دلاوری کا ثبوت دے رہے تھے۔ دوپہر سے کچھ پہلے انہوں نے فرنگی کیمپ میں داخل ہونا شروع کردیا کہ اتنے میں علی پو کی فوج کی تباہ کن شکست کی خبر پہنچی۔ غم زدہ امیر انطاکیہ نے ناچار اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ اور ابھی ترک فوج بمشکل قلعے کی دیواروں کے پیچھے پہنچی تھی کہ فتح مند فرنگی سپاہی مالِ غنیمت سے لدے پھندے کیمپ میں واپس پہنچنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں اہلِ انطاکیہ نے محاصرین کے قہقہوں اور معنی خیز سیٹیوں کی آوازیں سنیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے قلعہ انطاکیہ میں فرنگی منجنیقوں سے رضوان کی فوج کے کٹے ہوئے سروں کی بارش برسنے لگی۔ ان برستے ہوئے سروں نے اہلِ قلعہ کے دل میں آنے والی گھڑی کی دہشت بٹھادی۔

یاغی سیان نے اپنے گردو پیش لوگوں کی ہمت بڑھانے کی کوشش کی جب کہ خود اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اور اس کی ساری امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ اُن دو پاگل بھائیوں کے خاتمہ کے بعد اب صرف والی موصل قربوقا ہی بچ رہا تھا جس سے مدد کی امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن موصل انطاکیہ سے دو ہفتوں کی منزل پر تھا۔

موصل، مشہور مورخ ابن الاثیر کا مولد، عراق یا اس زمانے کے لحاظ سے جزیرہ کا صدر مقام تھا۔ یہ دجلہ اور فرات کا دوآبہ تھا۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے اس شہر کو

۶۔ کولیسٹن روڈ۔ فاریسٹ گیٹ۔ لندن ای/۷ (یو۔کے)

بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اہل عرب اس کے رسیلے پھلوں انگور، ناشپاتی اور کھجوروں پر فخر کرتے تھے۔ وہاں کا بنا ہوا کپڑا جس کا نام اُسی شہر کے نام پر مسلن تھا دساور کو جاتا تھا۔ اور ساری دنیا میں مشہور تھا۔ اناطولیہ میں فرنگیوں کی آمد کے وقت یہ شہر ایک اور قدرتی ذریعے سے بھی استفادہ کرنے لگا تھا جس کا مشہور سیاح ابن جبیر بڑے تعجب سے ذکر کرتا ہے۔ یہ روغن نفت کے ذخائر تھے۔ یہ قیمتی سیاہ مائع جو اس ملک کی قسمت بننے والا تھا، دیکھنے والوں کے لئے بڑا ہی حیران کن تھا۔ ابن جبیر ان الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے:

"ہم ایک بستی میں پہنچے جس کا نام ال خیّارہ تھا۔ جو دجلہ کے قریب واقع ہے۔ موصل کو جانے والی سڑک کے داہنی طرف ایک نشیب ہے۔ جہاں خدا نے اپنی حکمت کاملہ سے وہ شئے بنائی ہے جو ایک عالم کو حیران کرتی ہے۔ اور جو زمین سے پچکاری کی صورت میں باہر آتی ہے۔ کبھی کبھی اس میں سے ٹھوس ٹکڑے بھی نکلتے ہیں جو کھولتے ہوئے پانی کی طرح گرم ہوتے ہیں۔ جیسے کسی نے انہیں ابال کر باہر نکالا ہو۔ لوگوں نے بڑے بڑے گڑھا و تیار کئے ہیں تاکہ اُن میں اس PITCH کو جمع کیا جا سکے۔ ان ذخائر کے قریب ہی ایک سیال چشمہ ہے جس کی سطح پر ایک ہلکا سیاہ جھاگ تیرتا رہتا ہے۔ جو دریا کنارے پانی سے ٹھنڈا ہو کر کولتار BITUMAN میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بہت چکٹ اور چمک دار چکنی مٹی جیسی شئے بن جاتی ہے جس میں سے ایک تیز چبھتی ہوئی بُو نکلتی ہے۔ اس طرح ہم نے اس نادر شئے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کے متعلق ہم صرف سنتے آئے تھے۔ یہاں سے قریب ہی دریائے دجلہ کے کنارے ایک اور کان ہے جہاں سے دھواں سا اٹھتا رہتا ہے۔ ہمیں بتایا کہ جب لوگ BITUMAN کولتار حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس میں آگ لگا دیتے ہیں۔ آگ کے شعلے اس سیال مادے کو جلا کر بھسم کر دیتے ہیں اور جو چیز بچ رہتی ہے اُسے کاٹ کر گاڑیوں کے ذریعہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل کیا جاتا ہے۔ خدا میں بڑی قدرت ہے وہ جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔"

باشندگانِ موصل کا خیال تھا کہ اس سیاہ سیال میں صحت کے لئے بہت سے مفید اجزا موجود ہیں۔ اور جب کبھی وہ بیمار ہوتے تو اپنے جسم پر یہ سیال لیپ لگا لیتے تھے۔ اس کولتار سے سمنٹ کے طور پر اینٹوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کا کام لیا جاتا تھا اور چونکہ کولتار میں سے رِس کر کوئی مائع باہر نہیں جا سکتا اس لئے اُسے حمام کی دیواروں کو بھی لیپ دیا جاتا تھا۔ لیکن جلد ہی اس سیال یا تیل کا استعمال جنگی اغراض کیلئے بکثرت کیا جانے لگا تھا

ان قدرتی ذرائع کے علاوہ بھی موصل کی بڑی اہمیت تھی ۔ والیانِ موصل کو ملک شام کی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا قانونی اختیار حاصل تھا اور والیٔ موصل، قربوقا اس حق کو ضرور استعمال کرنا چاہتا تھا ۔ لہذا جب یاغی سیان کے پاس سے مدد کی درخواست پہنچی تو قربوقا کی دلی مراد بر آئی کہ اس طرح سے اُسے اپنے اثرات کو آگے بڑھانے کا موقع ہاتھ آیا ۔

وہ بھی ایک ترک غلام تھا ۔ لیکن مشرقِ وسطیٰ میں غلامی باعثِ تذلیل و تحقیر باقی نہیں رہ گئی تھی ۔ کیوں کہ فوج کے اکثر سردار اور والیانِ ملک سابق میں غلام ہی رہ چکے تھے ۔ جو ممالک پر حکمراں تھے ۔ اور اُن کا اقتدار اتنا وسیع تھا کہ اس طوقِ غلامی کو چھپانا چنداں ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ فرنگی حملے کے وقت سارے مشرقِ وسطیٰ پر انہی غلاموں کی حکومت تھی ۔

ان میں سب سے زیادہ طاقت ور سلطان قربوقا تھا جس کا لقب آتابک تھا یعنی " شہزادے کا باپ "۔ سلجوقیوں کے دور میں شاہی خاندانوں میں اموات کا تناسب بہت زیادہ تھا ۔ کچھ تو خانہ جنگیوں کی بدولت اور کچھ سازشوں اور قاتلانہ حملوں کی وجہ سے ۔ ان مقتول امیروں اور سلطانوں کے ورثاء اکثر نابالغ لڑکے ہوا کرتے تھے ۔ ان وارثوں کی تعلیم اور تربیت کیلئے اتالیق مقرر کئے جاتے جو رفتہ رفتہ اتنا اقتدار حاصل کر لیتے کہ بعد میں مقتول کی بیوہ سے شادی کرکے اس کے نابالغ لڑکے کے باپ بن جاتے ۔ اسی طرح آتابک کا لقب وجود میں آیا ۔ اصلی اقتدار ان ہی اتابکوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو یہ اپنے بعد اپنے بچوں کے نام منتقل کرتے تھے ۔ اور اصلی وارث ان کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی بن کر رہ جاتا تھا ۔ بلکہ بعض صورتوں میں محض ایک یرغمال ۔ البتہ ظاہری رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جاتا تھا ۔ اور ان ہی نابالغ بچوں سے بڑے بڑے فرامین حاصل کئے جاتے تھے ۔

ایسا ہی ایک نظارہ اپریل ۱۰۹۸ء میں دیکھنے میں آیا ۔ ایک نابالغ سلجوقی شہزادے نے فرنگی کافروں سے جنگ کرنے کے لئے چالیس ہزار فوجوں کی سرداری آتابک قربوقا کے سپرد کی اور اُسے اس مہم پر روانہ ہونے کی اجازت دی ۔ ابن الاثیر جس کی ساری عمر ان ہی اتابکوں کی خدمت میں گذری لکھتا ہے کہ جب اہلِ فرنگ کو پتہ چلا کہ اُن کی سرکوبی کے لئے سلطان نے آتابک قربوقا کو روانہ کیا ہے تو ان میں سراسیمگی پھیل گئی ۔ کیوں کہ رسدات کی قلت کی وجہ سے ان کی طاقت بہت کمزور ہو گئی تھی ۔ اور دوسری طرف مدافعین کی بڑی ڈھارس بندھی ۔ اور انہوں نے پھر سے قربوقا کے حملے کے ساتھ خود بھی حملہ کرنے کا پروگرام بنایا ۔ یاغی سیان اب بھی اسی تندہی کے ساتھ

اپنی رسدات کی حفاظت اور تقسیم کا انتظام کر رہا تھا ۔ اور اپنی فوجوں کو ہمت اور دلاسہ دے رہا تھا کہ قربوقا کی آمد کے ساتھ ہی یہ محاصرہ ختم ہو جائے گا ۔

لیکن اس کی یہ ظاہری دلیری محض نمائشی تھی ۔ کیوں کہ کئی ہفتوں سے حالات دگرگوں ہونے لگے تھے ۔ شہر کی ناکہ بندی سخت ہو گئی تھی ۔ رسدات کا حاصل کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا ۔ اور غنیم کے کیمپ سے اطلاعات کے حصول میں کمی ہوتی جا رہی تھی ۔ اہل فرنگ نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کے ہر عمل کی قلعہ والوں کو قبل از قبل اطلاع مل جاتی ہے تو انہوں نے اس کے خلاف سخت کارروائی کی ٹھانی ۔ انہوں نے ایک مخبر کو پکڑ کر اس کے ٹکڑے کئے اور پھر آگ میں بھون بھون کر اس کا گوشت کھایا ۔ اور پھر اعلان کیا کہ آئندہ جو بھی مخبری کرتے پکڑا جائے گا اس کا یہی انجام ہوگا ۔ امیر کے مخبروں کے حواس جاتے رہے ۔ اور انہوں نے کیمپ سے راہِ فرار اختیار کی ۔

اب اس کی امید صرف قربوقا کی آمد سے وابستہ تھی اور توقع تھی کہ وہ وسطِ ماہ مئی میں انطاکیہ پہنچ جائے گا ۔ جہاں ہر شخص بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا ۔ لیکن قربوقا کی فوجوں کا کہیں پتہ نہ تھا ۔

قربوقا کی فوج بڑے طمطراق کے ساتھ موصل سے روانہ ہوئی ۔ سفید یونیفارم میں ملبوس سوار ہاتھ میں چمکدار نیزے اٹھائے جو سورج کی روشنی میں جگ مگ کر رہے تھے ۔ ہاتھوں میں سیاہ پرچم جو عباسی اور سلجوقی اقتدار کے نشان تھے ۔ تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے اگر اسی رفتار سے فوج آگے بڑھتی رہتی تو دو ہفتوں کے اندر اندر انطاکیہ پہنچ سکتی تھی ۔ لیکن قربوقا کو ایک اور پریشانی لاحق تھی ۔ نکلنے سے کچھ ہی پہلے اُسے اطلاع ملی تھی کہ فرنگیوں کے ایک دستے نے اڈلیسہ EDESSA جس کو عرب الرہا کہتے ہیں قبضہ کر لیا ۔ یہ آرمنی شہر موصل اور انطاکیہ کی شاہراہ کے شمال میں واقع تھا ۔ قربوقا کو ڈر تھا کہ اگر وہ انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا تو بہت ممکن تھا وہ لوگ پیچھے سے حملہ کر دیتے ۔ اس لئے اس نے اپنے سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ وہ پہلے اڈلیسہ کا قضیہ پاک کرنا چاہتا ہے ۔ اس کے بعد انطاکیہ کی طرف توجہ دے گا ۔ بعض سرداروں نے اس کی توجہ یاغی سیان کی خستہ حالت کی طرف دلائی لیکن قربوقا نے انہیں خاموش کر دیا ۔ جب وہ کوئی فیصلہ کرلیتا تو پھر ایک خچر کی طرح اس پہ اڑ جاتا تھا ۔ چنانچہ اس کی فوج اب انطاکیہ کے بجائے اڈلیسہ کی طرف بڑھنے لگی ۔

اس ارمنی شہر اڈلیسہ کے حالات واقعی تشویشناک تھے ۔ وہ چند مسلمان جو وہاں سے بھاگ کر

اپنی جان بچا لائے تھے وہ وہاں کے عجیب و غریب حالات بیان کرتے تھے۔ فروری کے مہینے میں ایک فرنگی سردار جس کا نام بالڈون تھا کئی سو نائٹوں اور دو ہزار پیادہ فوج کے ساتھ اڈلیسہ میں وارد ہوا۔ ارمنی سردار تھوروس THOROS نے بالڈون سے خواہش کی کہ وہ ترکوں کے خلاف شہر کو محفوظ کرنے میں اس کی مدد کرے۔ لیکن بالڈون نے محض بھاڑے کا ٹٹو بننے سے انکار کر دیا۔ اور تھوروس کو مجبور کیا کہ وہ بالڈون کو اپنا جانشین قبول کرے اور اس قبولیت کا باضابطہ اعلان بھی کرے۔ تھوروس جو کہ خود بھی لاولد تھا اس کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اور اس لئے باضابطہ تبنیت کی رسم انجام دی گئی۔ تھوروس محض ایک ڈھیلی ڈھالی قبا پہن کر دربار میں آیا۔ اور بالڈون جو خود بھی کمر تک ننگا تھا۔ اس قبا میں جا کر اپنے منہ بولے باپ سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر یہی عمل تھوروس کی بیوی اور بالڈون کے درمیان بھی عمل میں لایا گیا۔ اور لوگ تعجب سے دیکھنے لگے کہ تبنیت کی یہ رسم جو شیر خوار بچوں کے لئے وضع کی گئی تھی کیونکر ایک ہٹے کٹے عمر رسیدہ نائٹ کے لئے جائز ہو سکتی ہے؟

مسلم فوج کے لوگوں نے جب یہ واقعہ سنا تو خوب ہنسے۔ لیکن اس رسم کا چند روز بعد نتیجہ برآمد ہوا۔ اُس سے اُن کا خون منجمد ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک مشتعل مجمع نے بالڈون کی شہ پر ان منہ بولے ماں باپ کی تکا بوٹی کر دی اور اس طرح بالڈون بلا شرکت غیرے اڈلیسہ کا حاکم بن گیا۔ اور اس نے سلطنت کے تمام عہدوں پر فرنگیوں کو مامور کیا۔

اپنے اندیشوں کو یوں حقیقت میں تبدیل ہوتا دیکھ کر قربوقا نے اڈلیسہ کا محاصرہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس کے سرداروں نے اُسے پھر باز رکھنے کی کوشش کی کہ اڈلیسہ کے مٹھی بھر فرنگی کسی بھی طرح مسلم فوج پر حملہ کرنے کی جراءت نہیں کر سکیں گے۔ دوسری طرف ان کی تعداد اتنی ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک شہر کی مدافعت کر سکتے ہیں۔ اور یہ محاصرہ مہینوں چل سکتا ہے۔ اور شاید یاغی سیان اس طویل انتظار کی تاب نہ لا کر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ لیکن اتابک نے کسی کی ایک نہ چلنے دی اور محاصرہ کیے پڑا رہا۔ اور جب محاصرہ کو دو ہفتے گزر گئے تب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور اس نے اڈلیسہ کا محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا۔

اُدھر انطاکیہ میں لوگوں کی امیدیں یاس میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آخر موصل کی فوج کو یہاں پہنچنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ یاغی سیان مایوس ہو چکا تھا۔

۲؍جون کو اچانک یہ خبر اُڑی کہ فرنگی فوجیں محاصرہ اٹھا کر شمال مشرق کی طرف کوچ کر رہی ہیں۔ سب نے یہی نتیجہ نکالا کہ شاید قربوقا کی فوج آ پہنچی۔ اور فرنگی اس سے لڑنے کے لئے اکٹھے

ہوسکے تھے۔ شہر میں نئے سرے سے زندگی کے آثار پیدا ہوئے کہ دوپہر تک اتابک شہر کو فرنگیوں سے نجات دلائے گا۔ لوگ سارا دن انتظار کرتے رہے۔ رات ہوئی لیکن ان کی امیدوں کے افق پر اب بھی اجالا تھا۔

صبح چار بجے جب ان کی آنکھ کھلی تو شہر کے جنوبی حصے سے کسی رستے کے پتھر کی دیوار پر سرسراہٹ کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک پنج گوشہ برج کے اوپر ایک شخص کا ہیولا دکھائی دیا جو اوپر سے نیچے کو کچھ اشارے کر رہا تھا۔ وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ اس کی داڑھی بکھری ہوئی تھی۔ اس کا نام فیروز تھا۔ وہ ایک زرہ ساز تھا جس کے ذمہ اس برجی کی حفاظت تھی۔ یہ ارمنی نژاد مسلمان فیروز عرصہ دراز سے یاغی سیان کے عملے میں شامل تھا۔ لیکن اب اس کے خلاف بلیک مارکٹ کا الزام عائد کیا گیا تھا اور یاغی سیان نے اس پر بھاری جرمانہ عاید کیا تھا۔ بدلہ لینے کے لئے فیروز نے فرنگ سے ساز باز شروع کی۔ اس نے فرنگیوں کو بتایا کہ شہر کے جنوب کی طرف برج میں ایک کھڑکی ہے جو اس کے تحویل میں ہے۔ اس کھڑکی سے وہ انھیں قلعہ کے اندر آنے میں مدد کرسکتا ہے۔ اپنی بات کا یقین دلانے کے لئے اس نے اپنے لڑکے کو بطور یرغمال ان کے پاس بھجوادیا۔ اس کے جواب میں محاصرہ کنندوں نے اسے خوب سونا جواہرات اور زمین دینے کا وعدہ کیا۔ اور اس طرح یہ سازش مکمل ہوگئی۔ اس سازش پر ۳ ر جون کو عمل ہونا تھا۔ اور اسی وجہ سے مدافعین کو غافل کرنے کے لئے فرنگیوں نے ۲ ر جون کو محاصرہ اٹھالینے کی چال چلی۔ ابن الاثیر اس حملے کی تفصیل لکھتے ہوئے کہتا ہے:

"جب سازشی عہدنامہ فیروز اور فرنگیوں کے درمیان طے پاگیا تو وہ اس کھڑکی کے راستے قلعہ میں داخل ہوگئے۔ پھر اور بھی لوگوں کو رسوں کی مدد سے قلعہ پر چڑھایا گیا۔ جب پانسو سے زیادہ لوگ قلعہ کی فصیل پر چڑھ آئے تو تب انھوں نے صبح کا بگل بجایا جب کہ مدافعین ابھی نیند ہی میں تھے۔ یاغی سیان نے نیند سے بیدار ہوکر دریافت کیا کہ یہ کیسا شور ہے؟ اس سے کہا گیا کہ بگل کی آواز CITADEL (قلعہ) سے آرہی ہے۔ شاید اس پر فرنگیوں کا قبضہ ہوچکا ہے!!"

حالانکہ آواز دوسری دو برجیوں سے آرہی تھی۔ لیکن یاغی سیان نے سمجھا کہ سب کچھ ختم ہوچکا ہے۔ اس نے شہر کا ایک دروازہ کھلوایا۔ اور گھوڑے پر سوار ہوکر چند سو کے ایک محافظی دستے کے ہمراہ راہ فرار اختیار کی۔ گھنٹوں وہ اپنے مرکب کو سرپٹ دوڑاتا رہا۔ نیم جاں افتاں و خیزاں یہاں تک کہ تھک کر وہ ایک جگہ گر پڑا۔ ابن الاثیر اس کی موت کی تفصیل یوں لکھتا ہے:

باقی آئندہ پر

محمد فخر الاسلام صدیقی

خاندان برامکہ کی فیاضیاں

مشرقی ممالک میں یوں تو بہت سی سلطنتیں قائم ہوکر اپنے کارناموں کی یاد چھوڑ کر فنا ہو گئیں۔ ان میں خلافت عباسیہ کی تاریخ بڑی شاندار ہے۔ علوم و فنون کی قدر دانی اور دنیاوی امور میں ہر طرح کی ترقی و عروج کے لئے مشہور اور اپنی آپ مثال ہے لیکن اس سلطنت کے عروج و ترقی میں چار چاند لگانے والا مشہور و معروف برامکہ کا خاندان ہے۔ جن کے تذکرے کے بغیر سلطنت عباسیہ کا تذکرہ نامکمل نظر آتا ہے۔ آج ہم اس خاندان کی بے مثال فیاضی کا تذکرہ کریں گے۔

خاندان برامکہ کے اوصاف حمیدہ میں ان کی فیاضی اور سخاوت کی مثال تاریخ میں کسی دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ یحییٰ برمکی دنیا کے ممتاز اور مشہور اہل کمال گذرے ہیں۔ فصاحت و بلاغت، برجستہ گوئی، آداب محفل، فنون جنگ سے واقفیت اور مہارت۔ اہل علم کی قدر دانی اور غربا پروری ان میں عام تھی۔ اس خاندان کے لوگ صائب الرائے، بردبار، عالی حوصلہ، خوش اخلاق اور شجاع تو تھے ہی لیکن ان کی سخاوت کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی۔

خلافت عباسیہ کا مشہور شاعر ابو نواس کیا خوب لکھتا ہے:

ترجمہ: "برامکہ وہ ہیں جنھوں نے بادشاہوں کے صفات کو

مکان نمبر ۳۹۳/۵ آغا پورہ، حیدرآباد۔

اپنایا اور لوگوں کو سکھایا، جس پودے کو لگایا اس کی
نگہداشت و پرداخت کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ جب
عمارت بناتے تو اس کے استحکام کا خیال رکھتے۔ جب
لوگوں کی بھلائی کا کام کرتے تو اس کو بقائے دوام کا لباس پہناتے"۔

اس خاندان نے اپنے مداحوں کو نوازا۔ شاعروں اور عالموں کی سرپرستی کی۔ صالحین کی پوشیدہ طور پر خدمت کی۔ حکیموں، طبیبوں اور صاحب کمال لوگوں کو مالا مال کر دیا۔ بے نواؤں اور فلاکت زدہ لوگوں کی ایسی سرپرستی کی کہ ان کا امرا میں شمار ہونے لگا۔ جب کسی شریف اور معزز شخص کی تنگدستی کا حال معلوم ہوا تو اس پر سخاوت کی ایسی بارش کی کہ وہ تمام عمر کے لئے تنگدستی سے دور اور خوشحالی سے ہمکنار ہو گیا۔ انتہا یہ کہ جب کوئی شریف آدمی اپنی زبوں حالی سے مجبور ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا اور دوسرے لوگ ان سخی امرا کو اس کی زبوں حالی سے مطلع کرتے تو ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کیا جاتا اور باخبر کرنے والے بھی انعام و اکرام سے نوازے جاتے۔

چناں چہ اسحٰق موصلی دربار خلافت کا مشہور موسیقار تھا۔ فضل برمکی کو ایک دن اس نے ایسا گانا سنایا کہ اس نے خوش ہو کر ایک لاکھ درہم اور خلعت سے سرفراز کیا۔ دوسرے دن پھر طلب کیا۔ اسحٰق دیر سے پہنچا تو فضل ناراض ہوا اور تاخیر سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ اسحٰق موصلی نے عرض کیا کہ خلیل کندی جو بغداد کا ایک مشہور امیر ہے۔ آج بازار میں پیدل چلتا اور نہایت ہی ابتر حالت میں نظر آیا۔ میں نے اس کو گھر پہنچا کر پانچ ہزار دینار بطور قرض پیش کئے۔ یہ سن کر فضل آبدیدہ ہو گیا اور مجھے دعائیں دے کر پچاس ہزار دینار انعام دیئے کہ تم نے ایک معزز امیر کے حال سے واقف کرایا اور پھر خلیل کے حال پر ایسا کرم کیا کہ وہ پھر شاہانہ شان سے زندگی گزارنے لگا۔

علامہ ابو عبداللہ محمد بن الاعرابی قدح ایک مرتبہ پریشان ہو کر یحییٰ برمکی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ مالی مشکلات بیان کیں۔ پھر سلام کر کے اپنے گھر چلے آئے تو ایک خادم نے لاکر ایک تھیلی جس میں ہزار دینار ہے

یحییٰ کی جانب سے علامہ کو پیش کی اور کہا کہ یحییٰ نے کہلا بھیجا کہ کل پھر تشریف لائیں۔ وہ چار روز تک روز آنہ جاتے اور ہزار دینار وصول کرتے رہے۔ اس کے بعد خود داری سے مجبور ہو کر جانا بند کر دیا تو پھر یحییٰ نے بلا کر بوقت رخصت دو لاکھ درہم۔ ایک مکان مع ضروری سامان مرحمت فرمایا اور درخواست کی کہ آپ تمام عمر بغداد ہی میں رہیں۔ چنانچہ علامہ مستقل طور پر بغداد ہی میں قیام پذیر ہو گئے اور اس عدیم المثال فیاضی کی تعریف کرتے رہے۔

ایک عیسائی جبریل بن بختشوع، بنو عباس کے دور میں طبیب تھا، شاہانہ شان وشوکت سے زندگی گذارتا تھا۔ دربارِ خلافت سے جو تنخواہ اور انعام واکرام ملتا تھا، اس کے علاوہ خاندان برامکہ سے اس طبیب کو سالانہ وظیفہ ملتا تھا، جو حسب ذیل ہے۔

یحییٰ بن خالد برمکی ۔	چھ لاکھ درہم	سالانہ
جعفر بن یحییٰ ۔	بارہ لاکھ "	"
فضل ابن یحییٰ ۔	چھ لاکھ "	"

اسحٰق موصلی جو دربارِ خلافت کا نہایت مشہور موسیقار ہے بیان کرتا ہے کہ ایک دن یحییٰ برمکی نے علی الصباح مجھے بلایا۔ اس زمانہ میں میرا مکان بہت چھوٹا تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑا بھی دہلیز سے باندھا جاتا تھا اتفاقاً اسی روز ایک آدمی صبح سویرے آیا اور اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لین دین کے جھگڑوں کو چکانے میں دوپہر ہو گئی۔ اس کے بعد میں دربار میں پہنچا۔ یحییٰ نے ہنس کر کہا کہ جلسۂ صبوحی کی اچھی قدر کی۔ میں نے معافی چاہی اور اصلی واقعات عرض کر دیئے۔ میرا حال سن کر یحییٰ کو شرمندگی سے پسینہ آگیا۔ پھر میرا گانا سنا اور ایک قیمتی خلعت ایک راس، اسپ مطوق اور ایک لاکھ درہم انعام دیا۔ پھر اپنے نوکروں کو بلا کر حکم دیا کہ اسحٰق کے مکان پر جا کر بالاخانہ سے دیکھو۔ جس قدر مکان گردو پیش نظر آئیں وہ خرید لو۔ قیمت مالک مکان جو مانگے دیدو۔

پھر خاص طرز کا ایک عمارت تعمیر کراؤ۔ وکیل جب میرے مکان کے بالاخانہ پر آکر بیٹھا تو مجھ سے تیرہ قطعہ مکانات منتخب کئے۔ جن کو خرید کر جدید عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوگیا۔ تیسرے دن میری طمع بڑھی تو میں نے چاہا کہ اور چند مکانات خرید کر اس عمارت میں اضافہ کردوں تو معلوم ہوا کہ ابونصر احمد اصفہانی دو چند قیمت دے کر وہ مکانات خرید رہا ہے اور ایک عمارت تعمیر کررہا ہے۔ ہمارے پاس کے صناعوں کو زیادہ معاوضہ دے کر ہم سے چھین لیا باعتبار نقش ونگار اور مُطلّا کاموں کے بغداد میں یہ عمارت اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی تھی۔ ابونصر احمد کا اور میرا دونوں مکان تعمیر ہوگئے تو خواجہ حامد وکیل نے یحییٰ برمکی کو مطلع کیا۔ حکم ہوا کہ یہ مکانات شاہانہ طریقہ پر آراستہ کئے جائیں۔ ہر قسم کے ظروف نقرئی، شیشہ آلات اور زربفت کے پردے اور اس قدر لونڈی غلام بھیج دیئے جائیں۔ جب تمام امور مکمل ہوگئے تو ایک لاکھ درہم اخراجاتِ دعوت کے لئے عنایت کئے گئے۔

بعد انتظام یحییٰ برمکی صاحبزادوں اور ندیموں کے ہمراہ میرے جدید تعمیر شدہ مکان تشریف لائے اور مجلسِ عیش وطرب برپا ہوئی۔ پھر بالاخانہ پر تشریف لے گئے اور ابونصر احمد کا عالی شان محل دیکھ کر فرمایا کہ یہ خوشنما عمارت کس کی ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ ابونصر احمد کا محل ہے اور جس کی طرف سے مجھے جو تکالیف پہنچی تھیں وہ بیان کیں۔ یحییٰ نے میری باتیں سن کر خوب قہقہے لگائے جس سے میں بہت شرمندہ ہوا۔ ابونصر کی ایک دیوار میرے مکان سے متصل تھی اس کو یحییٰ کے حکم سے منہدم کردیا گیا پھر یحییٰ میرے مکان سے اس مکان میں منتقل ہوگئے۔ جہاں دسترخوان چُنا گیا۔ یہ محل چاندی اور سونے کے برتنوں سے جگمگا رہا تھا۔ ہر طرف عطر کی خوشبو مہک رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر یحییٰ نے مجھے بلایا اور سازوسامان اور غلام و کنیز اور سونے چاندی کے برتنوں کے علاوہ دونوں مکان مجھے عنایت کردیئے اور فرمایا کہ یہ دونوں مکان تمہارے لئے میرے ملازمین نے تعمیر اور آراستہ کئے ہیں لیکن تم کو اب تک اس لئے چھپا رکھا تھا کہ کہیں تمہیں شادیٔ مرگ نہ ہوجائے۔

چلتے وقت یحییٰ کے بیٹوں نے بیش بیش ستّر ہزار دینار عنایت فرمائے۔ الغرض یہ خاندان برامکہ، علماء، حکماء، شعراء، صاحب کمال اور حاجت مندوں کے لئے ابرِ رحمت تھا، جو سب پر فیاضی کی بارش کیا کرتا تھا۔ اس دور میں سخاوت ایسی صفت تھی کہ ہر امیر اس صفت سے خود کو متصف کرنا چاہتا تھا اور بعض جگہ یہ صفت اہلِ فارس اور اہلِ عرب کے درمیان ایسی باعثِ فخر صفت بن جاتی تھی کہ ہر امیر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا اور ان حالات میں اراکینِ سلطنت اور درباری امراء اپنی فضول خرچی کے باعث تنگ دست بھی ہو جاتے تھے۔

کسی نے یحییٰ برمکی کو مرنے کے بعد خواب میں دیکھ کر دریافت کیا کہ مرنے کے بعد خدا نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔ یحییٰ نے جواب دیا کہ یوں تو اگر حساب کیا جائے تو کروڑوں روپیہ عطا کئے لیکن پوشیدہ طور پر علماء و صالحین کو جو میں مدد کیا کرتا تھا، ان میں حضرت سفیان ثوری کو ایک ہزار درہم ماہوار دیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کی دعاؤں کی بدولت بخش دیا۔ (پیدائش ۷۱۶ء وفات ۷۷۷ء) حضرت ابو عبداللہ سفیان بن سعد بن حبیب رافع الثوری الکوفی کا شمار اقطابِ اسلام اور ارکانِ دین میں ہوتا ہے۔ علمِ حدیث کے امام تھے۔ خلیفہ مہدی عباسی بھی آپ کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔ ٭٭

سلسلہ صلا

دیا جا سکتا ہو تو انگریزی کو جاری رکھا جائے۔ بنگال کے گوسوامی کا خیال ہے کہ سنسکرت بھی یہ درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سنسکرت کا بھی وہی حال ہوگا جو ہندی کا ہے۔ ہندی کم از کم ایک علاقائی زبان تو ہے۔ سنسکرت تو آج کہیں بولی بھی نہیں جاتی۔ اگر یہ مقام دیا جا سکتا ہے تو صرف اردو کو دیا جا سکتا ہے جو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ یہیں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور اپنے دامن میں سبھی زبانوں کے الفاظ رکھتی ہے۔ کاش اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور کھلے دل سے تصفیہ کیا جائے۔

پیش

ن ناتھ آزاد

اشعار

سوس نہیں مجھ کو تری سنگ زنی پر ـ فریاد کناں ہوں میں فقط بے وطنی پر
قف بھی ہو آدابِ فنِ شیشہ گری سے ـ بے ناز تھیں یوں تو بہت تیشہ زنی پر

ریا کی ایک موجِ رواں کی طرح ہے تو ـ ڈوبا ہوں میں اگر تو کئی پار اُتر گئے

س میں جنسِ وفا ہے، نہ اس میں پیار کا نام ـ عجب دیار ہے یہ، کیا ہے اس دیار کا نام؟
ن کے غنچہ و گل بھی نظر میں ہیں کہ نہیں ـ ذرا خیال سے دینا اسے بہار کا نام

وں کو دل میں سنبھالو، ذرا خموش رہو ـ نہ منہ سے حرف نکالو، ذرا خموش رہو
ر اک جواب ہے پنہاں مری خموشی میں ـ مرے دقیق سوالو، ذرا خموش رہو
بھی سما نہ صوت و صدا و حرف میں تم ـ مرے لطیف خیالو، ذرا خموش رہو

دل کہ ہے اک قطرۂ خوں، غور سے دیکھیں اگر ـ جذبۂ پیہم کا ٹھاٹیں مارتا دریا بھی ہے

گوہرِ مقصود کیا ملتا دیارِ غیر میں ـ یوں تو جس حد تک نہ جانا چاہیے تھا ہم گئے

شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی۔ A-25 گورنمنٹ کوارٹرز۔ گاندھی نگر۔ جموں توی 180004 (جدید کے)

غزل

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشا

لطف دیتا ہے ہمیں اک دلِ غمگیں کیا کیا
انھی کے دم سے ہیں برپا جشنِ بہاریں کیا کیا

ہمت قاتل کا یہ فیضانِ کرم کیا کم ہے
جیب و داماں پہ کھلے ہیں گلِ رنگیں کیا کیا

یں نہ ہم ذوقِ جنوں کو کہیں محسن اپنا
اس نے سکھلائے ہیں زیست کے آئیں کیا کیا

سم ہے پوچھے کوئی معصوم و حیادار آنکھیں
حشر ڈھاتی تھیں پسِ پردۂ تمکیں کیا کیا

یا کہیں فصلِ بہاراں کی غزل رنگی سے
سہمے سہمے ہیں گل و لالہ و نسریں کیا کیا

یا اخلاص بہت رکھتے ہیں ہم اس باعث
ہم پہ الزام تراشے گئے سنگیں کیا کیا

م نے اپنایا ہے منشا یہی موضوعِ حیات
ورنہ تھے اور بھی رنگین مضامیں کیا کیا

پیروڈی

نظر برنی

بطرزِ غالب

مجھ کو جلا دیت کیا ہے
"غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟"

یوں تو پیتا نہیں میں پیسوں کی
"مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟"

عشق کرتا ہے اس کلرکی میں
"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟"

"پے" کے ملنے کے ساتویں دن بھی
"یہ نہ پوچھو کہ اب بچا کیا ہے؟"

شیخ صاحب کی آستیں نہ ٹٹول!
"صرف بوتل ہے اور دھرا کیا ہے؟"

نے پوتے سے کام لے لوں گا
"میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟"

مفلسی میں ہے سات تو ہیں اولاد
"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟"

وہ کلاکار بن کے بیٹھے ہیں...!
"جو نہیں جانتے کلا کیا ہے؟"

"تنگ" منہ میں ہے اس نظر کے بھی
"کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟"

جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

مومن خاں شوق

رات باقی ہے ابھی کروٹ بدل
خواب کی بے کیف وادی سے نکل

آرزوؤں کی فضاؤں میں مچل
بے یقینی کی فضا سے دل بدل

راہ میں رکنا نہیں شیوا ترا
جانبِ منزل یونہی بڑھتا ہی چل

آج ہی کر لے جو کرنا ہے تجھے
کیا بھروسہ زندگی ہو گی بھی کل

زندگی کی رہ گزر پُرخار ہے
گرنے والے ٹھوکریں کھا کر سنبھل

ہر کوئی ممکن ہے، ناممکن نہیں
شوق شاعر ہے ارادوں میں اٹل

اشرف ولا ۲۳-۷-۳-۱۱، ملے پلی، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۱

شوق ماہری لاپی

سایۂ زلف نہیں، شعلۂ رخسار نہیں
کیا بتاؤں مرا غم قابلِ اظہار نہیں

کچھ امیدوں کا سہارا تھا سو وہ بھی نہ رہا
درمیانِ غم و دل اب کوئی دیوار نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ وہ دورِ جنوں بیت گیا
اب کسی پاؤں کی زنجیر میں جھنکار نہیں

میکدے کس نئے ہنگاموں سے محروم ہوئے
بادہ و جام نہیں ہیں، کہ وہ میخوار نہیں

جو کڑی دھوپ کو سر لے کے مرے ساتھ چلے
میری راہوں میں کہیں سایۂ دیوار نہیں

رحمتیں کس نئے آنگن سے پلٹ جاتی ہیں
کیا مرے شہر میں اب کوئی گنہ گار نہیں

شوق یہ راز نہیں میں نے محبت کی ہے
مجھ گنہ گار کو اب جرم سے انکار نہیں

مہذب منزل۔ موگٹ روڈ، کھنڈوہ۔ 450001 (ایم پی)

ماہنامہ

حیدرآباد

ماہنامہ

جلد: ۳
شمارہ: ۱۲

دسمبر ۱۹۸۶ء

حیدرآباد

علمی
ادبی

دینی
و
سماجی

اقدار
کا
نمایندہ

ین مشاورت : عائشہ بیگم رباب • یوسف ناظم
ٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر رضی الدین احمد،
ر احمد صدیقی • محمد منظور احمد منظور • اے جی فاروقی
ٹر منشا الرحمٰن خان منشا • پروفیسر میر تراب علی

ایڈیٹر:
محمد قمر الدین صابری

مینجنگ ایڈیٹر:
محمد کلیم الدین احسن

تعاون:
ستان
روپے

پاکستان	انگلستان	امریکہ	خلیجی ممالک
25 پاکستانی روپیے	20 پونڈ	35 ڈالر	150 روپیے
" 225	" 36	" 65	" 270
" 2000	" 300	" 450	" 2500

5 روپے

پتہ:
۱۱-۷ ریڈ ہلز،
حیدرآباد۔ 590004 (اے پی)

• ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے
پریس چادر گھاٹ میں چھپوا کر ریڈ ہلز، حیدرآباد، آندھرا پردیش سے شائع کیا۔

فہرست

ہماری نئی قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اسے رُوبہ عمل لانے کے اقدامات شروع ہو چکے ہیں، شاداب میں مسلسل ایسے مضامین شائع کئے جا رہے ہیں جن میں تعلیمی پالیسی اور اس پر عملی اقدامات کا بیان ہے تاکہ اردو داں ہندوستانی ان سے واقف ہو سکیں اور ان سے استفادہ کر سکیں۔ ایسا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اردو میڈیم والے طلبا اور طالبات تعلیمی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں، ان کا تعلیمی معیار بہت پست ہے اور اس مسابقتی دور میں جب تک وہ اپنے معیارِ تعلیم کو اعلیٰ درجہ پر نہ لائیں ملک و قوم کی ترقی میں اپنا حصہ ادا نہیں کر سکتے۔ اصلاحِ حال کے لئے ضروری ہے کہ اپنی موجودہ حالت کا احساس ہونے کے بعد وہ راستے بھی بتائے جائیں جن پر چل کر ہم اپنی حالت بدل سکتے ہیں۔ موجودہ شمارے میں ایسا ہی ایک اصلاحی مضمون مسلم طلبا کے لئے کوچنگ سنٹرس کے قیام کی اہمیت کے بارے میں پیش کیا جا رہا ہے جسے ممتاز ماہرِ تعلیم جناب محمد اسحاق صاحب پرنسپال سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن نے لکھا ہے۔ موصوف نے کوچنگ سنٹرس کے قیام کو نمبر ایک مسئلہ قرار دیا اور بتایا کہ یہ کوچنگ ساتویں جماعت ہی سے شروع کی جانی چاہئے تاکہ ہمارے طلبا کی بنیادی کمزوریاں دور کی جا سکیں۔ موصوف نے اس خصوص میں محترمہ عائشہ بیگم موظف زائد ناظم تعلیمات مہاراشٹرا کی نگرانی میں "محفل علم و فن" کی مساعی کا ذکر کیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اس کام کو بہت ہی تیزی سے مختلف سنٹرس پر ایک ساتھ پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایڈیٹر شاداب محفل علم و فن کے معتمد کی حیثیت سے یہ کہنے کے موقف میں ہے کہ محفل علم و فن نے اپنے مرکز موتو عہ نبی خانہ اکبر پر خصوصی توجہ دی۔ اور دوسرے کئی اسکولوں میں انتظامیہ کو راغب کیا کہ کوچنگ سنٹرس چلانے میں محفل علم و فن سے تعاون کریں۔ چنانچہ مرکز موتو عہ نبی خانہ اکبر کا ایس۔ ایس۔ سی کا نتیجہ نہایت اچھا رہا، محفل علم و فن کا مقصد ہے کہ کوچنگ سنٹرس کی اہمیت کو محسوس کیا جائے اور اتنے کوچنگ سنٹر قائم کئے جائیں کہ ہمارا ہر طالب علم اس زائد مدد سے استفادہ کر سکے یہ کام اتنا بڑا ہے کہ حسب تجویز جناب محمد اسحاق صاحب سب وظیفہ یاب حضرات اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں کہ وہ قابل اور تجربہ کار بھی ہیں اور انھیں فراغت و فرصت بھی حاصل ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ سب اپنے اپنے علاقہ میں کوچنگ سنٹرس قائم کریں۔ جہاں طلباء کو ہوم ورک اور آموختہ کی سہولت حاصل ہو اور بنیادی اور مسابقتی امتحانوں کی تیاری کے لئے انھیں تربیت بھی دی جائے تاکہ وہ خداداد صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کرنے کے موقف میں آ جائیں۔

الحاج عبدالکریم پاریکھ

مُسلم کیلئے معاشی اونچ نیچ شرط نہیں

" قوم کے لوگ جواب میں بولے کیا ہم تمہاری بات لیں جب کہ تمہارے ساتھ چلنے والے کام کاج کے لحاظ سے نہایت ہی گرے پڑے لوگ ہیں"۔
نوحؑ نے فرمایا کہ ان کے کام کاج کی معلومات سے مجھے کیا مطلب ؟ —
تم کو کچھ بھی سوجھ بوجھ ہو تو یہ بات دھیان میں رکھو کہ ان کا حساب لینا میرے رب کی ذمہ داری ہے"۔
" اور میں کسی بھی ایمان والے کو اپنی مجلس میں آنے سے روک نہیں سکتا"
" میں تو کھلے طور پر ہر ایک کو ڈر سنانے کے لئے بھیجا گیا ہوں"۔
(سورۂ الشعراء آیات ۱۱۱ تا ۱۱۵)

تکبر اور گھمنڈ والے سماج میں اکثر لوگ غریبوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ روزی کمانے میں انہیں بہت سے چھوٹے چھوٹے کاموں میں خدمات انجام دینی پڑتی ہیں۔ مثلاً دھوبی، درزی بھنگی، چمار، نانبائی، حجام، بڑھئی، لوہار، دھنیا، حمال اور مزدور وغیرہ۔ اور ایک عجیب بات ہے کہ دعوتِ حق پر لبیک کہنے والوں میں بڑی تعداد غریبوں کی ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت نوحؑ کی قوم کے بڑے چودھری لوگوں نے کہا کہ تمہارے ساتھ ذلیل پیشہ کرنے والے لوگ ہیں۔ پھر تمہاری بات کیسے مان لیں۔ اور ان کے ساتھ ہم بیٹھ بھی کیسے سکتے ہیں۔ لیکن ہر ایک کو جان لینا چاہیئے کہ امیری غریبی کے لحاظ سے خدا کے یہاں نجات کے فیصلے نہیں ہوں گے۔ بلکہ ایمان اور عملِ صالح کی مناسبت میں ہر ایک کا فیصلہ ہوگا۔
ہر نبی کی دعوت عام ہوتی ہے کسی خاص طبقہ کی مالی حیثیت کم ہونے سے یا پیشے کے لحاظ سے دوسروں کی نگاہ میں اسے ذلیل سمجھا جارہا ہو تو بھی اللہ کے نبی کی تعلیم کے حصول میں ہر ایک کو

باقی پر صفحہ ۱۶

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی
ایم۔ اے، ایل ایل بی

قسط اول



صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم — ایک مثالی و فکر انگیز خطاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان سیدنا و سندنا ونبینا وحبیبنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر و ذکر اللہ کثیراً: اٰمنت باللہ وصدق اللہ مولانا العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم نحن علیٰ ذٰلک من الشٰھدین والشاکرین والحمد للہ رب العٰلمین۔

جناب صدر گرامی، علمائے کرام، معزز حاضرین، بزرگان محترم اور برادران عزیز! میں آج اس مبارک محفل میں شرکت کی سعادت حاصل کرکے اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت اور بڑا خوش نصیب تصور کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے تاریخی شہر میں اور اس کی ایک تاریخی مسجد میں ایک ایسے اجتماع میں شرکت کی سعادت عطا فرمائی جو سید الاولین والآخرین کے ذکر جمیل کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک تذکرہ ایک مسلمان کے لئے اتنی بڑی سعادت اور اتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ روئے زمین پر کوئی سعادت اور خوش نصیبی اس کی ہمسری نہیں کرسکتی۔ کیا اس لئے کہ اس کائنات میں اللہ جل شانہ کے بعد کوئی ہستی، کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گرد پا کو بھی پہنچ سکے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہیں کہ اس پوری کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد درحقیقت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہے۔ اگر آپ اس دنیا میں تشریف لانے والے نہ ہوتے تو یہ آسمان پیدا نہ ہوتا، یہ زمین

سیرتیں لکھنے والے بہت سے غیر مسلم بھی ہیں، مستشرقین بھی ہیں، یہودی بھی ہیں
سا ہیں۔ وہ سیرتیں لکھتے ہیں، رحمت کے اس سمندر میں غوطے لگانے کی کوشش کرتے
ہیں لیکن ان کے ہونٹ بھی تر نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ سیرت کا مطالعہ کرنے کا سبب نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے ان کی وہ محبت نہیں ہوتی بلکہ ایک تاریخی افسانہ
وہ ایک تاریخی واقعہ بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے لئے یہ نمونہ نہیں۔

لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر۔ نمونہ اس کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتا ہو اور جس کو یقین ہو کہ ایک آخرت کا دن آنے والا ہے۔ اس دن اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور میری پیشی ہوگی۔ وذکر اللہ کثیراً اور جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو کثرت سے یاد کرے۔ اس کے لئے آپؐ کی ذات والا صفات بہترین نمونہ ہے۔ عجیب لفظ استعمال فرمایا قرآن کریم میں نمونے کا۔ نمونہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی بھی شخص کے سامنے اس لئے لائی جائے کہ اس کی نقل اتاری جائے۔ اس نمونے کے مطابق ڈھالی جائے۔ اور یہ انسانی خصوصیت ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے ہر ہر مرحلے میں کام کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے ایک نمونہ کی۔ بغیر نمونے کے انسان اس دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس معاملے میں انسان عام جانوروں سے مختلف ہے۔ عام جانوروں کا انداز حال یہ ہے کہ مچھلی کا بچہ پانی کے اندر پیدا ہوا اور تیرنا شروع کر دیا۔ اس کو تیراکی سکھانے یا تربیت دینے کے لئے کسی معلم یا انسٹرکٹر کی ضرورت نہیں پڑتی، مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی اس نے چلنا اور دانہ کھگنا شروع کر دیا۔ اس کو اس عمل کے لئے کسی مربی اور معلم کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ڈال دیتے ہیں اور وہ خود بخود یہ کام کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب تک اس کے سامنے کوئی نمونہ نہ آئے وہ کسی کام کے قابل نہیں ہوتا۔ انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کو کھانا نہیں آتا۔ دو سال تک اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا ہے کہ کس طرح کھانا کھا رہے ہیں تب رفتہ رفتہ عادی بنتا ہے۔ جب نمونہ اس کے سامنے آتا ہے تب کھانا شروع کرتا ہے۔ یہی حال دنیا کے ہر علم وفن اور ہنر کا ہے۔ ایک بڑھئی کو لے لیجئے۔ کوئی آدمی یہ چاہے کہ اس کو بڑھئی کا کام اور فرنیچر بنانے کا طریقہ سکھانے والی کتاب مل جائے تاکہ اس کو پڑھ کر وہ بڑھئی کا کام شروع کر دے تو وہ بڑھئی کا کام نہیں کر سکے گا۔ یہ کام تب آئے گا جب کسی بڑھئی کا بنایا ہوا نمونہ اس کے سامنے ہوگا اور عملی طریقہ اس کے سامنے ہوگا تو اس کو دیکھ کر وہ کام کر سکے گا۔

ایک انگریزی جاننے والا شخص میڈیکل سائنس کی کتابوں کو پڑھ کر یہ چاہے کہ میں لوگوں کا علاج کروں تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ جب تک میڈیکل سائنس کا عملی تجربہ اور عملی تربیت کسی معلم اور مربی کے ذریعہ حاصل نہ ہو اس وقت تک وہ اس فن میں ماہر نہیں بن سکتا۔ یہی حال دنیا کے ہر علم و فن کا ہے اور تو اور کھانے پکانے کی ترکیبوں اور باورچی خانے کی کئی کتابیں نکل چکی ہیں۔ ان کو پڑھ کر اور اس میں لکھی ہوئی ترکیب اور مقدار کے مطابق اشیاء لے کر کوئی شخص اگر بریانی بنانا چاہے تو ساری عمر کوشش کرتا رہے گا کامیابی نہیں ہوگی۔ جب تک گھر کی گرہستن سے بریانی بنانے کا طریقہ نہ سیکھے اور اس کے سامنے عملی تربیت حاصل نہ کرے مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ دنیا کے کوئی کام انسان بغیر نمونہ کے نہیں سیکھ سکتا۔ یہ انسان کی فطرت ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آسمانی کتابیں اتاریں اور دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا کہ وہ آتے ہیں تو کتاب کا مطلب سمجھاتے ہیں، اس پر عمل کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں اور اس کی تربیت دیتے ہیں جس کے بعد ہی انسان اس کتاب پر عمل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ورنہ مشرکین مکہ یہ کہا کرتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کو ہمارے لئے ایک کتاب اُتارنی تھی تو براہ راست ہم پر نازل کرنے کی بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں نازل فرمایا۔ مشرکین مکہ کے اس مطالبے کو پورا کرنا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کے لئے تو کچھ مشکل نہیں تھا۔ مطالبہ کو یوں پورا کر دیا جاتا کہ ایک صبح جب سب لوگ بیدار ہوتے تو ہر ایک کے بستر کے سرھانے ایک بہت ہی شاندار طریقہ سے طبع کیا ہوا قرآن مجید کا ایک نسخہ ہوتا اور کہا جاتا کہ اس پر عمل کرو اور اس کے بعد کسی کے پاس مجال انکار بھی نہ رہتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تنہا کتاب بھیجنے پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ تنہا کتاب انسان کی ہدایت اور تربیت کے لئے کافی نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے ساتھ معلم و مربی نہ ہو۔ آپ کو ایسی مثالیں ملیں گی کہ اس کائنات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے لیکن ان پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی کہ کتاب آئی ہو اور ساتھ میں پیغمبر نہیں آئے۔ اس لئے کہ انسانی ہدایت کے لئے تنہا کتاب کافی نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ساتھ اسوۂ حسنہ نہ ہو ایک پیغمبر کا جو عمل کر کے بتائے کہ کتاب پر کس طرح عمل کیا جاتا ہے۔ کتاب کو پڑھو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو دیکھو تب پتہ چلے گا کہ قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اسی لئے بھیجا گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

سنتے رہیں تب بھی اس کے ہزارویں حصہ کا بھی حق ادا نہیں ہوتا۔
لیکن اس تھوڑے سے وقت میں خیال آیا کہ کیا بات عرض کروں، کس زبان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف جمیل بیان کروں تو معاً مرزا غالب کا ایک شعر یاد آیا اور اس سے مشکل حل ہوئی۔ جب انسان کوئی سیرت بیان کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے سامنے مضامین کی ایک کائنات ہوتی ہے کہ کس مضمون کو اختیار کرے اور کس کو چھوڑ دے

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ہر موضوع ایسا ہوتا ہے کہ یہی اختیار کرنے کے لائق معلوم ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے مسئلہ حل کیا اور بڑی پیاری بات کہی۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

کہ غالب ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کا معاملہ اللہ تبارک وتعالیٰ پر چھوڑ دیا اس لئے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ پہچان سکتی ہے۔ اس ذات باری کے سوا کوئی اس کائنات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مرتبہ نہیں جان سکتا۔ اس لئے خیال آیا کہ ہم تو کیا تعریف بیان کریں کیوں نہ اللہ تعالیٰ سے ہی پوچھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اپنے محبوب نبی کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا تو یہ آیت ذہن میں آئی جو آپ کے سامنے تلاوت کی گئی۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف بھی ہے اور آپ کی سیرت پاک سے حاصل ہونے والا پیغام بھی ہے اس آیت کی تھوڑی سی تشریح آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ صحیح طور سے اس کو بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اتفاق سے آج کئی بیانات مسلسل ہوئے اور طبیعت پوری طرح صاف بھی نہیں تھی۔ جب میں آرہا تھا تو سر میں کچھ چکر سا تھا اور کچھ درد سا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آج کے اس جلسے میں کیا کہہ سکوں گا اور کیا تقریر کرسکوں گا۔ لیکن معاً خیال آیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک تذکرہ کا جلسہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے کوئی نہ کوئی بات دل میں ڈال دیں گے اور کہنے کی توفیق عطا فرما دیں گے۔

جو آیت میں نے تلاوت کی اس میں باری تعالیٰ مسلمانوں سے خطاب کرکے فرما رہے ہیں لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کہ اے ایمان والو تمہارے لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ لیکن یہ ہر ایک کے لئے نہیں۔

پیدا نہ ہوتی۔ یہ چاند ستارے پیدا نہ ہوتے، یہ دریا نہیں، یہ ہوا اللہ تعالیٰ پیدا نہ کرتا۔ ساری کائنات کی ترقی کا اصل سبب اور باعث درحقیقت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ ایک جملہ لوگوں کی زبانوں پر حدیث کے نام سے مشہور ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا لولاک لما خلقت الافلاک اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہیں کرتا۔ یہ حدیث اگرچہ لفظی اعتبار سے تو موزوں ہے اور ثابت نہیں لیکن اس بات پر تمام علمائے حق کا اتفاق ہے معنی کے اعتبار سے یہ بات بالکل درست ہے کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس ساری کائنات کی تخلیق کا سبب ہیں اور اقبال نے اس بات کو کیا اچھے انداز میں کہا ہے کہ

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مئے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

درحقیقت وہ ذات والا صفات جو اس کائنات کی تخلیق کا سبب ہے اس کا تذکرہ سننا اور سنانا اس روئے زمین کی سب سے بڑی سعادت ہے اور میں آپ حضرات اور خود اپنے آپ کو اس بات پر مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اللہ جل جلالہ نے ایسی محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا جو آپ کے مبارک تذکرہ کے لئے وقف ہے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں اور آپ کو نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی زبان پر لینے کی اجازت عطا فرمائی ورنہ ہمارے ناپاک منہ، ہماری گندی زبانیں اس لائق نہ تھیں کہ سرکار دو عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک اس پر آتا۔ کسی نے کیا اور خوب کہا ہے کہ:

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اپنے منہ کو اگر میں ہزار مرتبہ بھی مشک و گلاب سے دھولوں اس کے بعد بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لینا انتہائی بے ادبی ہے۔ لیکن یہ اللہ جل جلالہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں آپ کا تذکرہ کرنے کی اور سننے کی سعادت کی اجازت عطا فرمائی۔ بلکہ ناقص، ناکارہ اور بے علم و بے عقل انسان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کن الفاظ اور کس زبان سے کرے۔ اس کے لئے وقت بھی کافی نہیں اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیرت کا موضوع اتنا طویل کہ اگر ہم اور آپ ساری عمر رات اس کو بیان کرتے رہیں اور

میں اللہ قرآن کریم نے کیا اچھے انداز میں فرمایا ”لَقَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ“ کہ اے مسلمانو تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب آئی یعنی قرآن ۔ لیکن کتاب کتنی ہی عالیشان ، کتنی ہی جلیل القدر ہو لیکن آپ کے پاس روشنی نہیں ہے پڑھنے کے لئے تو آپ اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔ اگر روشنی گل کر دی جائے اور بہت ہی اعلیٰ درجہ کی کتاب خواہ کتنے ہی بڑے عالم کو دی جائے وہ بغیر روشنی کے نہیں پڑھ سکتا ۔ کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے روشنی کی ضرورت ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ ایک روشنی بھیجی ۔ مفکرین کرام نے فرمایا اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیمات ہیں ۔ کتاب کی وضاحت کرنے کے لئے ہم نے اس کے ساتھ ایک نمونہ بھیجا کہ اس نمونے کو سر سے لے کر پاؤں تک اور صبح سے لے کر شام تک دیکھتے جاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرو اور اس کے مطابق نقل اتارتے جاؤ ۔

تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو ایسا نمونہ بنا کر بھیجا کہ زمین و آسمان کی نگاہوں نے نہ پہلے دیکھا اور نہ اس کے بعد دیکھا اور نہ قیامت تک دیکھ سکتے ہیں ۔

اس نمونہ کے اثرات ہر مسلمان جانتا ہے ، یہ ہوئے کہ وہ جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم جس کے اندر ہدایت کے کسی چشمے کے پھوٹنے کا امکان نہیں تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ اور اس سیرت و کردار کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا بنا دیا ۔ اس پر وہ واقعہ یاد آیا ۔ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ ایک وسیع و عریض علاقہ کے فرمانروا تھے ۔ جو علاقہ آپ کے زیر نگیں تھا اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ ہندوستان ، پاکستان ، بنگلہ دیش اور برما کو یعنی پورے برصغیر کو جمع کر کے اس کا چار گنا علاقہ آپ کے زیر نگیں تھا ۔ اتنے عظیم فرمانروا فرماتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ کے ایک پہاڑ کے دامن سے گزر رہے تھے تو اکدم سے اپنے آپ کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اے خطاب کے بیٹے ذرا ٹھہر جا ! ذرا وہ وقت یاد کر کہ اسی پہاڑ کے دامن میں تو اونٹوں کو چراتا ہوا جایا کرتا تھا اور تیرے پاؤں تلووں سے لے کر ٹخنوں تک اونٹوں کے پیشاب سے نہائے ہوئے ہوتے تھے اور اس حالت میں تیرے اوقات بسر ہو رہے تھے ۔ آج تیرا یہ حال ہے کہ آدھی سے زیادہ دنیا پر تیرا پرچم لہرا رہا ہے ۔ قیصر و کسریٰ کی Super Power بھی تیرے نام سے لرزہ بر اندام ہو جاتی

ہ۔ یہ تبدیلی، یہ انقلاب اور یہ عظیم الشان تغیر آخر تیرے اندر کس طرح آیا۔ پھر خود
جواب دیا کہ یہ درحقیقت صرف سرکار دوعالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کا
ہ ہے ۔ دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں   دو چار دن رہے تھے اُس کی نگاہ میں
روں کے اندر کتنا انقلاب آگیا۔

وہ قوم جو مرغی کے ایک بچے کی خاطر چالیس چالیس سال جنگیں جاری رکھتی تھی۔
یا ہے کہ ایک جنگ گزری ہے جو حرب غفور کہلاتی ہے۔ اس میں صرف اتنا ہوا
کہ ایک شخص نے دوسرے کے مرغی کے بچے کو مار دیا تو دوسرا اس کے مقابلے پر نکل آیا۔ تکرار
، ہاتھا پائی ہوئی، دونوں طرف سے آدمی میدان میں آگئے، تلواریں نیام سے باہر
، جنگ شروع ہوگئی۔ چالیس سال یہ جنگ جاری رہی۔ باپ مرتا تو بیٹے کو وصیت
اتا کہ بیٹا اور ہر چیز معاف کر دوں گا لیکن ان لوگوں سے میرا انتقام لینا مت چھوڑنا۔
ں اپنے بیٹوں کو کہا کرتی تھیں کہ جب تک تو اس جنگ کو جاری نہیں رکھے گا دودھ نہیں
یں گی۔ اور یہ خونریزی کا سلسلہ چالیس سال تک جاری رہا ایک مرغی کے بچے کے لئے۔
اس خونریزی کرنے والی قوم کے فرد تھے حضرت علی ابن طالب رضؓ۔ ان کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ
یہودی نے حضرت علی رضؓ کے سامنے معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ نبی کریم سرور دوعالم صلی اللہ
وسلم کی شان میں کچھ گستاخی کی، کچھ گالی کا کلمہ نکالا۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ
ہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسے کلمات سننا کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ اس یہودی پر جھپٹ
ے اور اسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہوگئے۔ جب یہودی نے دیکھا کہ اور کوئی بس نہیں
اور کوئی راستہ نہیں تھا تو اس نے لیٹے لیٹے حضرت علی رضؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ دیکھنے والوں
دیکھا کہ جس وقت یہودی نے آپ کے منہ پر تھوکا آپ فوراً یہودی کو چھوڑ کر الگ ہوگئے۔
ں نے کہا کہ امیر المومنین یہ وقت تو اور زیادہ اس کی پٹائی کا تھا۔ اس نے ایک طرف تو
یم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور پھر اس نے آپ کے رخ مبارک پر تھوک
۔ اب تو اور زیادہ سزا دینی چاہئے تھی پھر آپ اٹھ کھڑے کیوں ہوگئے؟ امیر المومنین
ت علی رضؓ نے جواب دیا کہ جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو
وقت مجھے جو غصہ آیا تھا اور اس وقت جو میں اسے زمین پر گرایا تھا وہ سرکار کی وجہ سے تھا
ب جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا اب اگر میں اس کو مارتا تو اپنی ذات کی وجہ سے
۔ تو سرکار کی وجہ سے مارنا تو موجب اجر و ثواب تھا لیکن اپنی ذات کی وجہ سے مارنا

یقیناً ابو جہل و ذاب کی بات نہ تھی اس لئے میں اسے چھوڑ کر آ گیا۔ یہ اس قوم کے فرد ہیں جو معمولی باتوں کے نیچے پر چالیس سال جنگ جاری رکھا کرتی تھی۔ یہ انقلاب برپا کر دیا اس کی زندگی میں۔ ایسی ایک دو مثالیں نہیں ہیں۔ ایک ایک صحابی زندہ ثبوت ہے۔

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلہ مبارک میں جب یہ ایک چھوٹے بچے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ حنین کے لئے تشریف لے جا رہے تھے راستے میں پڑاؤ ڈالا۔ پڑاؤ میں مسلمانوں نے اذان کہی۔ یہ صحابی چھوٹے بچوں کے ساتھ مل کر کھیل رہے تھے۔ بچوں نے اذان کی آواز سنی تو اپنی عادت کے مطابق اس نئی آواز کی نقل اتارنی شروع کر دی۔ جب ابو محذورہ رض اذان کی نقل اتار رہے تھے تو یہ آواز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے فرمایا کہ اس بچے کو میرے پاس بلا لو۔ حضرت ابو محذورہ رض فرماتے ہیں کہ مجھے بلانے جب کوئی آیا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا۔ حضرت ابو محذورہ رض فرماتے ہیں کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں حضور کی سمت اس حالت میں چلا کہ روئے زمین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے کسی سے نفرت نہیں تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ میں پہنچا اور روئے مبارک پر ایک نظر پڑی تھی کہ اس کے بعد دل کی کائنات میں وہ تبدیلی واقع ہوئی کہ یا تو روئے زمین پر آپ سے زیادہ نفرت کسی سے نہ تھی یا پھر اب خدا کی قسم اس روئے زمین پر آپ سے زیادہ محبت کسی سے نہ تھی۔ میں نے کہا یہ چہرہ کسی کذاب کا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے پوچھا تم کیا کہہ رہے تھے۔ میں نے کلمات بتائے تو اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔ پہلے تو نقل اتار کر کہہ رہے تھے کہ "لا الٰہ الا اللہ" اور اب دل سے کہہ رہے ہیں کہ "اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ"۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکہ مکرمہ کا موذن مقرر فرما دیا۔ مکہ مکرمہ میں اذان ابو محذورہ رض ہی دیا کرتے تھے اور جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا محبوب کوئی نہیں اس کی نشانی یہ تھی کہ آپ فرماتے ہیں کہ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا تھا تو میرے سر پر آپ نے شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ سر اس جگہ کے بال عمر بھر میں نے نہیں کٹوائے کہ یہ وہ بال ہیں جن پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک مس ہوا تھا۔ غرض ایک ایک صحابی کے حالات پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انقلاب ان کی زندگی میں برپا کیا وہ ایک زندہ ثبوت ہے آپ کی تعلیمات کا۔

محمد نورالاسلام صدیقی

: ایک عجیب واقعہ :-

حیات بعد الموت
یعنی
موت کے بعد زندگی

حیات بعد الموت ایک ایسی حقیقت ہے مختلف مذہبی کتب میں جس کی مختلف نوعیتیں بیان
ہیں۔ اسلام نے چودہ سو سال پہلے بذریعہ قرآن اس حقیقت کو بیان کیا۔ صوفیائے کرام کے
ں میں بھی کتنے واقعات ایسے ہیں جو سرکار رحمت عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے
" مرجاؤ مرنے سے پہلے " کی حقانیت کو ثابت کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم مغرب سے
شدہ ہر خیال کو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ قدیم حکماء نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے اور بائیبل میں بھی
کے روحانی پہلو اور حیات بعد الموت کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ بعض اقوام و ممالک
یسے واقعات کو قلمبند نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ علم سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے تھے کہ
کے بعد روحیں کن مراحل سے گذرتی ہیں۔ ڈاکٹر ریمنڈ موڈی کی مشہور کتاب LIFE AFTER
میں اس موضوع پر بڑی کوشش اور جستجو کے بعد ایسے بہت سے واقعات جمع کئے اور
بڑی قابلیت سے تجزیہ کیا ہے۔ یہ واقعات حیرت انگیز بھی ہیں اور تعجب خیز بھی۔ ایسا ہی
واقعہ میں قارئین کے ملاحظہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو خواب یا کوئی واہمہ یا فریب نظر نہیں
حقیقت ہے۔ بہت سے لوگ اس طرح کے واقعہ کو ہمدردی سے سنتے ہیں اور نہ اس پر
لیتے ہیں۔ اس واسطے ہم اس بحث میں وقت ضائع کئے بغیر اپنے موضوع پر واپس آجاتے ہیں۔
میرے بڑے بھائی جناب حکیم بدرالاسلام صاحب ریاست حیدرآباد کے محکمہ پولیس میں عہدیدار
اور سیر و شکار کے شوقین۔ چنانچہ جب عادل آباد میں مشہور شکاری تحصیلدار ثناءاللہ صاحب مرحوم

مکان نمبر ۳۹۳/B آغاپورہ۔ حیدرآباد۔ آندھراپردیش

کا ساتھ ہوگیا تو بھائی صاحب کی زندگی میں بہار آگئی تھی ۔ رات دن شکار اور شکاریوں کے قصوں میں گذرتی تھی ۔ دونوں ایک دوسرے کے مداح ۔ شکاری کون اور میر شکاری کون تھا : یہ تو وہ لوگ جانتے ہوں گے ۔ ہم تو صرف ثناء اللہ صاحب سے ان کے علی گڑھ کے قیام کے دوران کے لطیفے ا واقعات سن کر لطف اندوز ہوا کرتے تھے ۔ ہاں تو میرے بڑے بھائی بدر الاسلام صاحب کے کئی صاحبزادے ہیں جن میں ایک قمر الاسلام صاحب حیدرآباد میں مقیم ہیں ۔ اور یہ مجاہد آزادی ہیں ۔ جو آنجہانی سبھاش چندر بوس کے بہت قریب تھے ۔ ان کے بعد محمد اظہر الاسلام صدیقی ہیں جو دوران تعلیم پاکستان چلے گئے تھے ۔ اور وہاں بہت سعی و کوشش کے بعد اپنے لئے کوئی مناسب مقام حاصل نہ کر سکے تھے ہانگ کانگ سے انگریز عہدیداروں کی ایک ٹیم آئی اور اظہر الاسلام صاحب کو انٹرویو میں منتخب کر برٹش پولیس آفیسرز کے لئے ہانگ کانگ لے کر چلے گئے ۔ یہ وہاں پولیس میں ملازمت کرتے رہے اور ایک چینی نژاد مسلم خاتون سے شادی کرلی ۔ دوران ملازمت بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور ترقی کرتے رہے ۔ ایک اسمگلر کی گرفتاری کے دوران شدید زخمی ہوگئے تھے اس کے بعد لندن جاکر علاج کرایا ۔ خدا کے فضل سے صحت یاب ہوگئے اور وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوکر ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار شروع کیا ۔ اس دوران دو بچے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں اور تعلیم سے آراستہ ہوکر باپ کا کاروبار سنبھال لیا ۔ جب سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا تو دنیا کی سیر و سیاحت کی اور کئی مرتبہ ہندوستان آئے ۔

غیر ملک میں اپنی انفرادی کوششوں سے اپنے اور بچوں کا شاندار مستقبل بنانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ہے ۔ بفضلہٗ وہ اب ایک خوش حال زندگی گذار رہے ہیں ۔

ہانگ کانگ میں ۱۹۸۱ء میں ان کے قلب کا آپریشن ہوا ۔ جہاں جدید ترین آلات و مشنری اور قابل ترین مختلف ممالک کے ڈاکٹر اور سرجنس موجود ہیں ۔ آپریشن کے دوران سترہ منٹ ایسے قیامت خیز گذرے کہ ان کو مردہ قرار دیا جاکر ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کردیا گیا ۔ اور لاش کو ورثاء کے حوالے کئے جانا کا انتظام ہورہا تھا ۔

اس دوران مریض پر کیا گذری اس کو غور سے سنیئے ۔

" مریض کو ایسا محسوس ہوا کہ روح اُن کے جسم سے نکل رہی ہے ۔ ایسا لگا کہ جیسے کوئی دو زبردست ہاتھ جسم کے اندر داخل ہوئے ۔ اور پورے جسم کو اندر سے اکھاڑنا شروع کردیا ۔ پیروں کے جوڑوں سے یہ عمل شروع ہوا ۔ پھر گھٹنوں اور رانوں کے جوڑوں سے اکھاڑ پچھاڑ ہوکر جب سینہ کی نوبت آئی تو سینہ پر قیامت کا بوجھ محسوس ہوا ۔ اور پھر ناک کے ذریعہ جسم سے روح خارج ہوگئی ۔ بڑی بھیانک

اور جان لیوا تکلیف تھی جس کو بیان کرنے الفاظ کا سہارا لینا مشکل ہے۔ پھر ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے مادی وجود سے آزاد ہو گیا۔ موت کے بعد نئے لطیف جسم کی کیفیات اور محسوسات کو الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ اس کو روحی جسم کا نام دیا جاسکتا ہے"۔

بعض کتب میں درج ہے کہ سب سے پہلے تو مرنے والے کی روح اس کے بدن سے رخصت ہوتی ہے اور خود کو ایک خلاء میں موجود پاتی ہے۔ آدمی خود کو اپنے جسم سے باہر پاکر متعجب ہوتا ہے وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اپنے مردہ جسم پر نوحہ و گریہ کرتے دیکھتا ہے۔ اور بعض نے اپنے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا کہ وہ اپنے مادی وجود سے باہر نکل کر کمرہ کی جالیوں سے ہوتی ہوئی خود کو اُڑتا ہوا محسوس کیا۔ وہ ایک خاص مقام پر رک گیا۔ اور چھت کے قریب معلق ہو گئی۔ گویا کوئی کاغذ کا ٹکڑا ہے جس کو کسی نے چھت کی جانب اڑادیا ہے اور بعض لوگوں کا بیان ہے کہ "روحی جسم" دھندلے بخارات یا بادل کی طرح ہوتا ہے۔ یہ مادی مزاحمتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

اب اظہر الاسلام صاحب کی روئداد ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتے ہیں:

" پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں سب کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا ہے۔ لوگوں کے اضطراب و کیفیات رنج و غم کو محسوس کر رہا تھا۔ اب میرا روحی جسم ہلکا ہو کر چھت سے لگ گیا تھا۔ میری سماعت اسی وقت ختم ہو چکی تھی۔ جس وقت جان بدن سے علیحدہ ہو رہی تھی۔ لیکن بصارت موجود تھی۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور وہ سب مجھے نظر آرہا تھا جو نیچے ہو رہا تھا۔ سب انسان مجھے ایسے نظر آرہے تھے جیسے فوٹو ز کے نگیٹیوز ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹرز، نرسیں، میری بیوی اور میرے بچے سب کو میں پہچان بھی رہا تھا۔ اور مجھے ایسا بھی احساس تھا کہ میں مرگیا ہوں۔ میری بیوی بچے رورہے ہیں۔ لیکن اس حالت میں نہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ سب کیوں رو رہے ہیں؟ اور نہ ان سے کسی قسم کی محبت و ہمدردی کا احساس ہوا۔ نہ اپنے مرنے کا کوئی افسوس یا غم محسوس ہوا۔ میں صرف سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اپنی لاش کو بستر پر پڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میری بیوی آئی اور بہت روتی بیٹھی۔ جس کے بعد ڈاکٹرز نے مجھے اسٹریچر پر لٹادیا اور کمرے سے لے کر چلے گئے۔ میں چھت پر معلق ان کے ساتھ ساتھ موجود تھا۔ وہ اسٹریچر کو لے کر لفٹ میں داخل ہو گئے۔ تب میرا رابطہ ان سے منقطع ہو گیا۔ وہ کس منزل پر لے گئے، کس کوریڈور سے گذرے مجھے نہیں معلوم۔ لیکن وہ جس کمرے میں داخل ہوئے میں اپنے روحی جسم میں پہلے سے وہاں موجود تھا۔ معلق چھت کے بالکل قریب اور میں سب دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹرز نے کچھ مشینیں لگائیں۔ میرے سینے پر جھٹکے مارے اور جو حشر بھی وہ کر سکتے تھے، کیا۔

تب اچانک میرا رابطہ ختم ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم نے جھرجھری لی۔ اور میں زندہ ہوگیا۔ میری پسلیوں میں جو ڈاکٹروں کی تختۂ مشق بنی تھیں کئی ماہ درد ہوتا رہا۔ جس وقت مجھے ہوش آیا ہے اس سے قبل ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری ہوچکا تھا۔ اور میری لاش کو گھر والوں کے حوالے کیا جارہا تھا۔ میں جب زندہ ہوگیا تو پورے ہسپتال میں سنسنی پھیل گئی۔ ڈاکٹرز دوڑے دوڑے آئے اور مجھے ایک ایسے کمرہ میں منتقل کردیا گیا۔ جہاں متعدد مشینیں لگی ہوئی تھیں — پھر دھڑا دھڑ میرے ہر ہر طرح کے ٹسٹ لے جانے لگے — ہر ایک ڈاکٹر مجھ سے واقعات سنتا اور حیرت میں مبتلا ہوجاتا۔ اکثر بڑے ڈاکٹر جو بہت مصروف رہتے تھے میرے حالات میری زبانی سننے کسی وقت بھی آجاتے اور بعض اوقات مجھے سوتے سے اٹھا کر میرے بیانات لیتے تھے۔ اس طرح تین ماہ تک ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنا رہا۔ میں نے انشورنس پالیسی لے لی تھی جس کے باعث بائی پاس آپریشن کے غیر معمولی اخراجات برداشت کرنے میں سہولت ہوئی۔

"اب بفضلہٖ تعالیٰ ہر اعتبار سے صحت مند ہوں۔ آپریشن سے پہلے تو میں پرہیز بھی کرتا تھا۔ چڑھائی پہ بھی نہیں چلتا تھا۔ زیادہ پیدل چلنے سے گریز کرتا تھا۔ لیکن اب سب کچھ کرتا ہوں۔ اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس کبھی کبھی موت کے خیال سے بدن میں سنسنی سی محسوس ہوتی ہے"

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے افراد جن کی روحیں کچھ وقت تک ان کے جسموں سے باہر رہی تھیں۔ اس دوران مادی دنیا میں ہونے والے حالات کا وہ مشاہدہ کرتے رہے تھے۔ اور اگرچہ سماعت و بصارت اس ڈھنگ سے کام نہیں کرتیں جس طرح ہماری آپ کی سماعت کام کرتی ہیں۔ کچھ ایسا فرق محسوس ہوتا ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حافظہ برابر کام کرتا رہتا ہے۔ چونکہ جب روح بعد میں پھر مادّی جسم میں داخل ہوگئی اور اس شخص نے اس دوران دواخانہ میں جو کچھ دیکھا تھا اپنی بیوی اور ڈاکٹروں سے بیان کیا تو انہوں نے ان واقعات کی تصدیق کی۔

★★

...ابری کا حق پہنچتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے چند ضروری باتیں پیشِ خدمت ہیں۔ انبیاء جاہلیت ...باتوں کو مٹانے آتے ہیں۔ نبی اپنے مشن اور دعوت پر کوئی اجرت یا مزدوری نہیں لیتے — ...بان والوں میں طبقاتی فرق کو تسلیم نہیں کرتے۔ کسی ہلکے سمجھے جانے والے طبقے کی بے عزتی ...و بے ادبی کے چلن کو دنیا میں بند کردینا چاہتے ہیں۔ اللہ کے خزانوں کا انچارج ہونے کا دعویٰ ...یں کرتے۔ سماج میں جن کو حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا ہے اپنی تعلیم و تربیت میں اس طبقہ کا

میں نے اسلام کیوں قبول کیا ؟

ایک نومسلم فرانسیسی نوجوان کے تاثرات

اب مسلمان ہو جانے کے بعد تو میرا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ ہدایت اللہ ہی ہے اور اسی نے مجھے اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے لیکن میرے اسلام کے ظاہری اسباب کیا تھے ؟ میں انھیں اس لیے قلم بند کر رہا ہوں کہ اسلام ہری اسباب کو زندگی میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔

میں فرانسیسی ہوں۔ میری عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے اس لیے میں یہ دعوےٰ رسکتا کہ میں نے مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد فرانسیسی کلیسا کے رومن ے مذہب کو ترک اور اسلام کو قبول کیا ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ میں نے زندگی کی معمولی معمولی باتوں میں اپنے آبائی مذہب اور اسلام کی ہ پر غور کیا تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ اسلام کے بنیادی عقائد بہتر اور قابلِ ے۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ رومن کیتھولک میں انسان کے گناہوں کو معاف اختیار صرف کلیسا کے بڑے پادریوں کو حاصل ہے اور اس کے ساتھ مذہب کے ماننے والے اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ یسوع مسیح مذ خدا کے فرزند تھے اور انھیں بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ بننے ے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ مجھے یہ بات ابتدا سے ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتی یک انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے سامنے اپنے گناہوں کا کرے اور دوسرا انسان ان گناہوں کو معاف کر دے۔ پھر میں اس بات کو وس کرتا تھا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے گناہوں کے بدلہ میں سولی دیدی ، دوسرے انسانوں سے ان کے گناہوں کے متعلق باز پرس نہ کی جائے۔

سا داب حیدرآباد
دسمبر ۱۹۸۴

ہم فرانس کے باشندے مسلمانوں کے بہت ہی قریب رہتے ہیں۔ آج: مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے لاکھوں مسلمان فرانس میں رہتے ہیں اور ہمار: سوسائٹی کا جزو بن گئے ہیں، ان مسلمانوں سے میل جول کی بدولت جب میں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ اللہ ہی کو گناہ معاف کرنے پر قادر یقین کرتے ہیں اور سزا و جزا کو انسان کے انفرادی اعمال کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو مجھے ان کے یہ عقائد زیادہ قرینِ قیاس اور قابلِ فہم محسوس ہوئے اور میرے دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ رومن کیتھولک مذہب نے پادریوں کے لوگوں کے گناہ معاف کرنے کا جو اختیار دیا ہے اس اختیار اور عقیدہ نے کہ حضرت عیسیٰ انسانی گناہوں کا کفارہ بنے ہیں، انسانی سماج کو برائیوں سے پاک کرنے کی بجائے اس کی برائیوں کو بڑھایا ہے اور لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے گناہوں کو معاف ہی کرا سکتے ہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے فرزند کو ان کے گناہوں کا کفارہ بنا انھیں سزا سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔

اس کے برعکس اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم ہر انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار قرار دے کر اسے برائیوں کے ارتکاب سے روکتی ہے اور سماج میں توازن اور صحت مندی پیدا کرتی ہے، یہ بات میرے ذہن پر نقش ہو گئی اور اسلام کے ساتھ میری دلچسپی بڑھنے لگی لیکن اس سلسلہ میں ایک اور بات نے بھی مجھ پر بہت زیادہ اثر کیا اور وہ بات یہ تھی کہ میرے آبائی مذہب کے رہنما لوگوں کے ایسے ہی گناہوں کو معاف نہیں کر دیتے جو انھوں نے اپنے خالق اور مالک کے خلاف کیے ہوں بلکہ وہ ایسے گناہوں کو بھی معاف کر دیتے ہیں جو ایک شخص دوسرے لوگوں کے سلسلے میں کرتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص چوری اور خیانت جیسے گناہوں کو بھی پادری صاحب سے معاف کرا سکتا ہے، حالاں کہ چور اور خائن کو یہ خطائیں اُن ہی لوگوں سے معاف کرانی چاہئیں جن کے خلاف اس نے ان کا ارتکاب کیا ہے اس سلسلہ میں میں نے اپنے مسلمان دوستوں سے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو مجھے معلوم ہوا کہ اس مذہب نے انسان کی ذمہ داریوں کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اسلام کی اصطلاح میں یہ دونوں عبادات اور معاملات کہلاتے ہیں

پہلے درجے کا تعلق ان معاملات کے ساتھ ہے جو اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان محدود اور مخصوص ہیں اور دوسرے درجہ میں انسانوں کے باہمی تعلقات کو جگہ دی گئی ہے اور اسلام نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ انسان کے گناہوں کو معاف کرنے پر قادر ہے لیکن اس نے اس بات کو اپنی سنت یا طریق کار بنا لیا ہے کہ وہ انسان کی ان خطاؤں کو جو ایک انسان دوسرے انسان کے سلسلے میں کرتا ہے، اس وقت تک معاف نہیں کرتا، جب تک کہ وہی انسان اسے معاف نہیں کر دیتا جس کے مقابلہ میں ان کا ارتکاب کیا گیا ہو۔

مجھے اسلام کی یہ تعلیم بہت معقول معلوم ہوئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ اگر معقولیت سکون کی زندگی گزارنے کے لیے صحت مند معاشرہ ضروری ہے تو وہ معاشرہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے اور جو شخص بھی اس حقیقت سے واقف ہو جائے اسے ایسے صحت مند معاشرہ کو مضبوط بنانے کی غرض سے اس مذہب کو قبول کرنے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ہدایت ہی تھی کہ جس نے مجھے ان دو باتوں پر غور کرنے کی اور اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

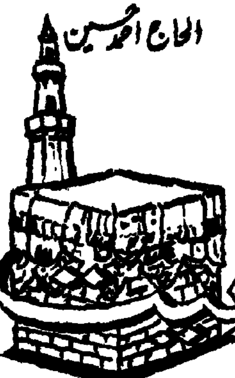
میں عربی نہیں جانتا لیکن فرانسیسی زبان میں اسلام سے متعلق بہت سا لٹریچر موجود ہے اور میں اس کا مطالعہ بھی کرتا رہتا ہوں لیکن اسلام کی صحت پر میرے عقیدہ کو پختہ بنانے میں زیادہ دخل ایسی باتوں کو حاصل ہے جو زندگی میں روزمرہ پیش آتی ہیں اور جن پر بہت کم توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ مثلاً میں ہمیشہ اس بات کو تعجب کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں کہ مشرق اور مغرب کے دور افتادہ گوشوں کے وہ مسلمان جن کی زبانیں، لباس اور رنگ جدا جدا ہیں، جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان میں اختلافات کا کوئی اثر نظر نہیں آتا وہ ایک ہی ساتھ بیٹھ سکتے ہیں ساتھ ہی کھا سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے دوش بدوش کھڑے ہو کر عبادت کر سکتے ہیں۔ میں نے کم از کم اپنے آبائی مذہب کے ماننے والوں میں یہ بات نہیں پائی، اس طرح میں اپنے مشاہدہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام انسانی مساوات کا داعی مذہب ہے۔

پھر میں اپنے مشاہدات ہی کی روشنی میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا ہوں کہ

اسلام امن و سلامتی کا مذہب بھی ہے اور اسی لیے اس نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ انھیں تمام پُرانے پیغمبروں اور مذہبوں کی صحت کا اقرار اور ان کا احترام کرنا چاہیے اور اسلام کی دعوت دیتے ہوئے لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دینی چاہیئے کہ وہی مذہب ہے جس کی تبلیغ و اشاعت تمام سابق انبیاؑ کرتے رہے ہیں۔ ان ہی انبیاء کی طرح داعی اسلامؐ بھی مبعوث ہوئے تھے لیکن چوں کہ اب یہ دین مکمل ہو چکا ہے، اس لیے نبوت اور پیغمبری کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا ہے اور ایک معمولی عقل والا انسان بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰ مبعوث ہو سکتے تھے اور انھوں نے اپنے آخری پیغمبر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تو پھر داعیِ اسلام کے دعوئے نبوت کو کس طرح ناقابلِ یقین کہا جا سکتا ہے ؟

میں خود کو اس بحث کے چھیڑنے کا اہل نہیں سمجھتا کہ محمدؐ عربی آخری نبی اور پیغمبر تھے یا نہیں اور اسلام کے مکمل دین ہونے کا دعویٰ درست ہے یا نہیں لیکن خود میں ان دونوں باتوں پر یقین رکھتا ہوں اور جو شخص بھی اس مذہب اور آنحضرتؐ کی زندگی کا مطالعہ ان دونوں دعوؤں کی روشنی میں کرے گا، وہ ان دعوؤں کی تصدیق کے علاوہ کسی اور نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ (ماخوذ)

کوچنگ سنٹر قائم کیا جائے اور ہر تعلقہ کے مستقر پر کم از کم ایک ایسا کوچنگ سنٹر تو ضرور ہو۔
(۳) اس اسکیم کے لئے سرمایہ اور کام کرنے والوں کی ایک فوج درکار ہوگی۔ سرمایہ کے لئے مسلم وقف بورڈ فلاحی ادارے اور ایجوکیشن سوسائٹیز اس طرف توجہ دیں۔ البتہ کام کرنے والوں کا ملنا مشکل ہے۔ ایسی ہر اسکیمات پر ہم نظری حیثیت سے تو بہت کچھ کہہ سکتے ہیں لیکن اصل کام آکر کرنے والے کے پاس رُک جاتا ہے۔ خود کرنے والوں میں ضروری قابلیت، صلاحیت، دیانتداری اور اخلاص کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے سب وظیفہ یاب حضرات چاہے ان کا تعلق کسی محکمہ سے رہا ہو ان میں بہت سے قابل ترین لوگ پائے جاتے ہیں۔ انھیں وقت بھی ہے۔ فرصت بھی ہے۔ فراغت بھی ہے۔ اگر وہ بچوں کی تعلیم کے کام کو اپنے ہی مقام پر اپنے ہاتھ میں لے لیں تو یہ ملت پر بڑا احسان ہوگا۔ دیکھنے میں یہ کام بظاہر چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن یقین مانئے بنیادی طور پر اس سے زیادہ عظیم الشان کام اس وقت کچھ اور نہیں ہے۔ اب ہم میں کوئی بہت جلد سرسید کے پیدا ہونے کی توقع بھی بہت کم ہے لیکن اس عظیم دانشور "سید" کے کام سے اپنا نام وابستہ کیا جا سکتا ہے۔



حج بیت اللہ مبارک

(اس سفرنامہ میں فرقہ سلیمانیہ کے طریق حج کا ذکر کیا گیا ہے)

یہ چاند ستاروں کا نگر کس کے لئے ہے
بہتے ہوئے جھرنوں کا سفر کس کے لئے ہے
وہ کون ہے بر بہر ہے جس کے لئے سجدہ
یہ دست دعا دیدۂ تر کس کے لئے ہے
جو صبر و رضا بن کے زمیں بوس ہوا تھا
شبیر کا وہ سجدہ و سر کس کے لئے ہے
ہر لحظہ طوافوں میں بسر ہو جہاں زلیخی
چوکور سیاہ پوش وہ گھر کس کے لئے ہے

چوکور سیاہ پوش گھر کے مالک! گناہگار بندے تیرے دربار میں لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ پکارتے ہوئے حاضر ہوئے ہیں۔ سجدۂ عبودیت گزرانتے ہیں اور عفو و مغفرت کے طلبگار ہیں۔ غفور و رحیم! گناہگار بندوں کا سجدۂ عبودیت قبول فرما اور نواز دے انھیں اپنی عفو و مغفرت سے۔ وعدہ بھی تو کیا ہے تو نے اس کا اور تجھ سے بڑھ کر وعدہ وفا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔

سبّوح قدوس! درود و سلام بھیج اپنے اس برگزیدہ بندہ پر جس کو تو نے اپنا رسول بنا کر بندوں کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ جس کو اعلانِ حج کا حکم دیا اور فرمایا کہ انھیں فریضۂ حج سمجھاؤ۔ مناسک حج کی تعلیم دو تاکہ وہ حج کر کے عفو و مغفرت حاصل کریں اور اس حد تک پاک و صاف بن جائیں جیسے نوزائیدہ بچہ۔ انتہا کر دی اپنے فضل و کرم کی۔

ذوالجلال والاکرام! درود و سلام بھیج اشرف الاوصیاء پر جن کی مولائیت کا اعلان کئے بغیر دین کی تکمیل نہ ہو سکی۔ صاحب سیف و قلم و مشکل کشا ر عالم۔ جب قلم ہاتھ میں لیا تو علم و حکمت کے دریا بہا دیے۔ اور جب ذوالفقار کو بلند کیا تو پہلوانوں کے دل ہلا دیے۔ مشکل پڑتا ہے تو اپنے اور پرائے سب انھیں کو پکارنے لگتے ہیں۔ بقول ؎

عمر ساری کٹی مشکلوں میں مگر
ساری دنیا کے مشکل کشا ہو گئے

اکرم الاکرمین ! درود و سلام عظیم شہزادی رسول بی بی خیر الانام حضرت فاطمہ بتول پر
ام الائمۃ الطاہرین، مومنین کی مادر مہربان جن کا آستانہ پاک دعاؤں کی قبولیت کا خاص مقام ہے
احد و صمد ! درود و سلام عظیم دو شہزادے حسن و حسین پر جنھیں رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے اپنے عین حیات حق کے امام مقرر فرمادیا چاہے وہ اپنے حق سے قیام کریں یا نہ کریں۔
تمام جوانان جنت کا سردار بنایا۔

رب العالمین ! درود و سلام عظیم ائمہ طاہرین پر جو خدا کی وہ مضبوط رسی ہیں جس کو
تھامے بغیر صراط مستقیم پر چلا نہیں جاتا۔ کشتی نجات ہیں جو گمراہی کے دریا میں ڈوبنے سے بچانے والی ہے
احکم الحاکمین ! درود و سلام عظیم صاحب عصر والزماں پر جن کی معرفت حج اکبر ہے۔
اور ان کے آنے والے عظیم جانشینوں پر۔

الحمد للہ سعادت حج اس سال بھی ملی اور اتنی ساری مشکلوں کے باوجود ملی۔ ان
مشکلوں کے حل کے لئے میں نے سجدہ ریزیاں کیں کیونکہ ان میں تمام مشکلوں کا حل مل جاتا
ہے۔ بقول ؎

گر یزاں کشتی و ساحل سے ہر طوفاں ہو جائے　　کٹھن راہوں پہ منزل کا سفر آساں ہو جائے
شعاع نور سے تاریکیاں دنیا کی روشن ہوں　　در حق پر اگر سجدہ گزار انساں ہو جائے

اور میں نے اپنی دعاؤں میں وسیلے بھی لئے تھے اس کے حبیب، ان کے وصی اور ان کے
آل اطہار کے۔ اور مالک نے میری ساری مشکلیں حل فرما دیں یعنی مجھے اجازت حج مرحمت ہوئی۔
اگرچہ کہ ملک کے قانون کے تحت مجھے حج کی اجازت نہیں مل سکتی تھی تو مجھے جدہ / مکہ آنے
جانے کی خاص پرمٹ مل گئی۔ اور جب ۷ / ذوالحجۃ الحرام کو حج کے لئے عرب بھائیوں کے ساتھ
روانہ ہوا تو مرکز تفتیش پر اس خصوصی پرمٹ کو دکھانے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ صرف
آنا جانا نہیں ہوا بلکہ وقوف عرفات، شب مزدلفہ، ایام منیٰ، رمی جمار، طواف حج و افاضہ
طواف نساء اور طواف وداع سب وقت وقت پر اور آسانی سے کر لئے گئے۔ بڑا
شدید تھا موسم کا کہ شدت کی گرمی ہوگی کیوں کہ یہاں کی بھر گرمی کا موسم تھا۔ مگر مالک نے اپنا
فضل و کرم کر دیا تو سارے مناسک آسانی سے ادا ہو گئے۔ اور وقت پر۔ اور سب حاجی
بھائی اور بہنیں کامیاب اور فائز المرام فریضۂ حج ادا کر کے لوٹے۔ الحمد للہ۔ فالحمد للہ

ہندوستان	پاکستان ۔ کراچی	
۱۔ الحاج عمران حاجی صاحب	۲۔ الحاجہ محمودہ اہلیہ عمران حاجی صاحب	۳۔ الحاج مخلص محسن صاحب
		۴۔ الحاجہ آنسا اہلیہ مخلص صاحب

۵۔ الحاج غلام علی شجاع الدین صاحب صوفی
۶۔ الحاجہ سکینہ اہلیہ غلام علی صاحب صوفی
۷۔ الحاج مظفر حسین شجاع الدین صاحب صوفی
۸۔ الحاجہ نسیم اختر اہلیہ مظفر حسین صاحب صوفی

کویت

۹۔ الحاج ڈاکٹر طیب الشیخ المنصور عفت شاکر صاحب
۱۰۔ الحاجہ طیبہ بی بی اہلیہ ڈاکٹر طیب صاحب
۱۱۔ الحاج محمد الیاس یوسف نورانی صاحب
۱۲۔ الحاجہ آمنہ بی بی اہلیہ محمد الیاس صاحب
۱۳۔ الحاجہ شگفتہ دختر محمد الیاس صاحب

سیام ۔ بنگ کاک

۱۴۔ الحاج برکت الثقلین صاحب
۱۵۔ الحاجہ نفیسہ اہلیہ برکت الثقلین صاحب
۱۶۔ الحاج عامر طاہر صاحب سیام والا
۱۷۔ الحاجہ سعیدہ بی بی اہلیہ عامر صاحب
۱۸۔ الحاج عمران طاہر صاحب سیام والا
۱۹۔ الحاج مظفر حسین اشرف الحسین صاحب
۲۰۔ الحاج سیف اللہ بن برالعالی صاحب
۲۱۔ الحاجہ مریم بی بی بنت غیاث الدین صاحب

لندن

۲۲۔ الحاجہ ڈاکٹر زینب امام بخش صاحب

امریکہ

۲۳۔ الحاج ڈاکٹر عبدالعلی امام بخش صاحب
۲۴۔ الحاجہ ڈاکٹر ... اہلیہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب

دبئی

۲۵۔ الحاج مقیم ولد احمد حسین صاحب
۲۶۔ الحاجہ زاہدہ بی بی اہلیہ مقیم صاحب

سعودی عرب ۔ ریاض

۲۷۔ الحاج ڈاکٹر عنایت حسین ولد شفقت حسین صاحب
۲۸۔ الحاجہ عابدہ اہلیہ ڈاکٹر عنایت حسین صاحب
۲۹۔ الحاجہ عفت بی بی دختر ڈاکٹر عنایت حسین صاحب
۳۰۔ الحاج العزیز عارف ڈاکٹر عنایت حسین صاحب
۳۱۔ الحاجہ عفری بی بی دختر ڈاکٹر عنایت حسین صاحب
۳۲۔ الحاجہ عصمت بی بی دختر ڈاکٹر عنایت حسین صاحب

دمام ۔ الجبیل

۳۳۔ الحاج زاہد امین الدین صاحب

نجران

۳۴۔ الحاج آصف نجران حمامی صاحب
۳۵۔ الحاج عطا محمد المعز علی سلیمانی صاحب
۳۶۔ الحاج منصور علی ناصر علی صاحب
۳۷۔ الحاج اختر حسین اشرف حسین صاحب تاج

جدہ

۳۸۔ الحاج احمد خورشید حسن
۳۹۔ الحاج مشتاق حسین ممتاز حسین صاحب
۴۰۔ الحاج منور حسین ممتاز حسین صاحب

میں جدہ سے بعد عصر روانہ ہوا۔ اور قبل مغرب مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ رباط جاکر سامان رکھا۔ غسل بہ نیت دخول الحرم کرکے نماز مغرب پڑھ کر عرب بھائیوں کے ساتھ حرم پاک پہنچا۔ طواف میں بے حد ہجوم تھا اور چھٹے پھیرے تک عشاء کی اذان آگئی۔ نماز عشاء پڑھ کر طواف ختم کیا اور سعی شروع کی ختم کرنے تک ساڑھے دس ہو چکے تھے۔ رباط آکر کچھ کھایا پیا اور سو گئے۔

۸/ذی الحجۃ الحرام ۔ یوم چہارشنبہ : آج یوم الترویہ یعنی حج کی ابتدا کا دن ہے۔ صبح جلد اٹھ کر تطوعات اور تسنیع پڑھیں۔ پھر حاجی بھائیوں کے ساتھ حرم شریف اس وقت پہنچے جب عوام نماز فجر پڑھ کر باہر آرہے تھے۔ نماز فجر اور دعائیں پڑھ کر رباط واپس آئے۔ کچھ دیر بعد سیدی محسن بن علی کو ملنے گیا۔ بعد ملاقات آپ نے سیدنا المالکؒ کا مشرف اور اعلان بتلایا جس میں سیدنا الداعیؒ نے سیدی محسن بن علیؒ کو قائد الحج مقرر فرمایا تھا اور مرتبہ میں سیدنا المنصوب حسین بن اسمٰعیل کے بعد مقرر فرمایا تھا یعنی آپ کو مناصب پر مقدم کیا گیا تھا۔ حکم حضرت الداعیؒ پر سمعاً و طاعۃً کہا اور تبریک و تہانی حضرت المنصوب الحسین بن محسن نائلؒ کی خدمت میں پیش کی۔ پھر حضرت المنصوب حسین بن اسمٰعیل کے پاس گیا۔ آپ نے سب

اخوان کی خیروعافیت پوچھی۔ اور سب کے لئے دعائے خیر کی۔

منیٰ جانے کے لئے دوپہر کے بعد مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ نماز ظہر سے دو گھنٹہ قبل سب اخوان نے غسل کرکے احرام کے کپڑے پہن لئے۔ اور حرم شریف نماز ظہر سے ایک گھنٹہ پیشتر پہنچ گئے۔ اذان ہوتے ہی سب نے نماز ظہر پڑھ لی۔ اور کچھ وقت بعد میزاب رحمت کے مقابل آگئے۔ دو رکعت نماز بہ نیت الصعود الی جبل عرفات پڑھی۔ پھر نیت اور احرام کی دعا پڑھ لی۔ اس مرتبہ حطیم کے اندر جانا ممکن نہ ہوا گیا اور اخوان و خواتین سب نے میزاب رحمت کے نیچے دیوار کعبہ سے لگ کر دعا پڑھی اور خوش خوش باہر آئے۔ کیونکہ ایسا موقعہ مشکل سے ملتا ہے۔ دھوپ تیز تھی۔ پہلے خوب سا زمزم پیا اور پھر سے میزاب رحمت کے سامنے آکر نماز عصر پڑھی اور رباط واپس ہوئے۔ سامان پہلے ہی تیار کرلیا تھا۔ کھانا کھا کر تیار ہوگئے اور کچھ دیر بعد سامان اتارنا شروع کردیا۔ ساڑھے تین کے قریب گاڑیوں میں بیٹھ کر منیٰ کے لئے روانہ ہوگئے راستہ میں تلبیہ کہتے جارہے تھے۔ اور چونکہ بھیڑ نہیں تھی جلد منیٰ میں خیموں پر پہنچ گئے۔ اس مرتبہ منیٰ میں اکثر جگہوں پر الکٹرک کنکشن آگیا تھا۔ تو خیموں میں گیس کے لیمپ کی بجائے نیون لائٹ لگی ہوئی تھی۔ اور الکٹرک کے پنکھوں کا انتظام بھی سیدنا المالک اللہ کی طرف سے کردیا گیا تھا۔ ہمارے خیمہ کا بٹوارہ ہوگیا ہوگیا تھا۔ اس طرح کہ ایک طرف سندھی بھائی بیٹھ گئے تھے اور آدھا حصہ یا کچھ کم ہمارے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اتنی جگہ ہمارے لئے بہت کم تھی۔ مگر حج میں ان باتوں کا خیال نہیں کیا جاتا۔ کہہ سن کر تھوڑی جگہ اور لے لی اور بستر جمالئے۔ نماز باجماعت پڑھنے کے لئے ایک بڑا خیمہ مخصوص کردیا گیا تھا۔ وہاں جاکر ہم نے نماز حضرت المنصوب حسین ابن اسمٰعیل اللہ کی امامت میں پڑھی۔ بعد نماز مغرب سیدنا المالک اللہ کا شرف اور اعلان پڑھ کر سنایا گیا جس میں آپ نے سیدی حسن بن علی کو حج کی قیادت سونپی تھی اور آپ کو حضرت المنصوب حسین بن اسمٰعیل کے بعد شیموں پر مقدم کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ سیدنا المالک اللہ نے سب اخوان کو مبارکباد تی حج دی تھی۔ اور دعائے خیر سے نوازا تھا۔

بعد نماز خیمہ پر آئے۔ کھانے میں قیمہ اور چاول کا انتظام تھا۔ مگر قیمہ راس نہیں آیا اور کئی بھائیوں کو "لینے کے دینے پڑ گئے" والا معاملہ پیش آیا۔ بہرحال کھاپی کر رات گزار لی۔

<u>۹/ ذوالحجۃ الحرام۔ یوم جمعرات۔ وقوف عرفات</u>: صبح جلدی سے اٹھ کر فارغ ہوئے اور وضو کرکے نماز پڑھنے آگئے۔ حضرت المنصوب حسین اللہ نے نماز فجر پڑھائی۔ بعد نماز بہت سے بھائی بہنوں نے حکومت کے بنائے ہوئے حمامات میں جاکر غسل یوم عرفہ کرلیا۔ اور کچھ کھاپی کر میدان عرفات جانے کی تیاری کرلی۔ سات بجے کے قریب گاڑیوں میں روانہ ہوئے اور ساڑھے آٹھ تک میدان عرفات میں خیموں تک پہنچ گئے۔ یہاں بہت بڑی جگہ روک کر احاطہ بندی کرلی تھی اور اوپر سایہ کردیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ جگہ

ہوتا چلا گیا۔ اور نماز ظہر تک اتنا بھر گیا کہ مزید گنجائش نہ رہا۔ اندازہ تھا کہ مجمع کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ ہوگی اور یہ سب ہمارے بھائی تھے۔ نماز ظہر سے ایک گھنٹہ پہلے تک کھایا پیا اور آرام بھی کیا۔ جنہوں نے غسل نہیں کیا تھا وہ غسل کر آئے۔ مگر سب وقت سے پہلے باوضو تیار ہو بیٹھے۔ الکٹرک کا انتظام یہاں بھی تھا اور پنکھے چل رہے تھے۔ پھر بھی موسم کافی گرم تھا۔ نماز ظہر و عصر قصر سے با جماعت پڑھی گئیں۔ اس کے بعد موقف عرفہ کی دعا۔ اور پھر سب لوگوں نے یوم عرفہ کی دعائیں پڑھنا شروع کیا۔ ہم لوگ اب جبل رحمت نہیں جاتے کیونکہ وہاں کا خاص موقف توڑ دیا گیا ہے۔ اس لئے دعائیں سب خیموں میں بیٹھ کر ہی پڑھ لیتے ہیں۔ بڑی دعائیں ہیں یہاں پڑھنے کی اور پڑھتے ہوئے قریب پونے چار ہو گئے۔ دعائیں ختم کر کے اور دعائیں مانگ کر سب اخوان ایک دوسرے سے ملے۔ مصافحہ کیا اور مبارکبادی حج دی ا لی۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب یہاں سے مسجد نمرہ کو روانہ ہوئے جو عرفات کی خاص مسجد ہے۔ مغرب ہونے پر یہاں سب لوگوں نے نماز شکر پڑھی اور دعا پڑھ کر باہر نکل آئے اور چلتے ہوئے اس جگہ آئے جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بعض بھائی اور بہنوں کی طبیعتوں پر کچھ موسم نے اور کچھ غذا نے اثر کیا تھا۔ مگر سب نے ہمت سے کام لیا۔ اور موقع سنبھال لیا۔ عرفات سے مزدلفہ آتے آتے ہوئے وقت زیادہ لگا اور پہنچے تو ساڑھے دس ہو چکے تھے۔ ٹھیرنے کو جو جگہ ملی وہ مسجد سے دور تھی اور تھکے ہوئے اتنے تھے کہ مسجد جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہیں پر نماز مغرب اور عشا بالقصر پڑھی۔ کنکریاں چنیں اور باندھ لیں اور کچھ کھا پی کر سو گئے۔

<u>۱۰/ ذی الحجۃ الحرام۔ عیدالاضحیٰ۔ یوم جمعہ:</u> صبح جلدی سے اٹھ کر فارغ ہو لئے اور وضو کر لی۔ یہاں آج کے دن شفع نہیں پڑھی جاتی۔ ہم لوگ روانہ ہو کر مسجد مشعر حرام پہنچے تو نماز فجر کے لئے جماعت کھڑی ہو رہی تھی۔ مسجد بھر گئی تھی تو نماز ختم ہونے تک ہم لوگ باہر ٹھیرے رہے۔ نماز ختم ہوئی تو اندر پہنچے۔ اور اب جو جماعت کھڑی ہوئی اس کی امامت ہمارے منصوب کر رہے تھے۔ ان کی امامت میں نماز پڑھی اور بعد نماز دعاء مسجد مشعر حرام پڑھ کر اپنی جگہوں پر آ گئے۔ سامان گاڑیوں پر لاد دیا گیا اور بعد طلوع شمس جب روانگی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ملا برکت صاحب جو ہمارے بعد مسجد مشعر حرام گئے تھے واپس نہیں ہوئے ہیں اور چونکہ نماز میں اتنی دیر نہیں ہو سکتی وہ یقیناً راستہ بھول کر کسی اور طرف نکل گئے ہوں گے۔ اب ان کو چھوڑ کر تو منیٰ جا نہیں سکتے تھے۔ اور عرب بھائی گاڑی چلانے والے شور مچا رہے تھے کہ تم لوگ اس طرح دیر کرو گے تو ہم بھی ہمارے ارکان پورے نہ کر پائیں گے۔ بالآخر جب ان کا تقاضا بہت ہوا تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ تم اخوان اور خواتین کو لے کر جاؤ اور ملک فیصل کے پل کے نیچے انہیں بٹھا کر اپنے

تمام پورے کر آؤ۔ میں اور سیام والے بھائی اور دو نوجوان ٹھیر جاتے ہیں اور جب ملا برکت صاحب آجائیں گے تو ان کو لے کر آجائیں گے اور سب ہم مل جائیں گے۔ چنانچہ وہ سب اور اہلیہ ملا صاحب تیار ہوکر روانہ ہوئیں۔ ہم لوگ کچھ اپنی جگہ ٹھیرے اور کچھ بڑے مسجد کو روانہ ہوئے۔ بڑی طرح جد ہی تھی ملا صاحب کی۔ ان کی طبیعت بھی درست نہیں تھی۔ بہرحال خدا خدا کرکے کوئی پونا گھنٹہ بعد "یوسف گم گشتہ" اپنے ایک بھائی کے ساتھ آتے ہوئے نظر آئے۔ کتنا بڑا بوجھ تھا سینہ پر جو اتر گیا۔ اور مالک نے سب کو ہنسا کر دیا۔ غریب معافی مانگنے لگے کہ ان کی وجہ سے ہم سب کو تکلیف اٹھانی پڑی۔ ہوا یوں کہ نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو غلط راستے پر چل پڑے اور کافی دور جاکر جب ان کو ایسا لگا کہ وہ راستہ بھول گئے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ پھر مسجد آگئے جہاں ہمارا ایک آدمی ان کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اور ان کو لے کر آیا۔

ان کے آنے کے بعد ہم لوگ ملک فیصل کے پل کو روانہ ہوئے جو قریب ہی تھا اور وہاں پر ہمارے سب بھائی بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد ہم سب نے فرداً فرداً نماز عید پڑھی اور پھر کچھ کھایا پیا۔ آرام کیا اور عرب بھائیوں کا انتظار کیا۔ کچھ وقت بعد وہ بھی آگئے اور ہمیں خیموں پر پہنچا دیا۔ قربانی کا وقت تو گذر چکا تھا البتہ بڑے جمرے کو مارنے جانا تھا۔ چنانچہ دن ڈھلتے یعنی ۵½ بجے نکلے اور آہستہ آہستہ بڑے جمرے کے پاس آگئے۔ بھیڑ کم تھی تو سب نے جمرہ کو آسانی سے مار لیا اور پھر دعا پڑھ کر مسجد خیف کو روانہ ہوئے وہاں پہنچنے تک مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ نماز ختم ہوئی تو مسجد میں جاکر نماز مغرب اور عشاء بالقصر پڑھی اور باہر آئے۔ کچھ کھانے کا بندوبست کیا۔ کھانا لے کر خیموں پر آئے۔ کھایا اور سو گئے۔

۱۱ ذی الحجۃ الحرام۔ اول یوم ایام تشریق۔ یوم جمعہ: ارکان کے لحاظ سے آج کا دن ہمارے لئے بہت اہم تھا۔ نماز فجر کے بعد ہی ہم نے قربانی کی لسٹ اور پیسے دے دئے اور عرب بھائیوں کو ذبیحت کے لئے بھیج دیا۔ چار اونٹ کی ذبیحت تھی۔ عرب بھائی جلد جلد سے قربان گاہ گئے اور قریب پونے آٹھ بجے قربانی کا گوشت چار علیحدہ علیحدہ تھیلیوں میں رکھ کر لے آئے جو اول بدل کر دے دی گئیں۔ جلد جلد گوشت بھونا اور انتظار کرکے اور کچھ کھا پی کر روانگی کی تیاری کر لی۔ پہلے جمرے مارنے گئے۔ آج سے تین دن تینوں جمروں کو سات سات کنکریاں مارنا ہیں۔ چنانچہ پہلے چھوٹے کو مارا۔ پھر اوسط کو اور پھر بڑے کو۔ آخری جمرہ کو مار کر اور دعا پڑھ کر باہر نکلے اور سر منڈانا شروع کیا۔ کئی حجام مل گئے۔ بال کٹوا کر اکٹھا کر لئے۔ منیٰ میں دفن کرنے کے لئے۔ پھر لاری میں بیٹھ کر مکہ آئے اور رباط پہنچ گئے۔ آتے ہی صاحب نے یکے بعد دیگرے غسل کرنا شروع کر دیا اور

احرام اتار کر اپنے کپڑے پہن لئے۔ کچھ کھایا پیا اور کچھ دیر آرام کر کے حرم شریف آگئے۔ پہلے نماز ظہر پڑھی اور پھر طواف حج وافاضہ شروع کیا۔ بڑا ہجوم تھا۔ مگر طواف تو بہرحال دینا تھا وہ دے دیا۔ اور طواف نماز عصر پڑھی اور سعی کے لئے آگئے۔ اور انہیں کپڑوں میں سعی کی اور طواف حج پورا کر لیا۔

اب بھیڑ زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ مگر طواف النسار باقی تھا وہ شروع کر دیا۔ بے حد ہجوم تھا۔ پہلے بھی گئے اور دیر بھی لگی اور طواف ختم ہونے تک مغرب کا وقت آگیا۔ چنانچہ مغرب وعشاء پڑھ کر رباط آگئے

چونکہ کوئی ایک حجاج عبدالقدیر سے پہلے روانہ ہونے والے تھے ڈاکٹر طیب صاحب نے منصوب حسین بن اسمٰعیل سے مقرر کر لیا تھا کہ ۱۲ تاریخ کو صبح ۸ بجے سب کا عہد لیں گے۔ اب ایسا لگا کہ یہ تو ممکن نہ ہوگا کیونکہ منٰی جا کر صبح آنا جلد واپس آنا ہو نہیں سکتا تھا۔ تو میں نے سیدی المنصوب کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ عہد شریف کے لئے کوئی اور وقت مقرر کریں۔ اور آپ نے حکم دیا کہ تم سب غسل کر کے ابھی آجاؤ۔ چنانچہ سب اخوان واخوات جلد جلد غسل کر کے تیار ہو گئے اور مشرف بعہد شریف ہوے۔ الحمدللہ۔

کافی تھکے ہوئے بھی تھے اور بھوکے بھی۔ اور ہمارے جوان بھائی خوب مزے دار کھانا لے آئے جس کو بھوک نے دوہرا مزے دار کر دیا تھا۔ سب نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اس کے بعد قریب ساڑھے دس بجے منٰی کو روانہ ہوے۔ سونے تک پونے بارہ کا عمل تھا۔

۱۲/ذوالحجۃ الحرام۔ نفر اول۔ یوم الاتوار: آج آرام کا دن ہے۔ تین جمروں کو مارو۔ نماز مفروضہ پڑھو اور آرام کرو۔ البتہ اگر کوئی ضرورت کے تحت جانا چاہے تو بعد نماز ظہر جمرے مار کر چلا جائے تیرہ تاریخ کے ۲۱ جمرے منٰی میں دفن کر کے۔ چنانچہ ڈاکٹر زینب، ان کے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی اور ان کی بیوی ڈاکٹر وسیم دوپہر کو نماز پڑھ کر روانہ ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جمرے مارنے کے بعد ان کو گاڑی نہیں ملی تو یہ سب کچھ دیر آرام کر کے پیدل رباط پہنچ گئے اور طواف وداع کر کے جدہ چلے گئے۔ ہم لوگ دن ڈھلے جمرے مارنے روانہ ہوے۔ آسانی سے جمرے مارے گئے۔ اس کے بعد مسجد خیف آ کر مغرب وعشاء پڑھی اور باہر آ کر کھانا لے کر خیموں پر آئے اور کھانا کھا کر سو گئے۔

۱۳/ذوالحجۃ الحرام۔ نفر ثانی۔ یوم پیر دوشنبہ: گئی کل سونے سے پہلے ہی سامان اکٹھا کر لیا تھا۔ نماز فجر پڑھی اور بستر اور سامان باندھ لیا۔ چائے پی اور کچھ کھا پی کر سامان لے کر باہر آگئے اور لاریوں میں لادنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تو لگی روانہ ہوتے ہوے مگر چلے تو جلد ہی جمروں تک آگئے۔ میدان تقریباً صاف تھا کیونکہ لوگ تو اکثر گئی کل ہی جا چکے تھے۔ جلد ہی جمرے مار لئے گئے اور گاڑیاں تیار تھیں تو مکہ معظمہ رباط آگئے۔ اب طواف وداع کرنا باقی تھا۔

اور پھر جدہ کو واپسی ۔ رباط پہنچ کر پہلے سیدی المنصوب محسن بن علی کے پاس جاکر واپسی کی اجازت لی اور پھر حضرت المنصوب حسین سے اجازت لی ۔ تھکان کی وجہ سے وقت کچھ زیادہ لگا مگر ٹھیک ۹ بجے تک طواف وداع کے لئے نکل آئے ۔ طواف کا حلقہ حرم شریف کے تہائی حصے کو گھیرے ہوئے تھا ۔ ایسے ہجوم میں اندر سے طواف بہت مشکل تھا ۔ باہر باہر سے طواف دے لیا ۔ دیر تو لگی اور اس پر کافی دھکے کھائے ۔ وہ تو خدا بھلا کرے نوجوانوں کا جو مجھے اور خواتین کو حلقہ میں لے کر چل رہے تھے ورنہ اکیلے ہوتے تو معلوم نہیں کیا حال ہوتا ۔ بہرحال طواف وداع ختم کیا ۔ دعاء وداع پڑھی اور "خدا یا این کرم بارِ دگر کن" کہتے ہوئے رباط آئے ۔

صد شکر و امتنان بارگاہ ذوالجلال والاکرام میں جس نے حج کی سعادت سے نوازا ۔ درود وسلام اس کے حبیب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر، ان کی وحی قرآن عظیم پر اور ان کی آل اطہار پر جن کے وسیلے سے ساری مشکلات آسان ہوگئیں ۔ والحمدللہ رب العالمین ۔

سب اخوان وخواتین کا مجھے تعاون حاصل رہا اور بڑی کرامت اور عزت دی انھوں نے مجھے ۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ معزز ومکرم رکھے ۔ خیروعافیت کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس ہوں ۔ اور اپنے بال بچوں اور عزیزوں کے ساتھ شاد وآباد رہیں ۔ الٰہ العالمین ہمارے آقا ومولیٰ حضرت داعی کا اور صاحب کرام کا سایۂ ہمایونی دراز فرمائے ۔ مومنین اور ابنائے دعوت ان کے زیر سایہ پھلے پھولے رہیں ۔ سب آفات وآلام سے سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھنا ۔ آمین یا الٰہ العالمین ۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین ۔

معلوم ہے سب کو کہ میں سفرنامۂ حج لکھا کرتا ہوں تو مجھ سے کہا گیا کہ کچھ خاص باتیں حج سے متعلق بھی لکھوں جو آئندہ کام آئیں ۔ کسی حج کے لئے پہلے سے یہ لکھنا کہ یہ مشکلات پیش آئیں گی یہ تو ذرا مشکل بات ہے کیونکہ حالات یکساں نہیں رہتے ۔ کچھ باتیں جو ضروری ہیں جن کا تعلق مناسک حج سے ہے اور کچھ وہ جن سے سفر حج آسان ہوتا ہے وہ مختصراً یہ ہیں : ۔

۱ ۔ حاجی جو بھی آئے وہ یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ یہاں آکر اور دوران سفر حج میں اس کو کھانے پینے کی اور رہنے سہنے کی وہ سہولتیں حاصل نہ ہوں گی جن کا وہ عادی ہے ۔ چونکہ حج کے دنوں میں حالات ہنگامی ہوتے ہیں تو رہنے کے لئے اور کھانے پینے کے لئے جو بھی ملے اور جیسا بھی ملے، جب بھی اور جہاں بھی اس کو گوارا کرنا ہے اور وہ بھی صبر وشکر کے ساتھ شکایت کئے بغیر ۔

۲ ۔ اپنے حاجی بھائیوں کے ساتھ تعاون حتی الامکان ضروری ہے ۔ چاہے وہ مالی طور پر ہو چاہے ذاتی طور پر ۔ تعاون دونوں صورتوں میں یکساں ضروری ہے ۔ اس کے علاوہ

لا پکو جذبۂ ایثار کو کام میں لینا چاہیے یعنی اپنے بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم کرنا اور ترجیح دینا اس اصول کے تحت کہ His need is greater than mine

۳۔ دوران حج پابندیٔ وقت ضروری ہے۔ مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے تیار ہو جاؤ اور معلم کے ساتھ رہو۔ ہر حاجی کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی ایک کی وقت کی پابندی نہ کرنے سے اس کے تمام ساتھی بھائیوں کو دیر ہوتی ہے اور دیری ان کی تکلیف کا باعث بن سکتی ہے۔ [illegible] اہم مناسک حج کی ادائیگی [illegible] توجہ اور یکسوئی چاہتی ہے۔ مناسک حج کے ادا کرنے کا وقت آئے تو خیال رہے تو صرف ان کو کامل طور پر ادا کرنے کا۔ ان اوقات میں ہنسی مذاق، باتیں بے توجہی، اور غیر متعلق باتوں کی طرف دھیان یہ آپ کے مناسک کو صحیح طور پر ادا ہونے نہیں دیں گے اور اس سے آپ کے حج میں نقص پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ یہ چار باتوں کو سمجھنا اور ان پر عمل سفر حج اور مناسک حج کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے۔

اعداد و شمار حجاج جو بیرونی ممالک سے اس سال حج کو آئے وہ یہ ہیں :-

لبنان	4298	قطر	1125	چین	2267	بورکینا فاسو	822	مالاگاسی	16
سوریا	15803	بحرین	4561	برونی	2954	تنزانیا	937	جنوبی آئرلینڈ	347
مصر	98606	صومالیہ	4487	سنگاپور	2873	کینیا	725	دوسرے افریقی ممالک	122
عراق	14551	موریتانیا	1243	فلپین	1323	موریشس	363	امریکہ	992
سوڈان	28724	جیبوتی	444	تھائی لینڈ	1685	اوگانڈا	188	یونان	159
لیبیا	14509	عمان	12804	دیگر ایشیا	707	جامبیا	425	یوگوسلاویہ	769
اردن	17165	ترکی	54624	بنین	425	تشاد	1720	کناڈا	386
یمن	43512	ایران	152149	نائجیریا	29899	گینیا	851	فرانس	510
الجیریا	28093	ہندوستان	39344	سینیگال	2501	گھانا	990	برطانیہ	3336
یمن جنوبی	6852	بنگلہ دیش	13631	نائجیر	1465	ٹوگو	250	ہالینڈ	125
امارات متحدہ	6549	انڈونیشیا	59172	ایتھوپیا	947	جنوب افریقہ	2498	آسٹریلیا	338
مراکش	22912	افغانستان	4603	مالی	2092	آیوری کوسٹ	1090	دیگر ممالک	538
فلسطین	2657	النیریا	26043	لیبیریا	121	سیرالیون	30	مجموعہ حجاج ۱۴۰۷ھ	856718
								۱۴۰۶ھ	851761
کویت	8398	پاکستان	92305	کامرون	1233	زامبیا	55	اضافہ ۱۴۰۷ھ میں	4957
برونسی	6807	سری لنکا	1314	جاپان	162	وسط افریقہ	207	ممالک جو سعودیہ میں مقیم ہیں اور جن کو اجازت ملی ان کی تعداد	227098

محمد اسحاق ایم-اے، ایم ایڈ

مسلم طلباء کیلئے کوچنگ سنٹرس کے قیام کی اہمیت

مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر چند دنوں سے اچھے مضامین شائع ہو رہے ہیں مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پستی کے اسباب کا اعداد و شمار کی روشنی میں تجزیہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ عملاً اس وقت کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ تعلیم کا مسئلہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی زبان میں سیاست کی طرح کوئی پہاڑی نالا نہیں ہے جو اچھلتا کودتا کہیں وادی میں جا گرتا ہے۔ تعلیم تو ایک خاموش دریا ہے جو اطراف و اکناف کی وادیوں کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مگر اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تعلیم کا کام بڑا صبر آزما ہوتا ہے اور برسوں کی مسلسل کوشش کے بعد اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس میں بعض حضرات جتنی جلد بازی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی انہیں مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں تعلیم نہیں وہاں غربت و جہالت، افلاس و نکبت، بے روزگاری و بے کاری، بدقسمتی اور فاقہ مستی وقت گزاری و نامرادی، تنگ نظری و تعصب، ایک ہی مقام سے وابستگی و پابہ زنجیری عام روگ ہیں اور یہی وہ اسباب ہیں جو کئی ایک معاشی و معاشرتی اور سیاسی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ ان کا مداوا حکومت اور لیڈروں قومی و فنی مسائل کے طور پر حل کرنے میں بہت وقت اور توانائی ضائع کرتے ہیں لیکن مسائل جوں کے توں رہ جاتے ہیں۔ ان سب کا علاج صرف ایک اور ایک ہی ہے وہ ہے تعلیم کا عام کرنا تعلیم ہی ایک ایسا پارس ہے جو خود انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے اور ایسا کمال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ جوہر قابل دوسروں کو بھی پارس بنا سکتا ہے

کچھ دنوں پہلے جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ مدینہ پبلک اسکول میں "مسلمانوں کے تعلیمی مسائل" پر ایک نہایت جامع اور پر مغز تقریر کی تھی۔ جس میں ایک بات تو لکھنے کی یہ ہے کہ سرسید کے انتقال کو آج ۸۸ برس

پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، بنجارہ ہلز

ہو گئے۔ لیکن سرسید کے بعد پھر کسی مسلم دانشور یا لیڈر نے کبھی مسلمانوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ آپ نے بتلایا کہ ایک عرصہ سے تعلیم کے شعبے سے وابستگی کی وجہ اور سارے ہندوستان کی سیر کے بعد وہ خود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے اہم تعلیمی مسائل کیا ہیں۔ موصوف نے مندرجہ ذیل مسائل کی نشاندہی کی۔

۱) مسلم طلباء کے لئے کوچنگ سنٹرس کا قیام۔

۲) مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دینا۔

۳) مسلمان ماں باپ اپنے بچوں کو گھر پر پڑھانے کے لئے اپنی دوسری مصروفیات کو کاٹ کر کم از کم ایک گھنٹہ کا وقت روز دینا۔

۴) پرائمری اسٹیج پر مسلم طلباء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کرنا۔

دوسرے الفاظ میں بنیادی (Base) یا بنیادی تعلیم کا پھیلاؤ وسیع ہوگا اتنا ہی اوپر اعلیٰ تعلیم اور سند یافتہ اسید واروں کی تعداد بڑھے گی۔ اور بھی بہت سی کام کی باتوں کے ساتھ یہ کہا کہ اس وقت سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل میں زیادہ "کوچنگ سنٹرس" کے قیام کو نمبر ایک مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ذرا چونکا دینے والی تھی کیوں کہ عام طور پر اس طرف کبھی ذہن نہیں گیا تھا۔ غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ اس دانشور کی نظر اس بنیادی مسئلہ پر گئی۔ آپ نے یہ بھی بتلایا کہ آئی۔ اے۔ ایس، آئی۔ پی۔ ایس، بنکنگ وغیرہ کے لئے کوچنگ وغیرہ کا انتظام گریجویشن کے بعد نہیں بلکہ انٹرمیڈیٹ کے بعد ہی سے شروع ہونا چاہئے۔ یہاں پر پروفیسر سید حامد صاحب کی پرزور تائید کے ساتھ کوچنگ سنٹرس کی بات کو اور ذرا پھیلا کر پیش کرنا مقصد ہے۔ تاکہ مسلم ادارے اور بااثر شخصیتیں جنہیں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے وہ اس پہلو پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔

یہ کوچنگ سنٹرس "ٹیوٹوریل" دراصل ہمارے تعلیمی نظام کی ایک شکل ہے۔ حکومت اور مختلف اداروں کی جانب سے جن اسکولوں میں نارمل یا روایتی تعلیم دی جاتی ہے وہاں پر طالب علم پر انفرادی توجہ جتنی دی جانی چاہئے کسی حال ممکن نہیں۔ سبق کے بعد سبق آگے بڑھتے جاتے ہیں، چند بنیادی کمزوریاں ابتدائی تعلیم کے زمانے میں کچھ ایسی رہ جاتی ہیں کہ وہ پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر پہنچنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ خصوصاً ریاضی، انگریزی اور سائنس، یہ تینوں مضامین کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ اگر ابتدائی جماعتوں میں خاص طور پر پرائمری اور سکنڈری درجوں میں ان مضامین کی خاطر خواہ تعلیم اور کمزوریاں دور نہ ہوں تو پھر آگے کی تعلیم کی منزل پر یہ نقص کسی نہ کسی طرح سامنے آتا رہتا ہے اور خرابی یہ ہے کہ جو خلا یا نقص بنیادی تعلیم کے زمانے میں ایک معمولی نقطہ معلوم ہوتا ہے وہ پھیل کر رفتہ رفتہ ایک دائرے میں تبدیل ہو جاتا ہے

ہماری تعلیمی ترقی کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ سب کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوچنگ سنٹر کی دراصل ساتویں جماعت ہی سے شروع کرنا فرض ہے جب کہ طلباء کی عمر ۱۳ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ انہیں اہم مضامین کی کوچنگ دینے کا بہت اچھا سبب یہ ہے: اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے سامنے ۴ سال بعد میٹرک کا امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ اس عمر کے طلباء کے لئے یہ ایک نہایت اہم امتحان ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ طلباء اپنی چند ایک کمزوریوں کی اصلاح ہوتے ہی اپنے ہم جماعت طلباء کے مقابل میں تیز ہو جاتے ہیں جو انہیں کلاس میں ممتاز بنا دیتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو طالب علم کو آگے بڑھانے میں بجلی کے کرنٹ کے طور پر کام کرتا ہے۔

ماہرین تعلیم جانتے ہیں یہ شوق اور جذبہ کا پیدا کر دینا ہی تعلیم کی اصل روح ہے یہ پیدا ہو گیا تو پھر آگے کا کام آسان ہے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ طالب علم کی کمزوریاں ابتدائی جماعتوں ہی میں دور کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس میں وہ خود اعتمادی پیدا ہو جو ایک اچھے طالب علم کا طرۂ امتیاز ہے اسکولوں میں اتنا وقت کہاں۔ وہاں تو مقررہ نصاب پورا کرنے کی دھن رہتی ہے۔ اوسط طالب علم اس دور میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کمزور تو کبھی کے ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ ذہین طالب علم بھی اچھا تشنہ کامی سے کچھ مایوس سا ہو جاتا ہے۔ بہرحال اسکول کی تعلیم سے کوئی بھی خوش نہیں رہتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے امتحان آجاتا ہے جس کے نام سے ہمارے طلباء کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں جب تک گھر پر روزآنہ دو گھنٹے طلباء کی تعلیم پر خاص توجہ نہ دی جائے خاطر خواہ نتائج کی توقع رکھنا عبث ہے۔ لیکن یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جو ماں باپ خود تعلیم یافتہ ہیں وہ تو اپنے بچوں کی تعلیم پر کسی نہ کسی طرح توجہ توجہ دیتے ہیں۔ ٹیوشن کا انتظام کرتے ہیں اور کبھی کبھی تعلیمی ریکارڈ کا حال بھی پوچھ لیتے ہیں۔ بعض مائیں باپ سے زیادہ بچوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دیتی ہیں اور خود پڑھاتی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں اکثر ماں باپ خود پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ گھر کا تنگ و تاریک ماحول سکون سے پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ غربت اور جہالت کا سایہ غریب مگر ذہین طلباء پر کچھ ایسا منڈلاتا رہتا ہے کہ اس کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ ایسے طلباء کے لئے اچھے کوچنگ سنٹرس ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مدینہ ایجوکیشنل سوسائٹی محبوب نگر کے کوچنگ سنٹر کی مثال قابل تقلید ہے۔ کوئی چھ سال قبل تک مستقر محبوب نگر کے ۱۲ فوقانی اسکولوں سے بس دو چار مسلمان طلباء مشکل سے میٹرک کامیاب ہوتے تھے بلکہ بعض اوقات ان کا نتیجہ صفر تک جاتا تھا۔ اس سوسائٹی نے بڑی دوراندیشی سے ایک کوچنگ سنٹر قائم کیا۔ جہاں پر ساتویں سے دسویں تک کی جماعتیں طلباء و طالبات کے لئے باضابطہ شام میں ۵ تا ۹ بجے رات تک چلائی جاتی ہیں۔ کوئی ۱۷ اساتذہ جو اپنے مضمون کے ماہرین ہیں پڑھاتے ہیں۔ طلباء آتے

فیس بھی لی جاتی ہے اور اساتذہ کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ چند ہی برسوں میں مسلم طلباء کی تعلیم کا معیار مستقر کے اسکولوں میں بہتر ہو گیا۔ گذشتہ سال ۳۰ طلبہ میں ۱۴ درجہ اول اور کوئی ۱۵ درجہ دوم اور طالبات میں ۵ درجہ اول اور نصف کے قریب درجہ دوم رہے۔ مدرسہ ڈل اسکول کے ساتویں جماعت کا نتیجہ ڈسٹرکٹ میں طلوع رہا۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ یہ اسکول کی تعلیم مثالی ہے اور نقل کرنے کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن [illegible] دی ہے۔ اس کی مثال دینا ضروری تھا تاکہ دوسرے کام کرنے والوں کی مناسب رہنمائی ہو۔ اسی طرح کا کام محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں چند سال قبل محفل علم و فن کی جانب سے شروع کیا گیا ہے لیکن اس کام کو بہت تیزی سے مختلف سنٹروں میں بہ ایک ساتھ پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ میٹرک کے طلباء کے لئے چار چھ مہینوں کی کوچنگ سے اس پیتھروں میں جونک لگا ہوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کوشش قابل داد ہے اور قدم صحیح سمت پر ہے۔ لیکن نتائج صرف اس وقت بہتر ہو سکتے ہیں جبکہ سنٹروں کی تعداد محدود کر کے کام میں باضابطگی پیدا کی جائے۔ مسابقتی امتحانات میں اکثر نوجوان باوجود تعلیمی شاندار ریکارڈ رکھنے کے وہ اپنی کمزوریوں سے واقف رہتے ہیں اس لئے شریک ہونے سے ہی گریز کرتے ہیں۔ ان میں دوسری کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ زبانی انٹرویو سے بہت گھبراتے ہیں۔ ان اس کی ٹریننگ نہ تو اسکول یا کالج میں دی جاتی ہے اور نہ اس طرف عام طور پر توجہ دی جاتی ہے۔ کالج اور اسکول کی تعلیم ہر بات کی گہرائی اور گیرائی کا احاطہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اطراف و اکناف جو کچھ دیکھتے ہیں ان کے متعلق بھی معلومات بہت مایوس کن ہوتے ہیں۔ اعلیٰ امتحانات میں انٹرویو میں امیدواروں کو اتنا کھنگالا جاتا ہے کہ کوئی جوہر آبدار ہو تو تہہ سے اوپر آجاتا ہے۔ اور کہیں کنکر پتھر رہ گئے ہیں تو وہ سب سے پہلے ابھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اچھے طالب علم بھی جن سے توقعات تھیں ناکام کر دیتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ کوچنگ کے لئے چاہے مضامین میں کمزوریاں دور کرنا ہو یا انہیں اعلیٰ مسابقتی امتحانات کے لئے تیار کرنا ہو اس کی پلاننگ انٹرمیڈیٹ یا گریجویشن کے بعد نہیں بلکہ آٹھویں جماعت ہی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ کام ضرور مشکل ہے لیکن جب تک اس کی بنیادی اہمیت کو نہ سمجھا جائے کوئی زیادہ مفید نتائج کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

جب تک پودوں کی نشو و نما کے وقت جڑوں کی کھاد اور آبیاری کا انتظام نہیں ہوتا وہ محض موسم کے رحم و کرم پر سے آگ آنے والے درختوں کی چند ہری بھری شاخوں اور پھول پتوں پر توجہ دینے سے یہ کام نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مندرجہ ذیل باتیں درج ہیں جو عملی کام کرنے والوں کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (۱) ہر بڑے شہر اور ضلع کے مستقر پر دو چار چھ محلوں کو ملا کر کسی مرکزی مقام پر ایک

باقی صفحہ ۳ پر

خلیل الکمل

کینسر

قسط دوم — (تشخیص اور مدافعت)

گزشتہ مضمون میں کینسر کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس مضمون میں کینسر کی تشخیص اور اس کے مدافعتی تدابیر کے مختلف پہلوؤں کو مختلف سوالات کے جوابات سے واضح کیا جائے گا۔

س۔ ڈاکٹر سے بغیر مشورہ سے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں کینسر ہے؟

ج۔ یہ مشکل ہے۔ ایک باقاعدہ اور مکمل طبی معائنہ ہی کینسر کی تشخیص کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ذیل میں دیئے ہوئے سات خطرناک اشاروں میں سے کسی کا بھی اظہار ہو تو کینسر کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

س۔ یہ سات خطرناک اشارے کیا ہیں؟

ج۔ ۱۔ وہ زخم جو مندمل نہ ہو۔

۲۔ جسم کے کسی حصے میں ابھار پیدا ہو۔

۳۔ جسم کے کسی حصے سے خون کا وقفہ وقفہ سے اخراج۔

۴۔ مسّہ یا تل میں کوئی تبدیلی ظاہر ہو۔

۵۔ دائمی قبض اور نگلنے میں دشواری۔

۶۔ مستقل کھانسی اور آواز کا بیٹھ جانا۔

۷۔ اجابت کے معمول میں تبدیلی۔

س۔ کیا درد کینسر کی علامت ہے؟

ج۔ نہیں۔ درد صرف ہڈیوں اور ریشوں کے کینسر میں ہوتا ہے جو ایک دیرینہ

سائنٹسٹ۔ سنٹرل ریسرچ لیب۔ حیدرآباد

علامت سمجھی جاتی ہے۔ جبکہ کینسر کا نشوونما کافی ہو گیا ہو۔

س۔ کینسر کی تشخیص اور علاج میں کیا فرق ہے؟

ج۔ کینسر جس قدر جلد تشخیص ہوگی اس کو جسم کے دوسرے حصوں میں پہنچنے سے روکا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایک مدت کے بعد اس کا علاج ممکن نہیں۔

س۔ ڈاکٹر کے مشورے سے قبل کتنے عرصے تک انتظار کیا جا سکتا ہے؟

ج۔ کوئی بھی انتظار بیکار ہے تو بھی خطرناک ہے۔ فوراً ڈاکٹر سے رجوع ہوکر مکمل امتحان کروالیں۔

س۔ وقفہ وقفہ سے طبی معائنہ کروانا کیوں ضروری ہے؟

ج۔ کیونکہ اس سے کینسر کی تشخیص آسان ہو جاتی ہے۔ اگر ان طبی معائنوں کے دوران کوئی علامت مشاہدہ میں آجائے تو اس کا ابتدائی مرحلہ میں ہی علاج کر کے مرض سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

س۔ طبی امتحان کی سہولتیں کہاں مل سکتی ہیں؟

ج۔ انڈین کینسر سوسائٹی نے مفت طبی معائنہ کے لئے کئی دواخانے کھول رکھے ہیں۔ ان میں سے جو بھی قریب ہو رجوع ہو جائیں۔

س۔ مکمل طبی معائنہ کا کیا مطلب ہے؟

ج۔ جسم کا معائنہ جس میں دل۔ شریانیں۔ نشش۔ پیشانی، منہ، ناک کے نتھنے۔ کان۔ حلق۔ سینہ۔ پستان۔ رحم اور جائے مخصوص شامل ہیں۔ معدے اور آنتوں کا اکسرے اگر مناسب ہو تو کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ پیشاب، خون اور جسم کے ایسے ریشے جن میں کینسر کا شبہ ہو خوردبینی امتحان کیا جاتا ہے۔ و نیز آنکھ اور مثانہ کا بھی امتحان کیا جاتا ہے۔

س۔ کیا یہ معائنہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے؟

ج۔ اس معائنہ کے لئے بمشکل ایک گھنٹہ درکار ہے۔ جس میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ فون کر کے اپنا وقت مقرر کر لینا بہتر ہے۔

س۔ میموگرافی کیا ہے؟

ج۔ میموگرافی پستانوں کے خاص اکسرے کو کہا جاتا ہے۔

س۔ پاپانیکولاؤ (PAPANICOLAOU) امتحان کیا ہوتا ہے؟

ج ۔ یہ ایک خورد بینی امتحان ہوتا ہے ۔ جس میں متاثرہ مقام سے ریشے حاصل کر کے جانچ کی جاتی ہے ۔ جس میں کیانسر کا سوئی کے برابر حصہ کا پتہ چل جاتا ہے ۔

س ۔ کیا خون کا اخراج کیانسر کی علامت ہے ؟

ج ۔ ایسا تو نہیں ہے ۔ لیکن تفصیلی جانچ ضروری ہے ۔ بعض اوقات چھاتیوں کے نپل سے خون خارج ہونے پر کیانسر کا شبہ ہوسکتا ہے ۔ اس کے علاوہ جائے مخصوص اور مثانہ کا امتحان بھی خون کے اخراج کے وقت کیانسر کی تشخیص میں داخل ہے ۔

س ۔ کیا پاخانہ میں خون کی موجودگی کیانسر کو ظاہر کرتی ہے ؟

ج ۔ اگر پاخانہ خون آلود یا ڈانبر جیسا سیاہ ہو تو اس کی مکمل جانچ ضروری ہے ۔ کیوں کہ پاخانہ میں خون کی موجودگی بواسیر اور کیانسر دونوں سے ظاہر ہوتی ہے ۔

س ۔ کیا پیشاب میں خون کا آنا کیانسر کا سبب ہے ؟

ج ۔ یہ مکمل امتحان کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے ۔

س ۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ کیانسر خراب صحت رکھنے والوں میں پیدا ہوتا ہے

ج ۔ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے ۔ باقاعدگی سے وقفہ وقفہ سے امتحان کروانا ہی کیانسر کی بہترین تشخیص ہے ۔

س ۔ معدہ کے کیانسر کی تشخیص کس طرح کی جاتی ہے ؟

ج ۔ اکسرے X-RAY سے کی جاتی ہے ۔ معدہ میں بیریم سلفیٹ نامی کیمیائی مرکب کو گزار کر اکسرے لیا جاتا ہے ۔ جس سے کیانسر کا پتہ چل جاتا ہے ۔ معدہ کی کیمیائی جانچ بھی بعض اوقات بہت اہمیت رکھتی ہے لیکن آخری درجہ میں معدہ کا کیانسر کا موجودگی ابھار کی شکل میں ہاتھ سے بھی محسوس کی جا سکتی ہے ۔

س ۔ ہندوستان میں کیانسر کی تشخیص اور علاج کے لئے دواخانے کہاں ہیں ؟

ج ۔ ٹاٹا میموریل ہسپتال بمبئی دنیا کا سب سے بڑا اور عصری دواخانہ ہے جس میں خورد بینی امتحان ہوتا ہے ۔ اکسرے مشین سے تشخیص اور

سے معلوم ہوتا ہے۔ ریڈیم تھراپی کے لئے ایک مخصوص تحقیقی ادارہ قائم کیا ہے جس میں ادویات کا ہندوستانی حالات کے تحت جانچ کرنے کے قابل ڈاکٹر اور سرجن متعین کئے گئے ہیں۔

س۔ کیا نسر کی تشخیص کے لئے کیا تکنیک استعمال ہوتی ہے؟

ج۔ زیروگراف۔ میموگرافی۔ ڈی شعاعیں۔ تھرموگراف وغیرہ بہت ہی عصری اور سائنسی طریقے کیانسر کی تشخیص کے لئے سمجھے جاتے ہیں۔

س۔ کیانسر کے خلاف بچاؤ کیسے کیا جاسکتا ہے؟

ج۔ جسم کے کسی بھی حصہ میں اگر دیرینہ کھلاہٹ ہو تو اس کو دور کریں۔ دھوپ اور ہوا سے محفوظ رہیں۔ زچگی کے دوران اگر رحم میں کوئی زخم پیدا ہو تو اس کا علاج کروالیں۔ دانتوں کو سیدھا کرنے کے لئے استعمال کردہ دھاتی پلیٹ کی تنصیب خراب نہ ہو۔ تمباکو کے استعمال پر کنٹرول اور دائمی قبض کا علاج کروالیں۔ مختصراً جسم کے کسی حصہ میں کوئی شکایت نہ ہو۔ کیانسر کے بچاؤ کا یہی سب سے بہترین طریقہ ہے۔

س۔ کیانسر کی علامتیں کیا ہیں؟

ج۔ جسم کے کسی بھی حصہ میں کوئی بھی خلاف معمول علامت ظاہر ہو اور وہ جاری رہے، کیانسر پیدا کرسکتی ہے۔

س۔ کیانسر کی ابتدائی علامتیں کیا ہیں؟

ج۔ منہ کی بلغمی جھلی پر سفید دھبوں کی بیماری۔ جلد کی خشکی۔ خاص کر چہرہ پر خارش زدہ دھبے۔ نوکدار دانت سے پیدا کردہ زخم، گہرے رنگ کے مسوں میں خارش وغیرہ۔ یہ تمام شکایتوں کے لئے ڈاکٹر سے رجوع ہوں۔

س۔ منہ کے کیانسر کے لئے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کئے جائیں؟

ج۔ منہ کو صاف رکھیں۔ نوک دار دانت اکھاڑ دیں۔ مسوڑھوں میں زخم پیدا نہ ہونے دیں۔ تمباکو کا استعمال ترک کردیں۔ پھر ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

س۔ جلدی کیانسر کی مدافعت کیسے کی جاسکتی ہے؟

ج۔ گہرے رنگ کے مسے یا تل میں خارش نہ پیدا ہونے دیں یا ان کو فوراً

[illegible] جن میں کھجلی محسوس ہوتی ہو یا جن میں زخم پیدا
ہو گیا ہو [illegible] علاج کروالیں ۔ دوسرے رنگ کے لوگ آفتاب
کی ریت شعاعوں سے محفوظ رہیں ۔ اگر بچپن سے پیدا شدہ ہوں تو
مستقل تبدیلی کی جانچ کروالیں ۔ اور جلد کو صاف رکھیں

س۔ کیا ہمیں جسم کے تمام تلوں کو نکال دینا ؟

ج۔ جسم پر بہت سے تل جلد پر ایسے ہی غیر مضرت رساں ہیں جتنے کہ جسم کے دوسرے
رنگ کے دھبے ۔ اوپر سے مال سیاہ رنگ کی تلوں میں اگر کھجلاہٹ پیدا
ہو تو نکال دینا یا اگر کسی تل یا مسّے کا رنگ اور سائز بدل جائے تو بھی نکال
دینا اور نکالے ہوئے حصے کا ڈاکٹری معائنہ کروالیں ۔

س۔ کیا ٹائیفائیڈ اور دیگر بیماریوں کی طرح کینسر کے لئے بھی مدافعتی ٹیکہ اندازی ممکن ہے ؟

ج۔ مدافعتی ٹیکہ اندازی صرف ان بیماریوں کے لئے ہے جو جراثیم سے پھیلتی
ہیں ۔ لیکن کینسر اس زمرہ میں نہیں آتا ۔ اس لئے ٹیکہ اندازی کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا ۔

س۔ جب لوگ کینسر کا شبہ محسوس کرتے ہیں تو ڈاکٹر سے مشورہ کرنے
کیوں جھجکتے ہیں ؟

ج۔ ایک تو خوف ہے ، دوسرا کینسر کے متعلق لاعلمی ہے کہ ابتدائی
تشخیص علاج میں کس قدر اہمیت رکھتا ہے ۔ بعض لوگ کینسر کو ایک
سماجی تحقیر سمجھتے ہیں ۔ اس لئے وہ رشتہ داروں ، دوست احباب
اور ڈاکٹروں سے چھپاتے ہیں ۔ ان کا یہ عمل ٹھیک نہیں

س۔ خون کے سفید جرثومے کینسر کو کیوں ہلاک نہیں کرتے ؟

ج۔ خون کے سفید جرثوموں کا کام ہمارے جسم کے جراثیم اور بیکٹیریا
کے خلاف بچاؤ کرنا ہے ۔ ان کا کینسر کے خلیوں پر کوئی اثر
نہیں ہوتا ۔

س۔ کیا ہم کینسر پر قابو پا سکتے ہیں ؟

ج۔ جب کبھی بھی کینسر کی کوئی علامت یا شبہ ظاہر ہو فوراً ڈاکٹر
سے مشورہ کرنا ہی دانشمندی ہے جو کسی مریض کی جان بچا سکتی ہے

باقی صفحہ پر

ڈاکٹر روفہ خاتون علوی

[illegible] افراد کا نظام ہضم

نظام ہضم کا عمل غذا کو منہ کے ذریعہ معدہ اور آنتوں تک پہنچانا ہے تاکہ وہ ہضم واستحالہ کے مختلف مدارج سے گزر کر بدل یا متحلل بن سکے۔ نظام ہضم میں یہ اعضا ہوتے ہیں دانت، منہ، زبان، حلق، غذائی نالی، معدہ، ہاضمہ کے غدود، چھوٹی اور بڑی آنتیں، جگر مرارہ (پتہ) لبلبہ۔ انمیں سے ہر عضو کا کام الگ الگ ہوتا ہے۔ دانت غذا کو چبانے ہیں۔ زبان کے نیچے کچھ غدود ہوتے ہیں غذا کو دیکھتے ہی ان کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ان سے ہاضمہ میں مدد دینے والی رطوبت افراز پانے لگتی ہے اس رطوبت کی وجہ سے غذا آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے اترتی ہے۔ غذائی نالی غذا کو معدہ میں پہونچا دیتی ہے۔ معدہ کے اندر قدرت نے ایک ملتحمہ نظام ترتیب دیا ہے۔ معدہ کی ساخت میں مخصوص قسم کے غدود اور چھوٹی بڑی جھلیں ہوتی ہیں۔ معدہ غذا کو گھوتا پیستا ہے اور معدی غدود سے ترشہ اور خمیری اجزاء شامل ہو جاتے ہیں۔ اب غذا استحالہ کے مختلف مراحل سے گزر کر ننھے ننھے برابر حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور معدی ہضم کے بعد [illegible] چھوٹی آنتوں میں ڈھکیل دی جاتی ہے۔ چھوٹی آنتوں میں بھی ہضم واستحالہ کے مختلف مدارج ملتے پاتے ہیں۔ غذا کو مزید تحلیل اور منجذب کرنے کے لیے غدود غیر نالیہ کے رسیل یا خامرے دہارمون درکار ہوتے ہیں۔ یہ رسیل بے حد اہم ہوتے ہیں اور لبلبہ سے متعلق ہوتے ہیں جس میں لانگرہانس (Insoline) انسولین اور گلوکاگون [illegible] ہوتے ہیں۔ یہ ہارمونس Hormone خون میں شکر کی مقدار کو طبعی رکھتے ہیں اس کے علاوہ یہ سے صفری چھوٹی آنتوں میں گرتا ہے اور چربیلے اجزاء کی تحلیل یا استحالہ میں مدد دیتا ہے صفری کی مدد سے

ہضم ہونے جراثیمی اور دوائی اجزاء کی تحویل ہوتی ہے۔ ہضم شدہ غذا جگر میں جاتی ہے اور جسم کی ضرورت سے زیادہ غذائی توانائی Gycogen کی صورت میں جگر میں محفوظ ہوجاتی ہے۔ جگر کے اندر استحالات و تغیرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ گویا یہ کہ حیاتیاتی تجزیہ گاہ ہے۔ قدیم اطباء نے جگر کو مطبخ کا نام دیا ہے۔ ان مراحل سے گذرنے کے بعد غذا کا فاضل حصہ بڑی آنتوں میں آجاتا ہے۔ یہاں پر سیالات کا مزید انجذاب ہوتا ہے اور اور غیر منہضم حصہ فضلہ کی صورت میں خارج ہوجاتا ہے۔ یہ پورا عمل بہت پیچیدہ ہوتا ہے مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عمل کی تکمیل میں آنتوں کی حرکات عضلاتی قوت اعصابی کنٹرول اور تخمیری، کیمیاوی ردعمل شامل ہوتے ہیں۔

کبر سنی نظام ہضم پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہے کہ اس کی سالمیت اور فعالیت غدد لعابیہ اور آنتوں کے لعابات، لبلبے اور جگر میں انحطاطی تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ آنتوں کی تیزابیت کم ہوجاتی ہے۔ عضلات کی قوت میں کمی ہوجاتی ہے۔ اوعیہ دمویہ میں تضیق (تنگی) پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جگر کے فعل اور تخمیری افرازات میں کمی نہیں ہوتی اور کبر سنی میں شاذ ہی موت مذکورہ وجہ سے واقع ہوتی ہو۔

نظام ہضم کے خلل کی عام علامات یہ ہوتی ہیں۔ سقوط اشتہا، ذائقہ کی کمی، عسر البلع نفخ پیٹ کا درد، ڈکاریں آنا، جی متلانا، سمن مفرط، قبض، وزن کی کمی، سستی کاہلی وغیرہ وغیرہ وہ امراض جو جوانوں کو ہوسکتے ہوں وہ کبر سن لوگوں کو بھی ہوسکتے ہیں لیکن زیادہ تر ہونے والے امراض یہ ہوتے ہیں۔ ہرنیا، ہوائی نالی کے ڈھیلے ہونے سے نگلنے کی دشواری، سینے کی جلن۔
کبر سنی کا ایک اور عارضہ شکم کی عضلاتی غشا کا سکڑ جانا اور بعض خلیات مسترخی ہوتا ہے۔ نتیجتاً معدہ کا حصہ گلے کی جانب کھسک جاتا ہے۔ غذائی نالی کا کھلنے اور بند ہونے کا خود کار نظام ناقص ہوجاتا ہے اور معدہ کے کچھ تیزابی اجزا غذائی نالی کے نچلے حصہ میں کھنچ جاتے ہیں اور وہاں جلن سوزش ہونے لگتی ہے۔ ہرنیا کے سبب سے سینہ کے نچلے حصے میں درد ہوتا ہے جو غلطی سے دل کا درد سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن فاضل معالج دونوں حالتوں میں تمیز کرسکتا ہے سینے کی جلن کو کھانے کی مقدار، چکنائی کی کمی یا اٹھنے بیٹھنے کے ان طریقوں سے بہتر کرکے ملایا جاسکتا ہے جو پیٹ کے درد کو بڑھاتی ہیں۔ چارپائی کے سرہانے کو تقریباً چھ انچ اونچا کردیا جائے تو اس سے آنتوں کے اترنے میں کمی ہوجائے گی اور افرازات کم ہوجائیں گے۔
مسن رسیدہ افراد میں زیادہ تر معدہ کا ناسور ہوتا ہے جبکہ جوانوں میں [illegible] میں

جاتا ہے۔ مذکورہ ناسور کی علامت کھانا کھانے کے بعد پیٹ کا درد اور کبھی کبھی متلی ہوتی ہیں۔ فی زمانہ اس عارضہ کی موثر ادویہ مل گئی ہیں اور بعض بعض مرتبہ عمل جراحی سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ اس صورت میں اگر بھوک میں کمی ہونے لگے تو معالج سے مشورہ بے حد ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ناسور شدت اختیار نہ کر سکے اور مرض کی ابتدا میں ہی ناسور یا سلعہ (Tumer) کی Biopsy سے اس کی نوعیت کا صحیح علم ہو سکے۔ آج کل جدید طریقے بیریم ایکس رے کے روایتی طریقوں سے زیادہ اچھے اور موثر ہیں اور تدریسی دواخانوں میں مہیا ہیں۔

یرقان کسی بھی عمر میں ہو سکتا ہے۔ یہ جگر یا پتہ کے نقص فعل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جب یرقان ظاہر ہو معالج کے مشورے سے ضروری تفتیش کروالی جائے اگر سن رسیدہ افراد میں شدید یرقان ظاہر ہو تو اس کا سبب مجاری صفراوی کا انسداد ہوتا ہے جس کا علاج جراحی سے ہو سکتا ہے۔ یرقان از خود کوئی مرض نہیں ہے بلکہ دوسرے امراض کی علامت ہے۔

ہمارے ملک میں جگر کے امراض اور پیرکبر سنی میں اس کا سکڑ جانا غیر معمولی ہیں یہ عموماً شراب نوشی جراثیمی سمیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دائم شراب نوشی جگر اور پتہ کو نقصان دیتا ہے گو کہ اس کا ظہور 20% ہوتا ہے لیکن اس تعلق سے پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔

سن رسیدہ افراد کی بڑی آنت امراض سے متاثر ہو سکتی ہے لیکن پیچش اور دیدان (Worms) جوانوں میں زیادہ ہوتے ہیں۔ نچلی آنت کے زخموں کی صورت میں اجابت میں تازہ خون آتا ہے۔ جب کہ سیاہی مائل خون چھوٹی آنت کے زخموں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کثیر الوقوع بواسیر اور نواصیر بھی ہو سکتے ہیں۔ قلیل الوقوع اسباب پیچش یا کسی پھوڑے کا پھوٹنا ہو سکتے ہیں۔ بواسیر میں اجابت کے بعد بڑی مقدار میں خون خارج ہوا کرتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ شدید درد ہو تو نواصیر یا زخم ہو سکتے ہیں۔ عمل جراحی سے ان کا علاج کیا جاتا ہے۔

بڑی آنت کا سلعہ پھوڑا زیادہ تر مبرز کے قریب ہوتا ہے اس کا سبب نقص فعل یا اندرونی خون ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں عوارض فوری توجہ کے طالب ہوتے ہیں۔ عمل جراحی سے ان کو دور بھی کیا جاتا ہے۔ متمدن مغربی ممالک میں سن رسیدہ افراد Diverticulosis سے تکلیف پاتا ہے کیونکہ ریشہ دار غذا کے استعمال سے یہ نہیں ہونے پاتی۔

عمر رسیدہ افراد میں قبض کی شکایت عام ہوتی ہے۔ اسباب یہ ہو سکتے ہیں۔ غذا ریشہ دار اجزا کی کمی، غذا کی مقدار کی کمی، عضلاتی ریشوں کی قوت کی کمی، نچلی آنت میں خرابی بض یا بواسیر یا مس [illegible] سیاتی مواد ہیں۔ قبض کو دور کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے کہ ریشے دار یا Rough غذا استعمال کی جائے۔ سیالات کا استعمال زیادہ کیا جائے ما اور ورزش کی جائے۔ عادتوں میں باقاعدگی پیدا کی جائے۔ جہاں تک ہو سکے مسہل ادویہ استعمال کم سے کم کیا جائے۔ قبض اور اسہال کا بار بار ہونا عضوی مرض کی علامت ہے ی صورت میں اس کی تفصیلی جانچ پڑتال کی جائے۔

غذا میں احتیاط نہ کرنے یا پھر جراثیمی سمیت کی وجہ سے شدید اسہال ہوتے ہیں ان کا ازخود سباب کیا جا سکتا ہے۔ سن رسیدہ افراد کو عموماً خونی پیچش نہیں ہوتی ہے اگر ہو تو تفصیل ی تشخیص درکار ہوتی ہیں۔ مختلف افراد میں بڑی آنتوں کا فعل مختلف ہوتا ہے۔

سن رسیدہ افراد میں Gases تبخیر کی شکایت عام ہوتی ہے۔ اسباب یہ ہو سکتے ہیں۔ ہوی غذا، مٹھائیوں اور دالوں کا زیادہ استعمال، ہاضمہ کی کمی، آنتوں کے فعل کی سستی، زیادہ ہ رہنا اور ذیابیطس۔ Gases کیوں بنتی ہیں۔ اس تعلق سے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ہ ایک منظم اور مربوط پروگرام جو عادات کا نظم و ضبط، غذا کی باقاعدگی پر مشتمل ہو اس پر اثر انداز ہے۔ اشتہاری دوائیں استعمال کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسی ادویہ کے استعمال کی پرستی نہیں کرنی چاہئے۔ خصوصاً عمر رسیدہ افراد میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ کے گردے [illegible] کی قوتوں میں ضعف آجاتا ہے۔ عمر رسیدہ افراد میں ان ادویہ کے استعمال مکان زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً مسہل، مسکن اور اعصابی تناؤ کو کم کرنے والی، درد دور سکین دینے والی، ذیابیطس کم کرنے والی دوائیں۔ لیکن ان امراض کی دوائیں اعتدال کے ساتھ استعمال کی جائیں۔ عمر رسیدہ افراد میں ان عوارض پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے ل کی کمی، وزن کی کمی، بار بار پیٹ کا درد، قے، آنتوں کے افعال میں تبدیلی۔ اگر مذکورہ نیا پر توجہ دی جائے تو بڑھاپا آسانی گزر سکتا ہے اور انسان مایوسی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

عمر رسیدہ افراد کی غذا صحت بخش اور متوازن ہونی چاہیے ان غذا میں صرف اتنے ہی ارے ہوں کہ ان کے جسم کی توانائی کو برقرار رکھ سکیں۔ زیادہ حرارے موٹاپا پیدا کرتے۔ ریشہ دار غذائی اجزا کم [illegible] ہوں اور حیاتین کی اضافی مقدار ہو۔ اگر کسی سن رسیدہ ن کو بواسیر ہو تو اس کی غذا میں دودھ، تازہ سبزی اور پھل ضرور شریک ہوں

باقی بر صفحہ ٦٤

بانڈیڈ

ذیل کا مکالمہ تمام کا تمام لوئی فشر کی کتاب "دی لائف آف مہاتما گاندھی" سے اخذ کیا گیا ہے۔

جے پرکاش کی بیوی پربھا وتی نے اُن کے پیر چھوئے اور اُنھوں نے اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ میں نے کہا کانگریس میں دستور ساز اسمبلی کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان اختلاف کی خلیج بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ویسے اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے، کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ محض کھلواڑ کر رہے ہیں اور ہندوستان چھوڑنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟

گاندھی: نہیں، میرے خیال میں انگریز اس دفعہ وہی کہہ رہے ہیں جو در اصل چاہتے ہیں۔

فشر: یعنی آپ کو یقین ہے کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے؟

گاندھی: بے شک۔

فشر: مجھے بھی اس کا یقین ہے ویسے میرے لئے جے پرکاش کو قائل کرنا ممکن نہیں لیکن بفرضِ محال اگر انگریز ہندوستان چھوڑنے سے منکر ہو گئے، تب ان کے خلاف احتجاج آپ اپنے طریقے سے کریں گے یا جے پرکاش کے؟

گاندھی: نہیں یہ احتجاج میرے اپنے ڈھنگ سے ہوگا اور جے پرکاش کو اس میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ میں نہیں چاہوں گا کہ جے پرکاش میرے مخالفین کی صفوں میں ہو [illegible] تھا کہ ہم ایک انجان سمندر میں سفر کرنے کے لئے نکلے ہیں لیکن

ایسا نہیں ہوگا۔ اس وقت میں لوگوں سے اتنا اچھی طرح سے واقف نہیں تھا جتنا اب میں ایک طرح سے جان گیا ہوں کہ کیا کیا جا سکتا ہے اور کیا کرنا ممکن نہیں۔

فشر: کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۴۲ میں آپ نہیں جانتے تھے ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے نتیجہ میں تشدد پھوٹ پڑے گا؟

گاندھی: ہاں۔

فشر: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دستور ساز اسمبلی کے تجربے کی ناکامی کی صورت میں بھی آپ ستیہ گرہ کی کوئی مہم نہیں چلائیں گے!

گاندھی: نہیں۔ اب ستیہ گرہ تب ہی ہوگی جب کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی عدم تشدد کا دھرم اپنائیں گے۔

فشر: ایسا ہونا تو ممکن نظر نہیں آتا ___ ؟

گاندھی: لیکن میں دوبارہ ستیہ گرہ کی تحریک کیسے شروع کروں جبکہ ہندوستان کی فضا میں اس وقت تشدد کا اثر زہر پھیل گیا ہے اب تو خود ہندوؤں کے بیچ بھی اتنا نفاق ہے کہ اعلیٰ ذات کے لوگ اچھوتوں کے ساتھ بھائی چارگی کا برتاؤ کرنے کے روادار نہیں

فشر: اعلیٰ ذات سے آپ کی مراد کانگریسی ہندو ہیں!

گاندھی: ہاں، ان میں کچھ کانگریسی بھی ہیں جو ہنوز اپنے دل سے چھوت چھات کا میل دور نہیں کر پائے ہیں ... مسلمان بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ نا انصافی برتی جاتی ہے۔ تنگ خیال ہندو گھرانوں میں کوئی مسلمان ایک ہی فرش پر بیٹھ کر سب کے ساتھ کھا پی نہیں سکتا۔ میرے خیال میں مذہب کی یہ تعبیر صحیح نہیں ہے ہندوستان میں ہر جگہ مذہب کی غلط تعبیر کی جا رہی ہے۔ ہمیں مذہب کی صحیح تعبیر کرنی ہوگی۔

فشر: اس معاملے میں آپ کانگریسیوں کو بھی اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ___

گاندھی: یہ سچ ہے۔ واقعی مجھے اس معاملے میں سخت ناکامی ہوئی۔ اس کے باوجود ہم کچھ حد تک آگے بڑھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً مدورا اور بعض دیگر مقامات پر مندروں کے دروازے اچھوتوں پر کھول دیئے گئے ہیں اور اونچی ذات کے ہندو بھی وہاں پوجا پاٹ کے لئے جاتے ہیں۔

اس نوبت پر ہماری صبح کی نشست اور گفتگو تمام ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

بابوؤں کا سر چڑھنے کا رخ قبیلوں کی بجائے اب اپنی ذات اور اپنے فرقہ کی سمت ہو گیا ہے اب اس کی روشنی کے دائرے میں نہ صرف وہ خود بلکہ سارے ہندو [illegible] آ گئے ہیں اور ان کی کمزوریاں اور خرابیاں بھی انھیں اب دکھائی دینے لگی ہیں اور یہ بات بعض ہندوؤں کو پسند نہیں کیونکہ وہ سارا الزام صرف انگریز اور جناح پر ہی ڈالنا چاہتے ہیں۔ دوپہر گاندھی جی اور جے پرکاش کے درمیان ایک گھنٹہ تک بات چیت ہوئی تھی ان کے سیکریٹری نے اس گفتگو کا ریکارڈ مجھے دکھایا جس کا کچھ حصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

جے پرکاش: کانگریس کی طرف سے ملک کی طاقت کو متحد کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ آج کانگریس میں صلاحیت اور قابلیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ خاندانی رسوخ و روابط، ذات پات یہ سب کچھ ہے اور اسی کی اہمیت ہے اور ہمارا دستور ساز اسمبلی کا مقاطعہ کرنے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی بے عملی کا شکار ہو گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ برطانوی تجاویز کو تسلیم کئے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ یہاں کی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ وہ انگریز سے توقع کرنے لگے ہیں کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان اشتراک کی کوئی سبیل وہ ڈھونڈ نکالے گا۔ حالانکہ ہمیں تو انگریز سے صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیئے تھا کہ بھائی صاحب، آپ سیدھے سیدھے یہاں سے دفع ہو جائیں، ہم یہاں آپس میں خود سمجھ لیں گے۔ اگر انگریز اس الٹی میٹم کو پسند نہیں کرتے تو وہ ہمیں جیل بھجوا سکتے ہیں۔

گاندھی: جیل، چور ڈاکو اور لیڈروں کے لئے جیل ہے میرے لئے تو وہ قصر شاہی ہے۔ جیل جانے کی رسم میں نے ڈالی ہے ... خود ٹالسٹائے تسلیم کرتا ہے کہ اس طریقۂ احتجاج کا بانی میں ہوں... میں نے جیل کے اندر رہ کر برطانوی سرکار کا مقابلہ کیا ہے۔ جیل جانے سے آزادی مل سکتی ہے بشرطیکہ اس کے پیچھے پایا جانے والا فلسفہ سچائی پر مبنی ہو... لیکن آج جیل جانے کی بات ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں ہے۔

جے پرکاش: آج ہم انگریز کو جیل بھیجیں گے۔

گاندھی: لیکن کیوں اور کیسے؟ اور پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ایسی بات تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتی اور اس جنگ کی اس خون آشام تباہی اور بربادی کے بعد یہ بات کچھ اور بھی ناگوار معلوم ہونے لگی ہے۔ یہ انداز فکر ہمارا نہیں مسٹر چرچل کا ہے جو کہتے ہیں کہ ہٹلر ہاتھ آ جائے تو وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ نیورمبرگ

[illegible] کے تحفظات کی حمایت کرنے والی جماعت کی حیثیت [illegible]
کو [illegible] متنبہ [illegible] سے زیادہ لایعنی الزام ہیں۔
[illegible] نے کہا [illegible] ہوں یہ عقیدہ [illegible] قائم کی تھیں جہاں تک [illegible] ہوئی
[illegible] اور دوستانہ [illegible] پرکاش اور [illegible] گاندھی [illegible]
[illegible] تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سوشلسٹ اور ان کے ہم خیال اپنے قوت بازو
[illegible] کو [illegible] حاصل یا [illegible] کرنا چاہتے تھے بہ الفاظ دیگر رفتہ رفتہ [illegible] کے بجائے [illegible] انتہا پر در
پیش [illegible] کے وہ قائل نہ تھے۔ انھیں شک تھا کہ انگریز مسلم لیگ کی مدد سے ہندوستان میں
اپنے قیام کو طول دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسی وجہ سے جے پرکاش دستور ساز
اسمبلی اور قانونی [illegible] سے آزادی کے حصول کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔
اس کے برخلاف گاندھی جی ۱۹۴۶ء، ۱۹۴۷ء میں برپا ہونے والے تشدد سے اس
قدر خائف تھے کہ مزید کسی تحریک کے شروع کرنے کے حق میں نہ تھے اور دستور ساز اسمبلی
ہی ان کے نزدیک آخری چارہ کار تھی اس طرح انھوں نے اپنے لئے ایسی راہ کا انتخاب کیا
جو آگے چل کر ان کی موت پر پہنچنے والی تھی کیونکہ اس راہ میں بار بار انتہا پسندوں سے
ٹکراؤ لازمی تھا۔

دوپہر میں گاندھی جی سے مزید ایک گھنٹہ گفتگو رہی۔ وہ دیر تک جنوبی افریقہ
میں کالے اور رنگ دار لوگوں کے مسائل پر بات چیت کرتے رہے۔ آخر کار میں نے کہا۔
اس بار ہندوستان میں مجھے کافی سمجھدار لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

گاندھی : اچھا!! کتنے بھلا ؟

فشر : جی بس ایک آپ اور دو تین اور (اس پر سب لوگ ہنسنے لگے)
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات اب پہلے سے بہت
بہتر ہیں اور بعض کا خیال اس کے بالکل اُلٹ ہے ؟

گاندھی : جناح اور لیگ کے بہت سے اراکین کبھی کانگریس کے ممبر ہوا کرتے
تھے وہ کانگریس کو چھوڑ گئے کیونکہ کانگریسی ہندوؤں کا ان کے ساتھ بچوں کی طرح
بہلانے پچکارنے کا انداز اور ہمیشہ برادر خورد کا برتاؤ انھیں سخت گراں گزرتا تھا۔
وہ مکمل مساوات کے مدعی تھے ..... جوں جوں کانگریس کی تحریک عوامی رنگ اختیار
کرتی گئی اور اس کے ممبران کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا مسلمانوں کے ساتھ ان کے

[illegible] ہیں [illegible] مذہب سے تعلق ہے بہت ہی کٹر واقع ہوئے ہیں لیکن کٹر [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں رواداری اور بھائی چارے کے جذبات نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام اخوت اور بھائی چارے کا مذہب ہے گو اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ بھائی چارہ مسلمانوں میں صرف آپس ہی میں ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوؤں کی علیحدگی پسند ذہنیت کانگریس اور لیگ کے درمیان وجہ اختلاف ہے۔ جناح ایک (EVIL GENIUS.) ہیں لیکن اپنے آپ کو ایک پیغمبر تصور کرتے ہیں۔

فشر: وہ ایک وکیل ہیں اور صرف مسلم مفاد کی وکالت کرتے ہیں۔

گاندھی: ایسا لگتا ہے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہو۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں ان کے ساتھ ہونے والی اٹھارہ روزہ گفتگو کی بنا پر میں اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو محافظ اسلام سمجھتے ہیں۔

فشر: مسلمان اپنی سرشت میں جذباتی، مخلص اور پرجوش واقع ہوئے ہیں۔

گاندھی: ہاں، یہ بات بالکل درست ہے۔

فشر: لیکن جناح برف کی قاش کی طرح سرد ہیں وہ ایک نحیف و نزار جسم کے مالک ہیں۔ وہ اپنے مقدمے کی وکالت کرسکتے ہیں لیکن کانگریس کا پرچار ان کے بس کی بات نہیں

گاندھی: جسمانی طور پر وہ لاغر اور کمزور ضرور ہیں لیکن فراڈ ہرگز نہیں ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں پر جو زیادہ تر سادہ لوح اور جذباتی لوگ ہیں، جادو کر دیا ہے۔

فشر: بعض اوقات مجھے یوں لگتا ہے کہ ہندو مسلم سوال دراصل ہندوستان جیسے کم ترقی پذیر ملک میں نئی ابھرتی ہوئی مسلم مڈل کلاس کے لئے جگہ پیدا کرنے کا مسئلہ ہے۔ معاشی میدان میں ہندوستان اتنا پسماندہ ہے کہ اس میں یہاں کے غریبوں کے لئے ہی جگہ نکالنا مشکل ہے۔ جناح مسلم مڈل کلاس کی حمایت اسی لئے حاصل کرسکے ہیں کہ وہ ہندو مڈل کلاس سے مقابلہ کرنے میں ان کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور اب وہ پاکستان کا نام لے کر مسلم زمیندار اور کاشتکار کے مفاداتی تضاد پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

گاندھی : ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن [illegible] مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو سکتا تو [illegible] نہیں ہے کیونکہ ہمارے [illegible] کی کوشش [illegible] ہے [illegible] [illegible] مسلمانوں [illegible] اختلاف نہیں ہے [illegible] [illegible] حاصل نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں [illegible] دہشت [illegible] سیاسی سوجھ بوجھ سے عاری ہیں۔

فشر : نہیں ان میں اب پہلے سے زیادہ سیاسی سوجھ بوجھ اور کچھ ہے۔

گاندھی : پہلے سے زیادہ صحیح لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ کافی ہے۔

فشر : کانگریس جس پر ہندوویت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے کیوں کر مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گی۔

گاندھی : مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرنے سے پہلے ہندو مت کو اپنا گھر درست کرنا ہو گا۔ ہریجنوں کو برابری کے حقوق دینے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر ایسا ہو کر رہے گا اور تب مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں ہو گا۔

فشر : ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات بہت ہی کم ہیں۔

گاندھی : اور جو ہیں بھی وہ اونچے طبقوں میں آہستہ آہستہ ٹوٹتے جا رہے ہیں۔

فشر : ۱۹۴۲ء میں جناح نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ دراصل آزادی نہیں چاہتے۔

گاندھی : میں آزادی نہیں چاہتا تو پھر کیا چاہتا ہوں؟

فشر : وہ کہتے تھے کہ آپ ہندو راج چاہتے ہیں۔

گاندھی : یہ خیال بالکل ہی غلط اور نہایت ہی مہمل ہے۔ میں مسلمان بھی ہوں، ہندو بھی اور بدھ عیسائی یہودی اور پارسی بھی۔ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ میں ہندو راج چاہتا ہوں تو وہ مجھے بالکل ہی نہیں جانتے۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس میں رتی برابر سچائی نہیں ہے۔ وہ ادنیٰ درجے کی قانونی قیل و قال میں الجھے ہوئے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ایک پاگل آدمی ہی ایسی بہتان تراشی کر سکتا ہے . . . میں سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ بالآخر دستور ساز اسمبلی میں ضرور شریک ہو گی۔ سکھ بھی دستور ساز اسمبلی میں جانے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہودیوں کی طرح ان میں بھی بہت اکڑ ہے۔

فشر : گردن تو آپ کی بھی کچھ کم اکڑی نہیں ہے۔

گاندھی : میری!!

فشر: ہاں، آپ کی۔ آپ بھی ساری دنیا کو اپنے راستے پر چلانا چاہتے ہیں۔ آپ بھی ایک ڈکٹیٹر ہیں، گو نرم مزاج۔

گاندھی: ڈکٹیٹر! کون سی طاقت ہے میرے ہاتھ میں۔ میں تو کانگریس کو بھی اپنی راہ پر نہیں چلا سکا۔ کتنی ہی شکایتیں ہیں مجھے اس ادارے سے۔

فشر: اپنی اٹھارہ روزہ ملاقات میں آپ نے جناح کو کیسا پایا؟

گاندھی: مجھے تو وہ بالکل جنونی قسم کے آدمی معلوم ہوئے۔ کیونکہ جنونی لوگ بھی تو کبھی کبھی وحشت کا جامہ اتار کر ہوش مندی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ اس طویل وقت گزاری پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوا، کیوں کہ زندگی میں میں کبھی بھی اتنا بے لوچ اور بے لچک نہیں رہا کہ کسی بات سے کوئی سبق حاصل نہ کر سکوں۔ میری ناکامیاں ہی میری کامیابیوں کا زینہ ہیں۔ جناح کے پاگل پن سے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے میں صرف مجھے ہی ناکامی نہیں ہوئی بلکہ خود ان کے بہت سے ساتھی ان کے خودسرانہ رویے کی وجہ سے ان سے بیزار ہو گئے ہیں۔

فشر: تو پھر لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلاف کا آخر حل کیا ہے؟

گاندھی: جناح ابھی مزید پچیس برس اور کام کر سکتے ہیں۔

فشر: وہ تو چاہتے ہیں کہ اس وقت تک زندہ رہیں جب تک آپ زندہ ہیں۔

گاندھی: تب تو انھیں میرے سوا سو برس کی عمر کو پہنچنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ ویسے وہ ایک بہادر اور دیانت دار آدمی ہیں۔

۱۸ ر جولائی ۱۹۴۶ء کو گاندھی جی کے ساتھ میری آخری گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا اگر کانگریس ورکنگ کمیٹی بھی آپ کی اندرونی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کیبنٹ مشن پلان کو رد کر دیتی تو آج دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے یا نہ ہونے کی بحث ہی پیدا نہ ہوتی۔

گاندھی: لیکن میں نے خود انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ میں نے کہا کہ وہ یہ راستہ صرف اسی وقت اختیار کریں جب ان کے دل کے ساتھ ان کا دماغ بھی اس بات کے حق میں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ خود میں نے بھی کبھی محض اندرونی آواز پر قدم نہیں اٹھایا جب تک اس کی تائید میں کوئی قوی دلیل میرے پاس نہ ہو۔

فشر: لیکن آپ تو کہا کرتے تھے کہ آپ ہمیشہ اپنی اندرونی آواز پر قدم اٹھاتے ہیں۔ مثلاً ہفتے جو آپ نے برت رکھے وہ خود آپ کے بیان کے مطابق آپ کی اندرونی آواز کی پیروی

باقی صفحہ پر

ڈاکٹر مظہر محی الدین

صفی اورنگ آبادی

وقت کو اے صفی بُرا نہ کہو
وقت پیغمبروں پہ آیا ہے

اس شعر میں صفی نے کس سادگی، صفائی اور خوبصورتی سے "حدیث قدسی" زمانے کو بُرا نہ کہو، میں خود زمانہ ہوں'' کے مفہوم کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ صفی مرحوم دکن کے اردو غزل گو شعراء کے وسیع سلسلے میں شائد آخری بڑے استاد تھے۔ اس ادب پرور سرزمین سے غزل گو شاعر کئی اٹھے اور آگے بھی پیدا ہوں گے لیکن اب صفی پھر نہ پیدا ہوگا.... ان کا تعلق غزل گوئی کے اس دبستان سے تھا جو داغ دہلوی اور میکش تھانوی کے اثر سے دکن میں ہماری صدی کے اوائل میں بہت مقبول رہا۔ جذبات نگاری بلکہ معاملہ بندی اس دبستہ کی نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن صفی نے خود اپنے لفظ پرستی اور محاورہ بندی کے رجحان کی بدولت ایک انفرادیت سی پیدا کرلی تھی۔ داغ کا رنگ گویا ان کے پاس چھن کر پہنچا ہے بلکہ اس سے بہت لطیف اور نازک تر ہوگیا ہے۔ وہ روز کی بول چال میں ایسے نفیس شعر لکھتے ہیں کہ شائد ہی کسی اور سے یہ طرز بن سکے۔ صفی کا بیشتر کلام سہل ممتنع ہے" یہ ہیں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کے الفاظ صفی اورنگ آبادی سے متعلق:

اورنگ آباد کے محلے جونا بازار میں ۲۶ رجب ۱۳۱۰ھ کو صفی اورنگ آبادی کا جنم ہوا۔ والدین نے نام بہاؤ الدین رکھا لیکن صفی نے بدل کر محمد بہبود علی رکھ لیا اور اسی نام سے مشہور ہیں۔ اُن کے والد محمد منیر الدین اوائل عمری ہی میں دلی چلے گئے تھے اور وہاں سے طب کی تعلیم مکمل کرکے لوٹے تو حیدرآباد

پرنسپل ۔ مولانا آزاد کالج ۔ اورنگ آباد

منتقل ہوگئے۔ اس وقت صفی کی عمر سات سال تھی۔ اس طرح
بچپن ہی میں ان سے اورنگ آباد چھوٹ گیا۔
لیکن وہ خود کو صفی اورنگ آبادی ہی لکھتے رہے۔ کوئی ۵۰ سال بعد صرف ایک مرتبہ
وہ اورنگ آباد آسکے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

آدھی صدی کو پانچ برس ہی تو کم رہے شاباش کب صفی کو خیال وطن ہوا

حیدرآباد میں انھیں مدرسۂ نظامیہ میں شریک کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے طب کی تعلیم حاصل کی لیکن کوئی سند لئے بغیر ہی تعلیم چھوڑ دی۔ عنفوان شباب میں ان کے شفیق والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر انھیں فکر معاش کی طرف توجہ دینا پڑی۔ کبھی نظم جمعیت میں ملازم ہوئے۔ کبھی اسپیشل مجسٹریٹ اضلاع دیوانی میں نوکر ہوئے اور کبھی عدالت العالیہ میں۔ کبھی معتمدی فوج اور کبھی آرائش بلدہ میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن طبیعت کی شورش اور آزاد منشی نے کہیں ٹک کر کام کرنے نہ دیا۔ کچھ ہی دنوں میں ہر ملازمت سے ان کا دل بھر گیا اور بالآخر سب چھوڑ چھاڑ کر فقر و آزادی کے مزے لوٹتے ہوئے زندگی گزاردی اور قلندری اور توکل پر ان کا مدار حیات رہ گیا۔ چند گنے چنے شاگرد جو نذرانہ گزران دیتے تھے اسی پر ان کی گزر بسر تھی۔ اس تنگدستی میں فیاضی کا یہ عالم تھا کہ ہر روپیہ میں سے ایک آنہ یعنی آج کے چھ پیسے خیرات کرتے تھے۔ اسی طرح بچوں کو بھی انعام دینے کے لیے ایک آنہ محفوظ کر دیتے تھے۔ اپنی تمام مصیبتوں کے باوجود اپنی سوتیلی والدہ کی خدمت سے کبھی غافل نہ رہے۔ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتے تھے نہ اہل ثروت واقتدار سے ملتے تھے ؎

آبرو رکھ کر کوئی کیوں اہل دولت سے ملے
پاؤ ٹکڑا لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

اللہ پر بھروسہ کر کے قلندرانہ زندگی گزارنے کا اظہار اکثر اشعار میں ملتا ہے۔

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے بندے ہزار نام کا یہ ایک نام ہے

غیر خدا سے التجا کی ضرورت نہیں ہمیں گھر بیٹھے بھیج دیتے ہیں اللہ میاں مجھے

گویا وہ ایک تیرے کرم کی نگاہ تھی جس زندگی پہ ہم کو بڑا اعتبار تھا

خدا سے دولت دنیا صفی میں کیا مانگوں غضب ہوا جو مرا کام بے دعا نہ ہوا

حضرت صفی اورنگ آبادی نے اپنی پوری زندگی ادب کی خدمت میں گزار دی۔ نامسا
حالات نے شادی کی اجازت نہ دی اور وہ مجرد رہے گویا شاعری ہی ان کی معنوی
اولاد تھی۔ شعر و ادب کی سرپرستی اور فن کاروں کی قدر افزائی میں حیدرآباد سرفہرست ر
ہے۔ داغ، امیر مینائی، فانی اور جلیل جیسے اساتذہ تو حیدرآباد ہی کے ہو رہے
پھر تعجب ہوتا ہے کہ صفی جیسے شاعر کو کیوں یہ سرپرستی حاصل نہ ہو
ہی کی وجہ شاید صفی کی آزاد پسند طبیعت ہی تھی۔ محبوب حسین جگر نے سچ ہی کہا ہے
صفی کو آسودہ حالی اس لئے حاصل نہ ہو سکی کہ وہ لا ابالی اور شاعرانہ طبیعت کے مالک
نیز صفی کی شوریدہ سری اور وارفتہ مزاجی کسی پابندی اور تسلیم و رضا کو برداشت نہیں کر
تی لہٰذا زندگی بھر انھیں آسودہ حالی نصیب نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس بانکپن سے زندگ
گزارنا ہی کمال تھا۔

لوگ ہیں طالب کمال صفی
جی رہا ہوں کمال کرتا ہوں

پھر بھی انھیں حیدرآباد سے بہت محبت تھی۔ کئی اشعار میں اس کا اظہار ہوتا ہے

خلق و تہذیب میں خدا رکھے
ہیں غنیمت بہت دکن کے لوگ

نہ جانے ہندوالے کون ہیں، وہ بولتے کیا ہیں
صفی ہم دکنیوں کی صاف اردو اک تعجب ہے

صفی باتیں بہت دلچسپ کرتے تھے۔ بڑے خوش مذاق تھے اور برجستہ گفتگو میں
اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ معاشی پریشانی اور تنگ دستی میں بھی ان کی زندہ دلی برقرار رہ
مرض الموت کے ایام میں ان کو خون کی قے شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر عبدالصمد کا علاج تھا۔ ڈاکٹر
نے کہا "قبلہ ذرا ہاتھ بڑھائیے انجکشن دے دیتا ہوں" صفی نے ہاتھ بڑھایا اور مٹھی بند کر لی
انجکشن دینے کے بعد ڈاکٹر نے کہا اب مٹھی کھول دیجئے۔ صفی اورنگ آبادی نے جواب دیا
"حضرت یہ بند مٹھی لاکھ کی ہے اسے کیوں کھلواتے ہیں"۔

مرض بڑھا تو انھیں دواخانے میں شریک کر دیا گیا۔ مولوی نظام الدین انھیں دیکھنے کے
لئے رات ساڑھے آٹھ بجے پہنچے۔ صفی نے کہا اس وقت تمہیں کس نے چھوڑ دیا۔ کدھر سے آگئے
مولوی صاحب نے جواب دیا "آنے کے ہزار طریقے ہیں بس کسی طرح پہنچ گیا"۔ صفی نے مسکرا کر
داغ کا یہ شعر پڑھا

خواب میں تم کو کس نے روکا ہے
آنے جانے کے ہیں ہزار طریق

حضرت صفی اورنگ آبادی کے کئی مصرعے روزمرہ استعمال ہوتے ہیں اور کئی شعر

زبان زد خاص و عام ہیں مثلاً

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

پراگندہ ان کے مجموعۂ کلام کا نام ... ہے جس کو وہ اپنی زندگی میں مرتب کر چکے تھے کہا جیکہ

یہ پراگندہ تھے جو کچھ بھی غنیمت ہے فرحی | میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

ایک اور شعر جو ہر آدمی کی زبان پر رہتا ہے وہ ہے ۔

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا | بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

سادگی، سلاست، روانی، روزمرہ اور محاورہ بندی تھگی کے کلام کی وہ خوبیاں ہیں جو حضرت داغ دہلوی کا حصہ ہی ہیں۔ لیکن کلام صفی، داغ کی بے اعتدالیوں سے بھی پاک ہے ۔

کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں :

اپنا دل بیمار دوا کا نہ دعا کا | احسان کسی کا نہیں، احسان خدا کا

غالب نے اسی خیال کو اس طرح ظاہر کیا تھا کہ ۔

درد منت کش دوا نہ ہوا | میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

سادگی کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں

یا مری جان لیجئے یا قتل ہی کر ڈالئے | یا مجھے آرام ہو یا آپ کو آرام ہو
ساری دنیا بھی مجھے دیوانہ اب کہنے لگی | آپ کا لکھا نوشتہ ہو گیا تقدیر کا
رو دیجے اس کی بدنصیبی کو | ڈھونڈنے سے جسے خدا نہ ملا
کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے | شب کو اک آواز آتی ہے الہٰی کیا کروں
یہ دو باتیں ہیں بس اے چارہ گر آگے تری مرضی | جو غم نکلے تو اچھا ہے، جو دم نکلے تو بہتر ہے
مجھ کو تو زندگی پہ نہیں کوئی اعتبار | تم وجہ زندگی ہو تو پھر اعتبار ہے
زمانے کی شکایت کر رہا ہوں | مجھے ان کا چلن یاد آ گیا ہے

سادگی، سلاست و روانی کے ساتھ روزمرہ اور محاورہ کا استعمال بھی تھگی نے بہت چابکدستی سے کیا ہے ۔ ان کی شاذ ہی کوئی غزل ہو جس میں یہ وصف نہ پایا جاتا ہو ۔ جہاں بھی انہوں نے محاورہ باندھا ہے یا روزمرہ کا استعمال کیا ہے گویا نگینہ جڑ دیا ہے ۔ اور شعر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے ۔

آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اس نے — کانوں کانوں مجھے خبر نہ ہوئی

یہ تکیہ اور بستر تماشہ ہیں سب اہلِ دنیا کے — جنھیں اس یار پہ ہے تکیہ، ان کو تکیہ ہے نہ بستر

خدا کی قسم کھا کے وہ ہنس دیئے — خدا کی قسم ہے مزہ آگیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو — یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا

دنیا مثال دیتی ہے مجنوں کے عشق کی — دیوانہ اپنے کام میں کیا ہوشیار تھا

وہ آتے ہیں تو اب کچھ حضرتِ دل رنگ لائے ہیں — عجب آفت میں ہوں دشمن بغل میں دوست پہلو میں

وہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے سنتے ہیں وہ کب دے گا — جب آنکھیں لگ گئیں چھت سے تو کیا امید چھپر کی

رنگینیٔ کلام اور حسنِ بیان کی کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

زباں سے آہ نکلی، دل سے نالہ، آنکھ سے آنسو
مگر اک تیری دھن ہے جو نکلتی ہی نہیں سر سے

قیامت آئی یا اس فتنہ قامت کو شباب آیا — جفا آئی، غرور آیا، ادا آئی، حجاب آیا

دوست نے وعدہ کیا ہے دوستو — آج کی شب جاگنے کی رات ہے

وہ ملے ہیں مجھ سے آئندہ نہ ملنے کے لئے — اور دنیا ہے کہ مصروفِ مبارک باد ہے

مرے قابو میں تم سا نازنیں بھی رہ نہیں سکتا — وہ کیسے لوگ ہیں جو دل کو رکھ لیتے ہیں قابو میں

کہتے ہیں لوگ موت سے بدتر ہے انتظار — میری تمام عمر کٹی انتظار میں

صفی نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ اُن میں صفی کی غزلوں کے تمام محاسن موجود ہیں:

اک عمر حسینوں میں وفا کو ڈھونڈھا — کچھ روز تو دوست آشنا کو ڈھونڈھا
اللہ اللہ صفی کی یہ حق جوئی — کوئی نہ ملا تو پھر خدا کو ڈھونڈھا

...

اے مردِ خدا تم بھی کبھی رکھو روزہ — یہ گلشنِ عالم ہے صفی دو روزہ
ہم کو یہ توکل نے پڑھایا ہے سبق — مل جائے تو روزی ہے نہیں تو روزہ

صفی نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں بھی وہی سادگی، سلاست اور روانی ہے جو اُن کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ سود پر ایک نظم کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

جیتے جی بھی ہو گئے ہیں انسان پر لاکھوں عذاب — کیا بتاؤں ان کی گنتی کیا کروں ان کا حساب
ایک ان میں قرض وہ بھی قرض سودی کی بلا — جس کو یہ لپٹی ہوا پھر اس کا گھر کا گھر خراب
جیب پر، تنخواہ پر، جائداد پر قرضہ ملا — وہ بھی جس کی تین میں گنتی نہ تیرہ میں حساب
سو میں بستر ہاتھ آئے تو بڑی دولت ملی — کم ہو گیا اب سر کا سودا اور دل کا پیچ و تاب

باقی بر صفحہ ۲۴

ڈاکٹر محبوب راہی

غنی اعجاز "دشتِ آرزو" کے پس منظر میں

کا تا اور لے دوڑا کے مصداق سال دو سال میں نظموں، غزلوں کے ڈھیر لگا کر راتوں
ت صاحبِ دیوان بن جانے کی روش سی چل پڑی ہے جس کے نتیجے میں شعری مجموعوں کی
ہ بھرمار ہے کہ وصف شاعری بے وقاری کا موجب ہو رہا ہے ۔ اس تناظر میں اگر میں
ہتا ہوں کہ "دشتِ آرزو" غنی اعجاز کا پہلا شعری مجموعہ ہے تو اس سے عام قاری
س مجموعے اور صاحبِ مجموعہ کے بارے میں کیا تاثر قائم کرے گا اس کا اندازہ
لگانا مشکل نہیں ہے لیکن اس بات کو میں اس طرح کہوں کہ "دشتِ آرزو" غنی اعجاز
کی تیس سالہ شاعری کا اولین انتخاب بلکہ تقریباً کل سرمایہ ہے تو یقیناً واقف کار
ادبی حلقوں میں یہ امر باعث حیرت بھی ہوگا ۔ اتنی بڑی تخلیقی عمر میں تو لوگ درجنوں شعری
موعوں کے خالق و مالک بن بیٹھتے ہیں ۔ اور یہی ایک چیز غنی اعجاز کو اپنے ہم عصروں
یں منفرد اور ممتاز بناتی ہے ۔ بے شک انھوں نے کم بلکہ، بہت کم کہا ہے لیکن جو کچھ
کہا ہے اسے بہت سوچ سمجھ کر، ناپ تول کر، نکھار سدھار کر، بے حد سلیقہ اور
رکھ رکھاؤ، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کہا ہے ۔ فکر کی عمیق و اتھاہ گہرائیوں سے
ین کے ہیرے نکال کر انھیں زبان و بیان کی سان پر چڑھایا ہے ۔ محاورہ بندی
محاکات کی خراد پر ان کی تراش خراش کی ہے اور انھیں ایک معنویت کی تہہ داری کے
ساتھ الفاظ کی تب و تاب عطا کر کے دنیائے فن کے روبرو انتہائی اعتماد کے ساتھ پیش
کیا ہے ۔ "دشتِ آرزو" کا ہر شعر ایک تراشا ہوا ہیرا اور ہر غزل ایک خوبصورت لڑی ہے ۔
دراصل اتنا کم کہنے اور شعری مجموعے کے اس قدر تاخیر سے منظرِ عام پر آنے کی

بارسی ٹاکلی ۔ ضلع اکولہ ۴۴۴۴۰۱

بنیادی وجہ غنی اعجاز کی حد سے بڑھی ہوئی بے نیازی ہے۔ ان کے قریبی واقف اور مشاعروں کے سامعین اس بات کے شاہد ہیں۔ مائک پر غنی اعجاز جس شان کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ ستائش اور صلے کی پرواہ کئے بغیر جس قلندرانہ انداز اور بے نیازی سے غزل سناتے ہیں اور بارہا جس قلندرانہ بے اعتنائی سے غزل ادھوری سنا کر لوٹ آتے ہیں اس سے ان کی قناعت پسندی، متانت وتحمل کا اندازہ ہوتا ہے۔ غنی اعجاز سستی شہرت بٹورنے کے لئے مروجہ حربوں کے استعمال سے بچنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے انتہائی یکسوئی کے ساتھ تخلیق شعر میں مگن رہتے ہیں۔ بقول شاذ تمکنت "غنی اعجاز" مشاعروں کی ہو حق اور شہرت وناموری کے چسکے سے دور ایک عبادت گزار کی طرح فن کی دیوی سے لو لگائے ہوئے ہیں"۔ مشاعروں کی ہو حق تو خیر ٹھیک تھا۔ رسائل وجرائد میں چھپنے چھپانے کے بارے میں ان کی بے نیازی اور بے اعتنائی کو کسی بھی طرح دانشمندی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ پچھلے کچھ برسوں سے احباب کے اصرار پر اور خود ان کے ہونہار فرزند مشہور ومعروف مصور اور ادیب شکیل اعجاز نے اس جانب توجہ دی۔ "دشت آرزو" کی تکمیل کا سہرا ان کے سعادت مند فرزند کے سر جاتا ہے۔

غنی اعجاز کی مذکورہ بالا بے نیازی سے یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ وہ مزاجاً خشک یا تنہائی پسند ہیں بلکہ بے حد منکسر المزاج، خوش طبع۔ مخلص اور یار باش آدمی ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کا بھی یہی تجربہ ہے۔ لکھتے ہیں "غنی اعجاز صاحب بے حد نرم مزاج آدمی ہیں۔ آپ ان سے مختصر ملاقات کے بعد بھی تا دیر ان کے خلوص کی مہک اور کردار کی لطافت کو یاد رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ یہ لطافت، نرمی اور خلوص ان کی غزلوں میں شراروں کی طرح چمکتا ہے ..... مجھے چونکہ غنی اعجاز کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اشعار میں قول وفعل کا تضاد نہیں پایا جاتا ہے۔"

فن اور فن کار دونوں کا پرتو ایک دوسرے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس قول کی تصدیق میں ڈاکٹر مظفر حنفی کی مذکورہ بالا تحریر غنی اعجاز اور ان کے فن کے حق میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہائی قلیل آمدنی کے باوجود غنی اعجاز کے چھوٹے سے گھر اور چھوٹی سی زندگی میں جو سلیقہ، رکھ رکھاؤ، متانت اور لطافت

دکھائی دیتی ہے ۔ یہی خوش گوار عناصر ان کی شاعری میں بھی ایک مخصوص دلکشی و دلربائی کے ساتھ جا بجا ملتے ہیں ۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔

خوبی کوئی بھی حد سے سوا ہو عذاب ہے ۔۔۔ بہتر وہی کمال کہ جو اپنی حد میں ہے

کھیل جاری ہے تو پھر ہوتی رہے گی ہار جیت ۔۔۔ کیجئے ناکامیوں میں کامرانی کی تلاش

فطرۃً اوس کہ اڑنے کا بہانہ ڈھونڈے ۔۔۔ اور سبزہ ہے کہ قدموں کی نشانی مانگے

نفرتوں کے سہارے اُگا پیار بھی ۔۔۔ ایک ہی ڈال پر پھول بھی، خار بھی

کیوں نہ دشمن عزیز ہو ہم کو ۔۔۔ ہم سے ملتا ہوا مزاج تو ہے

دشمنوں کو بھی خلوص دل سے اپنا کہہ گئے ۔۔۔ ہم کہ اپنی سادگی سے ہر طرف جانے گئے

خلوص اور سادگی جو غنی اعجاز کی شخصیت کے بنیادی عناصر ہیں ۔ فن کی شناخت کے بھی اہم وسیلے ہیں ۔ سادگی و سلاست زبان و بیان کی پاکیزگی و شستگی نثر سے قریب تر سہل ممتنع، محاورہ بندی، تخیل کی بلند پروازی ۔ فکر کی تازگی ۔ خیال کی ندرت، اظہار کی جدت ۔ موضوع متنوع جو غزل کی لازوال روایت کے بنیادی اوصاف ہیں ۔ غنی اعجاز کی غزل میں پوری آن بان کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں ۔ غنی اعجاز نے اپنی تخلیقی عمر کا قابل قدر حصہ کلاسیکی شاعری کے شاداب چمن زاروں کو سینچنے اور سنوارنے میں گزارا ہے اور اپنے اس انفرادی رنگ و آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے ایسے دلکش گل پارے تخلیق کئے ہیں جو حالات و رجحانات کی تبدیلیوں کے باوجود اپنے اندر ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ان کے درج ذیل اشعار پیش کر رہا ہوں ۔

اف یہ یادوں کا تسلسل یہ خیالوں کا ہجوم ۔۔۔ چھین لی آپ نے مجھ سے مری تنہائی بھی

یہاں موت کیا ہے حیات کیا، یہاں فرد کیا یہاں ذات کیا
کبھی بے خودی نے ہنسا دیا، کبھی آگہی نے رلا دیا

قہر و غضب سے تم نے یہ جانا ہے کوئی ہستی خالق باری
رحم و کرم سے ہم بھی ہوئے ہیں قائل یزداں تم سے زیادہ

جلائے رکھے ہیں ہم نے صداقتوں کے چراغ ۔۔۔ ہر ایک دور میں ہم زینتِ صلیب ہوئے

ہر شب غم کے مقدر میں سحر ہے لیکن ۔۔۔ اپنی قسمت کے ستاروں کی بلندی کیسی ہے

الگ تھلگ راستہ سمجھ کے، چلا تھا سارے جہاں سے بچ کے
کسے خبر تھی کہ تو ملے گا، یہی تری رہ گذر بھی ہوگی ۔

ہر قدم حادثے ہر گام مراحل تھے یہاں — اپنے قدموں میں ہر اک فتنے رہی منزل کی ہوا
پھر نئے انداز سے اعمال تولے جائیں گے — اب وہ میزانیں گئیں ماضی کے پیمانے گئے

یہ اشعار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ شاعر کو عصری تقاضوں کے تحت رجحانات کی تبدیلی کا شعور و ادراک ہے اور وہ عام روایتی شعرا کی طرح شعر و ادب میں جدیدیت کی آمد پر ناک بھنویں چڑھانے کی بجائے کشادہ قلبی اور خندہ پیشانی سے اپنے ذہن کے دروازے کھول کر انھیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ غنی اعجاز کی جدیدیت کی جانب پیش رفت کو سنجیدہ ادبی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھا گیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں

"اگر غنی اعجاز اپنی کم سنی پر اصرار نہ کریں تو عرض کروں گا کہ خورشید احمد جامی کے بعد وہ دوسرے غزل گو ہیں جنھوں نے تقریباً نصف صدی کلاسیکی رنگ سخن کے ماحول میں گزارنے کے بعد پختہ عمری کی منزل میں پہنچ کر شعوری طور پر جدیدیت کو لبیک کہا ہے اور نئے رنگ و آہنگ میں ایسے ایسے شعر نکالے ہیں جو آج کی جدید تر نسل کے لئے بھی لائق رشک ہو سکتے ہیں۔" (ڈاکٹر مظفر حنفی)

"کچھ ایسی غزلیں سامنے آتی ہیں جن میں روایات کا تسلسل بھی ہے اور زبان و بیان کی تازگی بھی تو نہ صرف یہ کہ جی خوش ہوتا ہے بلکہ غزل اور دنیائے غزل کی سخت جانی اور قوت حیات پر یقین دوچند ہو جاتا ہے۔ جناب غنی اعجاز کی غزلوں میں مجھے کچھ اسی طرح کی کیفیت نظر آتی ہے۔" (غلام ربانی تاباں)

"ان کے اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل کے مختلف ادوار سے عطر کشید کرنے کی جستجو کی ہے یہ نہ ماضی کے اسیر ہیں نہ حال پر ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ فن کے ساتھ یہ رویہ مستحسن بھی ہے اور قابل مبارک باد بھی۔" (شاذ تمکنت)

"غنی اعجاز اس عہد کے مسائل کو اپنے مزاج سے اپنی غزل میں پیش کرتے ہیں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی ادبی سمت و رفتار سے آگاہ ہیں۔ زبان و بیان کی پختگی کے اپنے عہد کے احساسات کو جا بجا انفرادی رویوں کے ساتھ پیش کرنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔" (ڈاکٹر بشیر بدر)

"غنی اعجاز صاحب غزل کے جدید تر رجحانات سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ متاثر بھی ہیں لیکن اس احتیاط اور اہتمام کے ساتھ کہ ان کی آواز اور لہجہ اپنی انفرادیت کو باقی و برقرار رکھے۔" (شہریار)

باقی بر صفحہ ۶۴

محمد کلیم الدین احسن

دہلی پولیس کے لئے اردو تعلیم

اسٹیٹسمین مورخہ ۲۲/۱۱/۸۶ء میں [illegible] گوش نے لکھا ہے کہ دہلی پولس کا نوجوان ہیڈ کانسٹیبل ہربنس سنگھ نہایت خوش ہے کہ اس نے اردو سیکھ لی ہے اور اب وہ بھی اپنے والد کی طرح اردو اخبار پڑھ سکے گا۔ جسے پڑھنے میں اس کے والد مشغول رہتے ہیں۔ ہربنس سنگھ ۲۲ پولس والوں میں سے ایک ہے جنہوں نے ۲۰/اگست ۸۶ء سے اردو سہ ماہی کلاس میں اپنی مرضی سے شرکت کی، تعلیم کے لئے ۲۵ نے رضامندی ظاہر کی تھی۔ چونکہ ڈیوٹی میں کوئی رعایت نہیں ہے اس لئے دو اسسٹنٹ کمشنر اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہوسکے واقعہ یہ ہے کہ دہلی پولس ریکارڈ کا بڑا حصہ اردو میں ہے۔ تقریباً ۱۹۶۸ء تک ایف۔آئی۔آر اور دوسرے دستاویزات اردو ہی میں لکھے جاتے تھے۔ ابتدائی عدالتوں میں بھی اردو ہی میں کام ہوتا تھا۔ اب اردو پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ گذشتہ سال مسٹر گوتم کول ایڈیشنل کمشنر پولس کو پرانے پولس ریکارڈ کو دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ اردو میں تھا۔ پولس والوں میں تلاش کی گئی پڑھنے والے نہ مل سکے۔ مسٹر گوتم کول نے تحریک پیش کی کہ پولس والوں کو اردو سکھائی جائے۔ مسٹر وید مروہ کمشنر پولس نے اپنی رضامندی دی۔ پولس ٹریننگ اسکول نے اردو تعلیم کے انتظام کے لئے اپنی معذوری ظاہر کی۔ پولس کے تعلیمی مشیر ڈاکٹر جے۔ پی۔ گور اور ان کے نائب برج موہن شرما نے [illegible] اردو اکیڈیمی سے بھی مشورہ کیا گیا اور تین مہینہ کا ایک کورس ۲۰/اگست کو شروع کردیا گیا۔ پولس والے اس کورس میں شریک ہوئے اس لئے کہ اردو کی واقفیت اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے انہیں ضروری لگی حالانکہ نہ ان کی ڈیوٹی میں کوئی رعایت کی گئی نہ انہیں کوئی الاونس دیا گیا ہے نہ اس سے ان کے پولس ترقی کا وعدہ کیا گیا۔ مگر پہلے بیاچ کے لوگ اس تعلیم کو اپنے لئے فائدہ مند تصور کرتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی اس تعلیم کے خواہشمند ہیں۔ بلکہ بہت سے کورس کے سیشن ہی سے شرکت کے خواہاں ہیں۔ اس کورس کو اب تین مہینے کے بجائے چھ مہینے کا کر دیا گیا ہے۔ مسٹر گوتم کول کا خیال ہے کہ دہلی پولس میں اردو کی ضرورت مسلمہ ہے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے محکموں کے ملازمین بھی اردو پڑھنا شروع کریں گے۔ اور شہر دہلی جو اردو کے عظیم شاعروں اور ادیبوں کا مرکز رہا ہے پھر سے اردو کی آماجگاہ بن جائے گا۔

تلنگانہ اندھرا شاداب

ڈاکٹر فشار الرحمٰن خان فشار

نعتیہ غزل

خاکی ہو کر بھی بڑی خاص دمک ہے مجھ میں
ہو نہ ہو آپ کی ہلکی سی جھلک ہے مجھ میں

جس کی خوشبو سے مہک اٹھا گلستانِ حیات
اس گلِ رعنا کی جاں بخش مہک ہے مجھ میں

جس طرف جاتا ہوں برساتا ہوں رنگوں کی پھوار
لگتا ہے رنگ بھری کوئی دھنک ہے مجھ میں

نامِ اسلام سے دنیا جسے پہچانتی ہے
اُسی ڈھلتے ہوئے سکے کی کھنک ہے مجھ میں

میں کبھی مصحف، کبھی کھینچی ہوئی تلوار بھی ہوں
کیا کہوں کیسی طرحدار لچک ہے مجھ میں

منزلِ حق کی طرف تیزی سے اٹھتے ہیں قدم
جانے کیسی لگن، کیسی لپک ہے مجھ میں

میں کبھی سیلِ حوادث سے نہیں دب سکتا
اٹھتی امواجِ تلاطم کی ہمک ہے مجھ میں

دل کے زخموں کی تب و تاب کے باعث فشار
کہکشاں جس سے خجل ہو وہ چمک ہے مجھ میں

۱۱ - اسٹارکی ٹاؤن - ناگپور - ۴۴۰۰۰۱

محمد عبدالکریم ماہر
سرپرست ادارہ مرکزِ ادب

مجموعۂ نعت - رباعیات

عاجز ہے قلم عقدہ کشا کیا ہوگا
اے فکرِ رسا تجھ سے بھلا کیا ہوگا
مداحِ ازل جب ہے ثنا خوانِ حضورؐ
حق نعت کا بندے سے ادا کیا ہوگا

•

ڈالی کی ضرورت نہیں خوشہ بس ہے
طیبہ میں کہیں ہو ایک گوشہ بس ہے
لے جاؤں گا دنیا سے فقط حبِ رسولؐ
اتنا ہی مرے واسطے توشہ بس ہے

•

آیا نہ کوئی ان کے برابر ہادی
پیدا نہ ہوا رسول ایسا کوئی
کیسے ہوتا کوئی بھی ان کا ہمسر
سایہ کی بھی قسمت میں نہ تھی ہمقدمی

•

یہ بھی کرمِ صاحبِ لولاک ہوا
سینہ جو غمِ ہجر میں صد چاک ہوا
اب اتنی تمنا ہے مدینے میں مروں
جو گیا اس خاک میں وہ پاک ہوا

•

کیا کیجے بیاں حسنِ شہِ عالم
خاتم کے صفات کو ملا حسنِ اتم
کھینچی نہ گئی پھر کوئی ایسی تصویر
توڑا نہ ہو دانستہ مصور نے قلم

•

پھر اور کہیں قیام ہونے ہی نہ پائے
گنبد میں سحر ہو شام ہونے ہی نہ پائے
پڑھ لوں درِ آقاؐ پہ اک ایسی بھی نماز
سجدے میں سلام ہونے ہی نہ پائے

•

عظیم حیدرآبادی (مرحوم)

صدر ادارہ مرکزِ ادب

نعت شریف

(ادارۂ مرکزِ ادب کے زیرِ اہتمام منعقدہ نعتیہ مشاعرہ [illegible] کی چند رباعیات و اشعار ہدیۂ قارئینِ شاداب ہیں۔ جنابِ عظیم حیدرآبادی صدر مرکزِ ادب کے انتقالِ پُرملال کی وجہ سے مرحوم کی نعت مشاعرہ میں پڑھی نہ جا سکی۔ چند شعر پیش ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام مرحمت فرمائے اور متعلقین و اراکین مرکزِ ادب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین)

-★-

زیارت جب بھی ہو سرکارؐ کی حاصل مقدر سے
تو مجھ پر رحمت اللعالمین کا نور ہی برسے

سوالی جو بھی آتا ہے مرادیں دل کی پاتا ہے
نہیں جاتا کوئی خالی مرے سرکارؐ کے گھر سے

ہے ہم پر سایہ فگن احمدِ مختارؐ کی رحمت
ہمیں کیا خوف ہوگا دار و گیرِ روزِ محشر سے

محمدؐ عرش کی منزل پہ جب معراج میں پہنچے
ملی خلوت میں بھی عزت انھیں خلاقِ اکبر سے

بصدقِ دل جو لیں نامِ محمدؐ وقتِ مشکل میں
عظیم اپنی بلائیں ٹل ہی جائیں گی محاسر سے

مومن خاں شوق

نائب صدر ادارہ مرکز ادب

نعت شریف

اے رحمت عالم ایک نظر بر حال غریباں ہو جائے
یا درد گزر جائے حد سے یا درد کا درماں ہو جائے

ہر سانس سے آئے بوئے وفا، ہر بات میں ہو الفت کی ادا
اک نشتر یادِ شاہ و رسل پیوستِ رگِ جاں ہو جائے

جب اشکِ ندامت ابھریں گے، سرکار کرم فرمائیں گے
خوشنودیٔ رب ہو گی حاصل، جب نفس مسلماں ہو جائے

میں نعت نگارِ شاہ بنوں، حسان پکارے مجھ کو جہاں
اللہ ثنا خواں ہوں میں بھی، مجھ پر بھی یہ احساں ہو جائے

میں چاہوں کہ دنیا کی مشکل، ہو جائے جو آساں، مشکل ہے
اے شوق دو عالم کی مشکل وہ چاہیں تو آساں ہو جائے

•

منیر الزماں منیر

معتمد ادارہ مرکز ادب

رکھو آٹھوں پہر اپنی نظر اُس ذاتِ اعلیٰ پر
وہی اک ذات ہے روشن بساطِ دین و دنیا پر

نظر کی حد سے آگے اور لے جائیں اگر آنکھیں
محمدؐ کا کفِ پا دیکھتے عرشِ معلیٰ پر

اگر تم چاہتے ہو سرخروی دونوں عالم میں
رکھو خوفِ خدا دل میں، رکھو ایمان آقا پر

بھنور میں جب بھی آ جائے گی میری زیست کی کشتی
رسول اللہ سمجھتا جاؤں گا دامانِ دریا پر

منیر خستہ جاں کا سر یہاں سے کس طرح اُٹھتا
اُٹھا ہے کس کا سر جھک کر محمدؐ کے کفِ پا پر

دوسرا یہ کہ ہر سال مکمل طبی امتحان کروالیں۔ خصوصاً خواتین جو ۳۵ سال سے زیادہ عمر کی ہوں تو انھیں چاہئے کہ سال میں دو مرتبہ اپنا امتحان کروالیں۔ تیسرا ابتدائی تشخیص اور فوراً علاج۔ چوتھا کینسر کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کریں چاہے وہ عام نوعیت کے ہوں یا فنی۔

غرض کینسر کے اسباب جاننے کے بعد ابتدائی تشخیص سے مدافعتی اور احتیاطی تدابیر اختیار کئے جائیں۔

صفحہ ۱۱

عمر رسیدہ افراد کے نفسیاتی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ ان کی عزت نفس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہمارا ملک ایسا ملک ہے جہاں عمر رسیدہ افراد مہمل اور بوجھ نہیں سمجھے جاتے بلکہ ان کی زندگی کے تجربات اور عقل و فراست سے استفادہ کیا جاتا ہے ▲▲

ہیں تھے۔

گاندھی: ٹھیک ہے۔ لیکن ہر کیس میں اندرونی آواز کی تائید میں عقلی دلائل بھی موجود ہوا کرتے تھے۔ دراصل میں نے کبھی محض اپنی اندرونی آواز پر کوئی قدم نہیں اٹھایا جب تک میری عقل نے بھی اس کی تائید نہیں کی۔

ایسے پیاسے کی طرح معروض کی حالت ہوئی دوڑے جو پانی سمجھ کر اور وہ نکلے سراب

ترنیاں برستی ہوئی زندگی اور برستی ہوئی آنکھوں سے مسکراتی غزلیں دینے والے صفیؔ کی آنکھیں ۱۵/رجب ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۱/مارچ ۱۹۵۴ء کو ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ جلتے ہوئے چراغ، بجھتے ہوئے دل، رستے ہوئے محاورے اور کھنکتے ہوئے شعر دے اور شعر و ادب کی یہ لافانی امانتیں ہم تک پہنچانے کے لئے انھیں خود سے دور ہو جانا پڑا۔ وہ دور ہوتے گئے اور اس قدر دور ہوگئے کہ اپنی شخصیت کا خود ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا چنانچہ آخر وقت وہ صرف شاعر رہ گئے تھے۔ ۲

کس مپرسی سے خاک ہونے تک خاک ہو کے ہما کیمیا ہوں میں

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

۱، ۲ پراگندہ۔ مقدمہ صفی کی شخصیت اور شاعری از اوج یعقوبی

دنیائے شعر و ادب کے ان باوقار اور مستند اہل الرائے حضرات کی موقر، معتبر اور مستحکم آرا پیش کر دینے کے بعد میں غنی اعجاز کی شاعری پر مزید کوئی رائے

), 37979/84. Postal Regd. No. 1: HD59s

Mly SHADAAB Hyd.

11-5-147, RED HILLS, HYD-50u 004. A. P.

) No. 12 DECEMBER 1986